شوکت صدیقی

چار دیواری

(ناول)

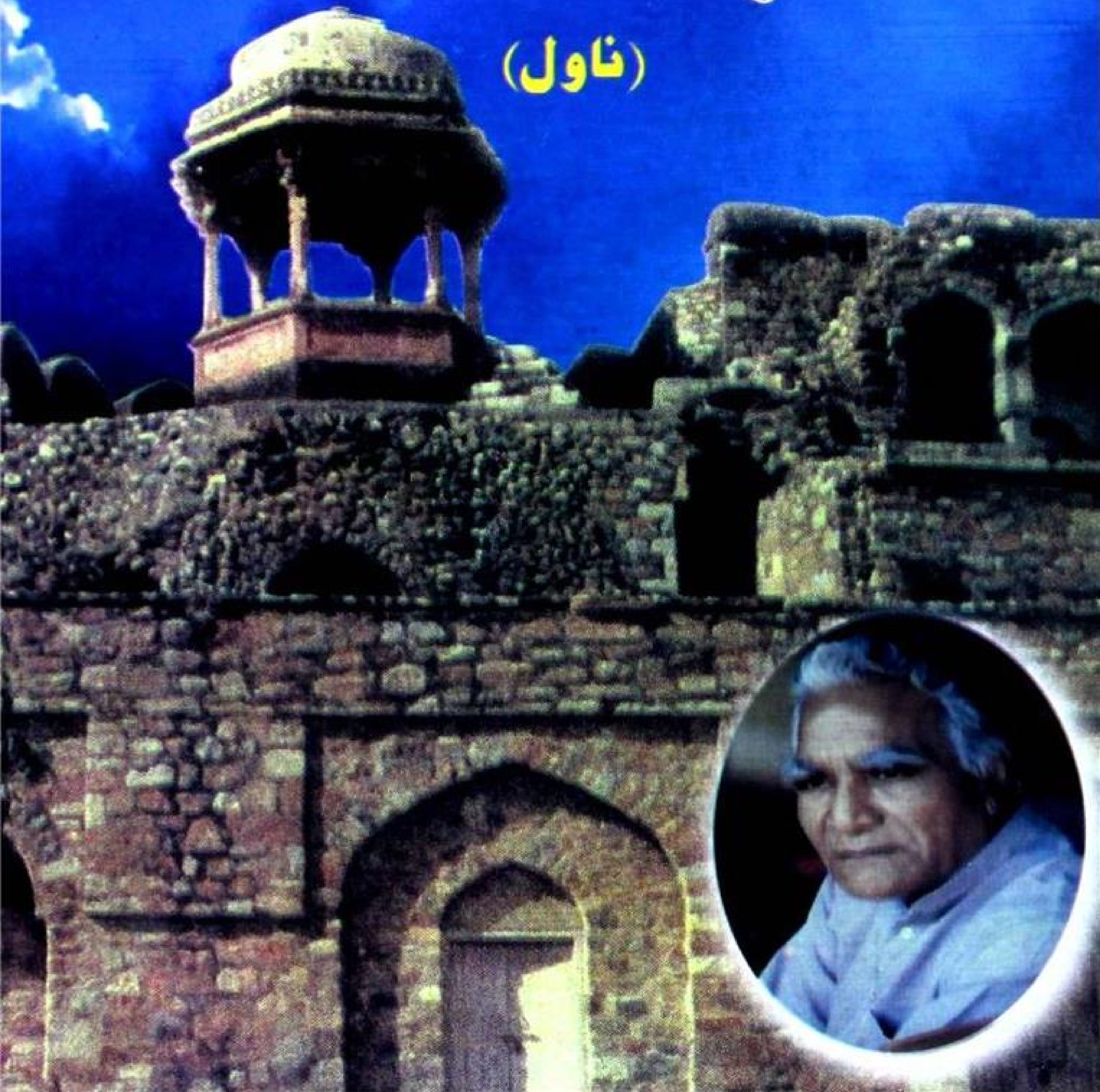

شوکت صدیقی

چار دیواری

(ناول)

چار دیواری

(ناول)

مصنف:

شوکت صدیقی

ناشر:

تخلیق کار پبلشرز

104/B ـ یاور منزل، آئی بلاک، لکشمی نگر، دہلی ـ ۱۱۰۰۹۲

جملہ حقوق محفوظ

نام کتاب : **چار دیواری** (ناول)

مصنف : شوکت صدیقی

تعداد : ۳۰۰

ناشر : انیس امروہوی

○ **تخلیق کار پبلشرز**

104/B ۔ یاور منزل، آئی بلاک، لکشمی نگر، دہلی ۔ ۱۱۰۰۹۲

سرورق : مسعود التمش

مطبع : کلاسک آرٹ پرنٹرس، چاندنی محل، دریا گنج، نئی دہلی ۔ ۱۱۰۰۰۲

ملنے کے پتے:

- کتب خانہ انجمن ترقی اردو، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی ۔ ۱۱۰۰۰۶
- کتابی دُنیا، ترکمان گیٹ، نئی دہلی ۔ ۱۱۰۰۰۲
- مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی ۔ ۱۱۰۰۰۶
- ایجوکیشنل بک ہاؤس، مسلم یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ ۔ ۲۰۲۰۰۲ (یو۔ پی)
- کتاب دار، جلال منزل، ٹیمکر اسٹریٹ، ممبئی ۔ ۴۰۰۰۰۸
- بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ ۔ ۸۰۰۰۰۴ (بہار)
- ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، گلی وکیل، کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی ۔ ۱۱۰۰۰۶

T.P.: 0184

ISBN: 978-81-907834-8-4

CHAAR DIWARI *(Novel)*

2009

By SHAUKAT SIDDIQI

Rs. 500.00

TAKHLEEQKAR PUBLISHERS

104/B - YAWAR MANZIL, I-BLOCK, LAXMI NAGAR, DELHI - 110092

Ph.:011-22442572, 9811612373 E-mail:qissey@rediffmail.com

○

رفیقۂ حیات

ثریا بیگم

کے نام

○○

مجھے سہل ہو گئیں منزلیں، وہ ہوا کے رُخ بھی بدل گئے
ترا ہاتھ، ہاتھ میں آ گیا کہ چراغ راہ میں جل گئے

اوّل

(۱)

اُس روز ایک ایسا حادثہ پیش آیا جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے نہایت پُراسرار اور ایسا لرزہ خیز تھا کہ بارہ دری پر خوف و ہراس کے سائے پھیل گئے۔

چار گھڑی دن ابھی باقی تھا۔ دھوپ کی تمازت ماند پڑتی جا رہی تھی۔ آج نوچندی تھی اور نوچندی بھی بسنت کی تھی۔ پت جھڑ لگ چکا تھا۔ درختوں کے نیچے خشک پتے باگھ کی بکھری ہوئی ہوا کے جھونکوں سے کھڑکھڑا رہے تھے۔ برہنہ شاخوں میں کہیں کہیں کونپلیں پھوٹ رہی تھیں۔ کھیتوں میں ہر طرف ہریالی تھی۔ گیہوں اور جو کی بالیاں جھوم رہی تھیں۔ سرسوں پھولی ہوئی تھی۔ ہوا کا تیز جھکڑ آتا تو چمکیلی دھوپ میں سرسوں کے بسنتی پھول لہلہاتے، گیندے کی زرد اور نارنجی کلیاں چٹکتیں اور پھول بن کر مسکراتیں۔ تالابوں اور جوہڑوں میں اُجلے اُجلے گلابی کنول کھلتے جن کو لکھنؤ اور اُس کے مضافات میں عام طور پر کو کا بیلی کہا جاتا ہے۔

موسم بدل رہا تھا۔ جاڑے کا چل چلاؤ تھا۔ بہار کی آمد آمد تھی۔ فضا میں رنگینی تھی، مہک تھی۔ ربیع کی فصل ابھی پکی نہیں تھی مگر تیاری کے مرحلے میں داخل ہو چکی

تھی۔ بسنت پنچمی گویا اس تیاری کی نوید تھی جسے باقاعدہ تہوار کے طور پر منایا جاتا ہے
بستی بستی قریہ قریہ میلے لگتے ہیں۔

دیہات کا رنگ ڈھنگ نرالا ہوگا۔ رات کو گاؤں کے کھلے میدان میں جشن کا سماں ہوگا۔ مہوے کے پھولوں سے کشید کی گئی داڑو کا دور چلے گا۔ ریندی کے تیل سے مشعلیں روشن کی جائیں گی۔ اُن کی لہراتی روشنی میں ہڑک کی گمک، جھانجھ اور مجیرے کی تال کے ساتھ، ڈھولک پر تھاپ پڑے گی۔ کچی شراب کے نشے میں دھت جوان اور بوڑھے، جھوم جھوم کر رقص کریں گے۔ لہک لہک کر دھو بیا راگ الاپیں گے۔

رُت بسنت کی آئی رے
گوری گجرا لگائے کے
جرا جوبنا دکھائے کے

اور سامنے کھڑی گوری، بسنتی دوپٹے کے آنچل سے مُنہ چھپائے ہُوئے جل کر کہے گی: "حرام جادے کو تنک لاج نہیں آتی۔ دارو پی کر کیسا مٹک رہا ہے۔ بے سری کی باتیں کر رہا ہے۔" اس کی جلی کٹی سُن کر زور دار قہقہہ بلند ہوگا۔ رات ڈھلتی جائے گی، ناچ تیز اور تیز ہوتا جائے گا، گیت کی تنک بندی میں بھکڑ پن بڑھتا جائے گا، ٹھٹھول ہوگا، غل غپاڑہ ہوگا، ملی جلی آوازوں کا شور ہوگا، ہنگامہ ہوگا۔ رات سرد اور تاریک ہوجائے گی۔ ناچنے والے ہر آن بڑھتی ہوئی سردی کے باوجود، رقص کرتے کرتے پسینے سے شرابور ہو جائیں گے۔ جسم شل پڑ جائیں گے۔ ہر طرف لہراتی ہوئی پرچھائیاں، اندھیرے میں تحلیل ہوتی جائیں گی۔ جھانجھ اور مجیرے کی جھنکار سُست پڑ جائے گی۔ ڈھولک کی گمک آہستہ ہو جائے گی، مشعلوں کی روشنی مدھم پڑ جائے گی ناچ تھم جائے گا۔ گیت خاموش ہو جائیں گے۔

☆

ادھر شہر میں مُنہ اندھیرے جلی خورشید کی کنکوے کی سرسراہٹ سے آنکھ کھلتی وہ کھاتی پیتی، بڑے کلے ٹھلے کی ڈیرے دار طوائف تھی۔ گانے میں اُس کا جواب نہ تھا،

نور کا گلا پایا تھا، رقص میں بھی دسترس رکھتی تھی۔ ناچ گانے کے ساتھ ساتھ کنکوے بازی کا بھی شوق تھا۔ اور والہانہ حد تک تھا۔ سنا ہے، ایک زمانے میں گھڑ سواری بھی کرتی تھی۔ نہایت آن بان سے گھوڑے کو ایڑ لگا کر دوڑاتی تھی۔ سائیکل بھی چلاتی تھی اور بہت تیز چلاتی تھی لیکن اب لکھنؤ کے ایک رئیس، ٹھاکر نواب علی کے گھر بیٹھ گئی تھی نام بھی گبرا بیگم رکھ لیا تھا۔ گھڑ سواری اور سائیکل سواری تو چھوٹ گئی تھی مگر کنکوے بازی نہ چھوٹی۔ چھوٹتی بھی کیسے؟ ٹھاکر نواب کو بھی کنکوے بازی کا شوق تھا۔ دونوں کے مراسم میں ناچ گانے سے زیادہ کنکوے بازی کو دخل تھا۔ اسی کنکوے بازی کے باعث وہ گبرا بیگم نہ بن سکی، جلی خورشید ہی کہلاتی تھی۔ ٹھاکر نواب علی اپنے اہل خانہ کے ساتھ جس کوٹھی میں رہتے تھے، اُس کے قریب ہی جلی خورشید کی رہائش کے لئے علیحدہ مکان کا بندوبست کر دیا تھا۔ وہ صبح وشام، خصوصیت کے ساتھ جاڑے میں، نہایت پابندی کے ساتھ ٹھاکر نواب سے کنکوے کے دو چار پیچ ضرور لڑاتی تھی۔

بسنت پر جلی خورشید کا ٹھاکر نواب سے کنکوے بازی کا باقاعدہ میدان رہتا ہفتوں پہلے اس کی تیاریاں شروع ہو جاتیں جن میں جلی خورشید، ذاتی طور پر دلچسپی لیتی۔ کہیں مانجھا سُوتا جا رہا ہے، کہیں سادی، کہیں کنکوے تیار ہو رہے ہیں۔ مانجھے پر خاص توجہ دی جاتی۔ پسے ہوئے شیشے کو نہایت باریک اور مضبوط کپڑے میں چھان کر خوب اُبلے ہوئے چاولوں میں ملایا جاتا، پھر گھیکوار کا گودا اور انڈوں کی پھینٹی ہوئی سفیدی شامل کر کے زرد رنگ کی آمیزش کی جاتی۔ اس طرح بسنتی لگدی تیار ہو جاتی۔ اس لگدی سے مانجھا سُوتنے والے، جو خاص طور پر بلائے جاتے تھے، گھوڑوں کے بالوں کے دستانے پہن کر، ڈور کو اس مہارت سے سُوتتے کہ مانجھے میں تیزی کے ساتھ ساتھ چکنائی بھی پیدا ہو جاتی۔ کنکوؤں کے کانپ اور ٹھڈے بھی پختہ بانسوں کو چھیل کر نہایت ہنرمندی سے کالے ببّن کی نگرانی میں تیار کئے جاتے۔ اُن کی تیاری میں اس بات کا خیال رکھا جاتا کہ کنکوا کھینچنے میں بالکل سیدھا رہے، نہ اڑائے نہ کسی طرف جھکے۔

کنکوّے پونے اور پٹی کم تاؤ بھر کے بھی ہوتے۔ رنگ اُن کا ہلکا بسنتی ہوتا۔ مُنڈھے پر سُرخ یا سیاہ چاند ہوتا۔ ایک ماہر کنکوّے باز مُلازم تھا۔ وہ کنکوّا اُڑاتا اور جب بلندی پر پہنچ جاتا تو ڈور جلی خورشید کے ہاتھ میں دے دیتا۔ اُس کے ٹھسّے کا یہ عالم ہوتا کہ نہایت کرّو فر سے کُرسی پر بیٹھتی۔ ڈور ہاتھ میں لے کر کنکوّے کو ٹھمکی دیتی۔ آہستہ آہستہ آگے بڑھاتی، بلندی پر لے جاتی۔ عام طور پر وہ کُرسی پر بیٹھ کر ہی پیچ لڑاتی۔ نظروں کے ساتھ ساتھ اُنگلیاں چلتی رہتیں۔ ذہن بھی برابر کام کرتا رہتا۔ یہ خیال رکھنا پڑتا کہ کنکوّا ہوا کے دھارے سے ہٹنے نہ پائے۔ ڈور کسی ہوئی رہے۔ کنکوّا بے گھرا نہ ہونے پائے۔ کب قط لگایا جائے۔ کب اسے کھینچا جائے۔ کہاں رُخ دیا جائے۔ کہاں رکا جائے اور رُک کر وار کیا جائے۔

پیچ اگر پھنس جاتا تو جوش و خروش کے عالم میں اُٹھ کھڑی ہوتی۔ ملازم کو ڈانٹتی اے ٹھیک سے چرخی دکھا۔ پیچ کاٹ دیا تو کنکوّے کی ڈور مسکرا کر کنکوّے باز ملازم کے سُپرد کرتی۔ اطمینان سے کُرسی پر بیٹھ کر پیشانی پر آیا ہوا پسینہ پونچھتی۔ اگر پیچ کٹ گیا تو ڈور ہاتھ سے چھوڑ دیتی۔ قریب رکھے ہوئے خاصدان میں سے پان کی گلوری نکال کر منہ میں رکھتی۔ سگریٹ بھی پیتی تھی اور ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر ٹھاٹھ سے کش لگاتی تھی۔

ٹھاکر نواب کے کنکوّوں کا رنگ سیاہ ہوتا۔ اس پر بسنتی چاند بنا ہوتا۔ اُن کے کنکوؤں کی یہی پہچان تھی۔ بسنت پر منہ اندھیرے ہی سویرے دونوں طرف سے کنکوّے اُڑائے جاتے۔ پھر دن چڑھے جب دُھوپ تیز ہو جاتی تو نگیرے تان دیئے جاتے۔ نگیرے کے نیچے، کنکوّے بازوں کے بیٹھنے کے لیے کُرسیاں لگا دی جاتیں۔ پان سگریٹ کے ساتھ ساتھ کشمیری چائے کا بھی دور چلتا جس میں زعفران کے علاوہ بادام پستے خوب گھوٹ کر ملائے جاتے۔ دوپہر کے کھانے کے لیے پلاؤ، زردے کی دیگیں چڑھتیں۔

کنکوّے بازوں کا جمگھٹا اِدھر بھی ہوتا، اُدھر بھی۔ ہر پیچ پر واہ واہ، سبحان اللہ کا غلغلہ بلند ہوتا۔ اگر کسی نے نوشیرواں کا کاٹ دیا تو زبردست شور اُٹھتا۔ دُور دُور تک

آوازیں سنائی پڑتیں۔ اگر کسی پیچ کے بارے میں تنازعہ پیدا ہو جاتا تو جج کا فیصلہ فریقین کے لئے بلا عذر قابل قبول ہوتا۔ جج تو عام رواج کے مطابق ایک ہی مقرر ہوتا تھا۔ مگر اس کی مدد کے لئے دو مشیر بھی ہوتے تھے جن سے ہر مسئلہ پر برابر صلاح مشورہ کیا جاتا۔

شام کو جب کنکوے بازی اختتام کو پہنچتی تو دن بھر کے پیچوں کا باقاعدہ حساب کتاب ہوتا، ہار جیت کا فیصلہ ہوتا۔ یہ طے ہوتا کہ پالا کس کے ہاتھ رہا۔ اس کانٹے کا مقابلہ ہوتا کہ ہزاروں پر پانی پھر جاتا۔

جلی خورشید تو کنکوے لڑا کر بسنت مناتی تھی۔ مگر شہر کی دوسری طوائفیں بھی نہایت دھوم دھام سے بسنت پنچمی کا اہتمام کرتی تھیں۔ اُن کی سج دھج سب سے نرالی ہوتی۔

☆

بسنت کی اصل بہار شاہ مینا مخدوم کی درگاہ پر دیکھنے میں آتی۔ اُن کا مزار ہمیشہ سے مرجعِ عام رہا ہے۔ اُن کے مُریدوں کا سلسلہ دُور دُور تک پھیلا ہوا ہے کشف و کرامات کا بھی ایسا ہی زبردست شہرہ ہے۔ اُن کا مزار میڈیکل کالج کے پہلو میں واقع ہے۔ سامنے سے پختہ سڑک گزرتی ہے جو شاہ مینا ہی سے موسوم ہے مزار کے اردگرد وسیع احاطہ ہے۔ تین طرف پختہ چار دیواری ہے۔ سامنے کے رُخ، جدھر سے سڑک گزرتی ہے، لوہے کا مضبوط جنگلا ہے۔ لوحِ مزار پر یہ شعر کندہ ہے۔

ہر کہ خواہد چشمِ دل بینا شود
سُرمۂ خاک درِ مینا شود

مشہور ہے کہ یہ شعر، مُلّا جامی نے شاہ مینا کے وصال کے موقع پر کہا تھا جس سے اُن کی تاریخِ وفات بھی نکلتی ہے۔

بسنت پر شاہ مینا کی درگاہ پر میلے کا سماں ہوتا ہے۔ سالانہ عُرس کے بعد سب سے بڑا اجتماع اسی روز ہوتا ہے۔ ماگھ کا مہینہ لگتے ہی ہر طرح کی تیاریاں

شروع ہو جاتی ہیں۔ درختوں کی تراش خراش ہوتی ہے، روشیں اور کیاریاں درست کی جاتی ہیں۔ مزار سے متصل ایک سلسلے سے حجرے بنے ہوئے ہیں۔ مزار کے قبّے اور حجروں پر تازہ تازہ سفیدی ہوتی تو چاندنی راتوں میں اُجلی اُجلی درگاہ کا نظارا بڑا روح پرور ہوتا۔

درگاہ کی چار دیواری کے اندر اور باہر فٹ پاتھ پر کئی روز قبل طرح طرح کی دکانیں لگائی جاتیں۔ دُور دُور سے نامی گرامی قوّالوں کی چوکیاں بُلائی جاتیں۔ حجروں میں مضافات سے آئے ہُوئے صوفیوں اور مشائخ کے قیام کا مناسب بندوبست ہوتا۔

شاہ مینا مخدوم کے ارادت مند مشائخ میں قلزم شاہ بھی تھے۔ وہ حال وقال کی محفلوں کی رونق تھے۔ نام تو اُن کا شیخ رفاقت علی تھا۔ مگر عرف عام میں قلزم شاہ کے نام سے مشہور تھے۔ وجہ تسمیہ اس عرفیت کی غالباً یہ تھی کہ ان کے وجد کا انداز سب سے جُداگانہ اور نہایت والہانہ تھا۔ قوالی سُنتے سُنتے جب اُن پر خاص کیفیت طاری ہوتی تو جھُومتے جھُومتے پھُدکنے لگتے اور پھُدکتے پھُدکتے بے قرار ہو کر کھڑے ہو جاتے حال آتا اور ایسا آتا کہ رقّت طاری ہو جاتی۔ آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے، جھُوم جھُوم کر حق اللہ کا نعرہ بلند کرتے، اسی عالم وجد میں رقص شروع کر دیتے۔ سُنا ہے کہ کسی محفل سماع میں قوّال لہک لہک کر بیدم وارثی کی ایک غزل الاپ رہے تھے انہوں نے مقطع پیش کیا۔

بیدم وہ مرا رو کر دامن سے لپٹ جانا
اور اُن کا یہ فرمانا دیوانے کو کیا کہیے

قلزم شاہ پر ایسا وجد طاری ہُوا کہ جھُومتے جھُومتے ایکبارگی تڑپ کر اُٹھے اور دونوں ہاتھ پھیلا کر بے ساختہ رقص کرنے لگے۔ عالم یہ تھا کہ آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ تن بدن کا ہوش نہ تھا۔ زبان سے بار بار یہ صدا بلند ہوتی "ہائے دیوانے کو کیا کہیے"۔ رقص کرتے کرتے بے حال ہو کر گر پڑتے۔ لوٹن کبوتر کی مانند، فرش پر پھڑکتے

تھے۔ کسی پہلو قرار نہ تھا۔

محفل سماع ختم ہوئی تو کسی نے نہایت تجسّس سے دریافت کیا: "شاہ صاحب! اس مصرعے میں آپ کو ایسی کیا کیفیت محسوس ہوئی کہ حال سے بے حال ہو گئے؟"

قلزم شاہ نے ایک آہ سرد کھینچی۔ دل گرفتہ ہو کر جواب دیا: "میاں تم اس رمز کو نہیں سمجھ سکتے۔ کیا بتاؤں، کیسے بتاؤں کہ کیا کیفیت تھی۔ یہ کشف کا وہ عالم تھا کہ حجابات کے سارے پردے اُٹھ گئے تھے۔ ہر طرف اُسی کا جلوہ نظر آتا تھا۔ دل میں ایسی ہلچل برپا تھی کہ تم سے کیا عرض کروں۔ یُوں سمجھ لو جیسے سینے میں بصفت قلزم موجزن ہو۔" کہنے والے کہتے ہیں کہ اسی روز سے ان کا نام قلزم شاہ پڑ گیا۔ ایسا چھپا ہوا کہ ان کا اصل نام عنتر بُود ہو گیا۔

عالمِ وجد میں قلزم شاہ جب اپنی نشست سے اُٹھ کر کھڑے ہوتے تو تمام اہل محفل بھی احتراماً کھڑے ہو جاتے۔ قوّال بھی کھڑے ہو جاتے اور بار بار وہی مصرعہ الاپتے جو قلزم شاہ کی زبان پر ہوتا۔ ایسا سماں بندھ جاتا کہ محفل سماع پر بے خودی اور سرشاری کی کیفیت طاری ہو جاتی۔ قلزم شاہ وارفتہ ہو کر کبھی ادھر بڑھتے، کبھی اُدھر جس طرف نکل جاتے، ہر شخص بڑھ کر اُنہیں عقیدت سے سنبھالنے کی کوشش کرتا۔ آخر نڈھال ہو کر کسی کے بازوؤں پر ڈھیر ہو جاتے۔ اُن کی بے قراری کو قرار آتا تو محفل کو بھی قرار آجاتا۔ افراتفری ختم ہو جاتی۔ سب اپنی اپنی جگہ پر مؤدّب ہو کر بیٹھ جاتے۔ یکسوئی اور انہماک سے قوالی سُنتے، عرفان حاصل کرتے، نذرانے پیش کرتے۔

قلزم شاہ وضع قطع سے بھی صوفی منش نظر آتے تھے۔ ہمیشہ گہرے سبز رنگ کا تہمد باندھے تھے۔ اس پر ڈھیلا ڈھالا ململ کا لمبا کُرتہ ہوتا۔ سردی کا موسم ہوتا تو کُرتے کے اُوپر، رُوئی بھری ہوئی چھینٹ کی بنڈی بھی پہن لیتے۔ گھنی سیاہ ڈاڑھی آنکھوں میں سُرمہ، ہونٹوں پر پان کا لاکھا، سر پر سبز ریشمی عمامہ جس کے نیچے اُن کی لمبی لمبی گھونگر والی زلفیں لہراتی ہوتیں، تیکھے نقش و نگار، کھلتا ہوا گندمی رنگ، اُونچا قد۔ قلزم شاہ نہ صرف خوش شکل تھے بلکہ خوش گفتار بھی تھے۔ اُن کا تعلق تو سلسلۂ

نقش بندیہ سے تھا مگر طریقت کے ہر سلسلے سے کسی نہ کسی طور وابستگی رکھتے تھے اور برملا اس کا اظہار بھی کرتے تھے۔

یہ تو خبر نہیں کہ کس کے ہاتھ پر بیعت کر رکھی تھی اور اُن کے پیر و مُرشد کون تھے لیکن باقاعدہ پیری مریدی کرتے تھے۔ ہفتوں اعتکاف میں بیٹھے رہتے۔ چلہ کشی کرتے تھے۔ جنوّں کو قابو میں کرتے تھے، گنڈے تعویز دیتے تھے۔ جھاڑ پھونک بھی کرتے تھے۔ اُن کے عقیدت مندوں کا حلقہ خاصا وسیع تھا۔ خود بھی اکثر نذر و نیاز کا اہتمام کرتے تھے۔ محفل سماع بھی منعقد کرتے تھے۔ لیکن سالانہ عُرس کے علاوہ بسنت کی نوچندی کے موقع پر نہایت پابندی سے شاہ مینا مخدوم کے آستانے پر حاضری دیتے تھے۔ عقیدت اور شیفتگی کا اظہار کرتے محفل سماع میں نیاز مندی سے شریک ہوتے اور ہمیشہ محفل ختم ہونے کے بعد واپس گھر جاتے تھے۔

☆

آج بھی بسنت کی نوچندی تھی۔ پہر دن چڑھتے ہی شاہ مینا کے مزار پر چہل پہل شروع ہو گئی تھی۔ جب دو گھڑی دن رہ جائے گا اور ڈوبتے سُورج کی دھُوپ پھیکی پڑ جائے گی تو مزار پر دھُوم دھام سے گاگر چڑھے گی۔ پچھلے کئی برس سے چوک کی مشہور طوائف اختری گاگر چڑھاتی تھی۔ اُس کے ہمراہ چوک کی دوسری طوائفیں بھی ہوتیں۔ گاگر کے جلُوس میں شرکت کے لئے طوائفیں دوپہر ہی سے بناؤ سنگھار شروع کر دیتیں۔ بسنتی لباس زیب تن کرتیں۔ جس بالا خانے کی جانب نظر اٹھتی بسنتی آنچل لہراتے۔

چاندی کی نقشیں گاگر میں پاک صاف پانی بھرا ہوتا۔ اُسے گلاب کے پھُولوں میں بسا کر معطّر کیا جاتا۔ گاگر صندل کی خوشنما چوکی پر اس قدر حفاظت اور احتیاط کے ساتھ رکھی ہوتی کہ پانی کے چھلکنے کا احتمال نہ ہوتا۔ چوکی پر سُرخ شال باف بچھی ہوتی گاگر پر پھُولوں کے ہار پڑے ہوتے۔ کہار بسنتی صافے باندھے، چوکی کندھوں پر اُٹھائے، سنبھل سنبھل کر چلتے۔ گاگر کے آگے شہنائی بجتی۔ عقب میں سب سے آگے اختری

بسنتی ساڑی باندھے، نہایت سج دھج سے خراماں خراماں قدم اٹھاتی۔ اُس کے جلو میں دوسری طوائفیں ہوتیں۔

گاگر کا جلوس، گول دروازے سے نکل کر وکٹوریہ پارک کے سامنے پہنچتا۔ سڑک پر تماش بینوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ نظر آتے۔ جدھر نگاہ جاتی سر ہی سر دکھائی دیتے شاہ مینا کے مزار تک فاصلہ نصف میل سے زیادہ نہیں مگر اس قدر اژدحام ہوتا کہ جب گاگر درگاہ کے پھاٹک پر پہنچتی تو شام ہو جاتی، چراغ روشن ہو جاتے۔ درگاہ کے اندر اور باہر زائرین اور عقیدت مندوں کے ہجوم کا یہ عالم ہوتا کہ کھوے سے کھوا چھلتا۔

پھاٹک پر پہنچ کر شہنائی کے سُر خاموش ہو جاتے۔ اختری کھنکار کر گلا صاف کرتی پھر ڈھول اور دوسرے سازوں کی سنگت پر اونچے سُروں میں قوالی کی دُھن میں عارفانہ کلام کے بول ادا کرتی۔ اختری کی شکل و صورت تو اچھی نہ تھی۔ سانولا رنگ تھا، ناک نقشہ بھی بھدا تھا مگر بڑی بڑی روشن آنکھوں میں ستارے جھلملاتے۔ گلے میں گھونگھروں کا چھناکا ہوتا۔ وہ اپنی پاٹ دار سُریلی آواز میں قوالی گاتی۔ دوسری طوائفیں اس کی ہم نوائی کرتیں۔

اس دھوم دھام سے گاگر کا جلوس، درگاہ کے اندر داخل ہوتا۔ ٹھہر ٹھہر کر مزار کی جانب بڑھتا۔ قریب پہنچتا تو قوالی بند ہو جاتی۔ مجاوروں کی مدد سے گاگر کو چوکی سے اُتارا جاتا اور مزار کے قریب پہنچا دیا جاتا۔ اختری اپنی دو نوچیوں کے ہمراہ جُوتیاں اُتار کر مزار کے قریب برہنہ پا جاتی۔ گاگر اُٹھا کر مزار پر پانی ڈالا جاتا اختری اُسے اپنے ہاتھ سے غسل دیتی۔ سُنا ہے کہ سالہا سال قبل اختری کے خاندان کی کسی طوائف نے گاگر چڑھانے کی منّت مانی تھی۔ اُس کی مُراد بر آئی۔ تب سے ہر سال بسنت کی نوچندی پر گاگر چڑھائی جاتی۔ گاگر کے ساتھ ٹوکروں میں مٹھائی اور ہار، پھول ہوتے۔ ان ٹوکروں کے ساتھ اختری دونوں ہاتھوں پر سو روپے رکھ کر نذرانہ بھی پیش کرتی۔

گاگر چڑھنے کے بعد زائرین کا ہجوم بڑھتا ہی جاتا۔ اس ہجوم میں طنّاز اور عشوہ طراز طوائفیں نمایاں ہوتیں۔ ان کے عشّاق اور چاہنے والے پروانوں کی مانند ادھر ادھر منڈلاتے۔ ایک ایک ادا پر قربان ہوتے۔ کبھی آہ کرتے کبھی واہ۔

پھول والوں اور مٹھائی والوں کی دکانوں پر سب سے زیادہ بھیڑ ہوتی۔ زائرین ہاتھوں میں پھولوں اور مٹھائی کے دونے سنبھالے، ہجوم سے بچتے بچاتے، مزار کے قریب پہنچتے، چادریں چڑھاتے، چراغ دیتے، شیرینی کے ساتھ ساتھ نقد نذرانے پیش کرتے، منّتیں مانتے، تبرّکات حاصل کرنے کی کوشش کرتے، مریضوں کو بیماری سے شفا کے لئے، مزار کی خاک چٹاتے۔

قوّال لہک لہک کر قوالی گاتے۔ سامعین پر وجد طاری ہو جاتا، کوئی جھومتا، کوئی عالم محویت میں ہوتا، کوئی بے قرار ہو کر "حق اللہ" کی صدا بلند کرتا۔ ایک کے بعد قوّالوں کی دوسری ٹولی آتی، اپنے کمال فن کا مظاہرہ کرتی، گرمیٔ محفل کو سوا کرنے کی کوشش کرتی۔ صبح تک یہ سلسلہ جاری رہتا۔ بسنت کی نوچندی پر ہر سال اسی دھوم دھام سے محفل سماع کا اہتمام ہوتا تھا۔

ماگھ کی مدماتی ہوا، فرّاٹے بھرتی ہوئی چل رہی تھی۔ ہر طرف بسنتی رنگ بکھرا ہوا تھا۔ کہیں بسنتی آنچل لہرا رہے تھے، کہیں مکانوں کے صدر دروازوں پر گیندے کے زرد زرد پھول جھول رہے تھے، جن کو آم کے پتّوں کے ساتھ گوندھ کر شگون کے طور پر لٹکایا جاتا تھا۔ فضا رنگ و بو میں ڈوبی ہوئی تھی۔ لکھنؤ میں ہر سو بسنت کی بہار تھی۔

(۲)

بارہ دری میں سورج غروب ہونے سے پہلے ہی غروب ہو جاتا تھا۔ دن ڈھلتے ہی دھوپ، فصیل نما اونچی اونچی دیواروں کی بلندی پر پہنچ جاتی تھی۔ سائے اب پھیل کر طویل ہو گئے تھے۔ سہ پہر کی مضمحل خاموشی میں بارہ دری سنسان نظر آ رہی

تھی۔ نہ کوئی چہل پہل تھی نہ گہما گہمی۔ نہ کوئی آہٹ تھی نہ آواز۔ دالانوں کے اُونچے اُونچے ستون سر اُٹھائے، دم بخود کھڑے تھے۔ محرابوں کے نیچے گہرا سکوت طاری تھا۔ صحن میں مولسری کے پھول، دُور دُور تک بکھرے ہوئے تھے۔ ہوا کے جھونکوں کے ساتھ بھینی بھینی خوشبو اُٹھتی اور ہر طرف پھیل جاتی۔

یہ بارہ دری کی حرم سرا تھی۔ بارہ دری کسی زمانے میں ملکہ زمانی کے بیٹے مرزا امجد علی کیوان جاہ کی محل سرا تھی۔ اب ان کے وُرثا کی ملکیت تھی۔ اور بارہ دری کہلاتی تھی۔ پوری بارہ دری خاصے وسیع رقبے میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس میں ایک نہیں کئی عمارتیں تھیں۔ چاروں طرف قدِ آدم پختہ چاردیواری تھی جس کے اندر بہت بڑا احاطہ تھا۔ احاطے کا پھاٹک اتنا بلند تھا کہ اس میں ہاتھی داخل ہوسکتا تھا پھاٹک کے کواڑ تھے تو لکڑی کے مگر نہایت مضبوط۔ دُکاریں دونوں رُخوں پر کرسی دے کر مختصر چبوترے تھے۔ چبوتروں کے اُوپر سائبان کی طرح جھکے ہوئے چھجّے تھے۔ چھجوں کی بلندی پر نیم دائرے میں دو مچھلیاں تھیں جن کو نہایت نفاست اور ہنرمندی سے بنایا گیا تھا۔ ان چبوتروں پر ہر صبح شام دو مسلح پہریدار تعینات رہتے۔ مگر اب عرصہ دراز سے چبوترے خالی پڑے تھے۔ کبھی کبھار کوئی راہگیر دھوپ یا بارش سے بچنے کے لئے دم کے دم بیٹھ جاتا اور پھر اپنی راہ لیتا۔

پھاٹک عام طور پر بند ہی رہتا تھا۔ صرف خاص خاص موقعوں پر کھولا جاتا تھا۔ آمد و رفت کے لئے پھاٹک کے ایک کواڑ میں مختصر سا دروازہ تھا جو دن بھر کھلا رہتا۔ مگر پہر رات گزرتے ہی بند کر دیا جاتا۔ پھاٹک کے اندر ہر وقت دربان موجود رہتے۔

پھاٹک کی چھت پر خاصہ کشادہ کمرہ تھا جس کے دریچے بیرونی رُخ پر کھلتے تھے۔ یہ بارہ دری کا نوبت خانہ تھا۔ ایک زمانہ تھا جب ہر وقت نوبت بجانے والے موجود رہتے تھے ہر پہر کے بعد نقّارے پر چوٹ پڑتی اور نوبت بجا کر وقت کا اعلان کیا جاتا۔ دن رات کے آٹھوں پہر اسی طرح نوبت بجتی تھی۔ مگر اب نوبت

خانے میں نہ نوبت تھی اور نہ اس کو بجانے والے تھے۔ صرف نوبت خانے کا نام رہ گیا تھا۔ اُس میں ڈیوڑھی کے دربان بیٹھے، حقہ گُڑگُڑایا کرتے۔ ویسے دربانوں اور کہاروں کی رہائش کے لئے پھاٹک کے اندر، ڈیوڑھی میں دونوں طرف کوٹھریاں بنی ہوئی تھیں

ڈیوڑھی کے سامنے چار دیواری کے اندر، دُور تک کھُلی جگہ تھی۔ ڈیوڑھی سے متصل ایک سلسلے سے بارہ دری کے دوسرے ملازمین کے رہنے کے لئے کوٹھریاں تھیں۔ آگے بڑھ کر دیوان خانے کی ایک منزلہ عمارت تھی۔ دیوان خانے میں ایک طویل اور کُشادہ کمرہ تھا جو نشست کے لئے تھا۔ اس کمرے کے پہلو میں جو کمرہ تھا، وہ خواب گاہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ خواب گاہ سے متصل غسل خانہ تھا۔ بغلی پچھی تھی کمروں کے آگے طویل والان تھا۔ دالان کے سامنے صحن تھا۔ وسط میں کرسی دے کر پختہ شہ نشین تھی جو گرمیوں میں غروب آفتاب کے بعد استعمال میں آتی تھی۔ اس شہ نشین پر رات، رات بھر محفل آرائیاں ہوتی تھیں۔

دیوان خانے کے ارد گرد دُور تک پھیلا ہوا پائیں باغ تھا۔ باغ میں سنگ مرمر کا خوبصورت حوض تھا۔ پھولوں کے تختے تھے۔ روشیں تھیں۔ گھنے اور سایہ دار درخت تھے جن میں نیم اور برگد کے علاوہ میوے دار درخت بھی تھے۔

دیوان خانے سے ملی ہوئی ایک اور عمارت تھی۔ یہ مہمان خانہ تھا جس میں بیرون شہر سے آنے والے مہمانوں کے قیام کے لئے کمرے تھے۔ کمروں کے آگے کھپریل کی چھت کے سائبان تھے۔ غسل خانہ تھا۔ باورچی خانہ تھا۔

احاطے کے ایک ویران گوشے میں خاندانی قبرستان تھا۔ کتنی ہی قبریں ٹوٹ پھوٹ کر برابر ہو گئی تھیں۔ جن کے آثار باقی تھے اُن کی حالت بھی ابتر تھی۔ جگہ جگہ جنگلی پودوں کی جھاڑیاں تھیں۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ قبرستان کی جانب عرصہ دراز سے کسی نے توجہ نہیں دی تھی۔

دیوان خانے سے تھوڑے ہی فاصلے پر زنان خانہ تھا۔ زنانی ڈیوڑھی تھی تو خاصی بڑی اور اُونچی مگر اُس کے اوپر صرف منڈیر تھی۔ اس ڈیوڑھی کا دروازہ

بھی زیادہ بلند نہ تھا۔ مگر اتنا بڑا تھا کہ فینس اور چوپہلا نہایت آسانی سے اندر جا سکتا تھا۔ ڈیوڑھی کے قریب سے احاطے کی ایک دیوار گزرتی تھی۔ ڈیوڑھی اور دیوار کے درمیان ایک پتلی گلی تھی۔ ڈیوڑھی کا اندرونی دروازہ صحن میں کھلتا تھا۔ دروازے کے پہلو میں محل دارنی کی کوٹھری تھی۔ مگر اب یہ کوٹھری خالی پڑی تھی۔ الفت آخری محل دارنی تھی۔ اس کے انتقال کے بعد کسی اور کو محل دارنی مقرر نہیں کیا گیا۔ محل سرا یا زنان خانے کا صحن کچّا تھا مگر بہت وسیع تھا۔ اس میں جگہ جگہ گیندے اور گل چاندنی کے پودوں کی کیاریاں تھیں۔ چنبیلی کی گھنی بیل تھی جو دیوار پر چڑھتی ہوئی چھت تک چلی گئی تھی۔ ایک کونے میں مولسری کا اونچا اور گھنا درخت تھا۔ قریب ہی کنواں تھا جواب بند کر دیا گیا تھا۔ ایک گوشے میں پختہ حوض بھی تھا۔

صحن کے ایک طرف خواصوں اور دوسری خادماؤں کے لئے کوٹھریاں اور صحنچیاں تھیں۔ دوسری طرف توشک خانہ، مودی خانہ، باورچی خانہ اور غسل خانہ تھا۔ باورچی خانے اور غسل خانے کے درمیان ایک کھلی سہ دری تھی۔ مغربی رخ بردالان در دالان تھے۔ دالان بہت بلند تھے اور ان کی محرابیں بھی بڑی بڑی تھیں۔ دالان کے آگے اونچی شہ نشیں تھی۔

☆

دھوپ ابھی تک منڈیروں پر جھلک رہی تھی۔ مگر بارہ دری میں زندگی کی کوئی چہل پہل نظر نہ آتی تھی۔ ماما ئیں اور خادمائیں اپنی اپنی کوٹھریوں، صحنچیوں، سہ دریوں میں پڑی بے خبر سو رہی تھیں۔ البتہ مغلانی خستہ بیگم، نہ صرف جاگ رہی تھیں بلکہ بیرونی دالان کی ایک صحنچی میں بیٹھی، دیر سے پائنچے کی کلیاں ترپ رہی تھیں۔ وہ وقفے وقفے سے نجّو کو پکارتیں اور پھر پائنچے کی ادھیڑ بُن میں کھو جاتیں۔

نجّو نے ایک بار بھی مغلانی کے پکارنے پر جواب نہ دیا تھا۔ صرف پلٹ کر دروازے کی جانب چوکنّا نظروں سے دیکھ لیتی۔ نجّو کا نام تو نجمہ تھا۔ مگر بگڑ کر نجّو پڑ گیا تھا۔ وہ نہ جانے کب ڈیوڑھی میں پہنچی تھی۔ ڈیوڑھی کا بیرونی دروازہ بند تھا۔ روشنی بھی

دھندلی دھندلی تھی۔ ڈیوڑھی کی ایک دیوار میں موکھا تھا جو گلی کی سمت کھلتا تھا۔ آگے احاطے کی دیوار تھی۔ اس کا ایک حصّہ پچھلی برسات میں اس طرح منہدم ہوگیا تھا کہ چار دیواری کے باہر کا علاقہ صاف نظر آتا تھا۔

بجّو موکھے سے آنکھیں لگائے باہر دیکھ رہی تھی۔ ٹوٹی ہوئی دیوار کے دوسری جانب مختصر سا کچّا میدان تھا۔ میدان کے اس پار باقر نواب کا عالی شان مکان تھا۔ لیکن بارہ دری کے مقابلے میں کمتر تھا۔ اُن کی ڈیوڑھی پر نوبت خانہ بھی تھا۔ البتہ پھاٹک کے سامنے لمبی لمبی بلّیاں کھڑی کر کے مچان بنائی گئی تھی۔ بلّیوں پر سُرخ ٹول لپٹا ہُوا تھا اور مچان کو بھی سُرخ کپڑے پر رو پہلی جھالر لگا کر خوش نما بنایا گیا تھا۔ مچان پر روشن چوکی رکھی گئی تھی۔ روشن چوکی بجانے والوں میں دو شہنائی نواز تھے اور ایک طبلچی تھا جس کی کمر کے گرد دو چھوٹے چھوٹے طبلے بندھے تھے۔ شہنائی نواز سُر نکالتے تھے اور طبلچی جھوم جھوم کر سنگت دیتا تھا۔

شہنائی کی سُریلی آواز، دُور تک سُنائی دے رہی تھی۔ باقر نواب کے گھر کے سامنے خوب چہل پہل تھی۔ اُن کی منجھلی بیٹی مہر عالم کی شادی تھی۔ برات فیض آباد سے آئی تھی اور رات ہی کو پہنچ گئی تھی۔ مکان کے دیوان خانے میں ٹھہرائی گئی تھی جہاں براتیوں کے آرام و آسائش کے لئے ہر طرح کی سہولت کا پورا پورا انتظام کیا گیا تھا۔

دونوں گھرانوں میں قرابت داری کے باوجود سخت ان بن اور ناچاقی تھی۔ بات بھی ناچاقی کی تھی۔ جائیداد کے بٹوارے کے سلسلے میں نواب تقی کی اپنے سوتیلے بھائی نواب صفی سے مقدمے بازی ہو رہی تھی۔ باقر نواب کے مختار کار، میر جعفّن نے فریق مخالف کے حق میں گواہی دی تھی اور ثقہ راویوں کے مطابق باقر نواب کی شہ پر دی تھی۔ اس کی تصدیق اس طور ہُوئی کہ بار بار احتجاج کرنے پر بھی میر جعفّن ہر پیشی پر گواہی کے لئے کچہری میں نہایت مستعدی سے حاضری دیتے۔ اُن کی گواہی اس حیثیت سے زیادہ اہم تھی کہ وہ ایک عرصے تک نواب تقی کے والد مرحوم کے مصاحب

خاص رہ چکے تھے۔ مقدمے نے طول کھینچا۔ بات اتنی بڑھی کہ آنا جانا، دعا سلام، حقّہ بخرا، سب منقطع ہو گیا۔ یہی وجہ تھی کہ شادی کا بُلاوا آنے پر بھی بارہ دری سے کوئی شریک نہ ہوا بلکہ مانجھے کی پینڈیاں بھی واپس کر دی گئی تھیں۔

نکاح تو چاشت کے وقت ہی ہو چکا تھا۔ برات کو کھانا بھی کھلایا جا چکا تھا مگر ابھی رُخصتی نہیں ہوئی تھی، دولہا زنان خانے میں تھا اور سالیوں کی چھیڑ چھاڑ کا نشانہ بنا ہوا تھا۔ طرح طرح کی رسمیں ادا کی جا رہی تھیں۔

سب سے پہلے اُسے دُلہن کی ہتھیلی پر رکھی ہوئی تل شکری چاٹنا پڑی پھر ایک رحل پر رکھا ہوا قرآن مجید آیا، دولہا دُلہن کے سروں پر چادر ڈال کر پردہ کیا گیا دونوں کے درمیان آئینہ رکھا گیا تا کہ وہ ایک دوسرے کی شکل دیکھ لیں۔ ایک ڈومنی سر پر کھڑی دولہا کو یہ کہنے پر مجبور کر رہی تھی "بیوی آنکھیں کھولو۔ میں تمہارا غلام" دولہا سے جو کہا جا رہا تھا، کہہ رہا تھا۔ یہ آرسی مصحف کی رسم تھی۔ اس کے بعد اُسے دلہن کے پاجامے کے نیفے میں کمر بند ڈال کر ناز برداری بلکہ زندگی بھر غلامی کرنے کا برملا اظہار کرنا تھا۔ یہ اور نہ جانے ایسی کتنی رسمیں تھیں، کچھ ادا ہو چکی تھیں اور کچھ ادا ہونا باقی تھیں۔

ادھر براتی تھے کہ اُکتائے ہوئے پھر رہے تھے۔ رُخصتی کے لئے ضروری انتظام کر رہے تھے۔ دُلہن کے لئے فینس آ چکی تھی۔ اُسے نہایت سلیقے سے سجایا گیا تھا۔ اس پر سُرخ مخمل کا کارچوبی چھتکا پڑا تھا۔ کہار، ڈیوڑھی کے سامنے چبوترے پر بیٹھے مزے سے چلم پر دم لگا رہے تھے۔ زنان خانے سے عورتوں اور بچّوں کے بولنے کی ملی جُلی آوازیں اُبھر رہی تھیں۔

شہدے دوپہر ہی کو آ گئے تھے۔ وہ غمی کے موقع پر میّت کا تابوت اٹھاتے تھے اور اس کا معاوضہ لیتے تھے۔ شادی بیاہ کی تقریبات پر "مبارک سلامت" کی صدائیں لگاتے تھے اور انعام و اکرام پاتے تھے۔ دلہن کی فینس پر جو روپیہ پیسہ نچھاور کیا جاتا تھا اسے لوٹتے تھے یہی ان کا ذریعہ معاش تھا۔

شہدوں کو ابھی تک کچھ نہیں ملا تھا۔ رُخصتی میں تاخیر ہوئی تو اُن کی بے قراری بڑھی۔ شام قریب آ رہی تھی۔ انہیں نوچندی کے میلے میں جانا تھا۔ وہ ڈیوڑھی کے بڑے پھاٹک کے سامنے اکٹھا ہو کر بار، بار شور مچاتے۔

"دولہا میاں کو چاند سی دُلہن مبارک"۔

"مبارک سلامت"۔

"دُولہا کے ابّا جان کو لاڈلے بیٹے کا سہرا مبارک"۔

"مبارک سلامت"۔

شہدے آخر شہدے ٹھہرے۔ بیچ بیچ میں پھبتی بھی کس جاتے۔ "اماں برات رخصت کرو مینہہ برسنے والا ہے"۔

"دُولہا نے پتیلی میں کھایا ہے"۔

"سر مُنڈایا ہے تو اولے بھی پڑیں گے"۔

ڈر کے مارے کوئی اُنہیں ڈانٹنے کی کوشش بھی نہ کرتا۔ ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ جائیں گے۔ ایک بار دُلہن والوں کی جانب سے کسی نوجوان نے انہیں شور مچانے سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ پھر کیا تھا اُس کے سر ہو گئے۔ ایسی بے نقط سُنائیں کہ بے چارا، اُن کے نرغے سے جان بچا کر بھاگا۔ لیکن شہدوں نے اُسے نہ بخشا۔ برابر چھیڑتے رہے، آوازے کستے رہے۔

"ابے، بولو! سالا ہے، بھئی، سالا ہے"۔

"نخرے میں اس کے گرم مصالحہ ہے"۔

"ساری خُدائی ایک طرف"۔

"جورُو کا بھائی ایک طرف"۔

"لینا، لپک کے، طاق سے ڈبیا افیم کی"۔

"ناک دھنا دھن۔ ناچے گا بھئی، ناچے گا"۔

انہوں نے اس قدر شور برپا کیا کہ سارا محلّہ گونج اُٹھا، پاس پڑوس کے

کچھ آوارہ لڑکے بھی گھروں سے نکل نکل کر وہاں آگئے تھے اور غول بنا کر شہدوں کے ساتھ چیخ چلّا رہے تھے، ٹھٹھول کر رہے تھے۔ وہ ہنگامہ برپا ہوا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی۔

سائے اور طویل ہو گئے۔ آسمان پر چھائے ہوئے خاکستری غبار کا جال ہلکا ہلکا سُرمئی ہونے لگا۔ یکایک شہنائی کے سُر مدھم ہو کر خاموش ہو گئے۔ ساری آوازیں تحلیل ہو کر مکھیوں کی بھنبھناہٹ معلوم ہونے لگیں۔ پھر ان ڈوبتی اور اُبھرتی آوازوں کے درمیان سارنگیئے نے گز ہاتھ میں سنبھال کر، سارنگی کے تار چھیڑے۔ سارنگی سے ایسے سُر پھوٹنے لگے جن میں سوز تھا، دبا دبا حُزن و ملال تھا۔ ڈھاڑیوں نے جو شادی بیاہ کے موقعوں پر خاص طور سے بُلائے جاتے تھے، سارنگی کی سنگت پر امیر خسرو کا مشہور منڈھا، مدھم سُروں میں چھیڑا۔

ہرے ہرے بانس کٹا، مورے بابل
نیکا منڈھا چھوائے رے
پربت بانس منگا مورے بابل

یہ رُخصتی کا گیت تھا۔ گیت کے بول دھیرے دھیرے اُونچے ہوتے گئے۔ ڈھاڑی سوز کی دُھن پر بابل گاتے رہے۔ چہروں پر غم کے سائے منڈلانے لگے۔ زنان خانے سے عورتوں کے رونے اور سسکیاں بھرنے کی آوازیں اُبھرنے لگیں۔

☆

نجّو، موکھے سے لگی کھڑی تھی۔ اُس کی نظریں باقر نواب کی ڈیوڑھی کی جانب لگی تھیں۔ اُس کا انہماک رفتہ رفتہ بڑھتا جا رہا تھا۔ بابل کے پُرسوز بول سُن کر وہ بھی شدّت سے متاثر ہوئی۔ اُس نے ٹھنڈی سانس بھری اور دوپٹے کے آنچل سے آنکھیں پونچھتے ہوئے سوچنے لگی۔ ہائے، ذرا دیر بعد مہر عالم، پرائے گھر کی ہو جائے گی، ماں، باپ، بہن، بھائی، گھر بار، پاس پڑوس سب چھوٹ کر

برائے ہو جائیں گے۔

اُس نے بے چین ہو کر چہرہ موکھے سے بالکل ملا دیا۔ اس کی بے قرار نظریں مہر عالم کے دولہا کو تلاش کر رہی تھیں۔ مگر وہ ابھی ڈیوڑھی سے باہر نہیں آیا تھا۔ اسی شوق اور تجسس میں اتنی دیر سے ڈیوڑھی میں موکھے سے لگی کھڑی تھی کہ اب تو اُس کی ٹانگیں بھی دُکھنے لگی تھیں۔

عین اُسی وقت صحن میں آہٹ ہوئی۔ طلعت آرا ایک سہ دری سے گزر کر باہر آئی۔ وہ ذرا ہی دیر پہلے نہا کر حمام سے نکلی تھی۔ اس کے بال ابھی تک نم تھے اور شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ وہ سفید اُونی شال اوڑھے ہوئے تھی۔ گلے میں بسنتی دوپٹہ لٹک رہا تھا جس نے طلعت آرا کے رُخساروں پر گیندے کے پھول کھلا دیئے تھے۔

وہ سردی سے ہولے ہولے کپکپاتی، آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتی، صحن میں آگئی۔ مولسری کے خشک پتے، اُس کے پیروں کے نیچے چرمرا کر ہلکی ہلکی آہٹ پیدا کر رہے تھے۔ سامنے کے دالان کی محراب میں ابابیل کا ایک جوڑا۔ اپنے گھونسلے کے آس پاس تیزی سے چکر کاٹ رہا تھا۔ طلعت آرا نے گردن کو خم دے کر اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ اس سناٹے سے فوراً اندازہ ہو گیا کہ امّاں جان جن کو حضور بیگم کہا جاتا تھا ملکہ زمانی کی کربلا جا چکی ہیں۔ اب تو عزا خانے سے تابوت بھی نکل چکا ہو گا۔ جہاں بیٹھیں قتل گاہ کے سامنے تیز تیز ہاتھوں سے ماتم کر رہی ہوں گی۔

باقر نواب کے دیوان خانے میں ڈھاڑی، بابل گا رہے تھے۔ گیت کے بول فضا میں گُونج رہے تھے۔ طلعت آرا نے بھی بابل سُنا۔ دل کو ٹھیس لگی۔ مُڑ کر صحنچی میں بیٹھی ہوئی مُغلانی کو دیکھا۔ وہ سر جھکائے ابھی تک پائنچے کی کلیاں تُرپنے میں محو تھیں۔

بابل سُن کر طلعت آرا نے محسوس کیا کہ مہر عالم کی رُخصتی کا وقت قریب آگیا ہے۔ اُس کی مشتاق آنکھیں ڈیوڑھی کی جانب اُٹھ گئیں۔ ساتھ ساتھ قدم بھی اسی

جانب اُٹھنے لگے۔ وہ ہولے ہولے چلتی ہوئی ڈیوڑھی میں داخل ہوگئی۔

نجّو نے عقب میں چاپ سُنی تو جلدی سے پلٹ کر دیکھا۔ طلعت آرا اُس کے سامنے کھڑی تھی۔ نجّو نے حیران ہوکر کہا۔ "ہائے اللہ!" اُس کی آنکھوں سے سراسیمگی جھلکنے لگی۔ "چھوٹی سرکار! آپ یہاں کیسے آگئیں؟" نجّو کو اچھی طرح علم تھا کہ طلعت آرا کو ڈیوڑھی میں آنے کی مطلق اجازت نہ تھی۔ وہ بھولے سے بھی اس طرف کا رُخ نہیں کرسکتی تھی۔

"اے، تو اس میں کیا ہو گیا؟" طلعت آرا کھسیانی سی ہوگئی۔ "ذری ہم بھی برات رُخصت ہوتے دیکھ لیں"۔

"نہیں، چھوٹی سرکار! میں، آپ کے آگے ہاتھ جوڑتی ہُوں"۔ نجّو نے گڑگڑاتے ہُوئے طلعت آرا کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔ "آپ اندر چلی جائیں۔ بڑی سرکار کے کان میں بھنک بھی پڑ گئی تو قیامت آجائے گی۔ ساری آفت مجھ پر نازل ہوگی۔ بڑی سرکار کا غصّہ تو آپ جانتی ہی ہیں"۔

طلعت آرا بھی کچھ خائف ہوگئی۔ ماں کے غصّے سے اس کا بھی دل دہلتا تھا لیکن برات کی رُخصتی دیکھنے کا اشتیاق کم نہ ہُوا۔ آہستہ سے بولی۔ "اچھا تو آؤ، ایسا کریں۔ آؤ، پر چھت پر چلتے ہیں"۔ اس دفعہ وہ بے نیازی سے مُسکرائی۔ "ابھی پہر دن رہتا ہے۔ چھت پر دھوپ ہوگی۔ دھوپ میں بال بھی سُکھا لیں گے۔ برات بھی وہاں سے اچھی طرح دکھائی دے گی۔ ٹھیک ہے نا؟"

"ہائے اللہ! آج آپ کو کیا ہوگیا ہے"؟ نجّو نے خوف زدہ نظروں سے طلعت آرا کی جانب دیکھا۔ دونوں کان، اُنگلیوں سے پکڑ کر انکار میں اِدھر اُدھر گردن ہلائی۔ "بھلا چھت پر کوئی جاتا بھی ہے اور آج تو آپ کو خبر ہی ہے کہ نوچندی جمعرات ہے"۔

نجّو واقعی دہشت زدہ ہوگئی تھی۔ بات بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ بارہ دری میں رہنے والے سب ہی بالائی منزل کے نام سے تھرّاتے تھے۔ اس کے بارے میں

طرح طرح کی پُراسرار داستانیں مشہور تھیں۔ جتنے مُنہ اتنی ہی باتیں۔

(۳)

بارہ دری کی بالائی منزل پر دو کمرے تھے۔ ایک خوب کشادہ تھا، دوسرا قدرے چھوٹا تھا۔ کمروں کے آگے نیچی چھت کا طویل سائبان تھا۔ سائبان کے کھلے دروں کی محرابوں میں بھی ابابیلوں نے جگہ جگہ گھونسلے بنا رکھے تھے جو تمام دن اُس کے اردگرد منڈلاتی رہتی تھیں۔

بارہ دری سے متصل، عشرت منزل تھی۔ کسی زمانے میں عشرت منزل بھی بارہ دری کا ایک حصّہ تھی اور عالی شان عمارت تھی۔ مگر اب ویران پڑی تھی، عرصہ دراز سے نہ اُس پر سفیدی ہوئی تھی، نہ مرمت۔ دیواروں پر کائی کی اتنی تہیں جم گئی تھیں کہ اُن کا رنگ اُڑ کر کالا ہی ہو گیا تھا۔ دروازوں کے کتنے ہی کواڑوں میں دیمک لگ گئی تھی۔ ایک دالان اور صحنچی کا کچھ حصّہ شدید بارشوں میں منہدم ہو کر ملبے کا ڈھیر بن گیا تھا۔ صحن میں جگہ جگہ کُوڑا کرکٹ جمع تھا۔ اس کے حقِ ملکیت کے بارے میں ایک مُدّت سے مقدمے بازی ہو رہی تھی۔ لہٰذا کوئی دیکھ بھال کرنے والا بھی نہ تھا۔

بالائی منزل بھی عشرت منزل کی طرح ویران اور اُجاڑ تھی۔ برآمدے کی چھت جگہ جگہ سے ٹوٹ پھوٹ گئی تھی۔ بارش ہوتی تو چھت چھلنی کی مانند ٹپکتی۔ برآمدے کے آگے طویل اور کشادہ مہتابی تھی۔ مہتابی، کرسی دے کر فرش سے اتنی اونچی بنائی گئی تھی کہ اُوپر پہنچنے کے لئے دو سیڑھیاں طے کرنا پڑتی تھیں۔ مہتابی کے ارد گرد حصار کی صورت میں سنگِ مرمر کی مضبوط جالی کا کٹہرا تھا۔ لیکن یہ جالی بھی ایک طرف سے ٹوٹ گئی تھی۔

دُور دُور تک پھیلی ہوئی چٹیل چھت تھی۔ چھت کے تین طرف اُونچی اُونچی دیواریں تھیں تاکہ بے پردگی نہ ہو۔ چھت کا پلاستر کہیں کہیں سے اُکھڑ گیا تھا مگر

چھت ابھی تک کہیں سے نہیں ٹپکتی تھی البتہ ایک دیوار میں دراڑ پڑ گئی تھی موسلادھار بارش ہوتی تو اس کے دھڑام سے گرنے کا دھڑکا لگا رہتا۔

بالائی منزل کے کمروں میں بڑے نواب صاحب کا ساز و سامان ابھی تک رکھا تھا۔ اُن کا نام تو نواب محمد تقی تھا۔ لیکن مردانے اور زنان خانے، ہر جگہ بڑے نواب صاحب کے نام سے یاد کیے جاتے تھے۔ خاندانی رئیس تھے۔ جائیداد تھی۔ وثیقہ بھی معقول پانے تھے۔ بیگم بھی بڑے گھر کی تھیں۔ اُن کا وثیقہ، نواب صاحب سے کچھ زیادہ ہی تھا۔ جہیز میں قیمتی زیورات اور جواہر کے علاوہ کئی عالی شان مکانات بھی لائی تھیں۔ اُن میں بارہ دری بھی شامل تھی۔ اس جائیداد کے علاوہ کئی گاؤں بھی اُن کی ملکیت میں تھے۔ بڑے نواب صاحب اسی باعث بیوی سے دبتے بھی تھے وہ حضور بیگم کہلاتی تھیں۔ پوری بارہ دری پر اُن کی حکمرانی چلتی تھی۔ اُن کے طنطنے کا یہ عالم تھا کہ کسی ملازم یا خدمت گار سے ناراض ہوتیں تو کھڑے کھڑے نکال باہر کرتیں۔

موسم گرما میں بڑے نواب صاحب رات کو اُوپر کی منزل پر استراحت فرماتے تھے۔ پہلے اُن کا بیشتر وقت دیوان خانے میں گزرتا تھا۔ راتیں بھی وہیں بسر ہوتی تھیں۔ نواب صاحب ذوق سلیم رکھتے تھے۔ فنون لطیفہ سے گہرا شغف تھا۔ موسیقی کے رسیا تھے مگر اب طوائف کے بالاخانے پر نہ جاتے تھے۔ طوائف کو بارہ دری میں بُلا لیتے۔ بے تکلف احباب کو بھی مدعو کرتے اور ذوق و شوق سے مُجرا سُنتے۔ حضور بیگم نے موسیقی کی ان محفلوں پر ناک بھوں چڑھائی، خفگی کا اظہار کیا تو اُن کی خوشنودی کی خاطر یہ سلسلہ بند کر دیا۔ البتہ کسی شناسا رئیس کی محل سرا میں مُجرا ہوتا اور اصرار کیا جاتا تو اُس میں شرکت کر لیتے تھے۔

شاعری سے بھی دلچسپی تھی۔ ایک سکّہ بند شاعر قتیل لکھنوی، ان کے خاص مصاحبین میں شامل تھے۔ انعام و اکرام کے علاوہ معقول مشاہرہ بھی پاتے تھے نواب تقی خود تو شعر نہ کہتے تھے لیکن ہفتے دو ہفتے بعد محفل مشاعرہ کا اہتمام کرتے

تھے۔ بہت اچھے سخن فہم تھے۔ اچھے شعر کو سمجھتے تھے اور دل کھول کر داد دیتے تھے۔ پچیسی اور گنجفہ بھی کھیلتے تھے۔ مگر شطرنج کے ایسے شوقین تھے کہ رات رات بھر بساط بچھی رہتی۔ انہماک کا یہ عالم ہوتا کہ وقت کا بالکل احساس نہ رہتا۔ ویسے بھی وقت کی اُن کے لئے کوئی قدر و قیمت نہ تھی۔ اللہ نے کھانے پینے کو بافراط دے رکھا تھا۔ فراغت ہی فراغت تھی۔ رات دن محفل آرائی ہوتی۔ مصاحبین اور مقرّبین کا جمگھٹا رہتا دونوں وقت دسترخوان، دیوان خانے میں بچھتا تھا اور کبھی ایسا نہ ہُوا کہ دسترخوان پر دس پندرہ افراد موجود نہ ہوں۔ مردانے کا باورچی خانہ بھی علیحدہ تھا۔ باورچی بھی ایسا باکمال رکھا تھا کہ کھانے میں ہر روز نت نئی اختراع اور ندرت پیدا کرتا اور ہر کھانا اتنا خوش ذائقہ اور لذیذ ہوتا کہ داد و تحسین کے علاوہ اکثر انعام و اکرام بھی پاتا۔

☆

عیش و نشاط کی ہنگامہ خیز محفل آرائیاں اپنے عُروج پر تھیں کہ اس اثنا میں ایک خاندانی تنازعہ پیدا ہُوا۔ اُس نے ایسی شدت اختیار کی کہ دن کا چین اور رات کی نیند حرام ہوگئی۔ نواب تقی کی آبائی جائیداد اور املاک مشترکہ تھی۔ اُن کے دو بڑے بھائی تھے اور ایک بہن تھی۔ بہن نواب تقی سے چھوٹی تھی۔ تینوں بہن بھائی سوتیلے تھے۔ نواب تقی اپنی والدہ کی اکلوتی اولاد تھے۔

عرصہ دراز تک نواب تقی کے تعلقات، بھائیوں اور بہن سے اس قدر خوشگوار رہے کہ سگے سوتیلے کا فرق مطلق محسوس نہ ہوتا تھا۔ جب تک سب سے بڑے بھائی نواب محمد ذکی حیات رہے، یہ خوش گوار تعلقات برقرار رہے مگر اُن کی آنکھیں بند ہوتے ہی خاندان کا شیرازہ بکھرنے لگا۔ ایسی نفسا نفسی اور آپا دھاپی پیدا ہوئی کہ ہر ایک کو اپنی فکر دامن گیر ہوگئی۔

نواب ذکی جس قدر بُردبار، کنبہ پرور اور فراخدل تھے، چھوٹے بھائی نواب صفی اُسی قدر تنگ دل، سفلے اور کائیاں تھے۔ رہتے بھی بدقماشوں اور اوباشوں کی صحبت میں تھے۔ ایک طوائف تو مستقل اُن کی مُلازمت میں رہتی تھی۔ اس کے علاوہ

کئی دوسری طوائفوں سے بھی مراسم تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ اور بھی ایسے ہی کئی رئیسانہ شوق پال رکھے تھے۔ نواب ذکی چھوٹے بھائی کی بے راہ روی پر ہمیشہ نالاں رہتے۔ بارہا نرمی سے پاس بٹھا کر سمجھایا بجھایا۔ سختی سے بھی کام لیا۔ بارہا تاکید اور تنبیہہ کی لیکن نواب صفی پر ذرا اثر نہ ہُوا۔ سنبھلنے کے بجائے اور بگڑتے چلے گئے۔

خاندانی جائیداد اور املاک کا سارا انتظام اور انصرام نواب ذکی کی زیر نگرانی تھا۔ جائیداد کے تمام وارثوں کی جانب سے وہ مختار عام تھے۔ اتنے اعلیٰ منتظم اور معاملہ فہم تھے کہ جائیداد سے ملنے والی آمدنی میں کمی کے بجائے اضافہ ہی ہوتا گیا۔ والد مرحوم نواب بیتد علی کے بعد وہی پورے خاندان کے سرپرست اور سربراہ تھے۔ ہر ایک کی دلجوئی کرتے۔ شفقت اور اخلاص کا یہ عالم تھا کہ نواب تقی کو کبھی سوتیلے پن کا احساس نہ ہونے دیا۔ ویسے بھائی اور بہن، سب ہی اُن کا پُورا پُورا احترام کرتے تھے۔ اوباش اور عیاش طبع ہونے کے باوجود نواب صفی بھی بڑے بھائی کی اس قدر عزت کرتے تھے کہ اُن کے رُوبرو ہمیشہ نظریں نیچی رکھتے۔ کبھی اُونچی آواز سے نہ بولے۔

مگر نواب ذکی کے مرتے ہی، نواب صفی نے پر پُرزے نکالے۔ دونوں ہاتھوں سے روپیہ لُٹانے لگے۔ شہر میں جو بھی نئی طوائف آتی، اُس سے تعلقات پیدا کرنے کی کوشش کرتے، ہر طرح اُس کی ناز برداری کرتے۔ اُس نے جو کچھ طلب کیا اُنہوں نے ہنستے مسکراتے اُسے پورا کیا۔ کبوتر بازی کا شوق پیدا ہوا تو سینکڑوں کبوتر خرید لئے ان کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہی ہوتا گیا۔ اپنی وسیع اور عالی شان محل سرا کا ایک حصّہ کبُوتر خانے کے لئے وقف کر دیا۔ دُور دُور سے اعلیٰ نسل کے کبوتر منگاتے اور اُن کی مُنہ مانگی قیمت ادا کرتے۔

اسی طرح بٹیر بازی کی ایسی لت لگی کہ ایک ایک بٹیر کی تیاری پر اندھادھند خرچ کرتے۔ بٹیروں کی دیکھ بھال کے لئے ملازمین کی پوری پلٹن موجود تھی۔ کوئی بٹیر کی نسل بلکہ شجرۂ نسب معلوم کرنے پر متعین تھا، کوئی دانہ دینے پر۔ کوئی جو بنج اور

پنجوں کے ناخن تیز اور نوک دار بنانے کے لئے تھا۔ کوئی رات کے سناٹے میں بٹیر کے کانوں میں کوک دیتا تھا۔ ایک طبیب بٹیروں کے علاج معالجے کے لئے مستقل ملازم تھا غرضیکہ بٹیروں کے ہر طرح سے ناز نخرے اٹھائے جاتے۔ پالی میں لڑانے کے لئے انہیں ہر طرح تیار کیا جاتا۔ چھٹنے، جھپٹ کر پلٹنے اور پلٹ کر زیادہ قوت سے چھٹنے کے ہر گُر اور ہر حربے کی تربیت دی جاتی تھی۔

نواب صفی، بٹیروں کی پالی میں بہ نفس نفیس شریک ہوتے تھے اور اس شان سے ہوتے تھے کہ جلو میں مصاحبین کا غول ہوتا۔ ایک ایک بٹیر پر ہزاروں کی شرط لگاتے لیکن قسمت کے ایسے ہیٹے تھے کہ ہمیشہ ہارتے تھے۔ کبھی اتفاق سے جیت جاتے تو فتح و کامرانی کا جشن اس قدر دھوم دھام سے مناتے کہ جیت کی رقم سے دُگنا خرچ ہو جاتا۔

یہ الللے تللے رنگ لائے۔ اخراجات بڑھے اور اتنے بڑھے کہ مہاجنوں سے قرض لینا پڑا۔ قرض ادا ہونے کے بجائے روز بروز بڑھتا ہی گیا۔ جب قرض کا بار بہت بڑھ گیا تو مہاجنوں نے ہاتھ روک لیا۔ جائیداد رہن رکھنے پر اصرار کیا مگر جائیداد ہنوز مشترک تھی۔ نواب صفی سخت اُلجھن میں مبتلا ہو گئے۔ اُن کے مصاحبیں اور مقربین میں ایک سے ایک بڑا گھاگ اور رچلتا پرزہ موجود تھا۔ انہوں نے حصول دولت کے نت نئے ہتھکنڈے سمجھائے۔ نواب صفی کی سمجھ میں بھی آ گئے اور وہ، اُن کو عملی جامہ پہنانے کے لئے بڑی سنجیدگی سے غور کرنے لگے۔

نواب ذکی مرحوم کے صرف دو بیٹے تھے۔ دونوں نے باپ کی سی ذہانت اور اعلیٰ ظرفی نہ پائی تھی۔ کم فہم اور رغبی تھے۔ نواب صفی نے دونوں بھتیجوں سے اپنی بیٹیاں بیاہ کر نہ صرف انہیں اپنا ہم نوا بنا لیا بلکہ بیوہ بھاوج کو بھی رام کر لیا۔ یہ پیش بندی کرنے کے بعد نواب صفی نے تمام خاندانی جائیداد اور املاک اپنے قبضے میں کرنے کی کوشش کی۔ اُن کی راہ کا بھاری پتھر نواب تقی تھے۔ نواب صفی اُن سے کدورت بھی رکھتے تھے۔ دل میں جو تھوڑی بہت گنجائش تھی وہ مصاحبین نے نواب تقی کے

خلاف کان بھر کر مٹا دی۔

جائیداد کے حق ملکیت سے محروم کرنے کی غرض سے نواب صفی نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ نواب تقی اُن کے والد مرحوم کی جائز اولاد نہیں ہیں۔ بات اتنی بڑھی کہ عدالت تک جا پہنچی۔ دونوں بھائیوں میں باقاعدہ مقدمہ بازی شروع ہو گئی۔ گواہ پیش ہوئے۔ ثبوت مہیّا کیے گئے۔ مقدمات نے طول پکڑا۔ پیشیوں پر پیشیاں پڑتی رہیں۔ بہن نفیسہ بیگم کے ویسے تو نواب تقی کے ساتھ خوشگوار تعلقات تھے مگر درپردہ وہ بھی نواب صفی کی طرف دار تھیں۔ اس طرف داری کا بنیادی سبب اُن کے شوہر تھے۔ جن کی نواب صفی سے گاڑھی چھنتی تھی۔

☆

نواب تقی اس مقدمے بازی میں ایسے اُلجھے کہ محفل آرائیوں کی ساری گرما گرمی سرد پڑ گئی۔ اُن پر ہر وقت مقدمے کی دُھن سوار رہتی۔ سچ تو یہ ہے کہ اُن کا مقدمہ کمزور بھی تھا۔ اُن کی پریشانی میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اسی دوران میں ایک روز خاندانی کاغذات دیکھتے ہوئے ایک ایسی دستاویز اُن کے ہاتھ آ گئی جس نے مقدمے کا رُخ بدل دیا۔ یہ اُن کی والدہ مرحومہ ناظمہ بیگم کا نکاح نامہ تھا۔ نواب تقی کے وکیل نے فوراً نکاح نامے کی ایک نقل عدالت میں پیش کر دی۔

نواب صفی بہت سٹپٹائے۔ مقدمہ ہاتھ سے نکلتے دیکھا تو سخت تشویش لاحق ہوئی۔ جائیداد ملنے کے جو سنہرے خواب دیکھ رہے تھے، سب تار تار ہو گئے۔ اُن کی پریشانی روز بروز بڑھتی گئی لیکن اُن کے مشیر بھی مقدمے بازی کے داؤ پیچ خوب جانتے تھے۔ نواب صفی بھی خود کم کائیاں نہ تھے۔ اُنھوں نے مقدمے کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا۔ بہت غور و فکر کے بعد، آخر ایک قانونی نکتہ سمجھ میں آ گیا۔ بھاگ دوڑ شروع ہوئی۔ نواب صفی، میونسپلٹی سے نواب تقی کی پیدائش کا سرٹیفکیٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس سرٹیفکیٹ کی رُو سے نواب تقی کی پیدائش، نکاح سے پہلے ثابت ہوتی تھی۔ اُن کے وکیل نے اپنے مقدمے کی تائید میں نواب تقی کی

پیدائش کا سرٹیفکیٹ عدالت میں داخل کر دیا۔

نواب نقی نے یہ صورت حال دیکھی تو ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ اُن کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ نواب صفی اتنی دُور تک جائیں گے کہ پیدائش کا سرٹیفکیٹ بھی حاصل کر لیں گے۔ مقدمے کا رُخ ایک بار پھر اُن کے خلاف پلٹا تو سخت پریشان ہوئے۔ پریشانی کی بات ہی تھی۔ حقیقت بھی یہی تھی کہ اُن کی پیدائش کے بعد ہی نواب سیّد علی اُن کی والدہ ناظمہ بیگم کو حبالۂ عقد میں لائے تھے۔ وکیل اور گواہوں کی موجودگی میں باقاعدہ نکاح کیا تھا۔

ناظمہ بیگم کسی زمانے میں نواب سیّد علی کی اتّا کی بہو رہ چکی تھیں۔ بھری جوانی میں بیوہ ہوگئیں۔ مرحوم شوہر سے کوئی اولاد نہ تھی۔ عزیز و اقارب میں کوئی ایسا نہ تھا جس کے سہارے بقیہ زندگی گزار دیتیں۔ پریشان حالی اُن کا مقدر بن گئی۔ ایسا کڑا وَقت پڑا کہ فاقوں کی نوبت آگئی۔ اس تنگ دستی کے عالم میں ایک روز نواب سیّد علی کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ اپنی زبوں حالی بیان کی، امداد کی طالب ہوئیں۔ خوش شکل اور طرح دار تھیں۔ پہلی ہی نظر میں نواب صاحب اُن کی زلف گرہ گیر کے ایسے اسیر ہوئے کہ باقاعدہ تعلقات پیدا ہو گئے۔ رہنے کو علیحدہ مکان دیا۔ خدمت کو نوکر چاکر مقرر کیے۔ جیب خرچ کے لئے ماہانہ رقم دیتے تھے۔ ہر طرح سے دل داری کرتے تھے۔ نواب نقی کی پیدائش کے بعد ناظمہ بیگم نے زور دیا تو نکاح بھی کر لیا اور اُن کو بیگم بنا کر محل سرا میں لے آئے۔

مقدمہ جس قدر بگڑتا گیا، نواب نقی کی پریشانی میں اُسی قدر اضافہ ہوتا گیا ان کے وکیل بھی کم پریشان نہیں تھے۔ نواب نقی کے معتمد خاص، میر منشی مرزا زوّار حسین، بھی بے بس تھے۔ وہ مقدمے کی پیروی میں پیش پیش تھے اس پریشانی میں داروغہ میر نصیر نے اُن کی مشکل کشائی کی۔ وہ تھے تو حضور بیگم کی جائیداد کے منتظم مگر نواب صاحب کی خدمت پر بھی مامور رہتے تھے۔ عدالتی کارروائیوں اور قانونی پیچیدگیوں کو بھی سمجھتے تھے لہٰذا مقدمے کے سلسلے میں ان کو بھی اکثر مشورے

میں شریک کر لیا جاتا۔

☆

داروغہ ببر نصیر نے عبداللہ خان سے رابطہ پیدا کیا۔ عبداللہ خان جعلی دستاویزات بنانے میں ماہر تھے۔ ایک بار جیل کی ہوا بھی کھا چکے تھے۔ ہوا یہ تھا کہ کپتان جارج مارٹن نامی ایک انگریز انجینئر کے خانساماں سے عبداللہ خان کے دیرینہ مراسم تھے عبداللہ خان نے اُس سے ساز بازی اور کپتان کی چیک بک سے ایک سادہ چیک پار کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ کپتان کا اکاؤنٹ الہ آباد بینک میں تھا۔ عبداللہ خان نے چیک میں دو ہزار رُوپے کی رقم کا اندراج کیا اور ایسی صفائی سے کپتان جارج مارٹن کے جعلی دستخط بنائے کہ بینک میں کسی کو بھی ذرا شُبہ نہ ہُوا اور چیک کیش ہو گیا۔

عبداللہ خان کو دو ہزار روپے ملے تو پانچ سو خانساماں کو بھی دیئے۔ دونوں بہت خوش تھے مگر یہ خوشی زیادہ عرصے قائم نہ رہی۔ کپتان کا ایک چیک واپس آیا تو بہت چکرایا وہ اپنے اکاؤنٹ کا باقاعدہ حساب رکھتا تھا۔ لہذا گھبرایا ہُوا بینک پہنچا، تحقیقات کی اِس کے حساب میں اور بینک کے کھاتوں میں دو ہزار کا فرق نکلتا تھا دو ہزار رُوپے کی یک مُشت رقم کا اُس نے چیک ہی جاری نہیں کیا تھا اِس نے دو ہزار کے چیک کو بار بار دیکھا دستخط ہُو بہُو اُس کے تھے کسی دائرے، کسی نقطے میں سرِمُو فرق نہ تھا۔

کپتان جارج مارٹن نے پولیس سے رجوع کیا۔ رپورٹ درج کرائی، پولیس نے تحقیقات شروع کی سب سے پہلے کپتان کے گھریلو مُلازمین کو تفتیش میں شامل کیا پوچھ گچھ کی تو خانساماں کا رویہ مشتبہ معلوم ہُوا۔ اُسے حراست میں لے لیا گیا۔ تھانیدار کے حکم پر ایک کانسٹیبل نے دو چار ہی زناٹے کے ہاتھ لگائے تھے کہ خانساماں چیں بول گیا اور اُس نے سب کچھ اُگل دیا۔ پولیس نے عبداللہ خان کے گھر پر چھاپہ مارا۔ عبداللہ خان گھر پر موجود تھے۔ پولیس کی دوڑ پہنچی تو اُن کی ایسی سٹی گُم ہوئی کہ تھر تھر کانپنے لگے۔ پولیس پکڑ کر تھانے لے گئی۔ عبداللہ خان جعل سازی میں تو اپنا جواب نہ رکھتے تھے مگر کبھی پولیس سے سابقہ نہ پڑا تھا۔ وہ خانساماں سے بھی زیادہ

بُو دے نکلے۔ مار پیٹ کی نوبت ہی نہیں آئی۔ تھانے دار کی ڈانٹ ڈپٹ اور گالیاں سُن کر گھگھیانے لگے۔ اپنے جرم کا صاف صاف اقبال کر لیا۔

کپتان کو مُلزم کے پکڑے جانے اور اقبال جرم کی اطلاع ملی تو پولیس کی کارگزاری کو سراہنے کے ساتھ ساتھ، عبداللہ خان سے ملنے کی خواہش کا بھی اظہار کیا۔ پولیس عبداللہ خان کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال کر کپتان کے بنگلے پر پہنچی۔ کپتان ادھیڑ عمر کا انگریز تھا۔ ہاتھوں میں رَعشا بھی تھا۔ اُسے سب سے زیادہ حیرت اس بات پر تھی کہ ہاتھ میں میں تھر تھراہٹ کے باعث اُس کے دستخط میں بھی تھر تھراہٹ صاف نظر آتی تھی۔

اُس نے غور سے عبداللہ خان کی طرف دیکھا۔ وہ ہٹے کٹّے اور خوب تندرست تھے۔ عمر بھی کپتان سے کہیں زیادہ کم تھی۔ وہ یہ جاننے کے لیے بے چین تھا کہ عبداللہ خان نے دستخط میں تھر تھراہٹ کی کیفیت کیسے پیدا کی؟ اپنے اس تجسّس کا اُس نے عبداللہ خان سے اظہار بھی کیا۔

عبداللہ خان نے کپتان جارج مارٹن کی بات سُن کر تامل کیا پھر ہاتھ جوڑ کر کپتان سے گویا ہوئے "حضور! مجھے معافی دے دی جائے تو ابھی آپ کے سامنے دستخط بنا کر دکھا دُوں گا۔" کپتان نے عبداللہ خان کی یہ شرط منظور کر لی۔ وعدہ کیا کہ اُن کو بالکل معاف کر دیا جائے گا۔ کسی قسم کی کارروائی نہیں کی جائے گی۔

یہ مارچ کے مہینے کا ذکر ہے۔ گرمی ابھی شروع نہ ہوئی تھی مگر عبداللہ خان نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ برف کی سل منگوائی جائے۔ کپتان کے حکم پر برف کی سل لائی گئی۔ عبداللہ خان کی ہدایت پر اُسے غُسل خانے میں نہانے کے ٹب میں ڈال دیا گیا اور ٹب کو پانی سے لبالب بھر دیا گیا۔ جب برف پانی میں پگھل گئی تو عبداللہ خان نے ہتھکڑی کھولنے کی درخواست کی۔ فوراً ہتھکڑی کھول دی گئی۔ عبداللہ خان، غُسل خانے میں داخل ہوئے اور کپڑے اُتار کر ٹب میں بیٹھ گئے۔ کپتان جارج مارٹن غسل خانے کے سامنے کُرسی ڈالے بیٹھا چوکنّا نظروں سے دروازے کو تک رہا تھا۔

کچھ دیر بعد دروازہ کھلا۔ عبداللہ خان تولیہ لپیٹے ہوئے، سردی سے کپکپاتے

باہر آئے۔ فوراً کاغذ اور قلم مانگا۔ سردی سے اُن کے بدن کا ایک ایک عضو پھڑک رہا تھا۔ اسی عالم میں عبداللہ خان نے تھرتھراتے ہوئے ہاتھ میں قلم پکڑا اور کاغذ پر جارج مارٹن کے دستخط بنا دیئے۔

کپتان نے کاغذ اُٹھا کر دیکھا تو اُچھل پڑا۔ دستخط میں سرِ مو فرق نہ تھا۔ ہُو بہُو اُس کا طرزِ تحریر تھا۔ وہی تھرتھراہٹ تھی۔ وہی ٹیڑھا اور ترچھا پن تھا۔ وہ عبداللہ خان کی کاریگری سے ایسا متاثر ہُوا کہ فوراً سو رُوپے انعام میں دے دیئے۔ دیر تک تعریف کرتا رہا۔ عبداللہ خان جھک جھک کر آداب بجا لاتے رہے۔

کپتان جارج مارٹن نے تو اپنے وعدے کے مطابق عبداللہ خان کو معاف کر دیا اور اپنی رقم سے بھی دست بردار ہو گیا۔ مگر مدعی کپتان نہ تھا بلکہ پولیس تھی عدالت کو پولیس کے چالان کے مطابق فیصلہ کرنا تھا۔ انگریزوں کی حکمرانی کا زمانہ تھا۔ لہذا کپتان جارج مارٹن کی سفارش پر مجسٹریٹ نے جعل سازی کے سنگین جرم کے باوجود نہ لمبی سزا دی نہ جرمانہ کیا۔ صرف تین ماہ کے لئے جیل بھیج دیا۔

عبداللہ خان جیل سے رہا ہُوئے تو اس قدر رسوائی ہو چکی تھی کہ کسی کو مُنہ دکھانے کے قابل نہ رہے تھے۔ محلّہ چھوڑ دیا۔ چھُپے چھُپے پھرتے۔ کچھ عرصہ تک جعل سازی سے تائب بھی رہے مگر کرتے بھی کیا؟ گزر بسر کیوں کر ہوتی؟ جعلی دستاویزات تیار کرنے کے علاوہ کوئی اور ہُنر نہ آتا تھا۔ لہٰذا پھر پُرانے ڈھرّے پر آگئے۔ البتہ جعلی چیک تیار کرنے سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے توبہ کر لی۔ اب وہ صرف جعلی دستاویز بناتے تھے اور مُنہ مانگی قیمت وصُول کرتے تھے۔

قصّہ کوتاہ، داروغہ میر نصیر نے عبداللہ خان جعل ساز سے مل کر اپنا مدّعا بیان کیا۔ نواب تقی کی والدہ کا نکاح نامہ دکھایا اور اس خواہش کا اظہار کیا کہ ہُو بہُو ایسا ہی نکاح نامہ تیار کرنا ہے۔ تاریخ بدل کر گیارہ ماہ پہلے کی تاریخ ڈالنا ہے۔ شرط یہ ہے کہ نکاح نامہ اتنا ہی پُرانا اور بوسیدہ بھی نظر آئے۔ عبداللہ خان نے نکاح نامہ غور سے دیکھا اور ہامی بھر لی۔ پانچ سو رُوپے میں معاملہ پٹ گیا۔

عبداللہ خان نے اسی طرز کا ایک سادہ نکاح نامہ کسی نہ کسی طور حاصل کیا اور اصلی نکاح نامے کو سامنے رکھ کر، جعلی نکاح نامہ تیار کیا۔ تاریخ بھی وہی ڈالی جو داروغہ میر نصیر نے بتائی تھی۔ عبداللہ خان کچّے مکان میں رہتے تھے۔ اُس کے ایک حصّے میں بھوس کا چھپّر تھا۔ نیچے چولہا جلتا تھا۔ عبداللہ خان نے جعلی نکاح نامہ تیار کرنے کے بعد، چھپّر میں ٹھیک چولہے کے اُوپر احتیاط سے رکھ دیا۔ ہفتے بھر بعد اُسے نکالا تو کاغذ کا رنگ چولہے کا دھواں لگنے سے بدل کر میلا ہو گیا تھا پھر اس میلے کچیلے نکاح نامے کو باریک ململ کے ٹکڑے میں پلیٹ کر، اُوپر سے گوڑا کرکٹ ڈال دیا۔ کچھ عرصے بعد نکالا تو کاغذ خستہ ہو کر بوسیدہ اور پُرانا نظر آتا تھا۔

عبداللہ خان نے داروغہ میر نصیر سے پانچ سو رُوپے وصُول کئے اور اصلی نکاح نامے کے ساتھ، جعلی نکاح نامہ، اُن کے حوالے کر دیا۔

☆

داروغہ نصیر نے جعلی نکاح نامہ تخلئے میں نواب تقی کے سامنے پیش کیا۔ انہوں نے دونوں نکاح ناموں کو سامنے رکھ کر دیکھا تو ششدر رہ گئے۔ دونوں میں بجز تاریخ کے شمّہ برابر فرق نہ تھا۔ فرطِ مُسرّت سے نواب صاحب کی باچھیں کھل گئیں۔ ساری کدورت اور پریشانی آناً فاناً رفع ہو گئی۔ داروغہ میر نصیر نے نواب صاحب کو اس قدر مسرور پایا تو موقعے سے پُورا پُورا فائدہ اُٹھایا۔ جعلی نکاح نامے کا معاوضہ پانچ سو کے بجائے ڈیڑھ ہزار وصول کیا۔ لُطف یہ کہ اس کارگزاری پر نواب صاحب کے حکم پر خزانچی نے سو روپے بطور انعام بھی میر نصیر کو دیئے۔

جعلی نکاح نامہ ملنے کے بعد داروغہ میر نصیر کو اپنی کارگزاری دکھانے کا موقع ملا۔ انہوں نے نکاح نامے کی نقل تیار کی۔ عدالت کے پیش کار اور مسل خواں سے ملے۔ دونوں سے راہ و رسم پہلے ہی سے تھی۔ کھلانے پلانے اور اپنا کام نکالنے کا گُر بھی جانتے تھے۔ پیش کار اور مسل خواں نے جو مانگا، اُنہوں نے دیا۔ مقدمے کی مسل سے نکاح نامے کی پُرانی نقل نکلوا کر دوسری لگوا دی۔ یہ کام اس رازداری سے انجام

دیا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔

نکاح نامے کی پرانی نقل لئے، ہوئے خوشی خوشی نواب تقی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ نقل اُن کے حوالے کی اور درخواست کی کہ اپنے ہاتھ سے جلا کر اسے تلف کر دیں۔ نواب صاحب فرطِ مسرّت سے عش عش کرنے لگے۔ داروغہ نصیر نے اس کارگزاری سے بھی خاطر خواہ فائدہ اُٹھایا۔ عدالت کے اہل کاروں کو جو رشوت دی تھی اُس سے دو چند نواب صاحب سے وصول کی۔ میر نصیر کی سوجھ بوجھ اور ہوشیاری سے وہ اس قدر مرعوب ہوئے کہ میر منشی مرزا زوّار حسین کی جگہ اُن کو مقدمے کی پیروی کے لئے مقرر کر دیا۔

وکیل کو اعتماد میں لے کر ہر اقدام اور ہر کارروائی سے باخبر رکھا گیا۔ بلکہ ہر قدم اٹھانے سے پہلے اُن سے مشورہ کر لیا جاتا تھا۔ نکاح نامے کی پرانی نقل مقدمے کی مسل سے غائب ہو گئی تو وکیل نے آئندہ پیشی پر اپنے مؤکّل کی تائید میں بحث کرتے ہوئے جعلی نکاح نامہ اس انداز سے عدالت کے روبرو پیش کیا کہ نواب تقی کی پیدائش کا سرٹیفکیٹ خلاف جانے کی بجائے حمایت میں مزید دستاویزی ثبوت بن گیا۔

مقدمے کا رُخ اس مرحلے پر ایک بار پھر نواب تقی کے حق میں پلٹ گیا۔ نواب صفی کے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ وہ مقدمہ جیتنے کے خواب دیکھ رہے تھے۔ اور اس قدر پُراُمید اور مطمئن تھے کہ مہاجنوں سے دھڑا دھڑ قرض لے رہے تھے اور دونوں ہاتھوں سے روپیہ لٹا رہے تھے مگر اب مقدمے نے ایسا پلٹا کھایا کہ اُن کے مقدمے میں جان نہ رہی اور یہ امکان صاف نظر آنے لگا کہ مقدمہ عدالت سے خارج ہو جائے گا۔ نواب صفی کے ہوش و حواس بجا نہ رہے۔ کبھی اپنے مشیروں پر برستے کبھی وکیلوں سے اُلجھتے۔

اُدھر نواب تقی کے چہرے پر چھائے ہوئے پریشانی کے سائے معدوم ہو چکے تھے۔ یکسوئی اور اطمینان قلب نصیب ہُوا تو طبیعت ایک بار پھر دیرینہ معمولات کی طرف راغب ہونے لگی مگر ابھی مقدمہ خارج نہیں ہوا تھا۔ دل میں چور تھا ہر

وقت دھڑکا بہرحال لگا رہتا۔ دیوان خانے کی چہل پہل اور بزم آرائی میں ابھی وہ پہلی سی گرما گرمی پیدا نہ ہوئی تھی کہ رات آنکھوں میں کٹ جائے۔ البتہ شطرنج سے ان دنوں وہ شوق ضرور فرماتے تھے۔

☆

ایک روز نواب تقی آدھی رات تک شطرنج کھیلتے رہے۔ آخری بازی ختم ہوئی تو دسترخوان بچھا۔ نواب صاحب نے مصاحبین اور حاضر باشوں کے ساتھ ماحضر تناول فرمایا۔ محفل برخاست ہوئی۔ نواب صاحب اپنی خواب گاہ میں پہنچے اور بستر پر دراز ہوگئے۔ برسات کا موسم تھا۔ شام کو موسلا دھار بارش بھی ہوئی تھی۔ آسمان پر اب تک کالے کالے بادل چھائے تھے۔

کمرے کی کھڑکیاں کھلی تھیں۔ ہوا کے بھیگے بھیگے جھونکے اندر آرہے تھے۔ نواب تقی بستر پر گہری نیند سو رہے تھے۔ رات کے پچھلے پہر انہوں نے ایسا محسوس کیا۔ جیسے دم گھٹ رہا ہو۔ فوراً آنکھ کھل گئی۔ مگر وہ کچھ دیکھ نہ سکتے تھے۔ چہرہ دلائی سے ڈھکا ہوا تھا۔ منہ کھول کر چیخنا چاہا تو اندازہ ہوا کہ کسی نے ایک ہاتھ سے بھینچ رکھا ہے۔ انہیں گردن میں بھی شدید تکلیف محسوس ہوئی۔ گردن کو بھی کسی نے اپنے ہاتھ کی فولادی انگلیوں سے جکڑ رکھا تھا۔

نواب صاحب نے بے چین ہوکر اپنے ہاتھوں کو جنبش دینا چاہا تو اس کی بھی گنجائش نہ تھی۔ دلائی کے اندر ایک ہاتھ اس طرح پھنسا ہوا تھا کہ اسے نکالنا ممکن نہ تھا۔ دوسرے ہاتھ کو کسی نے گھٹنے کے نیچے دبا رکھا تھا۔ گردن کی تکلیف دم بدم شدید سے شدید تر ہوتی گئی۔ سانس رک گئی تھی۔ گردن پر بڑھتے ہوئے دباؤ کی شدت سے آنکھیں ابل کر حلقوں سے نکلی پڑتی تھیں۔ ان کے ہوش و حواس بجا نہ تھے۔ جسم نڈھال ہوکر گویا بے جان ہوگیا تھا۔

ذہن نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ تکلیف کی شدت زیادہ بڑھی تو نواب تقی نے تڑپ کر کروٹ لینے کی کوشش کی۔ وہ پلنگ کی پٹی سے لڑھک کر دھڑام سے

نیچے گرے اور فرش پر بے حال پڑے، رُک رُک کر سانسیں لینے لگے۔ ڈلائی اب چہرے سے ہٹ چکی تھی۔ کمرے کے مشرقی گوشے میں رکھا ہُوا لیمپ نہ معلوم کب گُل ہو گیا تھا۔ ہر طرف گہری تاریکی تھی، پُراسرار خاموشی تھی۔

نواب تقی، فرش پر بے سُدھ پڑے تھے۔ اچانک کوئی چیز اُن کے کندھے سے ٹکرائی، کھڑکی پر پرچھائیں لہرائی اور رات کے سناٹے میں باہر احاطے میں دھم سے کسی کے کُودنے کی آواز اُبھری۔ چند لمحے وہ ساکت پڑے رہے پھر ہمت کر کے اُٹھ کھڑے ہُوئے۔ لڑکھڑاتے قدموں سے کھڑکی کی جانب بڑھے اور کھڑکی کی چوکھٹ کا سہارا لے کر گہری گہری سانسیں لینے لگے۔ اُنھوں نے گردن بڑھا کر باہر نظر ڈالی۔

ہر طرف ہُو کا عالم تھا۔ آسمان پر گہرا ابر چھایا تھا۔ اندھیرے میں قبرستان کے قریب کوئی سفید کفن میں لپٹا ہُوا نظر آیا اور آن کی آن میں نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

خوف سے اُن کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ جب حواس ذرا بجا ہُوئے تو اُنھوں نے کمرے کے باہر دالان میں لیٹے ہُوئے مُلازم کو گھبرا کر آواز دی۔ وہ گہری نیند سوتا تھا۔ کئی بار پکارنے پر اُٹھا۔

نواب صاحب تکیے کا سہارا لے کر بستر پر نیم دراز ہو گئے۔ ملازم آیا تو انھوں نے لیمپ روشن کرنے کا حُکم دیا۔ اُس نے فوراً لیمپ روشن کیا اور قریب آ کر دریافت کیا: "حضُور! خیریت تو ہے؟" وہ اُن کا پُرانا خدمت گار تھا۔ مزاج شناس بھی تھا۔ اُن کے چہرے پر چھائی ہُوئی مردنی دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ جلدی سے گلاس میں پانی بھر کر لایا۔ نواب صاحب نے گلاس منہ سے لگایا اور خالی کر دیا۔

پانی پینے کے بعد طبیعت کچھ اور سنبھل گئی۔ اُنھوں نے ملازم سے سارا واقعہ بیان کیا۔ وہ پریشان ہو گیا۔ اُسے سب سے زیادہ حیرت اس بات پر تھی کہ لیمپ اُس نے سونے سے پہلے جلتا ہُوا دیکھا تھا۔ اُس میں تیل بھی موجود تھا۔ ہوا بھی تیز نہ تھی اور لیمپ کھڑکی سے دُور ایک کونے میں رکھا تھا، وہ گُل کیسے ہو گیا؟

اُس کا خیال تھا کہ کمرے میں داخل ہونے والے نے لیمپ بجھا دیا تھا۔ نواب تقی نے بھی اُس کی قیاس آرائی سے اتفاق کیا۔ ملازم نے آوازیں دے کر دوسرے مُلازموں کو جگایا۔ ہر مُلازم گھبرایا ہُوا نواب صاحب کے پاس پہنچا۔ ہر طرف ہل چل برمچ گئی۔

صبح ہُوئی۔ پہر دن چڑھے تک بارہ دری میں ہر فرد کو رات کے واقعے کی اطلاع مل چکی تھی۔ جس نے سُنا دہشت زدہ ہو گیا۔ عام خیال تھا کہ وہ کوئی بلا تھی یا آسیب تھا۔ حضُور بیگم کو تو کامل یقین تھا کہ وہ آسیب ہی تھا۔ اُنھوں نے کالا بکرا منگوا کر صدقہ کیا۔ حضرت عباس علمدار کی درگاہ میں نواب تقی کی سلامتی اور ہر بلا سے محفُوظ رہنے کے لئے علَم میں کلاوا باندھ کر چلّہ چڑھایا۔

حضُور بیگم نے نواب تقی کو تو نہ جانے دیا مگر میر منشی مرزا زوّار حسین نے چند ملازمین کے ہمراہ، قبرستان کا معائنہ کیا تو یہ دیکھ کر خوف زدہ ہو گئے کہ ایک قبر کا مُنہ کھُلا ہُوا تھا۔ وہ بھی کم تو ہّم پرست نہ تھے۔ ایک بوُڑھے دربان نے قیاس آرائی کی کہ کوئی مُردہ، قبر سے اُٹھ کر رات کو نکلا تھا اور اُس کی رُوح بھٹکتی پھر رہی ہے اُسی نے نواب صاحب کو ستایا تھا۔ مرزا زوّار حسین نے اُس کی بات مان لی۔ خود بھی پریشان ہُوئے اور نواب صاحب کو بھی طرح طرح کے خدشات میں مُبتلا کر دیا۔ ایک مجتہد سے رجُوع کیا گیا اور اُن کے مشورے پر قبر کا کھُلا ہُوا مُنہ بند کروا دیا گیا۔ اُس کی مرمّت کی گئی اور ایک مُلازم کو یہ فرض سونپا گیا کہ ہر شام قبر پر چراغ روشن کرتا رہے۔

نواب صاحب اس قدر خوف زدہ ہُوئے کہ اُنھوں نے دیوان خانے میں رات بسر کرنے کا سلسلہ بند کر دیا۔ محفل برخاست ہوتے ہی وہ آرام کرنے کے لئے دیوان خانے سے اُٹھ کر زنان خانے میں چلے جاتے۔

(۴)

شہر میں ہر طرف بسنت کی رنگینیاں بکھری ہوئی تھیں۔

تین گھڑی دن ابھی باقی رہتا تھا۔ بارہ دری میں ہنوز سناٹا چھایا تھا۔ احاطے کی چار دیواری کے اُس پار، منڈھے کے جزینہ لول اُبھر رہے تھے۔ ڈھاڑی سارنگی کی سنگت پر اس طرح پُرسوز آواز میں گا رہے تھے کہ فضا سوگوار ہو گئی تھی۔ باقر نواب کے زنان خانے میں تو کہرام برپا تھا۔ مہر عالم کی ماں، بہنیں اور دوسری رشتے دار خواتین بلک بلک کر رو رہی تھیں۔ مہر عالم کو گلے لگا کر خود بھی آنسو بہاتیں اور اُسے بھی دل گرفتہ کرتیں۔ روتے روتے اُس کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔

نجّو اور طلعت آرا ابھی تک ڈیوڑھی میں کھڑی تھیں۔

طلعت آرا نے اصرار کیا۔ "تو آؤ پھر چھت پر چلیں۔ برات اب رُخصت ہونے ہی والی ہے"۔

"معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے"۔ نجّو نے طلعت آرا کو اُوپر جانے سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ "ذری موکھے سے تو دیکھئے سب کچھ نظر آ رہا ہے"۔

"موکھے سے کیا خاک نظر آئے گا؟ سامنے تو دیوار کھڑی ہے"۔

"دیوار تو ٹوٹی ہوئی ہے۔ اس کی آڑ سے دیکھئے۔ کتنا صاف نظر آ رہا ہے"۔

"یہاں کھڑے ہو کر دیکھنا ٹھیک نہیں"۔ طلعت آرا نے اپنے خدشے کا اظہار کیا "کوئی ماما، لونڈی ادھر آ گئی تو مصیبت آ جائے گی۔ تجھے تو خبر ہی ہے کہ ان میں سے ہر ایک آفت کی پرکالا ہے۔ ایک کی دس لگا کر امّاں جان سے جڑ دے گی"۔

"وہ سب تو بڑی مستار ہی ہیں۔ بڑی سرکار کربلا جو گئی ہوئی ہیں۔ اب اُنہیں کس کا خوف ہے"؟ نجّو نے صفائی پیش کی۔

"نہیں بھئی! ہم تو اُوپر ہی جا کر برات دیکھیں گے"۔ طلعت آرا اپنی ضد پر اَڑ گئی۔ اس نے ہلکی سے جھرجھری لی۔ "یہاں تو سردی بھی بہت ہے۔ چھت پر ذری دھوپ بھی کھا لیں گے"۔

"ہائے اللہ! یہ آج آپ کو کیا دھن سوار ہوئی ہے؟ بار بار اُوپر جانے کا نام لے رہی ہیں"۔ نجّو نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "آپ بھول گئیں اُوپر بڑے

نواب صاحب کے ساتھ کیا ہُوا تھا؟ وہ اور خوف زدہ ہو گئی۔ "یاد آتا ہے تو کلیجہ پھٹتا ہے۔ ہائے، وہ کیسی قیامت کی رات تھی؟"

☆

نجّو ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ گرمیوں کے دن تھے۔ بڑے نواب صاحب اُن دنوں، رات کو اُوپر کی منزل پر سوتے تھے۔ سرِ شام ہی چھت پر چھڑکاؤ ہوتا۔ مہتابی کو دھو کر صاف کیا جاتا۔ کمرے سے نواڑی کا چوڑا چکلا پلنگ نکال کر مہتابی پر ڈالا جاتا۔ اُس پر صاف ستھرا بستر بچھایا جاتا۔ بستر کی اُجلی چادر کو ریشمی ڈوریوں سے پلنگ کے پایوں کے ساتھ باندھ دیا جاتا تاکہ ہُوا سے اُڑ کر پلٹ نہ جائے اور بستر پر شکنیں نہ پڑیں۔ پلنگ کے نیچے سنگِ مرمر کے تراشے ہُوئے گول گول خوبصورت ٹکڑے اس طرح رکھ دیئے جاتے کہ سرہانہ کسی قدر اُونچا رہے۔

بستر پر پلنگ کی چوڑائی کے برابر، نرم نرم تکیئے لگائے جاتے اِن پر سُرخ شال باف چڑھی ہوتی۔ اُوپر تن زیب یا باریک نین سکھ کے غلاف ہوتے۔ پہلو میں دو گول گول گاؤ کی مانند تکیاں بھی رکھی جاتیں، جن کو کروٹ کے بل لیٹتے ہُوئے رانوں کے درمیان دبانے میں آرام ملتا تھا۔ تکیاں رُخساروں کے نیچے رکھنے کے لئے بھی استعمال ہوتی تھیں اور نہایت لطف دیتی تھیں۔ رات کو اوڑھنے کے لئے پلنگ کی پائنتی کے جانب ہلکی رضائی یا ریشمی چادر رکھ دی جاتی۔ بستر نہایت سلیقے سے کسی خوش نما پلنگ پوش سے ڈھک دیا جاتا۔

پلنگ پر بستر لگانے کے بعد، مچھر دانی تان دی جاتی اور اُس کے پردے گرا دیئے جاتے۔ پلنگ کے سرہانے، اُونچے پایوں کی چوکی رکھ دی جاتی۔ اُس پر موٹے کپڑے کا تخت پوش بچھا کر خاصدان کے اندر پان کی گلوریاں رکھی ہوتیں۔ چاندی کی چھوٹی چھوٹی کٹوریوں میں عُمدہ خوردنی تمباکو، کٹی ہُوئی ڈلی اور الائچیاں بھری ہوتیں۔ خاصدان سرپوش سے ڈھکا ہوتا۔

پہر رات گزرتی تو نواب صاحب بیگم کے ساتھ خاصہ تناول فرماتے۔ اب وہ

صرف دو پہر کا کھانا، دیوان خانے میں احباب اور مصاحبین کے ساتھ کھاتے تھے۔ رات کا کھانا نہ صرف وہ پابندی سے زنان خانے میں کھاتے تھے بلکہ دسترخوان بھی جلد ہی بچھ جاتا تھا۔ نواب صاحب دیوان خانے کی محفل برخاست ہوتے ہی زنان خانے میں آتے۔ اُن کے پہنچتے ہی دسترخوان لگا دیا جاتا۔ مامائیں اور خادمائیں جھپاک جھپاک کھانا چُن دیتیں۔

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد، آرام کرنے کی غرض سے نواب صاحب چھت پر چلے جاتے۔ حضور بیگم بھی کبھی کبھی اُن کے ساتھ ہوتیں۔ سن تو اُن کا ڈھل چکا تھا مگر جوانی کا ٹھسّا ہنوز برقرار تھا۔ ہاتھوں میں موتیے کے گجرے پڑے ہوئے، کانوں میں بیلے کے مہکتے پھول، وہ خوشبو میں بسی ہوئی، کلی دار پاجامے کے پائنچے سنبھالتی، خراماں خراماں آتیں۔ نواب صاحب ہاتھ تھام کر محبّت سے اپنے پہلو میں بٹھالیتے۔ وہ خاصدان سے پانوں کی گلوریاں نکال نکال کر خود بھی کلّے میں دباتیں اور نواب صاحب کو بھی پیش کرتیں۔

ایک زمانہ تھا جب، حضور بیگم بڑی دھان پان تھیں، چلتیں تو کمر، پھولوں سے لدی شاخ کی مانند خم کھاتی۔ نازک اندام ہونے کے ساتھ ساتھ، اُسی قدر حسین اور دل رُبا بھی تھیں۔ چہرہ، ہیرے کی مانند اس طرح جگر جگر کرتا کہ نگاہ نہ ٹھہرتی تھی۔ آنکھوں میں ستاروں کی کہکشاں جھلملاتی تھی۔ کھڑی ستواں ناک، گلابی ہونٹ، مسکراتیں تو جیسے پھول جھڑتے تھے۔ پان کھاتیں تو صراحی دار گردن کی رگوں میں پیک کی سُرخی دوڑتی ہوئی صاف نظر آتی۔

نواب تقی پہلی ہی نظر میں بیوی پر اس طرح فریفتہ ہوئے کہ اللہ رکھی طوائف کے بالاخانے پر آنا جانا بند کر دیا۔ برسوں کا تعلق تھا، باقاعدہ، اُن کی مُلازمت میں تھی۔ شام ہوتے ہی وہ نہا دھو کر لباس تبدیل کرتے اور خوب بن سنور کر، اللہ رکھی کے بالاخانے کی جانب روانہ ہو جاتے۔

اللہ رکھی، چوک کے ایک بالاخانے میں رہتی تھی۔ گاتی تو بہت اچھا نہ تھی مگر

نصرت بتانے میں جواب نہ تھا۔ خوش شکل تھی، خوش ادا تھی۔ نواب تقی اُس کی ایک ایک ادا پر جان نچھاور کرتے تھے۔ رات گئے تک اُس کے بالا خانے پر بزم آرائی ہوتی کبھی کبھی شب باشی بھی کرتے۔

مگر حضور بیگم کے حُسن جہاں سوز نے ایسا جادو کیا کہ برسوں کی آشنائی لمحوں میں ختم ہوگئی۔ یہ حضور بیگم کے حُسن کا اعجاز تھا۔ ورنہ کہنے والے تو یہاں تک کہتے تھے کہ نواب تقی، دُنیا چھوڑ سکتے ہیں لیکن اللہ رکھی سے دل کا رشتہ نہیں توڑ سکتے۔

حضور بیگم پر ابھی تک جوانی کی بھبن باقی تھی۔ جوڑا طباقی چہرہ، گلابی رنگت غلافی آنکھیں، آواز میں کھرج، جس محفل میں بیٹھ جاتیں اُس کی رونق دوبالا ہو جاتی سب سے نمایاں اور پُر شکوہ نظر آتیں۔ البتہ اب اُن کا جسم، کسی قدر پھیل کر بھدا ہو گیا تھا۔ تمام وقت گاؤتکیے سے لگی بیٹھی رہتیں۔ خواصوں، ماماؤں اور لونڈیوں پر حُکم چلاتیں، پان پر پان چباتیں۔ دونوں وقت مرغن غذائیں کھاتیں۔ کام کاج اور ہاتھ پاؤں ہلانے سے غرض نہ تھی۔ ہر کام چشم و ابرو کے اشارے پر ہوتا۔

خواصیں اور خادمائیں اُن کی خدمت کے لئے ہر دم حضوری میں رہتیں لہٰذا چربی کی تہ پر تہ چڑھتی چلی گئی۔ جسم بھاری بھر کم ہو کر پھیل گیا۔ لیکن نواب تقی کی چاہت میں فرق نہ آیا۔ وہ ہر طرح بیوی کی دل داری کرتے تھے۔ کوئی بات ناگوار خاطر بھی گزرتی تو طرح دے جاتے۔ دل آزاری سے حتیٰ الوسع گریز کرنے کی کوشش کرتے۔

☆

یہ مئی کی ایک گرم رات تھی۔ ہر طرف اُجلی اُجلی چاندنی چٹکی ہوئی تھی نواب تقی چھت پر ٹہل رہے تھے۔ مقدمہ ابھی ختم نہ ہُوا تھا۔ نواب صفی مقدمے بازی کو طول دینے کے لئے ہر طرح کوشاں تھے۔ اُن کے وکیل نے ایک قانونی نکتے کا سہارا لے کر نئی پیچیدگی پیدا کر دی تھی۔ اس صورت احوال سے ان دنوں، اُن کی طبیعت مکدّر تھی۔ اسی روز حضور بیگم سے بھی کچھ کھٹ پٹ ہو گئی تھی۔ ہُوا یہ کہ داروغہ میر نیمر نے ایک

نئی لونڈی خدمت کے لئے پیش کی تھی۔ لونڈی کا نام شبر۔ بتا تھا۔ گونڈہ کی رہنے والی تھی کچھ عرصے تک داروغہ میر نصیر کے پاس بھی رہ چکی تھی۔ چنانچہ اُن کے اعتماد کی بھی تھی بارہ دری میں جب آئی تو فاقوں کی ماری مریل چھپکلی نظر آتی تھی۔ مگر جب کھانے کو پیٹ بھر ملا اور بارہ دری کی ہوا لگی تو دیکھتے ہی دیکھتے ایسی کینچلی بدلی کہ گدّر انار معلوم ہوتی۔ عمر سولہ برس سے زیادہ نہ تھی۔

اُس کی صورت شکل بھی واجبی سی تھی رنگ بھی سانولا تھا۔ البتہ جسم سڈول اور خوب کسا ہوا تھا۔ اب تو چہرے سے سُرخی بھی جھلکتی تھی۔ جوانی تھی کہ پھٹی پڑتی تھی۔ چلتی تو زمین پر پاؤں نہ پڑتا۔ بدن کا ایک ایک عضو تھرکتا تھا۔ لہنگا پھڑکاتی چھلاوے کی مانند کبھی یہاں، کبھی وہاں۔ شوخ اور الھڑ ایسی تھی کہ بات بات پر اس کی بتیسی کھل جاتی۔

نواب تقی ویسے تو بیوی کے غلام تھے لیکن مزاج میں ہمیشہ سے رنگینی اور تماش بینی تھی۔ شادی سے پہلے اُن کی شامیں، چوک کے بالا خانوں پر گزرتی تھیں اللہ رکھی کے علاوہ ہر عشوہ طراز اور طرح دار طوائف سے مراسم تھے مگر اب اُنھوں نے چوک کے طواف کرنا چھوڑ دیئے تھے۔ بالاخانے کی بزم آرائیوں کو بھی مدّت ہوئی خیر باد کہہ چکے تھے۔ کہتے ہیں چور چوری سے جائے لیکن ہیرا پھیری سے نہیں جاتا۔ نواب تقی کا حال بھی کچھ ایسا ہی تھا۔

حضور بیگم، اُن کے ان لچھنوں سے بے خبر نہ تھیں لیکن یہ سوچ کر عام طور سے چشم پوشی سے کام لیتیں کہ وہ بہرحال، خاندانی نواب تھے۔ اور وہ نواب ہی کیا عورت جس کی کمزوری نہ ہو۔ خود اُن کے سامنے والد مرحوم کی مثال تھی بڑھاپے میں بھی ایک طوائف باقاعدہ مُلازم رہی خود کبھی چوک کے کسی بالاخانے پر نہ جاتے تھے، طوائف کو بُلوا لیتے وہ مہینوں اُن کے ساتھ دیوان خانے میں قیام کرتی۔ زنان خانے میں بھی اُس کی آمدورفت رہتی تھی۔ حضور بیگم کی والدہ نے کبھی اُس کی آمد پر مُنہ نہ بگاڑا نہ کسی طور نفرت کا اظہار کیا۔ شوہر کی دل داری منظور تھی۔ لہٰذا اُس کی بھی دل داری کرتی تھیں

پاس بٹھاتی تھیں پان اور شربت سے تواضع کرتی تھیں۔

حضور بیگم نے اپنے چچاؤں اور ماموؤں کی محل سراؤں کا بھی یہی حال دیکھا تھا سب طوائفیں بے دھڑک، زنان خانوں میں آتی جاتی تھیں البتہ ایک ممانی، اس معاملے میں بڑی سخت گیر واقع ہوئی تھیں۔ انہیں دیوان خانے میں طوائف کے رہنے پر کوئی اعتراض نہ تھا لیکن زنان خانے کی انگنائی میں قدم رکھنے کی کبھی اجازت نہ دی۔ میاں سے اس سلسلے میں خاصی رنجش رہی، بڑا ہنگامہ برپا ہوا مگر وہ ضد کی ایسی پکی تھیں کہ اپنی بات منوا کے رہیں۔

☆

شبرتیا جلد ہی نواب صاحب کی نظروں میں کھب گئی۔ اتفاق سے حضور بیگم ان دنوں اپنی بھانجی کی شادی کے سلسلے میں بڑی بہن کے گھر میں مقیم تھیں۔ دونوں بہنوں میں اس قدر محبت تھی کہ ایک دوسرے پر جان چھڑکتی تھیں۔ بڑی بہن نے شادی سے مہینہ بھر پہلے ہی حضور بیگم کو اپنے پاس بلا لیا تھا اور بیٹی کی شادی کی تمام ذمے داری اُن کے سپرد کر دی تھی۔

نواب صاحب نے بیوی کی غیر حاضری سے فائدہ اُٹھایا۔ شبرتیا کو بے دھڑک خلوت میں بلا لیتے۔ وہ اُلھڑ ہونے کے ساتھ ساتھ پیٹ کی بھی ہلکی تھی۔ دوسری ماماؤں اور لونڈیوں سے نواب صاحب کی خلوت کے راز، اترا اترا کر نہایت دھڑلے سے سُناتی اُس نے کام کاج بھی چھوڑ دیا تھا۔ نواب صاحب دیوان خانے میں ہوتے اور وہ دن بھر اپنی چارپائی پر پڑی اینڈتی رہتی۔ شام ہوتے ہی کنگھی چوٹی کر کے نواب صاحب کے انتظار میں بیٹھ جاتی۔

حضور بیگم شادی سے واپس آئیں۔ شبرتیا کے رنگ ڈھنگ دیکھے تو خون کھولنے لگا۔ بیساکھ کا مہینہ ختم ہو رہا تھا، گرمی بڑھ گئی تھی۔ نواب صاحب، بالائی منزل پر سوتے تھے۔ رات کو اُن کی خدمت کے لئے ایک پیش خدمت مقرر تھی۔ وہ زینے کے پہلو میں واقع دُوچھتی میں رہتی۔ رات کو کسی وقت کوئی بھی ضرورت پیش آتی تو نواب

صاحب اُسے طلب کرتے۔ حضور بیگم نے اس خدمت کے لئے کسی اور خادمہ کو مقرر کیا تھا مگر اُن کی عدم موجودگی میں نواب صاحب نے یہ خدمت شبر یتا کے سپرد کر دی تھی۔

بیگم نے یہ تبدیلی دیکھی مگر خاموش رہیں دل ہی دل میں سلگتی رہتیں۔ شامت اعمال! ایک روز شبر یتا نے حسب معمول باتوں باتوں میں ایک خواص سے جوانی کے زعم میں یہ بھی کہہ دیا کہ نواب صاحب تو حضور بیگم کو ذرا بھی نہیں چاہتے۔ کہتے ہیں کہ وہ تو صرف نام کی بیگم رہ گئی ہیں کسی کام کی نہیں۔ پاس بٹھانے کو بھی جی نہیں چاہتا۔ بوڑھی ڈھڈو ہو گئی ہیں۔

وہ کیا ساری ہی خواصیں اور دوسری خادمائیں شبر یتا کی چڑھی کمان دیکھ کر اندر ہی اندر جلتی تھیں۔ خواص نے شبر یتا کی باتیں سُنیں تو فوراً حضور بیگم کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ شبر یتا کی ایک ایک بات بیان کی۔ سُنتے ہی حضور بیگم شعلے کی طرح بھڑک اُٹھیں۔ اپنی اس قدر تحقیر برداشت نہ کر سکیں۔ شبر یتا کو بُلا کر خُوب فضیتا کیا۔ شبر یتا کو نواب صاحب کی چاہت کا مان تھا۔ زبان درازی کی کوشش کی تو حضور بیگم نے غضب ناک ہو کر جُوتی اُٹھائی اور دھڑ سے شبر یتا کے مُنہ پر دے ماری۔

جُوتی کی چوٹ کھا کر وہ زور زور سے رونے لگی۔

اُس کے اس طرح رونے دھونے پر، حضور بیگم اور چراغ پا ہو گئیں۔ زور سے دھاڑیں "شتل، قطامہ! چوری اور سینہ زوری۔ کیسا فیل مچا رہی ہے۔ دُور ہو جا میری نظروں کے سامنے سے۔ میں تیری صُورت بھی یہاں دیکھنا نہیں چاہتی"

شبر یتا نے گھبرا کر صفائی پیش کرنا چاہی مگر حضور بیگم نے اُس کی ایک نہ سُنی کھڑے کھڑے نکال باہر کیا۔ وہ روتی پیٹتی دیوان خانے میں پہنچی۔ دوپہر کا وقت تھا۔ نواب صاحب اپنے کمرے میں آرام کر رہے تھے لیکن داروغہ میر نصیر اتفاق سے موجود تھے۔ ویسے بھی اب ان کا بیشتر وقت مقدمہ بازی کی جوڑ توڑ اور بھاگ دوڑ میں یا نواب صاحب کی حاضر باشی میں گزرتا تھا۔ حضور بیگم کی جائیداد کی دیکھ بھال

کے لئے انہوں نے نواب صاحب کی اجازت سے غلام صفدر خاں کو اپنے نائب کے طور پر مقرر کر دیا تھا۔ دو چار ماہ بعد خود بھی علاقے کا دورہ کر لیتے۔ البتہ فصلوں کی کٹائی کے وقت وصولی کے لئے وہ ہمیشہ موجود رہتے۔

شبر یتا نے ان سے فریاد کی۔ میر نصیر کی اُس کے ساتھ پہلے ہی آشنائی تھی۔ وہ اُسے آلہ کار کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ جو نواب صاحب سے براہ راست نہ کہہ سکتے تھے، شبر یتا کے ذریعے پہنچا دیتے۔ بارہ دری میں شبر یتا کی موجودگی اور نواب صاحب کا قُرب، داروغہ نصیر کے لئے نہایت کارآمد تھا۔

داروغہ نصیر نے شبر یتا کو تسلّی دی۔ دل جوئی کی باتیں کیں۔ سہ پہر کو نواب صاحب بیدار ہُوئے تو داروغہ نصیر نے شبر یتا کا مقدمہ اُن کے رُو برو پیش کیا۔ شبر یتا نے بھی رو رو کر اپنی بپتا سُنائی۔ نواب صاحب کے دل میں ابھی تک شبر یتا کی چاہت موجود تھی۔ اُنہوں نے توجہ سے سب کچھ سُنا اور اطمینان دلایا کہ بیگم کو سمجھا بجھا کر شبر یتا کو معافی دلا دیں گے۔ پریشان ہونے اور خود کو ہلکان کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔

داروغہ میر نصیر مطمئن ہو گئے۔ اُنہوں نے شبر یتا کو بارہ دری سے جانے نہ دیا مہمانوں کے قیام کے لئے جو کمرے تھے اُن میں سے ایک کمرے میں اسے ٹھہرا دیا۔

میر منشی زوّار حسین بھی اس وقت موجود تھے۔ انہوں نے سارا قضیّہ دیکھا اور سُنا۔ داروغہ نصیر نے شبر یتا کی جس طرح کھلم کُھلا طرف داری کی اس کا بھی بخوبی اندازہ لگایا مگر خاموش رہے۔ مطلق دخل نہ دیا۔ میر نصیر سے پہلے ہی وہ خار کھاتے تھے۔ ایک زمانہ تھا کہ انہیں نواب صاحب کا اس قدر قرب حاصل تھا کہ ہر معاملے میں ان سے مشورہ کرتے۔ ان کی مرضی اور منشا کے بغیر کوئی کام نہ ہوتا۔ لیکن میر نصیر نے نواب صاحب کو اب اس طرح اپنی مٹھّی میں لے لیا تھا کہ میر منشی زوّار حسین بالکل عضوِ معطل ہو کر رہ گئے تھے۔ مشورہ درکنار اب نواب صاحب ان سے سیدھے مُنہ بات بھی نہ کرتے تھے۔ ان کے اس ادبار اور خواری کا سبب صرف اور صرف میر نصیر تھے جو ہر وقت ان کی کاٹ میں لگے رہتے تھے۔ میر منشی زوّار حسین بھی تاک میں تھے کہ کوئی

موقع ہاتھ آئے اور وہ داروغہ نصیر کو نیچا دکھائیں۔ شبر تیا کے فقیٹے نے یہ موقع فراہم کر دیا۔ وہ حضور بیگم کو میر نصیر کی طرف سے بدگمان کر سکتے تھے جن کی جائیداد اور زمین داری کے اب وہ منتظم اعلیٰ تھے۔ زوّار حسین نے حضور بیگم کی خواص، گل بدن کو اعتماد میں لیا اور اسے ایک ایک بات بتا دی۔ اس نے حضور بیگم کو فوراً صورت حال سے آگاہ کر دیا۔

پہر رات گزری، محفل برخاست ہوئی۔ نواب صاحب دیوان خانے سے اُٹھ کر زنان خانے میں گئے۔ اُن کے پہنچتے ہی دستر خوان لگا دیا گیا۔ بیگم معمول کے مطابق نواب صاحب کے ساتھ دستر خوان پر آ کر بیٹھ گئیں۔ نواب صاحب نے کھانے کے دوران میں شبر بنا کی بات چھیڑی۔ مُسکرا کر بولے۔

"سُنا ہے، بیگم! آپ نے ہماری پیش خدمت شبر بتا کو مُلازمت سے برطرف کر دیا ہے۔" انھوں نے قدرے تامّل کیا پھر نرم لہجے میں گویا ہوئے۔ "اُس سے ایسا کیا قصور سرزد ہو گیا۔ جو آپ اس قدر ناراض ہو گئیں؟"

بیگم پہلے ہی جلی بھُنی بیٹھی تھیں۔ اُن کے مخبر مطلع کر چکے تھے کہ شبر بنا، نواب صاحب کے رُوبرُو فریادی ہوئی ہے اور ابھی تک دیوان خانے میں ٹھہری ہے۔ اُنھوں نے بے نیازی سے جواب دیا۔

"کم بخت! کام کی نہ کاج کی۔ ہر دم ٹھی ٹھی کرتی رہتی تھی۔ میں نے اُس کی حرام خوری بہت برداشت کی، لیکن پانی اب سر سے اُونچا ہو چکا تھا۔" اُن کے لہجے میں جھلاّہٹ تھی۔

"غصّہ تھُوک دیجئے۔ اُسے ایک موقع اور دیجئے۔ وہ خود بہت نادم ہے"۔ نواب صاحب نے نرمی سے کہا۔

"تو گویا وہ، آپ کے پاس فریاد لے کر پہنچی تھی"۔ بیگم نے تیکھی نظروں سے نواب صاحب کو دیکھا۔ "بڑی ہمدردی ہے، آپ کو، اُس سے۔ کیوں نہ ہو، سر پر بھی تو آپ ہی نے چڑھا رکھا ہے۔"

"بیگم! آپ تو ناحق بدگمانی میں مُبتلا ہو جاتی ہیں"۔ نواب صاحب نے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔ "مجھ سے تو داروغہ میر نصیر نے اُس کی سفارش کی تھی"۔

"کیوں نہ سفارش کریں گے۔ وہی تو اس شطّاح کو لے کر آئے تھے"۔ بیگم جل کر بولیں۔ "بہر حال، میں تو اب اُس کی صُورت دیکھنے کی بھی روادار نہیں"۔

نواب صاحب نے دبی زبان سے اصرار کیا۔ داروغہ نصیر کی سفارش پر خصوصیت کے ساتھ زور دیا مگر بیگم اور بھڑک اُٹھیں۔ نواب صاحب نے سمجھانے بجھانے کی کوشش کی لیکن وہ، شبر تیا کی مُلازمت بحال کرنے پر کسی طور رضامند نہ ہوئیں۔

اُس وقت تو بات آئی گئی ہو گئی مگر حضور بیگم کی برہمی کم نہ ہوئی۔ داروغہ نصیر سے وہ پہلے ہی خوش نہ تھیں۔ شبر تیا کے سلسلے میں انہوں نے جو وتیرہ اختیار کیا تھا اُس نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ وہ اُن کی جاگیر اور جائیداد کے منتظم ہونے کی حیثیت سے ایک طرح سے اُن کے ذاتی ملازم تھے۔ حضور بیگم کو اس قدر طیش آیا کہ دوسرے روز داروغہ نصیر کو بھی مُلازمت سے برطرف کر دیا۔

نواب صاحب بہت سٹپٹائے۔ لینے کے دینے پڑ گئے۔ شبر تیا کے ساتھ ساتھ داروغہ نصیر کا بھی پتّا کٹ گیا۔ وہ نواب صاحب کے نہایت بااعتماد آدمی تھے۔ ہر معاملے میں اُن سے مشورہ کرتے تھے۔ راز دار بھی تھے اور ایسے راز دار تھے کہ نواب صاحب کے اُن رازوں سے بھی واقف تھے جن سے حضور بیگم بھی واقف نہ تھیں اور مقدمے بازی کے داؤ پیچ کے تو ایسے ماہر تھے کہ وکیل بھی اُن کی قانونی سوجھ بوجھ کے قائل تھے۔

نواب صاحب نے بیگم کو منانے کی لاکھ کوشش کی۔ شبر تیا کی سفارش سے بھی دست بردار ہو گئے مگر وہ داروغہ نصیر کو دوبارہ مُلازم رکھنے پر رضامند نہ ہوئیں اُن کا نام سُنتے ہی بھڑک اُٹھتیں۔ غیظ و غضب کے عالم میں ہزاروں صلواتیں سُناتیں نواب صاحب بیگم کو کسی طور رام کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ شبر تیا کے ساتھ ساتھ داروغہ نصیر کا بھی بارہ دری سے رشتہ ختم ہو گیا۔

ان کی برطرفی سے کوئی خلا نہ پیدا ہوا۔ حضور بیگم کی جائیداد اور املاک کی دیکھ بھال کے لئے غلام صفدر خاں موجود ہی تھے۔ میر منشی زوّار حسین کے اختیارات بحال ہو گئے۔ مقدمے کی پیروی ایک بار پھر اُن کے سپرد کر دی گئی۔ وہ زیادہ مستعدی اور لگن سے ہر خدمت انجام دینے لگے۔ نواب تقی کو میر نصیر کی علحٰدگی کا جس قدر ملال تھا زوّار حسین اسی قدر مسرور اور شادماں تھے۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ میر نصیر سے اتنی جلدی چھٹکارہ مل جائے گا۔

داروغہ نصیر چند روز تو مُلازمت سے برطرف ہونے کے بعد گھر پر خاموش بیٹھے رہے پھر اُنہوں نے بارہ دری کے چکر کاٹنا شروع کر دیئے۔ نواب صاحب کی منت سماجت بھی کرتے۔ بار بار صفائی پیش کرتے مگر نواب صاحب مجبور تھے۔ بیگم کے سامنے داروغہ نصیر کا نام بھی لیتے تو اُن کی تیوری پر بل پڑ جاتے۔ مُلازمت پر بحال کرنا تو درکنار اُنہیں داروغہ نصیر کا نام تک سُننا گوارہ نہ تھا۔

نواب صاحب نے داروغہ نصیر سے اپنی مجبوری اور بیگم کی شدید برہمی کا صاف صاف اظہار کر دیا۔ وہ اُن سے ہمدردی بھی رکھتے تھے۔ مگر اُن کے معاملے میں بیگم کے سامنے اُن کی ایک نہیں چل رہی تھی۔ داروغہ نصیر مایوس ہو کر چلے گئے۔ وہ ایسے دل برداشتہ ہو کر گئے کہ اُن کے رویئے سے صاف عیاں تھا کہ آئندہ نہیں آئیں گے۔

☆

میر نصیر ایک شام پھر نواب صاحب کے پاس پہنچے۔ تخلیہ میں اُن سے بات کرنے کی درخواست کی۔ نواب صاحب انہیں علحٰدہ کمرے میں لے گئے۔ میر نصیر کے چہرے سے پریشانی عیاں تھی۔

نواب تقی نے اُن کا چہرہ غور سے دیکھتے ہوئے پریشانی کا سبب پوچھا "میر صاحب آج کچھ پریشان پریشان نظر آ رہے ہو۔ خیریت تو ہے؟"

"سرکار! پریشانی کی بات ہی ہے"! میر نصیر نے بُجھے ہوئے لہجے میں بولے"۔ حضور! میرا

حال ، آپ سے کیا چھپا ہے۔ عیال دار ہوں ، آپ کی سرکار سے جو تنخواہ ملتی تھی وہ بھی آپ کے علم میں ہے ، پس انداز کرنے کی گنجائش ہی نہ تھی۔ بیوی کے پاس جو ٹوم چھلاّ تھا ، اُسے بیچ کر کام چلا رہا ہوں ! اس کے بعد گرہستی کا جو سامان ہے ، اُسے فروخت کرنے کی نوبت آجائے گی۔"

نواب صاحب تذبذب میں پڑ گئے۔ بیوی کے سخت رویّے سے وہ بخوبی آگاہ تھے۔ میر نصیر اپنی پریشان حالی بیان کر کے دوبارہ مُلازمت پر آنا چاہتے تھے اور نواب نقی کے لئے ایسا کرنا ممکن نہ تھا۔ بیوی سے اُن کے لئے جو کچھ کہہ سکتے تھے کہہ چکے تھے مقدمہ شروع ہونے کے بعد بیوی کی جائیداد اور املاک ہی کے سہارے گزر بسر ہو رہی تھی وہ اپنی اس کمزوری سے بخوبی واقف تھے۔ لہٰذا بیوی سے اور زیادہ دبنے لگے تھے

میر نصیر نے نواب نقی کو خاموش پایا تو خود ہی سکوت توڑا۔ کہنے لگے۔" آج تو میں ، آپ سے ایک خاص بات عرض کرنے کے لئے حاضر ہُوا تھا۔"

" خاص بات !" نواب نقی نے چونک کر پوچھا " میر صاحب ! ایسی کیا خاص بات ہے ؟ تردّد کی ضرورت نہیں۔ صاف صاف بیان کیجئے۔"

" چند روز قبل نواب صفی نے مجھے بلایا تھا۔" داروغہ میر نصیر نے دبی زبان سے بتایا۔

" اچھا !" نواب صاحب نے حیران و پریشان ہو کر اپنے فوری ردعمل کا اظہار کیا " تو پھر تم اُن کے پاس گئے تھے ؟"

" جی ہاں گیا تو تھا۔" داروغہ میر نصیر نے جھجکتے ہوئے جواب دیا۔

نواب صاحب نے کرید کر پوچھا۔" کیا کہتے تھے وہ ؟"

میر نصیر نے اس دفعہ بھی دبی زبان سے بتایا۔" فرماتے تھے ، نواب نقی نے تمہارے ایسے کام کے آدمی کی قدر نہ کی۔ میرے پاس آجاؤ۔ جو تنخواہ انکی سرکار سے پاتے تھے اس سے دگنی ملے گی۔"

میر نصیر نے یہ بات بھی سچ ہی کہی تھی۔ نواب صفی مقدمے کے سلسلے میں میر نصیر کی اہمیت سے واقف تھے وہ انہیں اپنے پاس ملازم رکھنے کے خواہاں تھے اگر

میر نصیر اُن کے پاس چلے جاتے تو مقدمے میں نہایت مددگار ثابت ہو سکتے تھے۔

نواب تقی کو پہلے ہی اس امکان کا دھڑکا تھا۔ میر نصیر کی بات سُن کر وہ پریشان ہو گئے۔ پریشان ہونے کی بات ہی تھی۔ میر نصیر اُن کے مقدمے کے ہر راز سے واقف تھے سچ تو یہ ہے کہ مقدمے کی پیروی میں اب وہی پیش پیش تھے۔

نواب صاحب نے دھڑکتے دل سے دریافت کیا۔ میر صاحب تم نے کیا جواب دیا؟

"سرکار کا برسوں نمک کھایا ہے۔ مجھ سے یہ گوارہ نہ ہُوا"۔ میر نصیر نے اس بار ذرا جما کر بات کی۔ گردن اونچی کر کے نواب تقی کو اپنی وفاداری کا یقین دلایا۔ ہاتھ جوڑ کر اُن سے عرض کیا کہ مجھ سے ایسی توقع نہ رکھیں۔"

نواب تقی خوشی سے چہک کر بولے۔" میر نصیر! مجھے تم سے یہی توقع تھی"۔ اُنہوں نے ایک بار پھر صفائی پیش کی۔" تمہیں میری مجبوری کا علم ہے۔ کیا کروں، بیگم کے دل میں تمہاری طرف سے اس قدر کدورت بھری ہے کہ وہ کسی طور آمادہ ہی نہیں ہوتیں معلوم نہیں کس نے اُن کو اتنا برگشتہ کر دیا۔"

یہ گویا نواب صاحب کی طرف سے دوسرے لفظوں میں انکار تھا۔ پہلے بھی وہ اسی طرح اپنی مجبوری اور حضور بیگم کی ضد کا اظہار کر چکے تھے۔ میر نصیر کو توقع تھی کہ نواب صفی کی پیش کش کے بارے میں اطلاع ملتے ہی نواب تقی اُنہیں ملازمت پر بحال کرنے کے لئے آمادہ ہو جائیں گے۔ وہ حضور بیگم کے سامنے نواب تقی کو اتنا مجبور نہ سمجھتے تھے جس کا وہ اظہار کر رہے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ نواب تقی اگر اپنی بات پر اڑ جائیں تو حضور بیگم کو بادل نخواستہ ہتھیار ڈالنا ہی پڑیں گے۔ نواب تقی بہر حال اُن کے شوہر تھے، اور شوہر کی اطاعت اور فرماں برداری اُن کی گھٹی میں پڑی تھی۔

میر نصیر نے اس دفعہ پینترا بدلا۔ نئے ڈھب سے بات شروع کی۔ جھجکتے ہوئے بولے۔" نواب صفی سے ملنے کے بعد مجھے ایک فکر لاحق ہو گئی ہے۔ اسی پریشانی میں دن رات غلطاں و پیچاں رہا۔ جب پریشانی زیادہ بڑھی تو سرکار کی خدمت میں حاضر ہو کر اس کا اظہار کرنا مناسب سمجھا۔"

نواب صاحب کو ایک بار پھر تشویش لاحق ہوئی۔ گھبرا کر استفسار کیا۔ "میر نصیر! ایسی پریشانی کی کیا بات ہے، کھل کر بتاؤ؟"

"سرکار! مجھے نواب صفی کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ انہیں آپ کی والدہ ماجدہ کے نکاح نامے کے جعلی ہونے کا شبہ ہو گیا ہے وہ اس کا سراغ لگانے کی ٹوہ میں ہیں۔" میر نصیر نے اس دفعہ سیدھی سیدھی دھمکی سے کام لیا۔ "جس وقت یہ گفتگو ہو رہی تھی نواب صفی کے وکیل رام نرائن اوستھی بھی موجود تھے۔ انہوں نے فرمایا کہ جعلی دستاویز کو اصل ظاہر کرنے والے کے لئے تعزیرات ہند کی دفعہ ۴۷۱ کی رو سے دس سال قید اور جرمانے کی سزا مقرر کی گئی ہے۔"

اس دھمکی کا وہی اثر ہوا جس کی میر نصیر کو توقع تھی۔ دس سال قید کی سزا کے تصور ہی سے نواب نقی لرزہ براندام ہو گئے۔ ہوش و حواس بجا نہ رہے دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ چہرے پر مردنی چھا گئی۔ انہوں نے صرف ہوں کی اور گہری فکر میں ڈوب گئے۔

میر نصیر نہایت گھاگ اور چلتے پرزہ تھے۔ نواب نقی کو اس قدر پریشانی کے عالم میں پایا تو نیا انجھر پھینکا۔ دبی زبان سے بولے۔ "سرکار! میرے منہ میں خاک خدانخواستہ یہ راز افشا ہو گیا تو سخت پریشانی کا باعث ہو گا۔ اب تک تو دیوانی مقدمہ تھا۔ نکاح نامہ جعلی ثابت ہو گیا تو آپ کے خلاف جعل سازی کے الزام میں فوجداری مقدمہ قائم ہو سکتا ہے۔" میر نصیر نے نواب صاحب کے رہے سہے حواس بھی گم کر دیئے۔ "سرکار! مصیبت یہ ہے کہ اس مقصد کے لئے وہ، مجھے آلۂ کار کے طور پر استعمال کرنا چاہتے ہیں۔" میر نصیر نے اپنی اہمیت جتائی۔ "میں نے تو صاف انکار کر دیا تھا مگر وہ باز نہ آئے۔"

"اور کیا، کہا، انہوں نے؟" نواب نقی نے گھبرا کر پوچھا۔

میر نصیر کو بخوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ نواب نقی اب پوری طرح اُن کی گرفت میں آ چکے ہیں۔ حقیقت یہ تھی کہ نواب صفی نے نکاح نامے کے جعلی ہونے کے بارے میں کوئی تذکرہ نہیں کیا تھا۔ وہ صرف میر نصیر کو ملازم رکھ کر، مقدمے کی پیروی میں خاطر خواہ فائدہ حاصل

کرنا چاہتے تھے مگر میر نصیر، اُن کی ملازمت کرنا نہ چاہتے تھے۔ نواب صاحب کی ملازمت میں انہیں اتنے وسیع اختیارات حاصل تھے کہ اُن کے پو بارہ تھے۔ حضور بیگم کی جائیداد اور زمین داری کا سارا انتظام ان کے ہاتھ میں تھا۔ جو جی چاہتا کرتے تھے۔ ایک خرچ کرتے تھے، دس بتاتے تھے۔ بظاہر ہر وقت اپنی پریشان حالی بیان کرتے رہتے تھے مگر اُن کے گھر میں گویا مَن برس رہا تھا۔ نواب صاحب دوسرے نوابوں اور رئیسوں کی طرح اپنی تفریحات اور مشاغل میں ڈوبے رہتے تھے۔ پلٹ کر کبھی زمینداری کی جانب دیکھنے کی زحمت گوارہ نہ کی۔ میر نصیر پر اس قدر اعتماد تھا کہ اُنہوں نے آمد و خرچ کا جو حساب کتاب پیش کیا، اُسے آنکھیں بند کر کے تسلیم کر لیا۔ میر منشی زوار حسین نے دبی زبان سے کئی بار اصل حقیقت بتانے کی کوشش بھی کی مگر نواب صاحب نے ان کی مطلق حوصلہ افزائی نہ کی۔ میر نصیر نے ایسا رنگ جمایا تھا کہ ان کے خلاف نواب صاحب کو کچھ سننا گوارہ نہ تھا۔

میر نصیر نے نواب تقی کو سخت تشویش کے عالم میں پایا تو مسکین سی صورت بنا کر خود کو معصوم ثابت کرنے کی کوشش کی۔ "سرکار! کیا عرض کروں، کس مصیبت میں گرفتار ہوں۔ نواب صفی نے تو میری خدمات حاصل کرنے کے لئے کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا۔ ظلم یہ کیا کہ اپنے اعتماد کی ایک بوڑھی خرانٹ مُلازمہ کو میرے گھر بھیجا۔ اُس نے میری اہلیہ کو ایسی پٹی پڑھائی، ایسے سبز باغ دکھائے کہ وہ، اُس کے دام میں آ گئیں۔ ہر دم گھر کی پریشانی کا رونا روتی رہتی ہیں۔ اُن کا اصرار ہے کہ میں نواب صفی کی مُلازمت فوراً قبول کر لوں۔ انہوں نے تو میرا ناک میں دم کر دیا ہے، سرکار آپ جانتے ہیں کہ یہ عورتیں تو ہوتی ہی ناقص العقل ہیں۔ میں سمجھاتا ہوں تو ان کی سمجھ میں خاک نہیں آتا۔ اُنہیں تو صرف اپنی پریشانی کی فکر ہے۔"

"ٹھیک کہہ رہے ہو، میر نصیر!" نواب صاحب نے اُن سے اتفاق رائے کیا۔ اُن کے سامنے حضور بیگم کی ضد اور ہٹ کی نظیر تھی۔ "یہ عورتیں، زندگی کے نشیب و فراز کو بالکل نہیں سمجھتیں۔"

"سرکار! سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ میں نواب صفی سے ملنے سے کترا رہا ہوں اور انہوں نے اپنے ملازمین کو اس طرح میرے پیچھے لگا دیا ہے کہ اُن سے چھپتا پھرتا ہوں۔ گھر میں رہتا ہوں تو بیوی ناطقہ بند کر دیتی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا، کیا کروں؟"

میر نصیر دبی زبان سے گویا ہوئے۔ "یہی نظر آتا ہے کہ نواب صفی کی ملازمت بدرجۂ مجبوری اختیار کرنا ہی پڑے گی۔ آپ جانتے ہیں کہ میں نے کبھی نمک حرامی نہیں کی اب اُن کا نمک کھاؤں گا تو اس کا حق تو بہر حال ادا ہی کرنا پڑے گا۔ کیا عرض کروں، جان زیق میں ہے۔ اسی پریشانی کے عالم میں حضور کی خدمت میں حاضر ہُوا ہُوں، حکم دیں کہ میں کیا کروں؟"

نواب نقی نے خود کو سنبھالا۔ میر نصیر کو تسلّی دی اور وعدہ کیا۔ "میں آج بیگم سے تمہارے بارے میں دوٹوک بات کروں گا۔ یقین ہے کہ کوئی نہ کوئی سبیل پیدا ہو جائے گی۔"

"مگر سرکار! میرے بارے میں جلد فیصلہ ہو جانا چاہیئے۔" میر نصیر نے عاجزی سے کہا "میں تو اس سرکار کا پرانا نمک خوار ہوں۔ دوسری سرکار، اور وہ بھی آپ کی شدید مخالف سرکار سے وابستگی کو میرا ضمیر گوارہ نہیں کرتا۔ مگر اس مجبوری کو کیا کروں، کیسے بیان کروں؟"

میر نصیر کی آواز بھرّا گئی۔ نواب نقی بہت متاثر ہُوئے۔ اُن کی دل جوئی کی، ہر طرح اطمینان دلایا۔ میر نصیر دعائیں دیتے ہُوئے معمول کے مطابق رُخصت ہو گئے۔

٭

میر نصیر کی باتوں نے نواب نقی کے ذہن میں خلفشار پیدا کر دیا تھا۔ ان کی پریشانی برقرار رہی۔ اسی بے چینی کے عالم میں شام گزری۔ اندھیرا بڑھنے لگا آخر دل بہلانے کو انہوں نے شطرنج کی بساط بچھائی، لیکن دماغ حاضر نہ تھا۔ ذہن میں ایسی ہلچل برپا تھی کہ چالیں اُلٹی سیدھی چلتے تھے۔

دیوان خانے سے اُٹھ کر زنان خانے میں گئے تو بدستور پریشان اور فکر مند تھے۔ دستر خوان بچھا، کھانا چنا گیا مگر وہ پریشانی میں کھانا بھی ٹھیک سے نہ کھا سکے۔ دو چار لقموں کے بعد ہی ہاتھ کھینچ لیا۔

حضور بیگم نے پوچھا۔ آج تو آپ نے کچھ بھی نہیں کھایا۔ خیریت تو ہے؟
طبیعت کیسی ہے"؟
"ہاں طبیعت میں کچھ انقباض ہے"۔ نواب صاحب نے کھل کر بات نہ کی۔ اُوپر
چلیے، تخلیہ میں کچھ ضروری بات کرنا ہے"۔
بیگم کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ تیکھے لہجے میں بولیں۔ "مجھے اطلاع مل چکی ہے کہ
داروغہ نصیر شام کو آپ کے پاس آئے تھے۔ انھی کے بارے میں بات کرنا چاہتے ہیں نا؟
"آپ کا قیاس درست ہے"۔ نواب صاحب انکار نہ کر سکے۔ "میں انھی کے بارے
میں بات کرنا چاہتا تھا"۔
"میں کہتی ہوں اللہ اللہ کر کے اس مصیبت سے چھٹکارا ملا ہے"۔ بیگم نے ترش
روئی سے کہا۔ "آپ کی آنکھوں پر تو جیسے اُس نے پٹی باندھ دی ہے۔ دونوں ہاتھوں
سے لُوٹ رہا تھا۔ وہ دن دُور نہیں تھا کہ ساری زمین داری ہڑپ کر جاتا"۔ اُن کا
لہجہ قدرے نرم پڑ گیا۔ "غلام صفدر خان اچھے بھلے کام کر رہے ہیں کچھ بوڑھے تو
ضرور ہیں مگر دیانت دار اور محنتی ہیں۔ اب اُن کو ہٹا کر، میر نصیر کو دوبارہ مقرر
کرنے کی کیا تُک ہے"؟
"آپ کو کیا خبر، مقدمے کے سلسلے میں مجھے میر نصیر کی کس قدر ضرورت ہے"؟
نواب صاحب نے میر نصیر کی اہمیت جتانے کی کوشش کی۔ "مقدمے کی تمام پیروی
وہی کر رہے تھے"۔
"اے، آپ کو تو وہم ہو گیا ہے۔ میر نصیر کہاں کا ایسا قانون دان ہو گیا ہے کہ
اُس کے بغیر کام ہی نہیں چل سکتا۔ میر منشی زوّار حسین تو موجود ہیں، پہلے بھی وہی
پیروی کرتے تھے۔ میر نصیر کو خدا معلوم کیا سوجھ کر آپ نے ان کی جگہ لگا دیا تھا
اور سو باتوں کی ایک بات یہ ہے کہ وکیل آخر کس مرض کی دوا ہے اس سے کام
نہیں چلتا تو دوسرا وکیل کھڑا کر دیجیے"۔
"مگر مجھے تو اپنے مقدمے کے لئے داروغہ میر نصیر ہی کی ضرورت ہے"۔ نواب

صاحب نے اصرار کیا۔ زور دے کر کہا۔ "بیگم! آپ بات کو سمجھنے کی کوشش تو کیجئے"۔
"میں خوب سمجھتی ہوں۔ اب زیادہ سمجھانے کی ضرورت نہیں"۔ بیگم تنک کر بولیں
"بہت ہو چکی، اُس موئے الفتے کی سفارش۔ میں نے ہزار دفعہ کہہ دیا کہ میں اُس منحوس
کا نام بھی سُننا نہیں چاہتی۔"

نواب صاحب نے اُن کو ایک بار پھر رام کرنے کی کوشش کی۔ مگر حضور بیگم
آپے سے باہر ہو گئیں۔ خادماؤں اور خواصوں کی موجودگی ہی میں نواب صاحب کو
اس بُری طرح جھڑکا کہ اُن کی سوئی ہوئی مردانگی جاگ اُٹھی۔ بیگم کو قہر آلود نظروں
سے گھور کر دیکھا لیکن صرف اتنا کہہ سکے۔

"بیگم! آپ کی زبان بہت چل گئی ہے۔ آپ حد سے تجاوز کرتی جا رہی ہیں"۔
بیگم نے اُن کو کبھی اس قدر غیظ و غضب کے عالم میں نہ دیکھا تھا۔ بات کو آگے
نہ بڑھایا۔ خاموش بیٹھی رہیں۔

نواب صاحب مُنہ پھُلائے ہوئے اُٹھے۔ زینے کی جانب بڑھے اور سیڑھیاں
طے کرتے ہوئے اوپر چھت پر چلے گئے۔ کچھ دیر بے چینی کے عالم میں ٹہلتے رہے پھر
آرام کرنے کی غرض سے بستر پر لیٹ گئے مگر بے چینی کم نہ ہوئی۔ بار بار خاص دان
سے گلوریاں نکال نکال کر کھاتے رہے۔ بے قراری سے پہلو بدلتے رہے۔ ذہنی
اُلجھن کسی طور کم نہ ہوتی تھی۔ میر نصیر خطرہ بن کر سر پر سوار تھے۔ بیگم کو اس خطرے
کی بنیادی وجہ سے آگاہ بھی نہ کرنا چاہتے تھے۔ جعلی نکاح نامے کے بارے میں اُنھوں
نے اب تک نہ بیگم سے کوئی ذکر کیا تھا نہ کرنا چاہتے تھے۔ اس میں سراسر اُن کی
سُبکی تھی۔ خدشہ تھا کہ وہ بیگم کی نظروں میں گر جائیں گے۔ یہ نہ صرف اُن کی عزّت
و وقار کا معاملہ تھا بلکہ ان کی والدہ مرحومہ کی ناموس پر بھی حرف آتا تھا۔

✡

رات آدھی ہو گئی۔ چاند دھیرے دھیرے مغرب کی جانب ڈھلنے لگا۔
نواب صاحب پر رفتہ رفتہ غنودگی طاری ہونے لگی۔ اُن کی آنکھ لگ گئی وہ گہری

نیند سو گئے۔ دفعتہً کسی آہٹ سے اُن کی آنکھ کھل گئی۔ سرہانے کی جانب ہلکی سی چاپ سُنائی دی۔ اُنھوں نے فوراً آنکھیں کھول دیں۔ سائبان کے نیچے اندھیرے میں ایک انسانی سایہ لہراتا نظر آیا۔ ہر طرف کافور کی تیز بُو پھیلی ہوئی تھی۔ چند لمحے تک وہ دم بخود، آنکھیں کھولے لیٹے رہے پھر گھبرا کر اُٹھ بیٹھے اور زیر لب نادِ علی پڑھنے لگے۔ ان کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

اُنھوں نے سہمی ہوئی نگاہوں سے دیکھا۔ زرد زرد چاندنی میں کوئی سفید کفن لپیٹے ہوئے، مشرقی دیوار کی اوٹ میں اس طرح چل رہا تھا کہ جسم سے لپٹے ہوئے کفن کا نچلا حصّہ فرش پر گھسٹتا جا رہا تھا اور اُس کی سرسراہٹ رات کے سنّاٹے میں صاف سُنائی دے رہی تھی۔ چاندنی سے وہ اندھیرے میں پہنچا اور آن کی آن میں چھلاوے کی مانند نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔

دہشت کے مارے نواب صاحب پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔ آواز نکالنا چاہی تو نکل نہ سکی۔ اُنھوں نے خود کو سنبھالنے کی بہت کوشش کی مگر سراسیمگی اس قدر بڑھی کہ دل بیٹھنے لگا۔

وہ نڈھال ہو کر بستر پر گر گئے۔ مگر قرار نہ آیا۔ فوراً اُٹھ بیٹھے۔ اُنھوں نے ہاتھ بڑھا کر خاصدان کا سرپوش اُٹھایا۔ سُرخ صافی کو کھولا، اُس میں صرف ایک گلوری موجود تھی۔ اُنھیں حیرت بھی ہوئی مگر زیادہ توجہ نہ دی۔ گلوری گلے میں رکھی چٹکی سے تمباکو اور ڈلی اُٹھا کر منہ میں ڈالی اور آہستہ آہستہ پان چبانے لگے۔ چند ہی لمحے گزرے تھے کہ اُن کا دم گھٹنے لگا۔ ایسا محسوس ہُوا جیسے کوئی کلیجہ مسل رہا ہو۔ رہ رہ کر سینے میں ٹیسیں اُٹھتی تھیں۔

وہ لمبی لمبی سانسیں لے کر ہانپنے لگے مگر درد کم ہونے کے بجائے سوا ہوتا گیا۔ قوت برداشت نے جواب دے دیا۔ اُنھوں نے کراہتے ہوئے نذیرن کو آواز دی۔ وہ، اُن کی نئی پیش خدمت تھی جسے شبر تیا کو برطرف کرنے کے بعد نواب صاحب کی خدمت پر حضور بیگم کے حکم سے مقرر کیا گیا تھا۔

نذیرن، زینے کے پہلو کی دو چھتی میں سو رہی تھی۔ خلاف توقع اتنی رات گئے نواب صاحب کی آواز سُنی تو ہڑبڑا کر اُٹھی۔ وہ ادھیڑ عمر کی پُرانی خادمہ تھی۔ اُس نے جلدی جلدی سیڑھیاں طے کیں۔ ہانپتی کانپتی نواب صاحب کے پاس پہنچی۔ نواب صاحب دونوں ہاتھوں سے سینہ دبائے ہوئے تھے۔ انھوں نے پھُولی ہُوئی سانس قابو میں کرتے ہوئے کہا۔ "نذیرن! بیگم کو بُلاؤ۔" یہ کہہ کر وہ بستر پر کروٹیں بدلنے لگے۔

نذیرن، اُن کی اس قدر غیر حالت دیکھ کر پریشان ہو گئی۔ گھبرائی ہوئی نیچے پہنچی۔ حضور بیگم کو جگا کر نواب صاحب کا حال بتایا۔ وہ بدحواس ہو کر اوپر پہنچیں۔ نواب صاحب کو بستر پر تڑپتے دیکھ کر اُن کے ہوش اُڑ گئے۔ حال پوچھا تو نواب صاحب نے رُک رُک کر سارا ماجرہ بیان کر دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے گھر کے سارے افراد کوٹھے پر پہنچ گئے۔ ہر طرف کھلبلی مچ گئی۔

حضور بیگم نے ایک لونڈی کو مردانے میں بھیجا کہ کسی مُلازم کو حکیم صاحب کی طرف دوڑائے۔ فوراً اُن کو بُلا کر لائے۔ نواب صاحب کی حالت دم بہ دم غیر ہوتی گئی۔ خُون کی ایک قے ہُوئی۔ بستر کی اُجلی چادر پر خُون ہی خُون نظر آنے لگا۔ قے کے ساتھ ہی نبضیں چھُوٹ گئیں۔ آنکھیں پتھرا گئیں۔ منکا ڈھلک گیا۔

حکیم صاحب کے پہنچنے سے پہلے ہی نواب نقی، دُنیا سے رُخصت ہو چکے تھے۔ بارہ دری میں کہرام برپا ہو گیا۔

اس ہولناک سانحے کے بعد، کسی نے کوٹھے کی جانب جھانک کر بھی نہ دیکھا وہاں ہر وقت ہُو کا عالم طاری رہتا تھا۔ نواب صاحب کا تمام سامان، کمروں میں رکھ کر دروازے بند کر دیئے گئے اور اُن میں قفل ڈال دیئے گئے۔

حضور بیگم کا خیال ہے کہ اُوپر کی منزل پر جنّوں کا گزر ہے۔ نواب صاحب سے کوئی بے ادبی ہو گئی اور جنّوں نے جلال میں آکر اُن کا کلیجہ چبا ڈالا۔ اب اکثر رات کے سنّاٹے میں چھت پر قدموں کی ہلکی ہلکی آہٹ سُنائی دیتی۔ تاریک

رانوں میں دبے، دبے قہقہے اُبھرتے اور پھر گھر بھر میں عود و عنبر کی تیز خوشبو پھیل جاتی۔ عام طور سے یہ سب کچھ لو چندی کو ہوتا تھا۔

(۵)

باقر نواب کی ڈیوڑھی کے سامنے چہل پہل بڑھ گئی تھی۔ ملی جلی آوازوں کے ساتھ ساتھ فضا میں منڈھے کے بول گُونج رہے تھے۔ رخصتی کا وقت اب قریب آگیا تھا۔

طلعت آرا، موکھے سے لگی کھڑی تھی مگر وہ زیادہ دیر وہاں کھڑی نہ رہ سکی اُس نے مُڑ کر نجّو کی جانب دیکھا اور مُنہ بگاڑ کر بولی۔ "اس موکھے سے تو خاک نظر نہیں آتا۔" وہ آگے بڑھی اور نجّو کے قریب پہنچ گئی۔

نجّو دم بخود کھڑی تھی۔ اُس نے زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکالا۔ نجّو جس قدر خوف زدہ اور سہمی ہوئی تھی طلعت آرا کے انداز سے اُسی قدر الھڑ پن اور بے نیازی جھلک رہی تھی۔ وہ اکہرے بدن کی نازک لڑکی تھی، چہرے پر چاندنی کا نکھار تھا، رُخساروں پر پھُول کھلتے تھے۔ بڑی بڑی آنکھوں میں ستارے جھلملاتے تھے۔ وہ حضور بیگم کی جوانی تھی۔ شکل و صُورت اور مزاج کے اعتبار سے بھی اس میں حضُور بیگم کی بہت شباہت پائی جاتی تھی۔

حضور بیگم نے اُسے بہت ناز و نعم سے پالا تھا۔ لاڈ پیار کا یہ عالم تھا کہ پل بھر کے لئے آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے دیتیں۔ طلعت آرا اب اٹھارویں برس میں لگ چکی تھی مگر ابھی تک اُسے بچّوں کی طرح سنبھال کر رکھتی تھیں۔

کیا مجال کہ وہ سر ڈھکے بغیر، آنگن میں چلی جائے۔ قیامت برپا کر دیتیں۔ کہتی تھیں کہ کھُلے آسمان تلے ہر وقت بلائیں گھومتی پھرتی ہیں۔ خدانخواستہ کسی کا سایہ پڑ گیا تو میری بچّی ہاتھوں پر آجائے گی۔ ذرا سی بات پر تو پھُول کی طرح کملا جاتی ہے۔

طلعت آرا کو، ان ہر وقت کے چونچلوں اور طرح طرح کی روک ٹوک سے

سخت اُلجھن ہوتی تھی۔ بات بات پر جھنجلا جاتی اور جب کوئی بس نہ چلتا تو اپنے کمرے میں جا کر پھُوٹ پھوٹ کر رونے لگتی۔

ہر گھڑی اور بے وقت کی روک ٹوک نے اُسے ضدی اور سرکش بنا دیا تھا۔ اس وقت بھی وہ اپنی بات پر اڑ گئی۔ تیوری پر بل ڈال کر بولی۔ "ہم تو اُوپر جا کر ہی برات رُخصت ہوتے دیکھیں گے۔" اُس کے چہرے پر جھنجلاہٹ تھی۔

"چھوٹی سرکار! اللہ کے لئے اوپر نہ جایئے۔" نجّو نے گڑگڑا کر عاجزی سے ایک بار پھر اُسے روکنے کی کوشش کی۔ "آپ کو میری جان کی قسم!" اُس کی آنکھوں سے خوف جھانکنے لگا۔ "وہاں جناتوں کا سایہ ہے اور آج تو جمعرات ہے آج تو اُن کا ضرور پھیرا ہوگا۔ آپ کو ذرا بھی ڈر نہیں لگتا۔"

طلعت آرا لمحہ بھر کے لئے سہم گئی مگر باز نہ آئی کہنے لگی۔ "ابھی تو دن نکلا ہُوا ہے، اُن کا پھیرا تو رات کو ہوتا ہے۔ بس ذرا دیر بعد لوٹ آئیں گے۔" اُس کے لہجے میں التجا تھی۔ "قسم ہے، جناب امیر کی۔ زیادہ دیر وہاں نہ ٹھہروں گی۔ اُوپر دیوار کے جھروکے سے برات اچھی طرح نظر آئے گی۔" اُس نے قدرے توقف کیا اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ہویدا تھی۔ "اے، سُنا ہے، مہر عالم کا دُولہا بڑا خوبصورت ہے۔ ذری دیکھیں تو کیسا ہے۔"

دولہا کو دیکھنے کا ارمان نجّو کے دل میں بھی تھا۔ اُس کے دل کا چور فوراً بول اُٹھا۔ "شمّو کی ماں سویرے دولہا کو دیکھ کر آئی تھی۔ کہتی تھی بالکل شہزادہ لگتا ہے ایسا بانکا سجیلا اور خوبصورت ہے کہ دیکھو تو دیکھتے ہی رہ جاؤ۔"

"اے سچ بتا۔ کیا واقعی مہر کا دُولہا بہت خوبصورت ہے؟" طلعت آرا نے اشتیاق بھرے لہجے میں دریافت کیا۔

"سرکار! میں نے تو اُسے دیکھا نہیں۔ وہی نگوڑی، شمّو کی ماں تعریفوں کے پل باندھ رہی تھی۔" نجّو نے شوخی سے مُسکرا کر طلعت آرا کو چھیڑا۔ "اے اللہ نے چاہا تو ہماری چھوٹی سرکار کو اس سے بھی زیادہ خوبصورت دولہا ملے گا۔ ایسا بانکا

سجیلا، گلفام:
"چل ہٹ: بدتمیز کہیں کی"۔ طلعت آرا نے آنکھیں نکال کر نجّو کو ڈانٹا۔ "تجھے باتیں بنانا بہت آ گئی ہیں"۔
نجّو ذرا مرعوب نہ ہوئی۔ بدستور مسکراتی رہی۔ منہ بگاڑ کر بولی۔ "مہر عالم کا تو نصیبہ جاگ اُٹھا۔ اے اتنی چھوٹی چیاں سی تو آنکھیں ہیں۔ نہ ناک نہ نقشہ، بس رنگ ہی رنگ ہے اور وہ بھی پھیکا شلجم۔ خُدا قسم، مجھے تو ذرا اچھی نہیں لگتیں"۔
طلعت آرا نے اُس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "تو پھر آؤ، اوپر چلیں رُخصتی اب ہونے ہی والی ہے"۔
نجّو نیم رضا مند ہو گئی۔ جھجکتے ہُوئے اپنے خدشے کا اظہار بھی کیا۔ "اور جو کہیں بڑی سرکار آ گئیں تو؟"
"ابھی کیسے آجائیں گی۔ اے، وہ تو چراغ جلے واپس آئیں گی۔ ان کو کربلا سے حضرت عباس علمدار کی درگاہ بھی تو جانا ہے"۔ اس نے پیار سے نجّو کی جانب دیکھا۔ "اچھا تو پھر میں اوپر چلی جاؤں"۔ اُس کے لہجے میں بچوں کی سی معصومیت تھی۔ "میری اچھی، نجّو! تم بھی تو میرے ساتھ چلوگی نا؟"
نجّو پسیج گئی۔ جھجکتے ہُوئے گویا ہوئی۔ "دیکھئے، جلدی لوٹ آیئے گا۔ میرے سر کی قسم کھا کر وعدہ کیجئے"۔
"اے، تیرے سر کی قسم"! طلعت آرا نے نجّو کے سر پر ہاتھ رکھ کر یقین دلایا "بس، ذری برات رُخصت ہوتے ہُوے دیکھیں گے اور چُپکے سے واپس آ جائیں گے۔ اتنی سی دیر میں کون سی قیامت آ جائے گی"۔
نجّو آمادہ ہو گئی۔
دونوں، ڈیوڑھی سے نکل کر، صحن میں آ گئیں۔ نجّو آگے بڑھی، طلعت آرا اُس کے پیچھے پیچھے چلی۔
نجّو نہایت خاموشی سے مغلانی کے سامنے آڑ کر کے کھڑی ہو گئی۔ مُغلانی

اپنی دُھن میں ایسی مگن تھیں کہ انہیں ذرا خبر نہ ہوئی۔ نجّو نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ طلعت آرا پنجوں کے بل، ہولے ہولے چلتی ہوئی صحنچی کے سامنے پہنچی اور جھپاک سے زینے میں داخل ہو گئی۔ نجّو نے چور نظروں سے طلعت آرا کو دیکھا مگر دم سادھے کھڑی رہی۔ مغلانی نے نظریں اُٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ وہ سر جھکائے نہایت انہماک سے پائینچے کی کلیوں کی ترپائی کرتی رہیں۔ انہیں نجّو کی موجودگی کا بھی مطلق احساس نہ ہُوا۔ نجّو نے اُن کی محویت سے فائدہ اُٹھایا۔ نظر بچا کر وہ بھی لپک کر زینے میں پہنچ گئی۔

★

زینے کے اندر ابھی سے ہلکا ہلکا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ زینہ سیدھا اُوپر تک چلا جاتا تھا۔ نصف سیڑھیاں طے کرنے کے بعد ایک تکونا چبوترہ تھا۔ چبوترے کے ایک طرف دروازہ تھا جو دوچھتی میں کُھلتا تھا۔ ایک زمانہ تھا جب دوچھتی میں رات کے وقت ایک خادمہ رہتی تھی مگر اب دوچھتی میں کاٹھ کباڑ بھرا تھا۔ اُس کا دروازہ بند تھا اور کُنڈی لگا کر تالا ڈال دیا گیا تھا۔ دوچھتی کے ساتھ پھر سیڑھیاں شروع ہوتی تھیں۔ اس جگہ زینہ قدرے تنگ ہو گیا تھا۔ آگے کی سیڑھیاں سیدھی اس دروازے تک جاتی تھیں جو چھت پر کھلتا تھا۔

زینے کی سیڑھیاں بوسیدہ تھیں۔ کہیں کہیں سے اُن کے کنارے بھی جھڑ گئے تھے۔ نجّو سنبھل سنبھل کر قدم رکھتی ہوئی دوچھتی تک پہنچ گئی۔ اُس نے چبوترہ طے کیا۔ آگے اندھیرا اور بڑھ گیا تھا۔ چبوترے کے ساتھ دیوار میں، ایک دوشاخہ آویزاں تھا۔ جن دنوں نواب تقی چھت پر سوتے تھے، غرُوب آفتاب سے پہلے ہی دوشاخہ روشن کر دیا جاتا اور صبح تک روشن رہتا۔ لیکن نواب صاحب کی موت کے بعد نہ کوئی چھت پر گیا اور نہ ہی دوشاخے کو روشن کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ کبھی کبھار کوئی خادمہ کسی ضرورت سے زینے میں جاتی تو دوچھتی سے آگے نہ بڑھتی۔ دوشاخہ، جس کی روشنی سے زینہ جگمگاتا تھا، اب خاک

دھول سے اَٹا ہُوا تھا۔ کسی نے جھاڑ پونچھ کر اُسے صاف کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہ کی تھی۔

نجّو نے چند سیڑھیاں ہی طے کی تھیں کہ گہری خاموشی میں چھت پر دفعتہً طلعت آرا کی گھُٹی گھُٹی چیخیں سُنائی دیں۔ نجّو کے قدم جہاں تھے، وہیں جم گئے۔ اُس کا بدن خوف سے تھر تھر کانپنے لگا، دل زور زور سے دھڑکنے لگا ہر طرف آسیب زدہ سناٹا چھایا ہُوا تھا۔

نجّو کی سراسیمگی کا یہ عالم تھا کہ ایک پیر، اُوپر کی سیڑھی پر تھا اور دوسرا نچلی سیڑھی پر۔ تمام جسم پر سکتے کی سی کیفیت طاری تھی۔ مگر یہ پُراسرار سکوت زیادہ دیر تک برقرار نہ رہا۔ چھت پر دروازے کے قریب کوئی مردانہ آواز دبی آہستہ سے کھنکارا۔ چھت پر چاپ سُنائی دی اور زینے کا دروازہ چرچراتا ہُوا بند ہو گیا۔ پھر دروازے کی کُنڈی چڑھانے کی آہٹ اُبھری۔

خوف اس قدر بڑھا کہ نجّو کی گھگھی بندھ گئی۔ سارا بدن پسینے پسینے ہو گیا۔ زینے میں پھیلا ہُوا اندھیرا اور گہرا ہو گیا۔ اس گہرے اندھیرے میں دیواروں پر جیسے پرچھائیاں منڈلانے لگیں۔ آگے قدم بڑھانے کی ہمّت نہ ہُوئی۔ بدحواس ہو کر پلٹی اور گھبراہٹ میں تیزی سے دو دو سیڑھیاں پھلانگتی ہوئی دیوانہ وار نیچے کی جانب بھاگی۔

زینے سے نکل کر وہ صحن میں آئی۔ وحشت زدہ نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ہر طرف بدستور خاموشی چھائی ہُوئی تھی۔

مُغلانی بھی اپنی پلنگڑی پر موجود نہیں تھیں۔ صحنچی خالی پڑی بھائیں بھائیں کر رہی تھی حوض پر پانی گرنے کی آواز آہستہ آہستہ اُبھر رہی تھی۔ مُغلانی وُضو کر رہی تھیں۔

نجّو نے پہلے تو سوچا کہ ساری بات جا کر مُغلانی کو بتا دے مگر حضُور بیگم کے غیظ و غضب سے اُس کی ہمّت جواب دے گئی۔

وہ ذرا دیر تک بیرونی دالان کے ایک ستون سے پیٹھ لگائے سہمی ہوئی کھڑی رہی۔ اُس کی نظریں بار بار زینے کی جانب اُٹھ جاتیں۔ خوف کم نہ ہُوا۔ وہ وہاں کھڑی نہ رہ سکی۔ جسم اس قدر نڈھال ہو رہا تھا کہ خود کو نہ سنبھالتی تو لڑکھڑا کر دھڑام سے ڈھیر ہو جاتی۔

وہ خاموشی سے مُڑی، آگے بڑھی، اپنی کوٹھری میں پہنچی اور بے حال ہو کر پلنگ پر لیٹ گئی۔

☆

کوٹھری میں ہلکی ہلکی تاریکی تھی۔ نجّو کا دل ابھی تک ریل کے انجن کی طرح دھک دھک کر رہا تھا۔ اُسے رہ رہ کر طلعت آرا کا خیال ستا رہا تھا۔ اُسے اپنے اردگرد دبی دبی سسکیاں سرسراتی ہُوئی محسوس ہُوئیں۔ اُس نے دل گرفتہ ہو کر سوچا۔ ہائے اللہ یہ آناً فاناً کیا ہو گیا۔ نہ جانے بےچاری چھوٹی سرکار پر چھت پر جا کر کیا بیتی ہے، کس بُری طرح چیخی تھیں۔ جیسے ذبح ہونے سے پہلے بکرے کے حلق سے آوازیں نکلتی ہیں۔

یہ سوچتے سوچتے، اُس کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے وہ پلنگ پر لیٹی چھت کی کڑیوں کو تک رہی تھی۔ باہر نواب باقر کے دیوان خانے میں سارنگی سے غم ناک نغمے پھوٹ رہے تھے۔ ڈھاڑی سارنگی کے سُر سے سُر ملا کر، پُرسوز آواز میں منڈھا گا رہے تھے۔

دھلیاں پربت بھئیں بابل
انگنا بھیا بدیس رے!
لے بابل گھر اپنا، میں چلی پیا کے دیس رے
ہرے ہرے بانس منگا مورے بابل
ہرے ہرے بانس

منڈھے کے غم ناک بول دھیرے دھیرے مدّھم پڑ کر خاموش ہو گئے

اور اُن کے خاموش ہوتے ہی براتیوں کی اُونچی اُونچی آوازیں اُبھرنے لگیں۔

شہدے گلا پھاڑ پھاڑ کر دُعائیں دے رہے تھے۔ مبارک سلامت کی صدائیں بلند کر رہے تھے۔ آوازے کس رہے تھے۔ دھکم دھکا کر رہے تھے، لڑ جھگڑ رہے تھے۔ دلہن کے فینس پر نچھاور کئے جانے والے چاندی کے پھول اور روپے پیسے لُوٹ رہے تھے۔

برات رُخصت ہو رہی تھی۔ مہر عالم اپنے دولہا کے ساتھ پرائے گھر جارہی تھی اور طلعت آرا اُوپر چھت پر تھی۔ نجّو کا دل بھر آیا۔ وہ بے اختیار سسکیاں لے لے کر رونے لگی۔

(٦)

بسنت کی سہانی شام دَر و بام سے آہستہ آہستہ نیچے اُتر رہی تھی۔ سورج ڈوب چکا تھا۔ اندھیرا پھیل رہا تھا۔ بارہ دری میں زندگی کی گہما گہمی اور چہل پہل پوری طرح بیدار ہو چکی تھی۔ خادماؤں اور لونڈیوں کے ہنسنے بولنے کی ملی جلی آوازیں ہر گوشے سے اُبھر رہی تھیں۔ ہوا میں آمد بہار کی رنگینی تھی۔ خوشبو تھی۔ شگفتگی تھی۔ مُولسری کے خشک پتے شاخوں سے ٹوٹ کر گرتے اور سرسراتے ہوئے جھونکوں کے ساتھ اِدھر اُدھر بکھر جاتے۔

زندگی جاگ رہی تھی۔ مسکرا رہی تھی اور نجّو اپنی کوٹھری میں مضمحل اور نڈھال پڑی تھی۔ بستر سے اُٹھ کر باہر جانے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔ دل بیٹھا جا رہا تھا۔ بار بار سینے میں دُھواں سا اُٹھتا۔ وہ بے قرار ہو کر کروٹ بدلتی ٹھنڈی سانس بھرتی۔ ذہن میں طرح طرح کے وسوسے پیدا ہو رہے تھے۔ وہ سخت الجھن اور پریشانی میں مبتلا تھی۔

مُغلانی کوٹھری میں داخل ہوئیں تو اُس نے گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں بستر پر دم بخود لیٹی آہستہ آہستہ سانس بھرتی رہی۔ مغلانی اس کے قریب

پہنچیں۔ نرم لہجے میں دریافت کیا۔ "کیسی طبیعت ہے بیٹی؟ اب تک بستر پر پڑی ہو۔ یہ کوئی لیٹنے کا وقت ہے۔ دونوں وقت ملتے ہیں کہتے ہیں، اس وقت لیٹے رہنے سے فرشتے بیماروں میں نام لکھ لیتے ہیں۔" وہ ٹھہر ٹھہر کر بولتی رہیں۔

نجّو نے آنکھیں کھول کر اُن کی جانب دیکھا۔ مگر خاموش پڑی رہی۔

"اُٹھو، ذرا مُنہ ہاتھ دھو۔" مُغلانی نے اصرار کیا۔ "طلعت آرا بیگم کے پاس جاؤ۔ وہ بھی اپنے کمرے میں ابھی تک پڑی سوتی ہیں۔ اُن کے ساتھ ہنسو بولو۔"

طلعت آرا کا نام سن کر نجّو لرز کر رہ گئی۔ دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ اُٹھ کر تکیے کے سہارے بیٹھ گئی۔ سوچا شاید طلعت آرا اوپر سے واپس آگئی ہو اُس نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔ "اماں تم چھوٹی سرکار کے کمرے میں گئی تھیں؟" نجّو نے مُڑ کر مغلانی کے چہرے پر نظر ڈالی۔

"نہیں بیٹی، میں ان کے کمرے میں کہاں جاتی ہوں۔" مغلانی نے مطلع کیا۔ "وہ تو تم ہی سے مانوس ہیں۔ تم دونوں ہم سن جو ہوئیں۔"

نجّو سخت پریشان ہوگئی۔ مگر اس نے کسی نہ کسی طرح خود کو سنبھالا۔ جھٹ بات بنائی۔ "میرے سر میں تو اتنا درد ہو رہا ہے جیسے پھٹے جا رہا ہے۔"

مغلانی نے ہاتھ بڑھا کر نجّو کی پیشانی پر رکھ دیا۔ "تمھارا تو پنڈا بھی گرم ہو رہا ہے۔" ان کے لہجے سے تشویش آشکارہ تھی۔ "دوپہر تک تو طبیعت اچھی بھلی تھی۔ کب خراب ہوئی؟"

"سہ پہر سے طبیعت نہ جانے کیسی ہو رہی تھی۔ تب ہی تو یہاں آکر لیٹ گئی۔" نجّو نے جواب دیا۔

"موسم بدل رہا ہے۔ آج کل احتیاط کرنے کی ضرورت ہے۔" مغلانی نے دریافت کیا۔ "دن ڈھلے تم نے پنڈا تو نہیں دھویا؟"

"میں نہانے جاتی تو بتا کر نہ جاتی۔"

"میں تو حضور بیگم کے پائجامے کی کلیاں تُرپ رہی تھی۔" مغلانی نے وضاحت

کی۔ "ان میں ایسی الجھی رہی کہ کسی بات کا ہوش ہی نہیں رہا۔ مگر پائنچے ابھی تک ادھورے پڑے ہیں۔ ادھر حضور بیگم کا حکم ہے کہ پاجامہ آج ضرور سل کر تیار ہو جائے۔ کیا کروں۔ بیٹی اب تو نظر بھی ٹھیک سے کام نہیں کرتی۔" وہ ٹھہر ٹھہر کر بولتی رہیں۔ "میرے علاوہ پہلے دو مغلانیاں اور تھیں۔ مہرالنسا تھیں۔ صغریٰ بیگم تھیں۔ مہرالنساء کو تم نے بھی دیکھا ہوگا۔ آئے دن بیمار رہتی تھیں۔ آخر ایک روز اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ صغریٰ بیگم کو ان کو منجھلا بیٹا اپنے ساتھ لے گیا۔ وہ اب تک واپس نہ آئیں۔ سینے پرونے کے ساتھ ساتھ کتنے ہی دوسرے کام کاج ہیں۔ سب کا بوجھ اکیلے میری جان پر ہے۔" انہوں نے شکوہ کیا۔ "بڑی سرکار کو اس کا احساس بھی ہے۔ کئی بار ذکر بھی کیا مگر اب تک کوئی مغلانی رکھی نہیں۔ دو نہیں ایک ہی رکھ لیں۔ مجھے کچھ تو سہارا ملے گا۔"

نجّو پہلے بھی ان کے یہ گلے شکوے سن چکی تھی۔ اور اتنی بار سن چکی تھی کہ اب اس کی نظروں میں ان کی کوئی اہمیت نہیں رہ گئی تھی۔ اس نے ان کی باتیں نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "سر میں بہت درد ہو رہا ہے۔" وہ دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر آہستہ آہستہ دبانے لگی۔

"اب تم لیٹ جاؤ۔" مغلانی نے نجّو کے چہرے کو نظر بھر کر دیکھا۔ "منہ بھی اترا اترا نظر آرہا ہے۔" انھوں نے تاکید کی۔ "باہر نکلنے کی ضرورت نہیں۔ ہوا بھی ٹھنڈی چل رہی ہے۔ سویرے حکیم صاحب سے حال کہلوا کر دوا منگوا دوں گی۔ اب تم آرام کرو۔"

نجّو نے نہایت سعادت مندی کا مظاہرہ کیا۔ فوراً لیٹ گئی۔ مغلانی نے اس کے جسم پر دلائی ڈال دی۔ شفقت سے سر پر ہاتھ پھیرا۔ تسلی دی۔ دل جوئی کی باتیں کیں۔ وہ اُسے چاہتی بھی بہت تھیں۔ سگی اولاد کی مانند لاڈ پیار کرتی تھیں ہر طرح سے ناز برداری کرتی تھیں۔

نجّو بھی مغلانی کو اماں کہتی تھی۔ ماں ہی کی طرح اُن سے ٹوٹ کر محبت کرتی تھی۔ ویسے رشتے میں وہ ان کی بھانجی تھی۔ بچپن ہی میں باپ کا سایہ سر سے

اُٹھ گیا تھا۔ اکلوتی اولاد تھی۔ ماں نے بڑے چاؤ چو نچلے سے پالا تھا۔ لیکن ماں کا سایہ بھی زیادہ عرصہ سر پر قائم نہ رہ سکا۔ چند ہی سال بعد وہ تپ دق میں مبتلا ہو کر داغ مفارقت دے گئی۔ مرتے وقت صرف بی مغلانی اس کے پاس تھیں۔ اس نے آنکھوں میں آنسو بھر کر مغلانی کے ہاتھوں میں نجو کا ہاتھ دیا اور اس طرح آنکھیں بند کیں کہ پھر نہ کھلیں۔ مغلانی نے بھی اس کی لاج رکھی۔ نجو کو پوری توجہ سے پالا پوسا اور پروان چڑھایا۔

مغلانی کی اپنی کوئی اولاد نہ تھی۔ ایک بیٹا پیدا ہوا مگر وہ بھی مرا ہوا۔ ان کی گود خالی ہی رہی۔ میاں نے دوسری شادی کر لی تھی۔ اس بیوی سے کئی اولادیں بھی تھیں۔ وہ اب دوسری بیوی کے ساتھ رہتا تھا۔ زردوز تھا اور اچھا کاریگر تھا۔ دوسری شادی کے بعد کچھ عرصہ تک مغلانی کے پاس آتا رہا۔ مہینے کے مہینے کچھ خرچہ بھی دیتا رہا۔ پھر ایسا منہ موڑا کہ پلٹ کر خبر بھی نہ لی۔ مغلانی نے یہ دور بڑی عسرت اور تنگ دستی میں گزارا۔ کئی کئی وقت کے فاقے پڑنے لگے۔ نواب تقی کی والدہ، ناظمہ بیگم اس وقت حیات تھیں انہوں نے ترس کھا کر مغلانی کو اپنے پاس ملازم رکھ لیا۔

مغلانی کا نام حسنہ بیگم تھا۔ جب انہوں نے ملازمت اختیار کی تو جوان ہی تھیں۔ صورت شکل بھی اچھی تھی۔ خاندان بھی اچھا تھا۔ ان کا میکہ بلگرام میں تھا۔ باپ حدیث خواں تھے، لیکن زبان میں ہلکی سی لکنت تھی۔ لہٰذا مجلسوں میں ان کی حدیث خوانی اور ذاکری کا رنگ جما نہیں۔ عیال دار بھی تھے۔ زندگی ناداری اور مفلسی میں بسر ہوئی۔ دنیا سے رخصت ہوئے تو بیوی بچوں کے لئے غربت اور فاقہ کشی ورثے میں چھوڑ گئے۔ مغلانی کبھی بلگرام نہ گئیں۔ شادی کے بعد تمام زندگی لکھنؤ ہی میں رہیں۔ پوری جوانی نواب تقی کے گھرانے میں کٹی اب تو ان کا جونڈا سفید ہو گیا تھا۔ اور کمر بھی قدرے جھک گئی تھی۔

مگر نجو کا جسم سڈول اور کسا ہوا تھا۔ کام کاج میں بھی بڑی پھرتیلی اور

مستعد تھی۔ چلبلاپن اس میں کُوٹ کُوٹ کر بھرا تھا۔ بات بات پر بے ساختہ ہنس پڑتی۔ جس وقت بارہ دری میں آئی تھی تو ذرا سی بچی تھی اور اب قد قامت میں طلعت آرا سے کم نہ تھی۔ دونوں میں بہت اچھی نبھتی تھی۔ نجّو کے علاوہ طلعت آرا کسی ماما لونڈی کو مُنہ نہ لگاتی تھی۔ نجّو کا بھی یہ حال تھا کہ کام کاج سے ذرا فرصت ملی اور وہ طلعت آرا کے پاس پہنچی۔ اس کا ہر کام کرکے اُسے نہ صرف خوشی محسوس ہوتی بلکہ نہایت مستعدی اور ذوق شوق سے انجام دیتی۔

حضور بیگم بھی اس کی مستعدی اور کارگزاری سے خوش تھیں مگر اس کا ہنسوڑپن اور بات بات پر ٹھی ٹھی کرنا ایک آنکھ نہ بھاتا۔ کئی بار تو ایسی برہم ہوئیں کہ نجّو کو بارہ دری سے نکل جانے کا بھی حکم صادر ہوا۔ مگر ہر بار بی مغلانی آڑے آجاتیں۔ منّت سماجت کرکے حضور بیگم کا غصّہ ٹھنڈا کرتیں۔ البتہ وہ حضور بیگم کی مار سے نہ بچ سکی۔ اکثر پٹتی تھی۔ اور ان کی تنبیہ اور ڈانٹ پھٹکار تو اس کے لئے اب عام بات بن چکی تھی۔

نجّو کی اُٹھتی جوانی جاڑے کی چاندنی نہ تھی۔ وہ حضور بیگم کا حکم لے کر ڈیوڑھی کے پھاٹک پر بیٹھے ہوئے نوکروں چاکروں کے پاس جاتی تو وہ چھیڑ چھاڑ کرتے۔ آنکھ مار کر کوئی جملہ چست کرتے۔ وہ جل کر صلواتیں سناتی تو ڈھیٹ بن کر ٹھی ٹھی کرتے۔ بڑے نواب صاحب نے بھی اس پر التفات فرمایا کسی نہ کسی بہانے خلوت میں بلایا لیکن ہر بار مغلانی ڈھال بن کر سامنے آجاتیں نجّو کو اشارہ سے منع کر دیتیں اور خود پہنچ جاتیں۔

☆

نواب صاحب مغلانی کو دیکھ کر سخت بھنّاتے۔ تیوری پر بل ڈال کر بے رُخی سے کہتے "بی مغلانی! تم نے یہاں آنے کی کیوں زحمت گوارہ کی؟" وہ کھسیانی ہو کر مسکرانے کی کوشش کرتیں نہایت عاجزی سے کہتیں "اے سرکار! اس بندی کو بھی کبھی کبھار خدمت کا موقع دیا کریں۔ مگر وہ ذرا نہ پسیجتے۔ بے زاری

کا مظاہرہ کرتے۔ کبھی پھبتی کستے کبھی آفت ناگہانی قرار دیتے۔ مغلانی ان کا طعن تشنیع سن کر سلگ اٹھتیں۔ دل ہی دل میں کڑھتیں۔ تڑپ کر ٹھنڈی سانس بھرتیں ہر چرکہ اور ہر چوکا خاموشی سے برداشت کر جاتیں۔

نواب صاحب کی اس بے اعتنائی اور تحقیر آمیز رویہ پر مغلانی کو کبھی کبھی وہ گئے گزرے دن یاد آجاتے جب ان کی جوانی کا چراغ مدّھم نہ ہوا تھا۔ بدن میں گداز تھا۔ آنکھوں میں چاندنی راتوں کی جگمگاہٹ تھی۔ مگر انہوں نے اپنے لباس کی طرح خود کو صاف ستھرا رکھا۔ جوانی کی بھڑکتی آگ کو تھپک تھپک کر سلا دیا۔ سخت پردہ کرتی تھیں۔ ڈیوڑھی کے ملازمین اور دربانوں سے بات کرنا تو ایک طرف رہا کسی نامحرم کا نام سن کر حیا سے نظریں جھک جاتی تھیں دوپٹے کے پلّو سے فوراً سر ڈھک لیتی تھیں۔ بیشتر وقت عبادت میں گذارتی تھیں۔ چہرے پر نور برستا تھا۔ گھر میں نذر نیاز ہوتی مجلس یا عزاداری، ہمیشہ اس کی دیکھ بھال ان کے سپرد ہوتی۔ کہیں صحنک ہوتی تو ان کو اصرار کر کے بلایا جاتا۔ عزت و احترام سے بٹھایا جاتا۔ ہر طرف ان کی پاک دامنی کا شہرہ تھا۔ پارسائی کا یہ عالم تھا کہ بقول شخصے، دامن نچوڑ دوں تو فرشتے وضو کریں۔

نواب نقی کے والد بزرگوار، نواب سیّد علی، بھی مغلانی کا احترام کرتے تھے حالانکہ وہ کم رنگین مزاج نہ تھے۔ طوائفوں سے مراسم رکھنا اور زنان بازاری سے دل بہلانا تو گویا امارت کی نشانی تھا۔ عیب نہ تھا۔ معاشرتی زندگی کا حصّہ تھا اور محل سرا کی خادمائیں اور لونڈیاں تو ان کے لئے شب خوابی کے لباس کی مانند تھیں نواب صاحب کی دل بستگی ان کے فرائض میں شامل تھی۔ شروع شروع میں انہوں نے مغلانی پر بھی ڈورے ڈالے۔ اس وقت ان کی جوانی پر نکھار تھا لیکن وہ کبھی ان کے ہتّھے نہ چڑھیں۔ حتیٰ کہ وہ ان کی پارسائی سے ایسے مرعوب ہوئے کہ نظر ملاتے ہوئے ڈرتے۔ کہتے تھے ان پر کسی کا سایہ ہے۔

مغلانی حُسنہ بیگم ان کے دست بُرد سے تو صاف بچ گئیں مگر نواب نقی

سے خود کو نہ بچا سکیں۔

نواب تقی نے جوانی کی دہلیز پر نیا نیا قدم رکھا تھا۔ ابھی مسیں بھی نہ بھیگی تھیں۔ ماں کے تو ایسے لاڈلے تھے کہ وہ انہیں بچہ ہی سمجھتی تھیں۔ ویسے بھی ان کو کنکوّے بازی کے علاوہ الھڑ اور نوخیزہ ماماؤں اور خادماؤں کے ساتھ ٹٹھول کرنے کے علاوہ کام ہی کیا تھا۔ کبھی ان کے ساتھ آنکھ مچولی کھیل رہے ہیں۔ کبھی صحن میں کوڑا جمال شاہی ہو رہا ہے تو کبھی چادر چھپوّل۔ کسی ماما لونڈی سے ناراض ہو جاتے تو دُھنک کر رکھ دیتے۔ وہ اُن کی مار کھاتی تھیں اور ڈھٹائی سے ہنستی تھیں۔

لیکن مغلانی کے ساتھ ان کا رویہ مختلف تھا۔ ان کا وہ ادب و لحاظ کرتے تھے۔ عمر میں وہ نواب تقی سے بارہ تیرہ سال بڑی تھیں متین اور سنجیدہ بھی تھیں۔ ان کے طور طریق میں بُردباری اور رکھ رکھاؤ تھا۔ پھر ایسا ہوا کہ جاڑوں کی ایک رات کو نواب تقی مغلانی کی کوٹھری میں داخل ہوئے۔ یہ پہلا موقع نہ تھا۔ اکثر ان کی کوٹھری میں آجاتے تھے۔ اس وقت وہ بالکل تنہا تھیں۔ نجّو ان کی تحویل میں نہ آئی تھی۔

اس روز نواب بیبّد علی کی حرم سرا میں سرِشام ہی سنّاٹا ہو گیا تھا۔ مہاوٹوں کی سردی پڑ رہی تھی۔ آسمان ابر آلود تھا۔ ہوا فرّاٹے بھرتی ہوئی چل رہی تھی۔ سب رضائیوں اور لحافوں میں دبکے ہوئے تھے۔ پہر رات گزر چکی تھی۔ مغلانی عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر سونے کی تیاری کر رہی تھیں۔ انہوں نے نواب تقی کو اپنی کوٹھری کے دروازے پر دیکھا تو پریشان ہو گئیں۔ وہ سردی سے کپکپا رہے تھے۔ مغلانی ہڑبڑا کر اُٹھیں اور شفقت سے نواب تقی کو اپنے پاس بٹھا کر لحاف کا ایک حصّہ ان کے جسم پر ڈال دیا۔ حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔ "چھوٹے سرکار! اس جاڑے پالے میں کیسے نکل آئے؟ آج تو غضب کی سردی پڑ رہی ہے"۔ نواب تقی نے اِٹھلا کر جواب دیا۔ "نیند نہیں آ رہی تھی

ہم تو اس وقت آپ سے انار بادشاہ زادی کی کہانی سُنیں گے"۔ وہ کہانی سُننے کے لئے ضد کرنے لگے۔

مغلانی نے لاکھ ٹالنا چاہا۔ طرح طرح کے حیلے بہانے کئے۔ منت سماجت بھی کی۔ مگر نواب تقی اپنی ضد پر اڑے رہے۔ ان کی ایک نہ سنی۔ لاڈ سے گلے میں بانہیں ڈال کر اصرار کرنے لگے۔ ان کے انداز میں خوشامد بھی تھی۔ مغلانی ان کی ضد کے سامنے بے بس ہو گئیں۔ ہزار بار کی سنائی ہوئی گھسی پٹی کہانی شروع کی۔ ابتدا میں وہ سنبھل سنبھل کر بولتی رہیں۔ پھر بہکنے لگیں۔ بیچ بیچ میں بھول جاتیں۔ خاموش ہو جاتیں۔ پھر شروع ہو جاتیں۔ نواب تقی ان کے پہلو میں لیٹے تھے۔ کبھی مچلتے۔ کبھی ٹھنکتے۔ کرید کرید کر ایک ایک بات پوچھتے۔

رات بھیگتی گئی۔ سنسان ہوتی گئی۔ کہانی بے ربط ہوتی گئی، طویل ہوتی گئی اور جب ختم ہوئی تو مغلانی ٹوٹ پھوٹ کر بکھر چکی تھیں۔ انہوں نے توشہ عاقبت کے لئے جو اثاثہ اب تک سنبھال کر رکھا تھا ختم ہو چکا تھا، نواب تقی کی نذر ہو چکا تھا۔ وہ کوٹھری سے باہر گئے تو حسنہ بیگم ایسی دل گرفتہ ہوئیں کہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

نواب تقی کو کہانی سُننے کا ایسا چسکا لگا کہ ہر رات کسی نہ کسی بہانے مغلانی کی کوٹھری میں پہنچ جاتے۔ نواب تقی کی والدہ ناظمہ بیگم محل سرا کے ایک علاحدہ حصے میں رہتی تھیں۔ مغلانی ان کے ذاتی عملے میں شامل تھیں۔ مغلانی کو رہائش کے لئے کوٹھری بھی دے رکھی تھی۔ یہ کوٹھری ماماؤں اور خادماؤں کی کوٹھریوں سے الگ تھلگ تھی۔ نواب تقی کا کمرہ اتفاق سے مغلانی کی کوٹھری کے قریب ہی تھا۔ بیچ میں صرف توشک خانہ تھا جس کا دروازہ سرِ شام ہی بند کر کے تالا ڈال دیا جاتا۔ اس کی کنجی بھی مغلانی ہی کے پاس رہتی تھی۔

شروع شروع میں مغلانی نے مزاحمت بھی کی۔ بے رُخی اختیار کرنے کی بھی حتی الوسع کوشش کی مگر نواب تقی ڈھٹائی سے کام لیتے۔ ناراض ہونے

کے بجائے عاجزی کا مظاہرہ کرتے۔ ان دنوں وہ تھے بھی خوش شکل اور بھولے بھالے۔ نرم نرم رخسار شعلوں کی مانند دہکتے تھے، آنکھوں میں ستارے جگمگاتے تھے۔ ایسی من موہنی صورت پائی تھی کہ چہرے پر نظر پڑتی تو ٹھٹھک کر رہ جاتی مغلانی بھی کہاں تک دل ناشکیب کو سنبھالتیں۔ ایک ایک کر کے سارے بندھن ٹوٹتے گئے۔ بی مغلانی اب نواب تقی کے لئے صرف حسنہ بیگم رہ گئی تھیں۔ اور انہوں نے بی مغلانی بننے کی کوشش بھی نہ کی۔ ان کی سوئی ہوئی جوانی ایک بار بیدار ہوئی تو پھر سو نہ سکی۔ وہ دن بدن نکھرتی گئیں، خوبصورت اور خوش ادا ہوتی گئیں زیادہ جوان اور گداز ہوگئیں۔ اپنی عمر سے بھی کم نظر آنے لگیں۔

نواب تقی بھی اس زمانے میں اس بری طرح فریفتہ ہوئے کہ راتوں کو چھپ چھپ کر ان کے پاس جاتے۔ زانوں پر سر رکھ کر آہیں بھرتے۔ بے قرار ہو کر کہتے "حسنہ بیگم تم نے مجھ پر جادو کر دیا۔ دیوانہ پاگل بنا دیا۔ واللہ! دن کاٹنا قیامت ہو جاتا ہے۔ کہیں دل نہیں لگتا۔ بس یہی جی چاہتا ہے، رات ہو اور میں تمہارے پاس پہنچ جاؤں"۔ حسنہ بیگم بھی ناز و ادا دکھاتیں۔ کبھی دل داری کرتیں۔ کبھی تڑپاتیں۔ چھیڑنے کے لئے شوخی سے مسکرا کر کہتیں "بس اب بہت ہو چکیں یہ چوری چھپے کی ملاقاتیں۔ تم ٹھہرے نواب زادے۔ جانے کب دل بھر جائے، کسی اور سے دل لگا لو۔ پلٹ کر بھی نہ دیکھو گے۔ سوچتی ہوں اماں کے پاس بلگرام چلی جاؤں"۔ اس چھیڑ چھاڑ میں ان کے موہوم خدشات اور وسوسے بھی مضمر ہوتے دل کی بات کسی نہ کسی طور زبان پر آ ہی جاتی۔

نواب تقی ان کی زبان سے ایسی باتیں سنتے تو تڑپ کر منہ پر ہاتھ رکھ دیتے۔ ٹھنڈی سانس بھر کر گویا ہوتے "ایسی بے وفائی کی باتیں دل میں لاؤ تو ہمارا مرا ہوا ہی دیکھو۔ واللہ! ہیرے کی کنی کھا لوں گا۔ تڑپ تڑپ کر مر جاؤں گا۔ تمہارے بغیر زندگی حرام ہے"۔ یہ کہہ کر وہ انگلی میں پڑی ہوئی ہیرے کی انگشتری منہ میں رکھنے کے لئے ہاتھ بڑھاتے۔ ان کی آواز گلوگیر ہو جاتی۔ حسنہ

بیگم جھٹ ان کا ہاتھ تھام لیتیں۔ انداز دل ربائی سے کہتیں۔ "ہے ہے تقن! یہ تم کو کیا ہو گیا؟ تم تو واقعی دیوانے ہو گئے ہو"۔ ان دنوں وہ نواب تقی کو تقن ہی کہتی تھیں۔ کھلیں تو ایسی کھلیں کہ حجابات کے سارے پردے اُٹھا دیئے۔ ان کے انگ انگ سے سرخوشی اور مسرت پھوٹتی تھی۔

دن کو تو زندگی کے اُس طوفانی دور میں بھی وہ معمول کے مطابق سیدھا سادا اجلا لباس پہنتیں۔ کنگھی چوٹی بھی بس واجبی سی کر لیتیں۔ بالوں کو سمیٹ کر جوڑا بنا لیتیں۔ ہر وقت دوپٹے کے آنچل سے سر ڈھکا رہتا۔ مگر رات گئے جب ہر سُو سناٹا چھا جاتا اور محل سرا کا ہر فرد گہری نیند سو جاتا تو وہ اپنی کوٹھری کا دروازہ بند کر کے کنڈی چڑھا دیتیں اور بن سنور کر اس طرح بیٹھتیں کہ در و دیوار جگمگانے لگتے۔ اس وقت ان کی سج دھج کا یہ عالم ہوتا کہ آنکھوں میں دنبالہ سرمہ، ہونٹوں پر پان کی دھڑی، بالوں میں خوشبودار تیل کی چمک دمک۔ چوٹی سلیقے سے گندھی ہوئی۔ گلے میں چنا ہوا رنگین دُوپٹہ۔ کرتا اور پائجامہ بھی بھڑک دار ہوتا۔ اور عام طور پر سُرخ ہوتا۔ جسم عطر سے مہکتا ہوتا۔ نواب تقی اپنی والدہ سے مختلف حیلے بہانے کر کے رقم اینٹھتے اور مغلانی حسنہ بیگم کی ہر فرمائش چوری چھپے پوری کرتے۔ وہ کبھی فرمائش نہ بھی کرتیں تو نواب تقی خود ہی ہر رات کچھ نہ کچھ ضرور لاتے۔ وہ منع بھی کرتیں تب بھی نہ مانتے۔

نواب تقی اگر بے قرار رہتے تھے تو رات ہوتے ہی حسنہ بیگم کی بھی بے قراری بڑھ جاتی۔ وہ کام کاج سے فارغ ہوتے ہی اپنی کوٹھری میں پہنچ جاتیں۔ آئینہ طاق میں رکھ کر ایک ایک رُخ سے اپنی سج دھج دیکھتیں۔ مُڑ مُڑ کر دروازے پر نظر ڈالتیں۔ کبھی بے چین ہو کر بستر پر جا کر بیٹھ جاتیں۔ بار بار پہلو بدلتیں۔ قرار نہ آتا تو اُٹھ کر کھڑی ہو جاتیں۔ ایک ایک لمحہ کاٹنا دُوبھر ہو جاتا آخر دروازے پر رُک رُک کر تین بار ہلکی سی دستک ہوتی۔ یہ نواب تقی کی آمد کی مخصوص پہچان تھی۔ وہ تڑپ کر اُٹھتیں۔ دروازہ کھولتیں۔ نواب تقی اندھیرے

میں دیوار سے لگے کھڑے ہوتے۔ دروازہ کا پٹ کھلتے ہی اندر آجاتے۔ وہ دروازہ بند کرتیں اور کنڈی چڑھا دیتیں۔ پلٹتیں تو ایسی دلکش اور دل رُبا نظر آتیں کہ نواب تقی وارفتہ اور بے خود ہو جاتے۔ ہر ہر ادا پر مر مٹتے۔ وہ عشوہ گری کرتیں۔ یہ ناز اٹھاتے، دل داری کرتے۔

حسنہ بیگم، پختہ اور تجربہ کار تھیں۔ نواب تقی نوعمر اور اناڑی تھے۔ انکی چاہت اور وارفتگی میں اُٹھتی جوانی کا جوار بھاٹا تھا۔ شدت اور بے ساختگی تھی۔ حسنہ بیگم طرح طرح سے ان کو تڑپاتیں۔ سلگتی آگ کو شعلہ فشاں بناتیں۔ بے سبب روٹھ جاتیں۔ منہ موڑ کر بیٹھ جاتیں۔ بے رخی سے ہاتھ جھٹک دیتیں۔ قریب آنے نہ دیتیں۔ نواب تقی ان کو مناتے خوشامد کرتے۔ شیفتگی زیادہ بڑھتی تو دوپٹے کے آنچل سے مُنہ چھپا کر رونے لگتے۔ مغلانی کو انہیں اس طرح ستانے اور پریشان کرنے میں لذّت محسوس ہوتی۔ ان پر سرشاری اور سرخوشی کا عالم طاری ہو جاتا۔ یہ ایسی ولولہ انگیز راتیں تھیں جن میں انہوں نے زندگی کو پہلی بار اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ ہنستے مسکراتے دیکھا تھا۔

☆

ایک رات ایسا ہوا کہ مغلانی نے معمول کے مطابق بناؤ سنگھار کیا اور نواب تقی کا انتظار کرنے لگیں۔ رات گزرتی گئی۔ مغلانی کا اضطراب سِوا ہوتا گیا۔ رات آدھی ہو گئی۔ رات ڈھلنے لگی۔ نیند کا غلبہ ہوا تو انہوں نے دروازے کی کنڈی کھول دی اور بستر پر یہ سوچ کر لیٹ گئیں کہ نواب تقی آئیں گے تو نیند سے بیدار کر دیں گے۔ کچھ دیر وہ بے چینی سے پہلو بدلتی رہیں۔ پھر آنکھ لگ گئی وہ گہری نیند سو گئیں۔ نواب تقی اس رات نہ آئے۔

صبح ہوئی۔ مغلانی نے رات کا بھڑکدار لباس تبدیل کیا اور کوٹھری سے باہر چلی گئیں۔ پہر دن چڑھے نواب تقی کے والد، نواب سیّد علی نے معمول کے مطابق بیگم کے ساتھ دسترخوان پر ناشتہ کیا اور جب ناشتے سے فارغ ہونے

کے بعد دیوان خانے میں چلے گئے تو نواب تقی کی والدہ نے مغلانی کو اپنے کمرے میں طلب کیا۔ وہ اس وقت تنہا تھیں۔ مغلانی پہنچیں۔ آداب کیا۔ مزاج پوچھا۔

مگر خلاف توقع ان کو دیکھتے ہی نواب تقی کی والدہ اُٹھ کر کھڑی ہوگئیں نہایت احترام سے بٹھایا۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کیں پھر جھجکتے ہوئے گویا ہوئیں "بی مغلانی! کل رات ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ میں تمہاری کوٹھری پر پہنچی۔ دروازہ کھولا اندر گئی تو کیا دیکھتی ہوں کہ تم بے خبر سوتی ہو۔ بدن پر نہایت شوخ اور زرق برق لباس تھا۔ سخت حیرت ہوئی۔" مغلانی نے ان کی باتیں سُنیں تو خوف سے دم بخود رہ گئیں۔

نواب تقی کی والدہ ان کی سراسیمگی سے بے نیاز بولتی رہیں۔ "سنگھار بھی ایسا کر رکھا تھا کہ نظر نہ ٹھہرتی تھی۔ ایسی خوبصورت اور حسین نظر آ رہی تھیں کہ میں تم سے کیا بتاؤں۔ مجھے تو ایسا لگا کہ بستر پر تم نہیں کوئی نوجوان حسینہ سوتی ہے"

مغلانی نے خود کو سنبھالا۔ سخن سازی سے کام لیا۔ انجان بن کر بولیں۔ "سرکار! میں تو یہی لباس پہن کر سوئی تھی جو اس وقت بدن پر ہے۔ قسم لے لیجئے مجھے کچھ خبر نہیں۔ یہ بھی نہ معلوم ہوا کہ آپ کب تشریف لائیں اور کس وقت واپس گئیں۔"

نواب تقی کی والدہ نے ان کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ "بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو۔ تم کو کچھ خبر ہوتی بھی تو کیوں کر۔ تم تو کسی اور ہی عالم میں تھیں۔ نواب صاحب درست فرماتے ہیں کہ تم پر کسی کا سایہ ہے۔" ان کے لہجے میں عاجزی پیدا ہوگئی۔ "مجھ سے انجانے میں غلطی ہوگئی۔ آئندہ کبھی ایسی گستاخی نہ ہوگی۔"

مغلانی پریشان ہو کر بولیں۔ "اے حضور! بندی کو آپ کیوں اس قدر شرمندہ کر رہی ہیں۔" مگر نواب تقی کی والدہ ناظمہ بیگم برابر معذرت کرتی رہیں معافی کی خواستگار رہیں۔

ناظمہ بیگم نہایت خوف زدہ اور سراسیمہ نظر آ رہی تھیں۔ اس سراسیمگی کا ایک بنیادی سبب یہ بھی تھا کہ وہ اختلاج قلب میں مبتلا تھیں۔ ایک رات اختلاج

قلب بہت بڑھا تو اسی عالم میں بستر سے اُٹھ کر کمرے سے باہر آگئیں۔ مغلانی کی کوٹھری کے قریب پہنچیں تو اندر سے آہستہ آہستہ باتیں کرنے اور ہنسنے کی آوازیں اُبھر رہی تھیں۔ ان کو شبہ ہوا تو ٹوہ لگانے کے لئے گذشتہ شب نہایت خاموشی سے مغلانی کی کوٹھری میں داخل ہوگئیں۔ وہاں جو کچھ دیکھا اس سے ایسی خائف ہوئیں کہ پریشانی میں تمام رات جاگتی رہیں۔ انہوں نے مغلانی سے مطلق اظہار نہ کیا کہ وہ ان کی کوٹھری میں کیوں گئی تھیں صرف معذرت پر اکتفا کیا۔

وہ مغلانی سے ایسی مرعوب ہوئیں کہ تمام خواصوں اور خادماؤں کو سختی سے منع کر دیا کہ رات کو کوئی بھی مغلانی کی کوٹھری میں ہرگز ہرگز نہ جائے وہ نہ بھی منع کرتیں تب بھی کوئی ڈر کے مارے رات کو مغلانی کی کوٹھری میں جانے کی جسارت نہ کرتا۔ سب کو معلوم ہوگیا تھا کہ مغلانی پر کسی کا سایہ ہے۔

غرضیکہ مغلانی کا راز افشا ہو کر بھی افشا نہ ہوا بلکہ ہر وقت سر پر جو خطرہ منڈلاتا رہتا تھا وہ بھی کم ہوگیا۔ رات کے سناٹے میں نواب تقی کے ساتھ ان کی چوری چھپے ملاقاتوں کا سلسلہ چلتا رہا۔ مگر ایک بار ان کو سخت آزمائش سے گزرنا پڑا۔ ہوا یہ کہ نواب تقی کی والدہ نے ایک روز صحنک کی۔ حضرت بی بی کی نیاز کے لئے پورا پورا اہتمام کیا۔ مٹی کے کورے طباقوں کو صاف ستھرے پانی سے دھو کر باقاعدہ پاک کیا گیا۔ ان طباقوں میں سات ترکاریاں اور سات ہی طرح کا میوہ رکھا گیا۔ سوا پانچ سیر عمدہ چاول پکائے گئے۔ ان کو بھی پاک صاف طباقوں میں ڈالا گیا۔ ان پر ڈھائی سیر شکر کی تہ جمائی گئی اور ڈھائی سیر دہی بھی ڈالا گیا۔ نیاز میں مسّی، روغن چنبیلی، سرمہ، مہندی، کلاوہ، صندل اور پانچ آنے چراغی کے بھی رکھے گئے۔ نیاز کا کھانا کھانے کے لئے تلاش کر کے دور و نزدیک سے نیک اور پرہیزگار بیبیوں کو بلایا گیا۔ ان کو نہایت عزت و احترام کے ساتھ صحنک کے طباقوں کے روبرو بٹھایا گیا۔

ناظمہ بیگم، مہمانوں کی خاطر تواضع کے لئے خود بھی موجود تھیں مگر ایک عفیفہ

کے مشورے پر اس بار خلاف معمول عین وقت پر یہ اہتمام کیا گیا کہ دستور قدیم کے مطابق صحنک کھانے والیوں کے سامنے ایک طشتری میں چونا بھر کر رکھ دیا گیا۔ کھانا شروع کرنے سے قبل ہر ایک کے لئے یہ ضروری قرار دیا گیا کہ انگلی بھر کر چونا چاٹے۔ یہ گویا پاک دامنی اور پارسائی کا امتحان تھا۔ عام اعتقاد یہ تھا کہ اگر کوئی بدکار اور بدچلن عورت چونا چاٹتی تو اس کے منہ سے خون جاری ہو جاتا۔ مغلانی حسنہ بیگم بھی صحنک کھانے والیوں میں شامل تھیں۔ بلکہ سارا بندوبست ہی انہوں نے کیا تھا۔

بکچھ بیبیوں نے ناک بھوں چڑھائی۔ یہ طریق کار ان کو ناگوار گزرا لیکن کوئی اٹھی نہیں۔ انگلی میں لے کر چونا چاٹا اور صحنک کھانے لگیں حسنہ بیگم سخت تذبذب میں مبتلا ہو گئیں۔ کوئی عذر پیش کرتیں یا انکار کرتیں تو سب کے سامنے بھانڈا پھوٹ جاتا بھری محفل میں تھڑی تھڑی ہوتی۔ فرار ممکن نہ تھا۔ اور چونا چاٹنے میں بھی خطرہ درپیش تھا ان کا چہرہ فق ہو گیا۔ لیکن دوسری عورتوں کو چونا چاٹتے دیکھ کر ان کی بھی کچھ ہمت بندھی۔ انہوں نے دھڑکتے دل کے ساتھ طشتری کی جانب ہاتھ بڑھایا۔ انگلی میں چونا لیا اور آنکھیں بند کر کے چاٹ لیا۔

چونے کی تیزی تو انہوں نے ضرور محسوس کی لیکن پان کھانے کی لڑکپن سے عادی تھیں اور بار ہا چونا زیادہ ہونے کے باعث منہ کٹ بھی چکا تھا لہٰذا چونے کی کاٹ اور تیزی برداشت کر گئیں۔ البتہ ذہن میں طرح طرح کے خیالات ابھرتے تھے اور اندیشہ ہائے دور دراز بن کر ڈراتے تھے۔ ان کا دل اور زیادہ زور زور سے دھڑکنے لگا۔ لیکن نہ زبان تڑخی اور نہ ہی منہ لہولہان ہوا انہوں نے چونا چاٹنے کے بعد فوراً چاولوں میں ہاتھ ڈالا لقمہ بنایا اور منہ میں رکھ لیا۔

ان کی پارسائی اور عفت کا بھرم قائم رہا بلکہ روز بروز بڑھتا ہی گیا

ان کے چہرے کے نور میں بھی اضافہ ہی ہوا۔ آنکھوں میں ہمیشہ کی طرح حیا جھلکتی بات کرتیں تو لہجہ نرم اور شیریں ہوتا۔ وہ معمول کے مطابق عبادت گزار بھی رہیں نذر و نیاز کا انتظام بدستور ان کے سپرد رہا۔ نواب تقی کے ساتھ یاری آشنائی کا سلسلہ بھی چلتا رہا۔ وہ رات کے سناٹے میں چوری چھپے ان کی کوٹھری میں جاتے یہ بن سنور کر بیٹھتیں۔ ان کو اپنی زلف گرہ گیر کا اسیر بناتیں۔

☆

سردی ختم ہو گئی۔ گرمی شروع ہوئی۔ لیکن مغلانی حسنہ بیگم ابھی تک رات کوٹھری ہی میں بستر کرتیں۔ گرمی نے زیادہ شدت اختیار کی تو رات کو در و دیوار سے چنگاریاں نکلتیں۔ حبس سے دم گھٹتا۔ جسم پسینے سے شرابور ہو جاتا۔ آخر ان کو اپنی چارپائی کوٹھری سے نکال کر صحنچی میں ڈالنا پڑی۔ اب نواب تقی کا ان کے پاس آنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ صحنچیوں اور آنگن میں جگہ جگہ خادماؤں اور لونڈیوں کے بستر لگے ہوتے۔ نواب تقی کی والدہ بھی اب کمرے سے نکل کر دالان کے آگے کھلی شہ نشیں پر سوتی تھیں۔

گرمیوں میں نواب تقی اور مغلانی حسنہ بیگم ایک دوسرے سے ملنے کے لئے تڑپتے تھے۔ موسم گرما کے ختم ہونے کی دعائیں مانگتے تھے۔ نواب تقی کی شیفتگی کا یہ عالم تھا کہ وہ اکثر رات کو پچھلے پہر ان کے پاس پہنچ جاتے۔ وہ جتنے نڈر اور بے باک تھے یہ اتنی ہی محتاط تھیں۔ منت سماجت کر کے کسی نہ کسی طور ان کو ٹالنے کی کوشش کرتی رہتیں۔ خدا خدا کر کے گرمی ختم ہوئی۔ برسات شروع ہوئی۔ جس روز بارش ہوتی حسنہ بیگم اپنی کوٹھری ہی میں سوتیں۔ نواب تقی کو اشاروں کنایوں میں پہلے ہی آگاہ کر دیتیں۔ وہ چھپتے چھپاتے ان کی کوٹھری میں پہنچ جاتے۔

سردی شروع بھی نہ ہوئی تھی، موسم ذرا بدلا ہی تھا کہ مغلانی نے پابندی سے کوٹھری میں سونا شروع کر دیا۔ پہر رات گزرتے ہی وہ کوٹھری میں چلی جاتیں دروازہ بند کر کے کنڈی لگاتیں اور بناؤ سنگار کر کے نواب تقی کے انتظار میں دروازے کو

تکتی رہتیں۔ آخر کوٹھری کے دروازے پر نواب تقی پہنچتے۔ اپنے مخصوص انداز میں دروازے پر ہولے ہولے دستک دیتے۔ مغلانی بے قرار ہوکر اُٹھتیں اور آہستہ سے دروازہ کھول دیتیں۔

ہر چند کہ رات کو ان کی کوٹھری میں بجز نواب تقی کے کسی کو داخل ہونے کی جسارت نہ ہوتی تھی مگر وہ اپنے طور پر پوری پوری احتیاط سے کام لیتی تھیں۔ انہوں نے اس قدر ہوشیاری اور رازداری اختیار کی کہ کسی کو ذرا بھی شبہ نہ ہوا۔ خیریت یہ ہوئی کہ نواب تقی سے کوئی بال بچہ بھی نہ ہُوا۔ مرے ہوئے بیٹے کی پیدائش کے بعد وہ بانجھ ہوگئی تھیں۔ حکیم ڈاکٹروں نے ان کے بارے میں یہی بتایا تھا۔ تب ہی تو ان کے میاں نے اولاد کی خاطر دوسری شادی کرلی تھی۔

مغلانی کی پارسائی اور پاک دامنی کا بھرم تو قائم رہا لیکن جوانی کب تک ساتھ دیتی۔ عمر ڈھلی تو جسم کا گداز اور بانکپن بھی پگھلنے لگا۔ رگ پٹھے سمٹنے اور سکڑنے لگے۔ آنکھوں کے نیچے ہلکی ہلکی جھریاں نمودار ہونے لگیں۔ چہرے کی شادابی اور شگفتگی دھندلا گئی۔ آنکھوں میں جھلملاتے ہوئے چراغ مدھم پڑ گئے۔ مغلانی کی جوانی اب شام کی دہلیز پر کھڑی تھی۔

نواب تقی کے التفات میں بھی پہلی سی گرمی اور شوریدہ سری نہ رہی تھی مغلانی کے حسن و شباب پر خزاں کے سائے منڈلا رہے تھے تو دوسری طرف نواب تقی کی جوانی پر پوری طرح بہار آئی ہوئی تھی۔ ان کی مردانہ وجاہت روز بروز نکھرتی جا رہی تھی۔ اب وہ ایک خوب رُو اور کڑیل جوان تھے۔ یار دوست بھی پیدا ہو گئے تھے۔ خوب سے خوب تر کی تلاش میں ان کے ہمراہ چوک کے بالاخانوں پر پہنچنے لگے تھے۔ کئی طوائفوں سے مراسم پیدا ہوئے اور اللہ رکھی پر تو ایسا دل آیا کہ ہر دم اس کی شکل آنکھوں میں گردش کرتی رہتی۔ وہ تھی بھی غضب کی حسین۔ اُٹھتی جوانی تھی۔ ایک ایک عضو مچھلی کی مانند پھڑکتا تھا۔ اس کے ہر انداز میں عشوہ تھا، لگاوٹ تھی۔ نواب تقی کی شامیں اب اس کے بالاخانے

پر گزرتیں۔ اکثر رات بھی وہیں بسر کرتے۔

مغلانی کے پاس اب وہ بہت کم آتے۔ کئی کئی دن پلٹ کر خبر نہ لیتے حالانکہ اب وہ رات کو زیادہ، بلکہ بہت زیادہ بناؤ سنگار کرتیں۔ گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار بناتیں۔ نواب تقی آتے تو ہر طرح ان کی دل داری کرتیں۔ ان کو اپنا گرویدہ بنانے کے لئے ہر حربہ اور ہر گر آزماتیں۔ کبھی نواب تقی ان کی ناز برداری کرتے تھے۔ یہ روٹھتی تھیں وہ مناتے تھے۔ یہ تڑپاتی تھیں وہ تڑپتے تھے۔ اب مغلانی حسنہ بیگم ان کے لئے تڑپتی تھیں۔ بے قراری کا اظہار کرتیں۔ گلے شکوے کرتیں۔ نواب تقی حیلہ جوئی اور سخن سازی سے کام لیتے۔ وعدہ کرتے اور نہ آتے مغلانی ساری رات ان کے انتظار میں گزار دیتیں۔

اسی اثنا میں نہایت دھوم دھام سے نواب تقی کی شادی بھی ہو گئی نواب تقی نے حضور بیگم کو حجلۂ عروسی میں دیکھا تو ایسے فریفتہ ہوئے کہ گھڑی بھر کی جدائی بھی شاق گزرتی۔ اللہ رکھی کے بالا خانے پر آمد و رفت میں بھی خلل پیدا ہوا اور پھر ایک ایسا وقت آیا کہ مراسم یک لخت ختم ہو گئے۔ اب وہ مغلانی سے بھی کترانے لگے تھے۔ وہ چھپ چھپ کر کسی نہ کسی طور نواب تقی سے ملتیں۔ رات کو آنے کے لئے قسمیں دے دے کر وعدہ لیتیں اور ہر وعدے کے بعد پہر رات گزرتے ہی خوب بناؤ سنگار کر کے ان کے انتظار میں ایک ایک پل کا شمار کرتیں۔ عالم یہ ہوتا کہ کان دروازے پر لگے ہوتے اور آنکھوں میں نواب تقی کی صورت بسی ہوتی۔ مگر نہ دروازے پر دستک ہوتی نہ نواب تقی کا ہنستا مسکراتا چہرہ نظر آتا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ حضور بیگم جب میکے میں ہوتیں تو یہ خود چل کر چھپتی چھپاتی نواب تقی کی خواب گاہ میں پہنچ جاتیں۔

نواب تقی کی بے اعتنائی بڑھتے بڑھتے اس مرحلہ پر پہنچ گئی کہ ایک رات جب وہ ان کے کمرے میں گئیں تو انہوں نے نہایت بے رُخی سے ان کو واپس بھیج دیا۔ صاف صاف کہہ دیا کہ اب وہ اللہ اللہ کریں۔ اور اپنی عاقبت

سنوارنے کی کوشش کریں۔ مغلانی کے دل پر ایسی زبردست چوٹ لگی کہ بلبلا اٹھیں۔ کوٹھری میں پہنچ کر بستر پر گر پڑیں اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

وہ رات انہوں نے تڑپتے اور آنسو بہاتے کاٹی۔ اس کاری ضرب نے ان کا رہا سہا دم خم بھی ختم کر دیا۔ دل برداشتہ ہو کر سوچا کہ سنکھیا کھا لیں یا کہیں اور چلی جائیں۔ مگر نہ انہوں نے خودکشی کی اور نہ کہیں گئیں۔ جاتی بھی کہاں خاموشی سے اپنی آگ میں جلتی رہیں۔

☆

نواب تقی کی زندگی میں کتنے ہی نشیب و فراز آئے۔ پہلے والد کا انتقال ہوا۔ دو سال بھی نہ گزرے تھے کہ جان چھڑکنے والی ماں بھی داغ مفارقت دے گئیں۔ دونوں کی آنکھیں بند ہوتے ہی دبی ہوئی خاندانی رنجشوں نے سر ابھارا سگے سوتیلے کا امتیاز پہلے ہی کم نہ تھا۔ اب کھل کر سامنے آگیا۔ منجھلے بھائی نواب صفی کی بیوی انجمن آرا بیگم سے حضور بیگم کی کبھی نبھ نہ سکی۔ وہ مزاج کی تیز اور طرار تھیں جو منہ میں آتا بھڑ سے کہہ دیتیں۔ ادھر حضور بیگم کو یہ مان تھا کہ وہ بہت بڑے گھر کی بیٹی تھیں۔ انجمن آرا سے ذرا نہ دبتیں۔ دیورانی اور جٹھانی میں تلخی اتنی شدت کے ساتھ بڑھی کہ انجمن آرا بیگم نے مغلانی کو اعتماد میں لیا اور کھانے میں زہر ملا کر حضور بیگم کو ہلاک کرنے کا منصوبہ بنایا۔ مغلانی تو پہلے ہی رقابت کی آگ میں جل رہی تھیں۔ تیار بھی ہو گئیں۔

مگر جب انجام پر غور کیا تو دل میں خوف خدا سمایا۔ حضور بیگم کی جوانی پر ترس آیا۔ ایک روز پہلے ہی ان کو خطرے سے خبردار کر دیا۔ بات کچھ ایسے ڈھب سے کی کہ سازش میں ان کے ملوث ہونے کے بارے میں حضور بیگم کو ذرا بھی شبہ نہ ہوا۔ بلکہ وہ مغلانی کو اپنا ہمدرد اور جانثار سمجھنے لگیں۔ حضور بیگم اسی روز میکے چلی گئیں اور ہفتہ بھر تک واپس نہ آئیں۔

نواب تقی کو تشویش ہوئی۔ حضور بیگم کے پاس گھبرائے ہوئے پہنچے۔ کریدکر

نہ آنے کا سبب پوچھا تو انہوں نے سب کچھ صاف صاف بتا دیا۔ اب ساتھ رہنا ممکن نہ تھا۔ لہٰذا حضور بیگم کے مشورے سے بارہ دری میں منتقل ہونے کا تہیہ کر لیا۔ بڑے بھائی نواب ذکی کو اطلاع ملی تو دل گرفتہ ہوئے۔ نواب تقی کو اپنے ارادے سے باز رکھنے کی بہت کوشش کی۔ ہر طرح سمجھایا بجھایا مگر نواب تقی آمادہ نہ ہوئے۔ بارہ دری میں منتقل ہو گئے۔

مغلانی بھی ان کے ساتھ ہی رہیں مگر سلگتے سلگتے اب جل کر راکھ ہو گئی تھیں۔ بالوں میں سفیدی تو پہلے ہی کہیں کہیں سے جھانکنے لگی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارا سر سفید ہو گیا۔ چہرے کی جھریاں اور نمایاں ہو گئیں۔ نواب تقی کے لئے اب وہ حسنہ بیگم نہ رہی تھیں صرف اور صرف بی مغلانی رہ گئی تھیں۔

نجّو سایۂ عاطفت میں آئی تو انہیں دل بہلانے کا سہارا مل گیا۔ مامتا کا جذبہ جو اُن کی تہہ در تہہ شخصیت میں دب رہ گیا تھا، ایسا بیدار ہُوا کہ وہ اس پر جان چھڑکتی تھیں۔ عبادت گزار بھی زیادہ ہو گئی تھیں۔ عبادت اور ریاضت کے ساتھ ساتھ ان کا بیشتر وقت نجّو کی دیکھ بھال میں گزرتا۔

نجّو کا رنگ گندمی تھا مگر چہرے کے خدوخال تیکھے اور دل آویز تھے۔ مغلانی اسے دیکھتیں تو دل ہی دل میں نہال ہوتیں۔ چوزے کی طرح اپنے پروں میں اسے سنبھال کر رکھتیں۔ لڑکپن گزرا اور جوانی کی دہلیز پر اس نے قدم رکھا تو مغلانی نے زنان خانے کی ڈیوڑھی سے باہر جانے اور نوکروں چاکروں سے بات چیت کرنے پر کڑی پابندی لگا دی۔ حضور بیگم سے اجازت بھی لے لی۔ نواب تقی کی جانب سے ہمیشہ چوکنّا رہتی تھیں۔ وہ ان کی حسن پرستی اور دل پھینک طبیعت سے بخوبی واقف تھیں۔ نجّو کو ان کے قریب پھٹکنے نہ دیتیں۔

نجّو کے ساتھ مغلانی کی محبت کا یہ عالم تھا کہ جان نچھاور کرتی تھیں۔ ہنس ہنس کر اس کے ناز نخرے اٹھاتی تھیں۔ کوشش کرتیں کہ کسی طور اس کا دل میلا نہ ہو۔

اس وقت بھی اس کو مضمحل اور نڈھال دیکھا تو بے چین ہو گئیں۔ پیار سے چمکارا سر پر ہاتھ پھیرا مسکرا کر بولیں۔

"طبیعت میں گرانی ہے تو بستر پر آرام کرتی رہو۔"

"ہاں اماں، میرا بستر ہی پر لیٹے رہنے کو دل چاہ رہا ہے۔" نجو نے لہجے میں نقاہت پیدا کرتے ہوئے کہا۔ "نہ جانے طبیعت کیسی گری گری ہو رہی ہے سر میں درد بھی ہے۔"

"اچھا، اچھا لیٹی رہو۔ کون تم سے اٹھنے اور باہر جانے کو کہہ رہا ہے۔" مغلانی نے اسے تسلی دی۔

نجو نے کچھ نہ کہا خاموش لیٹی رہی۔

☆

کوٹھری کے دروازے کی دہلیز پر رمضانو کھڑی تھی۔ گل بدن کی طرح وہ بھی حضور بیگم کی پرانی خواص تھی۔ مزاج شناس بھی تھی۔ ہر دم ان کے آگے پیچھے رہتی تھی۔ کام کاج بھی نہایت مستعدی سے کرتی تھی۔ اس کا شوہر عیدل بارہ دری کے پھاٹک پر دربان تھا۔ حضور بیگم ہی نے عیدل سے رمضانو کی شادی کرائی تھی۔ دونوں کی ایک بیٹی بھی تھی۔ اور اب پانچ برس کی ہو چکی تھی۔

مغلانی نے رمضانو کو دیکھتے ہی پوچھا۔ "ادھر کیسے آ گئی رمضانو؟"

"وہ ایسا ہے مغلانی جی، مجھے ایک ضروری کام سے باہر جانا ہے۔" رمضانو نے جواب دیا۔

"اس وقت جاؤ گی؟" مغلانی نے حیرت کا اظہار کیا۔ "تم کو معلوم نہیں کہ بڑی سرکار اب درگاہ حضرت عباس سے واپس آنے ہی والی ہوں گی۔ آتے ہی تمہارے بارے میں پوچھیں گی۔" ان کا لہجہ ناصحانہ ہو گیا۔ "میرا کہنا مانو تو ابھی ٹھہر جاؤ۔ بڑی سرکار آ جائیں تو ان سے اجازت لے کر جہاں تمہارا جی چاہے چلی جانا۔"

"نہیں مغلانی جی۔ مجھے تو ابھی جانا ہے"۔ رمضانو نے اصرار کیا۔" بڑی سرکار کا تو کچھ پتہ نہیں کب آئیں۔ مجھے جلدی ہے"۔

"شاہ مینا کے مزار پر نوچندی کا میلہ دیکھنے میاں کے ساتھ جا رہی ہو؟"

"نہیں مغلانی جی، چاہے جس کی قسم لے لو۔ ایسی بات نہیں"۔ رمضانو نے فوراً وضاحت کی۔"سیتا پور سے میری چھوٹی بہن مجیدن آئی ہوئی ہے۔ اس سے ملنے جا رہی ہوں"۔

"پہلے تو تم نے اس کا تذکرہ کیا نہیں"۔ مغلانی نے اپنے شبہ کا اظہار کیا۔

"آج ہی تو مجھے پتہ چلا ہے"۔ رمضانو نے مغلانی کا شبہ رفع کرنے کی غرض سے مزید وضاحت کی۔"میرا بہنوئی مجھے لینے آیا ہے۔ پھاٹک پر عبدل کے ساتھ بیٹھا ہے۔ کہتا تھا مجیدن کی طبیعت بہت خراب ہے"۔

"بیماری کیا ہے"؟ مغلانی نے تشویش کا اظہار کیا۔

"سنا ہے چھیٹ ہے۔ ایسا زبردست آسیب ہے کہ میرا بہنوئی تو مجیدن کو لے کر کچھوچھے شریف بھی گیا۔ مہینوں وہاں پڑا رہا پر کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا۔ اب یہاں لے کر آیا ہے"۔

"مجیدن کہاں ہے"؟ مغلانی نے دریافت کیا۔

"مولوی انوار کے باغ میں ہے"۔ رمضانو نے جواب دیا۔"وہیں مزار کے پاس ٹھہری ہے"۔

"کہتے ہیں وہاں تو دور دور سے لوگ آتے ہیں۔ اور اچھے ہو کر جاتے ہیں"۔

"اچھے ہی ہو کر جاتے ہوں گے۔ تب ہی تو آتے ہیں"۔ رمضانو نے مغلانی کی تائید کی۔

"وہاں ہوتا کیا ہے۔ میرا مطلب ہے کیسے بھوت پریت اور آسیب کو اتارا جاتا ہے"؟ مغلانی نے کرید کر پوچھا۔

"مجھے خود ٹھیک سے معلوم نہیں"۔ رمضانو نے بتایا۔"پہلے کبھی گئی ہوتی تو معلوم

بھی ہوتا۔ آج جاکر دیکھوں گی کیا ہوتا ہے"۔ اس نے قدرے توقّف کیا۔ "مغلانی جی تو پھر میں چلی جاؤں۔ باہر میرا بہنوئی بیٹھا انتظار کر رہا ہے"۔

"بڑی سرکار پوچھیں گی تو میں ان سے کیا کہوں گی"۔

"مغلانی جی انہیں سمجھا دیجئے گا"۔ اس کے لہجے میں التجا تھی۔ "دیکھئے نا اتنی دور سے بہن آئی ہے۔ بے چاری کی ایسی حالت ہو رہی ہے کہ آپ سے کیا بتاؤں اس کا میاں کہتا تھا کہ دن بدن طبیعت بگڑتی ہی جا رہی ہے۔ اب یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ یہاں ہو اور میں نہ جاؤں"۔ اس کی آواز بھرّا گئی۔ "دنیا میں اس بہن کے سوا میرا اور بیٹھا ہی کون ہے"۔

مغلانی پسیج گئیں۔ نرم لہجے میں بولیں۔ "اچھا، اچھا، تم دل چھوٹا نہ کرو اب جاؤ۔ بڑی سرکار پوچھیں گی تو میں ان کو سمجھا دوں گی"۔

رمضانو نے دوپٹے کے آنچل سے آنکھوں میں ڈبڈباتے ہوئے آنسو پونچھے خاموشی سے مُڑی۔ آگے بڑھی۔ دالان سے گزر کر صحن میں پہنچی اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی ڈیوڑھی میں داخل ہو گئی۔

(۷)

بارہ دری کی چار دیواری کے اس پار باقر نواب کی ڈیوڑھی پر اب خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ان کی بیٹی مہر عالم کی رخصتی کا ہنگامہ ختم ہو چکا تھا۔ براتی کب کے جا چکے تھے۔ اب مہمان بھی ایک ایک کر رخصت ہو رہے تھے۔

گلی میں بچوں کے شور و غل میں ملی جلی پھیری والوں کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔

دن کا چل چلاؤ تھا۔ شام کی آمد آمد تھی۔ گلی کے موڑ پر ایک مکان کی بلندی پر میونسپلٹی کی بڑی سی لالٹین نصب تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے جھٹ پٹے میں لالٹین روشن کرنے والا ایک موڑ سے نمودار ہوا۔ وہ کندھے پر لکڑی کی اونچی سیڑھی

اٹھائے ہوئے تھا۔ ایک ہاتھ میں ٹین کا کنستر لٹک رہا تھا۔ اس نے سیڑھی دیوار سے لگائی۔ اوپر چڑھا۔ لالٹین کا دروازہ کھولا۔ اندر سے شیشے کا لیمپ نکالا۔ نیچے اترا لیمپ کو جھاڑن سے صاف کیا۔ اس میں کنستر سے مٹی کا تیل ڈالا۔ اسے سنبھالے ہوئے ایک بار پھر سیڑھی پر چڑھا۔ لیمپ اندر رکھا۔ دیا سلائی جلا کر لیمپ کی بتی کو روشن کیا۔ لالٹین کا دروازہ احتیاط سے بند کیا۔ نیچے اترا۔ سیڑھی اٹھا کر کندھے پر رکھی۔ کنستر سنبھالا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ ابھی اسے تاریک گلی کوچوں میں ایسی ہی کتنی لالٹینیں روشن کرنا تھیں۔

لالٹین کی روشنی سے اندھیری گلی روشن ہوگئی۔ گلی سے سو، سوا سو گز کے فاصلے پر پختہ سڑک تھی جو بارہ دری کے پھاٹک کے سامنے سے گزرتی تھی۔ سڑک پر لگے ہوئے لوہے کے کھمبوں میں بجلی کے بلب جگمگا رہے تھے۔ نواب نقی مرحوم نے بہت کوشش کی کہ بارہ دری میں بجلی آجائے۔ سفارش بھی پہنچائی۔ بیماری کا سرٹیفکیٹ بھی درخواست کے ساتھ لگایا۔ لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ پاور ہاؤس بیلی گارد کے پہلو میں بلرام پور اسپتال کے قریب واقع تھا مگر وہ اتنا طاقت ور نہ تھا کہ پورے شہر کی ضرورت کے مطابق بجلی مہیا کر سکے۔

بیرونی ڈیوڑھی کے اندر طاقوں میں رکھے ہوئے چراغ روشن کر دیئے گئے تھے۔ چھت میں گیس کا ہنڈا بھی لٹک رہا تھا جو خاص خاص موقعوں پر روشن کیا جاتا تھا۔ چراغوں کی روشنی میں کہار اور دربان اطمینان سے بیٹھے حقہ گڑگڑا رہے تھے۔ قریب ہی ایک چوپہلا رکھا تھا۔ اس پر پردہ پڑا تھا۔

زنان خانے کی غلام گردشوں، صحنچیوں اور سہ دریوں کی دیواروں پر آویزاں کنول اور دوشاخے، سورج کے غروب ہوتے ہی روشن کئے جا چکے تھے۔ ایک خادمہ دالانوں کی اونچی اونچی چھتوں میں لٹکے ہوئے فانوس اور مردنگ احتیاط سے روشن کر رہی تھی۔ فانوسوں اور مردنگوں میں جھلملاتی ہوئی کافوری شمعوں کی روشنی ہر سو پھیلتی جا رہی تھی۔

مامائیں اور لونڈیاں اِدھر سے اُدھر آ جا رہی تھیں، ہنس بول رہی تھیں۔ باورچی خانے سے کھانوں کی تیز مہک اُبھر رہی تھی۔

☆

ڈیوڑھی میں کہاروں کی اونچی آواز اُبھری۔ اس آواز کے ساتھ ہی ہر طرف کھلبلی مچ گئی۔ دو خادمائیں، سارے کام کاج چھوڑ کر ڈیوڑھی کی جانب تیزی سے دوڑیں۔

کہاروں نے چوپہلا ڈیوڑھی کے اندر رکھ دیا اور باہر چلے گئے۔ مہری نے جو حضور بیگم کے ساتھ تھی، بڑھ کر جھٹ باہر احاطے میں کھلنے والا دروازہ بند کر دیا۔ دونوں ماماتیں جھپاک سے چوپہلے کے قریب پہنچ گئیں۔ ایک نے ہاتھ بڑھا کر چوپہلے پر پڑے ہوئے پھٹکے کو ایک طرف سے اٹھا دیا۔ دوسری نے جھک کر سہارا دیا۔ حضور بیگم نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور چوپہلے سے اتر کر باہر آ گئیں۔ وہ ہر جمعرات کی سہ پہر کو اپنی بگھی میں سوار ہو کر پہلے ملکہ زمانی کی کربلا جاتیں۔ پھر وہاں سے درگاہ حضرت عباس علمدار پہنچتیں۔ چراغ جلے واپس آتیں تو بگھی پھاٹک کے اندر ڈیوڑھی میں ٹھہر جاتی۔ آگے باغیچہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اصطبل باہر سڑک کے کنارے تھا۔ جب پھاٹک کے دروازے بند ہو جاتے اور کوئی مرد موجود نہ رہتا تو حضور بیگم بگھی سے اتر کر چوپہلے میں بیٹھ جاتیں۔ ایک مہری ہمیشہ ان کے ہمراہ رہتی تھی۔ وہ کہاروں کو آواز دیتی۔ کہار دروازہ کھول کر اندر آتے اور چوپہلا اٹھا کر زنانہ ڈیوڑھی میں پہنچا دیتے۔

حضور بیگم نے چوپہلے سے باہر آ کر اپنی شال درست کی۔ مہری کی مدد سے فرشی پائجامے کے بڑے بڑے پائنچے اٹھا کر ایک ہاتھ پر ڈالے اور خراماں خراماں آگے بڑھیں۔ مہری ان کے جلو میں تھی۔ دونوں ماماتیں پیچھے پیچھے چلیں۔ حضور بیگم ڈیوڑھی سے نکل کر صحن میں پہنچیں۔ خواصوں اور خادماؤں کی کوٹھریوں کے طاقوں میں مٹی کے تیل کی کپیاں ٹمٹما رہی تھیں۔ ان کی زرد زرد روشنی کوٹھریوں

کی جھکی ہوئی چھت کے برآمدے سے نکل کر صحن میں روشن دھبوں کی مانند بکھری ہوئی تھی۔

حضور بیگم نے ان کی جانب کوئی توجہ نہ دی۔ مٹی کے تیل کی بو اُن کو سخت ناگوار گزرتی تھی۔ اس قدر نازک مزاج اور حساس تھیں کہ مٹی کے تیل کی بو ناک میں پہنچتے ہی چھینکیں آنا شروع ہو جاتیں۔ کبھی کبھی تو زکام بھی ہو جاتا۔ چنانچہ مٹی کے تیل سے چلنے والے خوبصورت اور عمدہ لیمپ موجود ہونے کے باوجود کبھی ان کے استعمال میں نہ آئے۔ وہ صرف دیوان خانے میں استعمال ہوتے تھے اور وہ بھی اس وقت جب نواب تقی حیات تھے۔ اب تو دیوان خانہ عرصے سے ویران پڑا تھا۔

انہوں نے صحن عبور کیا۔ مغلانی خیر مقدم کے لئے پہلے ہی وہاں موجود تھیں۔ جھک کر آداب بجا لائیں۔ مزاج پوچھا اور ساتھ ساتھ چلنے لگیں۔ حضور بیگم ایک محراب کے نیچے سے گزر کر دالان میں پہنچیں اسے طے کیا۔ دوسرے میں پہنچیں ایک پیش خدمت نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا اور نظریں جھکا کر ادب سے ایک طرف کھڑی ہو گئی۔

حضور بیگم اندر داخل ہوئیں۔ یہ ہال نما وسیع کمرہ تھا۔ طول میں دالانوں کے برابر تھا۔ چھت بھی اتنی ہی اونچی تھی۔ دونوں طرف تلے اوپر کمرے تھے جو جاڑوں میں کبھی کبھار خواب گاہوں کے طور پر استعمال ہوتے تھے اور عام طور پر خالی رہتے تھے۔ مہمان آجاتے تو انہی کمروں میں قیام کرتے۔ بڑے کمرے کے وسط میں چھ تخت ملا کر شہ نشین بنائی گئی تھی۔ شہ نشین پر اجلی چاندنی کا فرش تھا۔ چاندنی پر نرم نرم غالیچہ بچھا تھا۔ گاؤ تکیے قرینے سے رکھے تھے ان پر عنابی مخمل کے غلاف چڑھے تھے۔

وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی شہ نشین کے قریب پہنچیں۔ جوتیاں اتاریں۔ ایک پیش خدمت نے بڑھ کر سہارا دیا۔ اوپر پہنچیں اور گاؤ تکیہ سے ٹیک لگا کر تھکی

ہوئی سی مسند پر بیٹھ گئیں۔ مغلانی بھی ان کے ساتھ ہی بیٹھ گئیں۔ خادمہ پان دان اُٹھا کر لائی اور مغلانی کے پاس رکھ دیا۔ انہوں نے پاندان کا ڈھکنا کھولا صافی میں لپٹے ہوئے پانوں میں سے ایک پان نکالا اور اس پر کتھا چونا لگاتے لگیں۔

مغلانی نے پان بنا کر پیش کیا۔ حضور بیگم نے اسے کلّے میں دبا لیا۔ ایک خواص شہ نشین کے ایک طرف سر جھکائے مؤدب کھڑی تھی۔ حضور بیگم نے اشارہ کیا۔ اس نے پیکدان اٹھا کر سامنے کیا۔ حضور بیگم نے پیک تھوکی خواص کی طرف نظریں اٹھا کر دیکھا۔ حکم دیا۔ "گل بدن! باہر دروازے پر جا کر بیٹھو اور دیکھو کوئی بغیر بلائے یہاں نہ آئے۔" اس حکم کا واضح مطلب یہ تھا کہ وہ تخلیہ چاہتی تھیں۔

گلبدن فوراً مڑی اور دروازے کے باہر دہلیز سے لگ کر بیٹھ گئی۔

تخلیہ ہُوا تو مغلانی نے بھی پہلو بدلا اور ہمہ تن گوش ہو گئیں۔

حضور بیگم نے کھنکار کر گلا صاف کیا آہستہ سے مغلانی کو مخاطب کیا۔ "بی مغلانی، تم نے کچھ اور سنا؟" انہوں نے قدرے تامّل کیا۔ "داروغہ میر نصیر پھر بے روزگار ہو گئے۔" وہ زیرلب مُسکرائیں۔ "اب حال ان کا یہ ہے کہ پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں۔"

"مگر وہ تو نواب صفی کی سرکار میں ملازم تھے۔" مغلانی نے حیرت کا اظہار کیا۔

"تو تمہیں اب معلوم ہوا ہے۔" حضور بیگم کا لہجہ اس بار قدرے تیکھا تھا۔ "نواب صاحب کی اِدھر آنکھیں بند ہوئیں، اُدھر میر نصیر نے ان کی ملازمت اختیار کی۔ جیسے وہ اسی دن کا انتظار کر رہا تھا۔ میں تو کہتی ہوں وہ پہلے ہی سے ان سے ملا ہوا تھا۔ مقدمے کے بارے میں ایک ایک اطلاع پہنچاتا تھا۔ نواب صاحب تو ہمیشہ کے بھولے تھے۔ آنکھیں بند کر کے ہر ایک پر اعتبار کر لیتے تھے داروغہ نصیر نے گویا اُن پر جادو کر دیا تھا۔ جو کہتا تھا وہی کرتے تھے۔"

"آپ کو یہ اطلاع کس نے دی کہ داروغہ نصیر اب نواب صفی کی سرکار میں نہیں رہے؟" مغلانی نے دریافت کیا۔

"کسی اور سے نہیں، خود داروغہ میر نصیر کی بیوی نے مجھے بتایا۔ یہاں آنے کی تو اُسے جرأت نہیں ہوئی، کربلا پہنچی۔" حضور بیگم نے مطلع کیا۔ "اسے اچھی طرح خبر ہے کہ میں ہر جمعرات کو کربلا جاتی ہوں۔"

"داروغہ نصیر کو نواب صفی کی سرکار سے علٰحدہ کب کیا گیا؟"

"دو مہینے سے اوپر ہو گئے۔" حضور بیگم نے مغلانی کو بتایا۔ "وہ تو یہی کہتی تھی اپنی بات کہتے کہتے وہ لمحہ بھر کو ٹھٹکیں۔" ہاں خوب یاد آیا۔ پچھلے ہی دنوں تو نفیسہ بیگم کے ہاں مجلس میں تمہاری ملاقات چھوٹی بھابی جان سے ہوئی تھی۔ انہوں نے تم کو نہیں بتایا کہ داروغہ نصیر کو ملازمت سے برطرف کر دیا گیا؟"

"سرکار! میری تو ان سے صرف اتنی ملاقات رہی کہ میں نے آداب کیا مزاج پوچھا۔ اللہ اللہ خیر صلّا! نہ انھوں نے کوئی بات کی نہ میں نے۔ سچ پوچھیے تو میں ان سے بات کرتے ہوئے کترا رہی تھی۔ آپ ان کی طبیعت تو جانتی ہیں۔ اللہ معلوم کیا کہہ دیتیں۔ خواہ مخواہ جی سلگتا۔"

★

مغلانی نہایت ڈھٹائی سے جھوٹ بولتی رہیں۔ حضور بیگم کی چھوٹی جٹھانی انجمن آرا بیگم سے نہ صرف ان کی بات چیت ہوئی تھی بلکہ دیر تک ہوتی رہی تھی۔ ان کی باتوں سے مغلانی حسنہ بیگم کو بخوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ نواب صفی نے نہ تو میر نصیر کو ملازمت سے ہٹایا تھا اور نہ ہی فی الحال ایسا کوئی ارادہ تھا۔ جائیداد کے تنازعے میں نواب تقی اور نواب صفی کے درمیان جو مقدمہ بازی ہو رہی تھی وہ ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ البتہ نواب تقی کے انتقال کے بعد مقدمہ نواب صفی کے حق میں پلٹ گیا تھا۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ مدد ان کو میر نصیر سے مل رہی تھی جو عرصۂ دراز تک نواب تقی کی جانب سے مقدمہ کی پیروی میں پیش پیش رہ چکے تھے۔ نواب تقی مرحوم نے اپنی والدہ کا جو جعلی نکاح نامہ عدالت میں پیش کیا تھا اس حقیقت سے میر نصیر نہ صرف واقف تھے بلکہ انھی نے بنوایا بھی تھا۔

نواب صفی اپنے وکیل کے مشورے پر اب یہ چاہتے تھے کہ اصلی نکاح نامہ اور مقدمہ کے سلسلہ کی دوسری اہم دستاویزات جو حضور بیگم کی تحویل میں تھیں کسی طرح ان کے قبضے میں آجائیں تاکہ ان کا مقدمہ نہ صرف اور مضبوط ہو جائے بلکہ دو چار پیشیوں میں فیصلہ بھی ان کے حق میں ہو جائے۔ یہ مقصد صرف اسی صورت میں حاصل ہو سکتا تھا کہ داروغہ میر نصیر کو دوبارہ حضور بیگم اپنی جائیداد اور املاک کا پہلے کی طرح منتظم مقرر کر دیتیں۔ ملازمت پر بحال ہوتے ہی مقدمہ کی پیروی میں ایک بار پھر وہ کرتا دھرتا بن جاتے اور آسانی سے حضور بیگم سے کسی نہ کسی بہانے ہر دستاویز حاصل کر کے نواب صفی کو پہنچا دیتے۔

نواب صفی نے ایک طرف تو اپنی بیوی کو لگایا کہ وہ مغلانی کے ذریعہ حضور بیگم کو آمادہ کریں کہ وہ میر نصیر کو دوبارہ ملازم رکھ لیں اور دوسری طرف مشہور کر دیا کہ انہوں نے میر نصیر کو ملازمت سے علیٰحدہ کر دیا ہے۔

اس سازش میں ان کی چھوٹی بہن نفیسہ بیگم شامل تھیں یا نہیں، مگر انہوں نے نواب صفی کی بیوی انجمن آرا بیگم سے مغلانی کی ملاقات کرانے کی سبیل ضرور پیدا کر دی۔ نفیسہ بیگم نے مجلس کا اہتمام کیا اور اس میں شرکت کے لئے حضور بیگم کے ساتھ ساتھ مغلانی کو بھی بلایا۔ کسی خادمہ کو بھیجنے کے بجائے خود بارہ دری پہنچیں حضور بیگم سے بار بار کہا مگر ان کو اچھی طرح علم تھا کہ حضور بیگم تو مجلس میں اس لئے شریک نہ ہو سکیں گی کہ وہاں انجمن آرا بھی موجود ہوں گی اور وہ ان کی صورت تک دیکھنے کی روادار نہ تھیں۔ البتہ ان کے اصرار پر حضور بیگم نے مغلانی کو مجلس میں جانے کی اجازت دے دی۔

انجمن آرا نے مغلانی کو بلا کر اپنے پاس بٹھایا۔ خندہ پیشانی سے پیش آئیں حال احوال پوچھا۔ نجو کی خیریت معلوم کی۔ کچھ دیر ادھر اُدھر کی باتیں کیں پھر ایک طرف تخلیہ میں لے گئیں۔ حضور بیگم کے خلاف لگائی بجھائی کی۔ اس طرح الزام تراشی اور بدگوئی سے کام لیا کہ مغلانی کے دل میں حضور بیگم کے خلاف نفرت اور بدگمانی

پیدا ہو جائے۔

انہوں نے مغلانی کو اپنے ڈھب میں لانے کی پوری پوری کوشش کی۔ رشوت کے طور پر یہ پیش کش بھی کی کہ وہ جب چاہیں بچوّں کے ساتھ زیادہ تنخواہ پر ان کی ملازمت میں آجائیں۔ زیادہ آرام و آسائش کے ساتھ رکھنے اور زیادہ عزت و احترام دینے کا بار بار اظہار کیا۔

مغلانی نے ان کی تمام باتیں خاموشی سے سُنیں۔ ان کی ہاں میں ہاں بھی ملائی۔ یہ بھی وعدہ کر لیا کہ حضور بیگم کو آمادہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کریں گی کہ وہ میر نصیر کو معافی دے دیں اور ان کی ملازمت بحال کر دیں۔ انجمن آرا بیگم نے خوش ہو کر ان کو بیس روپے بھی دیئے۔ اور انہوں نے لے کر رکھ بھی لئے۔ مجلس سے واپس بارہ دری آئیں تو حضور بیگم سے صرف اتنا ذکر کیا کہ انجمن آرا بیگم بھی موجود تھیں اور آج حضور بیگم نے جب کرید کر پوچھا تب بھی نہ کھلیں۔ سخن سازی سے کام لیا۔ صاف انکار کر دیا۔

☆

حضور بیگم نے حسب معمول مغلانی کی باتوں کو تسلیم کر لیا۔ مسکرا کر بولیں۔" مجھے خبر ہے کہ تم نے چھوٹی بھابھی کو منہ نہ لگایا ہو گا۔ وہ تم سے میری غیبت ہی کرتیں اور اسے سن کر خواہ مخواہ تمہارا دل ہی جلتا۔ جواب دیتیں تو بدمزگی پیدا ہوتی۔ کوئی تعجب نہیں کہ وہ بھری مجلس میں تمہارا فضیتا شروع کر دیتیں۔"

مغلانی نے بات کا رخ پلٹنے کی غرض سے پوچھا۔" سرکار! آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ داروغہ میر نصیر کی اہلیہ کہتی کیا تھیں؟"

" اسے کہنا کیا تھا،" حضور بیگم نے منہ بگاڑ کر بے نیازی سے کہا۔" گڑگڑا رہی تھی۔ بچوّں کا واسطہ دے رہی تھی کہ میر نصیر کا قصور معاف کر دیا جائے۔ ایک آخری موقع دیا جائے۔ آئندہ کوئی غلطی سرزد ہو تو کھڑے کھڑے ذلیل کر کے نکال دیں۔" انہوں نے پان طلب کیا۔ مغلانی نے سر پوش اٹھا کر خاصدان سامنے

کیا۔ حضور بیگم نے ایک گلوری اٹھائی۔ منہ میں رکھی۔ پیکدان میں پان کی پہلی پیک تھوکی۔ سلسلہ گفتگو جاری رکھتے ہوئے بتایا۔ "آنکھوں میں آنسو بھر کر کہہ رہی تھی کہ اس قدر بُرا حال ہے کہ فاقوں کی نوبت آگئی ہے۔ قرض خواہوں نے جان کھا رکھی ہے۔" انہوں نے مڑ کر مغلانی کو دیکھا۔ "کم بخت اس بری طرح گھگھیا رہی تھی کہ میں تم سے کیا بتاؤں۔"

مغلانی خاموش بیٹھی حضور بیگم کی باتیں سنتی رہیں اور دل ہی دل میں کہتی رہیں کہ میر نصیر کی بیوی کس قدر عیّار اور چلتی پرزہ ہے کہ ایسے ڈھب سے بات کی کہ حضور بیگم متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں۔

مغلانی نے دبی زبان سے اپنے ردعمل کا اظہار بھی کیا۔ مسکرا کر بولیں۔ "سرکار آپ بڑی نرم دل ہیں۔ بہت جلد پسیج جاتی ہیں۔" انہوں نے کھل کر دل کی بات پھر بھی نہ کہی۔

"کیا کروں بی مغلانی، کم بخت یہ دل ہی ایسا ہے۔ کسی کو بھی مصیبت میں دیکھ کر تڑپ اٹھتا ہے۔" حضور بیگم نے بھی اپنی کمزوری کا اعتراف کر لیا۔ "اور میر نصیر تو تم کو معلوم ہی ہے کہ برسوں اس سرکار سے وابستہ رہا ہے۔ جانور بھی پاس رہے تو اس سے لگاؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ میر نصیر تو پھر انسان ٹھہرا۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہی ہوں؟"

"بالکل بجا فرمایا آپ نے۔" مغلانی نے ہاں میں ہاں ملائی۔ جھکتے ہوئے اُن کا عندیہ بھی معلوم کرنا چاہا۔ "سرکار! پھر آپ نے کیا سوچا؟"

"مجھے تو میر نصیر کی بیوی کی باتوں سے یہ اندازہ ہوا کہ کوئی دن جاتا ہے کہ وہ خود یہاں پہنچ جائے گا۔" حضور بیگم نے قیاس آرائی کی۔

"سرکار! میرا بھی یہی خیال ہے۔" مغلانی نے اتفاق رائے کیا۔ "مگر آپ نے ان کے بارے میں کیا طے کیا؟"

"اسی سلسلے میں تم سے مشورہ کرنا چاہتی ہوں۔"

حضور بیگم نے مغلانی کو الجھن میں ڈال دیا۔ وہ داروغہ میر نصیر کے بارے میں کھل کر کچھ کہنا نہ چاہتی تھیں۔ انہوں نے محتاط رویہ اختیار کیا۔ "سرکار! میں اس معاملہ میں کیا مشورہ دے سکتی ہوں۔ میرا تو میر نصیر سے اور ان کی بیوی سے کبھی سابقہ نہیں پڑا۔ آپ دونوں ہی کو اچھی طرح جانتی ہیں۔ اور میر نصیر کو تو بہت اچھی طرح جانتی اور سمجھتی ہیں۔ برسوں اس سرکار میں ملازم رہ چکے ہیں۔"

انہوں نے پینترا بدلا۔ "آخر آپ نے کچھ نہ کچھ تو ان کے بارے میں سوچا ہی ہوگا۔ یہ فرمائیں کہ آپ کا اپنا کیا خیال ہے؟" دراصل وہ کوئی رائے دینے سے پہلے حضور بیگم کا دل ٹٹولنا چاہتی تھیں۔

"بات دراصل یہ ہے کہ اس کمبخت مقدمہ بازی کے بارے میں مجھے تو کچھ پتہ نہیں۔ نواب صاحب نے بھی کچھ نہیں بتایا۔ پوچھا بھی تو یہ کہہ کر ٹال دیا۔ ارے بھئی! آپ کیوں ان جھمیلوں میں پڑنا چاہتی ہیں۔ خانہ داری کے مسائل کچھ کم ہیں۔" حضور بیگم نے اپنی الجھن بیان کی۔ "تم کو تو خبر ہی ہے کہ اب تو نہ میر منشی زوّار حسین ہیں اور نہ نواب صاحب کے عملے کے دوسرے ملازمین۔ کیا کرتی انہیں رکھ کر۔ نواب صاحب کے انتقال کے بعد ان کے لئے کرنے کا کوئی کام کاج تو رہ نہیں گیا تھا۔ مفت کی تنخواہ لیتے تھے۔ اب تو لے دے کے غلام صفدر خاں رہ گئے ہیں اور ان کو کچہری عدالت کا کوئی تجربہ نہیں۔ مقدمے کے بارے میں کچھ معلوم کرنا چاہتے ہیں تو وہ مجھ سے دریافت کرتے ہیں۔ میں ان کو کیا بتاؤں۔ کچھ خبر ہو تو بتاؤں بھی۔"

"لیکن مقدمے کے تمام کاغذات تو آپ ہی کے پاس ہیں نا؟" انجمن آرا بیگم سے نفیسہ بیگم کی مجلس میں ان کی جو گفتگو ہوئی تھی، اس کی روشنی میں وہ یہ جاننے کے لئے بے چین تھیں کہ مقدمہ کے کاغذات اور دستاویزات کہاں ہیں اور کس کی تحویل میں ہیں۔ انہوں نے دبی زبان سے دریافت کیا۔ "سرکار! آپ نے وہ تمام کاغذات وکیل صاحب یا غلام صفدر خاں کو تو نہیں دے دیئے؟"

"غلام صفدر خاں کی تحویل میں تو کوئی کاغذ یا دستاویز نہیں۔ یہ تو مجھے اچھی طرح علم ہے۔ وکیل صاحب کے پاس ضرور کچھ ہوں گے۔ ان کے بارے میں بھی صحیح طور پر کچھ نہیں معلوم"۔ حضور بیگم نے مغلانی کو مطلع کیا۔" البتہ ایک صندوقچی میں مقدمے کے کاغذات اور ضروری دستاویزیں ضرور رکھی ہیں۔ یہ صندوقچی میرے کمرے کے ساتھ جو توشہ خانہ ہے، اس میں موجود ہے۔ اس میں قفل پڑا ہے۔ میرے پاس اس کی کنجی بھی ہے، لیکن میں نے تو کبھی اسے کھول کر بھی نہ دیکھا۔"

" یہ صندوقچی ہمیشہ سے آپ کے توشے خانے میں رہتی تھی؟"

"جہاں تک مجھے یاد ہے۔ پہلے دیوان خانے میں رہتی تھی، پھر نواب صاحب ہی نے توشے خانے میں لاکر رکھ دی تھی۔ ضرورت ہوتی تھی تو دیوان خانے میں منگوا لیتے تھے مگر ہمیشہ واپس بھجوا دیتے تھے۔" حضور بیگم سنبھل کر بتاتی ہیں۔ نواب صاحب ہی اسے کھولتے اور بند کرتے تھے۔"

" بعد میں اسے کھولنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی"؟ مغلانی نے کرید کر پوچھا۔

" ابھی تک تو نہیں پڑی"۔ حضور بیگم کا لہجہ اچانک تیکھا ہوگیا۔" پڑتی بھی کیسے، غلام صفدر خان کے رویّے سے تو صاف ظاہر ہوتا ہے ان کو مقدمہ سے کوئی دلچسپی ہی نہیں۔ وہ تو مقدمے کے بارے میں بات بھی کرتے ہیں تو دبی زبان سے تشویش ہی کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کو خود تو کچھ خبر نہیں۔ وکیل صاحب سے جو سنتے ہیں وہی بتا دیتے ہیں۔ پچھلی پیشی پر کچہری سے آئے تو بہت پریشان تھے۔ کہتے تھے، مقدمہ کمزور پڑتا جارہا ہے۔"

"یہ تو واقعی پریشانی کی بات ہے"۔ مغلانی نے تبصرہ کیا۔

" پریشانی کی تو بات ہے، مگر میں کر بھی کیا سکتی ہوں؟" حضور بیگم کے بُشرے سے بھی پریشانی ہویدا تھی۔ ان کا لہجہ ایک بار پھر تلخ ہوگیا۔" جب کوئی ٹھیک سے پیروی کرنے والا نہ ہوگا تو مقدمہ کمزور ہی پڑے گا۔ خالی وکیل کھڑا کر دینے سے

تو کام نہیں چلتا۔ اس کے لئے تو پتا مارنا پڑتا ہے۔ بھاگ دوڑ کرنا پڑتی ہے۔" انہوں نے مڑ کر مغلانی کو نظر بھر کر دیکھا۔ "ایمان لگتی پوچھو تو داروغہ میر نصیر ہی تندہی اور مستعدی سے مقدمے کی پیروی کرتا تھا۔ جب سے وہ گیا ہے، یہی سننے میں آرہا ہے کہ مقدمہ کمزور ہو گیا ہے۔"

"ایسا تھا تو سرکار داروغہ میر نصیر کو ملازمت سے علٰحدہ کرنے سے قبل یہ ساری باتیں سوچ لینا چاہیئے تھیں۔" مغلانی نے دبی زبان سے حضور بیگم پر چوٹ کی جن کی ضد اور ہٹ دھرمی کے سامنے نواب تقی مرحوم بھی بے بس ہو گئے تھے۔ شدید ضرورت محسوس کرنے کے باوجود میر نصیر کی ملازمت برقرار نہ رکھ سکے تھے لیکن حضور بیگم نے مغلانی کی بات سن کر نہ منہ بگاڑا نہ کسی طور خفگی کا اظہار کیا۔ بلکہ نہایت صاف گوئی سے اپنی غلطی تسلیم کر لی۔ کہنے لگیں "کیا بتاؤں، بس اس وقت عقل پر پردے ہی پڑ گئے تھے۔ آئندہ کے بارے میں کچھ نہ سوچا۔ اب اس کا خمیازہ بھی تو بھگتنا پڑ رہا ہے۔" وہ لمحہ بھر خاموش رہیں۔ پھر جھجکتے ہوئے بولیں۔ "سوچتی ہوں کہ میر نصیر آیا تو دوبارہ ملازم رکھ لوں۔ ورنہ مقدمہ چوپٹ ہو جائے گا۔" انہوں نے نظریں گھما کر مغلانی کی جانب دیکھا۔ "کیوں بی مغلانی تمہارا کیا خیال ہے؟"

"سرکار! گستاخی معاف! آپ فیصلہ کرنے میں عجلت سے کام لیتی ہیں۔" مغلانی نے آنے والے خطرے سے تو حضور بیگم کو کھل کر خبردار نہ کیا۔ البتہ یاد دہانی کے لئے اتنا کہنے پر اکتفا کیا۔ "میری سرکار، ابھی ذرا ہی دیر پہلے آپ نے خود فرمایا تھا کہ میر نصیر تو پہلے ہی سے نواب صفی سے ملا ہوا تھا۔ مقدمے کے بارے میں ایک ایک بات جا کر بتاتا تھا۔ میں نے غلط تو نہیں سنا۔ یہی فرمایا تھا نا آپ نے؟"

حضور بیگم بہت خفیف ہوئیں۔ کھسیانی ہو کر بولیں۔ "بھئی مجھے کیا معلوم۔ غلام صفدر خان نے تو مجھے میر نصیر کے بارے میں یہی بتایا تھا۔"

غلام صفدر خان سے بھی ان کی گفتگو براہ راست تو ہوتی نہیں تھی۔ ان کو جب حضور بیگم سے بات کرنا ہوتی۔ تو مہری کے ذریعہ اندر اطلاع پہنچاتے اور

زنان خانے کی ڈیوڑھی میں ایک کرسی پر بیٹھ جاتے. حضور بیگم کی خواص رمضانو پیغام رسانی کی خدمت انجام دیتی. غلام صفدر کو جو کہنا ہوتا، رمضانو سے کہتے، وہ اندر جاکر حضور بیگم کے گوش گزار کرتی. وہ جو کچھ کہتیں، واپس جاکر غلام صفدر کو بتاتی.

حضور بیگم پر مغلانی کی بات کا کچھ ایسا ردّ عمل ہوا کہ ان کا اعتماد ڈگمگا گیا. تائید میں رمضانو کی گواہی پیش کرنا چاہی: "بھئی میری بات کا اعتبار نہ ہو تو رمضانو سے پوچھ لو. اس نے مجھے آکر یہی بتایا تھا." مگر رمضانو سے کون تصدیق کرتا وہ اس وقت بارہ دری میں موجود ہی نہ تھی.

(۸)

رمضانو اپنے بہنوئی کے ہمراہ باغ مولوی انوار کے پھاٹک میں داخل ہو رہی تھی.

اندر جاکر اس نے دیکھا، باغ کا تو کہیں نام و نشان نہ تھا. سامنے ٹوٹی پھوٹی بوسیدہ قبریں تھیں. جو شام کے اندھیرے میں ویران نظر آرہی تھیں. یہ علمائے فرنگی محل کا آبائی قبرستان تھا. مگر اس میں اب کبھی کبھار مردے دفن کئے جاتے تھے. بیشتر قبریں ٹوٹ پھوٹ کر برابر ہو چکی تھیں ان کا نشان بھی باقی نہ رہا تھا.

قبروں کے کنارے کنارے آمد و رفت کے لئے کچا راستہ تھا جو ایک سرے سے دوسرے سرے تک پیچ و خم کھاتا ہوا گزرتا تھا. راستے کے ایک طرف مکانات کا سلسلہ تھا جن میں بیشتر کچے اور نیم پختہ تھے. جگہ جگہ تنگ و تاریک گلیاں گزرتی تھیں. مکانوں کے درمیان کھلا میدان تھا. میدان کے ایک گوشہ میں پختہ قبر تھی. یہ بانیٔ درس نظامی، ملّا نظام الدین فرنگی محلی کے بھتیجے ملا احمد عبدالحق کے فرزند مولانا احمد انوار الحق کا مزار تھا. اب یہ پورا علاقہ انہی سے موسوم تھا اور باغ

مولوی انوار کہلاتا تھا۔

میدان کے وسط میں ایک بلند چبوترے پر ایک اور قبر تھی جو دوسری قبروں سے نمایاں نظر آتی تھی۔ قبر کے چاروں طرف لکڑی کا جنگلا تھا۔ یہ مولانا محمد نعیم کا مزار تھا۔ ان کا تعلق بھی خانوادہ فرنگی محل سے تھا۔ عرف عام میں ان کو نعیم میاں کہا جاتا تھا۔ ان کے کشف و کرامات کا بڑا شہرہ تھا۔ ان کا مزار مرجع انام تھا۔ حاجتمندان سے فیض پاتے۔ بیمار اور آسیب زدہ مریض دُور دُور سے آتے شفا بھی پاتے تھے اور صحت یاب ہو کر جاتے تھے۔

اس قدیم قبرستان کے ایک حصہ میں قدآدم چار دیواری تھی۔ چار دیواری کے اندر مسجد تھی۔ ملا نظام الدین فرنگی محلی کا مزار تھا۔ یہ مزار بھی بلند چبوترے پر تھا۔ اس کے ساتھ چار اور قبریں تھیں۔ ان قبروں کے علاوہ خانوادہ فرنگی محل کے دیگر علماء اور اکابر کی بھی قبریں تھیں۔ بیشتر قبریں پختہ تھیں۔ اردگرد پھولوں کی کیاریاں اور روشیں تھیں۔ سایہ دار درخت تھے۔ چار دیواری بھی اجلی اجلی نظر آتی تھی۔ ہر سال ۹ جمادی الاوّل کو ملا نظام الدین کا جب عرس ہوتا تو چونے کی قلعی ہوتی۔ صفائی اور ضروری مرمت ہوتی۔

رمضانو پہلی بار باغ مولوی انوار میں آئی تھی۔ وہ اپنے بہنوئی کی رہنمائی میں آگے بڑھی اور آہستہ آہستہ کچے راستے پر چلنے لگی۔ مکانوں میں چراغ جھلملا رہے تھے۔ عورتوں اور بچوں کی ملی جلی آوازوں کے ساتھ کہیں بکریاں منمنا رہی تھیں کہیں مرغیاں کڑکڑا رہی تھیں۔ رمضانو پر پیچ راستے پر چلتی ہوئی آگے اور آگے بڑھتی گئی اور ایک موڑ سے نکل کر نعیم میاں کے مزار کے عقب میں پہنچ گئی۔

مزار پر نہ کوئی گنبد تھا، نہ قبہ، کھلا تاروں بھرا آسمان تھا۔ مزار کی پشت پر املی اور نیم کے گھنے درخت تھے۔ املی کا ایک بڑا تناور پیڑ تھا۔ اس کے تنے کے ساتھ لوہے کی مضبوط زنجیر سے ایک نوجوان بندھا تھا۔ بال بکھرے ہوئے۔ لباس تار تار جسم خاک اور میل سے اٹا ہوا۔ ناگاہ اس نے اس زور سے چیخ ماری کہ رمضانو

لرز کر رہ گئی۔ وہ نوجوان گردن اِدھر اُدھر ہلا کر ایک ہی جملہ بار بار دھرانے لگا "دیکھ لوں گا، دیکھ لوں گا۔" اس کے قریب ہی ایک بوسیدہ قبر تھی جس پر ایک بوڑھا اداس اور خاموش بیٹھا تھا۔ وہ وقفہ وقفہ سے نظریں اٹھا کر نوجوان کی طرف دیکھتا تھا۔

دونوں سے ذرا ہٹ کر ادھیڑ عمر کا ایک شخص فرش پر آنکھیں بند کئے پڑا تھا۔ اس کے ایک پیر میں زنجیر تھی اور دوسرا سرا ایک درخت کے تنے سے بندھا تھا۔ اس کے سرہانے ایک بوڑھی عورت بیٹھی تھی۔ قریب ہی چودہ پندرہ سال کا ایک لڑکا بھی بیٹھا تھا۔ فرش پر لیٹا ہوا آدمی خاک دھول میں لتھڑا ہوا تھا۔ وہ بے چینی سے کروٹ بدلتا اور جسم پر پڑی ہوئی چادر اتار کر پھینک دیتا۔ بوڑھی عورت ہر بار لڑکے کی مدد سے چادر اس کے جسم پر دوبارہ ڈال دیتی۔

بوڑھی عورت کے چہرے پر دکھ کے سائے کچھ اس طرح پھیلے ہوئے تھے کہ رمضانو اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ رک کر پوچھا۔ "اماں تم یہاں کب سے پڑی ہو؟"

اس نے سرد آہ کھینچی۔ "پورے جاڑے یہیں گزر گئے۔" اس کے قریب ہی ایک پھٹا پرانا بستر لپٹا ہوا رکھا تھا۔ وہ خود ایک چٹائی پر بیٹھی تھی۔ ذرا ہٹ کر اینٹوں کا چولہا تھا جس میں جلی ہوئی لکڑیاں اور راکھ نظر آ رہی تھی۔

رمضانو نے دریافت کیا۔ "کچھ فائدہ ہوا؟"

"ابھی تک تو کچھ نہیں ہوا۔" بوڑھی عورت نے مزار کی جانب اشارہ کیا۔ "میاں کا جب حکم ہوگا تو ٹھیک ہو جائے گا۔ انھی کے سہارے اب تک پڑی ہوں۔"

"کس کا اثر ہے، کچھ پتہ چلا؟"

"کوئی شہید مرد بتاتا ہے، کوئی جن۔" بوڑھی عورت نے بجھے ہوئے لہجے میں بتایا۔ "اللہ جانے کون ہے۔ ایسا ہاتھ دھو کر پیچھے لگا ہے کہ جان ہی نہیں چھوڑتا۔"

خاک پر پڑے ہوئے مرد نے ایک بار پھر چادر ہٹا دی۔ اس کے برہنہ جسم کو عورت چادر سے ڈھانپنے لگی۔ رمضانو اپنے بہنوئی سلیم کے ہمراہ آگے بڑھ گئی۔

☆

نوچندی تھی لہٰذا اس روز مزار پر آنے والوں کا ہجوم بھی زیادہ تھا۔ ہر طرف چہل پہل اور گھما گھمی تھی۔ مزار کے قریب ہی کئی دکانیں تھیں۔ کسی پر ہار فروخت ہو رہے تھے۔ کسی پر ریوڑیاں اور بتاشے اور کسی پر کاجل کی ڈبیاں اور خاکِ شفا کی پڑیاں رکھی تھیں۔ ایک طرف کبابیا فرش پر بیٹھا کباب تل رہا تھا۔ دکانوں پر خریداروں کی بھیڑ لگی تھی۔

رمضانو اپنے بہنوئی کے ہمراہ مزار کے پہلو سے گزرتی ہوئی حجرے میں پہنچی۔ حجرہ کیا تھا۔ ایک طویل دالان تھا جس میں جگہ جگہ محرابیں تھیں نہ کوئی دروازہ تھا نہ کھڑکی۔ پختہ فرش تھا جس پر ایک سرے سے دوسرے سرے تک گدّوں، دریوں اور چٹائیوں کے میلے کچیلے بستر لگے تھے۔ بستروں پر مختلف عمر اور مختلف وضع قطع کی عورتیں بیٹھی یا لیٹی ہوئی تھیں۔ ان کے ساتھ مرد اور بچے بھی تھے۔ ان میں رمضانو کی بہن مجیدن بھی تھی۔ وہ اسی روز سہ پہر کو پہنچی تھی۔

مجیدن کے ساتھ اس کی بوڑھی ساس اور دو سال کا ایک بچہ تھا۔ مجیدن پیلی اور کمزور ہو گئی تھی۔ چہرہ مرجھا کر اس قدر بے رونق ہو گیا تھا کہ رمضانو پہلی نظر میں تو اُسے پہچان ہی نہ سکی۔ وہ ایک بوسیدہ دری پر سکڑی سکڑائی لیٹی تھی۔ قریب ہی اس کی ساس تھکی ہوئی سی بیٹھی تھی۔

مجیدن نے رمضانو کو دیکھا تو اُٹھ کر بیٹھ گئی، بولی۔ "باجی، تم آگئیں"۔

رمضانو آگے بڑھی۔ مجیدن کو سینے سے لگایا۔ دونوں بہنیں لپٹ کر رونے لگیں جب ذرا قرار آیا تو رمضانو نے آنسو پونچھتے ہوئے پوچھا۔

"اری مجیدن! یہ تو نے اپنی کیا حالت بنالی"؟

"پتہ نہیں باجی مجھے کیا ہو گیا ہے"۔ مجیدن دل گرفتہ ہو کر بولی۔ "بس! مجھے

تو ایسا لگتا ہے کہ میں اب بچوں گی نہیں۔"

"کیوں ایسی بدشگونی کی باتیں منہ سے نکالتی ہے"۔ رمضانو نے اسے پیار سے ڈانٹا۔

" تم دیکھ لینا۔ جان لئے بنا وہ میرا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔" مجیدن نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔" ذرا آنکھ لگی اور سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ نیند حرام ہو گئی۔ ساری ساری رات جاگتے گزر جاتی ہے۔ ڈر کے مارے آنکھیں ہی بند نہیں کرتی۔"

" اے خالہ، یہ ہے کیا مصیبت؟" اس دفعہ رمضانو نے مجیدن کے بجائے اس کی ساس کو مخاطب کیا۔

" کیا بتاؤں بیٹی کیا مصیبت ہے"۔ مجیدن کی ساس نے ٹھنڈی سانس بھری " ایسا اس کی جان کو یہ روگ لگا ہے کہ جاتا ہی نہیں۔ کوئی حکیم کوئی ڈاکٹر نہیں چھوڑا۔ جس پیر جس عامل کو کسی نے بتایا اس کے پاس اسے لے کر گئی۔ اسی بھاگ دوڑ میں اس کی لگی لگائی نوکری گئی"۔ اس نے مجیدن کے شوہر کی جانب اشارہ کیا، جو منہ لٹکائے گم صم بیٹھا تھا۔ "بچے الگ رواں دواں ہیں۔ دو بچیوں کو تو ان کی پھوپھی کے پاس چھوڑ کر آئی ہوں"۔ اس نے پوتے کی طرف دیکھا جو ٹکر ٹکر دادی کا منہ تک رہا تھا۔" یہ ماں کے بغیر پل بھر کو نہیں ٹکتا۔ مجبوراً ساتھ لانا پڑا۔ نہ پوچھو کہاں کہاں کی خاک نہیں چھانی۔ ہر مزار ہر درگاہ گئی مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ اب اسے یہاں لائی ہوں۔ شاید اسی دربار سے اس کی جان اس مصیبت سے چھٹ جائے۔"

" آخر یہ مصیبت اس کے لگی کیسے؟" رمضانو نے پوچھا۔

مجیدن کی ساس نے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ کچھ دیر خاموشی رہی پھر وہ رمضانو کو ایک طرف لے گئی۔ سلیم اپنی بیوی کے پاس بیٹھا رہا۔

رمضانو نے اصرار کیا۔" ہاں خالہ اب بتاؤ۔ یہ بلا مجیدن کے پیچھے لگی کیسے؟"

" بیٹی مجھے تو ٹھیک سے کچھ معلوم نہیں۔ مجیدن ہی کی زبانی گا ہے گاہے جو

سنا ہے تم کو بتائے دیتی ہوں"۔ مجیدن کی ساس نے پان چباتے ہوئے کہا "یہ تو تم کو پتہ ہی ہوگا کہ سلیم پہلے قانون گو صاحب کے پاس ملازم تھا ان کی آئے دن تو بدلی ہوتی رہتی تھی۔ سیتاپور سے کوئی دس بارہ کوس دور ایک بستی ہے مدن پور۔ قانون گو صاحب کا تبادلہ وہاں ہوا۔ سلیم بھی ان کے ساتھ گیا۔ رہنے کو گھر مل گیا تو بیوی بچوں کو بھی بلا لیا۔ بس اسی گھر سے یہ مصیبت اس کے پیچھے لگ گئی"۔

"کوئی آسیب واسیب ہے؟"

"ہاں کچھ ایسی ہی بات ہے"۔ مجیدن کی ساس نے بتایا۔ "اچھی بھلی رہتی تھی سلیم اکثر رات کو دیر سے بھی آتا۔ مگر کبھی کھٹکا محسوس ہوا نہ ڈر نہ خوف۔ برسات کا موسم تھا۔ ایک روز ایسا ٹوٹ کے مینہ برسا کہ کئی دن تک آسمان نظر نہ آیا۔ اسی بارش میں باورچی خانے کی دیوار گر گئی۔ سلیم موجود نہیں تھا۔ قانون گو صاحب کے ساتھ دورے پر گیا تھا۔ بہو گھر میں اکیلی تھی۔ دونوں وقت ملتے تھے۔ بہو گری ہوئی دیوار کے پاس پہنچی، وہاں گڑھا پڑ گیا تھا۔ اس نے جھک کر گڑھے میں دیکھا تو مٹی اور کیچڑ میں دبا ہوا لکڑی کا صندوقچہ نظر آیا"۔

"کسی نے روپیہ پیسہ یا زیور دبا دیا ہوگا"۔ رمضانو نے قیاس آرائی کی۔

"روپیہ یا زیور ہوتا تو بات ہی کیا تھی"۔ مجیدن کی ساس نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "ہاں تو میں یہ کہہ رہی تھی کہ بہو کو صندوقچہ گڑھے میں دبا ہوا نظر آیا۔ اس نے بھی تمہاری طرح سوچا کہ اس کے اندر کچھ روپیہ پیسہ ہوگا۔ صندوقچہ باہر نکالا۔ مٹی اور کیچڑ صاف کی۔ تھا تو لکڑی کا مگر بڑا خوبصورت بنا ہوا تھا۔ خوب رنگ روغن کیا ہوا تھا۔ مٹی میں دبے دبے اس کی چمک دمک تو مدھم پڑ گئی تھی پھر بھی خوشنما لگتا تھا۔ بہو نے خوشی خوشی اسے کھولا تو ڈھکنا اٹھاتے ہی ڈر کر پیچھے ہٹ گئی"۔

"اے خالہ، اس کے اندر کیا تھا؟" رمضانو نے بے چین ہو کر پوچھا۔

" تھا کیا، کسی مردے کی ہڈیاں رکھی ہوئی تھیں"۔ مجیدن کی ساس نے رمضانو کو مطلع کیا۔" بہو کچھ دیر تو ڈری سہمی کھڑی رہی۔ مگر ہے ہمت والی۔ ہڈیاں نکال کر پھر اسی گڑھے میں ڈال دیں جس کے اندر سے صندوقچہ نکالا تھا۔ البتہ صندوقچہ پسند آ گیا تھا۔ اسے استعمال کرنے کے لئے رکھ لیا۔ تو بھئی یہ کرنا ہی جان کا عذاب بن گیا"۔ وہ سنبھل سنبھل کر بولتی رہی۔" اس رات سلیم بھی گھر پر نہیں تھا۔ بہو کھانا کھا کر سو گئی۔ آدھی رات کو آہٹ سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ کیا دیکھتی ہے کہ صندوقچے کا ڈھکنا کھلا اور اس کے اندر سے ایک مرد نکلا۔ مگر اس کا سر غائب تھا۔ وہ اس کی طرف بڑھنے لگا۔ ڈر کے مارے بہو کی چیخ نکل گئی۔ خیریت یہ ہوئی کہ اسی وقت سلیم گھر پر پہنچ گیا۔ اس نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ یہ بستر سے اُٹھ کر دوڑی اور جھٹ سے دروازہ کھول دیا"۔

" تب تو سلیم نے بھی اسے دیکھا ہوگا"۔ رمضانو نے کہا۔

" نہیں"۔ مجیدن کی ساس نے بتایا۔" سلیم نے جا کر دیکھا وہاں کوئی نہ تھا۔ صندوقچے کا ڈھکنا بھی بند تھا"۔ اس نے قدرے تامل کیا۔" بس وہ دن اور آج کا دن، وہ سر کٹا بہو کے پیچھے ایسا لگا ہے کہ کسی طور نہیں ٹلتا"۔

"اس صندوقچے کا کیا بنا"؟ رمضانو نے کرید کر پوچھا۔

" میں ان دنوں اپنی بڑی بیٹی کے پاس تھی۔ سلیم نے اپنے ایک دوست کو بھیج کر مجھے اپنے پاس بلا لیا"۔ مجیدن کی ساس نے کہا۔" میں فوراً پہنچی۔ بہو کی زبانی سارا حال سنا۔ صندوقچہ اس وقت تک موجود تھا۔ میں نے بھی اُسے دیکھا"۔

" خالہ، کیسا صندوقچہ تھا"؟

" بس ایسا ہی تھا جیسے لکڑی کے صندوقچے ہوتے ہیں۔ صرف اس کا ڈھکنا اُوپر سے اُبھرا ہوا تھا اور گول تھا۔ البتہ اس پر گل بوٹے بڑے خوبصورت بنے ہوئے تھے"۔ مجیدن کی ساس نے رمضانو کو بتایا۔" میں نے پہلا کام تو یہ کیا کہ جس گڑھے سے وہ نکلا تھا اسی میں اس کو دبا کر اوپر سے مٹی ڈال دی۔ مگر بہو کے سر

سے پھر بھی مصیبت نہ ٹلی۔ اسی رات اس نے بہو کو ڈرایا۔"

"خالہ، اس صندوقچہ کا راز کیا تھا۔ کچھ اس کا بھی پتہ چلا؟"

"بیٹی، اللہ جانے کیا راز تھا۔" مجیدن کی ساس نے جواب دیا۔ "پاس پڑوس میں رہنے والوں سے پوچھ گچھ کی تو صرف اتنا معلوم ہوا کہ اس گھر کو ایک سادھو نے اپنا استھان بنا رکھا تھا۔ وہ مدت تک اپنے ایک چیلے کے ساتھ ٹھہرا رہا پھر اچانک ایسا غائب ہوا کہ نہ کبھی سادھو نظر آیا نہ اس کا چیلا۔ بوڑھی عورت کا لہجہ رازدارانہ ہو گیا۔" میرا تو خیال ہے کہ انھی دونوں نے کسی کو قتل کر کے اس کی ہڈیاں صندوقچے میں بند کیں اور صندوقچہ باورچی خانے کی دیوار کے پاس گڑھا کھود کر دفن کر دیا یا ایک نے دوسرے کو۔ کر زمین میں دبا دیا ہو گا اور موقع پا کر چپکے سے کسی طرف نکل گیا۔"

"ایسے منحوس اور آسیب زدہ گھر کو تو فوراً چھوڑ دینا چاہیئے تھا۔" رمضانو نے اپنے ردعمل کا اظہار کیا۔

"اس گھر ہی کو نہیں سلیم نے تو مدن پور بھی چھوڑ دیا تھا مگر اس کم بخت نے بہو کا پیچھا نہ چھوڑا۔" مجیدن کی ساس نے رمضانو کو مطلع کیا۔ "بہو کے سامنے آتا ہے تو ہمیشہ یہی کہتا ہے کہ میرا سر مجھے واپس دے ورنہ تجھے ہرگز نہیں چھوڑوں گا۔"

"خالہ، تم نے مجیدن سے پوچھا نہیں کہ اس کے سر کا اس نے کیا کیا؟"

"بیٹی میں نے ایک بار نہیں، نہ جانے کتنی بار بہو سے پوچھا۔ مگر وہ یہی کہتی ہے کہ صندوقچے میں صرف ہڈیاں ہی تھیں۔ نہ کوئی سر تھا نہ کھوپڑی۔"

مجیدن کی ساس خاصی باتونی تھی۔ اور رمضانو بھی دلچسپی اور توجہ سے اس کی باتیں سُن رہی تھی مگر سلیم نے پہنچ کر سلسلۂ گفتگو منقطع کرا دیا۔ اس نے ماں سے کہا۔ "اماں، تم یہاں کھڑی باتیں کر رہی ہو، رات ہوتی جا رہی ہے۔ مجیدن کو مزار پر کب لے جاؤ گی؟" ماں نے بیٹے کی بات سن کر خاموشی

اختیار کی۔ مٹری اور بہو کی جانب چلی۔ رمضانو بھی اس کے ساتھ ساتھ تھی۔

☆

تینوں نے مجیدن کے پاس پہنچ کر اسے ہمراہ لیا۔ اس نے چادر اوڑھی اور ان کے پیچھے پیچھے مزار کی جانب چلی۔ مزار کی سیڑھیوں کے قریب مجیدن، اس کی ساس اور رمضانو تو ٹھہر گئیں۔ سلیم دکانوں کی طرف چلا گیا۔ اس نے پھول اور بتاشوں کے ساتھ ریوڑیاں بھی خریدیں۔ واپس آیا تو ایک دونے میں پھول اور بتاشے تھے اور دوسرے میں ریوڑیاں تھیں۔

مزار پر اس روز خلاف معمول بہت زیادہ بھیڑ تھی۔ مزار تک پہنچنے کے لئے دس بارہ سیڑھیاں طے کرنا پڑتی تھیں۔ سلیم نے کسی نہ کسی طور راستہ بنایا اور سنبھل سنبھل کر اوپر چڑھنے لگا۔ اس کے پیچھے پیچھے مجیدن اور رمضانو تھیں۔ مجیدن کی ساس نیچے ہی رک گئی۔ سلیم اوپر پہنچ گیا۔ مجیدن اور رمضانو بھیڑ سے بچتی بچاتی اس کے عقب میں ایک سیڑھی پر سمٹ سمٹا کر کھڑی ہو گئیں۔

مزار میں داخل ہونے کی اجازت نہ تھی۔ لکڑی کے کٹہرے میں مختصر سا دروازہ تھا۔ اور کھلا ہوا تھا۔ دروازے سے ذرا ہٹ کر مجاور بیٹھا تھا۔ اس کی لمبی سفید ڈاڑھی تھی۔ جسم بھی بھاری بھرکم تھا۔ سفید کرتا پہنے، خانے دار سبز تہمد باندھے، سر پر گول ٹوپی اوڑھے، وہ خاصہ بارعب نظر آرہا تھا۔ آواز بھی بھاری تھی۔ مزاج کا بھی کڑوا تھا۔ عقیدت مندوں کی پریشانی اور بے قراری کا ذرا لحاظ نہ کرنا، نہایت بے رخی سے دھتکارنا۔

سلیم جھکتا ہوا آگے بڑھا۔ دونوں دونے مجاور کے سامنے کئے۔ اکنی چراغی کی بھی پیش کی۔ مجاور نے دونے لئے۔ چراغی وصول کی اور ان کو قریب بیٹھے ہوئے نوجوان کی جانب بڑھا دیا۔ مجیدن کا ہاتھ پکڑ کر سلیم نے مجاور کے سامنے کیا۔ گھگھیا کر بولا۔ "میاں اس کے سر پر آسیب ہے۔" مجاور نے اس کی جانب دیکھے بغیر کہا۔ "اسے قریب لا۔" مجیدن آگے بڑھ گئی۔ بوڑھا مجاور ایک دم بپھر گیا۔ آنکھیں

نکال کر دھاڑا۔ "سر پر کیوں چڑھے آرہی ہے۔ الگ ہٹ۔" مجیدن سہم کر پیچھے ہٹ گئی۔ بوڑھے مجاور نے ڈبیا سے کاجل لے کر انگشتِ شہادت میں لگایا مجیدن کو مخاطب کیا۔ "گردن اونچی کر۔" مجیدن نے جھٹ گردن اونچی کی۔ بوڑھے مجاور نے انگلی سے اس کی دونوں آنکھوں میں کاجل لگا دیا۔

کاجل آنکھوں میں لگانے کے بعد مجیدن سے بوڑھے مجاور نے کہا "منہ کھول" مجیدن نے منہ کھولا، مجاور نے اس کے کھلے ہوئے منہ میں قریب رکھے ہوئے پھولوں کے ڈھیر میں سے ایک پھول اٹھا کر رکھ دیا۔ بتاشے کا ایک ٹکڑا بھی پھول کے ساتھ ہی مجیدن کے منہ میں ڈال دیا۔ بوڑھے مجاور نے مڑ کر سلیم کی جانب دیکھا۔ مجیدن کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "اسے مزار کے سامنے بٹھا دے۔ سر کے بال کھول دینا۔" سلیم نے کچھ پوچھنے کے لئے تامل کیا۔ مجاور نے اسے ڈانٹا۔ "منہ کیا تک رہا ہے چل یہاں سے۔ دوسروں کو آنے دے۔" سلیم نے گھبرا کر مجیدن کا ہاتھ پکڑا اور سنبھل سنبھل کر سیڑھیاں اترنے لگا۔ رمضانو بھی اس کے ساتھ ہی نیچے اتر گئی۔ مجیدن کی ساس ان کے انتظار میں کھڑی تھی۔

☆

مزار کے سامنے ڈھائی تین فٹ اونچا بہت وسیع اور پختہ چبوترہ تھا فرش پر پتھر کے بڑے بڑے چوکور ٹکڑے لگے تھے۔ چبوترے پر جگہ جگہ عورتیں بیٹھی تھیں۔ مرد بھی تھے مگر عورتیں بڑی تعداد میں تھیں۔ ان سب کا تعلق نچلے اور غریب طبقے سے تھا۔ ان میں مسلمان بھی تھے اور ہندو بھی۔ البتہ اکثریت مسلمانوں کی تھی۔ سب کے چہروں کا رُخ مزار کی طرف تھا۔

آگے آگے سلیم تھا اس کے پیچھے مجیدن، سلیم کی ماں اور رمضانو تھیں۔ سلیم ایک گوشہ میں پہنچ کر ٹھہر گیا۔ اس کی ماں، مجیدن اور رمضانو بھی رک گئیں مجیدن کو وہیں پختہ فرش پر بٹھا دیا گیا۔ قریب ہی اس کی ساس اور رمضانو بھی بیٹھ گئیں۔ سلیم اپنے بچے کے پاس چلا گیا جو دالان میں اکیلا سو رہا تھا۔ ساس نے

مجاور کی ہدایت کے مطابق مجیدن کے سر سے چادر علحدہ کی اور چوٹی کھول دی۔ مجیدن دونوں ہاتھ جوڑے اس طرح بیٹھی تھی کہ اس کا منہ مزار کی جانب تھا۔ کھلے ہوئے بال کندھوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ اس پر مراقبے کی سی کیفیت طاری تھی۔

مجیدن کے ارد گرد کچھ اور عورتیں بھی اسی طرح بیٹھی تھیں، کچھ سر سے کھیل بھی رہی تھیں، ان کی گردنیں جھوم جھوم کر گردش کر رہی تھیں۔ گردنوں کے ساتھ ساتھ کھلے ہوئے بال بھی تیزی سے گردش کر رہے تھے۔ وہ ہر گردش کے ساتھ فرش پر زور سے دوہتڑ مارتیں اور اونچی آواز سے صدا بلند کرتیں۔ مختلف عورتوں کی زبانوں پر مختلف قسم کی صدائیں تھیں، کچھ رو رہی تھیں، کچھ خفگی کا اظہار کر رہی تھیں، کچھ فریاد کر رہی تھیں، کچھ آہ وزاری کر رہی تھیں۔

رمضانو ہر ایسی عورت کو حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے سن تو بہت کچھ رکھا تھا مگر پہلی بار اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ اس کے قریب ہی ایک نوجوان عورت فرش پر دوہتڑ مار مار کر کھیل رہی تھی۔ اس کے بکھرے ہوئے بال گردن کے ساتھ ساتھ فضا میں تیزی سے جھوم رہے تھے، گردش کر رہے تھے۔ وہ دوہتڑ مار کر بے قراری کے عالم میں دہائی دے رہی تھی۔ "میاں! مجھے ماپھ کر دو"۔ وہ بار بار یہی جملہ دُہرا رہی تھی۔

رمضانو مڑ کر اس کی جانب متوجہ ہو گئی۔ اور گہری نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ اس کے عقب میں ذرا ہٹ کر ایک غم زدہ مرد خاموش بیٹھا تھا۔ وضع قطع اور سن وسال کے لحاظ سے اس کا شوہر معلوم ہوتا تھا۔ وہ رمضانو کے نزدیک ہی گم صم بیٹھا تھا۔ اس کے بشرے سے غربت اور پریشانی جھلکتی تھی۔

رمضانو نے جھک کر مرد کو مخاطب کیا۔ "اس پر کس کا سایہ ہے؟"

"پتہ نہیں، شسر کون، کون ہے"۔ مرد نے رمضانو کو بتایا۔ "چڑیلیں ہیں، پریت ہیں اور نہ جانے کیا کیا ہے"۔

"کب سے اس کے سر پہ ہیں؟" رمضانو نے پوچھا۔
"پچھلی گرمیوں سے ہیں۔" مرد نے بتایا۔
"یہاں آکر کوئی چڑیل اتری بھی کہ نہیں؟"
"تو کون ہے؟" اس بار مرد کے بجائے عورت بولی۔ اس نے مڑ کر خونخوار نظروں سے گھور کر رمضانو کو دیکھا۔ "یہاں دربار میں نہ بیٹھی ہوتی تو تجھ سے پوچھتی۔"

رمضانو خوف زدہ ہو کر پیچھے ہٹ گئی۔ اچانک عورت بلبلا کر چیخنے لگی۔ "میاں ماہی دے دو، اب کچھ نہیں کہوں گی، کچھ بھی نہیں کہوں گی۔" وہ کبھی دائیں جانب مڑتی، کبھی بائیں جانب، کبھی آگے، کبھی پیچھے۔ گڑگڑا، گڑگڑا کر دہائی بھی دیتی جاتی۔

مرد نے رمضانو کی جانب جھک کر سرگوشی کی۔ "دربار میں بیٹھ کر زبان درازی کر رہی تھی۔ میاں کے غلام اب سجا دے رہے ہیں۔ دیکھ رہی ہو کیسے سٹراک، سٹراک ہنٹر مار رہے ہیں۔ تب ہی تو پھر یاد کر رہی ہے۔" اس کا لہجہ تیکھا ہو گیا۔ "اب سسری کیسے گڑگڑائے رہی ہے۔"

مگر رمضانو کو میاں کا نہ کوئی غلام نظر آیا نہ اس کا سٹراک سٹراک چلتا ہوا ہنٹر دکھائی دیا۔ نہ اس کی آواز سنائی دی۔ البتہ عورت بے قرار ہو کر برابر دہائی دے رہی تھی۔ ہاتھ جوڑ کر گڑگڑا رہی تھی معافی مانگ رہی تھی۔

رمضانو نے مرد سے پوچھا۔ "میاں کے غلام کہاں ہیں؟"
"دھیرج سے بولو۔" مرد نے مدھم لہجے میں بتایا۔ "وہ کہیں دکھائی دیتے ہیں۔ ہاتھ میں ہنٹر پکڑے اِدھر سے اُدھر گھومتے پھرتے ہیں۔ دیکھ رہی ہو کیسی مار لگائے رہے ہیں۔"

رمضانو نے عورت کو غور سے دیکھا، وہ جس طرح گھگیا گھگیا کر دہائی دے رہی تھی، بے قرار ہو کر اِدھر اُدھر جھک رہی تھی، اس سے صاف ظاہر

ہو رہا تھا کہ کوئی اسے ہنٹر سے بری طرح مار پیٹ رہا ہے۔

کچھ دیر بعد عورت کو قرار آ گیا۔ اس کی فریاد اور چیخم دھاڑ ختم ہو گئی۔ اب وہ ہاتھ جوڑے سر جھکائے مراقبے کے عالم میں خاموش بیٹھی تھی۔ پھر اس نے دھیرے دھیرے جھومنا شروع کر دیا۔ اب وہ سر سے کھیل رہی تھی۔ گردن گردش کر رہی تھی۔ اور سر کے بال فضا میں لہرا رہے تھے۔ یہ عمل تیز اور تیز ہوتا گیا۔ وہ فرش پر دو ہنٹر مار مار کر کھیلنے لگی۔ ساتھ ہی بار بار گڑگڑا کر کہتی۔ "میاں مجھے رہائی دلا دو، اب نہیں آؤں گی" وہ گڑگڑاتی رہی۔ دہائی دیتی رہی۔

اس کی گردن پھرکی کی مانند گردش کرنے لگی۔ بال سیاہ بگولا معلوم ہونے لگے۔ فرش پر دو ہنٹر مارنے کی رفتار تیز تر ہو گئی۔ یکا یک اس نے چیخنا شروع کر دیا۔ "ہائے میں جلی، ہائے میں جلی۔" چیختے چیختے وہ نڈھال ہو کر ایک طرف لڑھک گئی۔

رمضانو نے دیکھا وہ فرش پر مردے کی طرح بے سدھ پڑی تھی۔ آنکھیں بند تھیں اور سانس رک رک کر چل رہی تھی۔ چہرے پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔ مرد نے چادر اٹھا کر اس کا جسم ڈھانپ دیا۔ اس عالم وہ بالکل لاش معلوم ہو رہی تھی۔ رمضانو نے گھبرا کر مرد سے پوچھا۔ "اسے کیا ہو گیا؟"

اس نے بے نیازی سے جواب دیا۔ "ایک چڑیل تو جل جلا کر راکھ ہو گئی پہلے بھی کئی جل چکی ہیں۔ پتہ نہیں ابھی سسری اور کتنی رہ گئی ہیں۔"

عورت کروٹ کے بل بے حال پڑی تھی۔ اسے اپنے تن بدن کا ہوش نہیں تھا۔ اس کے پورے جسم پر ایک میلی چادر پڑی تھی۔ مرد اس کے سرہانے بیٹھ گیا۔ اور آہستہ آہستہ دونوں ہاتھوں سے سر دبانے لگا۔ عورت اسی حالت میں لیٹی رہی۔ نہ اس نے منہ سے آواز نکالی اور نہ کروٹ بدلی۔

☆

رمضانو کا بہنوئی سلیم ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔

مجیدن ہاتھ جوڑے، گردن جھکائے مراقبہ کے عالم میں بیٹھی تھی۔ رمضانو کھسک کر اس کے قریب چلی گئی۔ اس نے نہ مجیدن سے کوئی بات کی نہ اس کی ساس سے، چپ بیٹھی رہی۔ مزار پر آنے والوں کا ہجوم کم ہونے کے بجائے اور بڑھ گیا تھا۔ پختہ چبوترہ عورتوں اور مردوں سے بھر گیا تھا۔ بعد میں آنے والے چبوترے کے نیچے کچی زمین پر دری یا چادر بچھا کر بیٹھ جاتے۔ کتنی ہی عورتیں گردن اور سر کو گردش دے کر کھیل رہی تھیں، چیخ رہی تھیں، چلا رہی تھیں۔ کچھ مرد بھی فرش پر دو ہتڑ مار مار کے سر سے کھیل رہے تھے۔ ہر طرف شور برپا تھا۔

اسی اثناء میں سلیم آ گیا۔ اس نے ماں کو مخاطب کیا۔ "اماں تم جا کر روٹی پکا لو۔ میں کبابیئے سے کباب لے آؤں گا۔" اس نے مڑ کر رمضانو کی جانب دیکھا "باجی بھی کھانا کھا کر جائیں گی۔"

"مجھے تو بالکل بھوک نہیں۔" رمضانو نے معذرت کے انداز میں کہا۔ "تم میری فکر نہ کرو۔ میں تو واپس جا کر کھانا کھاؤں گی۔"

سلیم نے زیادہ اصرار نہ کیا۔ مجیدن کی ساس اٹھ کر چلی گئی۔ سلیم خاموشی سے مجیدن کے قریب بیٹھ گیا۔ کچھ دیر خاموشی رہی پھر رمضانو نے شفقت سے مجیدن کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ پوچھا "مجیدن اب کیسی طبیعت ہے"؟ اس کے لہجے میں محبت کی شیرینی گھلی ہوئی تھی۔

مجیدن ایک دم بپھر گئی۔ غصے سے رمضانو کو ڈانٹا۔ "الگ ہٹ۔ خبردار جو میرے بدن کو ہاتھ لگایا۔" ہاتھ بڑھا کر رمضانو کو اس زور سے دھکا دیا کہ وہ دھڑام سے فرش پر گر پڑی۔ کہنی میں چوٹ بھی آئی مگر وہ چوٹ سے بے نیاز ہو کر سہمی ہوئی نظروں سے مجیدن کو دیکھنے لگی۔ مجیدن کے مریل ہاتھوں میں نہ جانے کہاں سے اتنی قوت آ گئی تھی کہ رمضانو سنبھل نہ سکی حالانکہ وہ خاصی صحت مند تھی۔ مجیدن کے مقابلہ میں تو بہت تگڑی تھی۔

مجیدن کی آنکھیں انگارے کی طرح دہک رہی تھیں۔ چہرہ بھی کرخت ہو گیا تھا۔ وہ پہلی سی مجیدن ہی نہ رہی تھی۔ ایسی خونخوار نگاہوں سے گھور رہی تھی کہ رمضانو تاب نہ لا سکی۔ اس نے مڑ کر سلیم کو دیکھا۔ پریشان ہو کر پوچھا۔ "سلیم! یہ بیٹھے بٹھائے اسے کیا ہو گیا؟" وہ خاصی خوف زدہ نظر آ رہی تھی۔

سلیم نے آہستہ سے کہا۔ "باجی! یہ اس وقت اپنے ہوش میں نہیں ہے۔"

رمضانو نے کچھ نہ کہا۔ خاموشی سے اٹھ کر بیٹھ گئی اور اپنی کہنی آہستہ آہستہ سہلانے لگی جس میں درد محسوس ہو رہا تھا۔ اب وہ مجیدن سے ذرا ہٹ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ اتنی دوری پر کہ مجیدن کا ہاتھ اس کے جسم تک نہ پہنچ سکے۔

مجیدن ہاتھ باندھے مزار کی جانب تک رہی تھی۔ اس کا جسم بالکل ساکت تھا۔ نہ وہ سر سے کھیل رہی تھی نہ بول رہی تھی۔

سلیم نے مجیدن کی طرف دیکھا۔ عاجزی سے پوچھا۔ "آپ کون ہیں؟"

مجیدن نے مڑ کر اسے دیکھا۔ "تو بار بار یہ سوال کیوں پوچھتا ہے؟ ہم کوئی بھی ہیں کیوں بتائیں، ہرگز نہیں بتائیں گے۔"

رمضانو نے غور کیا۔ مجیدن کی آواز بھی مردانہ ہو گئی تھی۔

"آپ کوئی بھی ہیں اب تو اسے چھوڑ دیجیے۔" وہ گڑگڑانے لگا۔

"یہ ہمارا سر ہمیں واپس کر دے، ہم چلے جائیں گے۔"

"آپ کا سر تو اس نے دیکھا بھی نہیں۔ یہ تو آپ کو بھی معلوم ہے۔" سلیم نے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔

"بار بار تو بھی یہی کہتا ہے، تیری ماں بھی یہی کہتی ہے۔" مجیدن مردانہ آواز میں بولتی رہی۔ "ہم کو اس سے کوئی غرض نہیں، ہمیں اپنا سر واپس چاہیے ہے۔ جب تک سر نہیں ملے گا، ہم نہیں جائیں گے، ہرگز نہیں جائیں گے۔"

"اس کی غلطی معاف کر دیجیے۔" سلیم برابر گڑگڑاتا رہا۔ اس نے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ "اس نے اپنی غلطی کی بہت سزا بھگت لی۔ اس کے ساتھ میں بھی

سزا بھگت رہا ہوں۔ چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ نوکری بھی جاتی رہی۔ قرض مانگ مانگ کر گزارہ کر رہاں ہوں"۔ وہ دل گرفتہ ہو کر التجا کرنے لگا۔" میں کیا کروں؟ اب تو مجھ میں بھاگ دوڑ کرنے کی ہمت بھی نہیں رہی"۔

"تو ہم کو پھوپھے شریف لے جانا چاہتا تھا"۔ مجیدن مردانہ لہجے میں ٹھٹھا مار کر ہنسی۔"ہم کو پہلے ہی خبر مل گئی۔ راستے ہی سے علیحدہ ہو گئے"۔ مجیدن نے سرخ سرخ آنکھوں سے گھور کر سلیم کو دیکھا۔" مگر اس بار تو نے ہم کو دھوکے سے یہاں لا کر گرفتار کرا دیا۔ کوئی بات نہیں۔ جب تک ہمارا سر واپس نہیں ملے گا۔ ہم اسے چھوڑیں گے نہیں"۔

" نہ اسے معلوم ہے نہ مجھے معلوم ہے کہ آپ کا سر کہاں ہے"۔ سلیم نے اپنی مجبوری بیان کی۔" جب اس کا کچھ اتا پتا نہیں معلوم تو اسے لاؤں کہاں سے"۔

سلیم کو کوئی جواب نہ ملا۔ مجیدن خاموش بیٹھی ٹکٹکی باندھے مزار کی جانب دیکھ رہی تھی۔ رمضا لو سخت حیرت زدہ تھی۔ اس نے بھوت پریت اور آسیب کے بارے میں سن تو بہت کچھ رکھا تھا مگر آج اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔

" یہی بتا دیجئے کہ آپ کا سر کہاں ہے، کس کے پاس ہے"؟ سلیم نے نرم لہجے میں پوچھا۔" میں کسی نہ کسی طرح اسے لانے کی کوشش کروں گا"۔

" تو وعدہ کرتا ہے تو سن۔ اب تک میں نے تجھے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا مگر آج تجھے سب کچھ بتا دوں گا"۔ مجیدن مردانہ آواز میں بول رہی تھی۔ " میرا نام مولوی حبیب اللہ ہے۔ میں عامل ہوں تب ہی تو کسی عامل کے قابو میں نہیں آتا۔ مہینوں ٹوٹی قبر میں بیٹھ کر اندھیری راتوں میں چلہ کشی کی ہے کمر کمر تک پانی میں کھڑے ہو کر رات بھر وظیفے پڑھے ہیں۔ مگر جس موکل کی خاطر میں نے یہ پاپڑ بیلے تھے، وہ میرے قبضہ میں نہ آیا"۔

سلیم اور رمضا تو خاموش بیٹھے رہے۔ مجیدن کی مردانہ آواز ابھرتی رہی "مجھے کسی نے سادھو مہاراج کے بارے میں بتایا کہ وہ بہت بڑا گیانی ہے۔ برسوں

اندھیری گپھاؤں میں بیٹھ کر تپسیا اور ریاضت کی ہے۔ ایسے زبردست منتر جانتا ہے کہ ان کو پڑھ کر پھونکنے سے بہتا پانی ٹھہر جائے۔" رمضانو حیرت سے مجیدن کا منہ تکتی رہی۔ مجیدن بتاتی رہی۔" میں منتر سیکھنے کے لئے سادھو کے پاس گیا۔ دن رات اس کی خدمت کی۔ اس نے منتر سکھانے کا وعدہ بھی کر لیا۔"

"تو وہ منتر اس نے آپ کو سکھا دیئے؟" سلیم نے بے چین ہو کر دریافت کیا۔

"کہاں سکھائے۔ منتر سکھانے کے بجائے ایک رات اس نے اپنے چیلے کی مدد سے مجھے قتل کر دیا۔ چھری سے میری گردن کاٹی اور ٹکڑے ٹکڑے کر کے لاش زمین میں دبا دی۔" مجیدن نے اسی مردانہ لب و لہجے میں بتایا۔"چھ سات مہینے بعد جب گوشت کیڑے مکوڑوں نے کھا لیا۔ اور کھال بھی گل سڑ کر مٹی میں مل گئی تو اس نے زمین کھود کر ہڈیاں نکالیں۔ کھوپڑی علیحدہ کر لی اور ہڈیوں کو صندوقچے میں بند کر کے کوئی ایسا منتر پڑھا کہ میں صندوقچے میں قید ہو کر رہ گیا۔ سادھو نے میری کھوپڑی اپنے جھولے میں ڈالی۔ کمنڈل اٹھایا اور اپنے چیلے کے ساتھ رفو چکر ہو گیا۔" مجیدن نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔" میں صندوقچے میں قیدی بنا ہوا پڑا تھا۔ لیکن جب تیری جورو نے صندوقچہ زمین کے اندر سے نکالا اور اس کا ڈھکنا کھول کر ہڈیاں باہر نکالیں تو میں قید سے آزاد ہو گیا۔"

سلیم نے عاجزی سے کہا۔" مگر اس نے تو آپ کے ساتھ نیکی کی ہے قید سے آزاد کر دیا۔ اب یہ کہاں کا انصاف ہے کہ جس نے قید سے رہائی دلائی ہو آپ اسی کو ستا رہے ہیں۔"

" مگر میرے پاس تو صرف دھڑ ہے"۔ مجیدن کے سر پر سوار عامل حبیب اللہ کی روح نے کہا۔" بغیر سر کے یہ دھڑ ادھورا ہے۔ جب تک سر نہیں ملتا میں اپنی اصلی جون میں نہیں آسکتا۔ میرا سر تو ابھی تک سادھو کے قبضے میں ہے۔"

"آپ سادھو سے اپنا سر واپس لے لیجئے۔" سلیم نے نرم لہجے میں کہا۔"آپ تو سب کچھ کر سکتے ہیں۔"

"نہیں، میں اپنا سر سادھو مہاراج کے قبضے سے واپس نہیں لے سکتا۔"
"کیوں نہیں لے سکتے"؟ سلیم نے اپنی بات پر زور دے کر کہا۔
"بس نہیں لے سکتا، مجبوری ہے۔ اور مجبوری بھی ایسی ہے کہ میں بتا بھی نہیں سکتا۔" مجیدن نے مردانہ آواز میں جواب دیا۔ "میرا سر تو تجھے ہی واپس لانے کا بندوبست کرنا پڑے گا۔ جب تک مجھے اپنا سر نہیں ملے گا، میں تیری جورو کو ہرگز نہیں چھوڑوں گا۔"
"سادھو نے سر اپنے پاس کیوں رکھ چھوڑا ہے۔ وہ اس کا کیا کرے گا؟" سلیم نے صورت حال سمجھنے کے لئے دریافت کیا۔
"وہ اس سے زبردست کام لے گا۔"
"مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ سادھو ہے کہاں"؟ سلیم نے اپنی مجبوری بیان کی۔ "اس کا کچھ اتا پتا معلوم ہو تو اسے تلاش کرنے کی کوشش کروں۔"
"وہ کانپور میں ہے اور گنگا کے کنارے بھیروں گھاٹ پر اپنے چیلے کے ساتھ ٹھہرا ہوا ہے۔ تجھے تو معلوم ہی ہوگا کہ بھیروں گھاٹ بہت بڑا مرگھٹ ہے دور دور سے ہندو اپنے مُردوں کی چتا جلانے اور کریا کرم کرنے کے لئے وہاں آتے ہیں۔" مجیدن مردانہ آواز میں بتاتی رہی۔ "سادھو مہاراج کو کنوار کے مہینے کا انتظار ہے۔ اس مہینے میں وہ اماوس کی رات کو جب اندھیرے پاکھ کی پندرہ تاریخ ہوگی، کسی سمادھی پر بیٹھ کر جاپ کرے گا۔ اور میری کھوپڑی کو چتا کی آگ پر رکھ کر چاول پکائے گا۔"
"ان چاولوں کو وہ کھائے گا"؟ رمضانو جواب تک خاموش بیٹھی تھی، اپنے تجسس کو قابو میں نہ رکھ سکی۔ اس نے حیران و پریشان ہو کر پوچھا۔ "وہ ان چاولوں کا کیا کرے گا؟"
"بتاؤں کیا کرے گا؟" مجیدن نے قہر آلود نظروں سے رمضانو کو دیکھا۔ رمضانو ڈر گئی، مزید بات کرنے کی اسے جرأت نہ ہوئی، البتہ سلیم نے

معذرت کے انداز میں کہا۔ "ان کی بات کا بُرا نہ مانیں۔ انہیں آپ کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔ بہت عرصہ بعد مجیدن کے پاس آئی ہیں۔" اس نے تامّل کیا۔ "آپ کو تو جو کچھ بتانا ہے مجھے بتا دیں۔" وہ نہایت عزت و احترام سے اسے مخاطب کر رہا تھا۔ ڈر تا تھا کہ ناراض ہو کر وہ مجیدن کو اور زیادہ پریشان نہ کرے۔

"ہاں تو میں بتا رہا تھا کہ اماوس کی رات کو وہ میری کھوپڑی میں چاول پکائے گا۔" مجیدن نے مردانہ آواز میں سلیم کو بتایا۔ "جب چاول پک جائیں گے تو وہ آدھی رات کو سادھی سے اٹھ کر گنگا میں آشنان کرے گا اور دریا سے نکل کر بالکل ننگ دھڑنگ مرگھٹ کے گھنے پیپل کے نیچے جائے گا۔ کھوپڑی اس کے ہاتھ میں ہو گی۔ اس میں ہاتھ ڈال کر چاول نکالے گا اور ان کو پیپل کی جھکی ہوئی شاخ پر زور سے مارے گا۔ جتنے چاول پتوں سے لگے رہ جائیں گے وہی اس کے کام کے ہوں گے۔ ان کو وہ اکٹھا کرے گا۔" مجیدن نے مڑ کر سلیم کو دیکھا۔ "معلوم ہے وہ ان چاولوں سے کیا کام لے گا؟"

"مجھے کیا خبر وہ ان سے کیا کام لے گا۔" سلیم نے سادگی سے جواب دیا۔

"ان چاولوں میں سے ایک دانا بھی کسی کو کھلا دے گا، وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس کا ایسا غلام بن جائے گا کہ جو کہے گا، آنکھ بند کر کے وہی کرے گا۔" مجیدن نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "جو کچھ کرنا ہے پاکھ کی پندرہ تاریخ سے پہلے کرنا ہو گا۔ ایک بار کھوپڑی میں چاول پکا لئے گئے تو وہ جل بھن کر کوئلہ ہو جائے گی۔ میرے لئے بالکل بیکار ہو جائے گی۔" اس کا لہجہ اچانک تلخ ہو گیا۔ "سلیم تو کسی طرح میرا سرلا دے ورنہ میں تیری جُورو کو کبھی نہیں چھوڑوں گا۔"

"کاہنور تو میں کل ہی چلا جاؤں گا لیکن سادھو سے کھوپڑی کیسے واپس لاؤں گا۔" سلیم نے کہا۔ "اگر قرض ادھار لے کر اسے کچھ رقم دی جائے تو وہ کھوپڑی میرے حوالے کر دے گا؟"

"لاکھ روپے دے، تب بھی وہ نہیں دے گا۔" اس نے جواب دیا۔ "کسی زبردست عامل کو اپنے ساتھ لے جانا ہوگا اور سادھوؤں کا بھیس بدل کر جانا ہوگا۔ مگر عامل ایسا کامل اور سیانا ہو جو اسے قابو میں کرلے اور کھوپڑی اپنے قبضے میں لے لے۔"

"لیکن میں تو کسی عامل کو ہی نہیں جانتا۔ کامل عامل کہاں تلاش کرتا پھروں گا۔" سلیم نے سادگی سے اپنی مجبوری بیان کر دی۔

"تو پھر یہ بھی سن لے، میں تیری جورو کو بغیر اپنا سر واپس لئے چھوڑوں گا نہیں۔" اس نے جھنجلا کر سلیم کو دھمکی دی۔ "میں نے جو کچھ بتانا تھا تجھے بتا دیا۔ آگے تو جان اور تیرا کام۔"

سلیم کچھ نہ بولا۔ رمضانو بھی چپ بیٹھی رہی۔ مجیدن اب ہاتھ باندھے نظریں جھکائے مراقبے کے عالم میں گم صم بیٹھی تھی۔ کچھ دیر تینوں خاموش رہے پھر سلیم نے مجیدن کی جانب دیکھا، آہستہ سے بولا۔ "ایک بات اور پوچھنا تھی۔" مجیدن نے اس کی جانب دیکھے بغیر مردانہ لہجے میں ڈانٹا۔

"چپ بیٹھا رہ۔ میاں کے سامنے میرا مقدمہ پیش ہو رہا ہے۔"

ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔ کچھ وقت اسی خاموشی کے عالم میں گزرا۔ آخر مجیدن کی وہی مردانہ آواز ابھری۔ "عشاء کی نماز کا وقت ہو گیا۔ میاں نے دربار برخاست کر دیا۔ آج میری پیشی نہیں ہوئی۔ بعد میں ہو گی۔ مجھے لینے میاں کے غلام آ رہے ہیں، لے میں چلا۔" سلیم نے کچھ نہ کہا۔ رمضانو کی سمجھ میں بھی کچھ نہ آیا۔ وہ خاموش بیٹھی رہی۔

☆

مجیدن نے مڑ کر رمضانو کو دیکھا۔ حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر پوچھا۔ "اے باجی! تم یہاں کب آئیں؟" اس دفعہ آواز زنانہ تھی۔ مجیدن کی اپنی آواز تھی۔ رمضانو بولی۔ "میں تو دیر سے تیرے ساتھ بیٹھی ہوئی ہوں۔" وہ بھی حیرت

زدہ تھی۔

"مجھے بہت کمزوری معلوم ہو رہی ہے۔" مجیدن کے لہجے میں نقاہت تھی "میں اب لیٹوں گی۔ سر میں درد بھی ہو رہا ہے۔"

"اتنی دیر پٹر، پٹر باتیں جو کرتی رہی۔" رمضانو نے مسکرا کر کہا۔ "بولتے بولتے تھک گئی۔"

"میں باتیں کرتی رہی؟" مجیدن نے چونک کر پوچھا۔ "نہیں باجی! میں کہاں بول رہی تھی۔ مجھ میں تو بولنے کا دم ہی نہیں ہے۔"

"ذرا دیدے کی صفائی تو دیکھو، کیسا صاف جھوٹ بول رہی ہے۔" رمضانو نے کہا۔

"نہیں باجی، یہ ٹھیک ہی کہہ رہی ہے۔ یہ اپنے ہوش میں کہاں تھی۔ وہ تو کوئی اور ہی بول رہا تھا۔ اسے سنتے ہوئے ایک مدت ہو گئی۔ تم نے تو پہلی بار سنا تھا۔" سلیم نے وضاحت کی۔ "تم نے یہ نہیں دیکھا یہ اس کی آواز کب تھی، صاف معلوم ہوتا تھا کوئی مرد بول رہا ہے۔ جب بھی وہ اس کے سر پہ آتا ہے اسی طرح آواز بدل جاتی ہے۔"

مجیدن چلنے کے لئے اصرار کرنے لگی۔ وہ نڈھال اور تھکی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ رمضانو نے سہارا دے کر مجیدن کو اٹھایا اور اس کا بازو پکڑے ہوئے دالان کی جانب چلی۔ سلیم اس کے ساتھ ساتھ تھا۔

مجیدن کی ساس تینوں کا انتظار کر رہی تھی۔ مجیدن اس قدر بے حال ہو رہی تھی کہ دالان میں پہنچتے ہی بستر پر لیٹ گئی۔

سلیم کھویا کھویا اور دل گرفتہ نظر آ رہا تھا۔ رمضانو کو مخاطب کر کے بولا۔ "باجی اس کی کھوپڑی سادھو سے واپس لانے کے لئے میں کس عامل کے پاس جاؤں؟"

"فکر نہ کر، میں تجھے قلزم شاہ کے پاس لے چلوں گی بہت پہنچے ہوئے بزرگ

ہیں۔ ایسا تعویز دیتے ہیں کہ جو بیماری حکیم ڈاکٹروں کے علاج سے نہیں جاتی، ان کے تعویز سے چلی جاتی ہے۔ کیسا بھی آسیب ہو، کسی کا بھی سایہ ہو، عمل پڑھ کر اتار دیتے ہیں۔" رمضانو نے سلیم کو اطمینان دلایا۔ "آج رات تو وہ شاہ مینا کے مزار پر قوالی سن رہے ہوں گے۔ عبدل بھی بیٹی کو لوچندی کا میلہ دکھانے اُدھر ہی گیا ہے۔"

مجیدن کی ساس نے مداخلت کی۔ "ارے یہ عامل وامل کی کیا بات ہو رہی ہے۔ پہلے یہ تو دیکھ لو، یہاں سے کیا حکم ملتا ہے۔"

"اماں کہہ تو ٹھیک ہی رہی ہے۔" سلیم نے ماں کی تائید کی۔ "آج تو پہلا دن تھا۔ ابھی کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہیئے۔"

رمضانو نے کوئی تبصرہ نہ کیا۔ مجیدن کے پاس گئی شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ چوڑی دار پاجامے کے ازار بند میں بندھا ہوا بٹوہ نکالا۔ اسے کھولا، پانچ روپے نکالے اور مجیدن کے ہاتھ میں تھما کر بولی۔ "لے یہ رکھ لے ان سے کام چلا بعد میں اور روپے بھی لیتی آؤں گی۔" مجیدن نے کچھ کہنا چاہا مگر رمضانو نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر خاموش کر دیا۔ اس نے بہن کو تسلی دی اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

سلیم نے کہا۔ "باجی کہاں چلیں، کھانا کھا کر جانا۔"

رمضانو ٹھہرنے پر تیار نہ ہوئی۔ "مجھے بارہ دری پہنچا دے وہیں میرے ساتھ کھانا بھی کھا لینا۔ میں تو جلد سے جلد واپسی کا وعدہ کر کے آئی تھی۔ اب تو بڑی سرکار بھی لوٹ کر آگئی ہوں گی۔ دیر ہو گئی تو خفا ہوں گی۔" اس نے سلیم کو اشارہ کیا۔ "آ میرے ساتھ۔"

وہ آگے بڑھی سلیم اس کے ساتھ ساتھ چلا۔

(۹)

بارہ دری میں رات اُتر آئی تھی۔

حضور بیگم مسند پر خاموش بیٹھی تھیں۔ مغلانی کی بات سن کر وہ مخمصے میں پڑ گئی تھیں۔ وہ داروغہ نصیر کے بارے میں کوئی فیصلہ نہ کر سکیں۔ انہوں نے اس سلسلے میں مزید بات چیت نہ کی۔ مغلانی نے بھی بات بڑھانے سے گریز کیا۔ انہوں نے سرپوش اٹھا کر خاص دان حضور بیگم کے سامنے پیش کیا مگر انہوں نے گلوری نہ اٹھائی۔ انہیں پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ دروازے پر بیٹھی ہوئی خواص، گل بدن کو بلایا۔ پانی منگوایا۔

پانی آیا تو کٹورا ہاتھ میں لے کر حضور بیگم نے ہونٹوں سے لگایا، لیکن چند ہی گھونٹ پانی کے پیے تھے کہ حلق میں پھندا لگا۔ معاً ان کو طلعت آرا یاد آگئی کٹورا انہوں نے ایک طرف رکھا اور مغلانی کو مخاطب کیا۔

"بی مغلانی! یہ طلعت آرا کہاں ہے؟ ابھی تک نظر نہ آئی۔ آداب کرنے کو بھی نہ آئی۔ یہ بیٹھی کہاں ہے؟"

"مجھے بھی دیر سے نظر نہیں آئیں۔" مغلانی نے جواب دیا۔

حضور بیگم نے اونچی آواز سے پکارا "طلعت آرا بیگم، اے طلعت آرا بیٹی، ذری یہاں تو آؤ۔"

مگر حضور بیگم کو کوئی جواب نہ ملا۔

انہوں نے پھر آواز دی۔ "طلعت آرا۔ اب اپنے کمرے سے باہر آجاؤ دونوں وقت مل رہے ہیں۔ اس گھڑی بستر پر لیٹنا مناسب نہیں۔" وہ اپنی دھن میں رک رک کر بولتی رہیں۔ خلاف توقع اس بار بھی طلعت آرا کی آواز سنائی نہ دی! ان کے آواز دینے پر وہ ہمیشہ جواب دیتی تھی: "جی، حاضر ہوئی اماں جان۔" اور فوراً ان کے پاس پہنچ جاتی تھی۔

طلعت آرا کی جانب سے جب کوئی جواب نہ ملا تو حضور بیگم پریشان ہوگئیں۔ مغلانی نے ان کو پریشان دیکھا تو تسلی دی "سرکار، معلوم ہوتا ہے چھوٹی سرکار گہری نیند سو رہی ہیں۔" وہ زیر لب مسکرائیں۔ "جوانی کی نیند ہی ایسی ہوتی ہے۔"

مگر حضور بیگم کی تشویش کم نہ ہوئی۔ ایسی بے چین ہوگئیں کہ کسی پیش خدمت یا خادمہ کو طلعت آرا کی خواب گاہ کی جانب بھیجنے کے بجائے گھبرا کر خود ہی اٹھیں۔

مغلانی نے ٹوکا۔ "اے سرکار، آپ کہاں چلیں؟"

حضور بیگم آگے بڑھیں اور شہ نشین سے نیچے اترتے ہوئے بولیں "طلعت آرا کے کمرے کی طرف جا رہی ہوں"۔ انہوں نے پیروں میں سلیپر ڈالیں، پاجامے کے پائنچے جلدی سے ہاتھ پر سنبھالے اور کمرے سے نکل کر دالان میں پہنچ گئیں۔

خواص نے ان کو دیکھا تو فوراً اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ مغلانی بھی نیچے اتریں اور حضور بیگم کے پیچھے پیچھے چلیں۔

حضور بیگم نے طلعت آرا کے کمرے میں داخل ہو کر دیکھا، وہاں کوئی نہ تھا۔ بستر خالی تھا۔ کمرہ بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ وہ سناٹے میں آگئیں۔ کمرے کی دیوار پر ایک دوشاخہ روشن تھا۔ اس کی ہلکی ہلکی روشنی میں ہر طرف خاموشی چھائی تھی۔ حضور بیگم کمرے کی دہلیز پر گم صم کھڑی تھیں۔

☆

نجو اپنی کوٹھری میں دم بخود لیٹی تھی۔ اسے دھڑکا تھا کہ طلعت آرا کو حضور بیگم نے کمرے میں نہ پایا تو پریشان ہو کر شاید اسی طرف آجائیں۔ یہ سوچ کر اس کے حواس بجا نہ رہے۔ اب بستر پر لیٹے رہنا مناسب نہ تھا۔ اس نے اٹھ کر جھپاک سے دوپٹے کو ٹھیک سے اوڑھا۔ کوٹھری سے نکل کر جوتیاں گھسیٹتی ہوئی سٹر پٹر کرتی دالان میں پہنچی۔ اس کا قیاس غلط نہ نکلا۔ حضور بیگم سامنے سے نمودار ہوئیں۔ ان کے عقب میں مغلانی تھیں۔

نجو کو دیکھتے ہی حضور بیگم نے دریافت کیا۔ "اری نجو! یہ طلعت آرا کہاں ہے؟"

"سرکار! میں نے تو ان کو سہ پہر سے نہیں دیکھا" اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں صفائی پیش کی۔ "میرے سر میں تو آج درد ہے۔ میں تو اپنی کوٹھری میں

بستر پر لیٹی تھی۔

حضور بیگم ایک دم بپھر گئیں۔ جھنجلا کر بولیں۔ "بدبخت، تیرے سر کا درد جائے چولہے بھاڑ میں۔ تو اسی طرح ہر وقت فیل مچایا کرتی ہے جا ذری دیکھ تو چھوٹی سرکار کدھر ہیں؟"

بخّو نے کوئی جواب نہ دیا۔ گھبرائی ہوئی ایک جانب بڑھی۔ حضور بیگم نے پلٹ کر پیچھے کھڑی ہوئی مغلانی کو دیکھا۔ جھنجلا کر ان پر برسنے لگیں۔ "بی مغلانی! میں تم کو یہاں اس لئے چھوڑ کر جاتی ہوں کہ تم طلعت آرا کا خیال رکھو گی مگر تم کو تو اپنے ہی آپے کا ہوش نہیں۔ نہ جانے ہر دم کن فکروں میں مبتلا رہتی ہو۔"

"سرکار! آپ تو ذرا ذرا سے کے ذرا میں خود کو ہلکان کر لیتی ہیں۔" مغلانی ان کی گھبراہٹ رفع کرنے کی غرض سے نرم لہجے میں بولیں۔ "وہ ہوں گی کہاں؟ یہیں کہیں کمرے میں ہوں گی۔"

"وہ اپنے کمرے میں تو ہے نہیں۔" حضور بیگم نے بتایا۔

مغلانی جو اُن کے پیچھے پیچھے گئیں تھیں اور اپنی آنکھوں سے طلعت آرا کا خالی کمرہ دیکھ چکی تھیں، نہایت اطمینان سے بولیں۔ "کسی اور کمرے میں ہوں گی۔ حضور پریشانی کی ایسی کیا بات ہے؟"

حضور بیگم بے قرار ہو کر بولیں۔ "یا مولا، خیر کرنا، نہ جانے کیوں میرا دل بری طرح دھڑک رہا ہے، رہ رہ کے ہول ہو رہا ہے۔"

مغلانی دیرینہ مزاج شناس تھیں۔ انہوں نے فوراً ان کو ڈھارس دی۔ "سرکار! برا نہ مانئے۔ بعض اوقات تو آپ بالکل بچوں کی سی حرکتیں کرنے لگتی ہیں۔" انہوں نے تامّل کیا۔ "آپ بغیر سوچے سمجھے منہ سے بات نکال دیتی ہیں۔ آیئے میرے ساتھ۔ بخّو گئی ہے وہ ان کو تلاش کر کے ابھی لاتی ہے۔"

مغلانی کی باتوں سے حضور بیگم کو قدرے تشفی ہوئی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی پھر نشست گاہ میں پہنچیں اور گاؤ تکیہ کا سہارا لے کر مسند پر بیٹھ گئیں۔

مغلانی بھی ان کے قریب ہی بیٹھ گئیں۔ حضور بیگم کے دل میں طرح طرح کے وسوسے جنم لے رہے تھے۔ وہ خاموش بیٹھی آہستہ آہستہ سانس لے رہی تھیں۔

مغلانی زیادہ دیر خاموش نہ رہیں۔ اٹھتے ہوئے بولیں "سرکار، آپ ذرا آرام کریں۔ میں خود جا کر دیکھتی ہوں چھوٹی سرکار کہاں ہیں۔"

"بی مغلانی! صبح سے میری بائیں آنکھ پھڑک رہی ہے"۔ انہوں نے اپنی بڑھتی ہوئی تشویش کا اظہار کیا۔ "دل میں نہ جانے کیسے کیسے خیال آ رہے ہیں۔"

مغلانی نے مسکرا کر دل جوئی کی "سرکار آپ کو چھوٹی سرکار سے محبت ہی اس قدر ہے کہ پل بھر کو نہ دیکھیں تو بے قرار ہو جاتی ہیں۔ آپ اپنے تئیں وہم میں مبتلا نہ کریں۔ میں ابھی واپس آئی۔" یہ کہتی ہوئی وہ آگے بڑھیں، نیچے اتریں اور کمرے سے باہر چلی گئیں۔

اب ہر طرف کھلبلی مچ گئی تھی۔

حضور بیگم گاؤ تکیہ سے ٹیک لگائے چپ چاپ بیٹھی تھیں۔

مغلانی اور بارہ دری کی تمام خادماؤں نے چپہ چپہ چھان مارا لیکن طلعت آرا کا کوئی سراغ نہ ملا۔ نجّو نے کئی بار سوچا کہ جی کڑا کر کے حضور بیگم کو سب کچھ بتا دے مگر حضور بیگم کی ڈانٹ پھٹکار کے ڈر سے ہر بار اس کی ہمت جواب دے گئی۔ اس نے مغلانی کو بھی طلعت آرا کی گمشدگی کے بارے میں کچھ نہ بتایا حالانکہ مغلانی نے کرید کرید کر اس سے پوچھا بھی۔ لیکن اس نے ان کو اعتماد میں نہ لیا۔ خادماؤں کے ساتھ غلام گردشوں، کمروں، کوٹھریوں، سہ دریوں اور دو چھتیوں میں طلعت آرا کو ڈھونڈتی رہی۔ اس طرح بھاگی بھاگی پھر رہی تھی کہ توشہ خانہ، تہہ خانہ، غسل خانہ، حتیٰ کہ مودی خانہ بھی نہ چھوڑا۔ کبھی ادھر جاتی، کبھی ادھر۔ وہ حضور بیگم کی نظروں سے بچتی پھر رہی تھی۔

☆

سہ پہر رات گزر گئی۔

طلعت آرا کا جب کوئی پتہ نہ چلا تو ہر طرف موت کا سا سناٹا چھا گیا۔ نہ کسی کو کھانے کا ہوش تھا نہ بولنے کا۔ ہر چہرہ پریشان تھا اور ہر آنکھ ویران نظر آتی تھی۔

حضور بیگم خاموش بیٹھی ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں بھر رہی تھیں۔ جوان جہان لڑکی کا معاملہ تھا، زبان سے اف بھی نہ کر سکتی تھیں۔ مغلانی ان کے قریب ہی بیٹھی تھیں، ان کی ہمدرد و غم گسار تھیں، محرم راز تھیں۔ لیکن حضور بیگم نے ان سے بھی کوئی بات نہ کی۔ کھوئی کھوئی نظروں سے درو دیوار تکتی تھیں۔ ان کے ہونٹوں پر جیسے تالا پڑ گیا تھا۔

تمام خادمائیں اور لونڈیاں کمرے کے باہر دالان میں دم بخود کھڑی تھیں نہ کوئی بول رہی تھی نہ بات کر رہی تھی۔ ان میں نجّو بھی شامل تھیں وہ سب سے زیادہ پریشان اور دل گرفتہ نظر آ رہی تھی۔

بہت دیر بعد مغلانی نے سکوت توڑا۔ دبی زبان سے اپنے خدشہ کا اظہار کیا۔ "حضور! ڈر ہے چھوٹی سرکار کہیں کوٹھے پر تو نہیں چلی گئیں۔"

"ہو سکتا ہے، وہ اوپر چلی گئی ہو" حضور بیگم نے چونک کر مغلانی کی جانب دیکھا "ہائے اس نے یہ کیا غضب کیا۔ آج تو نوچندی جمعرات ہے۔" ان کے چہرے پر خوف کے سائے پھیل گئے۔ انہوں نے مغلانی کو مخاطب کیا۔ "بی مغلانی تم کو تو پتہ ہے آج تو ضرور پھیرا ہوتا ہے۔" حضور بیگم نے خوف سے جنوں کا نام بھی نہ لیا۔

"سمجھ میں نہیں آتا کہ اس نے اوپر جانے کی کیسے جسارت کی۔"

"ہو سکتا ہے ایسا نہ ہو۔" مغلانی نے حضور بیگم کی سراسیمگی دیکھ کر وضاحت کی۔ "یہ تو صرف میرا گمان ہے۔"

نجّو کمرے کی دہلیز پر کھڑی دونوں کی باتیں سن رہی تھی۔ اس سے ضبط نہ ہو سکا۔ بڑھ کر حضور بیگم کے روبرو پہنچ گئی۔ جھجکتے ہوئے بولی۔ "چھوٹی سرکار

مجھ سے بھی دو پہر کو اوپر جا کر مہر عالم کی رخصتی دیکھنے کو کہتی تھیں۔"
حضور بیگم نے تڑپ کر پہلو بدلا، غصّے سے بولیں۔" اور تو نے اسے منع بھی نہ کیا۔"
"سرکار! میں نے تو ان کو بہت منع کیا۔" نجّو نے گھبرا کر جھوٹ بولا۔" وہ مان بھی گئی تھیں۔"
"بعد میں کیا ہوا"؟ حضور بیگم نے تفتیش کرنے کے انداز میں پوچھا۔
"وہ حمام میں پنڈا دھونے چلی گئیں۔" نجّو نے جھٹ صفائی پیش کی۔" میرے سر میں بہت درد ہو رہا تھا۔ میں اپنی کوٹھری میں جا کر لیٹ گئی، پھر باہر ہی نہ نکلی۔"
"تو گویا یہ سب کچھ میرے کربلا جانے کے بعد ہوا"۔ حضور بیگم نے نیاس آرائی کی، انہوں نے مغلانی کی جانب دیکھا۔" بی مغلانی، تم تو گھر میں موجود تھیں۔ تم نے کچھ نہیں دیکھا۔"
"سرکار! میں تو آپ کے پائجامے کے پائینچے تیار کرنے میں الجھی ہوئی تھی۔ مغلانی نے وضاحت کی۔" مگر میں تو صحنچی میں بیٹھی تھی۔ چھوٹی سرکار اوپر جاتیں تو میں ضرور دیکھتی۔"
حضور بیگم نے قہر آلود نظروں سے نجّو کو دیکھا اور ایک دم پھٹ پڑیں۔
"شنقتل! جب چھوٹی سرکار نے اوپر جانے کو کہا تھا تو، تُو نے مغلانی کو تو آگاہ کیا ہوتا، ویسے تو ایک ایک بات ادھر سے ادھر لگاتی پھرتی ہے۔"
مغلانی نے حضور بیگم کے غصّے کا پارہ چڑھا ہوا دیکھا تو فوراً نجّو کے لئے ڈھال بننے کی کوشش کی، نرمی سے بولیں۔" اے سرکار! آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ یہ ہمیشہ کی بھڑ بھیڑیا ہے۔ نہ سوچتی ہے نہ سمجھتی ہے۔ بھڑ سے بیچ میں بول پڑتی ہے"۔ انہوں نے گھور کر اسے دیکھا۔" جا کر اپنی کوٹھری میں لیٹ، تیری طبیعت ویسے ہی ٹھیک نہیں۔" ان کی آواز اونچی ہو گئی۔" اب دفان ہو یہاں سے، سر

پر کیوں کھڑی ہے۔ جاتی کیوں نہیں؟"

نجو فوراً وہاں سے ٹل گئی۔

مغلانی نے اسے حضور بیگم کے عتاب سے صاف بچا لیا۔ بات کا رخ پلٹتے ہوئے بولیں "سرکار! گھر کا ایک ایک کونا، ایک ایک گوشہ چھان مارا۔ اب تو صرف اوپر کی منزل ہی رہ گئی ہے۔"

"مگر وہاں جائے گا کون؟" حضور بیگم نے مغلانی کو استفہامیہ نظروں سے دیکھا۔

"لونڈی ماماؤں میں سے کوئی چلی جائے گی۔" مغلانی نے جواب دیا۔ "ایک نہیں کئی مل کر چلی جائیں گی۔"

"سوچ لو، کوئی الٹی سیدھی نہ پڑ جائے۔" حضور بیگم کی آنکھوں سے خوف جھلکنے لگا۔ "بھئی میرا تو دل نہیں ٹھکتا۔ مجھے تو یہ سوچ کر ہی ہول ہونے لگا ہے۔"

"سرکار! آپ خواہ مخواہ خود کو ہلکان نہ کریں۔" مغلانی نے ان کو تسلی دی "آپ اطمینان سے تشریف رکھیں۔ میں باہر جا کر ماماؤں سے بات کرتی ہوں۔"

حضور بیگم گم صم بیٹھی رہیں۔

☆

دالان کے ایک گوشہ میں تمام خادمائیں حیران و پریشان کھڑی تھیں۔ نجو ابھی تک اپنی کوٹھری میں نہیں گئی تھی۔ سب کے ساتھ ہی کھڑی تھی۔ مغلانی نے قریب جا کر خادماؤں کو کوٹھے پر جانے اور طلعت آرا کو تلاش کرنے پر آمادہ کرنا چاہا۔ ان کی بات سن کر سب پر جیسے سکتہ طاری ہو گیا۔ ان کے چہروں سے سراسیمگی اور دہشت آشکارہ تھی۔ ہر وقت تو گھر میں جنوں، بھوت پریتوں اور طرح طرح کے آسیب کا تذکرہ رہتا تھا۔ ایسے ہولناک اور لرزہ خیز واقعات سننے میں آتے تھے کہ ہر ایک کے دل میں دہشت بیٹھی ہوئی تھی۔

جب کسی نے جواب نہ دیا اور سر جھکائے چپ چاپ کھڑی رہیں تو مغلانی

نے ان کے جذبہ وفاداری کو للکارا۔" تم سب سرکار کی نمک خوار ہو۔ وہ اس وقت مصیبت میں ہیں، تم کو ذرا بھی ان کا خیال نہیں۔"

سب تو خاموش رہیں مگر نجوّ چپ نہ رہی۔ وہ حضور بیگم سے زیادہ طلعت آرا کے لئے بے قرار تھی۔ اس سے محبت بھی بہت کرتی تھی۔ طلعت آرا کسی بات پر خفا ہو کر ڈانٹتی، دھتکارتی، دو ہنٹر پیٹھ پر مارتی مگر وہ ڈھٹائی سے ہی ہی ہنستی تھی۔ نجوّ سینے پر ہاتھ مار کر جوش سے بولی۔" امّاں! میں اوپر جاؤں گی" وہ بڑھ کر آگے آگئی۔

نجوّ کی اس حرکت پر مغلانی تلملا کر رہ گئیں۔ جی تو چاہا کہ اس سے کہیں کہ کیوں تیرے سر پر قضا کھیل رہی ہے۔ کہیں جنّات غضبناک ہو کر بڑے نواب صاحب کی طرح تیرا کلیجہ بھی نہ چبا ڈالیں۔ مگر انہوں نے مصلحت سے کام لیا۔ وہ خادماؤں کو مزید خوف زدہ نہ کرنا چاہتی تھیں نرمی سے بولیں۔" تیری طبیعت تو پہلے ہی خراب ہے۔ اتنی سیڑھیاں چڑھ کر جائے گی تو اور بگڑ جائے گی۔ تو جاکر کوٹھری میں لیٹ۔" وہ خادماؤں کی جانب متوجہ ہوئیں۔" یہ کل کی بچی تو اوپر جانے کو تیار ہے اور تم سب ہو کہ اس طور دم بخود کھڑی ہو۔ جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔" انہوں نے منہ بگاڑ کر خادماؤں کی طرف حقارت سے دیکھا۔

ان کے طعن تشنیع کا یہ ردّ عمل ہوا کہ نجیبن نامی ایک مہری نے آمادگی کا اظہار کیا۔" نہیں مغلانی جی، میں چھوٹی سرکار کو ڈھونڈنے اوپر جاؤں گی۔" اس نے مڑ کر ماماؤں کی سمت دیکھا۔" اور کون میرے سنگ چلے گا؟"

نجیبن تھی بھی سب خادماؤں میں دبنگ۔ اس کا میاں ڈیوڑھی پر دربان مقرر تھا۔ وہ اسے بھی خاطر میں نہ لاتی تھی۔ کبھی وہ خفگی کا اظہار کرتا تو کلّا بہ کلّا جواب دیتی۔ ذرا بھی نہ دبتی۔ کسی لونڈی ماما سے جھڑپ ہو جاتی تو آنکھیں نکال کر ایک کی آٹھ سناتی۔ سب ہی خادمائیں اس سے خائف رہتی تھیں۔

نجیبن نے آمادگی ظاہر کی تو دو تین اور خادماؤں کو بھی حوصلہ ہوا۔ وہ

بھی اوپر کی منزل پر جانے کے لیے تیار ہوگئیں۔

مغلانی نے نجو کو کوٹھری کی جانب روانہ کیا اور خود حضور بیگم کے پاس چلی گئیں۔

نجیبن نے باورچی خانے سے لالٹین لی، اسے ایک ہاتھ میں لٹکایا اور زینے کی جانب بڑھی۔ دو خادمائیں اس کے پیچھے پیچھے چلیں، مگر عالم یہ تھا کہ کسی انجانے خوف سے سب کے دل زور زور سے دھڑکتے تھے۔ سنبھل سنبھل کر چلنے کے باوجود پیر ڈگمگاتے تھے۔ نجیبن نے لالٹین اٹھا کر اونچی کر لی۔ گردن بڑھا کر زینے پر ایک نظر ڈالی۔ لالٹین کی دھندلی دھندلی روشنی میں زینہ بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ دیواروں پر چھائیاں لہرائیں اور خوف کو دوچند کر گئیں۔

نجیبن نے زور سے کھنکار کر خوف رفع کرنے کی کوشش کی۔ اونچی آواز سے بولی۔ "آؤ میرے ساتھ۔" دونوں خادماؤں نے قدم بڑھائے، ایک ساتھ بولیں "ہاں ہاں آگے قدم بڑھاؤ، ہم ساتھ ساتھ ہیں۔" تینوں ڈری سہمی زینے کے اندر داخل ہوگئیں۔

☆

نجو کوٹھری میں دل گرفتہ لیٹی تھی۔

مغلانی اس وقت حضور بیگم کے پاس بیٹھی دل جوئی کی باتیں کر رہی تھیں یکایک زینے سے خادماؤں کی چیخیں ابھریں۔ مغلانی اور حضور بیگم کے چہرے خوف سے سفید پڑ گئے۔ دل زور زور سے دھڑکنے لگے۔

خادمائیں گرتی پڑتی بدحواسی کے عالم میں زینے سے نکلیں اور دالان میں پہنچ کر زور زور سے ہانپنے لگیں۔ ان کے ہوش ٹھکانے نہ تھے۔ نجیبن کے ہاتھ میں لالٹین لٹک رہی تھی مگر اب اس کی بتی بجھی ہوئی تھی۔ دوسری لونڈیاں اور مامائیں بھی گھبرائی ہوئی ان کے قریب پہنچ گئیں۔ بار بار ہر ایک سے پوچھتی تھیں: "اے بوا، کیا ہوا، کچھ تو بتاؤ؟" مگر تینوں ایسی دہشت زدہ تھیں کہ منہ سے

آواز نہ نکلتی تھی۔

مغلانی نے اٹھ کر باہر جانا چاہا تو حضور بیگم نے ہاتھ پکڑ کر بٹھا لیا۔ "بی مغلانی، تم کہاں چلیں۔ میرا تو ہول کے مارے دم نکلا جا رہا ہے۔" مغلانی نے ارادہ ترک کر دیا۔ حضور بیگم کے پاس بیٹھی رہیں۔

ذرا دیر بعد نجیبن کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ خاصی موٹی تگڑی چھتیس سینتیس سال کی عورت تھی۔ اس کے چہرے سے خوف آشکارہ تھا۔ اس کے ہمراہ دو اور خادمائیں جو زینے میں گئی تھیں، سہمی ہوئی کھڑی تھیں۔ ان تینوں کے عقب میں دوسری مامائیں اور لونڈیاں تھیں۔ سب ہی ڈری ہوئی نظر آتی تھیں۔

حضور بیگم تو خاموش رہیں، مغلانی نے نجیبن سے دریافت کیا۔ "یہ تو بتا ڈ ہوا کیا تھا جو تم سب اس بری طرح چیخی تھیں؟"

"مغلانی جی نہ پوچھئے کیا ہوا۔" نجیبن مہری نے کہا۔ "اب تک دل قابو میں نہیں ہے۔"

"تم پر افتاد کیا پڑی؟" اس دفعہ حضور بیگم نے ڈرتے ڈرتے سوال کیا۔

"اے سرکار! دوچھتی تک تو ہم تینوں بے کھٹکے پہنچ گئے۔" نجیبن ٹھہر ٹھہر کر بتانے لگی۔ "میں آگے آگے تھی۔ ہاتھ میں لالٹین تھی جسے میں نے راستہ دیکھنے کے لئے اوپر اٹھا رکھا تھا۔ بس جیسے ہی دوچھتی سے آگے بڑھی، کیا دیکھتی ہوں۔" اس نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔ اس کے چہرے پر خوف کے سائے پھیل گئے۔

مغلانی نے ہمت کر کے پوچھا۔ "پھر کیا ہوا؟"

"کیا دیکھتی ہوں اندھیرے میں زینہ کے دروازے کے پاس کوئی کھڑا ہے۔" نجیبن نے بتایا۔ "کالا توا چہرہ۔ بڑے بڑے بکھرے ہوئے بال، کپڑے بھی کالے کالے تھے۔ سرخ سرخ انگارہ سی آنکھیں۔ سفید سفید دانت نکالے ہماری ہی طرف گھور رہا تھا۔ بس میں نے اس کی ایک جھلک ہی دیکھی۔ سنبھلنے بھی نہ پائی تھی کہ

ایسا محسوس ہوا کہ کسی نے پھونک مار کر لالٹین بجھا دی۔ زینے میں گھپ اندھیرا ہو گیا۔"

"میں نے بھی اس کی ذرا سی جھلک ہی دیکھی تھی۔" نجیبن کے ساتھ کھڑی ہوئی ایک خادمہ نے کہا۔ "اسے دیکھتے ہی میرے تو اوسان جاتے رہے اُلٹے پیر دل لوٹی۔"

"اے سرکار! آگے جانے کی کس میں ہمت تھی۔" نجیبن نے صفائی پیش کی "لالٹین بجھنے کے بعد ایسا اندھیرا ہوا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ نہ پوچھئے کس طرح لوٹی۔ قدم رکھتی کہیں تھی پڑتا کہیں تھا۔ دو بار گرتے گرتے بچی۔"

حضور بیگم اور مغلانی خاموش رہیں۔ نجیبن اور دونوں خادمائیں بھی نہ بولیں۔

کچھ دیر بعد مغلانی کی آواز خاموشی میں ابھری۔ "اچھا اب تم تینوں جاؤ۔" تینوں کمرے سے باہر چلی گئیں۔ دوسری خادمائیں بھی دروازے کی دہلیز سے ہٹ کر دالان میں چلی گئیں۔ حضور بیگم چند لمحے خاموش رہ کر بولیں۔ "یا اللہ! نہ جانے کیا ہونے والا ہے۔" ان کی آواز دل گرفتہ ہو گئی۔ نظریں چھت کی جانب اٹھ گئیں۔ "مولا مشکل کشا! میری بچی کو اپنی امان میں رکھنا۔ میرے منہ میں خاک اسے کچھ ہو گیا۔ میں تو بے موت مر جاؤں گی۔" ان کی آواز بھرا گئی۔ آنکھیں بھر آئیں۔ پلکوں سے قطرے ٹپک ٹپک کر رخساروں پر گرنے لگے۔

مغلانی نے ان کو اس قدر غم زدہ دیکھا تو فوراً تسلی دی۔ "سرکار! کیوں ایسی بدشگونی کی باتیں کرتی ہیں۔ یہ بھی تو خبر نہیں کہ چھوٹی سرکار اوپر ہی گئی ہیں۔" انہوں نے فوراً بات کا رخ بدل دیا۔ "اب تو سردی بھی بڑھ گئی ہے آپ صرف ایک شال اوڑھے ہوئے ہیں۔ چلئے اپنے کمرے میں چل کر آرام کیجئے۔"

حضور بیگم نے نہایت سعادت مندی سے ان کی بات مان لی۔ اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔ مسند سے نیچے اتریں اور کمرے کی جانب چلیں۔ مغلانی ان کے ساتھ ساتھ

تھیں۔ کمرے میں پہنچ کر حضور بیگم بے حال ہو کر بستر پر لیٹ گئیں۔ مغلانی نے پائنتی سے رضائی اٹھا کر کھولی اور حضور بیگم کے جسم پر ڈال دی۔ وہ قریب رکھے ہوئے تخت پر بیٹھ گئیں۔

حضور بیگم دیر تک بے سدھ پڑی رہیں پھر اٹھیں، باہر نکل کر چوکی پر بیٹھیں۔ ایک خادمہ نے لوٹے میں نیم گرم پانی اور آفتابہ رکھ دیا۔ حضور بیگم نے وضو کیا۔ مصلے پر پہنچیں اور سجدے میں گر پڑیں۔ روتے روتے آنسوؤں سے ان کا چہرہ بھیگ گیا تھا۔ بارہ دری پر گہرا سکوت طاری تھا۔ سب دم بخود تھے، گم صم تھے۔ نہ کوئی بول رہا تھا نہ بات کر رہا تھا۔

(۱۰)

رات اپنا سفر طے کرتی رہی۔ بسنت کی نوچندی کے میلے میں ابھی تک چہل پہل تھی۔ گہما گہمی تھی۔ بچے دکانوں کے ارد گرد مچل رہے تھے، خریداری کے لئے ضد کر رہے تھے۔ طرح طرح کے برقعوں میں لپٹی ہوئی عورتوں کا جگہ جگہ جمگھٹا تھا۔ وہ ہنس رہی تھیں۔ بول رہی تھیں۔ ان میں بیاہی بھی تھیں اور بن بیاہی بھی۔ کوئی منچلا کنی کا ٹھوکا دیتا ہوا پاس سے گزرتا تو نئی گھوڑی کی طرح بدکتیں۔ سینے میں گدگدی ہوتی۔ زبان پر جلی کٹی صلواتیں اور بددعائیں ہوتیں۔ کسی کو دیکھ کر آنکھوں میں راز و نیاز ہوتے، عہد و پیمان ہوتے نگاہیں ٹکرا رہی تھیں۔ دل دھڑک رہے تھے۔ نوچندی کا میلہ اپنے شباب پر تھا۔

شاہ مینا مخدوم کے مزار پر زائرین اور عقیدت مندوں کا ہجوم تھا۔ چادریں چڑھائی جا رہی تھیں، نذرانے پیش کئے جا رہے تھے۔ تبرکات تقسیم ہو رہے تھے۔ منتیں مانی جا رہی تھیں۔ قوالوں کی ایک چوکی سے محفل سماع گرم تھی۔ طبلوں کی تال، ڈھولک کی تھاپ اور ہارمونیم کی سنگت پر قوال لہک لہک کر اپنے

ہم نواؤں کے ساتھ الاپ رہے تھے۔

خواجہ پیا موری رنگ دو چنر یا۔

رنگ دو، رنگائے دو، موہے مول منگائے دو۔

خواجہ پیا، آہے خواجہ پیا!

سامعین سر دھن رہے تھے۔ کوئی آنکھیں بند کئے مراقبے میں بیٹھا تھا۔ کسی پر وجد کی کیفیت طاری تھی۔ ہر طرف اگر بتیوں اور لوبان کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔

محفل سماع میں حسب معمول قلزم شاہ بھی موجود تھے۔ جھومتے جھومتے انہوں نے دفعتاً "حق اللہ" کا نعرہ زور سے بلند کیا اور اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ حسب دستور قوال اور دوسرے سامعین بھی کھڑے ہو گئے۔ قلزم شاہ پر ایسا وجد طاری ہوا کہ دونوں ہاتھ پھیلا کر رقص کرنے لگے۔ بار بار بے قرار ہو کر کہتے "خواجہ پیا، ہائے خواجہ پیا"۔ ان کو اپنے تن بدن کا ہوش نہ تھا۔ عالم سرخوشی میں جھوم کر کبھی اِدھر جاتے کبھی اُدھر۔

سامعین میں میڈیکل کالج کے چند طلبا بھی شامل تھے۔ انہیں قلزم شاہ کا وجد ناگوار گزرا اور اس لئے ناگوار گزرا کہ جمی جمائی محفل سماع درہم برہم ہو گئی تھی۔ ایک بار جھومتے ہوئے قریب پہنچے تو انہوں نے قلزم شاہ کو اپنے حلقے میں لے لیا۔ ان کا ایک ساتھی طالب علم بھی شاہ صاحب کے ساتھ شریک ہو گیا اور ان سے لپٹ کر رقص کرنے لگا۔ وہ قلزم شاہ سے بھی زیادہ سرخوشی اور وجد کے عالم میں جھومتا تھا۔ کبھی بغل گیر ہو جاتا کبھی علیحدہ۔

اسی عالم میں اس نے انگلیوں میں دبی ہوئی پن پہلے سے سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق ان کی کمر میں چبھو دی۔ شاہ صاحب اسی طرح جھومتے رہے حال کی کیفیت طاری رہی۔ اس نے پن اور زیادہ کھال کے اندر کی قلزم شاہ ذرا نہ بدکے۔ اس نے پوری پن ان کی کمر میں اتار دی۔ اسے توقع تھی کہ قلزم

شاہ بلبلا کر چیخ اٹھیں گے اور ان کا سارا وجد اور حال ہوا ہو جائے گا لیکن قلزم شاہ پر وہی بے خودی طاری تھی۔

آخر قلزم شاہ جھومتے ہوئے ایک طرف بڑھے اور حسب معمول ایک شخص کے بازوؤں پر نڈھال ہو کر ڈھیر ہو گئے۔ اس نے سہارا دیا۔ قلزم شاہ کو لے کر ان کی جگہ پر بٹھا دیا۔ قوال اور سامعین بھی اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔ طالب علم بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ بیٹھ گیا۔ قوال لہک لہک کر عارفانہ کلام پیش کرتے رہے۔ طلبا حیرت سے قلزم شاہ کو تکتے تھے اور دل ہی دل میں پشیمان ہوتے تھے۔

قوالی ختم ہو گئی۔ قوال اٹھ کر چلے گئے۔ کچھ سامعین بھی ان کے ساتھ ہی محفل سے اُٹھ گئے۔ قوالوں کی دوسری چوکی آ گئی۔ محفل اس دوران میں ذرا بے ترتیب ہو گئی۔ جس طالب علم نے قلزم شاہ کی کمر میں پن چبھونے کی جسارت کی تھی اظہار معذرت کے لئے اٹھ کر ان کے پہلو میں جا بیٹھا۔ اس نے سرگوشی کے انداز میں جھک کر آہستہ سے کہا۔

"حضور، غلطی ہو گئی، معافی کا طلب گار ہوں"۔

قلزم شاہ نے بے نیازی سے کہا۔ "میاں کیسی غلطی"؟

اس نے دبی زبان سے پوچھا۔ "کمر میں زیادہ تکلیف ہو تو ٹنکچر آیوڈین لگا دوں"۔

قلزم شاہ نے اسے قہر آلود نظروں سے دیکھا۔ "اچھا تو مردود، یہ تیری کارستانی تھی"۔ وہ دانت پیستے ہوئے اس کی جانب مڑے۔

وہ چھپاک سے اُٹھ کر سٹک گیا۔ قلزم شاہ آہستہ آہستہ اپنی کمر سہلانے لگے قوالوں نے تان لگائی۔ ڈھولک پر تھاپ پڑی۔ ہم نوا تالیاں بجا کر سنگت دینے لگے۔ محفل سماع میں گرمی پیدا ہونے لگی۔ حاضرین ہمہ تن گوش ہو گئے۔

درگاہ کے احاطہ میں ہنوز عقیدت مندوں کا ہجوم کم نہ ہوا تھا۔

(۱۱)

بسنت کی مہکتی ہوئی رات جاگ رہی تھی اور بارہ دری سو رہی تھی۔ ایسا ہولناک سناٹا تھا کہ دل دہلتا تھا۔ زرد زرد یرقان زدہ چاند فصیل نما اونچی اونچی دیوار کے عقب میں آہستہ آہستہ اتر رہا تھا۔ بپھری ہوئی ہوا کے جھونکے سسکیاں بھرتے ہوئے معلوم ہوتے۔ صحن میں خزاں رسیدہ مولسری کے پتے گہری خاموشی میں رک رک کر کھڑکھڑا رہے تھے۔

حضور بیگم مصلّے سے اٹھ کر اپنی خواب گاہ میں آگئی تھیں۔ مغلانی ان کے قریب ہی بیٹھی تھیں، بارہ دری میں اب تک کوئی سویا نہیں تھا۔ سب جاگ رہے تھے۔

نجیبن مہری دروازے پر نمودار ہوئی۔ اس نے اندر آنے کی اجازت چاہی۔ "سرکار! آسکتی ہوں"۔

"آؤ نجیبن کیا بات ہے"؟ حضور بیگم نے نرم لہجے میں کہا۔

نجیبن قریب آکر بولی۔ "سرکار اجازت ہو تو باہر جاکر مردانے سے لالو کو بلا لاؤں"۔ لالو اس کا شوہر تھا اور اس وقت پھاٹک پر موجود بھی تھا۔ "دوسرے دربانوں اور خدمت گاروں کو بھی اس کے ساتھ لیتی آؤں گی۔ وہ چھت پر جاکر سب پتہ کرلیں گے۔ چھوٹی سرکار وہاں ہوئیں تو ان کو بھی ڈھونڈ کر لے آئیں گے"۔

نجیبن نے تو اپنے طور خیر خواہی کا مظاہرہ کیا تھا۔ مگر حضور بیگم کو اس کی بات سخت ناگوار گزری، غصّے سے بولیں۔ "خبردار ایسی حرکت نہ کرنا۔ گھر کی چار دیواری کے باہر اس بات کی کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ جاؤ دوسری لونڈی ماماؤں کو بھی تاکید کردو۔ کوئی ایسی جسارت نہ کرے"۔

نجیبن چپ چاپ کمرے سے باہر چلی گئی۔

رات آہستہ آہستہ گزرتی رہی۔ حضور بیگم کو کسی پہلو قرار نہ تھا۔ نیند کافور ہوگئی تھی۔ وہ دل ہی دل میں منّتیں مان رہی تھیں۔ گڑگڑا کر دعائیں مانگ رہی تھیں۔ طلعت آرا کی یاد بار بار ہوک بن کر اُٹھتی تھی۔ دل لرزتا تھا۔ کلیجہ منہ کو آتا تھا۔ طرح طرح کے خدشات اور وسوسے ستاتے تھے، سائے بن کر ڈراتے تھے۔

مغلانی بھی دیر سے خاموش بیٹھی تھیں۔ حضور بیگم کو اس پریشانی کے عالم میں تنہا بھی نہ چھوڑ سکتی تھیں۔ تسلی دینے کے لئے اب ان کے پاس کچھ نہ رہا تھا۔ وہ کہتیں بھی تو کیا کہتیں۔ ان کی سوجھ بوجھ جواب دے گئی تھی۔ عقل کام نہ کرتی تھی۔

دوپہر رات گزر گئی۔ چاند دیوار کے پیچھے غروب ہو گیا تھا۔ اچانک رات کے گہرے سناٹے میں کوتوالی کے گھڑیال نے ٹن ٹن بارہ بجائے۔ عین اس وقت چھت پر چاپ سنائی دی۔ کوئی بھاری بھاری قدموں سے چل رہا تھا۔ گہری خاموشی میں قدموں کی آہٹ اتنی صاف اور عیاں تھی کہ سب نے سنی۔ چاپ کے ساتھ ہی عُود اور عنبر کی تیز خوشبو اُبھری اور آن کی آن میں ہر طرف بکھر گئی۔

خوف اور دہشت کے سائے ہر طرف پھیل گئے۔ خادماؤں اور لونڈیوں نے ڈر کر اپنی کوٹھریوں کے دروازے بند کر لئے۔ حضور بیگم اور مغلانی دم بخود بیٹھی تھیں اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے دروازے کی جانب دیکھ رہی تھیں۔

☆

حضور بیگم کو کسی پہلو قرار نہ تھا۔ انہوں نے بے چین ہو کر کروٹ بدلی نگاہیں اٹھا کر مغلانی کو دیکھا۔ مغلانی سامنے تخت پر بیٹھی اونگھ رہی تھیں وہ تمام وقت حضور بیگم کے ساتھ رہیں اور جاگتی رہیں۔ تھکن اور نیند کے غلبے سے اب نڈھال ہو رہی تھیں۔ حضور بیگم کھوئی کھوئی نظروں سے مغلانی

کے چہرے کو تکتی رہیں۔ مگر خاموش رہیں۔ زبان سے ایک لفظ نہ نکالا۔
مغلانی نے حضور بیگم کو اپنی جانب متوجہ پایا تو چونکیں۔ کسمسا کر پہلو بدلا
زیرلب مسکرانے کی کوشش کی۔ قریب رکھا ہُوا خاصدان اُٹھایا اور اس کا سرپوش
علیحدہ کرتے ہوئے دریافت کیا۔ "سرکار! پان حاضر کروں؟" اُن کے لہجے میں نرمی
اور حلاوت تھی۔
"نہیں" حضور بیگم نے منہ بگاڑ کر بے زاری کا اظہار کیا۔ "تم کھانا چاہو تو
شوق سے کھاؤ۔ میرا تو بالکل جی نہیں چاہ رہا۔ طبیعت نہ جانے کیسی گری گری ہو
رہی ہے۔ دل ہے کہ بیٹھا جارہا ہے۔" ان کی آواز سے نقاہت صاف عیاں
تھی۔ انھوں نے تامّل کیا۔ پھر استفسار کیا۔ "ابھی کتنی رات باقی ہے؟"
"یوں سمجھئے اب ختم ہوا چاہتی ہے۔" مغلانی نے آہستہ سے جواب دیا۔ مُڑ
کر دیوار پر آویزاں کنول کو دیکھا۔ شیشے کے شفّاف اور سبک کنول میں کافوری
شمع روشن تھی جواب گھٹتے گھٹتے بہت کم رہ گئی تھی۔ شمع کی ہلکی ہلکی روشنی میں کمرے
پر اُداسی چھائی ہُوئی تھی۔ مغلانی نے گہری سانس بھری۔ "اللہ کیسی پہاڑ سی رات
ہے۔ کاٹے نہیں کٹ رہی۔"
حضور بیگم نے کسی ردّعمل کا اظہار نہ کیا۔ کروٹ کے بل گُم صُم لیٹی رہیں۔
کمرے کے باہر ہُو کا عالم تھا۔ بسنت کی ڈھلتی رات نڈھال اور دم بخود
کھڑی تھی۔ اندھیرا گہرا ہوگیا تھا۔ سردی بڑھ گئی تھی۔
بارہ دری ویران نظر آرہی تھی۔ کمروں اور کوٹھریوں کے دروازے بند
تھے۔ نہ کوئی آہٹ تھی نہ آواز۔
حضور بیگم بدستور خاموش تھیں۔ ان کی آنکھوں میں نیند کے بجائے دکھ
کے سائے منڈلا رہے تھے لیکن مغلانی زیادہ دیر خاموش نہ رہ سکیں۔ کمرے
میں چھائے ہُوئے بوجھل سکوت سے اُکتاہٹ محسوس ہونے لگی۔ نیند ایک
بار پھر ان کی آنکھوں سے اُڑ چکی تھی۔ انھوں نے آہستہ سے کھنکار کر حضور بیگم

کو مخاطب کیا۔ "سرکار! کچھ بولئے، بات کیجئے۔ رات کٹے، کچھ دل بہلے۔"

حضور بیگم بُت بنی بستر پر لیٹی رہیں۔ مغلانی کو ٹکر ٹکر دیکھتی رہیں۔

"سرکار! اس طرح جی ہلکان کرنے سے تو کچھ حاصل نہ ہوگا۔" مغلانی برابر دل جوئی کرتی رہیں۔ "ذرا دل کو سنبھالئے، دن نکلنے کا انتظار کیجئے۔"

حضور بیگم اب خاموش نہ رہ سکیں۔ انہوں نے کسی قدر تیکھے لہجے میں کہا "تم کو دن نکلنے کا انتظار ہے اور مجھے دن کا نام سن کر ہول اُٹھ رہا ہے۔"

"دن کے نام سے ہول اُٹھ رہا ہے"! مغلانی حیران و پریشان ہو کر بولیں "اے حضور، یہ آپ کیا فرما رہی ہیں؟"

"میں ٹھیک ہی کہہ رہی ہوں۔" حضور بیگم اپنی بات پر زور دیتے ہوئے بولیں۔ ان کے لہجے سے بے زاری اور پریشانی ہویدا تھی۔ "تم کو کیا خبر میں کس اُلجھن میں مُبتلا ہُوں۔"

"سرکار کچھ کھل کر بتائیں تو اس اُلجھن کا تدارک کرنے کی کوشش کی جائے۔" مغلانی نے کرید کر پُوچھا۔ "بظاہر تو شام سے ایک ہی پریشانی نے جان عذاب میں ڈال رکھی ہے۔" انہوں نے طلعت آرا کے بارے میں کھل کر اظہار نہ کیا۔ خدشہ تھا کہ حضور بیگم کے دل کو شدید ٹھیس پہنچے گی۔ وہ بیٹی کے غم میں اندر ہی اندر سلگ رہی تھیں۔ اس کا ذکر کرتے کرتے آنکھوں کے آبگینے چھلک اُٹھتے۔ روتے روتے پپوٹے سُوج گئے تھے۔ رہ رہ کے دل سے ہُوک اُٹھتی تھی۔ مغلانی نے جھجکتے ہوئے معلوم کرنا چاہا۔ "سرکار! کیا کوئی نئی اُلجھن لاحق ہو گئی؟"

"تم سے اپنی کیا کیا پریشانی بیان کروں۔" حضور بیگم نے بُجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "مختار الدولہ کی بھاوج قمر جہاں کو تم جانتی ہی ہو۔"

"اے سرکار! کیوں نہیں جانتی ان کو۔" مغلانی نے نہایت مستعدی سے جواب دیا۔ "ایک زمانے میں تو ان کا خاصا آنا جانا تھا۔ ادھر نا معلوم کیوں جھ

سات مہینے سے نہیں آئیں۔" وہ لمحہ بھر کے لئے خاموش رہیں۔ پھر دبی زبان سے اپنی بات کی تصدیق کرنا چاہی۔" آپ انھی قمر جہاں بیگم کا ذکر فرما رہی ہیں نا۔ جن کے چہرے پر چیچک کے ہلکے ہلکے داغ ہیں۔ کٹرہ بزن بیگ میں رہتی ہیں۔"

"ہاں، میں اُنہی کا ذکر کر رہی تھی۔" حضور بیگم نے تائید کی۔" اُن کی آمدورفت غالباً اس لئے کم ہو گئی کہ وہ کٹرہ بزن بیگ سے اُٹھ کر گھنٹا بیگ کی گڑھیا، اپنے آبائی مکان میں منتقل ہو گئی ہیں۔ گھنٹا بیگ ان کے نانا یا پرنانا تھے۔ صحیح طور پر تو مجھے علم نہیں۔ قمر جہاں سے بھی کبھی پوچھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔"

"سرکار! یہ گھنٹا بیگ بھی عجیب سا نام ہے۔" مغلانی نے حیرت کا اظہار کیا ان کو نہ تو گھنٹا بیگ سے دلچسپی تھی، نہ ان کی گڑھیا سے۔ وہ بات سے بات نکال کر حضور بیگم کا دھیان بٹانا چاہتی تھیں تاکہ ان کا ذرا دل بہل جائے، طلعت آرا کے غم کا بوجھ کچھ ہلکا ہو جائے۔" آپ نے تو ان کے بارے میں بہت کچھ سنا ہو گا۔"

"لو کیوں نہیں سنا، اپنے وقت کے مشہور رئیسوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔" حضور بیگم نے پہلو بدلا۔ کمر کسی قدر اونچی کی اور تکیہ سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گئیں۔" اصلی نام تو ان کا مرزا عنایت علی بیگ تھا۔ خلد آشیانی بادشاہ نصیرالدین حیدر کی فوج میں کمیدان تھے۔ بہادری اور شجاعت میں بڑا نام پیدا کیا۔ قدآور اور قوی ہیکل بھی ایسے تھے کہ گھوڑا بوجھ نہ سنبھال سکتا تھا۔ بادشاہ کو علم ہوا تو انہوں نے سواری کے لئے ہاتھی دے دیا۔" حضور بیگم سنبھل سنبھل کر بولتی رہیں اور مغلانی پوری توجہ سے ان کی باتیں سنتی رہیں۔" مگر وہ جتنے بہادر تھے، شاہ خرچ بھی ایسے غضب کے تھے کہ گھر پہنچتے پہنچتے ہاتھی بک گیا۔ اس کی تمام رقم بھی راستے ہی میں خرچ ہو گئی۔ دوسرے روز اسی ہاتھی پر سوار ہو کر بادشاہ کے حضور پیش ہونا تھا۔ لیکن ہاتھی ہوتا تو جاتے۔ کئی روز دربار سے غیر حاضر رہے۔ آخر دربار میں طلبی ہوئی تو سخت پریشان ہوئے۔"

"پریشانی کی تو بات ہی تھی۔" مغلانی نے اپنے فوری ردعمل کا اظہار کیا۔" مگر

وہ دربار میں حاضر بھی ہُوئے کہ نہیں"؟

"حاضر نہ ہوتے تو شاہی عتاب نازل ہوتا۔" حضور بیگم نے بتایا۔" ہاتھی تو اب رہا نہ تھا۔ ان کے پاس صرف اس کا گھنٹا رہ گیا تھا۔ اسی کو گلے میں ڈالا اور دربار میں پہنچ گئے۔ بادشاہ غصے سے بھرے بیٹھے تھے۔ ان کا یہ حلیہ دیکھا تو سخت حیران ہُوئے۔ ادھر یہ بار بار گردن اس طور ہلاتے تھے کہ گھنٹا ٹن ٹن بولتا تھا درباریوں کے لئے ہنسی ضبط کرنا مشکل ہو گیا۔ بادشاہ کا بھی سارا غصّہ جاتا رہا۔ مسکرا کر درگزر کیا۔ اسی روز سے ان کا نام مرزا گھنٹا بیگ پڑ گیا۔"

گھنٹا بیگ کی وجہ تسمیہ بیان کرتے کرتے حضور بیگم کے ہونٹوں پر بھی ہلکی سی مسکراہٹ ہویدا ہُوئی۔ مغلانی چاہتی بھی یہی تھیں۔ مسکراتے ہوئے بولیں"۔ اے سرکار، گھنٹا بیگ کیا وہ تو پورے گرو گھنٹال تھے"۔ ان کے لہجے میں کسی قدر بے تکلفی پیدا ہو گئی"۔ ان کی یادگار تو گھنٹہ گھر کی صورت میں ہونی چاہیئے تھی۔ یہ گڑھیا کیسے مشہور ہو گئی"۔

" میں نے تم کو بتایا تھا نا کہ مرزا گھنٹا بیگ بڑے شاہ خرچ تھے۔ پیسہ ہاتھ میں نہ ٹکتا تھا۔" حضور بیگم نے مطلع کیا"۔ آخر یہ فضول خرچی رنگ لائی بڑھاپے میں یہ حال تھا کہ جو کچھ پاس تھا، بیچ کھوچ کر کھا گئے۔ نہ کوئی اثاثہ رہا نہ جائیداد گھر کے سامنے ایک وسیع میدان تھا جو بکنے سے رہ گیا تھا۔ اس کی مٹی چکنی اور لیس دار تھی۔ مٹی کے کھلونوں اور برتنوں کے لئے نہایت عمدہ تھی۔ گھنٹا بیگ نے اسی کو کسگروں اور کمہاروں کے ہاتھ بیچنا شروع کر دیا۔ زمین کھود کر اتنی زیادہ مٹی نکال لی گئی کہ گہری کھائی بن گئی۔ برسات میں بارش کا پانی اس طرح اس میں بھر جاتا کہ پانی ہی پانی نظر آتا۔ ہاتھی ڈباؤ گہرائی ہو نی۔ آگے چل کر یہی گھنٹا بیگ کی گڑھیا کے نام سے مشہور ہو گئی"۔

" حضرت عباس کی درگاہ کے کہیں قریب ہی تو گھنٹا بیگ کی گڑھیا ہے"۔ مغلانی نے قیاس آرائی کی۔

"اے بالکل درگاہ کے پیچھے ہے۔" حضور بیگم نے چونک کر مغلانی کو دیکھا۔ "قمر جہاں سے شام کو درگاہ ہی میں تو ملاقات ہوئی تھی۔" ان کے بشرے سے جھنجھلاہٹ ٹپکنے لگی۔ "نہ جانے میں کیا کہہ رہی تھی۔ تم نے گھنا بیگ اور ان کی گڑھیا کا ذکر بیچ میں چھیڑ دیا۔ ویسے بھی اس وقت دماغ کام نہیں کر رہا۔ باتوں میں بہک کر نا معلوم کہاں سے کہاں نکل گئی۔"

"آپ قمر جہاں بیگم کے بارے ہی میں کچھ فرما رہی تھیں۔" مغلانی نے نرم لہجے میں حضور بیگم کو یاد دلایا اور ان کو فوراً یاد بھی آگیا۔ "ہاں، خوب یاد آیا۔" حضور بیگم کا لہجہ سنجیدہ ہو گیا۔ "وہ کل دن ڈھلے یہاں آنے کو کہتی تھیں۔"

"سرکار اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟" مغلانی نے نہایت اطمینان سے اظہار خیال کیا۔ "وہ شوق سے تشریف لائیں۔"

"بھئی حد ہو گئی۔ بی مغلانی تم اب بالکل سٹھیا گئی ہو۔" حضور بیگم تلملا کر بولیں "اے لو، اس میں پریشانی کی کوئی بات نہیں، قمر جہاں خود ہی کیا کم ہیں۔ بات کی کھال نکالتی ہیں ساتھ میں آفت کی پرکالا ان کی بیٹی، رفیقہ بھی ہوگی۔ وہ ایسی تیز اور طرّار لڑکی ہے کہ روکے سے بھی نہ رُکے گی۔ سیدھی طلعت آرا کے کمرے میں پہنچے گی۔" ان کا چہرہ اچانک بجھ گیا۔ "میں طلعت آرا کو کہاں سے لا کر پیش کروں گی؟" انہوں نے تڑپ کر کہا۔ "ہائے! طلعت آرا یہ تم نے کیا کر دیا۔ کوئی پوچھے گا تو میں کیا بتاؤں گی؟"

حضور بیگم ایک بار پھر حسرت کا مرقّع اور عبرت کی تصویر بن گئیں۔

مگر مغلانی نے خود کو سنبھالا۔ حضور بیگم کو تسلی دی۔ سنبھلے ہوئے لہجے میں بولیں "سرکار! اس قدر پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔ قمر جہاں یا کوئی بھی چھوٹی سرکار کے بارے میں پوچھے تو کہہ دیجئے گا کہ خالہ زاد بہن خورشید جہاں بیگم کے پاس گئی ہیں۔"

"اے لو، سب کو پتہ ہے کہ میں اسے کہیں اکیلا نہیں چھوڑتی۔" حضور بیگم

کی پریشانی کم نہ ہوئی۔

مغلانی بدستور مطمئن نظر آ رہی نہیں۔ کہنے لگیں "سرکار، آپ نے کوئی قسم تو نہیں کھا رکھی ہے کہ چھوٹی سرکار کو کہیں اکیلا نہیں چھوڑیں گی۔ پہلے کبھی اکیلا نہ چھوڑا تھا، اب چھوڑ دیا۔" انہوں نے فوراً پینترا بدلا۔ "اگر آپ کو یہ عذر منظور نہیں تو دن نکلتے ہی کسی نوکر چاکر کو قمر جہاں بیگم کی طرف بھیج کر یہ کہلوا دیجئے گا کہ آپ کو کسی عزیز، رشتہ دار کے گھر جانا ہے لہٰذا وہ آج کے بجائے کسی دوسرے روز تشریف لائیں۔"

"میں کس کس سے یہ بہانے بناتی رہوں گی۔" حضور بیگم کو اطمینان نصیب نہ ہوا۔ ان کی پریشانی برقرار رہی۔ "اور کب تک ایسے بہانے بناتی رہوں گی۔"

"سرکار! چند روز کی تو بات ہی ہے۔ پھر سب کچھ معلوم ہو جائے گا" مغلانی نے دل جوئی کی۔ ایک بار پھر انہوں نے حضور بیگم کو اطمینان دلانے کی کوشش کی۔ "یہ پریشانی زیادہ عرصہ نہ رہے گی۔ کوئی نہ کوئی بہتری کی سبیل پیدا ہو گی اور جلد ہی پیدا ہو گی۔"

"تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ وہ واپس آجائے گی۔" حضور بیگم نے بے قرار ہو کر ٹھنڈی سانس بھری۔ دل گرفتہ ہو کر بولیں۔ "نہیں، بی مغلانی، اب وہ واپس نہیں آئے گی۔" ان کا چہرہ کنول کی روشنی میں مرجھا کر زرد پڑ گیا۔ "میری اتا کہا کرتی تھیں۔ خدا کسی پر جنوں کا سایہ نہ ڈالے۔ زندگی بھر پیچھا نہیں چھوڑتے۔ جسے اپنے ساتھ لے جاتے ہیں، کبھی واپس آنے نہیں دیتے۔ قیدی بنا کر ڈال دیتے ہیں۔" یہ کہتے کہتے ان کی آواز بھرا گئی۔ "نہ جانے میری بچی پر کیا افتاد پڑی۔ کہاں گئی؟ کیسے گئی؟ مجھے کچھ بھی خبر نہیں۔"

"اے سرکار! یہ آپ کو کیا ہو گیا ہے۔" مغلانی نے فوراً ٹوکا۔ "کیسی بدشگونی کی باتیں کر رہی ہیں۔ خود کو سنبھالئے ہمت سے کام لیجئے۔"

حضور بیگم کچھ نہ بولیں۔ ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگ گئیں۔ مغلانی تسلی

دینے لگیں۔" سرکار اُلٹی سیدھی باتیں سوچ سوچ کر خواہ مخواہ خود کو پریشانی میں مبتلا نہ کریں"۔ انہوں نے قدرے تامّل کیا۔ پھر رسان سے بولیں۔" اب آپ سونے کی کوشش کریں۔ ساری رات جاگتی رہی ہیں۔ آپ کو آرام کی شدید ضرورت ہے"۔ مغلانی نے خاصدان اٹھایا۔ سرپوش علٰحدہ کیا اور خاصدان حضور بیگم کے سامنے پیش کیا۔" لیجئے، ایک پان تو مُنہ میں ڈالیے۔ طبیعت کو ذرا تسکین ملے گی"۔

حضور بیگم بدستور خاموش رہیں۔ البتہ خاصدان سے ایک گلوری اُٹھا کر مُنہ میں رکھ لی۔

مغلانی نے اصرار کیا۔" سرکار، اب آپ آنکھیں بند کریں اور سونے کی کوشش کریں"۔ ان کے لہجے میں محبّت اور شفقت رچی ہوئی تھی۔

" کوشش تو کر رہی ہوں مگر کیا کروں نیند ہی نہیں آرہی"۔ حضور بیگم نے اپنی مجبوری بیان کی۔ چند لمحے آنکھیں بند کیے لیٹی رہیں اور گہری گہری سانس بھرتی رہیں مگر قرار نہ آیا۔ آنکھیں کھول دیں۔ مُڑ کر مغلانی کو دیکھا۔ بجھے ہوئے لہجے میں بولیں۔" تم نے بھی تو ساری رات آنکھوں میں کاٹ دی۔ جاؤ تم بھی تھوڑی دیر آرام کر لو"۔

لیکن مغلانی ان کو تنہا چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوئیں۔ کہنے لگیں۔" سرکار، آپ میری فکر نہ کریں۔ اس وقت تو مجھ سے زیادہ آپ کو آرام کی ضرورت ہے"۔

" تم کہتی ہو تو میں سونے کی کوشش کرتی ہوں"۔ حضور بیگم نے مغلانی کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔" مگر تم کو بھی اب آرام کی ضرورت ہے۔ ویسے بھی اب تم کو جانا چاہیئے۔ نجّو اکیلی ہے گھبراتی ہو گی"۔

نجّو کا نام سُنتے ہی مغلانی اچانک پریشان ہو گئیں۔ انہوں نے دبی زبان سے اپنی رضامندی کا اظہار بھی کر دیا۔" سرکار آپ کا اصرار ہے تو چلی جاتی ہوں نجّو تنہائی میں واقعی پریشان اور خوفزدہ ہو گی۔ ذری اس کو دیکھ آؤں۔ تسلی تشفی دے دُوں، پھر واپس آجاؤں گی"۔

"ٹھیک کہہ رہی ہو، وہ ڈری سہمی پڑی ہوگی۔ ابھی اس کا سن ہی کیا ہے۔ بچی ہی تو ہے۔" حضور بیگم کے لہجے میں جذبۂ ہمدردی تھا۔ "واپس آنے کی ضرورت نہیں جاکر اپنی کوٹھری میں سو جاؤ۔" انھوں نے ایک بار پھر ٹھنڈی سانس بھری۔ "مجھے بھی نیند آ ہی جائے گی۔" انھوں نے قدرے تامّل کیا۔ مڑکر مغلانی کی جانب دیکھا۔ پھر تحکمانہ لہجے میں بولیں۔ "جاؤ، اب تم کو انتظار کس کا ہے؟"

"مگر سرکار، میں آپ کو تنہا چھوڑ کر تو ہرگز نہ جاؤں گی۔" مغلانی نے خیر خواہی جتائی۔ "گل بدن بغلی صحنچی میں سو رہی ہے۔ اُسے آپ کے پاس بھیج دوں گی۔ اس کی موجودگی سے ڈھارس ہو جائے گی۔ وہ آپ کی مزاج شناس ہے پرانی خواص ہے۔ صاف ستھری بھی رہتی ہے۔"

"صاف ستھری تو خیر وہ رہتی ہی ہے۔ لیکن یہ دیکھ لینا کہ اس کا بستر بھی صاف ستھرا ہے کہ نہیں۔"

مغلانی کو ان کی نفاست اور نازک مزاجی کا بخوبی علم تھا۔ انھوں نے مسکرا کر حضور بیگم کو باور کرایا۔ "اے سرکار، یہ کیسے ممکن ہے کہ مجھے آپ کی طبیعت کا اندازہ نہ ہو۔ اس ڈیوڑھی پر خدمت کرتے ساری زندگی گزر گئی۔ سرکار کا حکم سر آنکھوں پر۔ جیسا حضور نے فرمایا وہی ہوگا۔" یہ کہتی ہوئی وہ تخت سے نیچے اتریں۔ رضائی احتیاط سے جسم کے گرد لپیٹی۔ بڑھ کر دروازہ کھولا اور چپ چاپ کمرے کے باہر چلی گئیں۔

حضور بیگم نے ان کو روکا نہ ٹوکا۔ بستر پر خاموش لیٹی دروازے کی سمت تکتی رہیں۔ کنول کی روشنی میں ان کا چہرہ سورج مکھی کے پھول کی مانند گہرا زرد نظر آرہا تھا۔

(۱۲)

ہوا اب اور سرد ہوگئی تھی اور سرسراتی ہوئی چل رہی تھی۔

مغلانی سردی سے کپکپاتی ہوئی سنسان غلام گردش سے گذر رہی تھیں ہر طرف ویرانی برس رہی تھی غلام گردش میں اندھیرا بھی تھا۔ یہ غلام گردش نواب تقی مرحوم کی خواب گاہ کے عین پشت پر تھی خواب گاہ کا عقبی دروازہ اسی غلام گردش میں کھلتا تھا۔ ایک زمانہ تھا جب نواب صاحب رات کے سناٹے میں عقبی دروازہ خاموشی سے کھولتے اور چوکنا نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے غلام گردش سے گزر کر مغلانی کی کوٹھری کے دروازے پر پہنچ جاتے۔

مغلانی نے چلتے چلتے خواب گاہ کے عقبی دروازے پر نظر ڈالی۔ دروازہ بند تھا کنڈی لگی ہوئی تھی اور اس میں قفل پڑا تھا۔ کتنی ہی بھولی بسری یادیں تازہ ہوگئیں وہ لمحہ بھر کے لئے دروازے کے سامنے ٹھٹکیں اور پھر آگے بڑھ گئیں۔ چلتے چلتے ان کو عقب میں ہلکی ہلکی چاپ سنائی دی۔ ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی ان کے پیچھے پیچھے چل رہا ہے۔ خوف سے انہوں نے جھرجھری لی مگر پلٹ کر پشت کی جانب نہ دیکھا۔

انہوں نے لڑکھڑاتے قدموں سے غلام گردش عبور کی اور اپنی کوٹھری کے سامنے پہنچ گئیں۔ دستک دینے کے لئے جلدی سے ہاتھ آگے بڑھایا۔ دروازے پر رکھا لیکن دروازہ اندر سے بند نہ تھا۔ ہاتھ رکھتے ہی کھل گیا۔ وہ حیران و پریشان کھڑی ہوئی دروازے کو تکتی رہیں مگر وہ زیادہ دیر باہر نہ کھڑی رہ سکیں۔ گھبرائی ہوئی اندر داخل ہوئیں اور کواڑ بند کر کے کنڈی چڑھا دی۔

کوٹھری میں گھپ اندھیرا تھا۔ وہ دہلیز کے پاس سہمی ہوئی کھڑی تھیں اور گہری گہری سانس بھر کر ہانپ رہی تھیں۔ جب ذرا قرار آیا اور ہوش و حواس بجا ہوئے تو انہوں نے نجّو کو پکارا۔ "نجّو، اے نجّو" مگر کوئی جواب نہ ملا کمرے میں گہرا سکوت تھا۔

مغلانی جھنجلا کر بڑبڑاتے لگی۔ "بیٹی تمہاری اس نگوڑی نیند کو آگ لگے کسی بات کا ذرا بھی ہوش نہیں۔ اتنا بھی نہ ہوا کہ دروازے کی کنڈی ہی لگا دیتیں۔"

وہ سنبھل سنبھل کر آگے بڑھیں۔ بڑبڑاتی بھی رہیں۔ "یہ تم سے چراغ بجھانے کو کس نے کہا تھا۔ ہاتھ کو ہاتھ سجائی نہیں دیتا۔" وہ اٹکل سے اس طاق کی جانب چلیں جس میں چراغ کے ساتھ دیا سلائی بھی موجود رہتی تھی۔ •

آگے بڑھتے ہوئے اس دفعہ مغلانی نے نجو کو زیادہ اونچی آواز سے پکارا "نجّو، اے نجّو۔ بھئی اُٹھ بھی جاؤ۔ یہ بتاؤ دیا سلائی طاق ہی میں رکھی ہے نا؟" مگر نہ نجّو بیدار ہوئی نہ اس نے کوئی جواب دیا۔ کوٹھری میں بدستور گہری خاموشی چھائی رہی۔

مغلانی اندھیرے میں چارپائی سے ٹکرائیں، لڑکھڑائیں اور منہ کے بل فرش پر گرتے گرتے بچیں، مگر گھٹنے میں ایسی چوٹ آئی کہ بلبلا اُٹھیں۔ جھنّا کر نجّو پر دھاڑیں۔ "اے خدا سمجھے تیری اس نیند کو۔ تن بدن کا ہوش نہیں۔ میں کتیا کی طرح برابر بھونک رہی ہوں اور تیرے کانوں پر جوں بھی نہیں رینگی۔ اس بار بھی نجّو نہ بولی۔

مغلانی بڑبڑاتی ہوئی اب طاق کے قریب پہنچ گئی تھیں۔ انہوں نے ہاتھ بڑھایا۔ طاق میں اِدھر اُدھر ٹٹولا۔ آخر ان کے ہاتھ میں دیا سلائی آگئی مغلانی نے ایک تیلی نکال کر جلائی اور طاق میں رکھے ہوئے چراغ کو روشن کر دیا۔ انہوں نے اطمینان کی سانس لی۔ پلٹیں اور مڑ کر نجّو کی چارپائی کی جانب دیکھا تو دل دھک سے رہ گیا۔ نجّو وہاں موجود نہ تھی۔ اس کا بستر خالی تھا۔ کوٹھری بھائیں بھائیں کر رہی تھی۔

کہنے کو تو یہ کوٹھری ہی تھی، مگر کسی بڑے کمرے کی طرح کشادہ تھی البتہ آمد و رفت کے لئے دروازہ ایک ہی تھا۔ نہ کوئی کھڑکی تھی، نہ روشندان تھا۔ کسی زمانے میں یہ توشہ خانہ تھا۔ مگر نواب تقی مرحوم کی ہدایت پر اس میں مغلانی کی رہائش کا بندوبست کیا گیا تھا۔ اس کا انتخاب بھی نواب تقی ہی نے کیا تھا خوابگاہ سے قریب ہونے کے باعث وہ شب کے سناٹے میں جب جی چاہتا چوری چھپے

مغلانی کے پاس پہنچ جاتے اور اکثر رات بھر رہتے۔

اس کوٹھری کے در و دیوار سے، گوشے گوشے سے نواب تقی کی یادیں وابستہ تھیں۔ اس کی فضا میں ان کے جسم کی خوشبو بسی ہوئی تھی۔

مگر اس وقت مغلانی کو نواب تقی کے بجائے رہ رہ کر نجّو کا خیال ستا رہا تھا۔ ان کے چہرے پر ویرانی چھائی تھی وہ بجھی بجھی نظروں سے کبھی اپنی چارپائی کو دیکھتیں اور کبھی اس کے قریب پڑی ہوئی نجّو کی چارپائی کو۔ اس کا بستر اجاڑ تھا۔ لحاف بے ترتیبی سے الٹا ہوا تھا۔ چادر پر جگہ جگہ شکنیں تھیں اور تکیہ سرک کر ترچھا ہو گیا تھا۔

مغلانی طاق کے قریب دم بخود کھڑی تھیں۔ ان کی پشت پر چراغ روشن تھا۔ چراغ کی لو تھرتھراتی تو سامنے دیوار پر مغلانی کا بھاری بھرکم سایہ اس طرح جھومتا کہ اسے دیکھ کر خوف معلوم ہوتا۔ مغلانی کچھ دیر تو حیرت اور دکھ سے نجّو کے خالی بستر کو تکتی رہیں پھر قدم اس طرح ڈگمگانے لگے کہ ان کے لئے کھڑا رہنا ممکن نہ رہا۔ وہ آگے بڑھیں اور بے حال ہو کر نجّو ہی کے بستر پر جا کر بیٹھ گئیں۔

مگر چین نہ آیا۔ چاہا کہ اٹھ کر باہر جائیں۔ نجّو کے بارے میں پوچھ گچھ کریں لیکن اتنی رات گئے وہ کس کے پاس جاتیں۔ کون انہیں نجّو کے بارے میں بتاتا سب دروازے بند کئے اپنے اپنے بستروں پر بے خبر سو رہے تھے۔ ہر سو ویرانی برس رہی تھی۔

انہوں نے پریشان ہو کر حضور بیگم کے پاس جانے کا ارادہ کیا۔ مگر وہ بھی ان کی کیا مدد کر سکتی تھیں۔ پہلے ہی کیا کم خوفزدہ اور سہمی ہوئی تھیں۔ اور گھبرا جاتیں۔ وہ کچھ طے نہ کر پائی تھیں کہ کیا کریں؟ کہاں جائیں؟ کس کے پاس جائیں۔ یکایک کوٹھری کے باہر آہٹ ابھری۔ مغلانی نے چونک کر دروازے کی جانب دیکھا۔ غور کرنے پر اندازہ ہوا کہ کوئی گہری خاموشی میں سنبھل سنبھل کر چل

رہا ہے۔ سنسان رات میں قدموں کی آہٹ صاف سنائی دے رہی تھی اور رفتہ رفتہ قریب آتی جا رہی تھی۔ آنے والا ادھر ہی آ رہا تھا۔

کوٹھری کے عین سامنے پہنچ کر چاپ ختم ہو گئی۔ کوئی باہر کھڑا تھا۔ مغلانی کوٹھری کے اندر دم بخود بیٹھی تھیں۔ گردن اٹھائے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دروازے کو تک رہی تھیں۔ چند لمحے پراسرار سکوت طاری رہا۔ پھر کسی نے آہستہ آہستہ دروازے کو تھپ تھپایا۔ مغلانی کو معاً خیال آیا کہیں نجو تو باہر سردی میں نہیں کھڑی ہے۔

☆

مغلانی اُٹھیں۔ دروازے پر پہنچیں۔ کنڈی اتاری اور آہستہ سے دروازے کا ایک پٹ کھولا۔ ہوا کا سرد جھونکا آیا۔ مغلانی کپکپا کر رہ گئیں۔ چراغ کی روشنی کوٹھری کی دہلیز سے گذر کر باہر پھیل گئی۔ مگر نہ کوئی بولا، نہ اندر آیا۔ مغلانی نے گردن بڑھا کر کواڑ کی آڑ سے دیکھا۔ کوئی دیوار کے قریب اس طرح کھڑا تھا کہ گہری تاریکی میں سائے کی مانند دُھندلا دُھندلا نظر آ رہا تھا۔

مغلانی نے قدرے اونچی آواز سے پکارا۔ "نجو۔ اندر کیوں نہیں آتی؟" مغلانی کی آواز ان جانے خوف سے تھرتھرا رہی تھی۔

کوئی اندھیرے سے نکل کر سامنے آ گیا۔

یہ نجو نہیں، ہرمزی تھی۔ مغلانی نے اسے دیکھا تو خوف سے سکتہ طاری ہو گیا۔ آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ہرمزی پہلے ہی کیا کم بھدی اور بد وضع تھی۔ رات کے اندھیرے میں کچھ زیادہ ہی خوف ناک نظر آ رہی تھی۔

ہرمزی نے آگے بڑھتے ہوئے بے نیازی سے کہا۔ "مجھے اندر تو آنے دو۔ تم تو دربان کی طرح راستہ روکے کھڑی ہو۔ ذرا ایک طرف تو ہو۔" وہ مغلانی کے قریب پہنچ گئی۔

مغلانی نے کسی ردِعمل کا اظہار نہ کیا۔ نہایت خاموشی سے ہٹ کر ایک طرف ہو گئیں۔ ہرمزی کوٹھری میں داخل ہوئی اور اطمینان سے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے

بولی۔ "بی مغلانی تم تو مجھے دیکھ کر اس طرح ڈر گئیں جیسے میں کوئی آسیب یا بلا ہوں"۔ اس کے لہجے سے تلخی صاف عیاں تھی۔

مغلانی نے اس تلخی کو محسوس بھی کیا مگر درگزر سے کام لیا۔ دروازہ بند کیا پلٹ کر ہرمزی کو دیکھا۔ حیرت زدہ ہو کر دریافت کیا۔ "اے ہرمزی، تم اس وقت اپنی کوٹھری سے باہر کیسے آگئیں اور آکر اندھیرے میں کھڑی بھی اس طرح ہو گئیں کہ خواہ مخواہ ڈر معلوم ہو"۔ وہ اپنی چارپائی کی جانب بڑھیں اور بستر پر بیٹھ گئیں "غضب کی سردی پڑ رہی ہے، تم کو سردی بھی نہ لگی۔ اس جاڑے پالے میں نکل آئیں"۔ مغلانی نے لحاف اُٹھا کر جسم پر ڈال لیا۔ "رات ختم ہو رہی ہے اور تم اب تک سوئیں بھی نہیں"۔

"مگر تم اب تک کیوں جاگ رہی ہو"؟

"اے نیند کیسے آئے۔ دل پر تو آرے چل رہے ہیں"۔ مغلانی نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "چھوٹی سرکار کی پریشانی ہی کیا کم تھی کہ نجّو کی فکر لگ گئی"۔

"کیا ہو گیا اسے"؟ ہرمزی نے حیرت کا اظہار کیا۔

"میں تو بڑی سرکار کے پاس تھی"۔ مغلانی نے بتایا۔ "ذرا دیر پہلے واپس آئی تو کیا دیکھتی ہوں کہ کوٹھری کا دروازہ کھلا ہے۔ چراغ گل ہے اور نجّو کا کہیں پتہ نہیں"۔ بات کہتے کہتے یکایک ان کی آواز بھرا گئی۔ "نہ جانے میری بچّی کہاں ہے؟ کس عالم میں ہے؟ میری تو عقل بھی کام نہیں کرتی۔ یا اللہ، میں کیا کروں"؟

مغلانی کی آنکھیں بھر آئیں۔ دل گرفتہ ہو کر رونے لگیں۔

"ارے ارے تم تو رونے بیٹھ گئیں"۔ ہرمزی نے گھبرا کر کہا۔ لمحہ بھر کے لئے خاموش رہی۔ پھر اس کا لہجہ تیکھا ہو گیا۔ "رات بھر تو بڑی سرکار کے کمرے میں بیٹھی باتیں ملکاتی رہیں۔ اس وقت ذرا خیال نہ آیا کہ اکیلے میں اس پر کیا بیت رہی ہو گی"۔ اس نے نظر بھر کر مغلانی کو دیکھا۔ "ادھر یہ حال ہے کہ جسے دیکھو جنوں کے خوف سے سہما ہُوا، دروازے بند، ہونٹوں پر تالے پڑے ہوئے۔ نہ کوئی بول رہا ہے۔

نہ بات کر رہا ہے۔ ہر طرف ایسا ہُو کا عالم کہ گھر نہ ہُوا قبرستان ہو گیا"۔

"تب تو اُسے بھی کوٹھری ہی میں ہونا چاہیئے تھا"۔

"کب تک کوٹھری میں اکیلی بیٹھی رہتی۔ بڑوں بڑوں کا تو پتّا پانی ہو رہا ہے۔ اور نجّو تو سمجھو ابھی بچّی ہے۔ سن ہی کیا ہے اس کا۔ ابھی کل کی بات ہے۔ اتنی سی آئی تھی بارہ دری میں"۔ ہرمزی نے مغلانی کو بتایا۔"میں تو دروازہ بند کئے بے خبر سو رہی تھی۔ اچانک دروازے پر دھڑ دھڑ ہوئی۔ گھبرا کر اٹھی دروازہ کھولا۔ دیکھا، نجّو سردی سے کھڑی کپکپا رہی ہے۔ خوف کے مارے ہوش ٹھکانے نہیں"۔

"تو۔ یُوں کہو نجّو تمہارے پاس ہے"۔

"میرے پاس نہ ہو گی تو کہاں ہو گی"۔ ہرمزی کا لہجہ بدستور تیکھا تھا۔ کیا میں اسے اپنی کوٹھری میں نہ آنے دیتی"؟ اس نے گھور کر مُغلانی کو دیکھا۔ وہ زبان کی جتنی کڑوی تھی دل کی اتنی ہی اچھی تھی۔ کہنے لگی۔"جا کر دیکھو۔ کیسے اطمینان سے پڑی سو رہی ہے"۔

"وہ تو اطمینان سے پڑی سو رہی ہے اور یہاں جان پر بن گئی"۔ مغلانی کے چہرے پر چھایا ہُوا دُکھ کا غبار مٹنے لگا۔ انہوں نے اطمینان کی سانس لی۔

"تم نے سوچا ہو گا، چھوٹی سرکار کی طرح نجّو کو بھی جنّات اُٹھا کر ساتھ لے گئے"۔ ہرمزی کے ہونٹوں پر زہر خند تھا۔

"اے ایسا خیال دل میں آیا بھی ہو گا تو اس میں اچنبھے کی کون سی بات ہے"۔ مغلانی نے کُھل کر اس کی تردید نہ کی۔"چھوٹی سرکار کو بھی تو آخر لے ہی گئے نا"۔

"اے کون لے گئے"؟ ہرمزی نے تنک کر کہا۔

"وہی اُوپر والے"۔ مغلانی نے چھت کی جانب ہاتھ اُٹھا کر اشارہ کیا۔"بھئی رات کے وقت میں نام نہیں لوں گی۔ ڈر معلوم ہوتا ہے"۔

"تم نے دیکھا اپنی آنکھوں سے لے جاتے ہُوئے"؟ ہرمزی نے پوچھا۔

"دیکھا تو کسی نے بھی نہیں۔" مغلانی نے جواب دیا۔ "نجیبن کو یہی معلوم کرنے تو اوپر بھیجا گیا تھا۔ دو ماما ئیں اور بھی اس کے ساتھ تھیں۔ مگر نجیبن پر زینے میں پہنچ کر جو کچھ بیتی اسے کون نہیں جانتا۔"

"اے تم بھی کس لبڑ خندی کی باتوں میں آگئیں۔ میاں دلّو مل گیا تو وہ شیرنی بن گئی۔" ہرمزی نے منہ بگاڑ کر حقارت سے کہا۔ "بلّی کی آنکھوں سے تو دم نکلتا ہے۔ وہ بی بی چلی تھیں جنّاتوں کا مقابلہ کرنے۔ چھت پر پہنچنے کی نوبت ہی نہ آئی۔ راستے میں ہی ایسے اوسان خطا ہوئے کہ تینوں ہی دھڑ دھڑ کرتی ہوئی بھاگیں۔ واپس آکر جو جی میں آیا بتا دیا۔ سب نے یقین بھی کر لیا۔" اس کا لہجہ اور تلخ ہو گیا۔ "تو یہ کہو بہن کہاں کے جنّات، کیسے جنّات؟"

"اے ہے تم کیسی باتیں کر رہی ہو۔" مغلانی نے حیران و پریشان ہو کر اپنے رد عمل کا اظہار کیا۔ "چھوٹی سرکار اوپر نہیں گئیں تو کہاں گئیں۔ گھر کا چپّا چپّا چھان ڈالا۔"

"بارہ دری سے بھی تو جا سکتی ہیں۔"

"اے کدھر سے باہر جا سکتی ہیں؟" مغلانی نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر پوچھا۔

"ڈیوڑھی سے باہر نہیں جا سکتیں؟"

"لو اور سنو۔ ڈیوڑھی سے کیسے باہر جا سکتی ہیں؟" مغلانی بدستور حیرت زدہ تھیں۔ "تم بھی کمال کرتی ہو۔ پھاٹک پر ہر وقت تو دربان موجود رہتے ہیں۔ ان کے ہوتے ہوئے کون چار دیواری سے باہر قدم نکال سکتا ہے۔"

"تم نے نہیں دیکھا کہ ڈیوڑھی کے سامنے کی چار دیواری ٹوٹی ہوئی ہے۔ جس کا جی چاہے آسانی سے باہر جا سکتا ہے۔" ہرمزی اپنی بات پر اڑی رہی۔ "دربانوں کے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہو۔ کتنی ہی بار تو میں اس ٹوٹی دیوار کو لانگھ کر چہار دیواری سے باہر جا چکی ہوں اور بھی جس کا جی چاہتا ہے ادھر ہی سے باہر

چلا جاتا ہے"۔

"اے بوا. تم کہنا کیا چاہتی ہو"؟ مغلانی ایک دم بھڑک اٹھیں۔ "تمہارا مطلب ہے کہ چھوٹی سرکار کسی کے ساتھ بھاگ گئیں"۔ ان کا لہجہ ایک دم مدھم پڑ گیا۔ "ذرا سوچ سمجھ کر منہ سے بات نکالا کرو۔ بڑی سرکار کے کان میں بھنک بھی پڑ گئی تو قیامت آجائے گی"۔

"اے لو، میں نے یہ کب کہا، تم تو خواہ مخواہ بات کا بتنگڑ بنانے بیٹھ گئیں"۔ ہرمزی ڈر گئی۔ گھبرا کر فوراً صفائی پیش کرنے لگی"۔ میں صرف اتنا بتا رہی تھی کہ کس کس راستے سے باہر نکلا جا سکتا ہے"۔

"تمہارا مطلب خواہ کچھ ہی ہو۔ مجھے یہ بتاؤ کہ چھوٹی سرکار، آخر گئیں تو کہاں گئیں؟"

"مجھے کیا خبر، یہ تو تم کو معلوم ہوگا یا بڑی سرکار کو"۔ ہرمزی نے بات کا رُخ بدلنے کی کوشش کی"۔ میں تو سو باتوں کی ایک بات یہ جانتی ہوں کہ نفیسہ بیگم کے بڑے صاحبزادے علی رضا سے چھوٹی سرکار کا رشتہ ہو جاتا تو آج یہ دن دیکھنا کیوں پڑتا۔ گھر کا لڑکا تھا۔ پھوپھی کا بیٹا، نہ پوچھ گچھ کرنے کی ضرورت نہ تحقیق کی۔ صورت شکل کا اچھا، بات چیت میں، مزاج میں، کس بات میں کمی تھی" اُس نے جھک کر سرگوشی کی"۔ دونوں ایک دوسرے کو چاہتے بھی تھے"۔

"اے نہیں، ایسا کیسے ہو سکتا ہے"۔ مغلانی کو یقین نہ آیا۔

"تم کو کیا خبر، کیا کیا ہوتا رہا۔ تم تو اللہ میاں کے گول گنبد میں بیٹھی رہتی ہو"۔ ہرمزی نے مسکرا کر مغلانی کو دیکھا"۔ ویسے کچھ نہ کچھ تو تم کو بھی پتہ ہوگا"۔

"اے قسم لے لو، مجھے کچھ بھی خبر ہو"۔ مغلانی نے انکار میں گردن ہلائی ساتھ ہی دلچسپی اور تجسس کا بھی اظہار کیا"۔ تم کو کیسے معلوم ہوا"؟

"اے مجھے کیا نہیں معلوم"۔ ہرمزی نے بتایا"۔ علی رضا ایسے ہی تو یہاں کے چکر نہیں کاٹا کرتے تھے۔ جب چھوٹی سرکار کا ان سے پردہ کرانا شروع کر

دیا گیا تب بھی دن دن بھر دیوان خانے میں اپنے ماموں جان کے پاس بیٹھے رہتے۔ کسی نہ کسی بہانے زنان خانے میں بھی آجاتے۔ روزانہ ممانی کو آداب کرنے، مزاج پوچھنے تو ضرور ہی آتے۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے زیادہ سے زیادہ دیر ٹھہرنے کی کوشش کرتے اور جب وہ اندر آتے تو سنا ہے، چھوٹی سرکار اپنے کمرے کے دروازے سے لگی کھڑی ہوتیں۔"

"یہ سب کچھ ہوتا رہا اور مجھے کانوں کان خبر نہ ہوئی۔" مغلانی نے حیرت کا اظہار کیا۔

"تم کو تو یہ بھی خبر نہ ہوگی کہ علی رضا کبھی آنسوؤں کے قطرے ٹپکا کر کبھی خون سے لکھ کر خط بھیجتے رہے۔ ادھر ان کی فرمائش پر چھوٹی سرکار لفافے میں اپنے بالوں کی لٹ کاٹ کر بھیجتیں، کبھی پسینہ پونچھ کر اپنا رومال بھیجتیں" ہرمزی مسکرا مسکرا کر بتاتی رہی۔ مغلانی دلچسپی اور انہماک سے ایک ایک بات سنتی رہیں۔ "نہ پوچھو کس طرح چوری چھپے یہ رقعے پرچے آتے جاتے رہے اور اس میں کیا کیا لکھا ہوتا۔"

"تم کو ان کے بارے میں کیسے معلوم ہوا؟" مغلانی نے مشتبہ نظروں سے ہرمزی کو دیکھا، دبی زبان سے پوچھا۔ "ایسے رقعے پرچے کہیں تم تو اِدھر اُدھر نہیں پہنچاتی رہیں؟"

"اے توبہ کرو۔ کہیں میرا نام بھی نہ لے دینا۔ بڑی سرکار قیامت ڈھا دیں گی۔ یہ کام تو نفیسہ بیگم کی مہری حلیمن کے ذریعے ہوتا تھا۔ یاد کرو ایک زمانے میں وہ بارہ دری کے کتنے چکر کاٹا کرتی تھی۔ جب دیکھو کسی نہ کسی بہانے موجود ہوتی۔" اس کا لہجہ دفعتہً بہت مدھم ہوگیا۔ "مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ بڑی سرکار کو کچھ شبہ ہو گیا تھا۔ یا کسی نے مخبری کر دی ہوگی۔ ایسی باتیں کہاں چھپی رہتی ہیں۔ تب ہی تو سرکار نے حلیمن کے آنے جانے پر پابندی لگا دی تھی دربان ڈیوڑھی ہی پر روک لیتے۔ یہ تو تم کو بھی خبر ہوگی اور جب اس کی خبر

ہو گی تو اور بھی بہت کچھ معلوم ہو گا۔"

"سچ کہہ رہی ہوں مجھے کچھ معلوم نہیں۔" مغلانی نے ہرمزی کا شبہ دور کرنے کے لئے وضاحت کی۔" مجھے تو اس معاملہ میں صرف اتنا معلوم ہے کہ جب نفیسہ بیگم اور ان کے میاں نے بہت زور دیا تو بڑے نواب صاحب بھی رشتے کے حق میں قریب قریب رضامند ہو گئے تھے۔ یہ ان کے انتقال سے کچھ ہی عرصہ پہلے کی بات ہے مگر بڑی سرکار کسی طور تیار نہیں تھیں۔ نواب صاحب کے مرنے کے بعد بھی نفیسہ بیگم ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر خاموش نہ بیٹھیں۔ انہوں نے ڈھیٹ بن کر پھر کوشش کی مگر سرکار نے صاف انکار کر دیا اور یہ تم جانتی ہی ہو کہ وہ اپنی ضد کی کس قدر پکّی ہیں۔"

"اسے ضد و د کیا ہے۔ سارا جھگڑا تو اس موئی جائیداد کا ہے۔" ہرمزی نے اظہار خیال کیا۔" بڑی سرکار تو یہ چاہتی ہیں کہ ان کی جائیداد کسی طرح سسرال والوں کے پاس نہ جائے۔" اس نے مڑ کر مغلانی کے چہرے کو بھرپور نظروں سے دیکھا۔" میں کہتی ہوں بیٹی کے ساتھ ورثے میں کسی نہ کسی کو تو ملے ہی گی۔ اچھا تو یہ ہے کہ غیروں کے بجائے گھر کی جائیداد گھر میں رہے۔"

" مگر ایسا ہو کیسے سکتا ہے ؟" مغلانی نے تبصرہ کیا۔" اس کم بخت مقدمہ بازی نے ایسا بِس بو یا ہے کہ دلوں میں ایک دوسرے کے لئے ذرا گنجائش نہیں رہی۔"

"یہ مقدمہ بازی بھی تو اسی نگوڑی جائیداد کے لئے ہو رہی ہے۔" ہرمزی نے کہا۔" بڑے نواب صاحب اسی کا بوجھ سینے پر اٹھائے دنیا سے رخصت ہو گئے۔ جس جائیداد کا جھگڑا تھا وہ تو یہیں رہ گئی وہ اپنے ساتھ قبر میں تو نہیں لے گئے۔ وہ کیا بڑی سرکار بھی اپنے ساتھ نہیں لے جائیں گی۔"

حضور بیگم کے بارے میں ہرمزی کا لہجہ تلخ ہوتا گیا۔ وہ ان سے سخت نالاں معلوم ہوتی تھی۔ حالانکہ مغلانی کی طرح ہرمزی بھی بہت پرانی ملازمہ تھی حضور بیگم اس کے سامنے بیاہ کر آئی تھیں مگر اسے کبھی حضور بیگم کا قُرب نصیب نہ ہوا۔

مزاج کی تیز اور طرّار ہونے کے ساتھ زبان کی بھی پھوہڑ تھی۔ صاف ستھری بھی نہ رہتی تھی۔ مہینوں غسل نہ کرتی، ادھر حضور بیگم کے مزاج میں اس قدر لفاست تھی کہ ایک زمانہ تو ایسا بھی گذرا کہ کوئی ماما لونڈی گندے لباس میں قریب سے گزر جاتی تو فوراً نکسیر پھوٹ جاتی۔ ناک سے اس طرح خون جاری ہوتا کہ کپڑے لت پت ہو جاتے۔ چہرے کا نچلا حصّہ لہو لہان ہو جاتا۔ سر پر دیر تک لوٹے کی ٹونٹی سے ٹھنڈا پانی ڈالا جاتا۔ تب خون بند ہوتا۔ خاندانی طبیب نے طرح طرح کی مفرحِ قلب ادویات دیں اور ایک طویل مدّت تک نہایت توجہ اور پابندی سے علاج معالجہ کیا تو اتنا ہوا کہ گندے لباس کی بدبو یا پسینے کی بساند سے نکسیر پھوٹنے کا سلسلہ بند ہو گیا۔ مگر سر میں شدید درد شروع ہو جاتا۔ چنانچہ ان کی ہر خواص اور پیش خدمت پاک صاف رہتی۔ اجلا لباس پہنتی۔ خوشبو لگاتی اور کان میں ہمیشہ عطر کا پھویا رکھتی۔ اپنی خاص خدمت گاروں کے لئے وہ خود خس اور صندل کا عطر منگوا کر دیتی تھیں۔

ہرمزی پر حضور بیگم نے کبھی اس طرح لطف و کرم نہ فرمایا۔ اُسے دُور ہی دور رکھتیں۔ ویسے اب وہ بوڑھی بھی ہو گئی تھی۔ جی چاہا تو تھوڑا بہت کام کر لیا، ورنہ اس کے لئے تو آرام ہی آرام تھا۔ اس کی ماں قلماقنی تھی۔ مردانہ لباس پہنے، کمر سے تیغہ لگائے، ہر وقت چاق و چوبند رہتی۔ رات کو نہایت مستعدی سے محل سرا کی پہرہ داری کرتی۔ بڑی نڈر اور دلیر تھی۔ ہرمزی کو دلیری اور بے باکی ماں سے ورثے میں ملی تھی۔ اس نے شادی بیاہ بھی نہ کیا۔ ساری زندگی نواب تقی اور ان کے خاندان کی خدمت میں بسر کی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی تمام ہمدردیاں حضور بیگم کے سسرال کے ساتھ تھیں۔

اس وقت بھی وہ کبھی کھلم کھلا اور کبھی دبی زبان سے حضور بیگم کی مخالفت ہی کر رہی تھی۔ مغلانی کچھ دیر تو خاموشی سے اس کی باتیں سنتی رہیں۔ پھر اُکتا کر بولیں "تم نجانے کس کس کا دکھڑا لے کے بیٹھ گئیں۔ مجھے تو رہ رہ کر چھوٹی سرکار

کا غم ستا رہا ہے نہ جانے بیچاری کہاں ہیں؟ کس عالم میں ہیں؟" ان کے چہرے پر افسردگی چھا گئی۔

"فکر نہ کرو وہ جہاں بھی ہوں گی، ٹھیک ہی ہوں گی۔" ہرمزی نے مغلانی کو تسلی دینے کی کوشش کی۔

"تم کو کیا خبر کہ وہ کہاں ہیں اور کیسی ہیں؟" مغلانی نے تیکھی نظروں سے ہرمزی کو دیکھا۔ "مگھم میں بات نہ کرو۔ تم کو معلوم ہو تو صاف صاف بتاؤ۔"

"مجھے اور تو کچھ زیادہ معلوم نہیں مگر اتنا ضرور کہہ سکتی ہوں کہ یہ کچھ اور ہی معاملہ ہے۔" ہرمزی نے بہت مدھم لہجے میں کہا۔ "منہ سے بات نکالتے ڈر لگتا ہے دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔"

"اے کچھ کھل کے بتاؤ۔" مغلانی نے اصرار کیا۔ "اتنا ہی بتادو کہ چھوٹی سرکار کہاں ہیں؟"

"دو چار روز کی تو بات ہی ہے، پھر سب کچھ سامنے آجائے گا۔" ہرمزی کے لہجے سے اطمینان عیاں تھا۔ "میں تو کہتی ہوں جو کچھ ہوا ٹھیک ہی ہوا۔ اب تو وہی ہوگا جو ہونا چاہیئے تھا۔ یہی کام ہنسی خوشی ہو جاتا تو کتنا اچھا تھا۔"

"بھئی تمہاری باتیں اپنی سمجھ میں تو آئی نہیں۔" مغلانی نے قیاس آرائی کی۔ "میں نے تمہاری باتوں سے اندازہ لگایا تو یہی لگا یا کہ چھوٹی سرکار کے معاملے میں علی رضا کا ہاتھ ہے۔"

"میں اپنی زبان سے کچھ نہیں کہتی۔" ہرمزی نے کھل کر بات نہ کی۔ "قسم لے لو جو مجھے کچھ معلوم ہو مگر میں یہ کہہ سکتی ہوں کہ یہ بھید جلدی کھل جائے گا۔ چند روز انتظار کر لو۔"

مغلانی کچھ نہ بولیں سر جھکا کر سوچنے لگیں۔

ہرمزی اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ "اچھا اب تم آرام کرو میں بھی سونے جا رہی ہوں۔" اچانک اُس نے کھانسنا شروع کر دیا۔ جب ذرا قرار آیا تو گویا ہوئی۔

یہ کمبخت کھانسی سونے ہی کب دیتی ہے۔ کبھی کبھی تو ساری رات کھانستے گزر جاتی ہے۔"

"اگر بچہ جاگ رہی ہو تو اسے یہاں بھیج دو۔" مغلانی نے کہا۔ "ویسے میں تو یہی کہوں گی کہ اسے اب واپس بھیج ہی دو۔ آرام سے اپنے بستر پر سو سکے گی۔ ویسے اس کی موجودگی میں تم بھی بے چین رہو گی۔ بھئی سچ پوچھو تو مجھے کسی کے ساتھ نیند نہیں آتی۔"

"یہی حال اپنا بھی ہے۔" ہرمزی نے مغلانی کی تائید کی۔ ساتھ ہی اپنی الجھن کا بھی اظہار کیا۔ "جب سے بچو میرے پاس آئی ہے، برابر جاگ رہی ہوں کئی بار تمہاری کوٹھری کے چکر کاٹ چکی ہوں۔ جیسے ہی آہٹ سنی خود تمہارے پاس آئی۔ تم سے بات کرنے کو بھی جی چاہ رہا تھا۔"

مغلانی خاموش رہیں۔ ہرمزی کے جانے کے بعد انہوں نے کوٹھری کا دروازہ اٹھ کر بند کیا اور سردی سے تھرتھراتی ہوئی واپس بستر پر آگئیں۔ ہرمزی کی باتوں نے ان کو طرح طرح کی الجھنوں میں مبتلا کر دیا تھا۔

دوم

(۱)

صبح کی آمد آمد تھی۔

ستاروں کے روشن کنول دھندلے پڑ گئے تھے۔ مشرقی افق پر کافوری روشنی آہستہ آہستہ اُبھر رہی تھی۔ ہوا ٹھنڈی تھی اور بھری ہوئی بھی تھی۔ صحن میں بکھرے ہوئے مولسری کے پھول مہک رہے تھے۔ کہیں قریب ہی کسی گھر میں مرغ نے بانگ دی۔ عین اس وقت چھت پر قدموں کی آہٹ سُنائی دی۔

حضور بیگم کی آنکھوں پر غنودگی طاری تھی۔ انہوں نے چونک کر چھت کی جانب دیکھا۔ قدموں کی آہٹ اب خاموشی میں تحلیل ہو کر ختم ہو چکی تھی ہر طرف گہرا سناٹا چھایا تھا۔ حضور بیگم کی آنکھوں میں دُور دُور تک غنودگی کا پتہ نہ تھا۔ وہ اب پوری طرح جاگ رہی تھیں۔ ذرا دیر بعد زینے کا دروازہ آہستہ سے چرچرایا۔ سیڑھیوں پر چاپ اُبھری اور رفتہ رفتہ زیادہ واضح ہوتی گئی۔ چاپ سے اندازہ ہوتا تھا کہ گھپ اندھیرے میں کوئی رُک رُک

کر سیڑھیوں سے نیچے اُتر رہا ہے۔

حضور بیگم دم بخود لیٹی تھیں۔ ان کے کان زینے میں اُبھرتی چاپ پر لگے ہُوئے تھے۔ وہ ٹکٹکی باندھے چھت کی کڑیوں کو تک رہی تھیں۔ ان کے چہرے پر خوف کے سائے پھیلتے جا رہے تھے۔ دل زور زور سے دھڑک رہا تھا انہوں نے گھبرا کر کروٹ لی۔ مُڑ کر گل بدن کی جانب دیکھا۔ وہ کمرے کے ایک گوشے میں لحاف اوڑھے فرش پر سُکڑی ہُوئی لیٹی تھی۔ حضور بیگم خاموشی سے اسے دیکھتی رہیں۔ پھر دھیرے سے کھنکار کر اُسے بیدار کرنا چاہا۔ لیکن وہ بھی رات کے پچھلے پہر تک جاگتی رہی تھی اور اب ایسی گہری نیند سو رہی تھی کہ اپنے آپے کی بھی خبر نہ تھی۔

زینے میں اُبھرتی ہوئی چاپ قریب، اور قریب آتی گئی۔ سخت گھبراہٹ اور سراسیمگی کے عالم میں حضور بیگم نے رضائی ایک طرف پھینکی اور اُٹھ کر تکیے کے سہارے بستر پر بیٹھ گئیں۔ انہوں نے ایک بار پھر گل بدن کو جگانے کی کوشش کی۔ خوف سے لرزتی ہوئی آواز میں آہستہ آہستہ نام لے کر پکارا۔ "گل بدن، اری او گل بدن۔" لیکن اس کے کانوں پر جُوں تک نہ رینگی۔ بے خبر سوتی رہی۔

قدموں کی آہٹ پر ہول سناٹے میں صاف سنائی دے رہی تھی اور اب نیچے آخری سیڑھیوں تک پہنچ چکی تھی۔ حضور بیگم نے کمرے کے دروازے کی جانب سہمی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ مگر دروازہ اندر سے بند تھا اور کنڈی لگی ہوئی تھی۔ البتہ اس کھڑکی کا ایک پٹ کھُلا تھا جو صحن کے رُخ پر تھی۔

حضور بیگم نے دھڑکتے دل کے ساتھ کھڑکی پر نظر ڈالی۔ کھُلے ہوئے پٹ کی آڑ سے باہر دیکھا۔ صحن میں گہرا سکوت تھا۔ ہر طرف کہر کی ہلکی ہلکی دھند چھائی ہوئی تھی۔ صحن کے مشرقی گوشے میں وہ طویل صحنچی تھی جو شہ نشین کے نشیب میں کسی قدر آگے نکلی ہوئی تھی۔ صحنچی کے عین مقابل کھُلا ہُوا اونچا در تھا۔

یہ زینے میں داخل ہونے کا راستہ تھا۔ حضور بیگم کا کمرہ دور تھا۔ ان کے کمرے اور زینے کے درمیان دالان در دالان حائل تھے۔ دونوں دالانوں میں ابھی تک مردنگیں اور فانوس روشن تھے۔

مردنگوں اور فانوسوں کو عام طور پر آدھی رات کو بجھا دیا جاتا تھا۔ اس وقت حضور بیگم اپنی خواب گاہ میں جا کر بستر پر لیٹ جاتی تھیں۔ ایک خادمہ بانس کی اونچی چھڑ اٹھائے دالان میں داخل ہوتی۔ چھڑ کے سرے پر موٹا ادنی کپڑا بندھا ہوتا۔ وہ فانوس یا مردنگ کے نیچے کھڑی ہوتی۔ چھڑ بلند کرتی اور ہر جلتی ہوئی شمع کے اوپر رکھ دیتی۔ چند لمحے میں شمع بجھ جاتی۔ دھواں بھی نہ اٹھتا جس کی بو حضور بیگم کو ناگوار گزرتی تھی۔

خادمہ نہایت احتیاط اور ہوشیاری سے اسی طرح ہر فانوس اور مردنگ میں روشن شمع بجھا دیتی۔ البتہ دیواروں پر آویزاں کنول اور شاخے دوشاخے روشن رہتے تھے۔ ان کے ساتھ ساتھ دیوار گیریاں بھی روشن رہتی تھیں۔ ان کو رات ختم ہوتے ہی علی الصباح گل کر دیا جاتا تھا۔

☆

حضور بیگم کھڑکی کی آڑ سے زینے کے در کی جانب دیکھ رہی تھیں جس کی بلندی پر مدوّر محراب تھی۔ ان کو روشنیوں سے جگمگاتے دونوں دالان تو نظر نہیں آ رہے تھے لیکن صحنچی کا آگے نکلا ہوا وہ حصّہ نظر آ رہا تھا جس میں مردنگوں اور فانوسوں کی ہلکی ہلکی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔

انہوں نے دیکھا، زینے کے در پر ایک سایہ ابھرا۔ آگے بڑھا اور صحن میں پہنچ گیا۔ کہرے کی دھند اتنی گہری تھی کہ وہ اس کے بارے میں کوئی اندازہ نہ لگا سکیں۔ وہ ہنوز دھندلا دھندلا سایہ ہی نظر آ رہا تھا جو کہرے میں لپٹا ہوا ہولے ہولے صحنچی کی جانب بڑھ رہا تھا۔

حضور بیگم سکتے کے سے عالم میں مسہری کے سرہانے سے ٹیک لگائے

گم صُم بیٹھی تھیں۔ سانس رُک رُک کر چل رہی تھی۔ چہرہ خوف سے زرد پڑ گیا تھا۔ نظریں کھڑکی کی جانب اٹھی تھیں۔ کوئی سفید چادر میں لپٹا ہوا نیلگوں دھند سے نکل کر چھپاک سے صحنچی میں داخل ہُوا۔ حضور بیگم کو اس کی ہلکی سی جھلک نظر آئی۔ وہ سہمی ہوئی دم بخود بیٹھی رہیں۔

کمرے میں گہری خاموشی تھی۔ دیوار پر آویزاں کنول میں جلتی ہوئی شمع کی لو آہستہ آہستہ تھرتھرا رہی تھی۔ باہر دالان میں رُک رُک کر چاپ اُبھر رہی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی دبے دبے قدموں چل رہا ہو۔ حضور بیگم بت بنی خاموش بیٹھی رہیں۔ ذرا دیر بعد کھڑکی کے پاس کھٹکا محسوس ہوا۔ ساتھ ہی تیز خوشبو کا جھونکا آیا۔ کھڑکی کی چوکھٹ پر ایک پرچھائیں لہرائی۔ حضور بیگم کی سانس رک گئی۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔

حضور بیگم نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ غور سے کھڑکی کی جانب دیکھا اب وہاں کوئی نہ تھا۔ صحن میں دُور دُور تک کہرے کی نیلگوں دُھند پھیلی ہوئی تھی۔ صحنچی میں روشنی زرد دھبے کی مانند نظر آرہی تھی۔ زینے کا اونچا در کسی تاریک غار کا دہانہ معلوم ہوتا تھا۔ ہر طرف ویرانی برس رہی تھی۔

طلعت آرا کا کمرہ اندرونی دالان کے نکڑ پر تھا اور حضور بیگم کے کمرے سے زیادہ دُور نہ تھا۔ تھوڑی دیر بعد حضور بیگم نے طلعت آرا کے کمرے کا دروازہ کھلنے کی آہٹ سُنی۔ وہ ہنوز گم صُم بیٹھی رہیں مگر ان کو قرار نہ آیا۔ بے چین ہو کر پہلو بدلا۔

ماما کا جذبہ خوف پر رفتہ رفتہ غالب آنے لگا۔ ان کے لئے کمرے میں ٹھہرنا وبال ہو گیا۔ وہ خود کو قابو میں نہ رکھ سکیں۔ بے قرار ہو کر بستر سے نیچے اُتریں۔ جُوتی پہنی کھونٹی پر لٹکی ہوئی سبز شال اتاری۔ اسے اوڑھا گل بدن کی جانب مُڑ کر دیکھا۔ وہ بے خبر سو رہی تھی انہوں نے اسے جگانا مناسب نہ سمجھا۔ آگے بڑھیں اور دروازہ کھول کر باہر چلی گئیں۔

رات بھر کی جاگی ہوئی تمام خادمائیں گہری نیند سو رہی تھیں۔ ہر طرف سکوت طاری تھا۔ فصیل نما اونچی اونچی دیواروں کی اوٹ سے صبح کا ہلکا ہلکا اُجالا پھُوٹ رہا تھا۔ رات رُخصت ہو رہی تھی مگر صحن میں کُہرے کی دھند ابھی تک پھیلی ہُوئی تھی۔

حضور بیگم آہستہ آہستہ چلتی ہوئی طلعت آرا کے کمرے کی سمت بڑھیں وہ ابھی تک خوفزدہ اور سہمی ہوئی تھیں۔ قریب پہنچ کر انہوں نے دیکھا، کمرے کے دروازے کا ایک پٹ تھوڑا سا کھُلا تھا۔ اندر ہلکی ہلکی روشنی تھی۔ وہ لمحہ بھر کے لئے دہلیز پر ٹھٹکیں اور پھر دھڑکتے دل کے ساتھ کمرے میں داخل ہو گئیں۔ ان کا قیاس صحیح نکلا۔ طلعت آرا سامنے مسہری پر نظریں جھکائے بیٹھی تھی۔ وہ جگمگاتا ہُوا سُرخ عروسی لباس پہنے ہوئے تھی۔ گلے میں مُرجھائے ہُوئے پھولوں کے گجرے پڑے تھے۔ بالوں پر افشاں جھلملا رہی تھی۔ آنکھوں میں نیند کا خمار تھا۔ چہرے پر شگفتگی تھی۔ اسے دیکھ کر صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ ابھی ابھی حجلہ عروسی سے نکل کر آئی ہے۔

حضور بیگم نے اس کی یہ سج دھج دیکھی تو دم بخود رہ گئیں۔ ان کے دل پر چوٹ لگی۔ انہوں نے آہ سرد کھینچی اور حیران و پریشان کھڑی رہیں۔ ان کی سمجھ ہی میں نہ آیا کہ کیا کریں کیا نہ کریں۔

طلعت آرا مسہری پر چُپ بیٹھی تھی۔ اور حضور بیگم چند قدم کے فاصلے پر اس کے رُو برو بُت بنی کھڑی تھیں۔ کمرے میں سکوت طاری تھا۔ خلافِ معمول طلعت آرا نے ماں کی جانب کوئی توجہ نہ دی۔ نہ وہ انہیں دیکھ کر احتراماً اُٹھی نہ دوپٹے کے پلّو سے سر ڈھکا، نہ جُھک کر آداب کیا۔ جس طرح بیٹھی تھی اسی طرح اپنی جگہ پر خاموش بیٹھی رہی۔

حضور بیگم پھٹی پھٹی آنکھوں سے بیٹی کا چہرہ تک رہی تھیں۔ وہ بالکل سپاٹ نظر آ رہا تھا۔ مگر وہ زیادہ دیر اس عالم میں کھڑی نہ رہ سکیں۔ ان کے

قدم لڑکھڑانے لگے۔ وہ آگے بڑھیں اور طلعت آرا کے پہلو میں بیٹھ گئیں بے قراری بڑھی. ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے۔ انہوں نے اسے بے اختیار اپنے سینے سے چمٹا لیا اور سسکیاں بھر کر رونے لگیں۔

طلعت آرا کا تمام جسم عطر سہاگ سے مہک رہا تھا۔ پلکیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ وہ بالکل خاموش تھی۔ نہ اس نے ماں سے کوئی بات کی، نہ ان کو آنسو بہاتے دیکھ کر دل جوئی کی اور نہ ہی اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکا۔ اس کے چہرے پر کسی قسم کے تاثرات نہ تھے۔ وہ کھوئی کھوئی اور سحر زدہ سی بیٹھی رہی۔

حضور بیگم نے بیٹی کو اس خود فراموشی کے عالم میں پایا تو تڑپ اٹھیں انہوں نے اس سے کچھ نہ پوچھا۔ سرے سے بات ہی نہ کی۔ دل گرفتہ ہو کر ٹھنڈی سانس بھری۔ دوپٹے کے آنچل سے آنکھوں میں امڈتے ہوئے آنسو پونچھے۔ جھک کر طلعت آرا کی پیشانی کو چوما اور اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔ طلعت آرا کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔ مڑیں اور نہایت خاموشی سے باہر چلی گئیں انہوں نے کمرے سے نکلتے ہوئے دروازے کے دونوں پٹ بند کر دیئے تھے۔

دالان میں پہنچ کر وہ غلام گردش میں داخل ہوئیں۔ ابھی تک خاموشی کا راج تھا۔ غلام گردش میں ہلکا ہلکا اندھیرا تھا۔ سردی سے ان کا جسم تھر تھرا رہا تھا۔ انہوں نے غلام گردش عبور کی اور مغلانی کی کوٹھری کے سامنے پہنچ گئیں۔

دروازہ بند تھا۔ حضور بیگم نے ہولے ہولے دستک دی۔

مغلانی گہری نیند میں تھیں۔ انہوں نے بھی تمام رات بے چینی میں بسر کی تھی۔ کچھ ہی دیر قبل آنکھ لگی تھی وہ بے خبر سوتی رہیں، مگر دروازے پر بار بار آہٹ ہوئی تو بیدار ہو گئیں۔ چند لمحے سہمی ہوئی بستر پر لیٹی رہیں، پھر لرزتی ہوئی آواز سے دریافت کیا۔

"کون دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے؟"

"بی مغلانی میں ہوں۔" باہر سے حضور بیگم کی آواز ابھری۔ "ذری دروازہ تو کھولو۔"

مغلانی نے فوراً ان کی آواز پہچان لی۔ ہڑبڑا کر اُٹھیں۔ بستر سے نیچے اُتریں۔ بدحواسی میں ننگے پیر بڑھیں۔ دروازہ کھولا۔ حضور بیگم کو رُو برُو پایا تو پریشان ہو کر بولیں۔ "سرکار، خیریت تو ہے؟" وہ ہکا بکا ہو کر ان کا چہرہ تکنے لگیں۔

حضور بیگم نے رسان سے کہا۔ "جوتی پہن لو اور دلائی بدن پر ڈال لو، سخت سردی ہے۔" ان کی آواز بھی سردی سے کپکپا رہی تھی۔

مغلانی فوراً پلٹیں۔ جوتیاں پیر میں ڈالیں۔ دلائی اوڑھی اور کوٹھری سے باہر آگئیں۔ نجوّرات ہی کو ہرمزی کی کوٹھری سے واپس آگئی تھی اور اب اپنے بستر پر سو رہی تھی۔ جوانی کی نیند تھی۔ اسے حضور بیگم کی آمد کا مطلق علم نہ ہوا۔

حضور بیگم نے مغلانی کو اپنے ہمراہ آنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "میرے ساتھ آؤ۔" وہ آگے بڑھیں۔ مغلانی ان کے پیچھے چلیں۔ حضور بیگم بالکل خاموش تھیں۔ مگر مغلانی خاموش نہ رہ سکیں۔ انہوں نے بے چین ہو کر پوچھا۔ "سرکار کوئی پریشانی کی بات تو نہیں؟"

"ہاں، خیریت ہی ہے۔" انہوں نے گہری سانس بھری اور تاکید کرنے کے انداز میں بولیں۔ "یہاں بات کرنا مناسب نہیں۔" ان کا لہجہ مدّھم اور رازدارانہ تھا۔ "کمرے میں پہنچ کر اطمینان سے گفتگو ہو گی۔"

مغلانی نے مزید بات چیت نہ کی۔ خاموشی سے حضور بیگم کے پیچھے پیچھے چلتی رہیں۔ حضور بیگم اپنے کمرے میں داخل ہوئیں۔ گل بدن کو آواز دی "گل بدن، اے گل بدن۔"

گل بدن نے کروٹ بدلی۔ نیند میں ڈوبی ہوئی آواز میں پوچھا۔ "سرکار کیا حکم ہے؟" مگر بدستور لیٹی رہی۔

حضور بیگم کو اس کا رویّہ نہایت شاق گزرا۔ جل کر بولیں۔ "کمبخت تو

تو مُردوں سے شرط باندھ کر سوئی ہے۔ اُٹھ کر بیٹھ۔"

گل بدن جھٹ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ کچی نیند سے بیدار ہُوئی تھی۔ ابھی تک نیند کا شدید غلبہ بھی تھا۔ گھبرا کر پھٹی پھٹی آنکھوں سے حضور بیگم اور ان کے عقب میں کھڑی ہُوئی مغلانی کو تکنے لگی۔

حضور بیگم نے حکم دیا "کمرے سے باہر جاؤ۔ افسری سے کہو کر سویرا ہُوا چاہتا ہے، روشنیاں گُل کر دے۔ دھاڑ دھاڑ جل رہی ہیں۔" ان کے لہجے میں جھنجھلاہٹ تھی۔

گل بدن فوراً اُٹھ کھڑی ہُوئی۔ بستر لپیٹ کر بغل میں دبایا اور کمرے سے باہر چلی گئی۔ حضور بیگم تھکی ہُوئی سی آگے بڑھیں اور نڈھال ہو کر بستر پر دراز ہو گئیں۔ شب بیداری اور پریشانی سے ان کا چہرہ مُرجھا کر مٹیالا پڑ گیا تھا۔ وہ اس وقت بہت شکستہ اور لاغر نظر آ رہی تھیں۔ مغلانی ہنوز دہلیز کے قریب گم صُم کھڑی تھیں۔ حضور بیگم نے مُڑ کر مغلانی کو دیکھا۔ نرم لہجے میں کہا "کھڑی کیوں ہو، بیٹھ جاؤ۔" انہوں نے تخت کی جانب ہاتھ اُٹھا کر اشارہ کیا۔ "ہاں مجھے ایک پان بنا کر بھی دو۔ منہ پھیکا پھیکا ہو رہا ہے۔"

مغلانی خاموشی سے تخت پر اسی جگہ بیٹھ گئیں جہاں رات کو موجود تھیں انہوں نے پاندان کھسکا کر قریب کیا۔ اس کا ڈھکنا کھولا اور ایک پان لگا کر نہایت ادب سے حضور بیگم کو پیش کیا۔ وہ ابھی تک بے چین اور مضطرب نظر آ رہی تھیں۔ حضور بیگم نے بھی ان کے اضطراب کو محسوس کیا۔ انہوں نے پان کی گلوری لے کر منہ میں رکھی۔ مغلانی کو نظر بھر کر دیکھا۔ پھر مطلع کیا "طلعت آرا بیگم واپس آ گئی ہیں۔" ان کی آواز میں ہلکی ہلکی تھرتھراہٹ تھی۔ "تم ان کے نہانے کے لئے حمّام میں گرم پانی رکھوا دو۔"

"چھوٹی سرکار واپس آ گئیں؟" مغلانی نے یقین نہ آنے کے انداز میں دریافت کیا "سرکار، وہ کب آئیں؟"

"تھوڑی ہی دیر پہلے واپسی ہوئی ہے۔" حضور بیگم نے بتایا۔
مغلانی نے جھجکتے ہوئے دریافت کیا۔ "سرکار، وہ رات بھر رہیں کہاں؟"
"اوپر کی منزل پر۔" حضور بیگم نے چھت کی جانب انگلی اٹھا کر جواب دیا۔
"سرکار، آپ کو کیسے معلوم ہوا، وہ اوپر تھیں؟" مغلانی نے کرید کر پوچھا۔
"آپ نے ان سے معلوم کیا تھا کہ کہاں رہیں، کیسے رہیں؟"
"نہیں، میں نے کچھ نہیں پوچھا۔" حضور بیگم نے مغلانی کو بتایا۔ "پوچھتی بھی کیسے وہ اپنے ہوش میں کب ہے، کھوئی کھوئی سی بت بنی بیٹھی ہے۔ نہ آداب نہ سلام۔ بات کرنے کے لئے منہ ہی نہیں کھولا۔"
"اے حضور، انہیں ہو کیا گیا؟" مغلانی نے گھبرا کر اپنے ردعمل کا اظہار کیا۔
"وہ! نھی کے اثر میں ہے جن کا اوپر کی منزل پر سایہ ہے۔" حضور بیگم نے آہ سرد کھینچی۔ "کل نوچندی جمعرات تھی نا۔ خدا معلوم یہ قسمت کی ماری وہاں کیسے پہنچ گئی۔"
"سرکار، قسم لے لیجئے، جو میں نے چھوٹی سرکار کو زینے پر قدم رکھتے ہوئے بھی دیکھا ہو۔ میں تو تمام وقت زینے کے قریب صحنچی ہی میں بیٹھی رہی۔" مغلانی کو معاً ہرمزی کی باتیں یاد آگئیں۔ انہوں نے دبی زبان سے شک و شبہ کا اظہار کیا۔ "مجھے تو یقین نہیں آتا کہ وہ رات بھر چھت پر رہیں۔ سرکار، آپ نے یہ کیسے اندازہ لگایا؟۔ آپ کی تو ان سے بات ہی نہیں ہوئی۔"
"میں نے اسے زینے سے آتے ہوئے دیکھا تھا۔"
"سمجھ میں نہیں آتا کس وقت اور کیسے چپ چپاتے اوپر چلی گئیں۔" مغلانی نے ایک بار پھر صفائی پیش کی۔ "سرکار آپ کی اجازت ہو تو میں ان سے معلوم کرنے کی کوشش کروں۔"
"وہ خود بتا دے تو یہ اس کی مرضی۔" حضور بیگم نے تاکید کی۔ "مگر اس سے کچھ نہ پوچھنا۔ الٹے سیدھے سوال کر کے اسے پریشان نہ کرنا۔ پہلے ہی ہلکان ہو رہی

ہے۔ وہ اپنے آپے میں کب ہے۔"

"مگر سرکار، میرا مطلب ہے۔"

"میں تمہارا مطلب بخوبی سمجھ رہی ہوں"۔ حضور بیگم نے مغلانی کو آگے بولنے کا موقع نہ دیا۔ "جیسا کہہ رہی ہوں ویسا ہی کرو۔"

"بہت بہتر سرکار"۔ مغلانی نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ "مگر آپ مُنہ ہاتھ دھو کر کھا پی لیں۔ رات سے حلق میں کچھ نہیں گیا۔"

"مجھے بالکل بھوک نہیں"۔ حضور بیگم نے بیزاری سے کہا۔ "چاہتی ہوں ذرا دیر سو لوں۔ قسم لے لو جو تمام رات پل بھر کے لئے بھی آنکھ لگی ہو۔"

"سرکار مجھے خبر ہے کہ آپ ساری رات جاگتی رہیں"۔ مغلانی نے ان کی ہاں میں ہاں ملائی۔ "اللہ کیسی پہاڑ سی رات تھی۔ کاٹے نہیں کٹ رہی تھی۔"

حضور بیگم خاموش رہیں۔ مغلانی نے بھی مزید بات چیت نہ کی۔ آگے بڑھیں اور کمرے سے چلی گئیں۔ باہر نکل کر دالان میں پہنچیں، دیکھا افسری بانس کی چھڑ اٹھائے روشن شمعوں کو گل کر رہی تھی۔ اب صحن میں صبح کا ہلکا ہلکا اُجالا پھیل رہا تھا۔ خادماؤں کی کوٹھریوں سے کھانسنے، کھنکارنے کی آوازیں رُک رُک کر خاموشی میں ابھر رہی تھیں۔ مغلانی آہستہ آہستہ اُسی سمت بڑھنے لگیں۔

(۲)

حضور بیگم بستر پر بے حال پڑی تھیں۔ انہوں نے سونے کی لاکھ کوشش کی مگر نیند نہ آئی۔ دل تھا کہ اسے کسی پہلو قرار نہ تھا۔ رہ رہ کے طلعت آرا کا خیال ستاتا تھا۔ جی کو ہلکان کرتا تھا۔ طرح طرح کے خدشات اور وسوسے ذہن میں ابھرتے تھے۔ رات بھر میں وہ شمع کی مانند پگھل کر رہ گئی تھیں۔ چہرہ مُرجھایا ہوا۔ آنکھوں کے نیچے حلقے، جسم نڈھال اور لت پت۔ دُکھ کا سیلاب امڈتا تھا۔ کلیجہ مُنہ کو آتا تھا۔

ان کا شدید غم بے جا نہ تھا۔ طلعت آرا اب ان کی اکلوتی اولاد رہ گئی تھی۔ انہوں نے اپنی ساری ممتا اور تمام خوشیاں اس کے لئے وقف کر دی تھیں۔ اُسے دیکھ کر جیتی تھیں۔ بات بات پر بلائیں لیتی تھیں۔ صدقے اور واری جاتی تھیں۔

طلعت آرا سے بڑا ایک بیٹا بھی تھا۔ نام تو اس کا خورشید عالم نواب محمد وصی تھا مگر لاڈ سے نواب خسرو کہلاتا تھا۔ پہلوٹی کا بیٹا تھا۔ شادی کے تین سال بعد بڑی منّت مرادوں سے پیدا ہوا تھا۔ پھر کئی سال تک کوئی اولاد نہ ہوئی۔ لہذا اس کا لاڈ پیار بھی بہت زیادہ تھا۔ حضور بیگم کی تو آنکھوں کا تارا اور دل کی ٹھنڈک تھا۔ اُس پر جان چھڑکتی تھیں، ہنس ہنس کر اس کے چونچلے برداشت کرتی تھیں۔

نواب نقی بھی خسرو سے والہانہ محبت کرتے تھے۔ اس کے ناز نخرے اٹھانے میں حضور بیگم سے کسی طور پیچھے نہ تھے۔ وہ طلعت آرا سے کچھ اوپر آٹھ سال بڑا تھا۔

نواب نقی کی والدہ ناظمہ بیگم اس وقت حیات تھیں۔ حضور بیگم کا پیر بھاری ہوا تو وہ خوشی سے نہال ہو گئیں۔ بڑی منّتوں اور دعاؤں کے بعد تو اللہ نے یہ دن دکھایا تھا۔ حضور بیگم کے چاؤ، چونچلے بھی بہت ہوئے خاندانی دائی، لاڈلی بیگم ہر دوسرے تیسرے دن حضور بیگم کو دیکھنے آتی اور باقاعدہ معائنہ کرتی۔ خاندانی طبیب بھی ہر صبح آتے اور ڈیوڑھی میں بیٹھ کر حضور بیگم کا حال معلوم کرتے۔ دائی موجود ہوتی تو اس سے ضرور مشورہ کرتے ہدایات دیتے۔ ضرورت محسوس کرتے تو استعمال کے لئے نسخہ تجویز کرتے۔ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ ادویات میں کمی بیشی کرتے رہتے۔

ناظمہ بیگم ہر وقت بہو کی خبر گیری کرتی رہتیں۔ اُٹھتیں تو ٹوکتیں "دلہن ہاتھوں پر زیادہ زور نہ دو" چلتیں تو پیار سے تنبیہ کرتیں" دلہن! قدم آہستہ اٹھاؤ

تیز چال سے نہیں چلتے۔" کبھی کسی چیز کو اٹھا لیتیں تو وہ ماماؤں پر ناراض ہوتیں۔ "اری کم بختو، تم کس مرض کی دوا ہو۔ ذرا خیال نہیں رکھتیں کہ بہو بیگم بوجھ اٹھا رہی ہیں۔" فوراً لونڈی مامائیں گھبرائی ہوئی لپکتیں اور جو کچھ بھی حضور بیگم کے ہاتھ میں ہوتا جلدی سے لے لیتیں۔ حضور بیگم کو ذرا بھی خاموش دیکھتیں جھٹ مسکرا کر سمجھاتیں۔ "دلہن، ہنسی بولتی رہا کرو۔ خود کو ہشّاش بشّاش رکھا کرو۔ کسی طرح کی فکر یا تردّد کو اپنے قریب پھٹکنے نہ دو۔" صرف ناظمہ بیگم ہی پر منحصر نہیں خاندان کی دوسری بڑی بوڑھیاں بھی ان دنوں حضور بیگم کو اسی طرح بات بات پر ٹوکتیں۔ محبت اور شفقت سے سمجھاتی بجھاتی رہتیں۔

تیسرا مہینہ شروع ہوتے ہی حضور بیگم کے پیٹ پر دعائیں پڑھ پڑھ کر دم کی جانے لگیں۔ بیٹے کی پیدائش کے لئے دعاؤں کے ساتھ ساتھ منّتیں مانی جانیں۔ درگاہ حضرت عباس جا کر چلّے باندھے جاتے۔ دن گزرتے رہے۔ ہونے والے بچے کے واسطے کپڑے بھی تیار کئے جانے لگے تھے۔ ان کو نواب نقی اور حضور بیگم کے پرانے لباسوں سے کاٹ چھانٹ کر سیا جاتا تھا۔ کپڑوں کے علاوہ گھٹّے پوتڑے بھی سی سی کر صندوق میں حفاظت سے رکھے جا رہے تھے۔ زچگی کے واسطے کمرے کا بھی انتخاب کیا گیا۔ زچّہ کا پلنگ بچھانے کے لئے استخارہ دیکھ کر جگہ کا تعین کیا گیا۔ دودھ پلانے کے لئے دایہ بھی ملازم رکھ لی گئی۔ ایک کھلائی بھی مقرر کی گئی دونوں کو مہینہ بھر پہلے ہی ملازم رکھ لیا گیا تھا اور گھر بیٹھے تنخواہ دی جا رہی تھی۔

اللہ اللہ کر کے نواں مہینہ لگا اور ایک روز آدھی رات سے کچھ پہلے خورشید عالم کی ولادت ہوئی۔ مگر لاڈلی دائی نے زچہ خانے کے اندر سے صدا بلند کی۔ "لڑکی ہوئی ہے۔" یہ جھوٹ ہمیشہ دیدہ و دانستہ بولا جاتا تھا تاکہ بیٹے کی خوشی میں کہیں زچہ کی آنول اوپر نہ چڑھ جائے اور نال کاٹنے میں دشواری پیش آئے۔ اس میں شک نہیں کہ حضور بیگم کو بھی پہلوٹی کے بیٹے

کی اس قدر تمنّا تھی کہ ہر وقت اس کے لئے دل ہی دل میں دعائیں مانگا کرتی تھیں۔ طرح طرح کی منّتیں مان چکی تھیں۔ ان میں ایک منّت یہ بھی تھی کہ بیٹا پیدا ہوا تو ہر نوچندی کو ملکہ زمانی کی کربلا اور درگاہ حضرت عباس میں حاضری دینگی۔

زچّہ خانے سے دائی کی صدا بلند ہوتے ہی ایک ماما نے چولہا پھونکنے کی پھکنی منہ سے لگا کر بھُوں بھُوں بجانا شروع کر دی۔ کسی خادمہ نے زور زور سے توا پیٹا۔ کوئی لکڑی لے کر ٹن ٹن تھالی بجانے لگی۔ اس شور و غل کا مقصد یہ تھا کہ بلائیں اور بد ارواح دُور ہو جائیں۔

نواب تقی اس وقت مغلانی کی کوٹھری میں نتھے پھکنی کی بھُوں بھُوں سن کر گھبرا گئے۔ سہمے ہوئے جھٹ باہر آ گئے۔ گھر کے دوسرے تمام افراد کو بھی شور و غل سے بچے کی ولادت کا علم ہو گیا۔ مامائیں اور لونڈیاں نیند سے بیدار ہو کر زچّہ خانے کی جانب لپکیں۔ بیگمات بھی جاگ گئی تھیں۔ اور فرشی پائجاموں کے بڑے بڑے پائنچے سنبھالتی ہوئی پہنچنے لگیں۔ ان میں حضور بیگم کی چھوٹی اور بڑی جٹھانی بھی شامل تھیں۔ ناظمہ بیگم تو شام ہی سے زچّہ خانے کے باہر موجود تھیں۔ بار بار دائی سے زچّہ کی کیفیت معلوم کر رہی تھیں۔

آن کی آن میں زنانے سے مردانے تک ہر طرف ولادت کی خبر پھیل گئی۔ پوتے کی پیدائش پر ناظمہ بیگم کی مسرّت کا ٹھکانا نہ تھا۔ پہلوٹی کا بیٹا پیدا ہوا تھا۔ نواب تقی بھی خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے۔ صبح ہوتے ہی روشن چوکی پہنچ گئی۔ اور نوبت خانے پر شہنائی بجنے لگی۔

زنانہ ڈیوڑھی میں وقفہ وقفہ سے کہاروں کی صدائیں بلند ہوتیں۔ محل دارنی دو خادماؤں کے ساتھ ڈیوڑھی میں موجود تھی۔ جو پہلے فینس یا پالکی سے جو مہمان بیگمات اُترتیں، محل دارنی بڑھ کر ان کا خیر مقدم کرتی۔ جھک جھک کر بار بار تسلیم بجا لاتی۔ خادمائیں ان کو اندر پہنچاتیں۔ ہر مہمان بیگم کے ہمراہ مہری یا خادما ہوتی اور خوان یا کشتی اٹھائے ہوتی جس میں سرپوش سے ڈھکی ہوئی

انواع و اقسام کی مٹھائیاں ہوتیں۔ مٹھائیوں پر چاندی کے ورق نہایت سلیقے سے لگے ہوتے۔ شام تک مبارک باد دینے والوں کا تانتا بندھا رہا۔ زنانے اور مردانے دونوں جگہ مہمانوں کی ہر طرح خاطر و مدارت ہو رہی تھی۔ مسرت و شادمانی کا یہ عالم تھا کہ ہر سو قہقہے گونج رہے تھے۔

☆

چھٹی بھی نہایت دھوم دھام سے ہوئی۔ صبح ہی سے چہل پہل اور گھما گھمی شروع ہو گئی تھی۔ شہنائی کی سریلی آوازیں فضا میں گونج رہی تھیں۔ حضور بیگم کے میکے سے ان کی والدہ اور بہنیں جلوس کی صورت میں دھوم دھڑکے سے چھٹی لائی تھیں۔ جلوس کے آگے بینڈ باجا تھا۔ بینڈ بجانے والے مہتر تھے۔ سرخ اور سفید وردیاں پہنے ہوئے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں طرح طرح کے باجے تھے جن کو وہ اونچے سروں میں جھوم جھوم کر بجا رہے تھے۔ باجے والوں کے پیچھے سروں پر گلابی صافے باندھے کہار تھے۔ ان کے کندھوں پر خوان تھے کشتیاں تھیں۔ خوانوں اور کشتیوں میں چھٹی کا ساز و سامان تھا۔ ان پر ریشمی سرپوش پڑے تھے۔ سرپوشوں پر گوٹا لچکا ٹنکا تھا۔ ان کے عقب میں فینسیں اور پالکیاں تھیں جن میں بیگمات طرح طرح کے زیورات اور بھاری جوڑے پہنے، بناؤ سنگار کئے نہایت ٹھسے سے بیٹھی تھیں۔ فینسیں رنگین اور زرتار چھٹکوں سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ ان چھٹکوں کے دامن سنبھالے دونوں طرف مہریاں تھیں۔ رنگا رنگ لہنگے، چوڑی دار پائجامے اور چُنے ہوئے دوپٹے پہنے ہوئے یہ مہریاں فینسوں کے ساتھ ساتھ نہایت مستعدی سے چل رہی تھیں۔

چھٹی کا جلوس بینڈ باجے بجاتا حضور بیگم کی سسرال پہنچا تو نوبت خانے پر شہنائی کے سُر اور اونچے ہو گئے۔ ڈومنیوں نے مبارک سلامت کے گیت چھیڑے فینسیں اور پالکیاں آگے بڑھیں اور زنانہ ڈیوڑھی کے اندر رکھی جانے لگیں۔ بیگمات فینسوں کے چھٹکوں سے ہنستی مسکراتی باہر آئیں۔ ناظمہ بیگم آگے بڑھ کر خیر مقدم

کرتیں۔ ایک ایک کو گلے سے لگاتیں۔ مزاج پوچھتیں۔ دل جوئی کی باتیں کرتیں۔

مہمان بیگمات کے ساتھ ساتھ چھٹی کا سازوسامان بھی پہنچنے لگا۔ سرپوش ہٹا کر کشتیوں اور خوانوں کو قرینے سے رکھا گیا۔ اس میں بچے کے لئے قیمتی کپڑے تھے ہاتھوں اور گلے میں پہننے کے لئے کڑے اور طوق تھے۔ ہنسلی تھی۔ چاندی کے جھن جھنے اور لکڑی کے نہایت خوبصورت روغنی کھلونے تھے۔ حضور بیگم کے لئے جڑاؤ کنگن کی قیمتی جوڑی اور گلے میں پہننے کے لئے چپا کلی تھی گوہر غلطاں کا جوڑا تھا۔ عطردان تھا۔ ہاتھی دانت کی مرصّع کنگھی، مسّی، نقرئی تھری، نیل کے لئے چاندی کی کٹوری اور شال باف کی سرخ اوڑھنی بھی تھی جس میں سات میوے، بہنوں کا نیگ اور زنجیری کے ڈپٹے بندھے ہوئے تھے۔ پھولوں کا زیور علیحدہ کشتیوں میں آیا تھا۔

نواب تقی ان کی والدہ اور بہن کے لئے بھی حسب حیثیت عمدہ جوڑے آئے تھے۔ ان کے علاوہ محل دارنی مغلانیوں، مہریوں اور خادماؤں کے بھی جوڑے تھے۔ نوکر چاکروں کے لئے اعلیٰ قسم کی ململ کے صافے تھے جن کو رنگوا کر ابرک چھڑکی گئی تھی۔ خادماؤں اور ملازموں کے لئے انعام وکرام کی رقم بھی ایک خریطے میں رکھی ہوئی تھی۔

میکے سے آئی ہوئی اس شاندار چھٹی کی باقاعدہ نمائش ہوئی جس نے دیکھا تعریف وتوصیف کی۔ ناظمہ بیگم تو ایک ایک چیز کو حیرت سے دیکھتی تھیں اور بار بار سبحان اللہ، ماشا اللہ کہتی تھیں۔ تعریف کرتے ان کا منہ نہ تھکتا تھا۔ حضور بیگم کے والد کا تو انتقال ہو چکا تھا۔ چھٹی کا اہتمام ان کی والدہ آبادی بیگم نے کیا تھا۔ چھٹی کی تعریف سن کر ان کی خوشی کا ٹھکانا نہ تھا۔ انہوں نے چھٹی پر دل کھول کر خرچ کیا تھا جو کچھ اپنے پاس زر نقد تھا وہ تو خرچ ہی کیا، اس کے علاوہ بیس ہزار روپئے لالہ گوپی ناتھ رستوگی سے دس روپئے فی سیکڑا ماہانہ سود پر قرض لئے تھے۔

چھٹی کا سازوسامان جب سب نے اچھی طرح دیکھ لیا تو حضور بیگم کو چوکی

پر بٹھایا گیا۔ لاڈلی دائی نے نیم گرم پانی سے ان کو نہلایا دُھلایا۔ خادماؤں نے اس کا ہاتھ بٹایا۔ ناظمہ بیگم کے علاوہ حضور بیگم کی دونوں جٹھانیاں، والدہ اور بہنیں بھی موجود تھیں اور دائی کو بار بار ہدایات دے رہی تھیں۔

چھٹی کے نہان سے فارغ ہو کر حضور بیگم کو میکے سے آیا ہوا جوڑا اور زیورات پہنائے گئے۔ انہوں نے بیٹے کو گود میں لیا اور دلہن کی طرح شرمائی لجائی گاؤ تکیہ سے ٹیک لگا کر مسند پر بیٹھ گئیں۔ ڈومنیوں نے ڈھولک کی تھاپ پر زچاگیری چھیڑی۔

البیلے نے مجھے درد دیا، سانوریا نے مجھے درد دیا
پا یَلیا نے درد دیا
جائے کہو لڑکے کے بادا سے اُونچی نوبت دھراؤ رے
البیلے نے مجھے درد دیا، پا یَلیا نے مجھے درد دیا

رات کو دیوان خانے میں محفل نشاط برپا ہوئی۔ ڈھاڑیوں اور بھانڈوں کے علاوہ طوائفوں کے مجرے ہوئے۔ نواب نقی کے بڑے بھائی، نواب ذکی، اس وقت حیات تھے۔ ان کے علاوہ منجھلے بھائی نواب صفی بھی موجود تھے۔ عزیزو اقارب، دوست احباب، مصاحبین اور مقربین بھی شریک محفل تھے۔ شہر کی نامی گرامی طوائفیں بلائی گئی تھیں۔ ان میں اللہ رکھی بھی تھی۔ ایک زمانہ میں نواب نقی کے اس سے ایسے والہانہ مراسم تھے کہ ان کی شامیں تو بہرحال اس کے بالا خانے پر گزرتی تھیں، اکثر راتیں بھی وہیں بسر کرتے۔ باقاعدہ ان کی ملازم رہ چکی تھی۔ اللہ رکھی گانے کے لئے آئی تو اس نے نواب نقی کو مخاطب کر کے ایک غزل چھیڑی۔

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو۔

اللہ رکھی خوش شکل اور عشوہ طراز طوائف تھی۔ آواز میں رس تھا، سوزو ساز تھا۔ اس نے بانکی پتلیوں کو گردش دے کر اس طرح ہاتھوں کو لہرا کر بھاؤ بتایا کہ روپ کی ہر چھب نمایاں ہو گئی۔ نواب نقی تڑپ اٹھے۔ اللہ رکھی کو اشارے

سے قریب بلایا۔ ہاتھ پکڑ کر سامنے بٹھایا۔ رخسار پر ہولے سے چٹکی لی۔ دل پر ہاتھ رکھ کر بے ساختہ رند لکھنوی کا یہ شعر پڑھا۔

آپ کو بھولے ہیں لیکن نہیں بھولے تجھ کو
یاد کیا رکھیں جو غافل ہوں تری یاد سے ہم

محفل میں غلغلہ بلند ہوا ہر طرف سے واہ واہ، سبحان اللہ کی صدائیں آنے لگیں۔ نواب ذکی جو نواب تقی اور اللہ رکھی کے درمیان راز و نیاز ہوتے دیکھ کر قدرے سنجیدہ ہو گئے تھے، خود پر قابو نہ رکھ سکے۔ مسکرا کر داد دی۔ "بھئی تقن کیا برجستہ شعر پڑھا ہے۔ رند نے آپ اور تم کے نازک فرق سے جو فائدہ اٹھایا سو اٹھایا مگر تم نے شعر فہمی کا حق ادا کر دیا۔ واہ واہ"! وہ بار بار پہلو بدلتے تھے اور شعر بلند آواز سے پڑھتے تھے۔

لیکن نواب صفی جل بھن کر رہ گئے۔ اللہ رکھی ان دنوں ان کی ملازم تھی وضع داری کا تقاضا تھا کہ ان کی موجودگی میں نواب تقی کو اس طرح برملا چھیڑ چھاڑ نہیں کرنا چاہیئے تھی۔ انہوں نے بڑے بھائی، نواب ذکی کا لحاظ کیا اور صرف پیچ و تاب کھا کر رہ گئے۔ ادھر اللہ رکھی نے غضب یہ کیا کہ مقطع ختم کرنے کے بعد دوسری غزل چھیڑی اور اس بار پھر نواب تقی پر چوٹ کی۔

ترے وعدے کو بُتِ حیلہ جو نہ قیام ہے نہ قرار ہے

نواب صفی کے ہاتھ سے ضبط کا دامن چھوٹ گیا۔ فوراً اللہ رکھی کو ٹوکا۔ "یہ کیا تم نے شکوہ شکایت کا دفتر کھول رکھا ہے۔ کوئی دادرا یا ٹھمری سناؤ۔" اللہ رکھی کو فوراً اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ ایک شعر غزل کا اور گایا اور اُسے ادھورا چھوڑ کر نواب صفی کی فرمائش پر فوراً دادرا شروع کر دیا۔ ان کا حکم، کیسے ٹال سکتی تھی، ملازم جو ٹھہری۔

اللہ رکھی کا مجرا ختم ہوا۔ دوسری طوائف آئی۔ اس نے بھی اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ اسی طرح ایک کے بعد دوسری طوائف آتی رہی۔ صبح تک محفل موسیقی کا یہ سلسلہ

چلتا رہا۔ گیارہ بجے دن کو پھر شروع ہو گیا۔ مردانے میں طوائفیں، رقص و موسیقی سے محفل آرائی کر رہی تھیں تو زنان خانے میں ڈومنیاں گا بجا رہی تھیں، ٹھٹھول کر رہی تھیں۔ فقرے چست کر رہی تھیں اور انعام و اکرام وصول کر رہی تھیں۔

تین روز تک نواب تقی کے پہلوٹی کے بیٹے کی خوشی میں جشن منایا گیا۔ رقص و موسیقی کے ساتھ ساتھ دونوں وقت دیوان خانے اور زنان خانے میں دستر خوان بچھایا جاتا اور انواع و اقسام کے کھانوں سے مہمانوں کی تواضع کی جاتی۔

چھٹی کے نہان کے بعد حضور بیگم دو نہان اور نہائیں۔ تیسرا نہان چلّے کا تھا۔ اس روز بھی زبردست جشن منایا گیا۔ ڈومنیوں نے زچّہ گیریاں ایک بار پھر گائیں۔ مردانے میں ڈھاڑیوں کے علاوہ طوائفوں کے مجرے ہوئے۔ حضور بیگم کو دلہن کی طرح بنایا سنوارا گیا۔ بالوں میں افشاں چھڑکی گئی۔ مانگ میں صندل بھری گئی ہاتھ پیروں میں مہندی لگائی گئی۔ سرخ جوڑا پہنایا گیا۔ چراغ جلے ان کو صحن میں لایا گیا۔ بچّہ گود میں تھا اور گرد بیگمات کا جمگھٹا تھا۔ خادمائیں اونچی آواز میں زچہ بچہ کی درازیٔ عمر کی دعائیں مانگتی تھیں۔ حضور بیگم نے ساس اور دوسری بڑی بوڑھیوں کی ہدایت پر نظریں اٹھا کر آسمان پر چمکتے ستاروں کو دیکھا۔ تارے دیکھنے کی اس رسم کے ساتھ حضور بیگم گویا زچگی سے پوری طرح فارغ ہو گئیں۔

نواب ذکی نے جو والد کے انتقال کے بعد خاندان کے سربراہ سمجھے جاتے تھے، بھتیجے کا جشن ولادت اس قدر دھوم دھام سے منایا کہ ہر طرف واہ واہ ہوتی تھی انہوں نے پانی کی طرح روپیہ صرف کیا ان کو بھی پرو نوٹ پر دس روپئے فی سیکڑا ماہانہ سود پر اٹھارہ ہزار روپئے مہاجن سے قرض لینے کی ضرورت پیش آئی۔

☆

خسرو بڑے ناز و نعم سے پلا بڑھا۔ پانچواں سال شروع ہوا تو اس کی تعلیم کی فکر ہوئی۔ نواب تقی اب بارہ دری میں منتقل ہو چکے تھے خسرو کی بسم اللہ کی رسم بھی نہایت دھوم دھام سے ادا کی گئی۔ استخارہ دیکھ کر دن اور ساعت کا

تعیّن کیا گیا۔ رات کو خسرو کے ہاتھوں اور پیروں میں مہندی لگائی گئی۔ دن کو نہلا دھلا کر زرق برق لباس پہنایا گیا۔ خسرو کو دولہا کی طرح بنا سنوار کر مولوی صاحب کے روبرو بٹھایا گیا۔ خوانوں اور کشتیوں میں پستے، بادام، تیل، خشخاش اور ڈیڑھ من شیرینی رکھی گئی۔

مولوی صاحب نے چاندی کی تختی پر جلی حروف سے بسم اللہ تحریر کیا۔ بلند آواز سے اُسے پڑھا۔ مولوی صاحب کی ہدایت کے مطابق خسرو نے بھی بسم اللہ کہا۔ کئی بار اسے دہرایا۔ ہر طرف مبارک، سلامت کا غلغلہ بلند ہوا۔ خسرو کی درازیٔ عمر کے لئے دعائیں مانگی گئیں۔ شیرینی تقسیم ہوئی۔ استاد کو جوڑا اور سرخ خریطے میں رکھ کر پانچ اشرفیاں پیش کی گئیں۔ تمام نوکروں چاکروں، لونڈیوں اور ماماؤں کو جوڑوں کے علاوہ انعام و اکرام بھی دیا گیا۔

بسم اللہ کی رسم کی خوشی میں رقص و موسیقی کی محفل کا بھی اہتمام کیا گیا۔ زنان خانے میں ڈومنیاں گا بجا رہی تھیں اور باہر مردانے میں طوائفوں کا مجرا ہوتا تھا۔ رؤسا کے عام دستور کے مطابق، کھلائی اپنے ہمراہ نواب خسرو کو زنان خانے سے باہر لے گئی اور نواب صاحب کے حضور میں پیش کیا۔ خسرو جھک جھک کر سات بار آداب بجالایا۔ اس نے اس قدر شائستگی اور سلیقے کا مظاہرہ کیا کہ نواب صاحب نے بے قرار ہو کر گلے لگایا اور اپنے پہلو میں مسند پر بٹھا لیا۔ اس وقت ایک شوخ اور کافر ادا طوائف رقص کے ساتھ ساتھ گا بھی رہی تھی۔

میں آگے نہ تھا دیدۂ پر آب سے واقف!
پلکیں نہ ہوئی تھیں، میری خوں ناب سے واقف

خسرو خاموش بیٹھا طوائف کے لچکتے پھڑکتے جسم کے پیچ و خم دیکھتا رہا۔ گانا سنتا رہا۔ طوائف رقص کرتے کرتے آگے بڑھی۔ نواب خسرو کے قریب پہنچ۔ اس کی کمخواب کی اچکن کا دامن پکڑا اور مسکرا کر ایک خاص ادا سے یہ شعر پڑھا۔

پتھر تو بہت لڑکوں کے کھائے ہیں ولیکن
ہم اب بھی جنوں کے نہیں آداب سے واقف

خسرو نے شرما کر طوائف کو دیکھا۔ شعر سنا غور کیا۔ حیرت زدہ ہو کر والد بزرگوار سے پوچھا۔ "ابا حضور! بڑے شریر لڑکے تھے، پتھر مارتے تھے۔" اس نے طوائف کی طرف اشارہ کیا۔ "ان کو ہو کیا گیا تھا؟" نواب صاحب کے کچھ کہنے سے پہلے ہی طوائف ہنس کر بولی۔ "سرکار! جگ جگ جئیں۔ ہزار برس کی عمر پائیں۔ جوانی دیوانی آنے دیجئے، سب کچھ سمجھ میں آجائے گا۔" اس نے جھک کر چٹاخ سے خسرو کے رخسار کا بوسہ لیا۔ نواب صاحب نے خوش ہو کر طوائف کو انعام دیا۔ وہ لہرا کر اٹھی یہ ازدل کی سنگت پر لٹک لٹک کر گاتی رہی۔ آنکھوں کی گردش اور ہاتھوں اور پیروں کی جنبش سے بھاؤ بتاتی رہی۔

خسرو کے رخسار پر طوائف کے لبوں سے پان کی ہلکی سی پیک لگ گئی تھی۔ وہ ایک ہاتھ سے آہستہ آہستہ اسے پونچھتا رہا۔ رقص دیکھتا رہا۔ گانا سنتا رہا۔ وہ کافر ادا محفل طرب سے رخصت ہوئی۔ دوسری طوائف آئی۔ اس نے طبلے کی تھاپ اور سارنگی کے سُر سے سُر ملا کر ایک نئی غزل چھیڑی۔ اشعار سن کر خسرو کے ذہن میں تجسس پیدا ہوا۔ باپ کو مخاطب کیا۔ "ابا حضور! یہ عشق کی بیماری کونسی بیماری ہوتی ہے۔ بخار آتا ہو گا جیسا شکور ان کو آتا تھا۔" نواب صاحب نے مسکرا کر خسرو کو دیکھا مگر خاموش رہے۔ موسیقی سے لطف اندوز ہوتے رہے لیکن خسرو خاموش نہ رہا۔ کبھی پوچھتا۔ "یہ نینوں کے تیر کیسے چلائے جاتے ہیں؟" کبھی دریافت کرتا۔ "یہ نگاہوں کے خنجر سے کیسے قتل کیا جاتا ہے؟" نواب صاحب کچھ کہنے بھی نہ پاتے کہ قریب بیٹھے ہوئے ان کے مصاحب خاص، نوابو مرزا، فوراً چہک کر خسرو کے ہر سوال پر داد دیتے "اے سبحان اللہ، کیا ذہنی جودت ہے۔ چشم بد دور اس سن میں چھوٹے سرکار کیا دماغ سے اتارا تار کر باتیں کرتے ہیں۔ واللہ، کیا اپنج ہے۔" وہ نواب تقی کی خوش نودئ طبع کی خاطر نہایت مستعدی سے اپنی کارگزاری دکھانے کی کوشش کر رہے

تھے۔ ایسی ہی خدمات انجام دینے کی تنخواہ پاتے تھے۔ انعام و اکرام کے علاوہ دونوں وقت نواب صاحب کے ساتھ دسترخوان پر عمدہ اور مرغن کھانے کھاتے تھے۔ نوابو مرزا کی تعریف و توصیف پر خسرو کی ہمت افزائی ہو رہی تھی۔ وہ کرید کرید کر نت نئے سوالات کر رہا تھا۔

مجرا ختم ہو گیا لیکن خسرو کے سوالات کا سلسلہ بند نہ ہوا۔ پوچھا۔ ابا حضور! یہ شب وصل کیا ہوتی ہے؟" نواب صاحب خاموش رہے۔ نوبو مرزا کی بھی بولتی بند ہو گئی۔ نواب صاحب کی دائیں جانب تحصیل دار عظمت اللہ خان بیٹھے تھے وہ خاموش نہ رہ سکے۔ جھک کر نواب صاحب کے کان میں آہستہ سے کہا۔" نواب صاحب! صاحبزادے کو اندر بھجوا دیجیے۔ یہاں ان کا بیٹھنا مناسب نہیں۔ اخلاق پر برا اثر پڑے گا۔" وہ بہت دیر سے خسرو کے اوٹ پٹانگ سوالات سن رہے تھے اور دل ہی دل میں کڑھ رہے تھے۔

نواب صاحب نے تحصیل دار صاحب کے مشورے سے اتفاق نہ کیا۔ مڑ کر ان کی طرف دیکھا۔ نہایت سنجیدگی سے گویا ہوئے۔" خاں صاحب آپ کا تعلق فرخ آباد سے ہے پہلی بار ملازمت کے سلسلہ میں ادھر تشریف لائے ہیں۔ سوئے ادب نہ ہو تو عرض کروں۔ معلوم ہوتا ہے لکھنؤ کی مجلسی زندگی اور یہاں کے امراء اور رئیسوں کی صحبتوں سے زیادہ واسطہ نہیں رہا۔" بات بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ پچھلے ہی ماہ ان کا مین پوری سے ادھر تبادلہ ہوا تھا۔ تحصیل موہن لال گنج میں تعینات ہوئے تھے۔ وہیں حضور بیگم کی زرعی آراضی تھی۔ لہٰذا ان سے مراسم پیدا کرنا ضروری تھا۔ زمینداری کے سلسلے میں ہر وقت کا تو ان سے سابقہ رہتا تھا۔

داروغہ میر نصیر کی سفارش پر انہیں خاص طور پر مدعو کیا گیا تھا۔ عظمت اللہ خان نے نامساعد حالات میں آنکھ کھولی تھی۔ ہوش سنبھالتے ہی باپ داغ مفارقت دے گئے۔ بیوہ ماں نے تنگ دستی کے باوجود کسی نہ کسی طور پر تعلیم دلائی تھی۔ اور انہوں نے اس قدر محنت اور لگن سے پڑھا کہ ترقی کر کے تحصیل دار کے ب

تک پہنچ گئے۔ دو بیٹے تھے۔ اپنی ہی طرح ان کو بھی اعلیٰ تعلیم دلانے کے لئے کوشاں تھے فرصت کے اوقات میں خود ان کو پڑھاتے تھے انہوں نے سیدھی سادھی زندگی گزاری تھی۔ نہ کبھی کسی طوائف کے بالا خانے پر گئے نہ کبھی ساغر و مینا سے واسطہ رہا اور نہ کوئی اور ایسا شغل رہا۔ لکھنؤ میں نو وارد تھے انہوں نے فراخدلی سے اس کا اعتراف بھی کر لیا "نواب صاحب آپ کا قیاس بالکل درست ہے"۔ تحصیل دار صاحب نے بات بڑھانے سے گریز کیا۔

نواب تقی نے قدرے تامل کیا۔ پھر نرم اور شیریں لہجے میں وضاحت کی "حضت! اس حقیقت سے تو آپ بھی اتفاق کریں گے کہ اولاد کی تعلیم و تربیت کا فرض والدین پر واجب ہے۔ اُسے ابتدا ہی سے اپنے گرد و پیش کی زندگی کا زیادہ سے زیادہ ادراک ہونا چاہیئے تاکہ سن شعور کو پہنچ کر جب حقائق کا سامنا کرنا پڑے تو وہ بے خبر نہ ہو۔ قدم قدم پر ٹھوکر کھانے کی نوبت نہ آئے"۔ تحصیل دار صاحب کو اپنے ردّ عمل کے اظہار کا موقع ہی نہ ملا۔ نوابو مرزا نے جھٹ ہاں میں ہاں ملائی۔ "اے حضور! بالکل بجا فرمایا آپ نے۔ زندگی کے نشیب و فراز سے تو شروع ہی سے واقفیت حاصل ہونا ضروری ہے وہ کسی نے کیا خوب کہا ہے"۔ مگر ان کو کسی کا کہا ہوا برمحل شعر یا مقولہ یاد نہ آیا۔ تحصیل دار عظمت اللہ خان کو نوابو مرزا کی مداخلت شاق گزری مگر درگزر سے کام لیا۔ خاموش بیٹھے رہے۔

نواب تقی نے مزید وضاحت کی "خاں صاحب! سچ پوچھئے تو بزرگوں سے جو کچھ سیکھا ہے اس پر عمل پیرا ہوں۔ خلد آشیانی قبلہ والد صاحب تو اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت کا اس قدر خیال رکھتے تھے کہ نہ صرف میرے اتالیق بلکہ انّا، دَدّا اور چھُو چھُو تک کو اس وقت تک ملازم نہ رکھا جب تک ان کے ماحول، کردار، حسب نسب کے بارے میں جملہ کوائف کی تحقیق نہ کر لی"۔ انہوں نے تحصیل دار صاحب کے چہرے کو نظر بھر کر دیکھا "صرف اتالیق کی تعلیم و تربیت پر اکتفا نہ کیا۔ دیگر ذرائع بھی آزمائے۔ لڑکپن میں مجھے آداب مجلس کی تربیت حاصل کرنے کے لئے نوروزی خانم

کے پاس ایک ملازم کے ہمراہ بھیجا کرتے تھے۔ وہ تو میرے اتالیق کو بھی ساتھ ہی بھیجنا چاہتے تھے۔ مگر ان کا تعلق خاندان اجتہاد سے تھا۔ نہایت ثقہ قسم کے بزرگ تھے انہوں نے معذرت کر لی تو قبلہ والد صاحب پہلی بار خود اپنے ہمراہ نوروزی خانم کے گھر لے گئے تھے۔ نوروزی ڈیرے دار طوائف تھی۔ مگر کیا پاکیزہ مذاق پایا تھا۔ پچھلے ہی سال تو اس کا انتقال ہوا ہے۔" نواب صاحب نے دل گرفتہ ہو کر آہ سرد کھینچی۔

تحصیلدار صاحب خاموشی سے نواب صاحب کی باتیں سنتے رہے۔ نواب مرزا اس بار بھی خاموش نہ رہ سکے۔ نواب صاحب کی تائید میں مسکرا کر گویا ہوئے۔ "اے سبحان اللہ نوروزی خانم کی بھی کیا بات ہے۔ کیا نفاست طبع تھی۔ ایسا شُستہ اور شگفتہ لب و لہجہ۔ بولتیں تو جیسے منہ سے پھول جھڑتے تھے۔ حاضر جوابی، لطیفہ سنجی، شعر فہمی، رہن سہن، نشست برخاست، لباس میں نفاست، کس کس خوبی کو بیان کروں۔ جوانی میں ان کو دیکھا تھا۔ کس قیامت کا حسن و جمال پایا تھا۔ رقص و موسیقی میں تو ان کا جواب نہ تھا، کیا رکھ رکھاؤ تھا۔ کیا سلیقہ تھا۔ کیا شائستگی تھی۔" نواب مرزا نے داد طلب نظروں سے نواب نقی کی جانب دیکھا۔

اور نواب نقی نے داد بھی دی۔ "واللہ مرزا صاحب! بالکل درست فرمایا آپ نے کتنی ہی بھولی بسری یادیں تازہ ہو گئیں۔" نواب نقی ابھی کچھ اور کہنا چاہتے تھے اسی اثناء میں ملازم نے حاضر ہو کر اطلاع دی کہ دستر خوان بچھ چکا ہے، کھانا چنا جا رہا ہے۔ آدھی رات گزر چکی تھی خسرو پر نیند کا غلبہ ہوا۔ وہ جھومتے جھومتے نواب نقی کی کمر سے لگ کر سو گیا۔ نواب صاحب کے حکم پر ایک ملازم اُسے گود میں اٹھا کر باہر لے گیا۔ کھلائی کے سپرد کیا تا کہ وہ اپنی خواب گاہ میں آرام سے سو سکے۔

☆

بسم اللہ کی رسم ادا ہونے کے بعد خسرو کی تعلیم کا باقاعدہ آغاز ہو گیا۔ مگر یہ سلسلہ سال بھر بھی جاری نہ رہ سکا۔ خسرو کے استاد، سلطان المدارس کے فارغ التحصیل تھے۔ درس و تدریس کا بھی خاصہ تجربہ رکھتے تھے۔ ان کا تعلق مجتہدین کے ایک ممتاز

خانوادے سے تھا۔ مگر مزاج کے بہت کڑوے تھے بوڑھے بھی ہو گئے تھے۔ الفاظ کے دروبست اور تلفظ کی صحت کا بہت خیال رکھتے تھے۔ خسرو کی بچی عمر تھی۔ زبان سے الفاظ صحیح طور پر ادا نہ ہوتے۔ دوسری طرف مولوی صاحب، الفاظ کو ان کے درست مخرج کے ساتھ ادا کرنے۔ شین قاف کی ادائیگی پر ضرورت سے زیادہ زور دیتے۔

خسرو ان کی طرح حلق کے اندر سے آواز نکال کر کسی لفظ کو نہ پڑھتا تو سخت خفا ہوتے۔ قہر آلود نظروں سے گھور کر دیکھتے۔ خسرو ان کی خفگی سے سہم کر رہ جاتا ان کی ہدایت کے مطابق صحیح تلفظ ادا کرنے کی کوشش بھی کرتا۔ مگر اکثر کامیاب نہ ہوتا۔ مولوی صاحب پیچ و تاب کھا کر رہ جاتے۔

ایک روز مولوی صاحب کسی لفظ کو بار بار اس کے صحیح مخرج کے ساتھ دُہراتے رہے لیکن خسرو ان کی ہدایت کے باوجود مناسب لہجے میں اسے ادا نہ کر سکا۔ مولوی صاحب کے ضبط کا دامن چھوٹ گیا۔ ایسے جلال میں آئے کہ تڑاق سے گال پر تھپڑ رسید کیا۔ ہاتھ ایسا زنّاٹے کا پڑا کہ خسرو تیورا کر فرش پر گر گیا۔ نرم و نازک رخسار پر انگلیوں کا نشان بن گیا۔

خسرو نواب زادہ تھا۔ ناز و نعم میں پلا تھا۔ کبھی کسی نے اُسے پھول کی چھڑی بھی نہ لگائی تھی۔ مار تو ایک طرف رہی گھڑکی بھی نہ دی تھی۔ مولوی صاحب کا تھپّڑ کھا کر وہ۔ بلبلا اٹھا۔ روتا بلکتا اُٹھ کر سیدھا والدہ ماجدہ کے پاس پہنچا۔ بہت فیل مچایا رو رو کر مولوی صاحب کی مار کے بارے میں ماں کو بتایا۔

حضور بیگم اپنے لاڈلے بیٹے کا حالِ زار دیکھ کر تڑپ اُٹھیں۔ بڑھ کر خسرو کو سینے سے لگایا اور مولوی صاحب کو کوسنے لگیں۔ "اے موئے کے منہ پر جناب سیّدہ کی جھاڑو پھرے۔ مارنے والے کے ہاتھ ہی ٹوٹ جائیں۔ کم بخت نے ایسا مارا کہ پھول سے رخسار پر پانچوں انگلیوں کے نشان پڑ گئے۔" انہوں نے بیٹے کو پیار کیا چمکارا۔ دل جوئی کی۔ اے ماں تجھ پر واری جائے۔ نا بابا! مجھے اس قصائی سے اپنے لال

کو نہیں پڑھوانا۔ ویسے بھی پڑھا لکھا کر نوکری چاکری تو کروانا نہیں۔ اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ گاؤں گراؤں ہیں، جائیداد ہے۔ باپ کا وثیقہ ہے۔ ماں کا بھی وثیقہ ہے بس اتنا پڑھ لکھ لینا کافی ہے کہ دستخط کر کے وثیقہ وصول کر لے اور اب تو اتنا پڑھ لکھ بھی لیا ہے۔"

حضور بیگم نے اسی وقت مولوی صاحب کو پورے مہینے کی تنخواہ دے کر چلتا کیا۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ان کی چھٹی ہو گئی۔

استاد کی چھٹی ہوئی تو خسرو کو بھی پوری پوری چھٹی مل گئی۔ کئی اتالیق بھی مقرر کئے گئے مگر کوئی ٹک نہ سکا۔ خسرو ان کی ایک نہ سنتا۔ اپنی من مانی کرتا۔ اماں جان اس کی حوصلہ افزائی کرتیں۔ اس کا تمام وقت کھیل کود میں بسر ہوتا۔ ہر طرح کا لاڈ پیار ہوتا۔ ناز نخرے اٹھائے جاتے۔ ماں باپ کے تو گلے کا ہار تھا۔ صورت شکل اچھی تھی۔ رنگ روپ اور بھولپن ایسا تھا کہ بے اختیار پیار آتا تھا۔ خادمائیں اور ماما ئیں تک جان چھڑکتی تھیں۔ نواب تقی نے آداب مجلس کی تربیت، خوش ذوقی اور شائستگی سیکھنے کے لئے کسی ڈیرے دار طوائف کے بالا خانے پر تو نہ بھیجا مگر خود بارہ دری میں کئی ایسی خادمائیں تھیں جو خسرو پر ہزار جان سے فریفتہ تھیں۔ چھپ چھپ کر اس طرح چوما چاٹی کرتی تھیں کہ خسرو جوان ہونے سے پہلے ہی جوانی کے کتنے ہی رازہائے سربستہ سے واقف ہو گیا۔

زنان خانے سے باہر جاتا تو نوکر چاکر پیادا ور دشت کی آڑ میں طرح طرح سے مٹھار تے۔ اپنے ڈھب پر لانے کی کوشش کرتے۔ ایک دربان تو ایسا ہاتھ دھو کر پیچھے پڑا کہ باقاعدہ عشق کرنے لگا اور رفتہ رفتہ اپنے ڈھرّے پر لانے میں کامیاب بھی ہو گیا۔ چوری چھپے اسے دیوان خانے کے تہہ خانے میں لے جاتا۔ حالانکہ خود نواب تقی بھی اس عمر میں کبھی ایسے ہی مراحل سے گزر چکے تھے مگر اپنے تلخ تجربات کے باوجود بیٹے کی طرف سے بالکل آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ انہیں طرح طرح کے دوسرے مشاغل سے اتنی فرصت ہی نہ ملتی کہ بیٹے کی جانب توجہ صرف کرتے۔

مگران کو یہ مان ضرور تھا کہ خسرو آگے چل کر ان کا اور ان کے خاندان کا نام روشن کرے گا وہ حضور بیگم سے برملا اس کا اظہار بھی کرتے اور وہ خوشی سے نہال ہو جاتیں لیکن نواب تقی کو اچانک یہ علم ہوا کہ خسرو نے ابھی سے ان کا نام روشن کرنا شروع کر دیا تھا۔ ہوا یہ کہ ایک روز معمول کے مطابق وہ حضور بیگم کے ساتھ ناشتہ کرنے کے بعد زنان خانے سے باہر آئے تو پائیں باغ کے ایک گوشہ سے آواز ابھری "ابے بھسنڈ کے سالے، میں تیری ایسی کی تیسی کر کے رکھ دوں گا۔" ساتھ ہی ایک غلیظ گالی بھی ان کے کان میں پڑی۔ آواز خسرو کی تھی۔ نواب تقی مُناٹے میں آ گئے۔ مڑ کر دیکھا خسرو ایک نوجوان ملازم کے ساتھ دھینگا مشتی کر رہا تھا، دھڑلے سے ٹکسالی گالیاں بک رہا تھا۔

نواب صاحب نے یہ لچھن دیکھے تو تشویش لاحق ہوئی کہ کہیں بیٹا بُری صحبت میں پڑ کر بگڑ نہ جائے۔ لیکن وہ پہلے ہی خاصہ بگڑ چکا تھا۔ گیارھویں برس میں لگ چکا تھا مگر الف کے نام ب نہ جانتا تھا۔ حالانکہ پیدائش کے ساتھ ہی انّا اور کھلائی مقرر کر دی گئی تھیں۔ اور ملازم رکھنے سے قبل ان کے حسب نسب اور چال چلن کے بارے میں پوری پوری چھان بین بھی کر لی گئی تھی تا کہ ان کی نگرانی میں بچے کی اٹھان اچھی ہو۔ مہذب اور شائستہ ہو۔ فحش کلامی اور بداطواری اس کے قریب نہ پھٹکے کھانے پینے، اُٹھنے بیٹھنے، بات چیت، سونے اور آرام کرنے کے سلسلے میں ہر طرح کی دیکھ بھال کی جاتی۔

نواب تقی نے خسرو کو ملازم کے ساتھ دھینگا مشتی کرنے پر سختی سے ٹوکا تنبیہہ کی اُسے زنان خانے میں بھیجا اور اسی کے بارے میں سوچتے ہوئے دیوان خانے میں پہنچے۔ دیکھا تحصیلدار عظمت اللہ خاں انتظار کر رہے ہیں۔ نواب تقی حسب معمول نہایت گرم جوشی اور تپاک سے ملے۔ شکوہ کیا۔ "خاں صاحب! بھئی آپ نے تو حد کر دی۔ اپنی آمد کی اطلاع بھی نہ کرائی۔ آپ کب تشریف لائے؟" تحصیل دار صاحب نے مسکرا کر جواب دیا۔ "کچھ دیر پہلے آیا تھا۔ معلوم ہوا آپ اندر ناشتہ فرماتے ہیں۔ دخل دینا

مناسب معلوم نہ ہوا۔" نواب تقی مُسکراتے ہوئے ان کے قریب ہی بیٹھ گئے۔ اب تحصیل دار صاحب سے ان کے اس قدر گہرے مراسم ہو گئے تھے کہ وہ اکثر آجاتے، نواب صاحب بھی ان کے پاس جاتے رہتے تھے۔ تحصیل دار صاحب کبھی سرکاری دورے پر ہوتے یا کسی سبب سے ملاقات میں لمبی تاخیر ہوتی تو نواب صاحب ملازم کو بھیجتے، تحصیل دار صاحب کی خیریت معلوم کراتے۔ اصرار کر کے بلا لیتے۔

نواب صاحب زمین داری کے معاملات کے علاوہ ان سے دوسرے نجی مسائل پر بھی تبادلۂ خیالات کرتے رہتے تھے۔ اور ان کی رائے کو اہمیت بھی دیتے تھے۔ اس وقت اتفاق سے کوئی مصاحب اور حاضر باش موجود نہ تھا۔ وہ ناشتے سے کچھ جلد ہی فارغ ہو کر دیوان خانے میں آ گئے تھے۔ انھوں نے خسرو کے بارے میں بھی اپنی تشویش کا عظمت اللہ خاں سے ذکر کیا۔ خلاف توقع تحصیل دار صاحب نے مُسکرا کر بے تکلفی سے اپنے ردِعمل کا اظہار کیا۔ معاف کیجئے گا نواب صاحب آپ کے صاحبزادے میں تو کچھ ایسی خصوصیات پائی جاتی ہیں جو نواب آصف الدولہ کے لڑکپن کے بارے میں مشہور ہیں۔ ان کے والد بزرگوار نواب شجاع الدولہ نواودھ کے حکمراں تھے انھوں نے تو اپنے فرزند دلبند کے اوباش اور بد وضع ہم نشینوں میں سے بعض کو توحبسِ دوام کی سزا دی اور بعض پر ایسا عتاب نازل ہوا کہ پتھروں سے بندھوا کر رات کے اندھیرے میں غرق دریا کر دیا۔ لیکن آپ نواب شجاع الدولہ نہیں ہیں کہ ایسی کڑی اور عبرتناک سزائیں دے سکیں۔ آپ کو تو ان بدکردار اور بدچلن خدمت گاروں کی صحبت سے صاحبزادے کو محفوظ رکھنے کے لئے کچھ اور ہی تدارک کرنا ہوگا اور فوری طور پر کرنا ہوگا۔" ان کا لہجہ بتدریج سنجیدہ ہوتا گیا۔

نواب تقی کو ان کی گفتگو کا طنزیہ انداز کسی قدر ناگوار گزرا۔ مگر طرح دے گئے تحصیل دار صاحب ترقی کر کے اب ڈ پٹی کلکٹر ہو گئے تھے ابھی ان کی ترقی کے احکامات جاری نہ ہوئے تھے۔ مگر اس کی اطلاع تحصیل دار صاحب کو مل چکی تھی اور یہ خوش خبری نواب صاحب کو سنا بھی چکے تھے۔ لہٰذا نواب صاحب کے دل میں عزت و احترام کے ساتھ ساتھ ان کا رعب و دبدبہ بھی بیٹھ گیا تھا۔ دوسرے اُمراء اور رئیسوں کی

طرح نواب تقی بھی سرکار دربار میں اثر ورسوخ حاصل کرنے کے لئے کوشاں رہتے تھے۔ عظمت اللہ خاں بھی اب بڑے سرکاری حکام کے زمرے میں شامل ہو گئے تھے۔

نواب صاحب نے پریشان ہو کر استفسار کیا۔ "خاں صاحب! یہ خیال آپ کے ذہن میں کیسے آیا؟" انھوں نے تامل کیا۔ "میرا خیال ہے کسی نے آپ کو غلط اطلاع دی" تحصیل دار صاحب نے فوراً وضاحت کی۔ "قبلہ، اطلاع کیسی۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اور اُسے زیادہ دیر بھی نہیں ہوئی۔ میں جس وقت دیوان خانے میں داخل ہوا، خسرو ایک ملازم کے ہمراہ تہہ خانے سے برآمد ہوا۔ وہ جس عالم میں تھا، مجھے یہ دیکھ کر سخت صدمہ ہوا۔ میں تو اس سلسلے میں خود آپ سے بات کرنا چاہتا تھا۔ آپ سے تعلقات کی نوعیت ایسی ہے کہ میں خسرو کو بھی اپنے ہی بچوں کی طرح سمجھتا ہوں۔ کیا عرض کروں، میرے دل کو کیسی ٹھیس لگی۔" نواب تقی ان کی باتیں سن کر سخت پریشانی میں مبتلا ہو گئے۔

نواب صاحب نے عظمت اللہ خان سے خسرو کے بارے میں سنجیدگی سے مشورہ کیا۔ انھوں نے خسرو کی تعلیم از سر نو شروع کرانے پر نہ صرف زور دیا بلکہ نواب صاحب کو اس کے لئے امادہ بھی کر لیا۔

عظمت اللہ خان نے چند ہی روز میں خسرو کی تعلیم کے لئے ایک استاد کا بندوبست بھی کر دیا۔ یہ نئے استاد نہ کسی دینی مدرسے کے فارغ التحصیل تھے نہ ان کا تعلق خاندان اجتہاد سے تھا اور نہ ہی ان کو شین قاف درست کرانے کا مراق تھا۔ ان کا نام ماسٹر بھگوتی پرشاد سکسینہ تھا۔ ذات کے کائستھ تھے۔ حلیم الطبع اور منکسرالمزاج تھے۔ نرم اور شگفتہ لہجے میں بات کرتے تھے۔ درس و تدریس کا پرانا تجربہ رکھتے تھے ایک سرکاری اسکول میں پڑھاتے بھی تھے۔

خسرو کی طبیعت پڑھنے لکھنے سے اُچاٹ ہو چکی تھی۔ وہ تعلیم حاصل کرنے سے جی چراتا تھا۔ حیلے بہانے کر کے غائب ہو جاتا۔ طرح طرح سے استاد کو پریشان کرتا۔ مگر ماسٹر بھگوتی پرشاد سکسینہ نے خسرو میں تعلیم کی لگن پیدا کرنے کی گویا قسم کھا رکھی

تھی انہوں نے ہمت نہ ہاری اپنی کوشش میں لگے رہے۔ سختی کے بجائے نرمی اور محبّت کا رویّہ اختیار کرتے۔ شفقت سے اسے سمجھاتے بجھاتے۔ زندگی کے نشیب و فراز سے آگاہ کرتے۔ دلچسپ اور عام فہم انداز میں تعلیم دیتے۔

ماسٹر بھگوتی پرشاد کی انتھک کوششوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ خسرو کو نہ صرف پڑھنے لکھنے سے دلچسپی پیدا ہو گئی بلکہ نوکروں چاکروں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا بالکل ترک کر دیا ماماؤں اور لونڈیوں کے ساتھ ٹھٹھول بھی ختم کر دی۔ زیادہ سے زیادہ تعلیم پر توجہ صرف کرنے لگا۔ دو سال گھر پر تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ اس قابل ہو گیا کہ ماسٹر بھگوتی پرشاد نے کوشش کر کے حسین آباد ہائی اسکول کی پانچویں جماعت میں داخلہ بھی دلا دیا۔

خسرو ذوق شوق سے پڑھتا رہا۔ ساتویں جماعت تک ہر سالانہ امتحان میں کامیاب ہوتا رہا مگر آٹھویں جماعت میں پہنچ کر وہ ایسا اٹکا کہ دو سال مسلسل ناکام ہوتا رہا۔ پڑھائی سے ایک بار پھر اس کا دل اچاٹ ہو گیا۔ کئی کئی روز اسکول نہ جانا۔ یار دوستوں کے ساتھ واہی تباہی گھومنا پھرتا۔

نواب تفی کو خسرو کی اس بے راہ روی کی اطلاع مل چکی تھی۔ مگر انہوں نے چشم پوشی سے کام لیا۔ حضور بیگم کو بھی آگاہ نہ کیا۔ حالانکہ ان کو بھی کچھ شبہ ہو گیا تھا۔ انگریزی تعلیم کے تو وہ شروع ہی سے سخت خلاف تھیں۔ اب ان کو اس کی تعلیم منقطع کرانے کا عذر بھی مل گیا تھا۔

تعلیم منقطع کرانے کے بعد حضور بیگم کا ارادہ تھا کہ خُسرو کی شادی کر دی جائے۔ وہ شادی کے بارے میں سوچ ہی رہی تھیں کہ خسرو عین بھری جوانی میں داغ مفارقت دے گیا۔

حضور بیگم کو جوان بیٹے کا غم اس طرح کھا گیا کہ سارا رنگ روپ اجڑ گیا ہر دم بستر پر پڑی آہیں بھرتی رہتیں۔ خدا خدا کر کے اس غم سے ذرا سنبھلی تھیں کہ ایک اور جانکاہ صدمہ پہنچا یہ جان چھڑکنے والے شوہر کی دائمی جدائی تھی۔ اس

سانحہ نے ان کی رہی سہی صحت بھی برباد کر دی۔ وہ نڈھال اور تھکی تھکی سی نظر آتیں۔ ذرا سی مشقت پر بری طرح ہانپنے لگتیں۔ عزیز و اقارب کے پاس آنا جانا نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا۔ کسی تقریب میں کم ہی شریک ہوتیں۔ محفل میں بھی کم ہی بولتی نظر آتیں۔ گم صم بیٹھی رہتیں۔

جوان بیٹے اور چاہنے والے شوہر کے بچھڑنے کے بعد ان کی ساری توجہ کا مرکز طلعت آرا بن گئی تھی۔ وہ ہی ان کی بچی کھچی خوشیوں کا سہارا رہ گئی تھی۔

(۳)

طلعت آرا اپنے کمرے میں تھی اور ابھی تک جاگ رہی تھی۔

گرم پانی سے غسل کرنے کے بعد طبیعت میں کسی قدر تازگی آ گئی تھی۔ اس نے سرخ عروسی جوڑا تبدیل کر دیا تھا اور اب عام اُجلا لباس پہنے ہوئے تھی۔ وہ تکیہ کے سہارے بستر پر نیم دراز تھی۔ جسم پر رضائی پڑی تھی۔ وہ کھوئی کھوئی نظروں سے در و دیوار کو تک رہی تھی۔ چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔ اس پر کسی قسم کے تاثرات نظر نہ آتے تھے۔

مغلانی دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوئیں۔ طلعت آرا نے نظریں اٹھا کر اُن کو دیکھا۔ نہ بات کی، نہ آداب کیا، نہ احتراماً اُٹھ کر بیٹھی۔ چُپ چاپ لیٹی رہی۔ رات بھر میں وہ بالکل بدل گئی تھی۔ نہ کسی سے بول رہی تھی نہ بات کر رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر جیسے تالا لگ گیا تھا۔

مغلانی نے کھنکار کر طلعت آرا کو اپنی جانب متوجہ کیا۔ نرم لہجے میں پوچھا "چھوٹی سرکار، آپ ناشتہ نہیں کریں گی؟" مغلانی نے قدرے تامّل کیا۔ "میں بڑی سرکار کے پاس گئی تھی، وہ تو بے خبر سو رہی ہیں۔"

طلعت آرا نے کوئی جواب نہ دیا۔

مغلانی سنبھل سنبھل کر بولتی رہیں۔ "اے چھوٹی سرکار آپ سے کیا عرض

کروں"۔ انہوں نے ٹھنڈی سانس بھری۔" ہائے کل کس قیامت کی رات تھی۔ رہ رہ کے ہول اٹھتا تھا۔ نہ جانے کیسے کیسے خیالات دل میں آتے تھے۔ نہ کھانے کا ہوش تھا نہ پینے کا قسم لے لیجئے جو کھیل بھی اُڑ کر مُنہ میں گئی ہو کسی نے بھی تو کچھ نہیں کھایا۔ دل نے گوارا ہی نہ کیا۔"

طلعت آرا نے ان کی باتیں سن کر کسی ردعمل کا اظہار نہ کیا۔ جس عالم میں لیٹی تھی اسی طرح لیٹی رہی۔ نہ زبان سے کچھ کہا نہ مُڑ کر مغلانی کی جانب دیکھا۔

"بڑی سرکار کی پریشانی تو دیکھی نہ جاتی تھی"۔ مغلانی اسے بتاتی رہیں۔" روتے روتے ان کے پپوٹے سوج گئے۔ پل بھر کو آنکھ نہ لگی۔ سب ہی جاگ رہے تھے رات کے پچھلے پہر بستر پر جا کر لیٹی تھی۔ وہ بھی جب بڑی سرکار نے بہت اصرار کیا بس آنکھ لگی ہی تھی کہ بڑی سرکار نے آپ کے واپس آنے کی اطلاع دی۔ وہ تو برابر جاگتی ہی رہی تھیں"۔ مغلانی زیرلب مُسکرائیں۔" اب آپ کی واپسی کے بعد ذرا سکون نصیب ہُوا تو ایسی بے خبر سو رہی ہیں کہ میں کئی بار کمرے میں گئی۔ ان کو مطلق خبر نہ ہوئی۔"

طلعت آرا بدستور خاموش رہی۔

مغلانی نے کچھ نہ کہا۔ خاموشی سے طلعت آرا کے پاس ہی بیٹھ گئیں۔ انہوں نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ بے قرار ہو کر پوچھا۔" مجھ سے ناراض ہیں"؟

طلعت آرا ٹس سے مس نہ ہوئی۔ مغلانی دل گرفتہ ہو گئیں۔" اس گھر کے سوا میرا کونسا ٹھکانہ ہے۔ مجبور و بے بس ہوں۔ بے یار و مددگار ہوں۔ اس بھری دنیا میں میرا اور کون ہے"۔ ان کی آواز بھرّا گئی۔

طلعت آرا نے مُڑ کر مغلانی کی جانب دیکھا مگر زبان سے کچھ نہ کہا۔

مغلانی اُٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔" میں آپ کے لئے ناشتہ بھجوائے دیتی ہوں" یہ کہتے کہتے ان کا گلا رندھ گیا۔ آنکھیں بھر آئیں۔ وہ دوپٹے کے آنچل سے آنسو پونچھتی ہُوئی کمرے سے باہر چلی گئیں۔

وہ اس وقت بہت غمزدہ اور دل شکستہ تھیں۔ طلعت آرا سے ٹوٹ کر محبت کرتی

تھیں۔وہ بھی ان سے مانوس تھی ۔ بزرگوں کی طرح ان کا ادب لحاظ کرتی تھی۔ نہ کبھی ان سے زبان درازی کی نہ پلٹ کر جواب دیا۔ان کی کوئی بات ناگوار گزرتی تو طرح دے جاتی۔یہی وجہ تھی کہ طلعت آرا کا رویّہ ان کو بہت شاق گزرا۔

☆

طلعت آرا بی مغلانی کے ہاتھوں پلی بڑھی تھی۔جب وہ پیدا ہوئی تو مغلانی ہی نے اسے شہد چٹایا تھا۔ چھوٹی بڑی ہڑ،منقّا، باؤ بڑنگ ، باؤ کھمبہ،عناب،سونف گلاب کے پھول، گلاب کا زیرہ، نرکچور، املتاس اور مصری ہاون دستے میں کٹوا کر اپنے سامنے گھٹّی تیار کرائی تھی اور خود اپنے ہاتھ سے ننھی سی طلعت آرا کو دی تھی۔

زچّہ کے سرہانے چھری بھی مغلانی نے شگون کے طور پر رکھی تھی تا کہ بھوت پریت اور کسی طرح کے آسیب کا اثر نہ ہو۔تعویز انہوں نے پہلے ہی منگوا لئے تھے۔ان تعویذوں کو حضور بیگم کے پلنگ کے ارد گرد دیواروں پر چپیاں کر دیا تھا دو تعویز موم جامے میں لپیٹ کر پلنگ کے سرہانے کے دونوں پایوں سے باندھ دیئے تھے ۔رات کو وہ حضور بیگم کے پاس ہی رہتی تھیں۔طلعت آرا کلبلاتی بھی تو اُٹھ کر فوراً اس کے پاس پہنچ جاتیں ۔تھپک تھپک کر سلاتیں۔ چھ راتیں تو آنکھوں میں کٹیں۔وہ پل بھر کے لئے نہ سوئیں۔رات بھر چراغ روشن رکھتیں۔ بار بار تیل ڈالتیں۔ چراغ کی مدھم لو اونچی کرتیں۔

طلعت آرا جب پیدا ہوئی تو جاڑے کا موسم تھا۔ تمام شب زچّہ خانے کے اندر انگیٹھیوں میں کوئلے دہکتے رہتے۔بلاؤں اور بدروحوں سے زچّہ اور ننھی سی جان طلعت آرا کو محفوظ رکھنے کے لئے مغلانی وقفے وقفے سے انگیٹھیوں کے سُرخ سُرخ انگاروں پر کالا دانا ڈالتی رہتیں۔ویسے زچّہ خانے کے باہر بھی دن رات لکڑی کے بڑے بڑے کُندے سلگتے رہتے ۔کُندوں کے قریب ہی صندل اور لُوبان رکھا رہتا۔مغلانی باہر جاتیں اور جب واپس آتیں تو صندل اور لُوبان جلتے ہوئے کُندوں پر ڈالتیں اور ان سے اُٹھتے ہوئے خوشبو دار دھوئیں پر پاجامے کے پائنچے جھٹکنے اور جھاڑنے کے بعد ہی دوبارہ زچّہ خانے کے اندر داخل ہوتیں۔زچّہ

کے پاس دائی اور دوسری عورتیں بھی جانے سے پہلے ایسا ضرور کرتیں۔

زچہ کے لئے اچھوانی بھی مغلانی نے خود تیار کی تھی۔ اجوائن کا عرق نکال کر کڑکڑاتے گھی میں ڈالا۔ اوپر سے شکر کا قوام ملایا۔ جب خوب پک گیا تو سونٹھ ڈالی اچھوانی تیار ہو جاتی تو حضور بیگم کو تینوں وقت اپنے ہاتھ سے پلاتی تھیں۔ گوند کھانے میں حضور بیگم بچر بچر کرتیں تو اصرار کر کے کھلاتیں۔ ہر معاملے میں وہ پیش پیش رہتیں۔ دن رات ان کی دیکھ بھال میں اس طرح لگی رہتیں کہ ان کو اپنے آپے کا بھی ہوش نہ رہتا۔ یہ بھی خبر نہ ہوتی کہ کب شام ہوئی کب صبح۔

مگر جب خسرو کی پیدائش ہوئی تھی تب مغلانی نے حضور بیگم کی دیکھ بھال میں ایسی مستعدی اور تندھی کا مظاہرہ نہ کیا تھا۔ ان دنوں ان کی راتیں معمول کے مطابق اپنی کوٹھری میں بسر ہوتی تھیں۔ پہر رات گزرتے ہی وہ بناؤ سنگار کر کے بیٹھ جاتیں اور نواب تقی کا بے چینی کے ساتھ انتظار کرتیں۔ اس وقت تک نواب تقی کا التفات کم ہوتے کے باوجود یکسر ختم نہ ہوا تھا۔ وہ اکثر رات گئے۔ چوری چھپے ان کی کوٹھری میں پہنچ جاتے۔

خسرو کی پیدائش پر جس قدر دھوم دھڑکا ہوا تھا طلعت آرا کی پیدائش پر اتنا اہتمام نہ ہوا۔ اس کا ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ خسرو پہلوٹی کا بیٹا تھا اور طلعت آرا دوسری اولاد ہونے کے علاوہ بیٹی تھی۔ ویسے ننھیال سے اس کی چھٹی بھی آئی تھی۔ خوب گانا بجانا ہوا تھا۔ مہمان بھی آئے۔ ضیافت بھی ہوئی۔ لیکن اب نہ صرف دادی بلکہ نانی بھی اللہ کو پیاری ہو چکی تھیں۔

طلعت آرا کی پیدائش پر مغلانی پیش پیش تھیں۔ زچہ خانے کا سارا بند و بست انھی کے سپرد تھا۔ اس میں شک نہیں کہ انھوں نے نہایت مستعدی اور سرگرمی سے یہ خدمت انجام بھی دی۔ حضور بیگم چھٹی کا نہان نہائیں تو وہ موجود رہیں۔ دوسرے نہان پر بھی وہ برابر دائی کا ہاتھ بٹاتی رہیں۔ آخر بڑا نہان آیا۔ حضور بیگم کو چوکی پر بٹھا کر دائی نے نیم گرم پانی زچہ کے بدن پر ڈالا۔ خوب مل مل کر نہلایا۔ نہان

سے جب وہ فارغ ہوئیں تو ایک ایسی رسم ادا کی گئی جو خسرو کی ولادت پر نہ ہوئی تھی یہ بڑی انوکھی اور عجیب و غریب رسم تھی۔ حضور بیگم کو چوکی پر کھڑا کیا گیا ان کے جسم پر کوئی لباس نہ تھا وہ دونوں ہاتھ رانوں کے درمیان دبائے ہوئے پورے قد سے اس طرح جھکی ہوئی تھیں کہ ان کا جسم قریب قریب دوہرا ہو گیا تھا۔ دائی اور مغلانی کے علاوہ حضور بیگم کی نند، نفیسہ بیگم اور بھانجی خورشید جہاں ارد گرد حلقہ بنائے کھڑی تھیں۔ اسی عالم میں خسرو کو بلایا گیا۔ اس کے تمام کپڑے اتروائے گئے۔ لاڈلی دائی کی ہدایت پر ماں نے نگاہیں اٹھائیں اور نظر بھر کر خسرو کے برہنہ جسم کے نچلے دھڑ کو دیکھا۔ کم سن فخرو ہکّا بکّا کھڑا ایک ایک کا منہ تکتا تھا۔ باہر ڈومنیاں ڈھولک کی تھاپ پر لہک لہک کر گا رہی تھیں۔

لو رنگ چوڑے والیاں، میری بچارانیاں
سوہا جوڑا پہن، سہاگن موتی بھری مانگ
لو رنگ چوڑے والیاں
میری بچارانیاں، اے میری بچارانیاں

خسرو کو کپڑے پہنائے گئے اور باہر لے جا کر کھلائی کے سپرد کر دیا گیا۔ حضور بیگم کے برہنہ جسم پر فوراً اجلی چادر ڈال دی گئی وہ سردی سے کپکپا رہی تھیں رسم ادا ہو چکی تھی یہ رسم کیا تھی ٹوٹکا تھا تاکہ آئندہ اولاد نرینہ پیدا ہو۔ ٹوٹکا کارگر ثابت ہوا۔ طلعت آرا کے بعد نواب نقی کا دوسرا بیٹا پیدا ہوا۔ لیکن وہ حضور بیگم سے نہیں دلاری کے بطن سے تھا۔ مغلانی کو دلاری کبھی ایک آنکھ نہ بھائی۔ اسے دیکھ کر وہ دل ہی دل میں سلگتی تھیں موقع ملتا تو جلی کٹی سنانے سے بھی نہ چوکتیں۔

(۴)

مغلانی کو بیتے دنوں کی ایک ایک بات یاد آ رہی تھی۔
طلعت آرا کو گم صم اور خود فراموشی کے عالم میں دیکھ کر وہ دل گرفتہ ہو گئی

تھیں۔ اس نے کبھی ان کے ساتھ ایسی بے رُخی نہ برتی تھی۔ خدا معلوم اس پر پچھلی رات کیا افتاد پڑی کہ بالکل بدل گئی تھی وہ طلعت آرا ہی نہ رہی تھی جو ہر وقت ہنستی مسکراتی رہتی تھی۔

وہ طلعت آرا کے بارے میں سوچتی ہوئی دالان سے نکل کر صحن میں پہنچ گئیں۔ پہر دن گزر چکا تھا۔ سنہری دھوپ اُونچی اُونچی دیواروں سے اُتر کر صحن میں پھیلتی جا رہی تھی۔

سامنے سے ایک ماما نمودار ہوئی مغلانی نے اُسے ٹوکا۔ "ذری بات تو سُن"۔ وہ ٹھہر گئی۔ مغلانی نے اسے ہدایت دی۔ "جلدی سے جا کر چھوٹی سرکار کے لئے ناشتہ بھجوا دے۔ وہ ابھی جاگ رہی ہیں"۔

ماما باورچی خانے کی جانب چلی۔ مغلانی اپنی کوٹھری کی سمت مڑیں۔ وہ بہت تھکی ہوئی اور نڈھال ہو رہی تھیں۔ نیند سے آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں۔ ذہنی طور پر سخت پریشان بھی تھیں۔ وہ اب بستر پر لیٹ کر آرام کرنا چاہتی تھیں۔

مگر وہ اپنی کوٹھری میں نہ گئیں سیدھی حمام میں پہنچیں۔ انہوں نے دیکھا۔ کھونٹی پر وہ سُرخ جوڑا لٹکا ہوا تھا جو طلعت آرا واپسی پر سویرے پہنے ہوئے تھی۔ جوڑا خاصا بھاری تھا۔ پائیجامہ زربفت کا تھا اس پر چار انگل چوڑا گوٹا ٹنکا تھا۔ شلوکا البتہ سادا ریشمی تھا۔ اور ڈوپٹے پر کامدانی کا نہایت عمدہ کام تھا۔ اس عروسی لباس کو حمام میں چھوڑنا مناسب نہ تھا۔

مغلانی نے جوڑے کو تہہ کیا۔ بغل میں دبا کر اوپر سے دلائی اوڑھ لی تاکہ کسی لونڈی ماما کی اس پر نظر نہ پڑے۔ خواہ مخواہ بات کا بتنگڑ بنتا۔ سویرے جب انہوں نے طلعت آرا کو حمام میں پہنچایا تھا تو اس وقت تک بجز افسری کے جو فانوس اور مردنگیں بجھا رہی تھی سب خادمائیں اپنی کوٹھریوں میں سو رہی تھیں حمام بھی طلعت آرا کے کمرے سے متصل تھا۔ نہانے کا پانی بھی مغلانی نے خود گرم کیا تھا۔ اور گگری میں بھر کر حمام میں پہنچایا بھی تھا۔ لہٰذا کسی کی عروسی جوڑے پر نظر

ہی نہ پڑی تھی۔

سُرخ جوڑے کو بغل میں دبائے ہوئے وہ حمام سے نکل کر ایک بار پھر طلعت آرا کے کمرے میں پہنچیں۔ وہ ابھی تک تکیہ کے سہارے بستر پر اسی طرح نیم دراز تھی جس عالم میں وہ اُسے چھوڑ کر گئی تھیں۔

مغلانی نے جوڑا نکال کر طلعت آرا کے سامنے کیا۔ "چھوٹی سرکار! اس لباس کا کیا کیا جائے؟"

طلعت آرا نے کوئی جواب نہ دیا۔

مغلانی نے اصرار کیا۔ "چھوٹی سرکار، کچھ تو فرمایئے۔ میں اس کا کیا کروں؟" انہوں نے تامّل کیا۔ طلعت آرا کے چہرے کا جائزہ لیا۔ "میں نہیں چاہتی کہ کسی لونڈی ماما کی اس پر نظر پڑے۔ بڑی سرکار کے سامنے لے جاتے ہوئے بھی حجاب محسوس ہوتا ہے۔"

اس دفعہ طلعت آرا نے گردن کو خم دے کر سرخ لباس دیکھا۔ بے زاری سے منہ بگاڑا۔ مگر اس نے مغلانی سے نظریں نہ ملائیں۔ ایک ہاتھ اٹھا کر اُسے لے جانے کا اشارہ کیا۔ مغلانی اس کے بارے میں مزید استفسار کرنا چاہتی تھیں عین اس وقت دروازے پر رمضانو نمودار ہوئی۔

مغلانی نے لباس عروسی کو جھٹ بغل میں دبا کر اُوپر سے دلائی ڈال لی۔ انہوں نے پلٹ کر طلعت آرا کی جانب دیکھا بھی نہیں۔ سر جھکائے کمرے سے باہر چلی گئیں۔

رمضانو دونوں ہاتھوں سے کشتی اُٹھائے ہوئے اندر داخل ہوئی۔ کشتی چوکی پر رکھی۔ سرپوش اُٹھا کر ایک طرف ڈالا۔ مڑ کر طلعت آرا کو دیکھا۔ "چھوٹی سرکار، ناشتہ کر لیں۔" اس نے کشتی کی جانب اس کی توجہ مبذول کرائی۔

طلعت آرا نے نہ رمضانو کی جانب دیکھا نہ کشتی پر نظر ڈالی۔ خاموش لیٹی رہی۔

رمضانو نے اصرار کیا۔ "اے سرکار، ناشتہ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔"

طلعت آرا نے اس بار بھی مُنہ نہ کھولا۔

"معلوم ہوتا ہے چھوٹی سرکار، مجھ سے کچھ خفا ہیں۔" رمضانو نے شکوہ کرنے کے انداز میں کہا۔ "میں تو پہلے ہی پریشان ہوں۔ کل رات جب سے اپنی چھوٹی بہن مجیدن کو دیکھا ہے، رہ رہ کے دل میں ہول اٹھتا ہے۔ اس کے سر پر ایک عامل کا سایہ ہے اس عامل کا سر کاٹ کر کوئی سادھو لے گیا۔ اب اس عامل کی رُوح بھٹکتی پھرتی ہے۔ وہ مجیدن سے اپنا سر واپس مانگتا ہے۔"

طلعت آرا خاموش رہی رمضانو بولتی رہی۔ "اے سرکار، جب وہ مُوا عامل آتا ہے تو مجیدن کی آواز بالکل مردوں کی سی بھاری ہو جاتی ہے۔ کیسے بتاؤں کل رات میں نے کیا کیا دیکھا میں تو پہلی بار باغ مولوی انوار گئی تھی وہاں جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا، اس سے تو میرے ہوش اُڑ گئے۔ وہاں سے ڈری سہمی واپس آئی تو یہاں کا یہ حال تھا کہ جیسے دیکھو ڈر کے مارے کپکپا رہا ہے۔ کبھی چھت پر کسی کے چلنے کی آواز سنائی دیتی کبھی اگر بتیوں کی خوشبو پھیل جاتی۔ میں تو اُلٹے قدموں عبدل کے پاس مردانے میں چلی گئی۔ دن چڑھے لوٹی۔"

طلعت آرا بدستور خاموش رہی۔

رمضانو نے زچ ہو کر کہا۔ "چھوٹی سرکار، آپ نے تو جیسے نہ بولنے کی قسم کھا رکھی ہے، مجھ سے نہ بولیئے مگر ناشتہ تو کر لیجئے۔ میری موجودگی آپ کو کھل رہی ہے تو کہیئے میں باہر چلی جاتی ہوں۔" وہ مُڑی اور باہر چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد طلعت آرا بستر سے نیچے اُتری۔ زیر پائی پہنی۔ چوکی پر جا کر بیٹھی اور سر جھکا کر ناشتہ کرنے لگی۔ اسی اثنا میں نجّو مسکراتی ہوئی دروازے پر نمودار ہُوئی۔ آگے بڑھی اور طلعت آرا کے قریب پہنچ گئی۔ لیکن طلعت آرا نے نظر اُٹھا کر اس کی جانب دیکھا بھی نہیں۔

نجّو نے پوچھا۔ "طبیعت تو آپ کی ٹھیک ہے نا؟"

طلعت آرا نے کوئی جواب نہ دیا تو نجّو نے شوخی سے اُسے چھیڑا۔ "آپ نے تو جیسے چپ کا روزہ رکھ لیا ہے۔ نہ بولتی ہیں نہ بات کرتی ہیں۔" اس نے جُھک کر

طلعت آرا کے چہرے کو دیکھا۔ "ہائے اللہ، آپ نے کیسا سوکھا منہ بنا رکھا ہے ذرا بھی تو مسکراہٹ کا نام نہیں"۔ اس کا لہجہ قدرے سنجیدہ ہو گیا۔ "یہ رات بھر میں آپ کو کیا ہو گیا؟"

طلعت آرا گردن جھکائے بے نیازی سے ناشتہ کرتی رہی۔

نجّو چند لمحے خاموش کھڑی رہی۔ پھر اس نے اپنے تجسّس کا اظہار کیا۔ "میں نے سُنا ہے آپ سویرے دلہنوں والا سُرخ جوڑا پہن کر آئی تھیں۔ ابھی میں نے اسے امّاں کے پاس دیکھا تھا۔ صندوق میں رکھ رہی تھیں۔ خوب بھاری جوڑا ہے امّاں سے پوچھا تو انہوں نے ڈانٹ کر کوٹھری سے باہر نکال دیا۔ آپ ہی بتا دیجئے یہ سُرخ جوڑا آپ کو کس نے پہنایا؟"

طلعت آرا نے اس کی جانب مطلق توجہ نہ دی۔

مگر نجّو باز نہ آئی۔ اس نے اپنی محبت جتائی۔ "چھوٹی سرکار! آپ کو کیا خبر، قسم ہے جناب امیر کی، ساری رات رو رو کر کاٹی ہے"۔ اس کے چہرے پر دُکھ کا سایہ پھیل گیا۔ "جب سے چھت پر آپ کی چیخیں سُنی تھیں رہ رہ کے دل میں ہوک اُٹھتی تھی کہ کہیں جنّاتوں نے گلا تو نہیں گھونٹ دیا"۔ یہ کہتے کہتے اُس نے جھٹ منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ لمحہ بھر توقّف کرنے کے بعد بولی۔ "اے میرے منہ میں خاک، کیسی بُری بُری باتیں دل میں آ رہی ہیں"۔

طلعت آرا نے کسی ردعمل کا اظہار نہ کیا۔

نجّو نے کُرید کر پُوچھا۔ "چھوٹی بیگم آپ کو جنّاتوں سے ڈر تو نہیں لگا؟" وہ بے تکلفی سے مسکرانے لگی۔ "مجھے تو صرف ان کے خیال ہی سے ایسا ڈر لگا کہ خالی کوٹھری میں ٹھہرا نہ گیا۔ اُٹھ کر ہرمزی کے پاس چلی گئی۔ امّاں جب بڑی سرکار کے پاس سے واپس آئیں تب میں لوٹی"۔

نجّو تیزی سے بولتی رہی مگر طلعت آرا نے مڑ کر بھی اس کی جانب نہ دیکھا۔ "چھوٹی سرکار! آپ کی خاموشی سے تو دم ہولانے لگا ہے"۔ نجّو نے دبی زبان

سے احتجاج کیا۔ "اللہ! کچھ تو بولئے"۔

طلعت آرا کچھ نہ بولی تو نجّو نے عاجزی سے کہا۔ "اچھا یہی بتا دیجئے کہ کل تہ بہر کو اوپر پہنچ کر آپ چیخی کیوں تھیں؟"

طلعت آرا نے اس دفعہ بھی کوئی جواب نہ دیا۔ خاموش بیٹھی رہی۔

نجّو نے بھی خاموشی اختیار کرلی لیکن وہ زیادہ دیر چُپ نہ رہ سکی۔ کتنے ہی ایسے سوالات تھے جنہوں نے اسے بے قرار کر رکھا تھا۔ اس نے جھجکتے ہوئے دریافت کیا۔ "چھوٹی بیگم یہ جنّات کیسے ہوتے ہیں؟ سُنا ہے بڑے ڈراؤنے ہوتے ہیں۔ انہیں دیکھ کر تو آپ ڈر گئی ہوں گی۔ تب ہی تو اس بُری طرح چیخی تھیں"۔

طلعت آرا ٹس سے مس نہ ہُوئی۔

"چھوٹی سرکار! اور تو کچھ نہیں پوُچھوں گی"۔ نجّو نے گڑگڑا کر کہا۔ "بس اتنا بتا دیجئے، جب آپ نے دلہنوں والا لال لال جوڑا پہنا تو دلہن بھی بنی ہوں گی۔ کیا دُولہا بھی آیا تھا؟" اس کی بے چینی بڑھ گئی۔ "اللہ یہ بتا دیجئے کیسا تھا وہ؟"

اس دفعہ طلعت آرا نے گردن اُٹھا کر نجّو کو تیکھی نظروں سے دیکھا مگر زبان سے کچھ نہ کہا۔

"آپ ناراض ہوتی ہیں تو کچھ نہ پوچھوں گی"۔ نجّو نے سہمی ہوئی نظروں سے طلعت آرا کو دیکھا۔ "بس ایک بات، صرف ایک بات بتا دیجئے"۔

طلعت آرا نے پلٹ کر نجّو پر قہر آلوُد نظر ڈالی۔ ایک ہاتھ بڑھایا اور اس زور سے نجّو کو دھکا دیا کہ وہ سنبھل نہ سکی، لڑکھڑائی اور دُور جا گری۔ اس نے فرش سے اُٹھتے ہُوئے مڑ کر طلعت آرا کی جانب دیکھا۔ وہ بدستور اسے گھور رہی تھی۔ اس کی سُرخ سُرخ آنکھوں سے جیسے شرارے پھوٹ رہے تھے۔ چہرے پر ایسا جلال تھا کہ نجّو خوف سے تھرا گئی۔

طلعت آرا نظر اٹھائے نجّو کو مسلسل خونخوار نظروں سے گھور رہی تھی۔ وہ اس کی نظروں کی تاب نہ لا سکی۔ سہمی ہوئی اُٹھ کھڑی ہوئی اور طلعت آرا کی جانب دیکھے

بغیر کمرے سے باہر چلی گئی. خوف سے اس کے قدم کپکپا رہے تھے. وہ سخت دہشت زدہ نظر آ رہی تھی.

(۵)

دن ڈھلے حضور بیگم بیدار ہوئیں مگر وہ ابھی تک تھکی تھکی اور نڈھال نظر آ رہی تھیں. انہوں نے منہ ہاتھ دھویا تو کچھ فرحت محسوس ہوئی. دستر خوان بچھا کر کھانا چنا جا چکا تھا. پیش خدمت نے اطلاع دی. وہ دستر خوان پر پہنچیں. مغلانی کو بھی انہوں نے اپنے ساتھ بٹھا لیا لیکن طلعت آرا کی کمی محسوس ہوئی. وہ کھانا ہمیشہ ان کے ساتھ کھاتی تھی.

حضور بیگم نے مغلانی کو مخاطب کیا. "بی مغلانی، تم طلعت آرا بیگم کے پاس گئی نہیں؟"

"سرکار، وہ تو ناشتہ کر کے ایسی گہری نیند سوئی ہیں کہ ان کو اپنے آپے کا بھی ہوش نہیں." مغلانی نے دبی زبان سے قیاس آرائی کی. "لگتا ہے وہ بھی تمام رات جاگتی رہی تھیں."

"تم نے اس سلسلے میں اس سے کچھ معلوم کیا تھا؟"

"جی نہیں." مغلانی نے جواب دیا. "وہ تو کسی بات کا جواب ہی نہیں دیتیں بت بنی کھوئی کھوئی نظروں سے دیواروں کو تکتی رہتی ہیں." انہوں نے توقف کیا. "عجب حال ہے ان کا. بات کرنا درکنار، ان کے چہرے پر تو مسکراہٹ کا بھی نام و نشان نظر نہیں آتا."

"میں نے تم کو پہلے ہی خبردار کیا تھا کہ وہ اپنے ہوش و حواس ہی میں نہیں ہے." حضور بیگم نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا. "اس پر تو کسی کا ایسا سایہ ہے کہ ابھی تک اس کے اثر سے چھٹکارا نصیب نہیں ہوا. نہ جانے میری بچی کو بیٹھے بٹھائے کیا روگ لگ گیا."

"سرکار کا خیال بالکل درست معلوم ہوتا ہے"۔ مغلانی نے ان کی تائید کی۔ "میرے ہاتھوں پلی بڑھیں، پروان چڑھیں لیکن میں نے کبھی ان کو اس عالم میں نہیں دیکھا۔ ایسی چپ لگی ہے کہ منہ ہی نہیں کھولتیں۔ بالکل گم صم بیٹھی ہیں۔"

حضور بیگم نے صرف ٹھنڈی سانس بھری زبان سے کچھ نہ کہا۔

مغلانی نے جھجکتے ہوئے کہا "سرکار میں ایک بات دریافت کرنا چاہتی تھی۔"

"پلو چھو کیا پوچھنا چاہتی ہو؟"

"چھوٹی سرکار سُرخ لباس پہنے بالوں میں افشاں ڈالے، عطر سہاگ میں بسی ہوئی جس طرح دلہن بن کر واپس آئی ہیں۔ یہ سب کیا ہے؟ کیسے ہوا؟ کیونکر ہوا؟ میری تو عقل کام نہیں کرتی"۔ مغلانی نے رُک رُک کر اپنے تجسس کا اظہار کیا۔ "اب تک ایسے واقعات سُنے تو ضرور تھے۔ اب اپنی آنکھوں سے دیکھا تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یا الٰہی یہ ماجرہ کیا ہے؟"

"تم اس بھید کو سمجھ بھی نہیں سکتیں۔ ابھی تمہارا جنوں سے پالا نہیں پڑا اور خدا نہ کرے کسی کا ان سے پالا پڑے۔ وہ آتشی مخلوق ہوتے ہیں۔ کیا نہیں کر سکتے"۔ حضور بیگم نے دل گرفتہ ہو کر کہا۔ "اب تو دل سے یہی دعا نکلتی ہے کہ مولا مشکل کشا میری بچی کو اپنی امان میں رکھیں"۔

"سرکار، اس مصیبت سے کیسے چھٹکارہ حاصل کیا جائے"۔ مغلانی نے مشورہ دیا "کل رمضانو اپنی چھوٹی بہن کے پاس گئی تھی۔ بتاتی تھی اس پر کسی عامل کا سایہ ہے وہ اُسے اُتروانے باغ مولوی انوار میں ٹھہری ہوئی ہے رمضانو کہتی تھی کہ مولوی صاحب کے غلاموں نے اس عامل کو گرفتار کر کے قیدی بنا لیا ہے۔ چھوٹی سرکار کو کسی رات باغ مولوی انوار نہ لے جائیں"۔

"اے چھوڑو، تم بھی کسی ہولا خبطن کی باتوں میں آگئیں"۔ حضور بیگم ایک دم بپھر گئیں۔ "باغ مولوی انوار بھی کوئی جانے کی جگہ ہے۔ وہاں تو نیچ ذات کی عورتیں اپنے سروں پر سے چڑیلیں اور چھل پیریاں اُتروانے جاتی ہیں"۔ انہوں نے نفرت

سے منہ بگاڑا۔" لو اور سنو، رمضانو کی بہن کے سر پر عامل کا سایہ ہے۔ عامل وامل کیا کوئی بھوت پریت ہو گا۔" انہوں نے مڑ کر مغلانی کی جانب دیکھا۔" عامل تو نوازش علی خان تھے جن کو شیشے میں اُتار کر قابو میں کر لیتے تھے۔ ابا جان نے نوان کو دیکھا تھا۔ بتاتے تھے کیسا بھی طاقت ور جن ہوتا، عمل پڑھ کر اس طور شیشے میں قید کر لیتے تھے کہ اس کی شبیہ صاف نظر آتی تھی۔ باقاعدہ ہر سوال کا جواب دیتا تھا۔"

" تو پھر سرکار کسی عامل ہی سے رجوع کیا جائے۔"

" اب نوازش علی خان کی طرح کا کون عامل رہ گیا ہے۔ وہ تو تارکِ الدنیا درویش تھے۔ دریا کے کنارے مسجد کے حجرے میں پڑے رہتے تھے۔ تمام وقت یادِ الٰہی میں بسر ہوتا تھا۔" حضور بیگم نے اپنی مجبوری کا اظہار کیا۔" یہ بھی تو سوچو، میرا بیٹھا ہی کون ہے جس سے کچھ کہوں اور کہوں بھی تو کیوں کر۔ جوان جہان لڑکی کا معاملہ ہے۔ بدنامی سے ڈرتی ہوں۔" ان کے چہرے پر غم کی پرچھائیاں لہرانے لگیں۔ زبان سے اُف بھی تو نہیں کر سکتی۔"

مغلانی نے دبی زبان میں پوچھا۔" سرکار اس سُرخ جوڑے کا کیا کروں، خاصہ بھاری جوڑا ہے۔ چھوٹی سرکار کے پاس لے کر گئی تھی۔ پوچھا، اس کا کیا کروں؟ انہوں نے زبان سے تو کچھ نہ کہا۔ ہاتھ اٹھا کر لے جانے کا اشارہ کیا۔ اسے فی الحال اپنے صندوق میں رکھ دیا ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ کسی لونڈی ماما کی اس پر نظر پڑے اور بات نکل کر کہیں سے کہیں پہنچے۔" انہوں نے جھجکتے ہوئے تجویز پیش کی۔" سرکار آپ اسے اپنے توشہ خانے میں رکھ لیں۔"

" نہیں، تم اپنے ہی پاس رہنے دو۔ نہ جانے کیا اُلٹی سیدھی پڑے۔ مجھے تو اس کے خیال ہی سے ہول محسوس ہوتا ہے۔"

" سرکار، رکھنے کو تو میں نے رکھ لیا۔ مگر ڈر معلوم ہوتا ہے۔" مغلانی نے بھی اپنے خوف کا اظہار کیا۔

" تم کیوں ڈرتی ہو۔ تم پر بھی تو کسی کا سایہ ہے اور کسی پاک صاف ہی ہستی کا

سایہ ہے۔" حضور بیگم نے مغلانی کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

"سرکار اس کا پاس رکھنا تو خطرے سے خالی نہیں"۔ مغلانی نے حضور بیگم کی غلط فہمی دور کرنے کی کوشش نہ کی مگر وہ ہنوز خوفزدہ تھیں۔"رات کے سناٹے میں خاموشی سے جلا کر اسے راکھ کر دیا جائے۔"

"اے ہے! ایسا غضب بھی نہ کرنا" حضور بیگم نے پریشان ہو کر کہا۔"کوئی نئی مصیبت نہ کھڑی ہو جائے۔ جنوں کا معاملہ ہے، طیش میں آ کر نہ معلوم کیا عتاب نازل کریں۔"

"کسی ماما لونڈی کو تو دینا کسی طور مناسب نہیں"۔ مغلانی نے اظہار خیال کیا۔"گڑھا کھود کر اسے دفن کر دیا جائے مگر اس کام کے لئے صفدر خان کی مدد درکار ہو گی۔"

"نا بی بی، وہ صفدر خان ہوں یا کوئی اور۔ ابھی تو کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونا چاہیئے۔" حضور بیگم نے مغلانی کی رائے سے اتفاق نہ کیا۔"سردست تم اسے اپنے ہی پاس رکھو، دیکھو آگے کیا ہوتا ہے۔ اس کے بارے میں تو بعد ہی میں کوئی فیصلہ کرنا ہو گا۔"

"جیسی سرکار کی مرضی۔ آپ کا حکم سر آنکھوں پر"۔ مغلانی نے بات بڑھانے کی کوشش نہ کی۔

حضور بیگم نے کھانا کھاتے کھاتے ہاتھ روک لیا۔ مڑ کر مغلانی کی جانب دیکھا۔ "طلعت آرا کے بغیر میرا کھانا کھانے کو دل نہیں چاہتا۔ بہت دیر تک سو چکی جا کر اسے اٹھاؤ۔ کہو کہ میرے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھا لے۔ میں اس سے کچھ نہیں پوچھوں گی۔ کوئی بات نہیں نکالوں گی۔ بات چیت کرنا تو اسے اور پریشانی میں مبتلا کرنا ہو گا۔"

"سرکار، جب وہ ناشتے سے فارغ ہوئیں تو میں ان کے پاس گئی۔ کہا چھوٹی سرکار، لائیے میں آپ کا سر گوندھ دوں۔ بال بکھرے ہوئے ہیں مگر وہ اس کے لئے

بھی تیار نہ ہوئیں۔" مغلانی نے حضور بیگم کو مطلع کیا۔ "جمائی لیتی ہوئی اُٹھیں اور چپ چاپ بستر پر جا کر لیٹ گئیں۔ نہ میری کسی بات کا جواب دیا نہ ہی مُڑ کر دیکھا۔ میں خاموشی سے واپس آگئی۔"

"خیر، یہ تو تم نے اچھا ہی کیا۔" حضور بیگم نے کہا۔ "اُلٹے سیدھے سوال کرنے سے خدا معلوم کیا پیچیدگی پیدا ہو۔"

"میں نو بعد میں بھی کئی بار چھوٹی سرکار کے کمرے میں گئی۔ ذری دیر پہلے ان کے پاس گئی تھی مگر وہ بے غل وغش پڑی تھیں۔ ایسی بے خبر سو رہی تھیں کہ ان کو میری آمد کا ذرا بھی احساس نہ ہوا۔ میرا تو خیال ہے انہیں ابھی جگانا مناسب نہیں۔ جب سو کر اُٹھیں گی تو میں ان سے کھانے کے لئے دریافت کر لوں گی۔ ویسے انہوں نے ناشتہ تو کر ہی لیا ہے۔"

"تم مناسب سمجھتی ہو کہ اسے گہری نیند سے بیدار نہ کیا جائے تو اُسے سونے دو۔ آج میں اس کے بغیر ہی کھانا کھا لوں گی۔"

مغلانی نے مزید بات چیت کرنے سے گریز کیا۔ حضور بیگم بھی نظریں جھکا کر خاموشی سے کھانا کھانے لگیں۔ لیکن انہوں نے جلد ہی ہاتھ کھینچ لیا۔

مغلانی نے اصرار کیا۔ "سرکار آپ نے تو رات کو بھی کچھ نہیں کھایا۔ صبح ناشتہ بھی نہیں کیا۔ کچھ تو نوش فرمایئے۔"

حضور بیگم آمادہ نہ ہوئیں۔ ٹھنڈی سانس بھر کر بولیں۔ "کیا کروں کھایا ہی نہیں جا رہا ہے۔ نوالہ حلق میں پھنس رہا ہے۔"

مغلانی نے بھی مجبوراً ہاتھ روک لیا۔

حضور بیگم نے ہاتھ دھوئے۔ پان کی گلوری مُنہ میں رکھی۔ اُٹھیں اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئیں اپنے کمرے میں واپس پہنچ گئیں۔ انہوں نے کسی سے بات چیت بھی نہ کی۔ طلعت آرا کے پاس جانے کو دل تو بہت چاہا لیکن انہوں نے ضبط سے کام لیا۔ صرف اس کے کمرے کے بند دروازے کو نظر بھر کر دیکھا آہ سرد کھینچی اور

آگے بڑھ گئیں۔"

حضور بیگم اپنی خواب گاہ میں بستر پر اُداس اور نڈھال لیٹی ہُوئی تھیں۔ آنکھوں میں نیند بھی نہ تھی۔ حالانکہ وہ رات بھر کی جاگی ہُوئی تھیں اور دن میں صرف چند ہی گھنٹے سوئی تھیں۔ وہ اِس وقت بالکل تنہا تھیں۔

مغلانی بھی تھکی ہوئی تھیں۔ وہ حضور بیگم سے اجازت لے کر اپنی کوٹھری میں چلی گئی تھیں۔

حضور بیگم آنکھیں کھولے کروٹ کے بل لیٹی تھیں اور خاموشی سے دیوار کو تک رہی تھیں۔ اسی اثنا میں رمضانو کمرے میں داخل ہُوئی اس نے آہستہ سے کھنکار کر حضور بیگم کو اپنی جانب متوجہ کیا۔ حضور بیگم نے نظریں اٹھا کر رمضانو کی جانب دیکھا مگر زبان سے کچھ نہ کہا۔

"سرکار!" رمضانو نے ادب سے نظریں جُھکا کر کہا۔ "دلاری آئی ہے۔ سرکار کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتی ہے۔"

دلاری کا نام سُن کر حضور بیگم چونکیں۔ حیرت زدہ ہو کر سوچنے لگیں کہ آج دلاری اچانک کیسے آگئی۔ وہ اتنی مُدّت دراز کے بعد آئی تھی کہ حضور بیگم تقریباً اسے بھُول ہی چکی تھیں۔ اس کی غیر متوقع آمد کا سبب غور کرنے کے باوجود ان کی سمجھ میں نہ آیا۔

رمضانو نے حضور بیگم کو خاموش پایا تو آہستہ سے دریافت کیا۔ "سرکار میں دلاری سے کیا کہہ دُوں؟" اس نے لمحہ بھر توقف کیا۔ پھر خود ہی جواب بھی مہیّا کیا۔ "آپ رات بھر کی جاگی ہُوئی ہیں۔ ویسے طبیعت بھی پریشان ہے۔ میں یہ کہہ کر اُسے ٹالے دیتی ہوں کہ سرکار آرام فرما رہی ہیں۔ بعد میں کسی روز آجائے۔"

"نہیں، اُسے آنے دو۔" حضور بیگم نہ جانے کیا سوچ کر دلاری سے ملنے پر آمادہ ہوگئیں۔ "اور دیکھو رمضانو۔ خاصدان میں پان لگوا کر لیتی آنا۔"

☆

دلاری کسی زمانے میں حضور بیگم کی پیش خدمت تھی۔ بعد میں نواب تقی کی خدمت پر مامور ہوگئی۔ وہ ذات کی کمہارن تھی تب اس کا نام رام دلاری تھا۔

مگر ایک مسلمان کوچوان سے آشنائی ہو گئی۔ اس کے گھر بیٹھ گئی تو ہندو نہ رہی مسلمان ہو گئی۔ اور رام دلاری سے فقط دلاری رہ گئی۔ کوچوان شرابی اور پرلے درجے کا اوباش نکلا۔ ہیجڑوں سے بھی دلچسپی رکھتا تھا۔ رات گئے گھر میں داخل ہوتا تو تاڑی کے نشے میں دھت ہوتا۔ بات بے بات پر شعلے کی مانند بھڑک اٹھتا۔ دلاری کو اس بری طرح مارتا کہ لہو لہان ہو جاتی۔ کھانے کو بھی پیٹ بھر نہ دیتا روزانہ جو کچھ کماتا، تاڑی خانے میں بیٹھ کر اڑا دیتا۔ لہٰذا زیادہ عرصے تک نباہ نہ ہو سکا۔ دلاری نے اسے چھوڑ دیا اور بارہ دری میں ملازمت اختیار کر لی۔

رنگ تو اس کا سانولا تھا۔ ناک نقشہ بھی معمولی تھا۔ مگر آنکھیں اس قدر روشن اور پرکشش تھیں کہ انہیں دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا گویا موتی کوٹ کر بھر دیئے ہوں۔ جسم بھی سڈول اور خوب کسا ہوا تھا۔ جوانی تھی کہ ابلی پڑتی تھی۔ نواب تقی کو نہ معلوم کون سی ادا بھا گئی کہ بری طرح اس کے گرویدہ ہو گئے۔

نواب تقی رات کو عام طور پر حضور بیگم کے ساتھ ہی بارہ دری کے زنان خانے میں قیام کرتے تھے مگر خسرو کی پیدائش کے بعد وہ دیوان خانے کی خواب گاہ میں رات بسر کرنے لگے تھے۔ ان دنوں رات بھر محفل آرائیاں ہوتیں۔ دستر خوان بھی ان کا دیوان خانے میں بچھتا تھا۔ نہایت اہتمام سے کھانا چنا جاتا اور یہ تمام کھانا دیوان خانے کے باورچی خانے ہی میں پکتا تھا۔ البتہ زنان خانے کے باورچی خانے کا کوئی نہ کوئی کھانا جس میں تنوع ہوتا اور جس کی کوئی نمایاں خصوصیت بھی ہوتی حضور بیگم بطور خاص نواب تقی کے مردانہ دستر خوان کے لئے دونوں وقت پابندی سے بھجواتی تھیں۔ دلاری جب نواب تقی کی خدمت پر مامور ہوئی تو وہی یہ کھانا لے کر جاتی جو چینی کی قاب یا ڈونگے میں ہوتا۔ اس پر ہمیشہ سرپوش ہوتا۔ ویسے جب نواب تقی مردانے میں ہوتے تو ان کے اور حضور بیگم کے درمیان پیغام رسانی کا کام بھی دلاری ہی انجام دیتی تھی۔

نواب تقی نے جب دلاری میں دلچسپی لینا شروع کی تو وہ اکثر رات کو اسے

روک لیتے حضور بیگم ان دنوں پیٹ سے تھیں۔ اور پورے دنوں سے تھیں۔ جب طلعت آرا پیدا ہوئی اور حضور بیگم چلّے میں تھیں تو نواب صاحب ہر رات دلاری کو کسی نہ کسی بہانے اپنے پاس بلا لیتے وہ صبح تک ان کی خواب گاہ میں رہتی یہ وہی زمانہ تھا جب نواب تقی کا التفات مغلانی حسنہ بیگم کی جانب کم ہوتے ہوتے اکتاہٹ اور بے زاری کی منزل پر پہنچ چکا تھا۔ اور مغلانی نے بھی دل پر پتھر رکھ کر صبر کر لیا تھا۔

نواب تقی کی جانب سے مایوس ہونے کے بعد مغلانی نے حضور بیگم پر زیادہ سے زیادہ توجہ صرف کرنا شروع کر دی تھی۔ وہ دلاری کے خلاف حضور بیگم کے کان بھرتیں جس نے نواب صاحب کے دل پر قبضہ کر رکھا تھا۔ حضور بیگم مشتعل ہو کر دلاری پر گرجتیں برستیں۔ ڈانٹ پھٹکار سے بھی کام لیتیں۔ مغلانی دل ہی دل میں خوش ہوتیں۔ ان کے جذبۂ رقابت کو تسکین حاصل ہوتی۔

مگر جب دلاری کا پیر بھاری ہوا تو حضور بیگم کے غصے کا پارہ اور سوا ہوا مغلانی اٹھتے بیٹھتے ان کو دلاری کے خلاف ہشکارتیں۔ وہ بات بات پر دلاری کو صلواتیں سناتیں۔ "شفتل، حرافہ، قطامہ، خصم پیٹی ایک کو چھوڑا دوسرے کو پکڑا۔ اس کے گھر سے نکلی تیسرے کے پاس پہنچی۔ اب اس گھر کو آگ لگانے آئی ہے"۔ زیادہ غضب ناک ہوتیں تو بددعائیں دینے اور کوسنے سے بھی دریغ نہ کرتیں۔ "بد ذات! تجھ پر مولا علی کی تیغ ٹوٹے۔ تجھے اپنا یہ ڈھینڈا چھوڑنا نصیب نہ ہو۔ سوتی کی سوتی رہ جائے"۔ حضور بیگم کی خوش نودی کی خاطر بارہ دری کی دوسری خادمائیں بھی اٹھتے بیٹھتے طعن تشنیع سے کام لیتیں۔ دلاری سب کی سنتی، مگر سنی ان سنی کر جاتی نہ کبھی احتجاج کیا نہ فریاد۔ اس کی خاموشی اس بات کی غمازی کرتی تھی کہ اسے اپنے گنہگار ہونے کا اعتراف تھا۔ وہ ڈھیٹ اور بے حس ہو گئی تھی۔

نواں مہینہ لگتے ہی دلاری کو نہایت خاموشی سے گاؤں بھیج دیا گیا۔ اسے دائی بھی میسر نہ آئی ایک مہترانی نے بچہ جنوایا۔ نہ ڈھولک بجی نہ زچہ گیریاں

گائی گئیں نہ طوائفوں کا مجرا ہوا نہ بینڈ باجے کے ساتھ چھٹی آئی، نہ زچہ کو کھانے کے لئے گوند ملا نہ ستھورا، نہ نہان ہوا نہ چلہ۔ زچگی چپ چپاتے ہوئی۔ اور یہ کار خیر داروغہ میر نصیر نے اپنی نگرانی میں انجام دیا تھا۔ اس وقت تک وہ نواب تقی کی سرکار سے وابستہ تھے۔ زمیں داری اور جائیداد کی دیکھ بھال کے انتظام اور انصرام کے ساتھ ساتھ کتنی ہی ایسی خدمات بھی نہایت مستعدی سے انجام دیتے تھے جن کی پردہ پوشی ضروری تھی۔

دلاری کے بطن سے نواب تقی کا بیٹا پیدا ہوا تھا۔ شاہی دور ہوتا اور نواب تقی بادشاہ سلامت ہوتے تو دلاری کے پیش خدمت یا خواص ہوتے سے کوئی فرق نہ پڑتا۔ فرزند ارجمند کی ولادت کی فرحت بخش خبر جب ان کے گوش گزار ہوتی تو فوراً حکم صادر ہوتا۔ تہنیت کی توپیں داغ کر نومولود کو باقاعدہ سلامی دی جاتی کوتوال شہر قرنا پھونک کر منادی کرتا۔ شادیانے بجائے جاتے رقص و سرود کی محفلیں برپا ہوتیں۔ دلاری کا مرتبہ بلند ہوتا۔ زر و جواہر سے مرصع تمغہ عنایت ہوتی دل دار محل یا دلنواز محل کا خطاب عطا ہوتا۔ صاحب محل کا منصب حاصل ہوتا۔ اس کے بیٹے کو نیر یا جاہ، پسر قدر یا اسی نوع کے اعزاز سے نوازا جاتا۔ وہ شہزادہ کہلاتا اور اس کی ماں ملکہ ہوتی اور حضور بیگم بادشاہ ذی جاہ کے حکم پر نہایت احترام سے دلاری کو نذرانہ پیش کرتیں۔

مگر اب شاہی نہ رہی تھی اور نہ ہی نواب تقی سربراہ سلطنت تھے۔ وہ اگر کچھ تھے تو شاہی خاندان کے آثار قدیمہ ہونے کے دعویدار تھے وقت بدلا تو اقدار اور روایات بھی بدل گئیں۔ چنانچہ دلاری کے بیٹے کی پیدائش پر دھوم دھام کے بجائے خاموشی سے کام لیا گیا۔ ہر طرح اس کی پردہ پوشی کی گئی داروغہ میر نصیر نے کارگزاری دکھائی اور اس خوش اسلوبی کا مظاہرہ کیا کہ مہترانی کو بچہ جنوائی اور نال کاٹنے کے صرف دو روپئے کلدار دیئے اور نواب تقی کو اخراجات کی لمبی چوڑی فہرست دکھا کر سو روپئے سے بھی زیادہ اینٹھ لئے۔

دلاری سوا مہینے کا نہان نہائے بغیر اپنے نوزائیدہ بچّے کے ساتھ ایک شام خاموشی سے بارہ دری میں واپس آ گئی اور آتے ہی معمول کے مطابق کام کاج میں جُٹ گئی۔ زچّہ خانے میں کھانے کو موٹا جھوٹا ملا تھا اور داروغہ میر نصیر کی جزرسی کے باعث پیٹ بھر بھی نہ ملا تھا لہٰذا اس کی صحت بہت گر گئی تھی۔ سڈول اور کسا ہوا چھکتا بولتا جسم ایسا مرجھا گیا تھا کہ دلاری مریل چھلنگا نظر آتی۔ نواب نقی تو اسے دیکھ کر اب ایسی کراہیت محسوس کرتے کہ اس کے ہاتھ سے پانی پینا بھی گوارہ نہ ہوتا۔

☆

دلاری سے جو بیٹا پیدا ہوا۔ اس میں نواب نقی کی شباہت صاف جھلکتی تھی۔ ناک نقشہ تو عین بہ عین باپ کا تھا۔ رنگ البتہ ذرا دبتا ہوا تھا مگر دور سے دیکھ کر پہچانا جاتا کہ نواب تقی کا نطفہ ہے۔ اس کے برعکس خسرو اپنی ماں حضور بیگم پر گیا تھا۔ اس میں قدرے نسوانیت بھی تھی۔ بات بات پر شرماتا تھا۔ بولتا بھی کچھ اٹھلا کر تھا۔

دلاری کا بس چلتا تو خورشید عالم کی مناسبت سے اپنے بیٹے کا نام اختر عالم رکھتی۔ آخر وہ بھی تو اسی باپ کا فرزند تھا جس کا خسرو تھا لیکن وہ باز نہ آئی۔ بیٹے کا نام اختر عالم کے بجائے اختر حسین رکھا۔ حضور بیگم نے اس کا نام سنا تو آگ بگولا ہو گئیں۔ مغلانی کو مخاطب کر کے بولیں۔ "اے بی مغلانی! ذری اس قطامہ کی دیدہ دلیری تو دیکھو۔ اس مُوئے مُوری کے کیڑے کا کیسا شریفوں کا سا چھانٹ کر نام رکھا ہے۔" انہوں نے حقارت سے منہ بگاڑا۔ "اختر حسین!" وہ غضب ناک ہو کر دلاری پر برسنے لگیں۔ "اپنی اوقات نہ بھول۔ جامے میں رہ۔ خبردار جو تو نے اپنے اس کلموہے کا نام اختر حسین رکھا۔ جوتیاں مار کر کھڑے کھڑے نکال باہر کروں گی۔" پھر انہوں نے خود ہی اس کا نام بھی تجویز کیا۔ "یہ جمعہ کو پیدا ہوا تھا نا۔ اس کا نام تو جمن ہونا چاہیئے۔ ٹھیک رہے گا نا!" انہوں نے داد طلب نظروں سے مغلانی کی جانب

دیکھا۔ انہوں نے فوراً ہاں میں ہاں ملائی۔ اس وقت سے دلاری کے بیٹے کا نام جمن پڑ گیا۔

جمن کھیل کود کر خسرو ہی کے ساتھ پلا بڑھا مگر موری کا کیڑا تھا موری کا کیڑا ہی رہا۔ حضور بیگم کے زیر عتاب تو رہتا ہی تھا لیکن نواب تقی نے بھی اسے کبھی نظرِ التفات سے نہ دیکھا۔ نہ شفقت سے سر پر ہاتھ پھیرا نہ پیار سے بات کی۔ اسے ہمیشہ خانہ زادہی سمجھا اور ویسا ہی اس کے ساتھ برتاؤ بھی کیا۔ اس کی حیثیت بارہ دری میں نواب خسرو کے ذاتی ملازم کی سی رہی۔ وہ ہر وقت خسرو کی خدمت میں لگا رہتا۔ خسرو بات بات پر اسے دھتکارتا۔ ڈانٹتا ڈپٹتا۔ ناراض ہوتا تو مار مار کے جمن کا بھرکس نکال دیتا۔

ایک روز تو خسرو نے جمن کو اس بے دردی سے مارا کہ سر پھٹ گیا۔ چہرہ لہو لہان ہو گیا۔ دلاری نے اپنے لختِ جگر کا یہ حال دیکھا تو بلبلا اٹھی۔ اسی حالت میں جمن کو لے کر نواب صاحب کے روبرو پہنچی۔ فریادی ہوئی" سرکار! دیکھئے تو نواب خسرو نے اسے کس بری طرح مارا ہے۔ خونم خون کر کے رکھ دیا۔ کوئی اور تو اس پر کیوں ترس کھاتے لگا پر آپ تو اس کے ساتھ انصاف کریں۔" کہنا تو وہ یہ بھی چاہتی تھی کہ یہ بھی آپ ہی کا خون ہے۔ لیکن نواب صاحب کی خفگی کے ڈر سے دل کی بات زبان پر نہ لا سکی۔

نواب تقی نے نہ اسے تسلی دی نہ تشفی۔ بے رُخی سے بولے" اسے میرے پاس کیوں لائی ہے؟ میں کوئی جرّاح ہوں یا طبیب۔ جا، جا کر اس کے سر کا خون صاف کر اور پان چبا کے اس کا اگال زخم پر رکھ کر پٹی باندھ دے۔ دو چار روز میں ٹھیک ہو جائے گا۔ کھیل کود میں تو ایسی چوٹیں بچوں کو آتی ہی رہتی ہیں۔" دلاری ان کے پاس نہ جانے کیسی کیسی توقعات لے کر گئی تھی۔ ان کی سرد مہری پر جل کر کباب ہو گئی۔ سارا غصہ جمن پر اتارا۔ پیٹھ پر زور سے دو ہتڑ مار کر چیخی" حرامی پیدا ہوتے ہی نہ مر گیا۔" اس نے غضب ناک ہو کر جمن کے دو چار تھپڑ اور رسید کئے

ہاتھ پکڑا اور غصّے سے گھسیٹتی ہوئی اپنی کوٹھری میں لے گئی۔

دلاری اس قدر دل برداشتہ ہوئی کہ رات تو کسی نہ کسی طور کاٹی، دوسرے روز سویرے ہی سویرے اپنا سامان باندھا۔ ٹین کا پرانا ٹرنک سر پر رکھا۔ گٹھری کندھے پر لٹکائی۔ جمّن کا ہاتھ پکڑا اور چپ چاپ بارہ دری سے چلی گئی۔ کسی کو یہ بھی پتہ نہ چلا کہ وہ کہاں گئی، کس کے پاس گئی؟ نواب تقی نے بھی اس کے بارے میں کچھ معلوم کرنے کی کوشش نہ کی۔ نہ ان کو اب دلاری سے دلچسپی تھی نہ ہی جمّن سے۔

حضور بیگم کو تو کبھی بھولے سے بھی اس کا خیال نہ آیا۔

(۶)

دلاری جُوتیاں گھسیٹتی ہوئی، سٹر سٹر کرتی حضور بیگم کے کمرے کے دروازے پر نمودار ہُوئی جُھک کر آداب کیا۔ اجازت چاہی "سرکار، اندر آسکتی ہوں؟" وہ دہلیز پر ٹھٹھک گئی۔

حضور بیگم مُسکرا کر بولیں "آؤ آؤ رُک کیوں گئیں؟"

دلاری میلا کچیلا بُرقعہ پہنے ہُوئے تھی۔ اس کی جوانی کا سورج اب گہنا گیا تھا۔ چہرہ جھلس کر راکھ ہوگیا تھا۔ آنکھیں اندر دھنس گئی تھیں۔ گال پچک گئے تھے۔ وہ اپنی اُجڑی ہوئی جوانی کی لاش اٹھائے حضور بیگم کے روبرو کھڑی تھی۔ اُسے دیکھ کر حضور بیگم کو ترس آیا۔

دلاری نے بُرقعہ اتارا اور پھسکڑا مار کر بیٹھ گئی۔ حضور بیگم نے ٹوکا "اے فرش پر کیوں بیٹھ گئیں، اوپر بیٹھ جاؤ۔" انہوں نے تخت کی طرف اشارہ کیا۔

مگر دلاری آمادہ نہ ہُوئی۔ مسکرا کر بولی "سرکار، میں اپنی اوقات نہیں بھولی پہلے بھی آپ کی پیش خدمت تھی۔ آج بھی خود کو وہی سمجھتی ہوں۔"

حضور بیگم اور نرم پڑ گئیں۔ اصرار کیا تو دلاری فرش سے اُٹھ کر تخت پر بیٹھ گئی۔ اسی دوران میں رمضانو خاصدان لے کر حاضر ہُوئی۔ اس نے سر پوش اٹھا

کر خاصدان حضور بیگم کے سامنے پیش کیا۔ انہوں نے ایک گلوری اٹھا کر منہ میں دبائی۔ دلاری کی جانب اشارہ کیا۔ "دلاری کو بھی پان کھلاؤ۔" وہ تکیہ کے سہارے اُونچی ہو کر بیٹھ گئیں۔

رمضانو نے خاصدان دلاری کے سامنے کر دیا۔ دلاری نے بھی ایک گلوری اٹھا کر منہ میں رکھ لی۔ رمضانو نے خاصدان کو سرپوش سے ڈھک کر تخت کے ایک کونے پر رکھ دیا اور خاموشی سے باہر چلی گئی۔

"آج کیسے بھول کر ادھر آگئیں دُلاری؟" حضور بیگم نے مسکرا کر دریافت کیا۔

"سرکار کو سلام کرنے آئی تھی۔" دلاری نے انکسار کا مظاہرہ کیا۔ "ویسے بھی سرکار کو دیکھنے کو بہت جی چاہ رہا تھا۔"

"کبھی کبھار آجایا کرو۔" حضور بیگم نے شکوہ کرتے کے انداز میں کہا۔ "تم تو ایسی گئیں کہ پلٹ کر ادھر کا رُخ بھی نہ کیا۔ راستہ بھول گئی تھیں؟"

"اے سرکار، ایسی بات نہیں۔ زندگی کے جھمیلوں میں ایسی پھنسی رہی کہ اپنا ہی ہوش نہ رہا۔" دلاری نے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔ "جمن تو آپ کو بہت یاد کرتا ہے۔ وہ بھی سلام کرنے کو حاضر ہونا چاہتا تھا۔ کل ہی شام کی بات ہے۔ مجھ سے کہہ رہا تھا۔ امّاں کسی روز بارہ دری لے چلو وہاں جانے کو بہت دل چاہتا ہے۔"

دلاری نے جمن کا ذکر چھیڑا تو حضور بیگم کو معاً اپنا خسرو یاد آگیا۔ جمن اسی کے ساتھ کھیل کود کر پروان چڑھا تھا۔ ہر دم ساتھ لگا رہتا۔ خسرو کی ڈانٹ ڈپٹ سنتا مار کھاتا مگر اس کا ساتھ نہ چھوڑتا۔

حضور بیگم کو ایک ایک بات، یاد آنے لگی خسرو کی شوخیاں۔ بات بات پر اس کا ضد کرنا۔ مچلنا، اڑنا اور پھر اپنی بات منوا لینا۔ ان کو وہ الم ناک دن، وہ منحوس گھڑی اب تک یاد تھی جب خسرو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ان سے جدا ہو گیا۔

☆

گلابی جاڑوں کا موسم تھا۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ دونوں وقت ملتے تھے

بارہ دری کے دالانوں میں مردنگ اور فانوس روشن کیے جا رہے تھے۔ حضور بیگم نشست گاہ میں مسند پر گاؤ تکیہ کے سہارے تھکی ہوئی سی بیٹھی تھیں۔ خسرو بن سنور کر ان کے روبرو آیا۔ ماں نے اُسے دیکھا تو دیکھتی ہی رہ گئیں۔ بھرا بھرا مضبوط جسم۔ کٹورا سی روشن آنکھیں۔ بالائی ہونٹوں پر ہلکی بھوری مونچھیں سرج کی سیاہ دھاری دار شیروانی پہنے، آڑی مانگ نکالے۔ وہ نہایت وجیہہ اور خوب رو نوجوان نظر آرہا تھا۔ حضور بیگم نے بیٹے کی یہ سج دھج دیکھی تو خوشی سے وارفتہ ہوگئیں۔ فوراً ایک پیش خدمت سے کالا دانا منگوا کر نظر اتروائی۔

خسرو نے سر جھکا کر نہایت سعادت مندی سے نظر اتروا بھی لی۔ ذرا بچر مچر نہ کی مگر جب ماں نے صرف تیس روپے دیئے تو مچل گیا۔ کہنے لگا۔ "بائیسکوپ دیکھنے کا پروگرام ہے کچھ دوست احباب بھی ہمراہ ہیں۔ امّاں جان! غور تو فرمائیے، بھلا تیس روپیے۔ بس کیا ہوگا۔" ماں نے سمجھانے کی کوشش کی۔ مگر اس نے ایک نہ سُنی۔ آخر اس کی ضد کے سامنے حسب معمول ماں کو جھکنا پڑا۔ انہوں نے قریب رکھے ہوئے اپنے بھاری بھر کم چاندی کے پاندان کو کھولا۔ جھک کر متلاشی نظروں سے اندر کا جائزہ لیا۔ مگر پاندان میں زیادہ رقم نہ تھی۔

حضور بیگم کو بیٹے کی شاہ خرچی کا بخوبی اندازہ تھا۔ وہ دس بیس روپے مزید لے کر ٹلنے والا نہ تھا۔ انہوں نے کنجی دے کر مغلانی کو توشہ خانے میں بھیجا۔ اپنا عطردان منگوایا۔ یہ عطردان اتنا بڑا تھا کہ روپے پیسے کے ساتھ زیورات بھی اس میں رکھے جاتے تھے۔ انہوں نے عطردان کا قفل کھولا۔ ڈھکنا اُٹھایا۔ چور خانے سے پچاس روپے نکالے اور خسرو کی جانب بڑھاتے ہوئے گویا ہوئیں۔ "مجھے معلوم ہے۔ تو اس سے کم قبول کرنے پر راضی نہ ہوگا۔ اپنی ہٹ کا پکا ہے آسانی سے نہیں ٹلے گا۔" وہ کھل کر مسکرانے لگیں۔

خسرو نے روپے لئے جھک کر ماں کو آداب کیا۔ حضور بیگم ایسی نہال ہوئیں کہ بیٹے کا سر قریب کیا اور دونوں ہاتھوں سے چٹ چٹ بلائیں لیں۔

خسرو کھلنڈرے پن سے ہنستا مسکراتا ڈیوڑھی کی جانب بڑھا۔ ماں اُسے دُور تک دیکھتی رہیں۔ دل ہی دل میں دعائیں دیتی رہیں۔

خسرو ایسا گیا کہ پھر اس طرح آنا نصیب نہ ہوا۔ گھر سے ہنستا بولتا نکلا واپسی پر لاش آئی۔ صرف اتنا سننے میں آیا کہ وہ اور اس کے دو مقربین تانگے میں سوار ہو کر قیصر باغ جا رہے تھے تانگہ جب میڈیکل کالج سے آگے بڑھا اور شاہ مینا مخدوم کی درگاہ کے سامنے پہنچا تو اچانک زبردست دھماکہ ہوا۔ ایک بم تانگے پر آکر پھٹا، خسرو کے دونوں ہم نشین اور تانگے والا تو زخمی ہو کر اسپتال کے ایمرجنسی وارڈ میں داخل ہوئے لیکن خسرو کا جسم اس بری طرح جھلسا کہ تانگے ہی میں دم توڑ دیا۔ عین اسی وقت سڑک پر انگریز ڈپٹی کمشنر کی موٹر بھی گزری تھی کہتے ہیں کہ بم دراصل اس پر ہی پھینکا گیا تھا لیکن نشانہ چوک گیا۔ اخبارات نے بھی اپنی خبروں میں اسی شبہ کا اظہار کیا تھا۔ انھی دنوں کئی شہروں میں بموں کے دھماکے ہو چکے تھے جن میں کئی افراد ہلاک اور زخمی ہو چکے تھے حکومت نے ان دھماکوں کا ذمہ دار دہشت پسندوں کی تنظیم، ہندوستان سوشلسٹ ریپبلکن ایسوسی ایشن کو قرار دیا تھا۔

ساتھ ہی یہ بھی سننے میں آیا کہ خسرو کو سوچے سمجھے منصوبے کے تحت قتل کیا گیا تھا اور اس سازش کے پیچھے نواب صفی کا ہاتھ تھا۔ جائیداد کے تنازعے پر چھوٹے بھائی، نواب تقی سے تو مقدمہ بازی ہو ہی رہی تھی لیکن ایک نوجوان اور طناز طوائف کے معاملے میں چچا اور بھتیجے کے درمیان شدید رقابت پیدا ہو گئی تھی اور اس کا آغاز بھی ایک حادثہ سے ہوا تھا۔

☆

چوک میں شام اودھ اپنی تمام رنگینیوں کے ساتھ اُتر آئی تھی۔ ہر طرف گہما گہمی، اور چہل پہل تھی۔ ساز و آواز کا جادو جاگتا تھا۔ کہیں طبلہ ٹھنکتا تھا کہیں سارنگی سے سروں کی پھوار پھوٹتی تھی۔ کہیں گھنگرؤں کا چھناکا گونجتا تھا۔ بازار

میں نمائش میں منڈلاتے تھے۔ بالاخانوں کے چھجوں پر طوائفیں بن سنور کر دعوت نظارہ دیتی تھیں۔ آنکھوں آنکھوں میں اشارے ہوتے تھے۔ جذبات میں تلاطم برپا کرنے کے حربے آزمائے جاتے تھے۔

خسرو اپنے مصاحب مرزا مشرف، کے ہمراہ کینکی طوائف کے کوٹھے پر پہنچا کینکی کے حسن و جمال کا ان دنوں چوک میں بڑا شہرہ تھا۔ اس کا بالا خانہ سرائے تحسین علی خان سے متصل تھا اور اس کا اگلا حصّہ بازار کے رُخ پر تھا۔ بالاخانے کا ایک دروازہ پچھواڑے کی گلی میں کھلتا تھا۔ خسرو اسی دروازے سے مرزا مشرف کے ساتھ زینے کی سیڑھیاں طے کر کے اوپر پہنچا۔

کمرہ خوب کشادہ تھا۔ سفید چاندنی کا فرش تھا اس پر مسند بچھی تھی، کینکی گاؤ تکیہ سے ٹیک لگائے نہایت ٹھسّے سے بیٹھی تھی۔ چودہ گز کا کلی دار پا ئجامہ خوب کسا ہوا اور کولہے سے تین انگل اونچا شلوکہ۔جامدانی کا دوپٹہ، آنکھوں میں دنبالہ سُرمہ، دانتوں پر مسّی، ہونٹوں پر پان کا لاکھا۔ ہاتھوں، کانوں اور گلے میں مرصّع زیورات۔ کینکی پورا سنگھار کیے، مجسم قیامت بنی دروازے کے سامنے ہی بیٹھی تھی۔ پہلو میں بڑا سا پاندان رکھا تھا نائکہ پاندان کھولے نہایت سلیقے اور نفاست سے پان لگا رہی تھی۔

کینکی کی نظر نواب خسرو پر پڑی تو پائنچے سنبھالتی ہوئی فوراً اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ مرزا مشرف نے مُسکرا کر خسرو کا تعارف کرایا۔ کینکی کمر تک جُھک کر سات بار تسلیمات بجالائی۔ بڑھ کر شگفتہ لہجے میں خسرو کا خیر مقدم کیا۔" زہے نصیب، حضور نے کفش خانے کو زینت بخشی۔ بندی کی عزّت افزائی فرمائی۔ آیئے، تشریف رکھئے" اس نے ہاتھ اُٹھا کر مسند کی جانب اشارہ کیا اور ایک طرف ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔

خسرو نے کینکی کو دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ جیسا سُنا تھا ویسا ہی پایا۔ اس کے حُسنِ جہاں تاب، رکھ رکھاؤ اور شائستگی سے بہت متاثر ہُوا۔ خسرو نے دہلیز عبور کی مسند کی جانب قدم بڑھایا ہی تھا کہ ٹھیک اسی لمحے سامنے کے دروازے سے

نواب صفی اپنے دو مصاحبین کے ہمراہ نمودار ہوئے۔ بھتیجے نے چچا کو اور چچا نے بھتیجے کو دیکھا، لگا ہوں کا تصادم ہوا۔ دونوں بہت سٹ پٹائے، خجل اور شرمسار ہوئے، ندامت سے سر جھکائے اُلٹے قدموں جس راستے سے آئے تھے اسی سے واپس ہوئے۔

مگر خسرو پہلی ہی نگاہ میں کیتکی کے تیرِ نظر کا ایسا شکار ہوا کہ ضبط کا یارا نہ رہا، بے قرار ہو کر دوبارہ اُس کے پاس پہنچا اور رات گئے تک وہیں رہا رخصت ہوا تو کیتکی نے لگاوٹ سے کام لیا، قسمیں دے کر پھر آنے پر اصرار کیا۔

خسرو کا کیتکی کے بالا خانے پر باقاعدہ آنا جانا شروع ہو گیا۔ نواب صفی کے کیتکی سے پہلے ہی مراسم تھے اور وہ ہنوز برقرار تھے۔ وہ اسے مستقل ملازم رکھنا چاہتے تھے۔ لیکن کیتکی آمادہ نہ ہوئی اور اس کا بنیادی سبب خسرو تھا۔ اس کی جانب کیتکی کا التفات بھی کچھ زیادہ ہی تھا۔ عالم اس کا یہ تھا کہ جوانی کی بھری دوپہر تھی۔ انگ انگ چھلکتا تھا، بولتا تھا، غضب کی رعنائی اور دل ربائی تھی۔ خسرو بھی سجیلا اور کڑیل جوان تھا۔ اس کی بھی اُٹھتی جوانی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ کیتکی اسے دل دے بیٹھی تھی۔

نواب صفی بھی کیتکی پر بُری طرح فریفتہ تھے۔ نائکہ بھی ان کی ہم نوا اور طرفدار تھی۔ کھاتی پیتی ڈیرے دار طوائف تھی، تمام عمر رئیسوں سے سابقہ رہا تھا۔ لہٰذا جہاں دیدہ اور گھاگ تھی، خسرو کے مقابلے میں نواب صفی کو فوقیت دیتی تھی، اس کا معقول جواز بھی تھا۔ نواب صفی بات بات پر پیسہ لٹاتے تھے۔ خاندانی رئیس تھے اور اپنی مرضی کے مختار بھی تھے۔ اِس دوڑ میں خسرو ان کے سامنے کہاں ٹھہر سکتا تھا، وہ ماں باپ کا دستِ نگر تھا۔ نواب تقی کی ہدایت پر محل سرا کا خزانچی چرنجی لال تین سو روپے ماہانہ ہاتھ خرچ دیتا تھا۔ اس کے علاوہ طرح طرح کے حیلے بہانے کر کے کچھ رقم ماں سے بھی اینٹھ لیتا تھا۔ یہ بات کیتکی بھی جانتی تھی اور اس کی نائکہ بھی مگر یہ سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی کیتکی ہمیشہ نواب صفی سے کنّی کاٹتی۔ ان کو

ذرا گھاس نہ ڈالتی۔ اس کی اس بے رخی اور کج ادائی پر نواب صفی تڑپ کر رہ جاتے۔

نواب صفی جتنی تنبیہہ کرتے کیتکی اتنی ہی زیادہ خسرو کی جانب مائل ہوتی جا رہی تھی۔ خسرو کی فرمائش پر اس نے ساڑی باندھنا بھی شروع کر دی تھی۔ حالانکہ نواب صفی اسے ساڑی میں ملبوس دیکھ کر ناک بھوں چڑھاتے۔ فرشی پاجامہ اور شلوکہ پہن نے پر اصرار کرتے۔ نائکہ کو بھی یہی لباس پسند تھا مگر کیتکی ہر وہ لباس پہنتی جو خسرو کو پسند تھا۔ جس شام خسرو کا قتل ہوا وہ بھی اس کے ہمراہ تھی۔ خسرو کی خواہش پر اس نے دھانی رنگ کی ساڑی باندھی تھی جو اس کے لئے خاص طور پر وہ بزازے سے خرید کر لایا تھا۔ آگے کے تانگے میں خسرو اپنے یار دوستوں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ پیچھے کیتکی کا تانگہ تھا جس میں وہ دو بھڑوؤں کے ساتھ موجود تھی۔

بم کے دھماکے سے کیتکی کا تانگہ بال بال بچ گیا تھا۔ کیتکی اور اس کے دونوں بھڑوے بھی محفوظ رہے تھے البتہ کیتکی خوف اور دہشت سے بے ہوش ہو گئی تھی سنا ہے نواب صفی اس وقت خسرو کے بالاخانے پر نائکہ کے ساتھ بیٹھے تھے اور خسرو کے ہلاک ہونے کی خبر سننے کے منتظر تھے۔

لیکن دیکھنے والوں نے یہ بھی دیکھا کہ مقدمہ بازی اور شدید رنجش کے باوجود نواب صفی، بھتیجے کی المناک موت کی اطلاع ملتے ہی فوراً بدحواس ہو کر بارہ دری میں پہنچے۔ پچھاڑیں کھاتے تھے۔ پھوٹ پھوٹ کر روتے تھے۔ بھائی کو گلے سے لگا کر بین کرتے تھے۔ مگر اس گریہ وزاری اور آہ و فغان کے باوجود حضور بیگم کا شبہ رفع نہ ہوا۔ وہ اب تک یہی کہتی تھیں کہ خسرو کو نواب صفی ہی نے قتل کرایا تھا۔ حالانکہ نواب نقی اس معاملے میں ان کے ہم خیال نہ تھے۔ حقیقت کیا تھی؟ یہ راز ہمیشہ راز ہی رہا۔

حضور بیگم نے خسرو کی لاش دیکھی تو تیورا کر گر پڑیں۔ ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے بیٹھی بیٹھی گئیں۔ بڑی مشکل سے انہیں ہوش میں لایا گیا۔ جوان بیٹے کی موت

نے انہیں توڑ پھوڑ کر ملبے کا ڈھیر بنا دیا۔ خسرو کا غم ان کی زندگی کا ناسور بن گیا اس کی یاد آئی تو دل سے ہوک اٹھتی۔

(۷)

دلاری نے حضور بیگم کو گم صم دیکھا تو گمان غالب ہوا کہ جمن کا ذکر ان کو ناگوار گزرا۔ یہ قیاس آرائی بے سبب بھی نہ تھی۔ حضور بیگم نے جمن کو ہمیشہ نفرت کی نظر سے دیکھا تھا۔ کبھی ان کے پاس چلا جاتا تو حقارت سے دھتکار دیتی تھیں جلی کٹی سناتی تھیں۔ لہذا دلاری نے معذرت کے انداز میں کہا۔ "لگتا ہے سرکار کو میری کوئی بات بُری معلوم ہوئی"۔ اس نے جمن کا نام لینے سے گریز کیا۔ "غلطی ہو گئی۔ معاف کر دیں"۔ وہ ان کے چہرے کی جانب دیکھنے لگی۔

"کیسی غلطی، کاہے کی معافی؟" حضور بیگم نے چونک کر کہا۔

"سرکار میں سمجھی جمن کا ذکر آپ کو ناگوار معلوم ہوا"۔ دلاری نے وضاحت کی "میں اسے یہاں نہیں لاؤں گی"۔

"کیوں نہیں لاؤ گی، اُسے ضرور لانا۔ اسی گھر میں تو وہ پلا بڑھا ہے۔ میں اسے کیسے بھول سکتی ہوں"۔ حضور بیگم اب یادوں کے حصار سے باہر نکل آئی تھیں انہوں نے دلاری کی بدگمانی دور کرنے کی کوشش کی۔ "اے لو، اس کا ذکر مجھے کیوں ناگوار گزرنے لگا۔ اسے تو دیکھنے کو بہت دل چاہتا ہے۔ اب تو ماشاءاللہ خاصا سیانا ہو گیا ہو گا"۔

"اے سرکار، وہ تو ابھی سے تاڑ کا تاڑ ہو گیا ہے۔ دیکھیں گی تو پہچان نہ سکیں گی"۔ دلاری نے مسکرا کر بتایا۔ "مگر سرکار، آپ اس کے سامنے آنا پسند کریں گی؟"

"اے وہ کتنا بڑا ہو جائے میرے سامنے تو بچہ ہی رہے گا"۔ حضور بیگم نے بات کا رُخ بدلتے ہوئے پوچھا۔ "یہ تو بتاؤ دلاری تم اب کر کیا رہی ہو؟"

"سرکار! یہاں سے جانے کے بعد کچھ دن تو دھکے کھاتی رہی پھر نواب مظفر الدولہ

کی ڈیوڑھی پر ملازم ہو گئی۔ کوئی تین سال تک وہاں کام کرتی رہی۔ پھر وہ ملازمت بھی چھوڑ دی۔"

"چھوڑ دی یا ملازمت سے برطرف کر دی گئی تھیں؟" حضور بیگم نے دریافت کیا۔ "ویسے ان کی محل سرا کا یہ دستور نہیں۔ جسے ایک بار ملازم رکھ لیا وہ ہمیشہ کے لئے ان کا ہو گیا۔ میں نے تو یہی سنا ہے۔"

"آپ نے بالکل درست سنا۔" دلاری نے ان کی تائید کی۔ "میں نے خود ہی نوکری چھوڑ دی۔ کیا کرتی صرف دو روپے تنخواہ ملتی تھی۔"

"اے لو یہ کچھ کم ہے۔ تنخواہ تو صرف نام کی ہوتی ہے۔ کھانے پینے اور رہنے سہنے کے علاوہ سال میں دو جوڑے پہننے کیلئے۔ انعام و اکرام اس کے علاوہ۔" حضور بیگم بھی اپنی خادماؤں کو یہی تنخواہ دیتی تھیں۔ اور وہ بھی خواصوں کو جن کو ان کا قرب حاصل ہوتا تھا وہ متعمد اور ہمراز بھی ہوتی تھیں۔ ورنہ عام ماماؤں اور لونڈیوں کو تو صرف ایک روپیہ تنخواہ دیتی تھیں۔ کچھ تو ایسی بھی تھیں جو صرف روٹی کپڑے پر خدمت انجام دیتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا لہجہ قدرے تیکھا تھا۔ دلاری نے بھی اسے محسوس کیا۔ اس نے فوراً صفائی پیش کی۔ "سرکار! بالکل بجا فرما رہی ہیں۔ میں نے دراصل نواب مظفرالدولہ کی ملازمت اس لئے چھوڑ دی کہ مجھے چائے کی کمپنی میں ملازمت مل گئی تھی۔ دس روپے مہینہ تنخواہ کے علاوہ چار آنے روز بھتہ بھی ملتا تھا اور ہفتے میں ایک روز چھٹی۔ مگر اس روز کا بھتہ نہیں ملتا تھا۔"

"اے دلاری! چائے کی کمپنی میں تم کیا کرتی تھیں؟" حضور بیگم نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

"سرکار! وہ کیا کہتے ہیں اسے۔" دلاری اپنی بات کہتے کہتے الجھی۔ "یاد آیا۔ پبلسٹی کرتی تھی۔"

"اے وہ کیا ہوتی ہے؟"

"سرکار! شروع شروع میں تو مجھے بھی کچھ معلوم نہیں تھا۔ جب میں کمپنی کے دفتر

گئی تو وہاں بتایا گیا کہ کیا کام کرنا ہوگا۔ وہاں اور بھی عورتیں تھیں، مرد بھی تھے مگر عورتیں زیادہ تھیں۔ ہر ایک کے لئے الگ الگ محلے اور علاقے مقرر تھے۔ کچھ روز دفتر جاتی رہی۔ پھر ایک عورت کے ساتھ مجھے کام سیکھنے پر لگا دیا گیا۔ اس کا نام بتن تھا وہ جیشن تھی۔ کسی زمانے میں قلماقنی رہ چکی تھی۔"

"وہ گویا تمہاری استانی تھی۔" حضور بیگم نے مسکرا کر تبصرہ کیا۔

"سرکار! یہی سمجھ لیجئے۔" دلاری نے بتایا۔ "دو کارندے بھی ہمارے ساتھ رہتے تھے۔ ایک گراموفون اور دوسرا سماوار اور ضرورت کا کچھ اور سامان اُٹھا کر چلتا تھا۔ یحییٰ گنج کے چورا ہے پر بتن نے سارا سامان اتروایا۔ ایک صاف ستھری جگہ پر سماوار رکھوایا۔ اسٹول پر گراموفون رکھا۔ چابی بھری اور گانے کا ایک ریکارڈ بجنے کے لئے لگا دیا۔"

"وہ کاہے کے لئے؟" حضور بیگم نے بے چین ہو کر پوچھا۔

"مجمع اکٹھا کرنے کے لئے۔" دلاری نے مسکرا کر جواب دیا۔ "وہی ہوا۔ گانا سننے کے لئے لوگ آ آکر ہمارے اردگرد کھڑے ہو گئے۔ بتن نے سماوار کے نیچے آگ روشن کی۔ قریب ہی بمبا تھا۔ اس میں سے جگ میں پانی لیا اور سماوار میں بھر دیا جب تک پانی گرم ہوتا رہا۔ بتن ایک کے بعد دوسرا ریکارڈ بجاتی رہی۔ مجمع برابر بڑھتا رہا۔ پانی جب کھولنے لگا تو بتن نے اس میں چائے ڈالی۔ دودھ ملایا۔ شکر ڈالی۔ چائے تیار ہو گئی تو بتن نے کوزوں کلھڑوں میں سماوار میں لگی ہوئی ٹونٹی سے چائے نکالی اور باری باری ہر ایک کو پینے کے لئے دی۔"

"اے یہ چائے ان لوگوں نے کیسے پی لی۔ کشمیری چائے کی تو بات ہی دوسری ہے۔ مگر یہ کالی پتی کی چائے تو ایسی کڑوی کسیلی ہوتی ہے جیسے جوشاندہ۔ حلق سے نیچے نہیں اترتی۔" حضور بیگم نے منہ بگاڑ کر اپنے ردّ عمل کا اظہار کیا۔

"سرکار! اب تو ہر گھر میں اسی کا رواج ہوتا جا رہا ہے۔ بلکہ غریب غربا تو چائے میں رات کی باسی روٹی بھگو کر سویرے اسی سے ناشتہ کرتے ہیں۔" دلاری نے

زور دے کر کہا۔ "منہ اندھیرے گلی گلی پھیری والے چائے بیچتے پھرتے ہیں۔"

"مگر پھیری والے تو قیمت لے کر چائے دیتے ہیں اور بنّن مفت چائے پلاتی تھی۔"

"چائے بھی مفت پلاتی تھی اور ہر چائے پینے والے کو چائے کا ایک ایک پیکٹ بھی مفت دیتی تھی۔" دلاری نے حضور بیگم کو مطلع کیا۔ "بعد میں جب میں بنّن کے بغیر اکیلی کام پر جانے لگی تو میں بھی یہی کرتی تھی۔ مفت چائے پلاتی تھی مفت چائے دیتی تھی۔ چائے تیار کرنے کا طریقہ بھی سکھاتی تھی۔ اس کے فائدے بتاتی تھی۔ چیخ چیخ کر کہتی تھی۔ چائے پیا کیجئے۔ چائے تھکن دور کرتی ہے۔ سردیوں میں گرمی اور گرمیوں میں ٹھنڈک پہنچاتی ہے۔"

"اے دلاری! تم برقعہ پہن کر یہ سب کیسے کرتی ہو گی؟ اور وہ بھی غیر مردوں کے سامنے۔"

"سرکار! برقعہ تو میں اب پہننے لگی ہوں۔ ان دنوں تو بے پردہ رہتی تھی۔ سفید دھوتی باندھتی تھی۔ میرے ساتھ کی دوسری عورتوں کا بھی یہی لباس ہوتا تھا۔ اس میں فائدہ یہ تھا کہ ہندو مسلمان کا فرق نہیں معلوم ہوتا تھا۔ چائے پینے والے تو سب ہی ہوتے تھے اسی لئے آب خوروں میں چائے پلائی جاتی تھی۔" دلاری نے بتایا۔ "کئی سال تک یہ کام کیا۔ پھر کمپنی کو شہروں میں گراموفون پر گانے سنا کر مفت چائے پلانے کی ضرورت ہی نہ رہی۔ لوگ چائے کے عادی ہو گئے تو ایک ایک کر کے سب کو دیہاتوں میں بھیجنے لگے مجھے امیٹھی بھیجنا چاہا تو میں نے نوکری چھوڑ دی۔"

"تم نے یہ نہیں بتایا کہ آج کل کیا کر رہی ہو؟"

"سرکار رشتے طے کراتی ہوں۔"

"تو گویا تم نے مشّاطہ کا پیشہ اختیار کر لیا ہے۔" حضور بیگم نے دریافت کیا "یہ کام تم نے کب شروع کیا؟"

" سرکار، اب تو کئی سال ہو گئے۔ کیا کروں، پیٹ پالنے کے لئے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا۔ یہی پیشہ اختیار کر لیا۔"

" اس کام میں ٹھیک سے گزر بسر ہو جاتی ہے؟"

" یوں سمجھ لیجئے کوئی رشتہ طے ہو گیا تو بیٹے اور بیٹی والوں دونوں طرف سے انعام و اکرام کے ساتھ ساتھ جوڑے بھی ملتے ہیں۔ کبھی کبھار صرف ایک ہی طرف سے ملتا ہے۔ مگر سرکار بھاگ دوڑ بہت کرنی پڑتی ہے۔ ٹانگیں جواب دے جاتی ہیں۔"

دلاری آہستہ آہستہ پان کی جگالی کرتی رہی اور بتاتی رہی۔" جب تک بات چیت کا سلسلہ چلتا رہتا ہے تو دونوں ہی طرف خوب خاطر تواضع ہوتی ہے۔ مگر شادی ہوتے ہی دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینکتے ہیں۔ جاؤ تو کوئی سیدھے منہ بات نہیں کرتا۔"

حضور بیگم نے مسکرا کر کہا:" مگر تم کو تو تمہارا حق مل جاتا ہے۔" دلاری کی باتیں سُن کر حضور بیگم کے ذہن پر چھایا ہُوا غبار کسی قدر کم ہو گیا تھا۔

دلاری نے بتایا:" سرکار، یہ تو خوشی کا سودا ہے۔ کوئی زور زبردستی تو ہے نہیں ہاں، اگر کسی بڑی سرکار کا رشتہ طے کرانے کا موقع مل جائے اور دل بھی بڑا ہو تو اچھا خاصا انعام و اکرام مل جاتا ہے۔ مگر ایسے رشتے روز روز کہاں ملتے ہیں؟" اس نے خاصدان اٹھا کر سرپوش ہٹایا۔ حضور بیگم کو پیش کیا۔ ایک گلوری ان کو دی اور ایک اپنے کلّے میں دبائی:" ایک ایسا ہی رشتہ آج کل میرے پاس ہے۔ لڑکا صورت شکل کا اچھا ہے۔ نیک اور سعادت مند بھی ہے۔ کسی فعل بد میں نہیں، کوئی لت نہیں، خاندان بھی اچھا ہے۔ صاحب جائیداد ہے۔" اس نے قدرے تامّل کیا۔ پھر حرف مطلب پر آ گئی۔" مجھے تو اپنی چھوٹی سرکار کے لئے مناسب معلوم ہوتا ہے۔"

" مگر میرا تو ابھی کوئی ارادہ نہیں۔ تم کو یہ تو علم ہی ہے کہ میری ایک ہی بچی ہے جب یہ خیال آتا ہے کہ وہ مجھ سے جدا ہو کر پرائے گھر کی ہو جائے گی تو دل بیٹھنے لگتا ہے۔" حضور بیگم نے بجھے ہوئے دل سے کہا۔" ویسے وہ کب تک میرے پہلو سے لگی بیٹھی رہے گی۔ ایک نہ ایک روز تو اسے جُدا ہونا ہی ہوگا۔"

"سرکار، مجھے پہلے ہی اس بات کا اندازہ تھا کہ آپ چھوٹی سرکار سے کتنی ٹوٹ کر محبت کرتی ہیں۔ اور ہیں بھی تو کتنی اچھی۔ چندے آفتاب چندے مہتاب۔ بات کریں تو مُنہ سے پھُول جھڑیں۔ نہ پُوچھیے انہیں دیکھنے کو کیسا کیسا دل تڑپتا تھا۔"

"تم کو روکا کس نے تھا؟ جب چاہتیں آجاتیں۔" حضور بیگم نے کہا۔ "جب نہ آئیں تو اب کبھی کبھار آجایا کرو۔"

"اب تو سرکار آتی رہوں گی۔" دلاری نے ہامی بھری۔ "خدا کرے یہ رشتہ آپ کو پسند آجائے۔ میری تو دلی تمنّا ہے کہ سرکار کی کوئی خدمت کرسکوں۔ برسوں نمک کھایا ہے اور چھوٹی سرکار سے تو مجھے ویسے بھی بہت محبت ہے۔ میرے سامنے اتنی سی اتنی بڑی ہوئیں۔"

"اب تم نے ذکر چھیڑا ہے تو اس بارے میں سوچوں گی۔" حضور بیگم نے گول مول جواب دیا۔

"اے سرکار، یہ شادی بیاہ کا معاملہ بھی ایسا ہے کہ پُوری زندگی کا سوال ہوتا ہے۔ بچّوں کا کھیل نہیں، سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا ہوتا ہے۔ اچھی طرح سوچ لیجیے، غور کر لیجیے، چھان بین کر لیجیے، پھر فیصلہ کیجیے۔"

دلاری منجھی ہوئی مشاطہ کی طرح باتیں بنانے اور رجھانے کے فن میں طاق ہوگئی تھی۔ حضور بیگم اس کی باتوں سے متاثر بھی ہوئیں مگر انہوں نے کھل کر بات نہ کی۔ دلاری نے اپنا بستہ کھولا۔ اس میں سے ایک سُرخ خریطہ نکالا۔ حضور بیگم خاموش بیٹھی دیکھتی رہیں۔ انہوں نے کوئی تبصرہ نہ کیا۔ "اس میں رقعہ بھی موجود ہے لڑکے کے بارے میں سب کچھ تفصیل سے لکھا ہے۔" دلاری نے خریطہ حضور بیگم کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اسے رکھ لیجیے۔ اچھی طرح پوچھ گچھ کرا لیجیے۔"

"فی الحال تم اسے اپنے ہی پاس رکھو۔" حضور بیگم نے خریطہ لینے سے گریز کیا۔ "بعد میں آنا تو اس بارے میں بات کرنا۔"

"اے سرکار، رقعہ رکھ لینے میں حرج کیا ہے۔" دلاری نے مسکرا کر کہا۔ "اس کا

مطلب یہ تو نہیں ہُوا کہ آپ کسی طور پابند ہو گئیں۔ جہاں بیری ہوتی ہے وہاں ڈھیلے تو آتے ہی ہیں۔"

دلاری نے اصرار کیا تو حضور بیگم کے لئے انکار کی گنجائش نہ رہی۔ انہوں نے رقعہ لے کر بے نیازی سے ایک طرف رکھ دیا اور صرف اتنا دریافت کیا۔ "لڑکے کے والد کیا کرتے ہیں؟"

"سرکار خاندانی رئیس تھے مگر ان کا انتقال ہو گیا۔ لڑکے کی ماں بھی نہیں ہے۔" دلاری نے بتایا۔ "صرف ایک بڑی بہن ہیں وہ بھی خیر سے اپنے گھر بار کی ہو چکی ہیں۔ وہی بھیجے اب سرپرست ہیں۔ آپ کی بھاوج خورشید جہاں بیگم کے پڑوس میں برسوں رہ چکی ہیں۔ ان سے ابھی یاد اللہ رہی ہے۔ اب اپنے سعادت گنج والے مکان میں چلی گئی ہیں۔ کچھ پُوچھنا ہے تو آپ خورشید جہاں بیگم سے بھی پوچھ سکتی ہیں۔"

حضور بیگم خاموش رہیں۔ دلاری نے اطمینان سے اپنا بستہ کپڑے میں لپیٹ کر گرہ لگائی، رخصت ہونے کی اجازت چاہی۔ "سرکار، اب مجھے اجازت دیں۔ شام ہوا چاہتی ہے اور مجھے ابھی بہت دُور جانا ہے۔" وہ اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

اسی وقت مغلانی کمرے میں داخل ہوئیں۔ دلاری کو دیکھ کر بولیں۔ "اے دلاری کہاں چلیں۔ بیٹھو تم سے تو بات کرنے کا موقع بھی نہ ملا۔"

"مغلانی جی، میں پھر آؤں گی۔" دلاری رُکنے پر آمادہ نہ ہُوئی۔ "مجھے بنجاری ٹولہ جانا ہے۔ آج کل وہیں رہتی ہُوں۔" حضور بیگم بولیں۔ "دلاری آتی رہنا۔"

وہ مُسکرا کر بولی۔ "اب تو آنا جانا رہے گا۔ مگر میں ہفتے بھر سے پہلے نہ آسکوں گی۔"

وہ آگے بڑھی تو حضور بیگم نے ٹوکا۔ "دلاری ذرا رک جاؤ۔" دلاری ٹھہر گئی حضور بیگم نے مڑ کر اپنا تکیہ اٹھایا۔ اس کے نیچے ہاتھ ڈال کر پانچ روپے نکالے اور دلاری کو دے دیئے۔ وہ دعائیں دیتی ہوئی چلی گئی۔

☆

مغلانی کے ذہن میں کھلبلی مچی تھی کہ عرصہ دراز تک غائب رہنے کے بعد آج

دلاری کیسے بارہ دری میں آ گئی۔ انہوں نے بیٹھتے ہی اپنے تجسس کا اظہار کیا۔ "سرکار، یہ دلاری آج کیسے بھول کر ادھر آ گئی؟ اس نے تو جیسے یہاں آنے کی قسم کھا رکھی تھی۔"

"اس نے مشاطہ کا پیشہ اختیار کر لیا ہے۔" حضور بیگم نے مغلانی کو مطلع کیا۔ "شادی بیاہ کراتی ہے۔ اور اس کے صلے میں انعام و اکرام وصول کرتی ہے۔"

مغلانی کو ایک بار پھر ہرمزی کی باتیں یاد آ گئیں۔ سوچا کہ شاید نفیسہ بیگم نے دلاری کے ذریعہ بیٹے کا پیغام دیا ہو۔ انہوں نے ٹوہ لگانے کی کوشش کی۔ دبی زبان سے کہا:

"سرکار بہت دنوں سے نفیسہ بیگم تشریف نہیں لائیں۔"

"اے بی مغلانی، یہ اس وقت تم کو نفیسہ بیگم کیوں یاد آ گئیں؟" حضور بیگم کی تیوری پر دفعتہً بل پڑ گئے۔ لہجہ تیکھا ہو گیا۔

مغلانی نے حضور بیگم کے بگڑتے ہوئے تیور دیکھے تو سخت سٹ پٹائیں۔ دل ہی دل میں ہرمزی پر نفرین کی۔ فوراً بات بنائی۔ "دلاری کو دیکھ کر مجھے ان کا خیال آیا۔ سنا ہے کہ اس کا نفیسہ بیگم کے پاس بہت آنا جانا ہے۔"

"میں نے تو کسی سے ایسا نہیں سنا اور نہ ہی دلاری نے نفیسہ بیگم کا کوئی تذکرہ کیا۔" حضور بیگم کا لہجہ بدستور تیکھا تھا۔

"کسی نے مجھے غلط اطلاع دی ہو گی۔" مغلانی نے صفائی پیش کی۔ "یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سننے میں مجھ سے غلطی ہو گئی ہو۔"

"ویسے وہ نہ آئیں یہی اچھا ہے۔" حضور بیگم نے منہ بگاڑ کر بیزاری سے کہا۔ "وہ جب آتی ہیں تو اپنے بیٹے کے رشتے کا ذکر چھیڑتی ہیں حالانکہ میں صاف جواب دے چکی ہوں۔ مگر وہ ایسی ڈھیٹ ہیں کہ باز ہی نہیں آتیں۔"

"سرکار، آپ تو کئی بار انکار کر چکی ہیں۔" مغلانی نے فوراً ان کی ہاں میں ہاں ملائی۔ اب کسی شک و شبہ کی گنجائش نہ رہی تھی۔ انہوں نے بات کا رُخ بدلنے کی کوشش کی۔ "دلاری کی حالت دیکھ کر تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ پریشان حال ہے۔"

"ٹھیک کہہ رہی ہو۔ اس کی حالت دیکھ کر مجھے بھی دکھ ہوا۔" حضور بیگم نے قدرے تامّل کیا۔ پھر مغلانی کو مطلع کیا۔" وہ طلعت آرا کے لئے ایک پیغام لے کر آئی تھی۔"

"لڑکے کے بارے میں کچھ بتاتی تھی؟"

"تعریف تو اس قدر کر رہی تھی کہ زمین آسمان کے قلابے ملا دیئے۔ ویسے مشاطاؤں کا تو یہ کام ہی ہوتا ہے۔ لڑکی والوں میں جائیں تو لڑکے کی تعریف کے پل باندھیں اور لڑکے والوں میں لڑکی کی تعریف و توصیف کریں۔" حضور بیگم نے کہا "دلاری بولتی رہی، بتاتی رہی۔ میں تو خاموش بیٹھی اس کی باتیں سنتی رہی۔"

"کوئی رقعہ وقعہ بھی لائی یا خالی زبانی جمع خرچ تھا؟" مغلانی نے دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے دریافت کیا۔

"رقعہ بھی لائی تھی۔ میں تو منع کرتی رہی، مگر اس نے اس قدر اصرار کیا کہ مجبوراً لے کر رکھ لیا۔" حضور بیگم نے سرہانے رکھا ہوا سُرخ خریطہ دکھایا۔" اس میں رکھا ہے میں نے کھول کر بھی نہیں دیکھا۔" انہوں نے ٹھنڈی سانس بھری۔" کیا کروں گی اسے دیکھ کر۔ بچّی کی طرف سے دل ویسے ہی پریشان ہے۔ یہ وقت اس کا رشتہ طے کرنے کا ہے؟"

"سرکار اجازت ہو تو ایک بات کہوں؟" مغلانی نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہاں ضرور کہو۔" حضور بیگم نے مغلانی کی حوصلہ افزائی کی۔

"میں تو کہتی ہوں۔ سرکار جو ہونا تھا ہو گیا۔ میری ناچیز رائے میں تو اب یہی مناسب ہے کہ آپ جلد سے جلد چھوٹی سرکار کے فرض سے سبکدوش ہو جائیں۔" مغلانی نے سنبھل سنبھل کر اپنی رائے کا اظہار کیا۔" وہ اپنے گھر بار کی ہو جائیں تو یہ بدنامی اور رسوائی کا دھڑکا تو نہ رہے گا۔"

حضور بیگم نے کسی ردعمل کا اظہار نہ کیا۔ وہ سوچ میں پڑ گئیں۔

مغلانی نے ان کو سوچ میں غرق پایا تو اپنی بات پر زور دیا۔" ابھی تو بات دبی ہوئی ہے مگر زیادہ عرصے تک دبی نہ رہے گی۔ درست ہے کہ آپ نے تمام

خادماؤں کو سختی سے منع کر دیا ہے۔ لیکن ان کے پیٹ میں بات کہاں پچتی ہے ایک بار جب بات باہر نکل گئی تو آپ جانتی ہیں کہ بات کے کیسے کیسے بتنگڑ بنتے ہیں"۔

مغلانی جہاندیدہ تھیں۔ سوجھ بوجھ بھی رکھتی تھیں۔ انہوں نے نشیب و فراز سمجھایا تو حضور بیگم متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں۔ دبی زبان میں بولیں۔" کہتی تو تم ٹھیک ہو مگر یہ سوچ لو، جلدی میں کوئی اونچ نیچ نہ پڑ جائے۔ میری بچی پر کوئی نئی آفت نازل ہو"۔ انہوں نے اپنے خدشات کا بھی اظہار کیا۔

"سرکار، میں جلدی پر کب زور دے رہی ہوں"۔ مغلانی نے جھٹ وضاحت کی۔" مگر اس کے لئے خود کو تیار تو رکھنا چاہیئے۔ آپ نے یہ اچھا کیا کہ دفعہ رکھ لیا۔ لڑکے کے بارے میں، اس کے خاندان کے بارے میں معلومات تو حاصل کی جاسکتی ہیں۔ ویسے دلاری کیا کہتی تھی"؟

"وہ تو یہی کہتی تھی کہ لڑکا نیک اور شریف ہے۔ خاندانی رئیس ہے۔ صاحب جائیداد ہے"۔ حضور بیگم نے مغلانی کو آگاہ کیا۔" ماں باپ نہیں ہیں۔ صرف ایک بیاہی بڑی بہن ہے۔ پھوپھی ہی اب اس کی سرپرست بابڑی ہے۔ خورشید جہاں کے پڑوس میں برسوں رہ چکی ہے۔ خورشید سے ملنا جلنا بھی رہا ہے"۔ خورشید جہاں بیگم سے سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔

"لیجئے، یہ تو اور بھی اچھا ہوا" مغلانی نے مسکرا کر کہا"۔ کہیں اور پوچھ گچھ کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔

" خورشید کو تو میں کل ہی بلوا کر ساری معلومات حاصل کر سکتی ہوں وہ اس معاملہ میں صحیح مشورہ دے سکتی ہے"۔ حضور بیگم نے دلچسپی کے ساتھ ساتھ ایک بار پھر اپنے خدشات کا اظہار کیا"۔ مگر یہ بھی خوف دامن گیر ہے کہ کوئی الٹی سیدھی نہ ہو جائے۔ تم ان جنوں کو نہیں جانتیں۔ اللہ ان کے جلال سے بچائے۔ جب یہ سوچتی ہوں تو دل لرز جاتا ہے اسی لئے تو نہ میں نے طلعت آرا سے کچھ پوچھا اور نہ یہ چاہتی ہوں کہ کوئی اسے چھیڑے اور الٹے سیدھے سوال کر کے پریشان کرے"۔

"آپ کا فرمانا بالکل بجا ہے"۔ مغلانی نے حضور بیگم سے اتفاق کیا۔ "کچھ روز اطمینان سے گزر جانے دیجئے، پھر خورشید جہاں بیگم کو بلا کر مشورہ کر لیجئے گا۔"

حضور بیگم کو مغلانی کی بات دل لگتی معلوم ہوئی۔ وہ اس کے لئے آمادہ بھی ہو گئیں۔

(۸)

رات کا ابھی پہلا پہر تھا۔ بارہ دری کے طویل اور اونچے اونچے دالانوں اور بڑے کمرے میں جو نشست گاہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا فانوس اور مردنگ روشن کر دیئے گئے تھے۔ صحنچیوں اور خواب گاہوں میں کنول اور دو شاخے جھلملا رہے تھے۔

طلعت آرا اپنے کمرے ہی میں تھی۔ سورج غروب ہونے سے کچھ دیر قبل وہ بیدار ہو گئی تھی۔ اس نے حمام میں جا کر منہ دھویا اور خاموشی سے واپس اپنے کمرے میں آ گئی۔

طلعت آرا نے کچھ دیر پہلے کھانا کھایا تھا۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد اس نے آرام کیا۔ لباس تبدیل کیا۔ عمدہ جوڑا پہنا۔ اب وہ آئینہ کے سامنے کھڑی بال سنوار رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں دنبالہ سرمہ تھا۔ ہونٹوں پر پان کی لالی تھی کانوں میں کرن پھول تھے۔ گلے میں چندن ہار تھا۔ کلائیوں میں سونے کے جڑاؤ کڑے تھے۔ اس سج دھج نے اس کا حسن دو بالا کر دیا تھا۔

نجو دروازے پر نمودار ہوئی اور دہلیز پر ٹھٹھک کر طلعت آرا کو حیرت سے دیکھنے لگی۔ پھر وہ آگے بڑھی۔ طلعت آرا کے قریب پہنچی اور مسکرا کر شوخی سے بولی۔

"چھوٹی سرکار! اس وقت تو آپ ایسی اچھی لگ رہی ہیں کہ جی چاہتا ہے کہ بس دیکھتے ہی رہو"۔ اس نے بے تکلفی سے طلعت آرا کو چھیڑا۔ "کہیں میری نظر نہ لگ جائے۔ کالا دانہ لا کر نظر اتار دوں؟"

طلعت آرا نے کوئی جواب نہ دیا نہ مڑ کر اس کی جانب دیکھا۔ خاموشی سے

بالوں کی چوٹی گوندھتی رہی اِس نے صبح سے اب تک نجّو سے کوئی بات نہیں کی تھی۔

مگر نجّو ڈھیٹ بن کر برابر بولتی رہی۔" آپ نہ بولئے لیکن میں تو بات کرتی رہوں گی۔ کہاں تک نہ بولیں گی۔ آخر آپ کو اپنی نجّو پر ترس آ ہی جائے گا۔ اللہ قسم دل نہیں لگتا۔ گھبرائی گھبرائی اِدھر اُدھر پھرتی رہتی ہوں۔ پھر آپ کے پاس آجاتی ہوں۔" وہ کھل کر مسکرائی۔" آپ دھتکاریں یا خفا ہوں میں تو آپ کے پاس ضرور آؤں گی۔"

طلعت آرا بدستور خاموش رہی۔ چوٹی گوندھنے کے بعد وہ چند لمحے اپنی سج دھج دیکھتی رہی۔ پھر اس نے کھونٹی پر لٹکی ہوئی سُرخ شال اتاری اور اسے اوڑھنے لگی۔

نجّو خاموش کھڑی اس کی ایک ایک حرکت دیکھتی رہی۔ مگر جب طلعت آرا نے شال اوڑھی تو اسے تجسّس پیدا ہُوا۔ بڑے اشتیاق سے پوچھا۔" لگتا ہے آپ بڑی سرکار کے پاس جارہی ہیں۔" اس نے قیاس آرائی کی۔" ہاں انھی کے پاس جا رہی ہوں گی۔"

طلعت آرا نے نجّو کی جانب کوئی توجہ نہ دی۔ دوبارہ آئینہ کے روبرو کھڑے ہو کر سُرخ شال درست کرنے لگی۔

نجّو تیزی سے مُڑی۔ باہر نکلی اور حضور بیگم کی خواب گاہ کی جانب چلی۔ وہ دروازے ہی پر اُس سے مل گئیں۔ مغلانی بھی ان کے ہمراہ تھیں۔ نجّو اتنی تیزی سے چل کر آئی تھی کہ اس کی سانس پھول گئی۔

حضور بیگم نے نجّو کو اس عالم میں دیکھا تو گھبرا کر پوچھا۔" کیا ہوگیا نجّو تجھے خیریت تو ہے؟"

" سرکار۔" اس نے اپنی سانس کو قابو میں کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بتایا" چھوٹی سرکار آپ کو آداب کرنے آرہی ہیں۔"

حضور بیگم تو خاموش رہیں۔ اس دفعہ مغلانی نے دریافت کیا" تجھے کیسے معلوم

ہُوا کہ وہ سرکار کے پاس آرہی ہیں؟

"میں ابھی ان کے کمرے ہی میں تھی"۔ نجّو نے جواب دیا۔"سیدھی وہیں سے آرہی ہُوں"۔

"انہوں نے تجھے بتایا تھا کہ وہ ادھر آرہی ہیں"؟ حضور بیگم نے تفتیش کرنے کے انداز میں دریافت کیا۔

"سرکار، وہ مجھ سے بات ہی کب کرتی ہیں"۔ نجّو نے سوکھا سامنہ بنا کر شکوہ کیا۔"کسی بات کا جواب ہی نہیں دیتیں"۔ وہ لمحہ بھر کے لئے خاموش رہی۔"آپ دیکھئے گا وہ اس وقت کتنی اچھی لگ رہی ہیں۔ جوڑا بھی بہت اچھا پہن رکھا ہے۔ زیور بھی پہنے ہوئے ہیں۔ اس طرح نک سک سے درست ہو کر آپ کے پاس نہ آئیں گی تو اس وقت اور کہاں جائیں گی"۔

حضور بیگم خاموش کھڑی غور کر رہی تھیں کہ طلعت آرا اپنے کمرے سے نکل کر باہر آئی۔ حضور بیگم کی نظریں اس کی جانب اُٹھ گئیں۔ طلعت آرا سنبھل سنبھل کر قدم اٹھاتی ہوئی آگے بڑھی۔ فانوسوں میں جھلملاتی ہوئی کافوری شمعوں کی روشنی میں اس کا خوبصورت چہرہ ہیرے کی طرح جگر جگر کر رہا تھا۔ وہ کسی شہزادی کی طرح خوش ادا اور دل رُبا نظر آرہی تھی۔

حضور بیگم کے دل میں ہلچل برپا ہو گئی۔ طلعت آرا قریب اور قریب آتی گئی اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں اور چال میں ہلکی سی لڑکھڑاہٹ تھی۔ حضور بیگم کے دل کی دھڑکن تیز اور تیز ہوتی گئی لیکن وہ اُن کی جانب آتے آتے اچانک صحنچی کی سمت مُڑ گئی۔

مگر جب طلعت آرا نے صحنچی عبور کی تو مغلانی نے پریشان ہو کر حضور بیگم سے کہا۔"سرکار معلوم ہوتا ہے چھوٹی سرکار زینے کی جانب جارہی ہیں"۔

حضور بیگم نے پریشان ہو کر طلعت آرا کی طرف مُڑ کر دیکھا۔ مغلانی کا قیاس غلط نہیں تھا وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی زینے کی سمت بڑھ رہی تھی۔

مغلانی نے دل گرفتہ ہو کر حضور بیگم سے کہا۔ "سرکار ان کو روکیئے وہ پھر اوپر جا رہی ہیں"۔

"وہ جو کچھ کر رہی ہے اسے کرنے دو۔ اس وقت وہ اپنے ہوش میں کہاں ہے" حضور بیگم نے جان سوز لہجے میں اپنے ردِ عمل کا اظہار کیا۔ "روک ٹوک سے کہیں اور کوئی آفت نہ نازل ہو"۔

طلعت آرا لمحہ بھر کے لئے زینے کے سامنے ٹھٹکی اور پھر اندر داخل ہو گئی۔ حضور بیگم بت بنی زینے کے اونچے در کو تکتی رہیں۔ مغلانی اور بنّو بھی گم صم کھڑی تھیں ان کی نظریں بھی زینے کی طرف اُٹھی ہوئی تھیں۔

بارہ دری پر گہرا سنّاٹا چھایا تھا۔ ہوا کے سرد جھونکوں سے مولسری کے پتّے ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے۔ اندھیرے زینے میں قدموں کی آہٹ رُک رُک کر اُبھر رہی تھی۔ پھر یہ آہٹ مدّھم ہو گئی۔ چھت پر دروازہ بند ہونے کی چرچراہٹ سنائی دی۔ ہر طرف گہری خاموشی چھا گئی۔ خزاں کی اُداس رات اور اُداس ہو گئی۔

(۹)

پھاگن کا مہینہ ختم ہو رہا تھا۔ جاڑا رُخصت ہوا چاہتا تھا۔ گرمی کی آمد آمد تھی۔ شہر کے چوراہوں اور گلی کوچوں کے نکڑ پر بڑے بڑے لکّڑ جلا کر، ہولی کے الاؤ روشن کئے گئے تھے۔ ہلیارے بالٹیوں میں طرح طرح کے رنگ گھولتے۔ پچکاریوں میں بھرتے اور ایک دوسرے پر ڈالتے۔ ڈھولک کی تھاپ اور مجیروں کی تال پر لہک لہک کر ہولی کے گیت گاتے، رقص کرتے، دارو چڑھا کر غل غپاڑہ مچاتے۔

ہولی ہے بھئی ہولی ہے
آج ہماری ہولی ہے

ہولی کے روز سویرے ہی سویرے رنگ کی پچکاریاں چلنا شروع ہو جائیں گی۔ رنگ کھیلا جائے گا اور بے محابہ کھیلا جائے گا۔ دن ڈھلے رنگ کھیلنا بند

ہو جائے گا۔ شام کو کالی جی کے مندر کے سامنے کمپنی باغ میں ہولی کا میلہ لگے گا۔ یہ گویا موسم سرما کے خاتمے کا اعلان ہوگا۔

مگر میلہ لگنے میں ابھی کئی روز رہتے تھے۔ ہر طرف ہولی کا ہنگامہ برپا تھا۔ لیکن بارہ دری پر ویرانی چھائی رہتی۔ دن پر رات کا گمان ہوتا۔ دالانوں اور صحنچیوں کی محرابوں کے اردگرد ابابیلیں منڈلاتی رہتیں۔ مولسری کی شاخوں سے زرد زرد پتے ٹوٹ، ٹوٹ کر گرتے اور صحن میں دُور دُور تک بکھر جاتے۔ ہوا کا کوئی تیز جھونکا آتا۔ خشک پتے اُڑ اُڑ کر شور مچاتے۔ خاموشی کو درہم برہم کرتے۔

دن کا سفر ختم ہوتا۔ شام، فصیل نما اُونچی اُونچی دیواروں سے نیچے اُترتی فانوسوں اور دیوارگیریوں کو روشن کر دیا جاتا۔ کافوری شمعوں کی اُجلی اُجلی روشنی در و بام پر پھیل جاتی لیکن بارہ دری پر چھائی ہوئی ویرانی کم نہ ہوتی۔

ان دنوں ہر زبان پر جیسے مہر لگ گئی تھی۔ مامائیں اور خواصیں دبے دبے قدموں سے چلتیں۔ اشاروں میں ایک دوسرے سے بات چیت کرتیں۔ ہر چہرہ خوفزدہ اور سہما ہوا نظر آتا۔ رات پھیلتی اور بڑھتی تو ہر نگاہ بار بار طلعت آرا کے کمرے کی جانب اُٹھتی۔

پہر رات گزرتی طلعت آرا کے کمرے کا عقبی دروازہ آہستہ سے چرچراتا ہوا کھلتا۔ وہ باہر آتی اور اِدھر اُدھر دیکھے بغیر سنبھل سنبھل کر قدم اُٹھاتی ہوئی آگے بڑھتی۔ سنسان غلام گردش میں اس کے ریشمی لباس کی سرسراہٹ اُبھرتی۔ ہر سُو عطر حنا کی بھینی بھینی خوشبو پھیل جاتی۔ دیوارگیریوں اور دو شاخوں کی مدھم روشنی میں وہ سائے کی مانند نظر آتی۔ غلام گردش سے نکل کر صحنچی میں پہنچتی اور زینے کی جانب بڑھتی۔ اس کی نظریں جھکی ہوتیں۔ قدموں کی لڑکھڑاہٹ سے گھبراہٹ اور سراسیمگی عیاں ہوتی۔

زینے کی محراب کے درمیان لٹکتی ہوئی قندیل کے نیچے طلعت آرا کی پرچھائیں لہراتی اور آن کی آن میں چھلاوے کی مانند گم ہو جاتی۔ یہ قندیل حضور بیگم کی ہدایت

پہر سر شام ہی روشن کر دی جاتی تھی۔ اس کی روشنی زینے میں دور تک پھیلی رہتی ویسے زینے کے اندر روشنی کے لئے دو چھتّی کے دروازے کے قریب دیوار پر ایک دو شاخہ آویزاں تھا۔ مگر کوئی خادمہ یا لونڈی زینے میں داخل ہونے اور دو شاخے میں شمع روشن کرنے پر آمادہ نہ ہوتی۔

خوف اور دہشت کا یہ عالم تھا کہ کئی مامائیں ملازمت چھوڑ کر بارہ دری سے جا چکی تھیں۔ ان میں نجیبن بھی شامل تھی جو مہریوں اور خادماؤں میں سب سے زیادہ نڈر اور دبنگ سمجھی جاتی تھی۔ زینے کی محراب میں لٹکی ہوئی قندیل بھی صرف ہر مزی روشن کرتی تھی۔ دوسری مامائیں اور لونڈیاں تو دن میں بھی زینے کے قریب جاتے ہوئے ڈرتی تھیں۔

طلعت آرا کے زینے میں داخل ہوتے ہی حضور بیگم کے چہرے پر دکھ کے سائے پھیل جاتے۔ آنکھیں دھواں دھواں ہو جاتیں۔ دل سے بار بار ہوک اٹھتی۔ ایسی بے قرار اور دل گرفتہ ہو جاتیں کہ تمام رات بستر پر کروٹیں بدلتے کٹتی۔ لاکھ کوشش کرتیں لیکن نیند نہ آتی۔ ان کے کان زینے میں ابھرنے والی قدموں کی آہٹ پر لگے ہوتے رات قطرہ قطرہ بن کر سناٹے میں تحلیل ہوتی رہتی۔ ڈھلتی جاتی ختم ہو جاتی۔

آخر آمد سحر کے ساتھ زینے کی آسیب زدہ خاموشی میں چاپ ابھرتی قریب اور قریب آتی جاتی۔ حضور بیگم بستر پر اٹھ کر بیٹھ جاتیں۔ گردن کو خم دیکر غلام گردش میں کھلنے والے دریچے سے باہر دیکھتیں۔ نگاہیں زینے کی سمت اٹھی ہوتیں۔ زینے کی بلند محراب کے نیچے قندیل کی زرد زرد روشنی میں ایک دھندلا دھندلا سا یہ لہراتا۔ حضور بیگم تڑپ کر ٹھنڈی سانس بھرتیں۔ طلعت آرا زینے سے نکل کر صحنچی میں داخل ہوتی۔ اس کے قدموں کی آہٹ صبح کاذب کے گہرے سنّاٹے میں رُک رُک کر ابھرتی۔ حضور بیگم دم بخود بیٹھی اس کی آہٹ کو سنتی رہتیں اور جب قدموں کی آہٹ سنّاٹے میں تحلیل ہو کر گم ہو جاتی تو وہ نڈھال ہو کر بستر پر دراز ہو جاتیں۔

ہر صبح طلوع آفتاب سے پہلے یہی ہوتا۔ اسی عالم میں لگ بھگ ایک مہینہ

گزر گیا۔

(۱۰)

پہر دن چڑھے، جب رات بھر کی جاگی ہوئی حضور بیگم گہری نیند سو گئیں تو رمضانو خاموشی سے مغلانی کی کوٹھری میں داخل ہوئی۔ مغلانی اس وقت تنہا تھیں اور سر جھکائے حضور بیگم کا شلوکا سینے میں مصروف تھیں۔

نجّو کچھ ہی دیر پہلے اُٹھ کر باہر گئی تھی اور اب ہرمزی کی کوٹھری میں بیٹھی باتیں کر رہی تھی۔ اپنی کوٹھری سے نکل کر وہ پہلے طلعت آرا کے پاس گئی تھی۔ طلعت آرا کمرے میں موجود تھی لیکن دروازہ اندر سے بند تھا۔ اس نے ہولے ہولے دروازہ تھپ تھپایا۔ ایک بار نہیں کئی بار ٹھہر ٹھہر کر تھپ تھپایا۔ جب دروازہ نہ کھلا اور آواز دینے پر بھی اندر سے کوئی جواب نہ ملا تو وہ جھنجلائی ہوئی ہرمزی کی کوٹھری میں چلی گئی۔ مغلانی نے اُسے ہرمزی کے پاس جاتے ہوئے دیکھا بھی تھا۔ پہلے بھی کئی مرتبہ ایسا ہی ہوا تھا۔ ویسے بھی فرصت کے اوقات میں وہ اکثر ہرمزی کے پاس جاتی اور دیر تک بیٹھی رہتی۔ حالانکہ دونوں کی عمروں میں بہت بڑا فرق تھا لیکن اب دیکھنے میں یہ آیا کہ ہرمزی کے پاس نجّو کا خوب دل لگتا تھا جب سے طلعت آرا نے نجّو کی جانب سے بے رُخی اور بے التفاتی کا رویّہ اختیار کیا تھا وہ اکتائی اکتائی سی پھرتی تھی۔ کہیں تو گھڑی دو گھڑی بیٹھ کر دل بہلاتی۔ ہرمزی نے شفقت اور محبت کا مظاہرہ کیا تو وہ اس سے مانوس ہو گئی۔ ہرمزی اس کے سر میں تیل ڈالتی، کنگھی کرتی، بال سنوارتی، چوٹی باندھتی طرح طرح کے پر لطف واقعات سناتی۔ مزے مزے کی باتیں کر کے ہنستی ہنساتی۔ نجّو بھی چاہتی تھی۔

مغلانی نے قدموں کی آہٹ سُن کر گردن اٹھائی۔ رمضانو کی جانب دیکھا رمضانو نے مغلانی کو سلام کیا۔ اس کا چہرہ اُترا ہوا تھا۔ آنکھوں سے بھی پریشانی جھلک رہی تھی۔ وہ نڈھال اور تھکی تھکی نظر آ رہی تھی۔

"آؤ بیٹھو رمضانو"! مغلانی نے پلنگڑی کی جانب ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ آج کل کہاں رہتی ہو۔ بہت کم نظر آتی ہو"؟

"مجیدن کی بیماری میں ایسی پھنسی رہی کہ اپنا بھی ہوش نہ رہا"۔ رمضانو تھکی ہوئی سی پلنگڑی پر بیٹھ گئی"۔ نہ پوچھو! کہاں کہاں پھرتی رہی۔ کبھی اس کے پاس کبھی اس کے پاس۔ جس نے جو بتایا وہ کیا۔ جہاں کہا وہاں پہنچی"۔

"خیریت تو ہے، بہت پریشان نظر آرہی ہو"۔ مغلانی نے ہمدردی سے پوچھا"۔ تمہاری بہن مجیدن کی طبیعت اب کیسی ہے"؟

"پہلے سے تو اب اچھی ہے"۔ رمضانو نے بتایا"۔ منہ پر ذرا رونق بھی آگئی ہے"۔

"ابھی تک مولوی انوار کے باغ ہی میں ٹھہری ہوئی ہے"؟

"اسے اپنے گھر جانے کی اجازت مل گئی ہے۔ کل رات سیتاپور چلی گئی"۔ رمضانو نے مغلانی کو مطلع کیا"۔ لیکن ہر نوچندی جمعرات کو مزار پر حاضری دینے آتی رہے گی"۔

"یہ تو بہت اچھا ہوا۔ بیچاری نے بڑے دکھ جھیلے"۔ مغلانی نے نرم لہجے میں کہا۔ قدرے توقّف کیا، پھر مسکرا کر پوچھا" اس موئے سرکٹے کا کیا حشر ہوا جو مجیدن کے سر پر آتا تھا"؟

"وہ تو میاں کی قید میں ہے"۔

"قید میں ہے"! مغلانی نے حیرت کا اظہار کیا"۔ مجیدن نے بتایا ہوگا"۔

"مجیدن کو تو اس کے بارے میں کچھ خبر نہیں"۔ رمضانو نے وضاحت کی"۔ لیکن میرا بہنوئی سلیم یہی بتاتا تھا۔ بے چارہ بیوی کی طرف سے بہت فکرمند رہتا تھا۔ اتنا سا منہ نکل آیا تھا۔ اب تو وہ بھی خاصا مطمئن نظر آتا ہے"۔

"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ مجیدن کو مولوی انوار کے مزار سے بہت فائدہ ہوا"۔ مغلانی نے اپنے ردّعمل کا اظہار کیا۔

"اے ایسا ویسا فائدہ ہوا۔ یوں سمجھو مرتے مرتے بچی ہے۔ جس وقت مزار پر آئی تھی تو ایسی کمزور اور مریل ہو رہی تھی کہ ناک پکڑو تو دم نکلے کسی کے

سہارے کے بغیر دو قدم نہ چل سکتی تھی۔ بے چارہ سلیم اُسے اپنی پیٹھ پر لاد کر لئے لئے پھرتا۔ اب تو ماشاء اللہ اپنے پیروں سے چل کر گئی ہے۔" رمضانو کا لہجہ اچانک تشویش ناک ہو گیا۔ "میں تو پچھلے دنوں زیادہ تر غائب ہی رہی۔ بڑی سرکار خفا ہوتی ہوں گی۔"

"وہ خود اپنی پریشانی میں مبتلا ہیں۔ انہیں تو اپنا ہوش نہیں۔" مغلانی نے بتایا۔ "کبھی تمہارے بارے میں پوچھا بھی تو میں نے سمجھا دیا کہ بہن کی بیماری میں الجھی ہوئی ہے۔ بات آئی گئی ہو گئی۔"

رمضانو کے چہرے پر چھایا ہوا پریشانی کا غبار چھٹنے لگا۔ اس نے مڑ کر دروازے کی جانب چوکنّا نظروں سے دیکھا جب کسی کو آس پاس نہ پایا تو رازدارانہ لہجے میں آہستہ سے بولی۔ "بات سے بات نکلتی رہی تم سے جو بات کہنے آئی تھی وہ رہ گئی۔" وہ آگے جھک کر مغلانی سے اور قریب ہو گئی۔ "اس وقت تو میں چھوٹی سرکار کے بارے میں ایک ضروری بات کرنے آئی تھی۔"

"تم یہ کہنا تو نہیں چاہتی ہو کہ چھوٹی سرکار کو بھی مولوی انوار کے مزار پر لے جایا جائے؟" مغلانی نے رمضانو کو مشتبہ نظروں سے گھور کر دیکھا۔ ساتھ ہی تنبیہہ بھی کی۔ "خبردار! بڑی سرکار کے سامنے بھولے سے بھی ایسی بات زبان پر نہ لانا۔ میں نے تو ایک بار دبی زبان سے بات نکالی ہی تھی کہ وہ ایک دم بھڑک اُٹھیں وہ چھوٹی سرکار کو ہرگز وہاں جانے نہ دیں گی۔"

"لیکن مغلانی جی یہ تو سوچو یہ سلسلہ کب تک چلتا رہے گا۔" رمضانو نے تشویش کا اظہار کیا۔ "وہ اگر چھوٹی سرکار کو اوپر جانے سے روک نہیں سکتیں تو یہ تو پوچھ سکتی ہیں کہ رات بھر کہاں رہتی ہیں؟ کس کے پاس جاتی ہیں؟ کیوں جاتی ہیں؟"

"وہ ان سے کچھ نہیں پوچھیں گی۔ میرے کہنے پر بھی نہیں پوچھیں گی۔" مغلانی نے اپنی مجبوری بیان کی۔ "وہ تو یہ کہتی ہیں کہ چھوٹی سرکار جو کچھ کر رہی ہیں کرنے دو۔ پوچھ گچھ اور روک ٹوک سے نہ جانے کیا نئی مصیبت نازل ہو۔ وہ اپنے ہوش ہی میں

کہاں ہیں؟" انہوں نے ٹھنڈی سانس بھری۔" غور کرو تو بڑی سرکار درست ہی فرماتی ہیں چھوٹی سرکار نہ بولتی ہیں نہ بات کرتی ہیں۔ ہر وقت بُت بنی خاموش بیٹھی رہتی ہیں۔ جب اوپر جاتی ہیں تو کیسی کھوئی کھوئی اور مبہوت نظر آتی ہیں۔"

"یہ تو تم ٹھیک ہی کہہ رہی ہو۔ وہ پہلی سی چھوٹی سرکار ہی نہیں رہیں جو ہر دم ہنستی بولتی رہتی تھیں۔ اب تو ان کو ایسی چپ لگی ہے کہ بالکل پتھر ہو کر رہ گئی ہیں۔" رمضانو نے مغلانی کی تائید کرتے ہوئے کہا۔" دوسری طرف بڑی سرکار ہیں کہ ان کے غم میں گھل کر آدھی رہ گئی ہیں۔ وہ کیا سب ہی پریشان ہیں۔ ایسا خوف چھایا رہتا ہے کہ رات کو نیند بھی نہیں آتی۔" اس نے نظر بھر کر مغلانی کے چہرے کو دیکھا۔" آئے دن ایسی ایسی باتیں سننے میں آرہی ہیں کہ میں تم سے کیا بتاؤں دُکھ بھی ہوتا ہے خون بھی کھولتا ہے۔"

"مجھے کیا خبر، کیا کیا باتیں ہوتی رہتی ہیں۔" مغلانی نے بے رُخی سے اپنے ردّعمل کا اظہار کیا۔" میں تو ہر وقت اپنے ہی بکھیڑوں میں الجھی رہتی ہوں اور اگر کچھ معلوم بھی ہو جائے تو کر بھی کیا سکتی ہوں۔" ان کا لہجہ قدرے تلخ ہو گیا "یہ تو بڑی سرکار کو سوچنا چاہیئے۔ ان کا حال یہ ہے کہ پوچھ گچھ کرنا تو درکنار چھوٹی سرکار سے بات کرتے ہوئے ڈرتی ہیں۔ ایسی خوف زدہ ہیں کہ اب تو ان کے کمرے میں بھی نہیں جاتیں۔"

رمضانو ان کی بات نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔" آج ہی صبح کا ذکر ہے میں پھاٹک سے نکل کر چند ہی قدم گئی تھی کہ گلی کے نکڑ پر باقر نواب کی ڈیوڑھی کی ماما نجن مل گئی۔ کم بخت نے ایسی بات کہی کہ کلیجہ جل کر کباب ہو گیا۔"

"کیا کہتی تھی وہ؟" مغلانی نے بے چین ہو کر پوچھا۔

"ہاتھ نچا کر بولی۔ اے سنا ہے تمہاری چھوٹی سرکار کے پاس کوئی جن یا پری زاد آتا ہے اور ہر رات ان کو اپنے ساتھ پرستان کی سیر کرانے لے جاتا ہے وہ تو کچھ اور بھی کہنا چاہتی تھی لیکن میں نے اس بری طرح آڑے ہاتھوں لیا کہ

کھسیانی ہو کر رہ گئی۔"

"تو گویا بات گھر کی چار دیواری سے نکل کر باہر پہنچ چکی ہے۔" مغلانی کے بُشرے سے پریشانی ہویدا تھی۔

"ایسی باتیں کہیں چھپی رہتی ہیں۔ میری تو بڑی سرکار سے بات کرنے کی ہمت نہیں پڑتی اور بھی کوئی ایسا نظر نہیں آتا۔" رمضانو نے اپنی بات پر زور دے کر کہا۔ "مغلانی جی ایک تم ہی ہو۔ جو بڑی سرکار کو سمجھا بُجھا سکتی ہو اسی لئے تو تمہارے پاس آئی ہوں۔"

"مگر میں ان سے کہوں تو کیا کہوں۔" مغلانی نے بُجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "سچ پوچھو تو بڑی سرکار بھی کیا کر سکتی ہیں۔"

"بڑی سرکار کم سے کم یہ تو کر سکتی ہیں کہ کسی عامل وامل کو بلوائیں۔ اسے ساری بات بتائیں تاکہ یہ معلوم ہو کہ یہ بھید کیا ہے۔ پھر اس کا کچھ توڑ کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس طرح ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھے رہنے سے تو کام نہیں چلے گا۔"

"تم کسی عامل کو جانتی ہو؟" مغلانی نے استفسار کیا۔ "مجیدن کے آسیب کے سلسلہ میں تم تو عاملوں کے پاس جاتی رہی ہو گی۔"

"نہ پوچھو کس کس کے پاس جاتی رہی ہوں۔" رمضانو نے بتایا۔ "قلزم شاہ کے آستانے پر تو کتنی ہی بار گئی۔ ان کا تعویذ تو مجیدن کے گلے میں اب تک پڑا ہے۔ بڑے پہنچے ہوئے بزرگ ہیں۔ تم نے بھی اُن کا نام سُنا ہوگا۔"

"نام تو کچھ سُنا ہوا لگتا ہے۔ مگر میں اُن کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں جانتی۔ ویسے تو اور بھی مشہور عامل ہیں۔ بعض تو ایسے ہیں۔ جن سے بہت اچھی طرح واقف ہوں۔" مغلانی بھی رفتہ رفتہ کھلنے لگیں۔ "ایسی ایسی ہستیاں موجود ہیں کہ کیسا بھی آسیب ہو ان کے قابو میں آجاتا ہے۔"

"مرد تو مرد ایسی بیبیاں ہیں کہ کیسا ہی آسیب ہو۔ اُن کے سامنے ہاتھ باندھے ہوئے حاضر ہو جاتا ہے۔" رمضانو نے بتایا۔ "ایک تو رضیہ بیگم ہی ہیں بڑی نیک اور

عبادت گزار بی بی ہیں۔ ہر وقت حجرے میں بیٹھی رہتی ہیں۔ شادی تک نہیں کی۔ دن میں تو حجرے سے باہر نہیں نکلتیں۔ سورج غروب ہونے کے بعد نکلتی ہیں۔"

"تم ان بیدانی کا تو ذکر نہیں کر رہی ہو جو اچھوتی گلی میں رہتی ہیں؟" مغلانی نے دریافت کیا۔ "کبھی اُن کے پاس نہیں گئی۔ نہ ان کے بارے میں کچھ جانتی ہوں البتہ ان کا ذکر اکثر سنا ہے۔"

"ہاں ہاں انھی کی بات کر رہی تھی۔" رمضانو نے بتایا۔ "ایک بار تو میں اُن کے پاس جا بھی چکی ہوں۔ سفید برّاق لباس، سر بھی بالکل سفید۔ ایسا نورانی چہرہ جیسے شکر کی مورت۔ دیکھو تو دیکھتے رہ جاؤ۔ سنا ہے اُن کی والدہ کے پاس آدھی رات کے بعد جنّوں کی بچیاں پڑھنے کے لئے آتی تھیں۔"

"وہ آسیب اتارنے کے لئے کرتی کیا ہیں؟ کوئی عمل پڑھتی ہیں یا نقش لکھ کر دیتی ہیں؟"

"نہ عمل پڑھتی ہیں نہ نقش یا تعویذ لکھ کر دیتی ہیں۔ صرف دعا کرتی ہیں۔ اللہ میاں نے اُن کی زبان میں ایسی تاثیر دی ہے کہ جو ان کے پاس جاتا ہے مشکل اس کی آسان ہوتی ہے۔ البتہ اگر کسی پر جن کا سایہ ہو تو اُس کو شیشی میں تیل دیتی ہیں۔ اُن کے حجرے میں علم رکھے ہیں۔ اُن ہی کے نیچے ایک چراغ ہر وقت جلتا رہتا ہے۔ خوب بڑا سا مٹی کا چراغ جس میں تیل بھرا رہتا ہے۔ اسی چراغ سے اُن کے حکم پر خادمہ تیل نکال کر دیتی ہے۔ جنّوں کی مسجد جا کر سات روز تک آدھی رات کو چراغ جلانا پڑتا ہے۔"

رمضانو بتاتی رہی اور مغلانی توجہ سے اس کی باتیں سنتی رہیں۔ رمضانو نے زور دے کر کہا۔ "بڑی بڑی بیگمات اُن کی خدمت میں حاضری دیتی ہیں بڑی سرکار بھی چھوٹی سرکار کو لے کر وہاں چلی جائیں۔ تم بھی چلی جانا۔"

"میں تو چلی جاؤں گی۔ مگر بڑی سرکار کا وہاں جانا مشکل ہے۔"

"کہہ کے تو دیکھو، شاید مان جائیں۔" رمضانو نے کہا۔ "وہاں نہ جائیں تو کسی عامل

ہی کو بلوالیں۔ کچھ تو کریں۔ سچ بات تو یہ ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے۔ مجھ سے دیکھا نہیں جاتا۔ اس ڈیوڑھی کی پرانی نمک خوار ہوں۔ یہیں پلی بڑھی ہوں۔ میرا تو رہ، رہ کے دل تڑپتا ہے۔"

رمضانو دیر تک باتیں کرتی رہی۔ مغلانی کو سمجھاتی بجھاتی رہی۔ اس کی باتیں سن کر مغلانی متاثر بھی ہوئیں۔ مگر طلعت آرا کے بارے میں حضور بیگم سے بات کرنے سے کترا رہی تھیں۔ وہ حضور بیگم سے نہ صرف ضرورت سے زیادہ مرعوب تھیں بلکہ ڈرتی بھی تھیں لیکن رمضانو نے زور دیا۔ اصرار کیا تو وہ آمادہ ہوگئیں۔

☆

دن ڈھلے حضور بیگم بیدار ہوئیں۔ اب وہ اسی وقت سو کر اُٹھتی تھیں مغلانی نے اس عرصے میں شلوکا سی کر تیار کر لیا تھا۔ وہ اُسے دکھانے کے لئے حضور بیگم کے پاس پہنچیں۔ مگر شلوکے کے سوا اور کوئی بات کرنے کی نوبت نہ آئی دسترخوان بچھ چکا تھا۔ حضور بیگم کھانا کھانے جا رہی تھیں۔ وہ اپنے ہمراہ مغلانی کو بھی لے گئیں۔ نشست گاہ میں پہنچیں۔ کھانا چُنا جا چکا تھا۔ حضور بیگم نے مغلانی کو بھی اپنے ساتھ کھانے میں شریک کر لیا۔ ویسے بھی مغلانی عام طور پر ان کے ساتھ ہی کھانا کھاتی تھیں۔ لیکن خادماؤں کی موجودگی میں وہ حضور بیگم سے جو بات کرنا چاہتی تھیں، کر نہ سکیں۔

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد حضور بیگم کا یہ دستور تھا کہ رات گئے تک مسند ہی پر بیٹھی رہتی تھیں مگر اب جلد ہی اکتا جاتیں۔ اُٹھ کر خواب گاہ میں چلی جاتیں اور بستر پر لیٹ جاتیں۔

اس روز بھی انہوں نے ایسا ہی کیا۔ گھنٹہ بھر بھی نہ گزرا تھا کہ اُٹھ کر کھڑی ہوگئیں۔ شہ نشیں سے نیچے اتریں آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اپنے کمرے میں پہنچ گئیں۔ مغلانی سائے کی طرح ان کے ساتھ لگی ہوئی تھیں وہ بھی کمرے میں

چلی گئیں۔

کمرے میں کوئی اور موجود نہ تھا۔ مغلانی نے تخلیہ سے فائدہ اٹھایا۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد طلعت آرا کا ذکر چھیڑا۔ اپنی تشویش کا بھی اظہار کیا لیکن اس بار بھی حضور بیگم نے خاموشی اختیار کرنے پر زور دیا حالانکہ وہ بہت غم زدہ اور افسردہ نظر آرہی تھیں۔ آنکھوں سے پریشانی عیاں تھی۔ چہرے پر دکھ کے سائے پھیلے تھے۔

مگر مغلانی نے ہمت نہ ہاری۔ بدنامی اور جگ ہنسائی سے ڈرایا۔ دبی زبان سے کہا۔ سرکار بُرا نہ مانیں تو یہ عرض کرنے کی جسارت کروں کہ لاکھ احتیاط اور تنبیہہ کے باوجود بات زیادہ عرصے تک چھپی نہیں رہ سکتی"۔ انہوں نے رمضانو کا حوالہ دیتے ہوئے گریز کیا"۔ بلکہ سنتے ہیں تو یہاں تک آیا ہے کہ بات گھر کی چاردیواری سے نکل کر باہر پہنچ چکی ہے"۔ اپنی بات کی تائید میں انہوں نے یہ جواز بھی پیش کیا"۔ وہ لونڈیاں اور مامائیں جو پچھلے دنوں ملازمت چھوڑ کر گئی ہیں ان پر اب کوئی زور اور دباؤ تو رہا نہیں۔ نہ جانے کیا کیا کہتی ہوں گی"۔

حضور بیگم نے چونک کر مغلانی کو دیکھا۔ سخت پریشانی میں مبتلا ہوگئیں۔ اپنی مجبوری بیان کرنے لگیں"۔ بی مغلانی! تم درست کہہ رہی ہو۔ مگر یہ تو بتاؤ میں کر ہی کیا سکتی ہوں۔ گھر کی بیٹھنے والی ہوں۔ سر پر کسی مرد کا سایہ بھی نہیں۔ ہر طرف نظر اٹھا کر دیکھتی ہوں۔ کوئی ایسا بھی نہیں جس کو دل کھول کر دکھاؤں۔ اپنا دکھ درد بتاؤں جو اس آڑے وقت میں کام آسکے"۔

"خورشید جہاں بیگم سے بات کر کے دیکھئے۔ وہ نہ صرف آپ کی بھانجی ہیں بلکہ آپ سے ٹوٹ کر محبت بھی کرتی ہیں۔ مجھے تو وہ آپ کی ہمدرد اور غمگسار نظر آتی ہیں"۔ مغلانی نے مشورہ دیا۔"اُن کے میاں سے تو مدد مل سکتی ہے"۔

"اُن سے تو میں ڈرتی ہوں۔ ورنہ خورشید جہاں کو بلا کر ضرور مشورہ کرتی"۔ حضور بیگم نے اپنے ردِّ عمل کا کھل کر اظہار کیا"۔ کئی بار اس کا خیال آیا۔ مگر ہر بار یہ سوچ

کر خاموش ہو گئی کہ وہ اپنے میاں سے ضرور تذکرہ کرے گی۔ چھوٹے بھائی کے سالے تہوّر علی خان سے اُن کی گاڑھی چھنتی ہے۔ لاابالی اور پیٹ کے ہلکے بھی ہیں۔ تب ہی تو نواب صاحب نے مقدمہ کے سلسلہ میں کبھی ان سے کوئی مدد نہ لی۔ شروع شروع میں ان پر اعتبار کیا۔ مشورہ بھی کیا۔ آج بات زبان پر آ گئی ہے تو تم کو بتا رہی ہوں۔ انھوں نے ایک ایک بات جاکر چھوٹے بھائی کو پہنچا دی۔"

مغلانی خاموش بیٹھی رہیں۔ حضور بیگم کی باتیں پوری توجہ سے سُنتی رہیں۔ انہوں نے کانوں کو ہاتھ لگا کر انکار میں گردن ہلائی "نا بابا! خورشید جہاں سے تو طلعت آرا کے متعلق ہرگز بات نہیں کروں گی۔ ان کے میاں کے ذریعے چھوٹے بھائی کے کانوں میں بھنک بھی پڑ گئی تو فوراً ہی بیوی سے بتائیں گے۔ اور چھوٹی بھابی کو تو تم جانتی ہی ہو۔ وہ تو ایسے موقع کی تاک ہی میں رہتی ہیں۔ بات کا ایسا بتنگڑ بنائیں گی کہ زندگی اجیرن ہو جائے گی۔ ان کو نہ تو بدنامی کا ڈر ہے اور نہ ہی جگ ہنسائی کا خوف۔"

"مگر سرکار! یہ تو غور فرمائیں یہ سلسلہ کب تک چلتا رہے گا۔" مغلانی کا ایک بار مُنہ کھلا تو وہ اور زیادہ بے باک ہوتی گئیں۔ کہنے لگیں۔ "چھوٹی سرکار یوں کب تک ہر رات اُدھر جاتی رہیں گی۔ اس کا کوئی نہ کوئی تدارک تو آپ کو کرنا ہی پڑے گا۔"

"تم ہی بتاؤ میں کیا کروں۔" حضور بیگم نے تڑپ کر اپنی بے بسی کا اظہار کیا۔ "تم کو کیا خبر میں تو ہر دم طلعت آرا ہی کے بارے میں سوچتی رہتی ہوں۔ مگر کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ میری تو عقل کام نہیں کرتی۔"

"کسی عامل کو بلا کر مشورہ کیجئے۔"

"ڈرتی ہوں نا معلوم کیا اُلٹی سیدھی ہو جائے۔" حضور بیگم نے گھبرا کر کہا "میرا دل نہیں ٹھکتا۔"

"سرکار! اس طرح ڈرنے اور گھبرانے سے تو کام نہیں چلے گا۔" مغلانی نے

اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کی کوشش کی۔" آخر دنیا میں اور بھی تو لوگ ہیں۔ جو ایسی مصیبت میں مبتلا ہوتے ہیں تو کسی عامل ہی سے رجوع کرتے ہیں۔ وہ خود اپنے دشمن تو نہیں ہوتے۔ کچھ بہتری کی صورت نظر آتی ہو گی تب ہی تو ایسا کرتے ہیں۔"

حضور بیگم پر مغلانی کی باتوں کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ کچھ ہمت بھی بندھی۔ آہستہ سے بولیں۔ "میں تو کسی عامل وامل کو جانتی نہیں۔ تم کسی عامل کو جانتی ہو تو بتاؤ۔"

"میر مشرف حسین کا نام تو آپ نے بھی سنا ہو گا۔ خاندانی منجم اور عامل ہیں۔ اُن کے دادا امیر مہدی حسین تو اپنے زمانے کے مانے ہوئے عامل تھے۔ شاہی دربار میں بھی رسائی حاصل تھی۔ ایران کی ایک شہزادی کا علاج کرنے کے لئے اصفہان تک گئے۔ علم جفر اور نجوم میں ان کا جواب نہ تھا۔ اُن کے تو ایسے ایسے حیرت انگیز کارنامے مشہور ہیں۔"

مغلانی اپنی دُھن میں بولتی رہیں۔ بہک کر کسی اور طرف نکل گئیں۔ حضور بیگم نے اکتا کر اُن کو ٹوکا۔ "تم تو اُن کے پوتے میر مشرف کا ذکر کر رہی تھیں۔"

"سرکار نے بالکل درست فرمایا۔" مغلانی کھسیانی ہو کر بولیں۔ "عرصہ دراز ہوا میر مشرف کے پاس ایک بار جانا ہوا تھا۔ ننّھو کی ماں اس وقت زندہ تھی۔ کوئی زبردست آسیب تھا۔ اس پر ایسی دیوانگی طاری ہوتی تھی کہ کپڑے پھاڑ کر گھر سے باہر نکل جاتی تھی۔ میں اُسے میر مشرف کے پاس لے گئی۔ انہوں نے زعفران سے ایک نقش لکھا۔ میرے سامنے ہی آگ پر رکھا۔ بیچ میں چلمن پڑی تھی مگر سب کچھ صاف نظر آتا تھا۔ نقش میں جیسے ہی شعلہ بھڑکا ننّھو کی ماں نے چیخ ماری۔ ہائے میرے بدن میں آگ لگی۔ چیخ کے ساتھ ہی وہ بے ہوش ہو گئی۔ ہوش آیا تو آسیب ایسا اُترا کہ پھر کبھی اس کا اثر نہ ہوا۔"

حضور بیگم ایسی متاثر ہوئیں کہ بے ساختہ زبان سے نکلا۔ "اے سبحان اللہ واقعی بڑے پائے کے عامل ہیں۔ اُن کو بلوانا چاہیئے۔"

"مگر سرکار! وہ آج کل یہاں ہیں نہیں۔ سُنا ہے کربلائے معلّیٰ کی زیارت کو

گئے ہیں۔" مغلانی نے بتایا۔" ویسے مرزا جواد بیگ کا بھی بڑا شہرہ ہے مگران کے بارے میں مشہور ہے کہ کہیں آتے جاتے نہیں۔ بڑی مشکل سے گھر سے باہر نکلتے ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ اُن کو یہاں کون لے کر آئے؟"

" ایسے ہی موقع پر داروغہ میر نصیر کی یاد آتی ہے۔" حضور بیگم نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔" وہ ہوتا تو مرزا جواد کو کسی نہ کسی طور ضرور بلا لاتا۔ اپنا کام نکالنے میں تو وہ ایسا ماہر ہے کہ آدمی کو شیشے میں اتار لیتا ہے۔"

مغلانی کو داروغہ نصیر کا ذکر سخت ناگوار گزرا۔" سرکار تو پھر داروغہ نصیر کو دوبارہ ملازم کیوں نہیں رکھ لیتیں۔" ان کے لہجے میں طنز کی تلخی رچی ہوئی تھی۔" وہ تو آج کل اسی لئے چکر کاٹ رہے ہیں۔ پرسوں تو اُن کی بیوی بھی آئی تھیں۔"

" آئندہ نہ وہ آئے گی اور نہ ہی میر نصیر!" حضور بیگم نے وضاحت کی۔" وہ تو یہ بتانے آئی تھی کہ میر نصیر کو کسی اور سرکار میں ملازمت مل گئی ہے۔"

" آخر داروغہ غلام صفدر کس مرض کی دوا ہیں؟" مغلانی نے مشورہ دیا۔" آپ کی اتنی بڑی زمین داری کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ اتنا سا کام بھی نہیں کر سکتے۔"

" وہ میر نصیر کی طرح ہوشیار نہیں ہیں، ایماندار ہیں۔ مگر وہ نہ ایسا کام کر سکتے ہیں اور نہ ہی میں ان سے یہ کام لینا چاہتی ہوں۔"

" مرزا جواد بیگ کو بلا کر نہیں لا سکتے تو کسی اور ہی اچھے عامل کو بلا لائیں۔" مغلانی نے تجویز پیش کی۔" شہر میں اچھے عاملوں کی کوئی کمی ہے۔"

" داروغہ غلام صفدر تو اللہ میاں کی گائے ہیں۔ نامعلوم کس کو پکڑ کر لے آئیں کوئی نئی مصیبت کھڑی ہو جائے۔" حضور بیگم نے صاف انکار کر دیا۔" میں کہتی ہوں تم خود کیوں نہیں چلی جاتیں۔"

" سرکار! میرے جانے سے نہیں آئیں گے۔ پہلے کبھی اُن کے پاس گئی بھی نہیں اور نہ ہی میری کوئی ایسی واقف کار ہیں جن کا اُن کے گھر آنا جانا ہو۔"

حضور بیگم نے مزید اصرار نہ کیا۔ خاموش رہیں۔ مغلانی نے بھی کچھ نہ کہا انہوں

نے پاندان سرکا کر قریب کیا۔ اس کا ڈھکنا اُٹھایا۔ ایک پان لگایا اور خاصدان میں رکھ کر حضور بیگم کو گلوری پیش کی۔ اُنہوں نے گلوری اُٹھا کر دانتوں میں دبالی۔ وہ بدستور خاموش تھیں اور کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی نظر آتی تھیں۔

"سرکار! کس سوچ میں پڑ گئیں؟" مغلانی نے بات نکالی۔

"طلعت آرا ہی کے بارے میں سوچ رہی تھی"۔ حضور بیگم نے گہری سانس بھری۔ "مجھے تو ہر دم اسی کی فکر دامن گیر رہتی ہے۔ مولا مشکل کشا معلوم کب یہ مشکل آسان کریں گے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں"۔

"سرکار! ایک اور ہستی ایسی ہے جن سے رجوع کیا جائے تو مشکل آسان ہونے کی تدبیر پیدا ہو سکتی ہے"۔

"کوئی پائے کے عامل ہیں؟"

مغلانی نے رمضانو کا حوالہ دیئے بغیر دبی زبان سے بتایا۔ "سرکار! آپ نے رضیہ بیگم کا نام تو سنا ہو گا۔ اچھوتی گلی میں رہتی ہیں۔ ان کے پاس تو بڑی بڑی بیگمات اور رئیس زادیاں جاتی ہیں اور فیض حاصل کرتی ہیں"۔

"اے ان سے کون واقف نہیں سُنا ہے کھری سیدانی ہیں۔ نہایت عبادت گزار اور پرہیز گار۔ بڑی عالی نسب ان کے خاندان کی ایک بی بی تو اچھوتی بھی تھیں۔ انھی کے نام پر تو اس محلے کا نام اچھوتی گلی پڑ گیا"۔

"سرکار! اچھوتیوں کا ذکر تو اکثر سُنا ہے مگر یہ ہوتی کون تھیں"؟ مغلانی نے بات آگے بڑھانے کے لئے کرید کر دریافت کیا۔ حالانکہ وہ ان کے بارے میں قطعی لاعلم نہیں تھیں۔

"میں نے تو اپنی آتو اور دوسری بڑی بوڑھیوں سے ان کے بارے میں جو کچھ سُنا ہے، وہ کچھ اس طرح ہے کہ بادشاہ غازی الدین حیدر کی خاص محل، بادشاہ بیگم، نے ایک رات خواب دیکھا جس میں امام مہدی آخرالزماں کی چھٹی کرنے کی بشارت دی گئی تھی۔ انہوں نے فوراً اس کا بندوبست کیا۔ چھٹی اس

طور ہوتی تھی کہ پہلے باقاعدہ بچے کی پیدائش کا اعلان کیا جاتا، پھر زچہ کا نہان ہوتا۔ اس روز وہ عمدہ پوشاک پہنتی۔ اس موقع پر نیک اور پرہیزگار بیبیوں کو بلا کر بہت دھوم دھام سے ضیافت کی جاتی۔" حضور بیگم سنبھل سنبھل کر بولتی رہیں اور مغلانی توجّہ سے ان کی باتیں سنتی رہیں۔" یہ رسم ہر سال شب برات کے مہینے میں ہوتی تھی۔ بعد میں سوائے پہلے امام کے دوسرے تمام اماموں کے لئے بھی ایسا ہی کیا جانے لگا۔ شرفا اور عالی نسب کی خوبصورت اور کنواری لڑکیوں کو تلاش کر کے محل میں لایا جاتا۔ ان کو ہر امام سے منسوب کیا جاتا۔ ان کا نام بھی وہی رکھا جاتا جو آئمہ کی ازواج کا تھا۔ انہیں اچھوتی کہا جاتا تھا۔ ہر اچھوتی کی خدمت کے لئے تین خادمائیں مقرّر کی جاتی تھیں۔ انہیں عمدہ کھانے کھلائے جاتے۔ نفیس اور قیمتی لباس پہنایا جاتا۔ بادشاہ بیگم ان کا اس قدر ادب کرتی تھیں کہ ہر صبح اُٹھ کر پہلے ان کی زیارت کرتیں۔ آداب بجالاتیں، پھر کوئی دوسرا کام کرتی تھیں۔"

"سرکار! حضرت بادشاہ سلامت غازی الدین حیدر نے کبھی مداخلت نہ کی سب کچھ خاموشی سے دیکھتے رہے۔"

"اے لو، مداخلت کیوں کرتے۔" حضور بیگم نے قدرے تیکھے لہجے میں کہا۔ "ویسے وہ بادشاہ بیگم سے ڈرتے بھی تھے۔ مشہور ہے کہ بادشاہ بیگم پر جنوں کا بادشاہ عاشق تھا۔ اکثر ان کے پاس آتا رہتا تھا۔"

"اے سرکار! کیا واقعی شاہ جن ان کے پاس آتا تھا۔؟" مغلانی نے بے چین ہو کر پوچھا۔

"بھئی مشہور تو یہاں تک ہے کہ جس کمرے میں بادشاہ بیگم بناؤ سنگھار کر کے شاہ جن کے انتظار میں بیٹھتی تھیں۔ اس کے تمام دروازے بند رہتے اور وہ بالکل تنہا ہوتی تھیں۔ مگر کتنی ہی خواصوں اور کنیزوں نے اپنے کانوں سے حقّہ گڑگڑانے اور ہنسنے بولنے کی آوازیں سُنیں۔"

"سرکار! آپ نے تو بڑی عجیب و غریب باتیں سنائیں۔" مغلانی بی نے دبی زبان

سے اپنے شبہے کا اظہار کیا۔

"عجیب وغریب تو ہیں مگر یہ باتیں بالکل درست ہیں"۔ حضور بیگم نے نہایت اعتماد سے کہا۔" تمہاری طرح مجھے بھی ان باتوں کو سن کر حیرت ہوئی تھی یقین نہ آیا تو ایک روز ہمت کر کے ابّا جان سے پوچھا"۔

"انہوں نے کیا فرمایا؟"

"مسکرا کر بولے۔ بیٹی! یہ صرف باتیں ہی باتیں نہیں ہیں۔ بالکل ایسا ہی ہوتا تھا۔ میں نے تو یہ واقعات ان بزرگوں اور بڑے بوڑھوں سے سُنے ہیں جو بادشاہ غازی الدین حیدر کے دربار سے کسی نہ کسی طور وابستہ رہ چکے تھے"۔ حضور بیگم نے مغلانی کو بتایا۔" ابّا جان مرحوم نے تو بادشاہ بیگم کے بارے میں اور بھی بہت سی باتیں بتائیں بی مغلانی! میں تم کو کیا کیا بتاؤں"۔

حضور بیگم خاموش ہو گئیں۔ مغلانی بھی خاموش بیٹھی رہیں مگر زیادہ دیر خاموش نہ رہ سکیں۔ وہ جس مقصد سے آئی تھیں، اس کا ہنوز کھل کر اظہار نہ کر سکی تھیں انہوں نے تو صرف اس کی تمہید اٹھائی تھی۔ لیکن بات کچھ اس ڈھب سے چلی کہ دوسرے رُخ پر نکل گئی۔ مغلانی نے پان لگا کر حضور بیگم کو دیا۔ کھنکار کر گلا صاف کیا اور یوں گویا ہوئیں۔

"سرکار! رضیہ بیگم کے بارے میں آپ نے کیا سوچا؟"

"تم ہی بتاؤ، میں کیا کروں"؟ حضور بیگم نے ٹھنڈی سانس بھری۔" میرا تو دماغ کام نہیں کرتا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں"۔

"میری ناچیز رائے میں تو کسی عامل وامل کو تلاش کرنے کے بجائے رضیہ بیگم سے رجوع کیا جائے"۔ مغلانی نے مشورہ دیا۔" سو باتوں کی ایک بات۔ یہ ہے کہ وہ پردہ نشین ہیں۔ نیک اور پرہیزگار بی بی ہیں۔ ان کی تعریف بھی بہت سنی ہے۔ انہوں نے تامّل کیا پھر رسان سے کہا۔" سرکار! کیوں نہ آپ کسی روز چھوٹی سرکار کو رضیہ بیگم کے پاس لے جائیں۔ اچھوتی گلی ایسی زیادہ دور بھی نہیں اور اگر

کچھ دور بھی ہے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

"طلعت آرا کو تو میں کہیں لے کر نہیں جاؤں گی۔ اُسے تو کانوں کان خبر نہ ہو۔" حضور بیگم نے صاف انکار کر دیا۔" تم کہتی ہو تو میں چلی جاؤں گی۔" انہوں نے تامّل کیا۔" مگر میرا ابھی وہاں جانا مناسب نہیں۔ کوئی ملتے جلنے والی مل گئیں تو نہ جانے کیا نیا شاخسانہ کھڑا ہو جائے۔"

"آپ اجازت دیں تو میں اُن کے پاس چلی جاؤں۔" مغلانی نے اپنی خدمات پیش کیں۔" میرے جانے سے تو کسی کو شبہہ نہ ہو گا۔ میں تو حُجرے کے اندر تخلیے میں بات کروں گی۔"

"سوچ لو! کوئی اور اُلٹی سیدھی نہ ہو جائے۔" حضور بیگم کے چہرے سے پریشانی جھلکنے لگی۔

"سرکار! آپ اطمینان رکھیں، میں پُوری پُوری احتیاط برتوں گی۔"

مغلانی کے اطمینان دلانے پر بھی حضور بیگم مطمئن نہ ہو رہی تھیں۔ مگر جب مغلانی نے زور دیا تو وہ آمادہ ہو گئیں۔ کہنے لگیں۔" جانا ہے تو پھر آج ہی چلی جاؤ۔"

"میں پنڈا دھو کر وہاں جانا چاہتی تھی۔ اب تو شام ہوا چاہتی ہے۔ سردی بھی بڑھ گئی ہے۔ اس وقت نہاؤں گی تو ڈر ہے کہیں طبیعت نہ بگڑ جائے۔" مغلانی نے اپنی مجبوری بیان کی۔" کل جاؤں گی۔ دوپہر ہی کو نہا دھو لوں گی۔"

"کل تو جمعرات ہے۔ مجھے حضرت عبّاس علمدار کی درگاہ میں حاضری دینا ہے۔ پچھلی جمعرات کو ناغہ ہو گئی۔ کل تو مجھے ضرور جانا ہے۔ میری غیر موجودگی میں تمہارا گھر میں رہنا ضروری ہے۔ پرسوں چلی جانا۔"

اصرار کرنے کی گنجائش نہ تھی۔ حضور بیگم نے جو کہا مغلانی نے اُسے تسلیم کر لیا۔ وہ کچھ دیر اُن کے پاس بیٹھی باتیں کرتی رہیں پھر اجازت لے کر اُٹھ کھڑی ہوئیں۔

★

مغلانی واپس پہنچیں نور مضانو پہلے ہی سے کوٹھری میں موجود تھی۔ نجّو بھی تھی۔ رمضانو اس سے اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہی تھی۔ مغلانی کو دیکھتے ہی اس نے

پوچھا۔" اے بی مغلانی تم تو بڑی سرکار کے پاس بہت دیر تک بیٹھی رہیں۔ چھوٹی سرکار کے بارے میں بھی بات ہوئی؟" مغلانی خاموش رہیں۔ نجّو کی موجودگی میں بات کرنا مناسب نہ معلوم ہوا۔ انہوں نے ذرا ہی دیر بعد نجّو کو کسی بہانے کوٹھری سے باہر بھیج دیا۔ جب وہ چلی گئی تو مغلانی نے اطمینان سے اپنے پلنگ پر بیٹھ کر رمضانو کو بتایا کہ حضور بیگم سے ان کی کیا باتیں ہوئیں۔

رمضانو کرید کرید کر ایک ایک بات پوچھتی رہی اور مغلانی بتاتی رہیں۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ جمعہ کو جب وہ اچھوتی گلی جائیں گی تو اسے بھی اپنے ہمراہ لے جائیں گی۔ اسے لے جانا ضروری بھی تھا۔ وہ رضیہ بیگم کے پاس پہلے بھی جا چکی تھی۔ اور اُن کے گھر کے پتے سے پوری طرح واقف بھی تھی۔

رمضانو ان کے ہمراہ جانے پر فوراً آمادہ ہو گئی۔ وہ خود بھی یہی چاہتی تھی۔ کہنے لگی۔" میں تو تمہارے ساتھ ضرور جاؤں گی۔ ایک شیشی بھی لے کر جانا ہو گی۔ اس میں چراغ کا تیل لینا ہو گا۔ چند قطرے تو تیل ہی ہو گا۔ اُسے کڑوے تیل سے بھری ہوئی ایک بڑی بوتل میں ملا لیا جائے گا۔ یہ تیل سات روز تک چراغ جلانے کے لئے ہو گا۔"

وہ بولتی رہی اور مغلانی خاموشی سے اس کی باتیں سنتی رہیں۔ مگر جب اس نے دریافت کیا۔" چراغ جلانے کون جائے گا؟" تو مغلانی نے جواب دیا۔

" داروغہ غلام صفدر خاں جائیں گے اور کون جائے گا۔"

" داروغہ غلام صفدر آدھی رات کو جنوں کی مسجد میں سات روز تک چراغ جلانے پر راضی ہو جائیں گے؟"

مغلانی سوچ ہی رہی تھیں کہ رمضانو کے سوال کا کیا جواب دیں عین اس وقت ہرمزی کوٹھری میں داخل ہوئی۔ دونوں کو دیکھ کر بولی۔" اے کہیں ایسا غضب بھی نہ کرنا۔ کیوں بے چارے غلام صفدر کی جان کے پیچھے پڑی ہو۔" رمضانو اور مغلانی ہکا بکا ہو کر اُس کا مُنہ تکنے لگیں۔

ہرمزی قریب پہنچی اور مسلسل بولتی رہی۔" اے! وہ تو بوڑھے ہونے کو

آ گئے۔ جنوں کی مسجد میں تو کڑیل جوانوں کو جانے کی ہمت نہیں ہوتی۔ گومتی کے کنارے ایسے ویرانے میں ہے کہ دور دور تک آدم زاد کا پتہ نہیں۔ کس کی فالتو جان ہے۔ جو وہاں جائے۔ سُنا ہے آدھی رات کے بعد تو وہاں جنات عبادت کرنے آتے ہیں۔ میرے ایک ماموں زاد بھائی تھے۔ اب تو ان کو مرے ہوئے بھی کئی برس ہو گئے۔ ایک مرتبہ کاکوری سے لکھنو آ رہے تھے۔ راستے میں تھے کہ اچانک موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ رات بھی بہت ہو چکی تھی۔ دُور دُور تک آبادی کا نام و نشان نہ تھا۔ لے دے کے ایک جنوں کی مسجد ہی سامنے تھی۔ رات گزارنے کے لئے اس میں ٹھہر گئے۔ آنکھ کھلی تو اپنے ارد گرد جنوں کو پایا۔ ایسا خوف طاری ہوا کہ بے ہوش ہو گئے۔ خیر ہوئی کہ جان بچ گئی۔ وہ جب اس واقعے کو سناتے تھے تو ڈر کے مارے سننے والوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔"

دونوں دم بخود بیٹھی رہیں۔ ہرمزی کی باتوں سے انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ جب وہ باتیں کر رہی تھیں تو ہرمزی دروازے کے قریب ہی موجود تھی اور اس نے ان کی کچھ باتیں سن بھی لی تھیں مگر انہوں نے نہ اُسے ٹوکا اور نہ ہی کسی خفگی کا اظہار کیا ہرمزی ان کے احساسات سے قطعی بے نیاز نظر آتی تھی وہ آگے بڑھی اور اطمینان سے رمضانو کے برابر بیٹھ گئی۔ کوٹھری میں چند لمحے کے لئے خاموشی چھا گئی۔ مگر ہرمزی زیادہ دیر خاموش نہ رہی۔ اس نے مغلانی کو مخاطب کیا۔ "بی مغلانی! جنوں کی ایک مسجد عالم نگر اسٹیشن سے آگے شہدرہ میں بھی ہے۔ کبھی وہاں گئی ہو؟"

"میں کیوں جنوں کی مسجد میں جانے لگی۔" مغلانی نے بے رُخی سے جواب دیا وہ ہرمزی کی بے وقت آمد اور بے جا مداخلت سے دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہی تھیں۔

"چھوٹی سرکار کے لئے منت مانی ہے تو میرے ساتھ اس مسجد میں چلو۔" ہرمزی نے مغلانی کی بے رُخی نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "بڑی خوبصورت اور عالی شان مسجد ہے۔ آس پاس آبادی بھی ہے اور نوچندی جمعرات کو تو وہاں خلقت کا ہجوم ہوتا ہے۔ مرد اور عورتیں دونوں ہی جاتے ہیں۔ عورتوں کے لئے بالکل الگ حصّہ ہے۔

نہ ڈر معلوم ہوتا ہے نہ خطرہ محسوس ہوتا ہے۔ کہتے ہیں جو دعا مانگو پوری ہوتی ہے۔ جنوں کا سایہ ہو تو دور ہو جاتا ہے۔ مراد پوری ہونے پر وہیں میٹھی کھچڑی پکا کر نذر دی جاتی ہے۔" اس نے نظر بھر کر مغلانی کو دیکھا۔ "چلو گی میرے ساتھ؟"

"میں خود کیسے فیصلہ کر سکتی ہوں" مغلانی نے جواب دیا۔ "بڑی سرکار سے جا کر بات کرو۔ وہ اجازت دیں تو میں جا سکتی ہوں۔"

"میری اتنی کہاں مجال کہ بڑی سرکار سے جا کر بات کروں۔ وہ تو ایسے ہی میری شکل سے بے زار رہتی ہیں۔ میری بات کیا سنیں گی۔" ہرمزی نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ان سے تو تم ہی اجازت لے سکتی ہو۔"

"مجھے باؤلے کتے نے کاٹا ہے۔ جو میں بڑی سرکار سے جا کر اجازت لوں"۔ مغلانی جل کر بولیں۔ اُن کے چہرے پر جھنجلاہٹ چھا گئی۔ "مجھے ایسا کوئی شوق نہیں تم کو ہی ہر معاملے میں ٹانگ اڑانے سے دلچسپی ہے۔" اُن کا لہجہ اور درشت ہو گیا۔ "بات کسی کی ہو رہی ہو، کچھ ہو رہی ہو، بیچ میں نہ بولو تو کھانا ہضم نہ ہو۔ نہ جانے کیسی عادت پائی ہے تم نے۔"

ہرمزی اُن کی جھنجلاہٹ اور برہمی سے مرعوب ہو گئی۔ کھسیانی ہو کر بولی "خفا کیوں ہو رہی ہو۔ میرا آنا تم کو ناگوار گزرا تو میں چلی جاتی ہوں۔" وہ اٹھی اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی کوٹھری سے باہر چلی گئی۔

مغلانی اور رمضانو تیکھی نظروں سے اُسے جاتے ہوئے دیکھتی رہیں۔

(۱۱)

جمعہ کو مغلانی نے غسل کیا۔ اجلا لباس پہنا۔ سورج غروب ہونے سے پہلے پہلے وہ اچھوتی گلی جانے کے لئے تیار ہو چکی تھیں۔ رمضانو نے بھی نہا دھو کر اجلا لباس پہنا تھا۔ اُسے مغلانی کے ہمراہ جانا تھا۔

دن ڈھل رہا تھا۔ دھوپ چڑھ کر چھت کی منڈیروں پر پہنچ چکی تھی۔ بارہ دری

میں ہلکا ہلکا اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ حضور بیگم نشست گاہ میں گاؤ تکیہ کے سہارے مسند پر بیٹھی تھیں۔ پہلو میں خاصدان رکھا تھا جس میں سے گلوریاں نکال نکال کر وہ وقفے وقفے سے منہ میں رکھ لیتیں۔

مغلانی کمرے میں داخل ہوئیں۔ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی جوتیاں اتار کر اوپر گئیں اور حضور بیگم کے قریب مسند پر بیٹھ گئیں۔

حضور بیگم نے مڑ کر مغلانی کو دیکھا مدھم لہجے میں دریافت کیا۔ "تمہارا کس وقت اچھوتی گلی جانے کا ارادہ ہے؟"

"سرکار میں تو بالکل تیار ہوں۔ رمضانو بھی تیار بیٹھی ہے"۔ مغلانی نے بتایا۔ "آپ سے اجازت لینے آئی تھی کہ وہاں جانے کے لئے سواری بلوائی جائے"۔

"تم وہاں جا تو رہی ہو۔ مگر پوری پوری احتیاط سے کام لینا"۔ حضور بیگم نے رازدارانہ لہجے میں تاکید کی۔ "کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو کہ تم کہاں جا رہی ہو کس کے پاس جا رہی ہو؟ رمضانو کو بھی سختی سے منع کر دینا کہ اپنی زبان بند رکھے۔ ویسے وہ پرانی پیش خدمت ہے۔ قابل اعتماد بھی ہے لیکن احتیاط بہرحال لازم ہے"۔

"سرکار! آپ اطمینان رکھیں کسی کو مطلق خبر نہ ہو گی۔ رمضانو کو پہلے ہی تاکید کر چکی ہوں اس سے کہوں گی کہ ڈولی کے کہاروں کو بھی منع کر دے کہ کسی سے ذکر نہ کریں"۔ مغلانی نے حضور بیگم کو یقین دلایا۔

"اچھا اب تم جاؤ۔ وقت تنگ ہو رہا ہے"۔ حضور بیگم نے گردن کو خم دے کر دروازے کی جانب دیکھا۔ گل بدن کمرے میں داخل ہو رہی تھی اس نے قریب آ کر مطلع کیا۔ "سرکار نفیسہ بیگم آئی ہیں"۔

"نفیسہ بیگم آئی ہیں؟" حضور بیگم نے اپنی نند، نفیسہ بیگم کی غیر متوقع آمد پر حیرت زدہ ہو کر گل بدن سے پوچھا۔ "کہاں ہیں وہ؟"

"ڈیوڑھی میں ان کا چوپہلا لگ چکا ہے"۔ گل بدن نے بتایا۔ "دو مہریاں ان کو اتروانے کے لئے ڈیوڑھی میں گئی ہیں"۔

"تم بھی وہاں چلی جاؤ۔" حضور بیگم نے ہدایت کی۔ گل بدن چلی گئی۔ حضور بیگم کے چہرے سے پریشانی جھلکنے لگیں۔ مغلانی کی جانب متوجہ ہوئیں "اللہ خیر کرے یہ آج نفیسہ کیسے آگئیں"۔ انہوں نے تامّل کیا۔" بی مغلانی! اب تم اچھوتی گلی جانے کا ارادہ ترک کر دو۔ کسی اور دن جانا۔ آج تمہارا وہاں جانا مناسب نہیں"۔

"بہت بہتر سرکار! میں نہیں جاؤں گی"۔ مغلانی نے مطلق اصرار نہ کیا۔

"تم بھی باہر چلی جاؤ اور نفیسہ بیگم کو اپنے ہمراہ یہاں لے آؤ۔"

مغلانی فوراً اُٹھ کر کھڑی ہوگئیں۔ شہ نشین سے نیچے اُتریں اور کمرے سے نکل کر صحن کی جانب روانہ ہوگئیں۔ حضور بیگم گاؤ تکیہ کے سہارے دم بخود بیٹھی رہیں نفیسہ بیگم کی بے موقع آمد نے اُن کو ذہنی طور پر الجھن میں مبتلا کر دیا تھا۔

کمرے کے باہر دالان میں قدموں کی آہٹ اُبھری۔ حضور بیگم نے مڑ کر دیکھا نفیسہ بیگم مسکراتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئیں جھک کر آداب کیا۔ حضور بیگم نے نرم لہجے میں شفقت کا اظہار کیا۔ "جیتی رہو"۔ نفیسہ بیگم آگے بڑھیں۔ ایک مہری کے علاوہ اُن کے ہمراہ بوڑھی آتو بھی تھیں۔ وہ ان کی بیٹیوں کی اتالیق تھیں اور بہت کم باہر نکلتی تھیں۔ نفیسہ بیگم کے ساتھ آتو کو دیکھ کر حضور بیگم کو حیرت ہوئی مگر خاموش رہیں۔

مہری دروازے کے باہر ہی ٹھہر گئی۔ نفیسہ بیگم آگے بڑھیں اُن کے پیچھے پیچھے آتو تھیں۔ مغلانی بھی آتو کے ساتھ ساتھ چل رہی تھیں تینوں شہ نشین پر پہنچیں۔

حضور بیگم نے خندہ پیشانی سے نفیسہ بیگم کا خیر مقدم کیا۔ اپنے پہلو میں مسند پر بیٹھا یا۔ آتو بھی اُن کے قریب ہی بیٹھ گئیں۔ مگر مغلانی بڑھ کر حضور بیگم کے بائیں جانب خاموشی سے بیٹھ گئیں۔

مغلانی نے قریب رکھا ہوا چاندی کا پاندان کھولا اور سرخ صافی میں لپٹے ہوئے پان نکال، نکال کر گلوریاں بنانے لگیں۔

"آج کیسے اِدھر بھول کر آگئیں؟" حضور بیگم نے مُسکرا کر نفیسہ بیگم سے پُوچھا۔ "بہت مُدّت بعد تمہاری شکل نظر آئی ہے"۔

"کیا عرض کروں بھابی جان! گھر کے بکھیڑوں ہی سے فرصت نہیں ملتی"۔ نفیسہ بیگم نے صفائی پیش کی۔ "دونوں بچیاں بھی ماشاء اللہ، اب سیانی ہو گئی ہیں۔ ان کو گھر میں چھوڑ کر باہر جانا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔"

حضور بیگم نے ان کی بات سُنی تو چونک کر دیکھا۔ قدرے تامّل کیا پھر بولیں "ویسے طبیعت تو تمہاری ٹھیک رہی؟"

"میری طبیعت تو ٹھیک رہی سُنا ہے آپ کی طبیعت کچھ ناساز ہے"۔ نفیسہ بیگم نے اظہار ہمدردی کیا۔ "جیسے ہی یہ اطلاع ملی خیریت معلوم کرنے کے لئے حاضر ہوئی"۔ انہوں نے حضور بیگم کے چہرے کی جانب نظریں اٹھا کر دیکھا۔ "اب کیسی طبیعت ہے؟"

"اب تو پہلے سے بہتر ہے"۔ حضور بیگم نے بتایا۔ "اختلاج قلب کی شکایت ہے بیٹھے بیٹھے اچانک طبیعت بگڑ جاتی۔ ایسا خفقان ہوتا ہے کہ میں تم سے کیا بتاؤں۔"

"حکیم صاحب کیا کہتے ہیں؟"

"دوائیں دے دیتے ہیں"۔ حضور بیگم آہستہ آہستہ بول رہی تھیں۔ "ان کے استعمال سے آج کل تو کچھ فائدہ معلوم ہو رہا ہے"۔

نفیسہ بیگم نے تشویش کا اظہار کیا۔ اپنے خاندانی حکیم کا تذکرہ کیا۔ زور دیا کہ ان کا علاج کرا کے دیکھا جائے۔ وہ اپنے حکیم کی تعریف و توصیف کرتی رہیں۔ ان کے طبّی کارنامے سناتی رہیں۔ حضور بیگم اُن کی باتیں توجہ اور انہماک سے سُنتی رہیں۔

بات کرتے کرتے نفیسہ بیگم نے اچانک گفتگو کا رُخ موڑ دیا۔ حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر بولیں۔ "اے چھوٹی بھابی! آپ نے کچھ اور سُنا؟" حضور بیگم نے نظریں اٹھا کر اُن کے چہرے کی جانب تجسّس سے دیکھا۔ نفیسہ بیگم نے لمحہ بھر کے لیے خاموشی اختیار کر لی پھر گویا ہوئیں۔ "میری نند رقّن کو تو آپ اچھی طرح جانتی ہیں۔"

"کیا ہو گیا اُسے؟" حضور بیگم نے دریافت کیا۔

"جب سے نحّاس کا مکان چھوڑ کر محبوب گنج گئی ہے اس پر تو ایسی آفت نازل ہوئی ہے کہ میں آپ سے کیا عرض کروں۔"

اس بار حضور بیگم تو خاموش رہیں۔ مغلانی نے نہایت اشتیاق سے پوچھا۔ خیر تو ہے۔ کیا مصیبت ان پر نازل ہوئی؟

"اے ادھر شام ہوئی، اندھیرا بڑھا اور ان کے مکان پہ پتھروں کی بارش شروع ہوئی۔" نفیسہ بیگم نے بتایا۔ "خدا جھوٹ نہ بلوائے۔ یہ بڑے بڑے، کوئی سیر سیر بھر کے پتھر گرتے ہیں۔ کئی مامائیں لونڈیاں زخمی ہو چکی ہیں۔ زینن کے بھی چوٹ آئی۔ سر بچ گیا ورنہ خون میں نہا جاتی۔ پتھر پیٹھ پر آکر گرا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ کندھے سے ذرا نیچے یہ بڑا نشان پڑ گیا ہے۔"

"مگر یہ پتھر آتے کہاں سے ہیں؟" اس دفعہ بھی مغلانی نے استفسار کیا۔ "یہ نہیں معلوم ہوا کہ یہ کس کی حرکت ہے؟"

"معلوم کرنے کی تو بہت کوشش کی۔ چھتوں پر بیٹھ کر رات رات بھر پہرہ داری بھی کی۔ پاس پڑوس میں چھان بین کی۔ کوئی سراغ نہ ملا۔ بس اتنا تو اندھیرے میں دکھائی دیا جیسے چڑیاں اُڑ رہی ہیں۔ نہ صحیح سمت کا پتہ چلتا ہے نہ جگہ کا۔" نفیسہ بیگم پان چباتی رہیں اور سنبھل سنبھل کر بتاتی رہیں۔ "سُنا ہے مکان پر جنوں کا اثر ہے۔ وہی پریشان کر رہے ہیں۔"

"کوئی بے ادبی ہو گئی ہو گی۔" حضور بیگم نے دبی زبان سے اپنے ردّعمل کا اظہار کیا۔

"سرکار ان جنوں سے تو خدا بچائے۔ کسی کے پیچھے پڑ جائیں تو جان کے لالے پڑ جاتے ہیں۔" نفیسہ بیگم کے ساتھ آنے والی آتو نے دخل دیا۔ "میری تو رشتے کی ایک خالہ کے ساتھ یہی بیتی۔ ان سے ایسے ناراض ہوئے کہ جان لے کر ٹلے۔"

"بے چاری سے ایسی کیا خطا ہو گئی کہ اپنی جان سے گئیں؟" حضور بیگم نے مڑ کر خوف زدہ نظروں سے آتو کو دیکھا۔

"اے سرکار! اچھی خاصی تھوڑا سی تھیں۔ اب تک ان کی تصویر آنکھوں کے سامنے گھومتی ہے۔" آتو نے حضور بیگم کو بتایا۔ "بہت غریب تھیں۔ تنگ دستی سے عاجز

آکر نواز گنج کے ایک رئیس کی ڈیوڑھی پر ملازمت اختیار کر لی تھی۔ ایک روز تیسرے پہر کبابوں کے لئے سل پر قیمہ پیس رہی تھیں ایک کالی بلی کسی طرف سے نمودار ہوئی اور منہ میں قیمے کا پچا دبوچ کر بھاگی۔ خالہ کے تن بدن میں غصّے سے آگ ہی تو لگ گئی۔ ہاتھ میں سل کا بٹّا دبا تھا۔ وہی کھینچ کر مارا۔ بلّی کے سر پر جا کر لگا۔ بلی قیمہ چھوڑ کر چلی گئی۔" آتو نے توقف کیا۔ حضور بیگم کی جانب مڑ کر دیکھا "سرکار! کسے خبر تھی کہ بلّی کے بھیس میں جن تھا۔"

"تمہاری خالہ نے بھی تو غضب کر دیا۔" حضور بیگم اس قدر سراسیمہ ہوئیں کہ پوری طرح اپنی بات کی وضاحت بھی نہ کر سکیں۔

"اے حضور! انہیں کیا معلوم تھا کہ وہ بلّی نہیں جن تھا۔" آتو نے مزید بتایا "خالہ نے اپنا کام کاج نمٹایا۔ کھانا کھایا۔ سونے کے لئے اپنی کوٹھری میں چلی گئیں۔ کڑاکے کا جاڑا پڑ رہا تھا۔ انہوں نے دروازہ بھیڑ کر اندر سے کنڈی چڑھا دی اطمینان سے بستر پر لیٹ کر سو گئیں۔" بات کہتے کہتے آتو نے مڑ کر مغلانی کو دیکھا۔ جو پاندان کھولے پان لگانے میں مصروف تھیں۔ "اے مغلانی جی! ایک پان ادھر بھی دیں منہ پھیکا پھیکا ہو رہا ہے۔"

حضور بیگم نے بھی سفارش کی۔ "بی مغلانی! ایک پان آتو جی کو بھی دو۔" پھر وہ آتو کی جانب متوجہ ہوئیں۔ ان کی باتوں میں دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے بولیں۔ "بعد میں تمہاری خالہ پر کیا بیتی؟"

"نہ پوچھئے سرکار! بعد میں جنّاتوں نے ان کا کیا حشر کیا۔" آتو سخت چرب زبان تھیں۔ ساری زندگی بیگمات اور رئیس زادیوں کی صحبت میں گزری تھی مزاج شناس تھیں بات کرنے کا ڈھب جانتی تھیں۔ انہوں نے حضور بیگم کا اشتیاق بڑھانے کی غرض سے صرف اتنا کہنے پر اکتفا کیا۔ "کس دل سے ان کا حال بیان کروں سرکار! یاد کرتی ہوں تو کلیجہ منہ کو آتا ہے۔"

آتو نے خاموشی اختیار کر لی۔ حربہ کارگر ثابت ہوا حضور بیگم کے اشتیاق میں

حسبِ توقع اضافہ ہوا اور اتنی شدّت سے ہُوا کہ بے چین ہو کر پوچھا "آخر ہوا کیا؟"
ان کے لہجے میں خوف کا عنصر شامل تھا۔
"ہوا یہ سرکار کہ ٹھیک آدھی رات کو کسی نے کوٹھری کا دروازہ آہستہ آہستہ کھٹکھٹایا۔ ساتھ ہی باہر سے آواز آئی۔ دروازہ کھولو! خالہ کی آنکھ کھل گئی۔ آواز ایسی خوفناک تھی کہ ڈر کے مارے نہ وہ نیچے اُتریں اور نہ ہی اُٹھ کر دروازہ کھولا۔ ڈری سہمی بستر پر دم بخود پڑی رہیں۔" آتو ٹھہر ٹھہر کر جما جما کر بولتی رہیں۔ "دروازہ کھولنے پر بہت اصرار کیا گیا مگر خالہ ٹس سے مس نہ ہوئیں"۔
"اے وہ تھے کون"؟ مغلانی نے بے قرار ہو کر مداخلت کی۔
"لو بی مغلانی تم نے بھی حد کر دی"۔ آتو نے مغلانی کی مداخلت پر ناک سکوڑی "اے وہ تھے کون؟ جنات تھے ایک نہیں دو تھے"۔
"مگر وہ کوٹھری کے اندر کیسے داخل ہوئے"؟ حضور بیگم نے کرید کر پوچھا۔
"اے بھابی جان! جنوں کا کیا ہے۔ وہ تو جس قالب میں چاہیں خود کو ڈھال لیں"۔ اس دفعہ نفیسہ بیگم نے وضاحت کی۔ "جہاں چاہتے ہیں پہنچ جاتے ہیں"۔
"سرکار نے بالکل درست فرمایا"۔ آتو نے نفیسہ بیگم کی ہاں میں ہاں ملائی "انہوں نے ایسا ہی کیا۔ خود کو بلطوں کے روپ میں تبدیل کر لیا۔ اپنی لمبی لمبی چونچیں دروازے کی جھری سے اندر ڈال کر کنڈی کھول لی اور اندر چلے گئے دونوں میں سے ایک کے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ یہ وہی جن تھا جو کالی بلی کے رُوپ میں قیمے کا مُچا منہ میں دبا کر لے جا رہا تھا۔ جس کے سر کو خالہ نے سل کا بٹا مار کر زخمی کر دیا تھا۔ دوسرا بھی جن ہی تھا۔ جس کے سر میں پٹی بندھی ہوئی تھی اس نے خالہ کا سر پکڑ کر زور سے دیوار کے ساتھ ٹکرایا۔ بار بار ٹکرایا"۔
"دوسرے نے بچانے کی بھی کوشش نہیں کی"؟ مغلانی نے تبصرہ کیا۔
"اے لو وہ کیوں بچانے کی کوشش کرتا۔ اس کم بخت نے تو خالہ کی مشکیں اس طرح کس رکھی تھیں کہ وہ بالکل بے بس ہو کر رہ گئی تھیں"۔ آتو کے لہجے سے رقّت

جھلکنے لگی۔ بے چاری گڑگڑاتی رہیں، رو رو کر معافی مانگتی رہیں۔ بہت چیخی چلائیں۔ دہائی دی مگر دونوں جنوں کا ذرا بھی دل نہ پسیجا۔ خالہ کا سر پھٹ کر خون خون ہو گیا۔"

"ان کی چیخ پکار سُن کر کوئی بھی مدد کو نہ آیا؟" مغلانی نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر دریافت کیا۔

"اے کس میں اتنی ہمت تھی کہ جنّاتوں کا سامنا کرتا۔ اس کا بھی وہی حال ہوتا جو خالہ کا ہوا۔ جان کس کو پیاری نہیں ہوتی۔ سب خوف سے سہمے ہوئے کمروں اور کوٹھریوں کے اندر بند بیٹھے تھے۔ چوں تک نہ کی۔" آتو نے مغلانی کو بتایا۔ "جنّاتوں کے جانے کے بعد وہ خون میں لت پت دیر تک پڑی کراہتی رہیں۔ کوئی بھی اُن کے قریب نہ پھٹکا۔ پھر بے چاری خود ہی کسی نہ کسی طرح ہمت کر کے اُٹھیں لڑکھڑاتی ٹھوکریں کھاتی اپنی سرکار کے پاس پہنچیں جو کچھ ان پر بیتی تھی ہانپتے کانپتے بیان کی۔ صبح ہوتے ہوتے سسک سسک کر مر گئیں۔" آتو کے چہرے پر دُکھ کے سائے منڈلانے لگے۔ انہوں نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "سرکار! جنّوں نے ان پر بڑا ظلم ڈھایا۔"

حضور بیگم تو آتو کی باتوں سے اس قدر متاثر ہوئیں کہ دم بخود بیٹھی رہیں۔ انہوں نے کوئی تبصرہ نہ کیا۔ مغلانی بھی خاموش رہیں مگر نفیسہ بیگم چپ نہ رہیں۔ کہنے لگیں۔ "اے چھوٹی بھابی۔ اللہ ان جنّوں سے اپنی امان میں رکھے۔ خدا نہ کرے کسی کے پیچھے پڑ جائیں۔" وہ جھک کر حضور بیگم سے قریب ہو گئیں۔ رازدارانہ لہجے میں بہت آہستہ سے بولیں۔ "سُنا ہے طلعت آرا پر بھی کسی جن کا سایہ ہے۔"

حضور بیگم کا چہرہ فق ہو گیا۔ انہوں نے خود کو سنبھالا۔ سختی سے تردید کی۔ "اے اللہ نہ کرے ایسا ہو۔ کسی نے تم کو غلط اطلاع دی۔" حضور بیگم نے دروازے پر کھڑی ہوئی پیش خدمت کو اشارہ کیا۔ وہ اگالدان لے کر آئی۔ حضور بیگم نے ہاتھ کی آڑ کر کے اگالدان میں پان کی پیک تھوکی۔ رومال سے مُنہ صاف کیا۔ اب وہ پوری طرح اپنی گھبراہٹ پر قابو پا چکی تھیں۔ انہوں نے فوراً گفتگو کا رُخ موڑ دیا۔ نفیسہ بیگم سے دریافت کیا۔

"اے نفیسہ! پچھلے دنوں تمہارے سسر کے بارے میں بڑی تشویشناک خبریں سننے میں آ رہی تھیں۔ خیر سے اب وہ کیسے ہیں؟"

"اب تو ان کی طبیعت پہلے سے کچھ بہتر ہے مگر کمزور بہت ہو گئے ہیں۔ سن بھی تو ان کا کتنا ہے۔" نفیسہ بیگم نے بتایا۔ "بھابی جان! سچ پوچھئے تو بڑھاپا خود سو بیماریوں کی ایک بیماری ہے۔"

حضور بیگم نے ان کی سسرال کے متعلق باتیں شروع کر دیں۔ نفیسہ بیگم بتاتی رہیں۔ حضور بیگم کرید کرید کر پوچھتی رہیں۔ گفتگو طویل ہو گئی۔

☆

شام بارہ دری میں اُتر آئی تھی۔ ہر طرف اندھیرا پھیل گیا۔ خادماؤں نے فانوسوں اور مردنگوں کو روشن کر دیا۔ اونچے اونچے دالانوں میں کافوری شمعوں کی اُجلی اُجلی روشنی پھیل گئی۔ صحنچیوں، کمروں اور سہ دریوں میں کنول اور دوشاخے جھلملانے لگے۔ ماماؤں اور لونڈیوں کی کوٹھریوں میں چراغ ٹمٹما رہے تھے۔

زینے کی محراب کے نیچے لٹکتی ہوئی قندیل کو ہرمزی نے روشن کر دیا تھا خادماؤں کی نظریں جب قندیل پر پڑتیں تو وہ مُڑ کر طلعت آرا کے کمرے کی جانب ضرور دیکھتیں۔ کمرے کا دروازہ سہ پہر سے بند تھا۔

اندھیرا بڑھتا گیا۔ رات ہو گئی بارہ دری پر سناٹا چھا گیا۔ زنانی ڈیوڑھی کے قریب سے گزرتی ہوئی گلی میں پھیری والوں کی صدائیں رُک رُک کر اُبھرتیں۔

رات تاریک اور سرد ہو گئی۔ نفیسہ بیگم ایسی جم کر بیٹھیں کہ اُٹھنے کا نام ہی نہ لیا۔ وہ اطمینان سے بیٹھی اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہیں۔ آنو بھی بار بار دخل دیتیں۔ کوئی نئی بات کہتیں۔ بات سے بات نکلتی رہی۔ گفتگو طویل ہوتی گئی۔ وقت دھیرے دھیرے گزرتا رہا اور گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ حضور بیگم کی پریشانی میں اضافہ ہوتا گیا۔ مغلانی بھی کم پریشان نہ تھیں۔ وہ دیر سے خاموش بیٹھی تھیں۔

پہر رات گزر گئی۔ طلعت آرا کے کوٹھے پر جانے کا وقت قریب آ گیا تھا۔ حضور بیگم کو بخوبی علم تھا کہ نفیسہ کی مہری دالان میں خادماؤں کے ساتھ بیٹھی ہے۔ حضور بیگم کو خدشہ تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ طلعت آرا اوپر جانے کے لئے زینے میں داخل ہو اور مہری کی اس پر نظر پڑ جائے۔ وہ نفیسہ بیگم کو اس کی اطلاع ضرور دیتی حضور بیگم کو کسی طور یہ گوارہ نہ تھا کہ نفیسہ بیگم اس راز سے آگاہ ہو جائیں۔ ان کی پریشانی اب بدحواسی میں تبدیل ہونے لگی وہ سخت ذہنی خلفشار میں مبتلا تھیں۔ وہ نفیسہ بیگم سے نہ تو رخصت ہونے کے لئے کہہ سکتی تھیں اور نہ ہی اُن کا مزید ٹھہرنا گوارہ تھا۔ وہ گم صم بیٹھی تھیں۔

مغلانی اُن کے ذہنی خلفشار سے بخوبی واقف تھیں۔ خود بھی اسی الجھن میں گرفتار تھیں۔ انہوں نے کئی بار دبی زبان سے نفیسہ بیگم کو رات زیادہ گزرنے کا احساس دلایا۔ مگر انہوں نے کوئی توجہ نہ دی۔ اطمینان سے بیٹھی باتیں کرتی رہیں آخر انہوں نے تکلّف کو بالائے طاق رکھا۔ صورت حال کی نزاکت محسوس کرتے ہوئے مُنہ چھوڑ کر نفیسہ بیگم سے کہا۔ "حضور! رات اب خاصی ہو گئی ہے۔ سردی بھی بڑھتی جا رہی ہے آپ کو جانا بھی دور ہے"۔ مغلانی نے یہ کہہ کر جھٹ خاصدان اُن کے سامنے پیش کیا۔

"اے مغلانی! کیا تمہیں میرا یہاں ٹھہرنا کھل رہا ہے"۔ نفیسہ بیگم نے مسکرا کر ڈھٹائی سے اپنے ردّعمل کا اظہار کیا۔ پان کی گلوری اٹھا کر مُنہ میں رکھی اور بے نیازی سے بولیں۔ "مدّت بعد چھوٹی بھابی سے ملاقات ہوئی ہے۔ اُن کے پاس سے اُٹھنے کو دل نہیں چاہ رہا ہے"۔

حضور بیگم نے فوراً بات بنائی۔ بادل نخواستہ کہنا پڑا۔ "چلی جانا ایسی جلدی کیا ہے۔ بلکہ اب تو کھانا کھا کر ہی جانا"۔ انہوں نے مڑ کر اپنی خواص گل بدن کو مخاطب کیا۔ "گل بدن! دستر خوان بچھا کر کھانا لگواؤ"۔

"بہت بہتر! ابھی دستر خوان بچھاتی ہوں"۔ گل بدن نے نہایت مستعدی سے

جواب دیا۔ وہ آگے بڑھی تو حضور بیگم نے ٹوکا۔" اور دیکھو! وہ مہری جو نفیسہ بیگم کے ساتھ آئی ہے، اُسے اپنے ہمراہ لے جاؤ اور اس کے کھانے کا بھی بندوبست کرو آتو جی تو یہیں دستر خوان پر ہمارے ساتھ کھانا کھائیں گی۔ تم ان کی فکر نہ کرو۔"

مغلانی نے دل ہی دل میں حضور بیگم کی مصلحت اندیشی کی داد دی۔ ساتھ ہی معذرت کے انداز میں نفیسہ بیگم سے کہا۔" حضور میرا مطلب ہرگز یہ نہ تھا جو آپ نے سمجھا میری کہاں اتنی مجال کہ ایسی گستاخی کروں۔ میں نے تو صرف اس خیال سے کہا تھا کہ آپ کو تکلیف نہ ہو۔ معافی کی خواستگار ہوں۔"

نفیسہ بیگم نے اس بار بھی بے نیازی کا مظاہرہ کیا۔ مسکرا کر بولیں۔" اے بی مغلانی یہ تو میں بھی سمجھتی ہوں کہ تمہارا ہرگز یہ مطلب نہ تھا۔" یہ کہہ کر وہ حضور بیگم کی طرف متوجہ ہو گئیں اور اپنے دیور کی آشفتہ مزاجی اور لااُبالی پن کا دکھڑا چھیڑ دیا۔

گل بدن اور دوسری خادماؤں نے دستر خوان بچھایا اور کھانا چن دیا۔

حضور بیگم نے احتیاطاً گل بدن سے دریافت کیا۔" نفیسہ بیگم کی مہری کے کھانے کا بندوبست کر دیا؟"

"جی سرکار!" گل بدن نے مطلع کیا۔" وہ ادھر باورچی خانے کے قریب سہ دری میں کھانا کھا رہی ہے۔"

یہ سہ دری بارہ دری کے دُور تک پھیلے ہوئے صحن کے دوسرے سرے پر تھی۔ دور ہونے کے علاوہ ایسے رُخ پر تھی کہ وہاں سے زینہ اور اس کی محراب مطلق نظر نہ آتی تھی۔

گل بدن کا جواب سُن کر حضور بیگم کے ساتھ مغلانی کے چہرے سے بھی اطمینان جھلکنے لگا۔ مگر کھانا شروع کرنے سے قبل نفیسہ بیگم نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے حضور بیگم سے دریافت کیا۔" اے بھابی جان! یہ طلعت آرا کہاں ہے؟ آداب کرنے کو بھی نہ آئی۔" وہ بے تکلفی سے کھل کر مسکرائیں۔" کیا مجھ سے بھی اس کا پردہ شروع کرا

دیا ہے؟"

"اے ایسی کوئی بات نہیں"۔ حضور بیگم کے چہرے پر اچانک پریشانی کے سائے پھیل گئے۔ لہجے سے بھی دبی دبی گھبراہٹ آشکارہ تھی۔ "صبح سے اس کی طبیعت کچھ ناساز ہے۔ اپنے کمرے میں بستر پر لیٹی ہے"۔

مغلانی ہکا بکا ہو کر حضور بیگم کا مُنہ تکنے لگیں۔ انکو توقع تھی کہ حضور بیگم یہ عذر پیش کریں گی کہ ان کی بھا۔نجی خورشید جہاں آئی تھیں اور ضد کر کے طلعت آرا کو اپنے ہمراہ لے گئیں۔ مغلانی نے یہی مشورہ دیا تھا حضور بیگم نے اس سے اتفاق بھی کیا تھا۔ مصلحت کا بھی یہی تقاضہ تھا۔

"اے بھابی! کچھ زیادہ طبیعت تو خراب نہیں"؟ نفیسہ بیگم نے بھتیجی کی علالت کی اطلاع ملنے پر تشویش کا اظہار کیا۔

"نہیں ایسی کوئی پریشان ہونے کی بات نہیں"۔ حضور بیگم نے سنبھلتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "سر میں درد ہے۔ ہلکا ہلکا بخار بھی ہے۔ موسم بھی تو بدل رہا ہے۔ حکیم صاحب نے نسخہ تجویز کیا ہے۔ آرام کرنے کی تاکید کی ہے"۔

مغلانی کو جو خدشہ تھا وہ سامنے آیا۔ نفیسہ بیگم نے زور دے کر کہا۔ "بھابی جان زیادہ طبیعت خراب نہیں تو اُسے بلوا لیجئے۔ دسترخوان پر میرے ساتھ بیٹھ کر دو لقمے کھا لے گی۔ اُسے دیکھنے کو بہت جی چاہ رہا ہے۔ بہت دنوں سے دیکھا بھی تو نہیں"۔

"اُسے تو اب آرام ہی کرنے دو"۔ حضور بیگم نے جھٹ بات بنائی۔ "کھانا تو وہ حکیم صاحب کی ہدایت پر پرہیزی کھا رہی ہے۔ شاید کھانے سے فارغ بھی ہو چکی ہو"۔

نفیسہ بیگم اصرار کر کے طلعت آرا کو بُلانے پر بضد تھیں مگر اسی اثناء میں ایک پیش خدمت نے کمرے میں داخل ہو کر نفیسہ بیگم کے بیٹے علی رضا کے آنے کی اطلاع دی۔

نفیسہ بیگم نے دریافت کیا۔ "کہاں ہے علی رضا؟"

"ڈیوڑھی میں موجود ہیں۔"

"اُسے وہاں کیوں کھڑا کر رکھا ہے۔ یہاں لے کر آؤ۔" حضور بیگم نے پیش خدمت کو ہدایت کی۔ اطمینان کی سانس لی۔ اب نفیسہ بیگم کے لئے طلعت آرا کو بلانے پر اصرار کرنے کی گنجائش نہ رہی تھی جب سے انہوں نے علی رضا کا پیغام دیا تھا۔ حضور بیگم نے اس سے طلعت آرا کا پردہ شروع کرا دیا تھا۔ حضور بیگم نے مسکرا کر نفیسہ بیگم کی جانب دیکھا۔ "علی رضا خوب وقت سے آیا۔ وہ بھی کھانے میں شریک ہو جائیگا۔ کسی نے سچ کہا ہے دانے دانے پر مُہر ہوتی ہے۔"

"مجھے واپسی میں دیر ہوئی تو پریشان ہو کر آ گیا۔" نفیسہ بیگم بھی مسکرانے لگیں "مجھ سے بہت محبت کرتا ہے۔"

علی رضا پیش خدمت کے ہمراہ کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے حضور بیگم پر نظر پڑتے ہی جھک کر بار بار آداب کیا۔ مزاج پوچھا۔ حضور بیگم نے قریب بلا کر شفقت سے سر پر ہاتھ پھیرا۔ درازیٔ عمر کی دُعا دی اور اپنے پہلو میں بٹھا لیا۔ علی رضا چھریرے بدن کا خوش شکل نوجوان تھا۔ رنگ کھلتا ہوا تھا۔ چہرہ کشش انگیز تھا مگر آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک تھی جس سے شوخی کم، کائیاں پن زیادہ جھلکتا تھا۔ وہ دھاری دار اونی شیروانی اور اسی کپڑے کی سلی ہوئی ٹوپی پہنے ہوئے تھا۔ گردن میں بھی اونی گلوبند پڑا تھا۔

علی رضا دسترخوان پر شرمایا شرمایا بیٹھا تھا اور سر جھکا کر نہایت شائستگی سے آہستہ آہستہ کھانا کھا رہا تھا۔ اس کی ماں نفیسہ بیگم کھانا کھاتے کے ساتھ ساتھ بدستور مُسکرا مُسکرا کر باتیں کر رہی تھیں۔ بیٹے کی آمد کے بعد وہ کچھ زیادہ ہی چہک رہی تھیں۔ مگر حضور بیگم کے چہرے پر سنجیدگی چھائی تھی۔ وہ کم بلکہ بہت کم۔ بول رہی تھیں۔

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد نفیسہ بیگم جب واپس اپنے گھر جانے لگیں تو ساڑھے دس بجنے والے تھے۔ جاتے جاڑوں کی رات سرد اور سنسان ہو

چکی تھی۔ نفیسہ بیگم کے ساتھ حضور بیگم بھی اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ اُن کے چہرے پر سکون چھایا ہُوا تھا۔ وہ مطمئن تھیں کہ خطرہ ٹل گیا۔ اُن کو یقین تھا کہ اب طلعت آرا چھت پر جا چکی ہو گی۔ نفیسہ بیگم سے مڈ بھیڑ ہونے کا کوئی امکان نہ تھا۔

نفیسہ بیگم کو رخصت کرنے حضور بیگم کمرے سے باہر نکلیں۔ وہ نفیسہ بیگم کو گلے لگا کر ڈیوڑھی کے دروازے پر گرمجوشی سے رخصت کرنا چاہتی تھیں مگر دالان میں پہنچتے ہی نفیسہ بیگم ٹھٹکیں۔ بیٹے کو مخاطب کر کے بولیں "علی رضا! تم چلو میں آتی ہوں۔" علی رضا نے کوئی استفسار نہ کیا۔ خاموشی سے آگے بڑھ گیا۔ وہ مُڑ مُڑ کر ادھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ اس کی بے قرار نظریں کسی کو تلاش کر رہی تھیں۔

"اے بھابی جان! میں ذرا طلعت آرا سے تو مل لوں۔" نفیسہ بیگم یہ کہتی ہوئی مڑیں۔ "کہے گی کہ پھوپھی جان نے آ کر طبیعت بھی نہ پوچھی۔ غیروں کی طرح چپ چاپ چلی گئیں۔"

حضور بیگم کا دل دھک سے رہ گیا۔ سخت پریشان ہوئیں۔ سوچا کمرہ تو خالی ہو گا۔ طلعت آرا کو وہاں نہ پایا تو نفیسہ کے پوچھنے پر وہ کیا عذر پیش کریں گی۔ حضور بیگم نے اُن کو روکنا چاہا۔ "نفیسہ بات تو سنو! رات بہت ہو چکی ہے اب وہ سو چکی ہو گی۔ اس کی نیند خراب نہ کرو۔"

"میں اپنی بھتیجی سے ملے بغیر نہیں جاؤں گی۔"

نفیسہ بیگم آگے بڑھیں۔ حضور بیگم ان کے پیچھے چلیں۔ وہ حواس باختہ ہو رہی تھیں۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ نفیسہ بیگم کو کس طرح روکیں۔ مغلانی کے چہرے پر بھی ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ وہ بھی خود کو بے بس اور مجبور محسوس کر رہی تھیں۔

دونوں سوچتی ہی رہ گئیں۔ نفیسہ بیگم بڑھ کر طلعت آرا کے کمرے کے قریب پہنچ گئیں۔ حضور بیگم اور مغلانی کو گمان تھا کہ دروازہ معمول کے مطابق اندر سے بند ہو گا مگر نفیسہ نے ہاتھ سے دھکا دیا تو دروازہ کھل گیا۔ وہ کمرے کے اندر داخل ہو گئیں۔ حضور بیگم بھی اُن کے پیچھے پیچھے اندر داخل ہوئیں۔

مغلانی ایسی سٹپٹائیں کہ اندر جانے کی ہمت نہ ہوئی۔ باہر ہی ٹھہر گئیں۔ آنو بھی اندر نہ گئیں۔ مغلانی کے قریب ہی کھڑی رہیں۔

حضور بیگم کمرے کے اندر پہنچیں تو ششدر رہ گئیں۔ حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ سامنے بستر پر طلعت آرا عنابی مخمل کی رضائی اوڑھے بے خبر سو رہی تھی۔ اس کا چہرہ رضائی سے باہر تھا۔ لانبے لانبے سیاہ بال تکیہ پر بکھرے ہوئے تھے۔ دیوار پر آویزاں دوشاخے سے پھوٹتی ہوئی اُجلی اُجلی روشنی میں طلعت آرا کا چہرہ ہیرے کی مانند جگمگا رہا تھا۔ اس قدر دلکش اور دلربا نظر آ رہا تھا کہ نفیسہ بیگم اس کی مسہری کے قریب مسحور کھڑی تھیں اور ٹکٹکی باندھے اس کے خوبصورت چہرے کو تک رہی تھیں۔ حضور بیگم نے قریب پہنچ کر بہت مدھم لہجے میں نفیسہ بیگم سے کہا۔ "میں نے تو تم سے پہلے ہی کہا تھا کہ اب وہ سو چکی ہو گی۔" اُن کی آواز پر سکون اور سنبھلی ہوئی تھی۔ چہرے سے سراسیمگی کا غبار چھٹ چکا تھا۔

"ہاں بھابی جان! آپ نے بالکل درست فرمایا تھا۔" نفیسہ بیگم نے سرگوشی کی۔ "کس قدر گہری نیند سو رہی ہے۔ اسے کچھ خبر نہیں۔" وہ مڑیں اور آگے بڑھتے ہوئے ہولے سے گویا ہوئیں۔ "اُسے اب آرام ہی کرنے دیجئے۔"

حضور بیگم بھی نفیسہ بیگم کے ساتھ ساتھ دروازے کی جانب بڑھیں۔ نفیسہ بیگم نے آگے بڑھتے بڑھتے پلٹ کر طلعت آرا کی جانب دیکھا۔ رکیں اور حضور بیگم کی جانب دیکھتے ہوئے تڑپ کر بولیں۔ "بھابی جان! اس چاند کے ٹکڑے کو تو میں اپنی بہو بنا کر لے جاؤں گی۔ میرے آنگن میں اُجالا ہو جائے گا۔" اُن کے لہجے میں دفعتاً رقت اور عاجزی پیدا ہو گئی۔ "آپ کے قدموں پر اپنا دوپٹہ ڈال کر اسے مانگوں گی۔" وہ بہت جذباتی ہو گئی تھیں۔

"کمرے سے باہر تو آؤ۔" حضور بیگم نے دہلیز عبور کرتے ہوئے بے رُخی سے کہا۔ "یہ کوئی بات کرنے کی جگہ ہے۔" وہ باہر چلی گئیں۔

نفیسہ بیگم کچھ نہ بولیں۔ چپ چاپ کمرے سے باہر آگئیں اور حضور بیگم کے قریب

پہنچ گئیں۔ دونوں خاموشی سے آگے بڑھتی رہیں، دالان سے گزر کر صحن میں پہنچ گئیں۔

☆

نفیسہ بیگم کو رخصت کرنے کے بعد حضور بیگم ایک بار پھر طلعت آرا کے کمرے میں پہنچیں۔ وہ ہنوز گہری نیند میں تھی۔ حضور بیگم کچھ دیر خاموش کھڑی بیٹی کے چہرے کو محبت سے تکتی رہیں۔ مامتا نے جوش مارا، آگے بڑھیں، جھک کر اس کی شفاف پیشانی کو چوما اور چپ چاپ باہر چلی گئیں۔ انہوں نے دروازے کے کھلے ہوئے پٹ آہستہ سے بھیڑ دیئے۔

وہ اس وقت بہت خوش و خرم نظر آ رہی تھیں۔ اُن کے مرجھائے ہوئے چہرے پر رونق آ گئی تھی۔ بات بات پر مسکراتیں۔ اسی عالم میں اپنی خواب گاہ میں پہنچیں اور پاؤں پسار کر نرم، نرم بستر پر لیٹ گئیں۔ مغلانی بھی پیچھے پیچھے کمرے میں پہنچ گئیں۔ وہ بھی نہایت مطمئن اور پرسکون نظر آ رہی تھیں۔

بستر پر لیٹتے ہی حضور بیگم کی آنکھ لگ گئی۔ مسلسل شب بیداری کے بعد آج وہ پہلی بار گہری نیند سو رہی تھیں۔ مغلانی خاموشی سے اٹھیں اور باہر چلی گئیں۔ ان کی آنکھیں بھی نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں۔

رات کے پچھلے پہر حضور بیگم کی آنکھ کھل گئی۔ وہ کچھ دیر بستر پر دم بخود لیٹی رہیں پھر اُٹھ کر بیٹھ گئیں۔ بستر سے نیچے اُتریں۔ زیر پائی پہنی، شال اوڑھی، آہستہ سے کنڈی کھولی، کمرے سے باہر نکلیں۔ ہر طرف ہو کا عالم طاری تھا۔ بارہ دری میں سب ہی اپنے اپنے کمروں اور کوٹھڑیوں کے دروازے بند کئے بے خبر سو رہے تھے۔ وہ ہولے ہولے قدم اٹھاتی ہوئی طلعت آرا کے کمرے میں پہنچیں۔ ہاتھ رکھتے ہی دروازہ کھل گیا۔ انہوں نے گردن آگے بڑھا کر اندر دیکھا۔ طلعت آرا ابھی تک گہری نیند میں تھی۔ اُسے کچھ خبر نہ تھی۔

طلعت آرا اس رات چھت پر نہ گئی۔ دوسرے روز بھی نہ گئی، تیسرے روز بھی

نہ گئی۔ حضور بیگم رات کے سنّاٹے میں بار بار اُٹھتیں۔ خاموشی سے اس کے کمرے میں جھانکتیں، اُسے بستر پر سوتا ہُوا پاتیں اور مطمئن ہو کر واپس آجاتیں۔

دن گزرتے رہے۔ جمعرات آگئی۔ حضور بیگم نے نہا دھو کر لباس تبدیل کیا اور دن ڈھلے ملکہ زمانی کی کربلا اور درگاہ حضرت عباس علمدار کی جانب روانہ ہو گئیں۔ درگاہ سے واپسی پر راستے میں خورشید جہاں کا گھر پڑتا تھا۔ وہ ان کے پاس چلی گئیں۔ دُلاری دو بار آچکی تھی۔ طلعت آرا کے رشتے کے لئے جو رقعہ دے گئی تھی اس کے بارے میں جواب چاہتی تھی۔ حضور بیگم برابر اُسے ٹالتی رہیں اب ذرا یکسوئی نصیب ہوئی تو انہوں نے رشتے کے متعلق ضروری معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی۔

حضور بیگم دیر تک خورشید جہاں کے پاس ٹھہریں۔ اصرار کرنے پر رات کا کھانا بھی اُن کے ساتھ دسترخوان پر بیٹھ کر کھایا۔

حضور بیگم واپس بارہ دری میں پہنچیں تو پہر رات گزر چکی تھی۔ مغلانی بے چینی سے ان کا انتظار کر رہی تھیں۔ دیکھتے ہی دریافت کیا۔ "سرکار! آج تو آپ بہت دیر سے لوٹیں۔ طبیعت پریشان ہو رہی تھی۔"

"خورشید جہاں کے پاس چلی گئی تھی۔" حضور بیگم نے مسکرا کر بتایا۔ "وہیں اتنی دیر ہوگئی۔ وہ تو اٹھنے ہی نہ دیتی تھی۔ بڑی مشکل سے پیچھا چھڑایا۔"

حضور بیگم نشست گاہ میں پہنچیں اور گاؤ تکیہ کا سہارا لے کر مسند پر بیٹھ گئیں وہ تھکی ہوئی اور نڈھال نظر آرہی تھیں۔ مغلانی بھی چُپ چُپ تھیں۔ حضور بیگم نے غور کیا، ان کا چہرہ اُترا ہوا تھا۔ حضور بیگم نے دریافت کیا۔ "کیا بات ہے بی مغلانی! تم کچھ پریشان نظر آرہی ہو؟" اُن کے لہجے سے تشویش آشکارہ تھی۔

"سرکار! کچھ ہی دیر پہلے چھوٹی سرکار اُوپر چلی گئیں۔" اُن کی آواز تھرتھرا رہی تھی۔

حضور بیگم نے کچھ نہ کہا۔ دم بخود بیٹھی رہیں۔ اُن کا چہرہ مرجھا کر زرد پڑ گیا۔

(۱۲)

جیٹھ کا تپتا ہوا مہینہ تھا۔ گرمی اپنے شباب پر تھی۔ دن بھر لُو کے جھکّڑ چلتے در و دیوار سے چنگاریاں نکلتیں۔ آسمان پر گرد کا خاکستری غبار چھایا رہتا۔ کوچہ و بازار سنسان ہو جاتے۔

بارہ دری کے تہہ خانے میں سویرے ہی سویرے چھڑکاؤ کر دیا جاتا۔ اگر سوز میں اگر بتیاں سلگا دی جاتیں۔ دن چڑھے، جب دھوپ کی تمازت بڑھ جاتی تو حضور بیگم کسی پیش خدمت کے سہارے سنبھل سنبھل کر سیڑھیاں طے کرتی ہوئی نیچے تہہ خانے میں چلی جاتیں۔ تہہ خانہ جھلسا دینے والی گرمی سے محفوظ رہنے کے لئے مناسب پناہ گاہ تھی۔ اس میں اتنی ٹھنڈک ہوتی کہ عام طور پر پنکھے کی ضرورت نہ پڑتی۔ بادلوں سے ہوا کے ساتھ ساتھ آتی ہوئی مدھم روشنی میں ہلکا ہلکا اندھیرا ہوتا۔ دن ڈھلے تک تہہ خانہ آباد رہتا۔

حضور بیگم کا بھاری بھرکم جسم لاغر پڑ گیا تھا۔ سرخ و سپید چہرہ پیلا ہو گیا تھا۔ ان کی عمر پچاس برس سے تجاوز کر چکی تھی۔ مگر اب بڑھاپا تیزی سے چھانے لگا تھا۔ بالوں میں کہیں کہیں سفیدی جھلکنے لگی تھی۔ گوشت جگہ جگہ سے لٹکنے لگا تھا۔ اُن کی صحت کو گھن لگ چکا تھا۔ کھانا بھی کم کھایا جاتا۔ بھوک اُڑ گئی تھی۔ طلعت آرا کا غم ان کی روح کا ناسور بن گیا تھا۔

طلعت آرا کا اب یہ معمول بن گیا تھا کہ ہر جمعرات کو پہر رات گزرتے، ہی زینے میں داخل ہوتی۔ ساری رات بالائی منزل پر بسر کرتی اور صبح کاذب کے دھندلکے میں نہایت خاموشی سے واپس آ جاتی۔ اس کا بیشتر وقت اپنے کمرے ہی میں گزرتا۔ وہ بات چیت بھی کم بلکہ بہت کم کرتی۔ ہر وقت گم صم اور کھوئی کھوئی سی نظر آتی۔ اس کی آنکھوں میں ویرانی برستی تھی اور دلکش چہرہ دھواں دھواں دکھائی

۱:۰۰ ۱

نجّو اس کے پاس جاتی چھیڑ چھیڑ کر بات نکالتی۔ کرید کرید کر پوچھتی مگر طلعت آرا چپ رہتی۔ بہت ہوا تو اس کی جانب نظریں اٹھا کر دیکھ لیتی۔ کسی بات کا جواب نہ دیتی۔ نجّو نے ہزار کوشش کی۔ طرح طرح کی قسمیں کھا کر راز داری کا یقین دلایا۔ ٹھٹھول اور ہنسنے ہنسانے کا حربہ استعمال کیا۔ منّت سماجت بھی کی۔ حتیٰ کہ اس کے روبرو پھوٹ پھوٹ کر روئی بھی لیکن طلعت آرا کی پراسرار خاموشی کا طلسم نہ ٹوٹا۔

حضور بیگم کے ساتھ بھی اس کا ایسا ہی رویّہ تھا۔ وہ دوپہر کو اکثر ان کے پاس چلی جاتی۔ گھنٹوں چپ بیٹھی رہتی۔ اپنی بڑی بڑی روشن آنکھوں سے دیواروں کو تکتی رہتی۔ تہہ خانے کی دھندلی دھندلی فضا میں اگر بتّیوں کا مہکتا ہوا ہلکا ہلکا دھواں لہراتا رہتا۔ وہ اہرام کی کسی حنوط شدہ ممی کی مانند ساکت اور بے جان نظر آتی۔ جون کا سلگتا ہوا گرم مہینہ ختم ہو رہا تھا۔ تمام دن گرم گرم لُو چلتی۔ آسمان دھندلا دُھندلا اور کثیف نظر آتا۔ دُھوپ کی حدّت سے بدن میں شعلے لپکتے۔ بارہ دری پر ہر وقت ہو کا عالم طاری رہتا۔ دوپہر کو یہ خاموشی اس قدر شدّت اختیار کر لیتی کہ در و دیوار سے ویرانی برستی۔ ہر طرف خزاں کے سائے پھیلے ہوئے نظر آتے۔ مغلانی حسنہ بیگم بھی ان دنوں شکستہ اور نڈھال رہتیں۔ انہوں نے نعفانو کے زور دینے پر کئی بار کسی عامل کو بلوانے یا اچھوتی گلی جانے کا حضور بیگم سے ذکر چھیڑا۔ نشیب و فراز سے آگاہ کیا۔ اپنی بساط کے مطابق سمجھایا بجھایا۔ اصرار بھی کیا لیکن حضور بیگم آمادہ نہ ہوئیں۔ انہیں یہ دھڑکا لگا رہتا کہ کسی ایسے اقدام سے کہیں جنّات جلال میں نہ آجائیں اور کوئی ایسی آفت ڈھائیں کہ طلعت آرا کی زندگی خطرے میں پڑ جائے۔

ان کو اپنی جان سے زیادہ بیٹی کی زندگی عزیز تھی۔ صحت دن بدن گرتی جا رہی تھی۔ بار بار اختلاج قلب کا دورہ پڑتا۔ تہہ خانے کے اندر ہوتیں تو دم گھٹتا ہوا محسوس ہوتا۔ ایسا خفقان ہوتا کہ تہہ خانے سے نکل کر باہر آجاتیں۔ ان کی

یہی کیفیت دیکھ کر حکیم صاحب نے مشورہ دیا کہ دن کو بھی وہ تہہ خانے کے بجائے دالان میں آرام کریں۔ چنانچہ پچھلے کچھ دنوں سے ان کا پلنگ ہر دن چڑھے بیرونی دالان کے ایک گوشے میں ڈال دیا جاتا۔ اس پر صاف ستھرا بستر بچھایا جاتا۔ پلنگ کے قریب تخت لگا دیا جاتا جس پر اُن کا پاندان موجود ہوتا۔

تخت سے ذرا ہٹ کر گھڑونچی ہوتی جس پر کوری کوری کاغذی صراحیاں اور جھجریاں رکھی ہوتیں۔ ان پر موتیے اور چنبیلی کے ہار پڑے ہوتے۔ دالان کی محرابوں پر پڑے ہوئے موٹے موٹے پردے لپیٹ کر اُوپر چڑھا دیئے گئے تھے ان کی جگہ خس کی ٹٹیاں لگا دی گئی تھیں۔ کئی خادمائیں تمام دن ٹٹیوں کو پانی چھڑک چھڑک کر تر رکھتیں۔ گرم گرم لُو بھیگی ہوئی خس کی ٹٹیوں سے گزرتی تو ٹھنڈک پڑ جاتی۔ دالان کی فضا میں ٹھنڈک کے ساتھ ساتھ خس کی مہک رچی ہوتی۔

حضور بیگم کے بستر کے عین اوپر چھت کی کڑیوں سے بندھا ہُوا فرّاشی پنکھا تھا۔ دو مہریاں تمام دن پنکھے کی ڈوری پکڑے مسلسل کھینچتی رہتیں۔ ہر پانچ گھنٹے بعد ایک مہری کی ڈیوٹی ختم ہو جاتی اور اس کی جگہ تازہ دم مہری سنبھال لیتی۔ رات کو پنکھا کھینچنے والی مہریاں اُن کے علاوہ تھیں۔ حضور بیگم رات بھی اب خواب گاہ کے باہر ہی بسر کرتی تھیں۔ البتہ غروب آفتاب سے کچھ پہلے خس کی ٹٹیاں ہٹا دی جاتیں اور حضور بیگم کا پلنگ بیرونی دالان کے سامنے شہ نشین پر بچھتا۔ شہ نشین کے پختہ فرش کو بھی چھڑکاؤ کر کے ٹھنڈا کر دیا جاتا۔

حکیم صاحب صبح اور شام پابندی سے آتے۔ رمضانو یا گل بدن کے ذریعے حضور بیگم کا حال معلوم کرتے۔ مفرح قلب ادویات تجویز کرتے مگر حضور بیگم کی طبیعت سنبھلنے کے بجائے روز بروز بگڑتی جا رہی تھی۔

(۱۳)

جولائی کا مہینہ لگتے ہی ایک شام بادل گھر کر آئے اور بوندا باندی شروع

ہو گئی رات کو بھی رُک رُک کر ہلکی ہلکی بارش ہوتی رہی۔ صبح ہوئی تو بارش بند ہو چکی تھی مگر ابر چھایا ہُوا تھا۔ ہر طرف مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو پھیلی ہوئی تھی بارش کا پہلا چھینٹا پڑتے ہی گرمی کا زور ٹوٹ گیا۔ لُو کے گرم گرم جھکڑ چلنا بند ہوگئے

اس روز بھی تو چھتری تھی۔ موسم خوشگوار تھا۔ لیکن حضور بیگم کی طبیعت صبح ہی سے خراب تھی۔ دوپہر ہوتے ہوتے نقاہت سے ان پر غشی کے دورے پڑنے لگے۔ دن ڈھلے وہ اور بھی لت پت ہوگئیں۔ حکیم صاحب دو بار آچکے تھے دوا میں بھی تبدیلی کی مگر حضور بیگم کی حالت سنبھلنے کے بجائے اور بگڑ گئی۔

شام ہونے سے پہلے ہی حضور بیگم کا پلنگ دالان سے نکال کر شہ نشین پر بچھا دیا گیا۔ سامنے دور تک پھیلا ہُوا صحن تھا۔ ہوا مدھم تھی اور اس میں ہلکی ہلکی خنکی رچی ہوئی تھی۔ حضور بیگم آنکھیں بند کئے اُجلے اُجلے بستر پر لیٹی تھیں اور رُک رُک کر گہری گہری سانس بھر رہی تھیں۔ بہت دیر سے وہ بالکل خاموش تھیں۔ نہ کسی سے بات کرنے کی کوشش کی نہ کسی جانب توجہ دی۔

طلعت آرا بھی ماں کے پاس آ گئی اور اُن کے قریب ہی پڑے ہوئے مونڈھے پر بیٹھ گئی۔ حضور بیگم نے آنکھیں کھول کر اُسے دیکھا مگر زبان سے کچھ نہ کہا طلعت آرا بھی بُت بنی خاموش بیٹھی رہی۔ حضور بیگم نے آنکھیں بند کرلیں اور اسی حالت میں لیٹی رہیں۔ انہوں نے کروٹ بھی نہ بدلی۔

جب شام کا دھندلکا در و دیوار پر پھیلنے لگا تو خادماؤں نے دالانوں میں لٹکتے ہوئے فانوس اور مرونگ روشن کر دیئے۔ طلعت آرا خاموشی سے اٹھی اور حمام میں چلی گئی۔ حضور بیگم دیر سے بے سدھ پڑی تھیں انہوں نے اچانک آنکھیں کھول دیں۔ مڑ کر دیکھا مگر طلعت آرا کو قریب نہ پایا تو پریشان ہو گئیں۔ وحشت زدہ نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگیں۔

ایک خادمہ سرہانے کھڑی آہستہ آہستہ پنکھا جھل رہی تھی۔ حضور بیگم نے نحیف آواز میں اس سے پُوچھا۔ "اری گلشن! یہ تو بتا طلعت آرا کہاں ہے؟ ابھی تو میرے

پاس بیٹھی تھی:

"سرکار! وہ حمام میں ہیں۔" گلشن نے ادب سے جھک کر مطلع کیا۔ "آج جمعرات ہے نا۔"

حضور بیگم نے مزید پوچھ گچھ نہ کی۔ آنکھیں بند کیں اور کروٹ بدل کر چہرے کا رخ دوسری جانب کر لیا۔ انھوں نے بے قرار ہو کر سرد آہ کھینچی۔ دل میں ایسی ہُوک اُٹھی کر آنکھیں بھر آئیں۔ آنسو ڈھلک ڈھلک کر رخساروں پر ٹپکنے لگے۔ بجّو اُسی وقت اُن کے پاس پہنچی تھی۔ اس نے حضور بیگم کو اس قدر دل گرفتہ دیکھا تو سینے میں بگولا سا منڈلایا۔ وہ ان کو اس رقّت انگیز حالت میں زیادہ دیر نہ دیکھ سکی بے قرار ہو کر سیدھی اپنی کوٹھری میں پہنچی اور دونوں ہاتھوں سے مُنہ چھپا کر بے ساختہ رونے لگی۔

٭

شام کے سناٹے میں حمام سے پانی گرنے کی آواز رُک رُک کر اُبھر رہی تھی۔ طلعت آرا اطمینان سے نہا رہی تھی۔ یکا یک مغلانی نے دروازے پر زور سے دوہتڑ مارا۔ گلوگیر آواز میں کہا۔ "چھوٹی سرکار! آپ تو ادھر پنڈا دھو رہی ہیں۔ ذری جا کر بڑی سرکار کو دیکھئے۔ ان کی کیا حالت ہو رہی ہے۔" وہ آبدیدہ ہو گئیں۔

طلعت آرا نے دروازے کا ایک پٹ ذرا سا کھولا اور اس کی اوٹ سے جھانک کر مغلانی سے کہا۔ "میں کچھ دیر میں آتی ہوں۔" اس نے دروازہ بند کر دیا۔

مغلانی حمّام کے سامنے بُت بنی کھڑی رہیں، پھر دوپٹے کے پلّو سے آنسو پونچھے۔ مڑیں اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی حضور بیگم کی طرف چلی گئیں۔

حضور بیگم اب چُپ چاپ لیٹی تھیں۔ ان کا مُنہ آسمان کی سمت تھا۔ آنکھیں ہنوز بند تھیں۔ ٹھہر ٹھہر کر بہت آہستہ آہستہ سانس لے رہی تھیں۔ اسی اثناء میں طلعت آرا بھی ماں کے پاس پہنچ گئی۔ اس کے بھیگے ہوئے لانبے لانبے بالوں سے پانی کی بوندیں ٹپک رہی تھیں۔ چہرے پر گہری سنجیدگی طاری تھی۔ وہ ماں کے

سرہانے کھڑی خاموشی سے سر کے بالوں کو خشک کرتی رہی۔

مغلانی بھی قریب ہی موجود تھیں۔ انہوں نے جھک کر حضور بیگم کے کان میں کہا۔ "سرکار! ذری آنکھ کھول کر تو دیکھئے۔ چھوٹی سرکار واپس آگئی ہیں۔"

طلعت آرا سرہانے سے ہٹ کر ماں کے سامنے آگئی۔ حضور بیگم آنکھیں بند کئے چند لمحے تک دھیرے دھیرے کراہتی رہیں پھر آنکھیں کھول دیں۔ طلعت آرا کو سامنے پایا تو ٹکٹکی باندھے اس کے چہرے کو تکتی رہیں۔ انہوں نے ہاتھ ہلا کر بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ طلعت آرا خاموشی سے ان کے پہلو میں بیٹھ گئی۔

حضور بیگم نے نقاہت میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہا۔ "طلعت! تم یہیں رہنا" وہ آہستہ آہستہ ہانپنے لگیں۔ "میرا جی، نہ جانے کیسا ہو رہا ہے۔ دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اللہ جانے کیا ہونے والا ہے۔" یہ کہتے کہتے وہ آنکھیں بند کر کے اور زور زور سے ہانپنے لگیں۔

نجو ا بنی کوٹھری سے نکل کر حضور بیگم کے پاس آگئی۔ اس نے طلعت آرا کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے۔ بے قرار ہو کر آنسو بہانے لگی۔ سسکیاں بھرتے ہوئے مدھم لہجے میں گویا ہوئی۔ "چھوٹی سرکار! میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ اللہ کے لئے آج آپ کہیں نہ جائیں۔"

مغلانی نے بھی شفقت سے طلعت آرا کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ عاجزی سے درخواست کی۔ "چھوٹی سرکار! ذری دیکھئے تو بڑی سرکار کی کیا حالت ہو رہی ہے۔ آپ اُدھر چلی گئیں تو ان کے دشمنوں کو کچھ ہو جائے گا۔"

طلعت آرا بُت بنی خاموش بیٹھی رہی اور ساری باتیں سُنتی رہی۔ اس نے کسی بات کا نہ کوئی جواب دیا نہ ماں کی بگڑتی ہوئی حالت دیکھ کر کسی ردّ عمل کا اظہار کیا۔

ہر شخص خاموش تھا۔ ہر لب پر سکوت طاری تھا۔ عین اس وقت جب خاموشی بے حد بوجھل اور صبر آزما ہو گئی تو یکایک طلعت آرا کی آواز اُبھری۔ وہ بھرائی ہوئی

آواز میں کہہ رہی تھی۔ "امّاں جانی! میں کہیں نہیں جاؤں گی۔" اس نے ماں کے سینے پر سر رکھ دیا اور بلک بلک کر رونے لگی۔

نجّو گم صم کھڑی کھوئی کھوئی نظروں سے دونوں کو دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھیں خشک تھیں، ہونٹ آپس میں جڑے ہوئے تھے۔ چہرے پر بلا کا سکوت تھا۔ وہ کچھ دیر اسی عالم میں بت بنی کھڑی رہی پھر آہستہ سے مُڑی اور ایک طرف چلی گئی۔ مغلانی اور خادمائیں طلعت آرا اور حضور بیگم کی جانب اس قدر محویت کے ساتھ متوجہ تھیں کہ کسی نے دھیان بھی نہ دیا کہ وہ کب وہاں سے گئی اور کدھر گئی۔

طلعت آرا ماں کے سینے پر سر رکھے سسکیاں بھرتی رہی۔ حضور بیگم خاموش لیٹی ہوئی رُک رُک کر سانس بھرتی رہیں پھر انھوں نے آنکھیں کھول دیں۔ ایک ہاتھ اٹھا کر طلعت آرا کے سر پر رکھ دیا۔ شفقت سے اس کے بالوں کو ہولے ہولے سہلاتی رہیں۔ آہستہ سے بولیں۔ "میری بچّی! ماں صدقے تو اس طرح نہ رو۔ میرا کلیجہ پھٹا جا رہا ہے۔" اُن کی آواز بھرا گئی۔ آنکھیں بھر آئیں۔

مغلانی نے بڑھ کر طلعت آرا کو اٹھایا۔ منہ ہاتھ دھلایا۔ جلدی سے ٹھنڈا ٹھنڈا صندل کا شربت پلایا۔ طلعت آرا رُک رُک کر دیر تک ہچکیاں بھرتی رہی۔ مغلانی اُسے تسلی دیتی رہیں، دل جوئی کرتی رہیں۔ جب اُسے ذرا قرار آیا تو وہ حضور بیگم کی جانب متوجہ ہوئیں۔ دوا کی ایک خوراک پلائی۔ دوا پی کر حضور بیگم کو بھی سکون ملا۔ چہرے پر چھائی ہوئی مردنی کسی قدر کم ہو گئی۔

٭

اندھیرا آہستہ آہستہ پھیلتا اور بڑھتا جا رہا تھا۔ بارہ دری کی سہ دریوں صحنچیوں اور غلام گردشوں میں کنول اور دوشاخے روشن ہو گئے تھے۔ ہر طرف سایوں کا جال پھیلتا جا رہا تھا۔

ناگاہ گہرے سناٹے میں زینے کے اندر نجّو کی چیخیں سنائی دیں۔ وہ بے قرار ہو کر دہائی دے رہی تھی۔ "ہائے امّاں! میں مری۔" اس کی چیخیں تیز اور تیز ہوتی

گیئں۔ ہر طرف خوف و ہراس طاری ہو گیا۔ ہر چہرہ سہما ہُوا نظر آ رہا تھا۔ نہ کسی کے مُنہ سے آواز نکلی نہ کوئی اپنی جگہ سے ہلا۔ سب کی نگاہیں زینے کی جانب اٹھی ہوئی تھیں۔

مگر مغلانی زیادہ دیر بے حس و حرکت بیٹھی نہ رہ سکیں۔ بد حواس ہو کر اُٹھیں اور ننگے پاؤں دھبڑ دھبڑ کرتی زینے کی جانب لپکیں۔ سیڑھیوں پر بھاری بھاری قدموں کی آہٹ اُبھری۔ نجّو سیڑھیوں پر ٹھوکریں کھاتی، دھم دھم کرتی زینے سے برآمد ہوئی۔ وہ خوف و دہشت سے لرز رہی تھی۔ اس کے قدم ڈگمگائے اور دھڑام سے فرش پر گری۔ اس کے جسم پر وہ سُرخ جوڑا تھا جسے پہن کر طلعت آرا پہلی بار اوپر سے لوٹی تھی۔ آنکھوں میں کاجل تھا۔ سر کے بال سلیقے سے گندھے ہوئے تھے۔ لباس خوشبو سے مہک رہا تھا۔

نجّو کی آنکھوں میں ابھی تک خوف چھایا ہوا تھا۔ وہ فرش پر بے سدھ پڑی ہوئی مُڑ مُڑ کر سہمی ہوئی نظروں سے زینے کی جانب دیکھ رہی تھی جس کی محراب کے نیچے لٹکتی ہوئی قندیل ابھی روشن نہیں کی گئی تھی۔

نجّو اپنی کوٹھری میں دوبارہ کب گئی۔ اس نے کس طرح مغلانی کے صندوق سے سرخ عروسی جوڑا نکال کر پہنا۔ کیسے بناؤ سنگار کیا اور کیوں کر سب کی نظریں بچا کر اندھیرے زینے میں داخل ہوئی، کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ وہ زینے کے سامنے فرش پر پڑی تھی۔ نہ رو رہی تھی نہ بول رہی تھی۔ مغلانی نے اس کی یہ حالت دیکھی تو سر پر دوہتڑ مار کر گریہ و زاری کرنے لگیں:

"ہائے اللہ! کیسا اندھیر ہے، بن ماں باپ کی بچی پر یہ ظلم و ستم۔"

کوئی بھی خوف کے مارے نجّو کے پاس نہ گیا۔ مگر ہرمزی نے جرأت کا مظاہرہ کیا۔ وہ آگے بڑھی، قریب پہنچی۔ نجّو کو تسلی دی۔ سہارا دے کر اٹھایا۔ اب دوسری مامائیں اور لونڈیاں بھی پہنچ گئیں۔ کسی نے کٹورے میں بھر کر پانی دیا۔ کوئی جلدی جلدی پنکھا جھلنے لگی۔

مغلانی اُسے سنبھالے ہوئے آہستہ آہستہ آگے بڑھیں اور بستر پر لٹا دیا۔ ابھی تک خوف سے بنّو کا بدن کپکپا رہا تھا۔ آنکھوں سے سراسیمگی عیاں تھی۔ ہونٹوں پر خاموشی کی مہر لگی ہوئی تھی۔

طلعت آرا ہنوز ماں کے پہلو میں بیٹھی تھی اس کے چہرے پر ویرانی چھائی تھی وہ خوف زدہ نظر آرہی تھی۔ حضور بیگم بھی سہمی ہوئی دم بخود لیٹی تھیں نہ انہوں نے کوئی بات کی نہ کسی سے کچھ پوچھا۔

ہر چہرہ خوف زدہ تھا ہر آنکھ سے ڈر جھلکتا تھا۔ مگر ہرمزی سب سے بے نیاز تھی۔ اس نے نہایت اطمینان سے زینے کی محراب کے بیچوں بیچ لٹکتی ہوئی قندیل روشن کی، مڑی اور اپنی کوٹھری کے سامنے پڑی ہوئی چارپائی پر جا کر بیٹھ گئی۔

سوم

(۱)

آسمان پر بادلوں کا ہلکا ہلکا غبار چھایا تھا۔ اساڑھ کی دھندلی شام سنسان اور بوجھل تھی۔ سناٹا بڑھ گیا تھا۔ ہوا ٹھہری ہوئی تھی۔

بارہ دری پر خوف اور دہشت کا راج تھا۔ حضور بیگم مسہری پر دم بخود لیٹی تھیں۔ طلعت آرا ان کے پہلو میں گم صم بیٹھی تھی۔ اس کا چہرہ مرجھا کر زرد ہو گیا تھا۔ قریب ہی تخت پر مغلانی بھی خاموش بیٹھی تھیں اور پان دان کھولے احتیاط سے پان لگا رہی ہے۔

حضور بیگم کے سرہانے ایک خادمہ کھڑی آہستہ آہستہ پنکھا جھل رہی تھی۔ باورچی خانے سے کھانوں کی تیز خوشبو ابھر کر فضا میں تحلیل ہو رہی تھی۔ باورچن کسی بات پر ناراض تھی اور اس قدر مدھم آواز میں رک رک کر بڑبڑا رہی تھی کہ یہ سمجھنا مشکل تھا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔

ناگاہ ایک پیش خدمت بھاگی بھاگی ڈیوڑھی میں گئی اور واپس آ کر حضور بیگم کو یہ اطلاع دی۔ "سرکار! حیدر گڑھ کی رانی صاحبہ تشریف لائی ہیں۔"

حضور بیگم حیرت زدہ رہ گئیں۔ انہوں نے طلعت آرا کو اپنے کمرے میں جانے کا اشارہ کیا۔ وہ فوراً اٹھ کر چلی گئی۔ حیدر گڑھ کی رانی، ارجمند سلطانہ، رشتے میں طلعت آرا کی ماموں زاد بہن تھیں۔ وہ حضور بیگم کے پھوپھی زاد بھائی، راجہ یاور علی خاں کی بیٹی تھیں۔ حضور بیگم سے صرف چند سال چھوٹی تھیں۔ مگر کاٹھی اتنی اچھی تھی کہ وہ اپنی عمر سے بہت کم نظر آتی تھیں۔ آزاد طبع تھیں اور بے پردہ بھی رہتی تھیں۔ نہ کبھی برقعہ اوڑھا نہ چادر۔ ساڑی باندھتی تھیں۔ چوٹی کے بجائے سر پر پٹے رکھتی تھیں اور نامحرموں سے بے محابہ ملتی تھیں۔ لہٰذا طلعت آرا کا اُن سے پردہ کرایا جاتا تھا۔ ملنا جلنا بھی بہت کم تھا۔ اتنا کم کہ نواب تقی کے انتقال کے بعد وہ آج پہلی بار آئی تھیں۔ حضور بیگم کے حیرت زدہ ہونے کا بھی یہی سبب تھا۔

حضور بیگم نے ارجمند سلطانہ کے بیٹھنے کے لئے آرام کرسی منگوائی اور اپنے پلنگ کے قریب ہی رکھوا دی۔ کسی زمانے میں یہ کرسی نواب صاحب کے لئے مخصوص تھی۔ انتقال سے کچھ عرصہ قبل وہ رات کا کھانا دیوان خانے کے بجائے زنان خانے میں حضور بیگم کے ساتھ کھانے لگے تھے۔ موسم گرما میں کھانے کے بعد وہ اکثر کرسی پر نیم دراز ہو جاتے تے۔ حقّے کی نے مُنہ میں لگا کر آہستہ آہستہ کش لگاتے رہتے۔ اب یہ کرسی بہت کم استعمال میں آتی تھی اور وہ بھی خاص خاص مہمانوں کے لئے۔

ارجمند سلطانہ ڈیوڑھی کے دروازے سے نمودار ہوئیں۔ دو خادمائیں اور ایک مہری ان کے عقب میں چل رہی تھیں۔ صحن عبور کر کے شہ نشین کے پختہ چبوترے پر پہنچیں تو مغلانی نے جھک کر آداب کیا۔ مزاج پوچھا۔ بیٹھنے کو کرسی پیش کی۔ مگر کرسی پر بیٹھنے سے قبل وہ حضور بیگم کے بستر کے پاس پہنچیں۔ آداب کیا۔

حضور بیگم نے گاؤ تکیہ کے سہارے اُٹھنے کی کوشش کی۔

مگر ارجمند سلطانہ نے منع کر دیا۔ مُسکرا کر بولیں۔ "پھوپھی جانی! آپ تکلف نہ کیجئے۔ آرام سے لیٹی رہیئے۔ یہ بتایئے اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟" وہ کرسی پر اطمینان سے بیٹھ گئیں۔ "میں کل ہی نینی تال سے واپس آئی ہوں۔ اس دفعہ

برسات وہاں کچھ جلد ہی شروع ہوگئی۔ میرا واپسی کا پروگرام تو دو ہفتے بعد کا تھا" انھوں نے حضور بیگم کو کمزور اور لاغر دیکھ کر تشویش کا اظہار کیا۔ "آپ تو واقعی کمزور ہوگئی ہیں۔ مجھے تو آپ کی بیماری کی آج صبح اطلاع ملی ورنہ میں عیادت کے لئے پہلے ہی حاضر ہوتی۔"

ایک خادمہ جھٹ پنکھا لے کر آئی اور ارجمند سلطانہ کے عقب میں کھڑے ہوکر آہستہ آہستہ جھلنے لگی۔

حضور بیگم نے نحیف آوازِ میں کہا۔ "ارجمند! اچھا ہوا تم آگئیں۔ میں تو اپنی زندگی سے مایوس ہوگئی ہوں۔" وہ بہت دل گرفتہ ہوگئیں۔ لہجے میں رقت پیدا ہوگئی۔ "سچ کہتی ہوں ارجمند! مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ اب میں بچوں گی نہیں۔"

"پھوپھی جانی! یہ آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔ بیمار کون نہیں پڑتا" ارجمند سلطانہ نے اُن کو تسلی دی۔ "آپ اس قدر پریشان کیوں ہو رہی ہیں؟ طبیعت ایسی خراب تو معلوم نہیں ہوتی۔ ٹھیک ہو جائے گی۔ خواہ مخواہ خود کو وہم میں مبتلا نہ کریں۔"

حضور بیگم نے ان سے اپنا دکھ چھپانے کی کوشش نہ کی۔ ان کو بخوبی اندازہ تھا کہ جو کچھ ارجمند سلطانہ سے کہیں گی، وہ ان کی ذات تک محدود رہے گا۔ اس کی کہیں تشہیر نہیں کریں گی۔ یہ ان کی طبیعت کے خلاف تھا۔ نہ وہ کسی کی عیب جوئی کرتی تھیں نہ غیبت اور نہ ہی اس میں دلچسپی رکھتی تھیں۔ اس حیثیت سے وہ دوسری بیگمات اور رئیس زادیوں سے بہت مختلف تھیں۔ عزیز و اقارب سے ان کا میل جول بھی واجبی سا تھا۔ برسوں میں کبھی بھولے بھٹکے کسی کے پاس چلی جاتیں۔ حضور بیگم نے آہ سرد کھینچی۔ چند لمحے ہانپتی رہیں پھر ارجمند سلطانہ کو بتایا۔ "بیماری ویماری کیا ہے۔ مجھے تو طلعت آرا کا غم کھائے جا رہا ہے۔" وہ آگے کچھ نہ کہہ سکیں۔

"طلعت آرا کو کیا ہوگیا؟ خیریت تو ہے؟" ارجمند سلطانہ نے حیران و پریشان ہوکر دریافت کیا۔

حضور بیگم ذرا دیر خاموش لیٹی آہستہ آہستہ سانس لیتی رہیں پھر بجھے ہوئے لہجے میں بولیں۔ "یہ سب کچھ انھی کا کرم ہے جنھوں نے میرا سہاگ اجاڑا۔ اب میری

بچی پر ان کا سایہ ہے۔ آج جمعرات ہے، میں نے اُسے اوپر جانے سے روک لیا ہے۔ دیکھو کیا آفت نازل ہوتی ہے۔" ان کے چہرے پر خوف کے سائے پھیل گئے۔ "سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔ کیسے ان کے اثر سے اپنی بچی کو محفوظ رکھوں۔" اُنھوں نے رازداری سے کام نہ لیا۔ کھل کر دل کا حال بتا دیا۔

ارجمند سلطانہ ان کی باتیں سُن کر ششدر رہ گئیں۔ حالانکہ یہ باتیں پہلے بھی اُن کے کان میں پڑ چکی تھیں اور وہ یہ بھی جانتی تھیں کہ توہم پرستی ان کی گھٹّی میں پڑی تھی۔ وہ غضب کی وہمی اور ضعیف الاعتقاد واقع ہوئی تھیں۔ مگر واقعات کی نوعیت اس قدر مضحکہ خیز تھی کہ یقین ماننے کے لئے وہ ذہنی طور پر کسی طرح تیار نہ تھیں۔ اس اندازِ فکر میں اُن کے رہن سہن اور گرد و پیش کے ماحول کو بھی بہت دخل تھا۔

☆

حضور بیگم جس قدر قدامت پسند اور کم علم تھیں، ارجمند سلطانہ اسی قدر روشن خیال اور تعلیم یافتہ تھیں۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم لکھنؤ کے لارینٹو کونونٹ میں حاصل کی تھی۔ جونیئر کیمبرج، دہرہ دون کیمبرج اسکول سے کر چکی تھیں۔ کچھ عرصہ تک اُن کی تربیت ایک انگریز گورنس کی نگرانی میں بھی ہو چکی تھی۔

ارجمند سلطانہ کی تعلیم و تربیت میں اُن کے والد، یاور علی خان کو بڑا دخل تھا۔ وہ اودھ کے ایک ممتاز تعلقدار تھے۔ ریاست تو ان کی زیادہ بڑی نہ تھی مگر راجہ کہلاتے تھے۔ اُن کے والد بزرگوار بھی تعلقدار تھے اور اس حد تک آزاد خیال بھی تھے کہ اس زمانے میں جب انگریزی تعلیم حاصل کرنا کفر سمجھا جاتا تھا، بیٹے کو بیرسٹری کی تعلیم کے لئے انگلستان بھیجا۔ لیکن یاور علی خان بار ایٹ لا نہ بن سکے۔ تعلیم کو سال بھر بھی نہ گزرا تھا کہ باپ شدید علیل ہو گئے۔ اُنھوں نے بیٹے کو واپس بلا لیا اور اپنی زندگی ہی میں ان کو ریاست کا ولی عہد بھی مقرر کر دیا تھا۔ ویسے بھی وہ اپنے والد کی اکلوتی اولاد تھے۔ نہ کوئی بھائی تھا اور نہ بہن تھی۔

راجہ یاور علی خان تعلیم کے سلسلے میں تو ایک عرصہ تک انگلستان میں قیام کر ہی چکے تھے، بعد میں بھی کئی بار انگلستان اور یورپ کے دورے پر گئے۔ ان کا رہن سہن بھی مغربی طرز کا تھا۔ انگریز افسروں کے ساتھ گہرے مراسم تھے۔ کلب میں اکثر و بیشتر انہی کے ساتھ شام گزارتے تھے۔ ٹینس کے اچھے کھلاڑی تھے۔ وھسکی کے دو چار پگ لگانا۔ برج اور بلیرڈ کھیلنا اُن کے معمولات میں شامل تھا۔ شکار کا نہ صرف شوق تھا بلکہ اعلیٰ حکام کے لئے اپنی ریاست کے گھنے جنگلات میں شکار کا نہایت اہتمام سے بندوبست کرتے تھے۔ اپنے محل کے اندر ان کے اعزاز میں اکثر پُر تکلف کاک ٹیل پارٹیاں اور طرح طرح کی ضیافتیں بھی کرتے رہتے تھے۔

وہ بھی اپنے والد کی طرح انگریز حکمرانوں کے نہ صرف وفادار تھے بلکہ جانثاروں میں شمار کئے جاتے تھے۔ اسی جانثاری سے متاثر ہو کر انگریز گورنر نے ایک بار ان کو صوبائی لیجسلیٹو اسمبلی کا رکن بھی نامزد کیا تھا لیکن وہ یہ اعزاز حاصل نہ کر سکے۔ عین وقت پر قرعہ فال نواب سر احمد سعید خاں چھتاری کے حق میں نکلا۔ ان کی جانثاری زیادہ معتبر اور مستند تھی اور اس حد تک تھی کہ وہ ترقی کر کے کچھ مدت تک گورنر کے منصب پر بھی فائز رہے۔ تاجِ برطانیہ کا ایک ہیرا بن کر رخشندہ اور تابندہ ہوئے۔ نواب چھتاری کے سامنے راجہ یاور علی خان کی تمام خدماتِ جلیلہ دھری کی دھری رہ گئیں۔ اسمبلی کی رکنیت حاصل کرنے کی آرزو آرزو ہی رہ گئی۔

موسم گرما شروع ہوتے ہی یاور علی خان نینی تال یا مسوری چلے جاتے۔ نینی تال میں اُن کی ذاتی کوٹھی بھی تھی۔ لہٰذا عام طور پر نینی تال ہی جاتے تھے۔ بیوی اور بیٹی کو بھی ہمراہ لے جاتے تھے۔ بیوی ان کی گھریلو قسم کی رئیس زادی تھیں۔ تعلیم بھی واجبی سی تھی۔ ان کا بیشتر وقت گھر کی چار دیواری کے اندر ہی گزرتا تھا۔ شوہر کے ساتھ شاذ و نادر نظر آتی تھیں۔ کلب بھی کبھی کبھار جاتی تھیں۔ صرف محل یا کوٹھی میں منعقد ہونے والی پارٹیوں میں شریک ہوتی تھیں اور بادل نخواستہ ہوتی تھیں۔

یاور علی خان نے اپنی بیٹی ارجمند سلطانہ پر کبھی روک ٹوک یا پابندی عائد نہ کی۔

جوان ہونے پر بھی نہ کی۔ وہ آزادی سے گھومتی پھرتیں۔ نینی تال میں ہوتیں تو جھیل پر کشتی رانی کرتیں۔ تلّی تال سے ملّی تال اور ملّی تال سے تلّی تال تک جاتیں۔ کئی کئی گھنٹے مسلسل کشتی کے پتوار چلانے سے اُن کے ہاتھوں کے رگ پٹھے مضبوط اور سڈول ہو گئے تھے۔ صبح شام جھیل کے کنارے گھڑ سواری کرتیں۔ یاٹ کلب کی باقاعدہ ممبر تھیں۔ بادبانی کشتیوں کی دوڑ ہوتی تو اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتیں۔

ماں ان کی آزادی اور بے حجابی دیکھ کر دل ہی دل میں کڑھتیں۔ بارہا اپنی ناپسندیدگی اور خفگی کا اظہار بھی کیا۔ فہمائش کی۔ سمجھایا بجھایا مگر ارجمند سلطانہ نے اپنی روش نہ بدلی۔ ان کو باپ کی پوری پوری تائید و حمایت حاصل تھی۔ اکلوتی اولاد تھیں۔ لاڈ پیار حد سے زیادہ تھا۔ ماں اُن کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر ایسی دل برداشتہ ہوتیں کہ اندر ہی اندر سلگتی رہتیں۔ حتیٰ کہ سرطان کے مرض میں مبتلا ہو کر ایک روز دُنیا سے رخصت ہو گئیں۔

بیوی کے انتقال کے بعد یاور علی خان نے دوسری شادی نہ کی۔ موقع ہی نہ ملا۔ دو برس بھی نہ گزرے تھے کہ ایک روز نینی تال سے لکھنؤ واپس آ رہے تھے۔ شام ہو چکی تھی۔ ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ لہٰذا سڑک پر پھسلن تھی۔ ڈرائیور نے منع بھی کیا مگر انھوں نے ایک نہ سنی۔ ڈرائیور کو پچھلی نشست پر بٹھایا، اسٹیرنگ وھیل سنبھالا اور خود کار چلانے لگے۔ ایک موڑ کاٹتے ہوئے کار قابو سے باہر ہو گئی۔ سینکڑوں فٹ نیچے کھڈ میں گر کر چکنا چور ہو گئی۔ ڈرائیور تو بچ گیا۔ مگر راجہ یاور علی خان نہ بچ سکے۔ وہ حیدر گڑھ کی ریاست ارجمند سلطانہ کے لئے ورثہ میں چھوڑ کر دارِ فانی سے عالمِ جاودانی کو کوچ کر گئے۔

☆

حضور بیگم کروٹ کے بل خاموش لیٹی تھیں۔ ایک خادمہ گلاس میں شربت لے کر آئی۔ جھک کر نہایت ادب سے ارجمند سلطانہ کو پیش کیا۔ اُنھوں نے گلاس اُٹھایا۔ گھونٹ بھرا۔ مڑ کر سامنے بستر پر لیٹی ہوئی حضور بیگم کو دیکھا۔ زیرِ لب مسکرائیں۔ انجان

بن کر گویا ہوئیں۔

"پھوپھی جانی! آپ کا مطلب ہے کہ طلعت آرا کو جنوں دلوں نے پریشان کر رکھا ہے۔"

"رات کے وقت ان کا نام نہیں لیا کرتے۔" حضور بیگم نے تیکھے لہجے میں فوراً فہمائش کی۔

"رات کے وقت جنوں کا نام لینے سے کیا ہوتا ہے؟" ارجمند سلطانہ نے حضور بیگم کو مسکرا کر چھیڑا۔

"تم باز نہیں آؤ گی۔" حضور بیگم بگڑ کر بولیں۔

ارجمند سلطانہ اُن کی خفگی سے مرعوب نہ ہوئیں۔ بے نیازی سے گویا ہوئیں۔ "پھوپھی جانی! آپ کو جنوں کا وہم ہو گیا ہے۔" اُنھوں نے شربت کا گھونٹ بھرا۔ "اس وقت تو امّی سرکار یاد آگئیں۔ اکثر کہا کرتی تھیں کہ وہم کا علاج تو حکیم لقمان کے بھی پاس نہیں۔ معلوم نہیں یہ قبلہ وکعبہ حکیم لقمان کون بزرگوار تھے۔" اُن کے لہجے سے طنز آشکارہ تھا۔ "اور پھوپھی جانی یہ جن کیا ہوتے ہیں؟"

"تم ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتیں۔ تم کو کیا خبر کہ میں کس مصیبت میں مبتلا ہوں۔" ان کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ "بی بی! جس پر پڑتی ہے، وہی جانتا ہے۔ ابھی تمھارا سابقہ نہیں پڑا۔"

ارجمند سلطانہ نے اُن کی خفگی کا ذرا بھی بُرا نہ مانا۔ بے تکلفی سے ہنس کر بولیں۔ "آپ نے یہ تو سُنا ہی ہو گا کہ میں پاپا کے ساتھ شکار پر اکثر جایا کرتی تھی۔ جن کیا چیز ہے، میں تو ایک بار شیر کا بھی شکار کر چکی ہوں۔ پہلے ہی فائر میں ڈھیر ہو گیا۔ میرے پاس آج بھی ایسے خونخوار شکاری کُتّے موجود ہیں۔ کسی جن دِن کو دیکھ لیں تو چیر پھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیں۔"

ابھی وہ جانے اور کیا کیا کہتیں۔ مگر حضور بیگم نے حواس باختہ ہو کر ٹوکا۔ "ہے ہے۔ ارجمند تم کو کیا ہو گیا ہے۔ خدا کے لئے اپنی زبان قابو میں رکھو۔ ان باتوں کو ہنسی ٹھٹھا نہ سمجھو۔" اُن کے لہجے سے سراسیمگی عیاں تھی۔ "تمھارے آنے سے ذرا ہی دیر پہلے کا ذکر ہے۔ مغلانی کی بھانجی، نجّو کے سر میں نہ جانے کیا سمائی، زینے میں چلی گئی۔ اُسے

ہنٹر سے اس بُری طرح مارا کہ سارے بدن پر بلٹیں پڑ گئیں۔ یہ مغلانی موجود ہیں۔ ان سے پوچھ لو۔" اُنھوں نے تخت پر بیٹھی ہوئی مغلانی کی جانب ہاتھ اُٹھا کر اشارہ کیا۔" سب کا چشم دید واقعہ ہے۔ میں تم کو کیا کیا بتاؤں۔" ان کا چہرہ خوف سے زرد پڑ گیا۔

"اے ہاں سرکار!" مغلانی نے فوراً حضور بیگم کی تائید کی۔" میری بچّی کی مار مار کر کھال ادھیڑ ڈالی۔" اُنھوں نے اونچی آواز سے بنّو کو پکارا" بنّو" اے بنّو! بیٹی ذری یہاں تو آؤ۔"

بنّو اپنی کوٹھری سے نکل کر آہستہ آہستہ چلتی ہوئی حضور بیگم کے روبرو پہنچ گئی۔ اس کے بشرے سے ابھی تک دہشت ٹپک رہی تھی۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ آنکھیں خوف سے سہمی ہوئی تھیں حالانکہ اب وہ سرخ جوڑا تبدیل کر کے اپنا روزمرّہ کا عام لباس پہنے ہوئے تھی۔ مغلانی نے مُنہ ہاتھ دھلا کر ٹھنڈا پانی بھی پلایا تھا۔ دلجوئی بھی کی تھی لیکن وہ ابھی تک خوفزدہ اور گھبرائی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

مغلانی نے اُسے قریب بلایا اور اس کی زخمی پیٹھ دکھا کر بولیں۔ "آپ خود دیکھ لیجئے یہ قسمت کی ماری، خدا معلوم کیوں وہاں چلی گئی۔ اتنی سی بات کی یہ سزا ملی۔"

ارجمند سلطانہ نے بنّو کی پیٹھ پر نیلی نیلی بلٹیں دیکھیں تو حیرت زدہ رہ گئیں۔ واقعات کی نوعیت اب خاصی پُراسرار ہو گئی تھی۔ حضور بیگم کی پریشانی بے سبب نہ تھی۔ اُنھوں نے جو کچھ کہا تھا، اس کا جیتا جاگتا ثبوت بنّو کی زخمی پیٹھ کی صورت میں ان کے سامنے موجود تھا۔ اُنھوں نے کسی فوری ردِّ عمل کا اظہار نہ کیا۔ خاموش بیٹھی سوچتی رہیں کہ آخر یہ راز کیا ہے۔ جنوں بھوتوں کے وجود پر نہ ان کو پہلے کبھی اعتقاد تھا نہ ہی بنّو کی مار کا واقعہ سُن کر کوئی فرق پیدا ہُوا۔ البتّہ یہ ضرور ہوا کہ وہ کسی حد تک شش و پنج میں مبتلا ہو گئیں۔

حضور بیگم نے ارجمند سلطانہ کو خاموش پایا تو اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کی کوشش کی۔" اب تو تم نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔" اُنھوں نے بنّو کو واپس کوٹھری میں جانے کا اشارہ کیا۔ وہ چلی گئی تو اُنھوں نے آہ سرد کھینچی۔ رقّت انگیز لہجے میں بولیں۔" آج اُوپر جانے کا ناغہ ہو گیا اور وہ بھی نوچندی جمعرات کو۔ نہ جانے کیا آفت نازل ہو۔ میری بچّی کو اللہ اپنی امان میں رکھے۔ میرا تو دل بیٹھا جا رہا ہے۔" اُنھوں نے

ارجمند سلطانہ کو مخاطب کیا۔ "ارجمند! تم جانا نہیں۔ تمھارے آنے سے بڑی ڈھارس ہو گئی ہے۔" ان کے لہجے میں التجا تھی۔

"نہیں پھوپھی جانی! میں ابھی نہیں جاؤں گی۔ آپ اطمینان رکھیں۔" ارجمند سلطانہ نے حضور بیگم کو تسلی دی۔ "آپ پریشان نہ ہوں۔" اُنھوں نے تامّل کیا۔ "مگر اتنا ضرور کہوں گی، یہ ساری باتیں مجھے بڑی عجیب و غریب معلوم ہو رہی ہیں۔"

حضور بیگم خاموش رہیں۔ مگر ارجمند سلطانہ خاموش نہ رہ سکیں، کہنے لگیں۔ "میں اس سلسلے میں خود طلعت آرا سے بات کرنا چاہتی ہوں۔ وہ ہے کہاں؟" اُنھوں نے گردن گھما پھرا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔

حضور بیگم کشمکش میں مبتلا ہو گئیں۔ وہ طلعت آرا کو ارجمند سلطانہ کے سامنے کرنا نہ چاہتی تھیں اور نہ انکار کر کے ان کی دل آزاری کرنا چاہتی تھیں۔ وہ دم بخود بیٹھی سوچتی رہیں کہ کیا جواب دیں۔

ارجمند سلطانہ نے رُک رُک کر طلعت آرا کو پکارا۔ "طلعت آرا! ذرا یہاں تو آؤ۔ تم کو تو دیکھے ہوئے ایک مدّت ہو گئی۔"

مغلانی نے ارجمند سلطانہ کی توجہ طلعت آرا کی جانب سے ہٹانے کے لئے جھٹ پان کی گلوری پیش کی۔

"شکریہ!" ارجمند سلطانہ نے شائستگی سے انکار کر دیا۔ "مغلانی جی! آپ کو شاید معلوم نہیں میں پان نہیں کھاتی۔" وہ کھل کر مسکرائیں۔ "بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ میں اس نعمت سے محروم ہوں۔"

حضور بیگم نے دل ہی دل میں مغلانی کی معاملہ فہمی کی داد دی۔ سوچنے لگیں کہ مشکل ٹل گئی۔ مگر مشکل ٹلی نہیں۔ دفعتہً دالان کے سنّاٹے میں قدموں کی آہٹ اُبھری۔ طلعت آرا کمرے سے نکل کر حضور بیگم کی سمت آرہی تھی۔ اُسے دیکھ کر حضور بیگم اور مغلانی دونوں ہکّا بکّا رہ گئیں۔

طلعت آرا قریب پہنچی۔ جھک کر ارجمند سلطانہ کو آداب کیا اور نگاہیں نیچی کر کے اُن

کے روبرو مودب ہو کر کھڑی ہو گئی۔ بارہ دری پر خاموشی چھائی تھی۔ دالانوں کے اونچے اونچے ستون سر اٹھائے کھڑے تھے۔ فانوسوں کی روشنی میں محرابوں کی پرچھائیوں نے خوابوں کا جال بچھا دیا تھا۔ طلعت آرا کے دل آویز چہرے پر چاندنی راتوں کا عکس تھا۔ نیم روشن سایوں کا ہلکا ہلکا غبار اور ایسی دل فریب معصومیت کہ ارجمند سلطانہ مبہوت ہو کر اُسے دیکھنے لگیں۔

بلور کی طرح نفاست سے ترشے ہوئے سبک خدوخال اور بڑی بڑی روشن آنکھیں۔ وہ کسی یونانی دیوی کی طرح استادہ تھی۔ ارجمند سلطانہ کو بے اختیار پیار آگیا۔ وہ اُٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔ طلعت آرا کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیر کر بولیں: "بھئی طلعت! مجھے بلائیں دلائیں تو لینا آتی نہیں ورنہ میں تم پر نچھاور ہو جاتی۔ فی الحال، تم اُسے قبول کرو۔" اُنھوں نے گلے سے قیمتی موتیوں کا ست لڑا ہار اُتارا اور طلعت آرا کی گردن میں ڈال دیا۔

حضور بیگم نے دخل دیا۔ "اے ارجمند! یہ تم کیا کر رہی ہو؟"

"یہ بڑی، چھوٹی بہن کا معاملہ ہے۔ آپ اس میں نہ بولیں۔" وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے زیرلب مسکرائیں۔ "طلعت کھڑی کیوں ہو؟ تم بھی بیٹھ جاؤ۔"

طلعت آرا بھی ماں کے بستر پر ان کے قریب ہی بیٹھ گئی۔ ارجمند سلطانہ نے اُسے مخاطب کیا۔ "ہاں بھئی طلعت آرا! اب یہ بتاؤ کہ تم نے خواہ مخواہ پھوپھی جانی کو پریشانی میں کیوں مبتلا کر دیا ہے؟ ذرا دیکھو تو ان کی کیا حالت ہو گئی ہے۔"

طلعت آرا نے زبان سے ایک لفظ نہ نکالا۔ نگاہیں جھکائے خاموش بیٹھی رہی۔

ارجمند سلطانہ نے اصرار کر کے پوچھا۔ "طلعت آرا! میری پیاری بہن!" اُن کے لہجے میں محبت کی شیرینی گھلی ہوئی تھی۔ "خدا کے لئے کچھ تو بتاؤ۔ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ اپنی سمجھ میں تو یہ مسٹری آتی نہیں۔"

اس دفعہ طلعت آرا نے ارجمند سلطانہ کی جانب دیکھا۔ اُٹھی اور اُن کے کندھے پر سر رکھ کر گلوگیر آواز میں بولی۔ "رانی بجیا! خدا کے لئے مجھے بچا لیجئے۔ نہیں تو میں مر جاؤں گی۔" وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگی۔

ارجمند سلطانہ نے اُٹھ کر اُسے بے ساختہ اپنے سینے سے لگا لیا۔ اُنھوں نے اپنے دل میں شفقت سے زیادہ مامتا کا جذبہ محسوس کیا۔ ایسی رقت طاری ہوئی کہ آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔ بھرائی ہوئی آواز میں بولیں۔ ”طلعت! تو اس قدر مایوس کیوں ہوتی ہے۔ میں تو موجود ہوں۔ تیری بڑی بہن، تیری محافظ۔“ اُن پر ایسی رقت طاری ہوئی کہ آنسو ڈھلک کر رخساروں پر گرنے لگے۔

بارہ دری پر گہرا سکوت طاری تھا۔ رات تاریک تھی اور ہوا دم بخود۔ کبھی کبھی کوئی بھولا بھٹکا جھونکا آتا تو مولسری کے پتے اس طرح کھڑکھڑاتے، جیسے کوئی دبے دبے قدموں صحن میں چل رہا ہو۔

طلعت آرا کی سسکیاں رُک رُک کر خاموشی میں اُبھر رہی تھیں۔ حضور بیگم گم صُم بیٹھی رہیں مگر مغلانی نے فرض شناسی کا ثبوت دیا۔ تخت سے نیچے اُتریں۔ دونوں کے قریب پہنچیں۔ طلعت آرا کو چمکار کر علیٰحدہ کیا۔ پانی منگوا کر پلایا۔

طلعت آرا اپنی جگہ پر بیٹھ گئی۔ ارجمند سلطانہ آنسو پونچھتی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئیں۔ اُن کی آنکھیں سوچتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔ چہرے پر گہری سنجیدگی طاری تھی۔ نچلا ہونٹ آہستہ آہستہ لرز رہا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ کسی شدید ذہنی اُلجھن میں مبتلا ہیں۔

سب خاموش تھے۔ نہ کوئی بول رہا تھا نہ بات کر رہا تھا۔ ہر چہرہ سوچ میں ڈوبا ہُوا تھا۔ ہر آنکھ بجھی بجھی تھی۔ یکایک ارجمند سلطانہ اُٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔ مڑیں اور اس صحنچی کی جانب بڑھنے لگیں جو زینے کے قریب تھی۔

”ارجمند! کہاں چلیں؟“ حضور بیگم نے ان کو ٹوکا۔

”میں اُوپر جا رہی ہوں۔“ اُنھوں نے ایک ہاتھ اُٹھا کر چھت کی جانب اشارہ کیا۔

حضور بیگم حواس باختہ ہو کر چیخنے لگیں۔ ”ہے، ہے ارجمند! کیا غضب کر رہی ہو۔ تم کو میری جان کی قسم جو آگے قدم بڑھایا۔“ وہ اُٹھ کر بستر پر بیٹھ گئیں۔

ارجمند سلطانہ نے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ آگے اور آگے بڑھتی گئیں۔ صحنچی سے گزر کر

زینے کی محراب کے نیچے پہنچیں اور جھپاک سے زینے کے اندر داخل ہو گئیں۔ وہ سیڑھیوں پر سنبھل سنبھل کر قدم رکھتی ہوئی اوپر چڑھنے لگیں۔

حضور بیگم سہمی ہوئی بیٹھی تھیں اور دہشت زدہ نظروں سے ٹکٹکی باندھے زینے کی محراب کی سمت دیکھ رہی تھیں۔

☆

زینے میں ویرانی برس رہی تھی۔ خاموشی ایسی نامانوس تھی کہ دم گھٹتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ محراب کے نیچے لٹکتی ہوئی قندیل کی زرد، زرد روشنی میں سیڑھیاں صاف نظر آ رہی تھیں۔ سیڑھیاں کشادہ اور بڑی بڑی تھیں مگر اب بوسیدہ ہو گئی تھیں۔ کہیں کہیں سے ٹوٹ پھوٹ بھی گئی تھیں۔

ارجمند سلطانہ سنبھل سنبھل کر قدم رکھتی ہوئی دو چھتی تک پہنچ گئیں۔ اُنھوں نے نظریں اُٹھا کر دو چھتی کے دروازے کو دیکھا جس میں قفل پڑا تھا۔ کواڑوں کا رنگ روغن اُتر چکا تھا۔ دروازے کے آگے مختصر سا تکونا چبوترہ تھا۔ ارجمند سلطانہ لمحہ بھر کے لئے چبوترے پر رُکیں۔ پھر آگے بڑھیں۔ زینہ ذرا سا خم کھاتا ہوا اوپر جاتا تھا۔ تنگ بھی ہو گیا تھا۔ روشنی رفتہ رفتہ دھندلی پڑتی جا رہی تھی۔ میلی میلی دیواروں پر پرچھائیاں لہراتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔

وہ کہیں رُکی نہیں۔ البتہ اب زیادہ احتیاط سے قدم اُٹھانا پڑ رہے تھے۔ روشنی برابر کم ہوتی جا رہی تھی۔ اندھیرا بڑھ گیا تھا۔ ایک شکستہ سیڑھی پر ان کا قدم کچھ اس طرح پڑا کہ ڈگمگا گئیں۔ مگر اُنھوں نے دیوار کا سہارا لے کر خود کو سنبھال لیا۔ کچھ گھبرا بھی گئیں۔ ٹھٹکیں، مُڑ کے پیچھے دیکھا۔ قندیل کا صرف نچلا حصّہ نظر آ رہا تھا جس کی مدھم روشنی میں سیڑھیاں دُھندلی دُھندلی لکیروں کی مانند نظر آ رہی تھیں۔

ارجمند سلطانہ نے قدم اُٹھایا۔ آگے بڑھیں اور آخری سیڑھی پر پہنچ کر دم لیا۔ ان کی سانس پھُولی ہوئی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ ہانپ رہی تھیں۔ پیشانی پر پسینے کی نمی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ گھُپ اندھیرے میں کھڑی تھیں۔ آگے دروازہ تھا جو چھت پر کھُلتا تھا۔

دروازہ بند تھا۔ اُنھوں نے دروازہ کھولنے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو کسی انجانے خوف سے تمام جسم جھن جھنا اُٹھا۔ ہاتھ ہولے ہولے کپکپانے لگا۔

ارجمند سلطانہ نے حوصلے سے کام لیا۔ خُود کو سنبھالا۔ دروازے پر ہاتھ رکھ کر آہستہ سے دھکّا دیا۔ دروازہ چر چراتا ہوا کھُل گیا۔ تازہ ہَوا کا جھونکا آیا تو تازگی محسوس ہوئی، حواس بجا ہوئے۔ اُنھوں نے دہلیز کو عبُور کیا اور چھت پر پہنچ گئیں۔ پھیکی پھیکی چاندنی میں ہر طرف سنّاٹا چھایا تھا۔ دُور دُور تک چٹیل چھت پھیلی ہوئی تھی۔ اُونچی اُونچی دیواریں دم بخود کھڑی تھیں۔

وہ دروازے کے قریب ہی ٹھہر گئیں اور گومگو کے عالم میں سوچنے لگیں کہ اب کیا کیا جائے ؟ اجنبی جگہ تھی اور ایسا آسیب زدہ ماحول تھا کہ کسی اَن جانے خوف سے ان کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ وہ پہلی بار چھت پر آئی تھیں۔ یہاں آنے کی کبھی ضرورت ہی نہ پڑی۔ ویسے بھی بارہ دری میں اُن کی آمدورفت کم، بلکہ بہت کم رہی تھی۔ کبھی آتیں بھی تو گھڑی، دو گھڑی حضور بیگم کے پاس بیٹھ کر چلی جاتیں۔ باتوں باتوں میں اُن کی زبانی جو کچھ سُنا تھا، وہ یہ تھا کہ اُوپر کی منزل پر دو کشادہ کمرے تھے جو گرمیوں میں نواب تقی مرحوم کے استعمال میں رہتے تھے اور وہ بھی صرف شب باشی کے لئے۔ مگر انتقال کے بعد اُن کا سامان کمروں میں بند کر کے دروازوں پر تالے ڈال دیئے گئے تھے۔

نواب تقی کی پُر اسرار موت نے اس قدر دہشت طاری کر دی تھی کہ اوپر کی منزل پر جانے سے سب ہی ڈرتے تھے۔ اس خوف اور دہشت کو پھیلانے میں سب سے بڑا ہاتھ خود حضور بیگم کا تھا۔ اُن کا خیال تھا کہ اُوپر کی منزل پر جنوں کا قبضہ ہے۔ اُنھوں نے اسے اپنا مسکن بنا رکھا ہے۔ نواب تقی کی موت کا سبب بھی وہ جنوں کو قرار دیتی تھیں اور یہ یقین دلانے کی کوشش کرتی تھیں کہ نواب تقی سے نادانستگی میں کوئی بے ادبی ہوگئی۔ جنوں نے جلال میں آکر اُن کا کلیجہ چبا ڈالا۔ حالانکہ خاندانی طبیب کا کہنا تھا کہ نواب تقی کی موت حرکت قلب بند ہو جانے سے واقع ہوئی تھی مگر وہ یہ تشخیص نہ کر سکے تھے کہ انتقال سے پہلے اُنھوں نے خُون کی قے کیوں کی تھی۔ یہ راز، راز ہی رہا اور اسی کی

بُنیاد پر حضور بیگم نے اگر نواب صاحب کی موت کا ذمّہ دار جِنوں کو ٹھہرایا تھا تو دوسری طرف ایسی افواہیں بھی سُننے میں آئیں کہ اُن کو زہر دے کر ہلاک کیا گیا تھا۔

ان افواہوں کو سُن کر ارجمند سُلطانہ کے ذہن میں بھی یہ شُبہہ پیدا ہوا تھا کہ نواب تقی طبعی موت نہیں مرے تھے۔ ان کو کسی سازش کے تحت قتل کیا گیا تھا۔ اس سلسلہ میں اُنھوں نے اپنے خاندانی ڈاکٹر سے بھی مشورہ کیا تھا اور اس سے تفصیلی گفتگو کرنے کے بعد اُن کا شُبہہ اس قدر قوی ہو گیا تھا کہ اُنھوں نے نہ صرف پولیس سے رجوُع کرنے بلکہ تجہیز و تکفین سے پہلے لاش کا پوسٹ مارٹم کروانے پر بھی زور دیا تھا۔ مگر حضوُر بیگم آمادہ نہ ہوئیں۔ تڑپ کر بولیں۔ "ہے، ہے۔ کیا غضب ہے۔ میّت کو اب چیرا پھاڑا جائے گا۔ اُس کی بے حُرمتی کی جائے گی۔ مَیں تو جیتے جی یہ ستم برداشت نہیں کروں گی۔" وہ بے قرار ہو کر رونے لگیں۔ ارجمند سُلطانہ نے ان کو سمجھایا بھی تھا۔ "دیکھئے پھوپھی جانی، نہ صرف میرا بلکہ ڈاکٹر اصغر علی زیدی کا بھی یہی خیال ہے کہ پھوپھا جان کی موت جن حالات میں واقع ہوئی ہے، اُن سے یہ شُبہہ پیدا ہوتا ہے کہ انھیں زہر دے کر قتل کیا گیا اور اس کا ثبوُت پوسٹ مارٹم کے بعد مل جائے گا۔" لیکن حضور بیگم نے ان کا مشورہ قبول نہ کیا۔ کہنے لگیں۔ "میرے ساتھ ہی تو بیٹھ کر کھانا کھایا تھا۔ جو اُنھوں نے کھایا، وہی مَیں نے کھایا۔ مجھے تو کچھ نہ ہُوا اور وہ مجھے اتنا پہاڑ سا غم اُٹھانے کے لئے چھوڑ کر چلے گئے۔" وہ پھر پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگیں۔ سسکیاں بھرتے ہوئے بولیں۔ "جو ہونا تھا ہو گیا۔ مولا کی یہی مرضی تھی۔ اب میّت کی کیوں دُرگت بنوانا چاہتی ہو۔" اُنھوں نے آہ سرد کھینچی "ان کو موت کے گھاٹ اُتارنے والے تو اور ہی ہیں۔ تم اُن کو نہیں جانتیں۔" وہ جنوں کے وہم میں اس بُری طرح مُبتلا تھیں کہ خوُد بھی اُن کی قائل تھیں اور دُوسروں کو بھی باور کرانے کی کوشش کرتی تھیں۔

تجہیز و تکفین کے سلسلہ میں خاندان کی جو دُوسری بیگمات اور بڑی بوڑھیاں موجود تھیں، وہ بھی پوسٹ مارٹم کے سخت خلاف تھیں۔ کانوں پر ہاتھ رکھتی تھیں۔ پولیس کے نام سے تھرّاتی تھیں۔ کسی نے دبی زبان سے بھی اُن کی تائید نہ کی۔ بلکہ کچھ ایسی بھی تھیں

کہ پیٹھ پیچھے لعن طعن سے بھی دریغ نہ کیا۔

ہر چند کہ حضور بیگم عمر میں ارجمند سلطانہ سے زیادہ بڑی نہ تھیں مگر وہ بزرگوں ہی کی طرح اُن کا پُورا پُورا احترام کرتی تھیں۔ لہٰذا زیادہ اصرار نہ کر سکیں۔ اندر ہی اندر سُلگتی رہیں۔ کُڑھتی رہیں۔ نواب تقی کی موت کے بارے میں اُن کا شبہہ دُور نہ ہُوا۔ ان کو اب تک ایک ایک بات یاد تھی۔

☆

بارہ دری پر قبرستان کی سی خاموشی چھائی تھی۔ البتہ شہر کی گھما گھمی بیدار تھی۔ کوچہ و بازار میں چہل پہل تھی۔ دوکانوں اور مکانوں میں روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ ملی جُلی آوازوں کا شور مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی مانند معلوم ہوتا تھا۔

ارجمند سُلطانہ زینے کے دروازے کے قریب سہمی ہوئی کھڑی تھیں۔ نواب تقی کی پُر اسرار موت کی یاد تازہ ہوئی تو خوف میں اضافہ ہُوا۔ خوف اس قدر بڑھا کہ ایک لمحہ ایسا بھی آیا کہ اُنھوں نے گھبرا کر واپس جانے کا ارادہ کیا مگر اس خیال سے واپسی کا ارادہ ترک کر دیا کہ وہ طلعت آراء کے روبرُو کس مُنہ سے جائیں گی جس نے بڑی بیچارگی سے اُن کے شانے پر سر رکھ کر روتے ہوئے فریاد کی تھی۔ " رانی بجیا! اللّٰہ کے لیے مجھے بچا لیجئے۔" اور اُنھوں نے نہایت جوش و خروش سے اُسے اطمینان بھی دلایا تھا۔

انھوں نے دل مضبوط کیا اور سنبھل کر مستعدی سے کھڑی ہو گئیں۔ دل ہی دل میں کہا کہ وہ اس راز کا سُراغ لگانے کی ضرور کوشش کریں گی جس نے طلعت آرا ایسی کامنی سی لڑکی کی زندگی اجیرن بنا دی تھی۔ بارہ دری میں سراسیمگی اور دہشت پھیلا دی تھی۔ حضور بیگم کی صحت کو گھُن لگا دیا تھا۔ وہ گیلی لکڑی کی مانند اندر ہی اندر سُلگ رہی تھیں۔ رفتہ رفتہ ختم ہوتی جا رہی تھیں۔

وہ آگے بڑھیں اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی سائبان کے قریب پہنچ گئیں۔ لیکن یہ دیکھ کر حیران و پریشان ہو گئیں کہ ایک کمرے کا دروازہ کھُلا تھا۔ اندر روشنی تھی جو ہلکے

گلابی پردے سے چھن چھن کر باہر مہتابی پر ایک روشن حلقہ بن کر جھلملا رہی تھیں۔ ارجمند سلطانہ نے سراسیمہ ہو کر سوچا کہ کمرے تو مقفل تھے۔ یہ دروازہ کس طرح کھلا؟ کمرے کے اندر روشنی کس نے کی؟ ان کے ذہن میں کھلبلی برپا ہو گئی۔ ایک کے بعد دوسرا سوال اُبھرنے لگا۔ ان کو اپنی سانس رُکتی ہوئی محسوس ہوئی۔ خوف سے سارے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

اُنھوں نے دہشت زدہ ہو کر سوچا یہ تو سب کچھ وہی نظر آرہا ہے جو پھوپھی جانی بتاتی تھیں۔ یہ تو بہت پُراسرار جگہ ہے۔ عجب آسیب زدہ اور ڈراؤنا ماحول ہے۔ کیا واقعی یہ جنوں کا مسکن ہے؟ ایسا محسوس ہوا کہ کوئی چھُپ کر انھیں دیکھ رہا ہے۔ اُن کی نقل و حرکت کی نگرانی کر رہا ہے۔ عین اُس وقت عقب میں آہستہ سے آہٹ ہوئی۔ انھوں نے پلٹ کر وحشت زدہ نظروں سے دیکھا۔ دُور دُور تک کسی کا نام و نشان نہ تھا۔ البتّہ مولسری کا ایک خشک پتّہ ہَوا کے تیز جھونکے سے چھت پر کھڑ کھڑاتا ہوا دوڑ رہا تھا۔ اُسے دیکھ کر وہ بے ساختہ مسکرا دیں۔ سوچنے لگیں، پھوپھی جانی کی باتوں نے اُن کو خواہ مخواہ طرح طرح کے وسوسوں میں مُبتلا کر دیا، خود اعتمادی متزلزل کر کے اُنھیں ڈرپوک اور بودا بنا دیا۔

خوف اور گھبراہٹ کا احساس کچھ زائل ہوا تو معاً ایک نئے خیال نے جنم لیا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ سارا ڈھونگ خود طلعت آرا نے رچایا ہو اور اُس سازش میں مغلانی اور بَنّو بھی شامل ہوں؟ پھوپھی ٹھہریں ہمیشہ کی وہمی اور تو ہّم پرست۔ انھوں نے آنکھ بند کر کے یقین بھی کر لیا۔ اگر ایسا نہ بھی ہو، تب بھی اتنا ضرور ہے کہ ان تمام پُراسرار اور حیرت انگیز واقعات کی تہہ میں کوئی گہرا راز پوشیدہ ہے۔

اس راز کا سراغ لگانے کے لیے ان کے ذہن میں تجسّس پیدا ہُوا۔ اُنھوں نے مہتابی کے کشادہ چبوترے پر نظر ڈالی۔ جس کے کٹہرے کی جالی جگہ جگہ سے ٹوٹ پھوٹ گئی تھی۔ اسی چبوترے پر نواب تقی مرحوم موسم گرما کی گرم اور طویل راتوں کو استراحت فرماتے تھے۔ سورج غروب ہوتے ہی مہتابی کے پُختہ فرش پر چھڑکاؤ شروع کر دیا جاتا۔

کمرے سے پلنگ نکال کر بچھایا جاتا اور اس پر صاف شفّاف بستر لگا دیا جاتا۔ مگر اب نہ نواب تقی رہے تھے اور نہ ہی اُن کے لیے پلنگ بچھایا جاتا۔ مہتابی کے ایک گوشے میں اب صرف روشنی کا زرد زرد دھبّا نظر آرہا تھا۔

یہ روشن دھبّا مہتابی سے سائبان کے پُختہ فرش تک پھیلا ہوا تھا۔ سائبان کے عقب میں کمرہ تھا اور اُس کے کھُلے دروازے پر پڑے ہوئے ہلکے گلابی پردے سے روشنی پھُوٹ رہی تھی۔ ارجمند سُلطانہ کی نگاہیں روشنی کا تعاقب کرتی ہوئی دروازے تک پہنچیں اور ہوا سے ہولے ہولے ہلتے ہوئے پردے پر جاکر ٹک گئیں۔ کمرے میں روشنی تھی مگر باہر سے کچھ نظر نہ آتا تھا۔

وہ چند لمحے ٹکٹکی باندھے پردے کو تکتی رہیں پھر اُنھوں نے حوصلے سے کام لیا۔ قدم اُٹھایا اور سنبھل سنبھل کر آگے بڑھیں۔ سائبان کے نیچے پہنچیں مگر دروازے کی دہلیز سے چند قدم پہلے رُک گئیں۔ کان لگا کر سُن گن لینے کی کوشش کی۔ کمرے کے اندر گہری خاموشی چھائی تھی۔ نہ کوئی آہٹ تھی نہ آواز۔ اُنھوں نے آہستہ سے کھنکار کر اپنی موجودگی کا اظہار کیا۔ کمرے میں بدستوُر خاموشی چھائی رہی۔

اس دفعہ اُنھوں نے جھجکتے ہوئے دریافت کیا۔ "اندر کوئی ہے؟" ان کی آواز میں ہلکی ہلکی تھرتھراہٹ تھی۔

کمرے کے اندر کوئی آواز نہ اُبھری۔

"کیا مَیں اندر آسکتی ہوں؟"

کوئی جواب نہ مِلا۔ خاموشی کا طلسم نہ ٹوٹا۔

ارجمند سُلطانہ نے اس بار قدم اُٹھایا۔ بڑھیں، دروازے کے قریب پہنچیں اور ہاتھ بڑھا کر پردہ ایک طرف کر دیا۔ کمرہ بالکل خالی تھا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔

اُنھوں نے جی کڑا کیا اور اندر داخل ہوگئیں۔ حیرت زدہ ہو کر پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھا۔ سامنے دیوار کے پاس ایک کنول روشن تھا۔ کافوری شمع کی اُجلی اُجلی روشنی در و دیوار پر جھلملا رہی تھی۔ کنول سے ذرا ہٹ کر اگر سوُز رکھا تھا۔ جس میں اگر بتّیاں سلگ رہی

تھیں۔ ان کا مہکتا ہوا سفید سفید دھواں فضا میں بل کھاتا ہوا لہرا رہا تھا۔ کمرے کے وسط میں مسہری تھی جس پر نہایت صاف ستھرا بستر بچھا تھا۔ مسہری کے سرہانے کی جانب موتیے کے تازہ پھولوں کے گجرے جھول رہے تھے۔ ان کی بھینی بھینی خوشبو سے سارا کمرہ مہک رہا تھا۔

کمرے میں چھائی ہوئی گہری خاموشی سے وحشت معلوم ہوتی تھی۔ اگر بتیوں کے دھوئیں سے کنول کی روشنی بھی دھندلی دھندلی معلوم ہوتی تھی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی داہنے ہاتھ کی جانب گل دان رکھنے کا اونچا اسٹینڈ تھا لیکن اس پر گل دان کے بجائے، نصف انسانی دھڑ کا سفید مجسمہ موجود تھا۔ مجسمہ کسی نوجوان عورت کا تھا جس کی اونچی اور خوبصورت گردن بھدی بھدی انگلیوں والے ایک سیاہ ہاتھ میں جکڑی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں خوف اور اذیت سے پھٹی ہوئی تھیں۔ مجسمہ ساز نے چہرے پر چھائے ہوئے خوف اور اذیت کے تاثرات کو نہایت مہارت اور چابکدستی سے اجاگر کیا تھا۔ عورت کا نچلا ہونٹ لٹک رہا تھا جس کے بائیں گوشے سے سیاہی مائل ایک خم دار لکیر ٹھوڑی تک پھیلی ہوئی تھی۔

ارجمند سلطانہ نے مجسمے کو چونک کر دیکھا۔ آگے بڑھیں۔ قریب جا کر غور سے اس کا جائزہ لیا تو تھرا کر رہ گئیں۔ یہ تو گاڑھے گاڑھے خون کی سرخ لکیر معلوم ہوتی تھی۔ انھوں نے گھبرا کر دروازے پر نظر ڈالی۔ باہر پھیکی، پھیکی چاندنی پھیلی تھی۔ دور دور تک چٹیل چھت تھی۔ سناٹا تھا اور ویرانی تھی۔

انھوں نے گھبرا کر ایک بار پھر آبنوس کے سیاہ اسٹینڈ پر رکھے ہوئے پلاسٹر آف پیرس کے سفید مجسمے کی جانب دیکھا۔ وہی پھٹی پھٹی ہولناک آنکھیں، وہی بھدی بھدی انگلیوں میں جکڑی ہوئی اونچی اور لمبی گردن، وہی ہونٹوں کے گوشے سے بہتی ہوئی گاڑھے گاڑھے خون کی لکیر۔ ان کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ حواس باختہ ہو کر پلٹیں اور دروازے کی سمت تیزی سے لپکیں۔ وہ آسیب زدہ کمرے کے خوفناک ماحول سے جلد سے جلد باہر نکل جانا چاہتی تھیں۔

لیکن سراسیمگی اور بدحواسی میں مسہری کے ایک پائے سے ان کی ساڑی کا پلو کچھ اس

طرح اُلجھا کہ قدم لڑکھڑا گئے۔ وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکیں۔ دھڑام سے مُنہ کے بل فرش پر گریں۔ اُن کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ وہ بُری طرح ہانپ رہی تھیں۔ حالت کچھ اس قدر غیر ہو رہی تھی کہ وہ کچھ دیر تک کمرے کے فرش پر بے حال پڑی رہیں۔ ذرا قرار آیا تو اُنھوں نے اپنی داہنی پنڈلی میں سوزش محسوس کی۔ وہ کراہتی ہوئی اُٹھ کر بیٹھ گئیں۔ جُھک کر پنڈلی دیکھی۔ اس پر گہری خراش پڑ گئی تھی۔ خراش کے اندر سے سُرخ، سُرخ خون جھلک رہا تھا۔ ہڈی بھی درد سے دُکھ رہی تھی۔

وہ فرش پر خاموش بیٹھی گہری گہری سانس بھرتی رہیں۔ پنڈلی میں رہ رہ کر ٹیس اُٹھ رہی تھی۔ اُنھوں نے زخمی پنڈلی کو غور سے دیکھتے ہوئے سوچا کہ اب وہ خاصی بھدّی اور بے ڈول ہو گئی تھی۔ گوشت ہڈیاں چھوڑنے لگا تھا۔ پٹھوں کی سختی اور تناؤ میں کمی آ گئی تھی۔ وہ بجھ کر رہ گئیں۔ اپنے جسم کو اُنھوں نے کئی کئی گھنٹے اسکیٹنگ کر کے پُرکشش اور سڈول بنایا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ رات گئے تک بال رُوم کے چکنے چوبی فرش پر مسلسل رقص کرنے کے باوجود ان کو اپنی ٹانگوں میں ذرا بھی تھکن محسوس نہ ہوتی تھی۔

اُنھوں نے دل گرفتہ ہو کر ٹھنڈی سانس بھری۔ وہ پنڈلی کے درد اور کمرے کے ہیبت ناک ماحول کو فراموش کر کے ماضی کی دُھندلی، دُھندلی راہوں پر بھٹکنے لگیں۔ بیتے دنوں کی نہ جانے کتنی دل کش اور سہانی یادیں، خوابوں کی مانند اُن کے ارد گرد منڈلانے لگیں۔ وہ یادوں کی بھُول بھلیوں میں گُم ہو گئیں۔ ان یادوں کی لذّت میں شیفتگی تھی، وارفتگی تھی۔

ارجمند سُلطانہ، اب عمر کی اس سرحد پر پہنچ چکی تھیں، جب جوانی کا سُورج ڈھلنے لگتا ہے۔ اس کی تمازت، سرد پڑنے لگتی ہے، چمک دمک دُھندلی ہو جاتی ہے۔ بڑھاپا، دبے، دبے قدموں آ کر دستک دیتا ہے۔ سرگوشی کرتا ہے۔ مَیں آ گیا ہوں۔ اب دروازے کے پٹ کھول دو۔ مجھے اندر آنے دو۔ مَیں نے برسوں اس دن کا انتظار کیا ہے۔ اب میں واپس نہیں جاؤں گا۔ مگر اس ناخواندہ مہمان کا وہ خیر مقدم کرنے کے لئے کسی طور آمادہ نہ تھیں۔ ان کو بھی ہر پری چہرہ اور نسرین ادا عورت

کی طرح اپنی جوانی سے والہانہ لگاؤ تھا۔ اس مزاحمت کی ایک بنیادی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ ہنوز کنواری تھیں۔ اُنھوں نے شادی نہیں کی تھی۔ شادی کر کے وہ کسی کی بالادستی اور حکمرانی تسلیم نہ کرنا چاہتی تھیں۔ وہ ایک بڑی جاگیر کی فرماں روا تھیں۔ مستزاد یہ کہ وہ اپنے حسنِ جہاں تاب کے بل بوتے پر نہ جانے کتنے دلوں پر سالہا سال تک حکومت کر چکی تھیں۔ اپنی زلفِ گرہ گیر کا اسیر بنا چکی تھیں۔

اُنھوں نے گردن اُٹھا کر ایک بار پھر سرد آہ کھینچی۔ بے قرار ہو کر سوچا۔ ہائے! کتنے خوبصورت تھے، وہ دن۔ کتنی سہانی تھیں وہ راتیں اور کتنے دل آویز تھیں ان کی جگمگاتی یادیں۔

ارجمند سُلطانہ اُٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔ اُنھوں نے آگے بڑھنے کی کوشش کی لیکن پنڈلی میں ایسی چوٹ آئی تھی کہ قدم اُٹھاتے ہی ٹیس اُٹھی۔ لڑکھڑا کر گرتے گرتے بچیں۔ اُنھوں نے ہاتھ بڑھا کر دیوار کا سہارا لیا۔ ڈگمگاتی ہوئی کسی نہ کسی طرح مسہری کے قریب پہنچیں اور اُس پر بیٹھ گئیں۔

مُوتیئے کے تازہ پھولوں کے گجرے خوب مہک رہے تھے۔ اگر سوز میں سُلگتی ہوئی اگر بتیوں سے دُھوئیں کے سفید سفید مرغولے اُبھر کر فضا میں لہرا رہے تھے۔ ہوا کے نرم نرم جھونکوں سے دروازے پر پڑا ہُوا ریشمی پردہ آہستہ آہستہ سرسراہٹ پیدا کر رہا تھا۔ دُور تک پھیلی ہوئی سپاٹ چھت پر چاندنی نے افشاں چھڑک دی تھی۔ ارجمند سُلطانہ کی آنکھوں میں نیند کا ہلکا ہلکا خمار تھا۔ پلکیں بوجھل ہو رہی تھیں، واماندگی طاری تھی۔

کمرے میں کافوری شمع کی روشنی پھیلی تھی۔ اس روشنی میں ان کا بھاری بھرکم سایہ مشرقی دیوار پر بے ہنگم اور مہیب معلوم ہو رہا تھا۔ ہَوا کا کوئی جھونکا اندر آتا تو شمع کی لَو تھرتھراتی۔ دیوار پر پھیلا ہُوا ان کا سایہ اور بے ہنگم اور پُراسرار نظر آتا۔

نیند کا غلبہ جب زیادہ بڑھنے لگا تو اُنھوں نے سوچا، اب واپس نیچے جانا چاہیئے مگر نہ وہ اُٹھیں نہ کمرے سے باہر گئیں۔ مسہری کے سرہانے سے ٹیک لگائے خاموش بیٹھی رہیں۔ کمرے میں داخل ہونے کے بعد اُن پر جو خوف طاری ہو گیا تھا اس کی شدّت

میں اب کمی آگئی تھی۔ ماحول کی ہیبت رفتہ رفتہ زائل ہوتی جارہی تھی۔ البتہ تنہائی بڑی اُکتا دینے والی اور صبر آزما تھی۔

کئی بار ارادہ کرنے کے باوجود وہ باہر نہ گئیں اور یہ سوچ کر رہ گئیں کہ جب کمرے میں آہی گئی ہوں تو اس راز کو بھی معلوم کر لیا جائے جو بارہ دری کے مکینوں کے لیے ڈراؤنا خواب بن گیا تھا جس نے مکڑی کے پیچیدہ جال کی مانند طلعت آمار کو اپنی گرفت میں جکڑ لیا تھا۔ اس تجسس کا ایک بڑا اور اہم سبب یہ بھی تھا کہ پچھلے کئی برسوں سے ان کو انگریزی کے جاسوسی ناول پڑھنے کا چسکہ پڑ گیا تھا۔ جاسوسی ناولوں کے مطالعہ کا نفسیاتی ردِّ عمل یہ ہُوا کہ ہر وہ واقعہ یا مسئلہ جو اُن کو پُراسرار اور پیچیدہ معلوم ہوتا، اس کا سراغ نکالنے میں لُطف آتا۔ ذہنی آسودگی ملتی۔

(۲)

افتادِ طبع کے اعتبار سے ارجمند سلطانہ خاصی مہم جو واقع ہوئی تھیں اور یہ مُہم جوئی انھیں اپنے والد، راجہ یاور علی خان سے ورثہ میں ملی تھی۔ وہ شکار کے رسیا تھے اور اپنے وقت کے مشہور شکاری تھے۔ ایسے دھاکڑ کہ شیر کے شکار میں بھی کبھی مچان استعمال نہ کی۔ لاٹ گورنر بھی ساتھ ہوئے، تب بھی نہ مچان پر اور نہ ہی ہاتھی کے ہودے پر بیٹھ کر شکار کھیلا۔ شکار پر جاتے تو بیوی کے منع کرنے کے باوجود بیٹی کو اکثر اپنے ہمراہ لے جاتے۔ کبھی ساتھ لے جانے سے گریز بھی کرتے تو ارجمند سُلطانہ اَڑ جاتیں۔ اکلوتی اولاد تھیں اور اس قدر لاڈلی تھیں کہ ان کی ضد کے سامنے وہ مجبور ہو جاتے۔ نڈر ایسے تھے کہ کیسا ہی خطرہ درپیش ہو، ذرا ہراساں نہ ہوتے بلکہ خطرہ مول لینے میں اُن کو لُطف آتا تھا۔

باپ کی اس مہم جوئی اور دلیری سے ارجمند سلطانہ بھی لُطف اندوز ہوتی تھیں۔ انھیں اب تک یاد تھا۔ ایک بار راجہ یاور علی خاں پُورن پور کے علاقے میں شکار کھیل رہے تھے۔ ترائی کا گھنا جنگل تھا۔ اس قدر گھنا کہ دن میں بھی رات کا گمان ہوتا تھا۔ ارجمند

سلطانہ بھی باپ کے ہمراہ تھیں۔ ایک روز شکار سے واپسی میں وہ دوسروں سے بچھڑ گئے۔ کوئی محافظ ساتھ نہ تھا۔ صرف ارجمند سلطانہ تھیں۔ وہ تو اُن کو بھی پورن پور میں چھوڑ دینا چاہتے تھے تاکہ ریل گاڑی سے مالا اسٹیشن پہنچ جائیں جہاں اُن کا کیمپ تھا مگر وہ باپ کی رفاقت چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوئیں۔ ان کے ساتھ ساتھ رہیں۔

دونوں کئی گھنٹے تک گنجان جنگل میں ادھر اُدھر بھٹکتے رہے۔ درختوں میں پت جھڑ لگ چکا تھا۔ ہوا تیز تھی اور سرسراتی ہوئی چل رہی تھی۔ خشک پتے شاخوں سے ٹوٹ، ٹوٹ کر گرتے۔ طرح طرح کی آہٹیں پیدا کرتے۔ قدموں کے نیچے آکر چرمراتے۔ درختوں کے نیچے ہر طرف خشک پتے اس طرح بکھرے ہوئے تھے کہ ہر راہ اور ہر پگڈنڈی اُن کے نیچے دب کر اوجھل ہو گئی تھی۔ نہ منزل کا کوئی اندازہ ہوتا تھا نہ سمت کا۔ نہ جانے وہ کب تک جنگلی جھاڑیوں سے اُلجھتے، اندھیرے میں ٹھوکریں کھاتے، اِدھر اُدھر بھٹکتے رہے۔ ناگاہ درختوں کے ایک گھنے جھنڈ سے نکلے تو کھلا آسمان نظر آیا۔ سامنے ریل کی پٹری تھی جو جھلملاتے ستاروں کی روشنی میں دُور ہی سے چمکتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔

ریل کی پٹری دیکھ کر اُن کی جان میں جان آئی۔ آگے بڑھے۔ نشیب سے نکل کر اوپر ریل کی پٹری پر پہنچ گئے۔ اُنھوں نے اطمینان کی سانس لی اور سنبھل سنبھل کر قدم اٹھاتے ہوئے لوہے کی پٹریوں کے درمیان چلنے لگے۔ دونوں جانب ساکھو کے اُونچے اُونچے درخت تھے، جس کی لکڑی سے بلّیاں بنائی جاتی ہیں اور عمارتوں کی تعمیر میں بھی کام آتی ہے۔ راستے میں ایک قدرتی نالہ پڑا۔ مشہور ہے کہ یہ گھنے جنگلوں سے ڈھکے ہوئے ایک ایک پیپل کے درخت کی جڑ سے پھوٹتا ہے اور آگے جا کر بہت سے ندی نالوں سے مل کر دریائے گومتی بن جاتا ہے جس کے کنارے لکھنؤ آباد ہے۔

دونوں نے اس نالے کی پُلیا عبور کی۔ کچھ ہی دُور گئے ہوں گے کہ پیچھے سے آواز اُبھری "ہائے!" آواز اتنی دردناک تھی کہ ان کے دل لرز کر رہ گئے۔ راجہ یاور علی خاں جہاں تھے، وہیں رُک گئے۔ ارجمند سلطانہ بھی گھبرا کر ٹھہر گئیں۔ راجہ یاور علی خاں

نے پلٹ کر چوکنّا نظروں سے ادھر اُدھر دیکھا لیکن دُور دُور تک نہ کوئی آدم تھا نہ آدم زاد۔ جنگل سائیں سائیں کرتا تھا۔ چند لمحے ٹھہر کر آگے بڑھے۔ لیکن اُنھوں نے تھوڑا ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ پھر وہی "ہائے" کی صدا ہولناک سنّاٹے میں بُلند ہوئی۔ اس دفعہ کچھ زیادہ ہی درد ناک تھی۔ آواز سُن کر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی زخمی عورت تکلیف سے نیم جاں ہو کر کراہ رہی ہو۔

راجہ یاور علی خان نے بھی ایسا ہی محسوس کیا اور رُک کر بیٹی سے اس کا اظہار بھی کیا۔ "ارجی!" وہ پیار سے ارجمند سلطانہ کو ارجی ہی کہتے تھے۔ "یہ تو کسی زخمی عورت کی آواز معلوم ہوتی ہے۔"

"مجھے بھی ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔" ارجمند سلطانہ نے بھی ان کے خیال کی تائید کی۔

"کچھ ایسا گمان ہوتا ہے کہ کوئی درندہ اُسے زخمی کر کے چھوڑ گیا۔" راجہ صاحب نے قیاس آرائی کی۔ "ہو سکتا ہے کسی نے اس عورت کو قتل کرنا چاہا ہو اور مردہ سمجھ کر لاش یہاں ڈال دی تاکہ جنگلی جانور گوشت پوست کھا کر اس کا نام و نشان تک مٹا دیں۔" انھوں نے قدرے تامّل کیا۔ "مگر وہ مری نہیں۔"

"شاید ایسا ہی ہو۔ نہ جانے کون ہے بیچاری۔ کیسی درد بھری آواز تھی۔"

ارجمند سُلطانہ کے لہجے میں ہلکی ہلکی تھرتھراہٹ تھی۔ وہ اسنجانے خوف سے سہمی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ باپ نے بیٹی کی سراسیمگی کو فوراً بھانپ لیا۔ "ڈر رہی ہو، ارجی؟" وہ اُن کا خوف دُور کرنے کی غرض سے کھل کھلا کر ہنسے۔ "بھئی حد ہو گئی۔ یاور علی خاں کی بیٹی ڈر رہی ہے۔" وہ بے نیازی سے آہستہ آہستہ ہنستے رہے۔

"نہیں تو پاپا۔" وہ کھسیانی ہو کر مسکرائیں۔ "ایسی تو کوئی بات نہیں۔"

اس عرصے میں وہ درد ناک آواز پھر نہ اُبھری۔ راجہ یاور علی خاں نے خطرے کو آس پاس منڈلاتے ہوئے محسوس کیا۔ وہ خطرے کے احساس کے باوجود اس درد ناک آواز کا راز معلوم کرنے کی کوشش ضرور کرتے، مگر رات کا وقت، سنسان جنگل اور جوان بیٹی ہمراہ۔ انھوں نے مصلحت اندیشی سے کام لیا۔ قدم اٹھاتے ہوئے کہا۔ "آؤ بیٹی، اب

چلیں۔ خدا معلوم کیا بھید ہے، یہاں ٹھیرنا مناسب نہیں۔" ارجمند سُلطانہ خاموش رہیں اور باپ کے ساتھ ساتھ ریل کی پٹریوں کے درمیان چلنے لگیں۔

مگر دونوں زیادہ دُور نہ گئے تھے کہ سناٹے میں پھر وہی "ہائے" کی لرزہ خیز صدا بلند ہوئی۔ ارجمند سُلطانہ ٹھٹکیں لیکن راجہ صاحب نہ رُکے۔ بیٹی کو خبردار کیا۔" بیٹی! اس آواز کا خیال چھوڑ دو۔ آگے بڑھو، نہ معلوم کیا اسرار ہے۔" ارجمند سُلطانہ نے نہ زبان سے کچھ کہا نہ پلٹ کر پیچھے دیکھا۔ باپ کی ہدایت پر آگے بڑھیں۔

چند ہی قدم طے کیے ہوں گے کہ "ہائے" کی صدا سنائی دی۔ اس میں اس قدر درد اور سوز تھا جیسے کوئی جان کنی کے عالم میں تڑپ رہا ہو۔ آواز نے دلوں کو اس طرح متاثر کیا کہ ان کے قدم خود بخود رُک گئے۔ راجہ یاور علی خاں دل گرفتہ ہو کر بولے "بیچاری بہت ہی کرب کے عالم میں ہے۔" انھوں نے مڑ کر عقب میں نظریں دوڑائیں۔ آس پاس کوئی دکھائی نہ دیا۔ صرف ریل کی پٹری تھی جو سانپ کی طرح بل کھاتی ایک موڑ پر نگاہوں سے اوجھل ہو گئی تھی۔

ارجمند سُلطانہ نے بھی ادھر اُدھر نظریں دوڑا کر باپ کی تائید کی۔" جی ہاں، پاپا۔ نہ جانے کون مصیبت کی ماری ہے۔ اس بُری طرح کراہ رہی ہے کہ سُن کر دل بیٹھے جا رہا ہے۔" ان کی آواز غم میں ڈوبی ہوئی تھی۔

دونوں حیران و پریشان ریل کی پٹری پر کھڑے تھے اور کوئی فیصلہ نہ کر سکے تھے کہ ان کو کیا کرنا چاہیئے۔ ٹھہر کر صورتِ حال معلوم کی جائے یا آواز کو نظر انداز کر کے خاموشی سے آگے بڑھتے جائیں۔ اسی اثنا میں وہی "ہائے" کی دل دوز کراہ اُبھری۔ اس دفعہ اس میں اس قدر شدید سوز تھا کہ دل بے قابو ہو گئے۔

راجہ یاور علی خاں بے قرار ہو کر بولے۔" ہمیں اس کی ضرور مدد کرنا چاہیئے۔ یہ انسانیت سے بعید ہے کہ ہم اسے تڑپتے ہوئے چھوڑ کر آگے بڑھ جائیں۔ زندگی بھر ملال رہے گا۔"

وہ بجھے ہوئے لہجے میں رُک رُک کر بولتے رہے اور نگاہیں گھما کر یہ اندازہ

لگانے کی کوشش کرتے رہے کہ آواز کس سمت سے اور کہاں سے بلند ہوئی تھی۔ ارجمند سلطانہ بھی اپنے ردِ عمل کا اظہار کرنا چاہتی تھیں۔ عین اس وقت "ہائے" کی صدا بلند ہوئی۔

آواز نالے کی پُلیا کی طرف سے آئی تھی۔ راجہ یاور علی خاں کو بھی اس کا اندازہ ہو گیا۔ وہ مڑے اور بے ساختہ نالے کی سمت بڑھنے لگے۔ وہ بالکل خاموش تھے۔ ارجمند سلطانہ نے بھی ان کو نہ ٹوکا۔ چُپ چاپ ان کے ساتھ ساتھ چلتی رہیں۔ دونوں کے قدموں کی آہٹ لکڑی کے تختوں اور ان کے درمیان پڑے ہوئے پتھروں پر کھٹ کھٹ اُبھرتی رہی۔

پُلیا پر پہنچ کر وہ رُک گئے اور جس جانب سے کراہنے کی آواز اُبھری تھی اُدھر جُھک کر دیکھا، نالہ جنگلی جھاڑیوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ نالے میں پانی تھا اور ستاروں کی ہلکی ہلکی روشنی میں، جھاڑیوں کے درمیان کہیں کہیں سے جھلک رہا تھا۔ نالہ، ساکھو کے اونچے اونچے درختوں کے بیچ سے گزرتا ہوا دُور تک سیدھا چلا گیا تھا۔ نالے کے آس پاس مینڈکوں اور جھینگروں کی آوازوں کے ساتھ ساتھ جنگلی جانوروں کی آوازیں بھی رُک رُک کر اُبھر رہی تھیں۔ ہوا درختوں کی شاخوں سے اُلجھتی ہوئی گزرتی تو سرسراہٹ پیدا ہوتی۔ خشک پتّے ٹوٹ ٹوٹ کر گرتے اور کھڑکھڑاتے ہوئے اِدھر اُدھر بکھر جاتے۔

کچھ دیر دونوں گُم صُم کھڑے رہے، پھر راجہ یاور علی خاں نے قیاس آرائی کی۔
"نالے میں پانی ہے۔ آفتاب غروب ہوتے ہی جنگلی جانور یہاں پانی پینے آتے ہیں۔ کوئی بھولا بھٹکا، آفت کا مارا اِدھر آ گیا اور کسی خونخوار درندے نے حملہ کر کے اُسے زخمی کر دیا۔"

"لیکن وہ اس ویرانے میں آیا کیسے؟"

"ریل کی پٹری پر سے گزر رہا ہوگا۔ پیاسا ہوگا۔ پیاس بجھانے نالے پر چلا گیا ہوگا۔" راجہ یاور علی خاں نے اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کی کوشش کی۔

"ہوسکتا ہے شکاری ہو۔ شکار کے لیے یہ نہایت عمدہ جگہ ہے۔"

"آواز تو عورت کی تھی۔" ارجمند سلطانہ مطمئن نہ ہوئیں۔ "آپ نے بھی محسوس کیا ہوگا کہ آواز تو عورت ہی کی معلوم ہوتی تھی۔"

"آواز تو عورت ہی کی تھی۔" باپ نے بیٹی کی رائے سے اتفاق کیا۔ قدرے توقف کیا، پھر کچھ سوچ کر بولے۔ "یہ بھی ہوسکتا ہے کسی نے اسے چلتی گاڑی میں قتل کرنے کی کوشش کی ہو اور جب گاڑی پلیا پر سے گزری تو مردہ سمجھ کر کھڑکی یا دروازے سے پھینک دیا ہو۔" انھوں نے بیٹی کی طرف مڑ کر دیکھا۔ "بھئی، اپنی سمجھ میں تو یہی آتا ہے۔"

"ایسا ہی لگتا ہے۔ پہلے بھی آپ نے کچھ ایسا ہی خیال ظاہر کیا تھا۔"

راجہ یاور علی خاں خاموش رہے۔ جھک کر نالے پر چھائی ہوئی جنگلی جھاڑیوں کو دیکھنے لگے۔ وہ دوسری جانب بھی گئے۔ اُدھر بھی جھک جھک کر دیکھتے رہے، مگر سوائے گھنی جھاڑیوں اور ان کے درمیان کہیں کہیں سے جھلکتے ہوئے پانی کے کچھ نظر نہ آیا۔ نہ کوئی آہٹ ہوئی نہ کراہنے کی آواز اُبھری۔

وہ بیٹی کے پاس آکر بولے۔ "بھئی یہاں تو کچھ نظر نہیں آتا۔ آواز بھی آنا بند ہوگئی ہے۔"

"تو پھر آیئے، اب چلیں۔" ارجمند سلطانہ سہمی ہوئی تھیں اور اب وہاں ٹھہرنا نہ چاہتی تھیں لیکن راجہ یاور علی خاں آمادہ نہ ہوئے۔ کہنے لگے: "جب یہاں آ ہی گئے ہیں تو تحقیق بھی کر لی جائے۔ ہوسکتا ہے کسی مصیبت زدہ کو ہماری مدد کی ضرورت ہو۔"

"کیا آپ نیچے جانا چاہتے ہیں؟"

"ارادہ تو کچھ ایسا ہی ہے۔" وہ مڑے اور آگے بڑھتے ہوئے بولے۔ "تم یہیں ٹھہرو۔ میں اکیلا ہی نیچے جاؤں گا۔"

ارجمند سلطانہ کو معلوم تھا کہ راجہ صاحب کے پاس جو رائفل تھی اس کے

میگزین میں صرف ایک کارتوس تھا۔ کارتوسوں کا تھیلا اور شکار کا دوسرا ساز و سامان ملازموں کے پاس ہی رہ گیا تھا۔ وہ ان کو نالے کی جانب جانے سے روک تو نہ سکیں، مگر منع کرنے کے باوجود ان کے پیچھے پیچھے چلنے لگیں۔

راجہ یاور علی خاں نے ٹوکا۔ "تم نہ آؤ۔ تمھارا ادھر آنا ٹھیک نہیں۔ نیچے خطرہ ہے۔"

"میرے لیے خطرہ ہے، آپ کے لیے نہیں ہے۔ میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گی۔"

"نہیں بیٹی! ہر معاملہ میں ضد اچھی نہیں ہوتی۔" انھوں نے پیار سے ان کو ڈانٹا، مگر وہ باز نہ آئیں۔ کہنے لگیں۔ "میرے بارے میں تو امی سرکار سے آپ ہمیشہ یہی کہتے ہیں کہ یہ تو غلطی سے لڑکی ہو گئی۔ دیکھو، بالکل لڑکا نظر آتی ہے۔ یہ تو میرا بیٹا ہے بیٹا۔"

وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھیں۔ راجہ صاحب نے بیٹی کے بجائے بیٹے ہی کی طرح ان کی پرورش کی تھی۔ تب ہی تو ان کی عادات و اطوار میں خاصی مردانہ خصوصیات پیدا ہو گئی تھیں۔ اس وقت بھی انھوں نے نڈر ہونے کا مظاہرہ کیا۔ باپ کے ساتھ ساتھ ڈھلوان سے نیچے اترنے لگیں۔ باپ کی طرح وہ بھی شکاریوں کے لباس میں تھیں۔ سنبھل سنبھل کر قدم رکھ رہی تھیں اور چوکنا نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتی بھی جاتی تھیں۔

راجہ یاور علی خاں نے نالے کی جانب بڑھتے ہوئے زور سے کھنکار کر کہا۔ "یہاں کوئی ہے؟"

کوئی جواب نہ ملا۔ کوئی آواز نہ اُبھری۔ صرف ان کی اپنی آواز کی بازگشت ویرانے میں سُنائی دی۔ اُنھوں نے رُک رُک کر پکارا۔

"ارے بھئی، یہاں کوئی ہے؟"

"کوئی ہے، کوئی ہے؟"

"بولو، جواب دو۔"

"ڈرو نہیں، ہم تمھاری مدد کو آئے ہیں۔"

مگر کوئی جواب نہ آیا، کوئی نہ بولا۔ جنگل سائیں سائیں کرتا رہا۔

راجہ یاور علی خاں ایک ہاتھ میں رائفل سنبھالے، دوسرے سے جھاڑیاں ہٹاتے،

احتیاط سے قدم رکھتے، آہستہ آہستہ نشیب میں اُترتے رہے۔ ارجمند سلطانہ ان کے عقب میں تھیں۔ رات کا پچھلا پہر تھا۔ ہر طرف ویرانی برستی تھی۔ راجہ یاور علی خاں چلتے چلتے ٹھٹھک جاتے، پھر آگے بڑھتے۔

دونوں جھاڑیوں سے گزر کر نالے کے قریب پہنچ گئے۔ نالے میں پانی تھا اور پتلی دھار کی صورت میں بغیر آواز پیدا کئے آہستہ آہستہ بہہ رہا تھا۔ ان کے سروں کے اوپر کھُلا آسمان تھا۔ گہرے نیلے آسمان میں ستاروں کے کنول جھلملا رہے تھے۔ رات ڈھلتی جا رہی تھی۔ ہوا میں ہلکی ہلکی خنکی رچی ہوئی تھی۔ انھوں نے چوکنّا نظروں سے مڑ، مڑ کر ہر طرف دیکھا۔ دُور دور تک کسی کا نام و نشان نہ تھا۔

راجہ یاور علی خاں کھنکارتے تھے۔ اونچی آواز سے پکارتے تھے مگر کوئی نہ بولا۔ کسی طرف سے آواز نہ اُبھری۔ وہ رائفل سنبھالے ہوئے دھیرے دھیرے پُلیا کی جانب بڑھنے لگے۔ پُلیا کے نیچے گہرا اندھیرا تھا۔ گھنی جھاڑیاں راہ میں حائل تھیں۔ انھوں نے چند ہی قدم کا فاصلہ طے کیا تھا کہ پیر ایک گڑھے میں پڑا۔ وہ اس طرح لڑکھڑا کر دھڑام سے گرے کہ رائفل ہاتھ سے چھوٹ کر ایک طرف گری۔ سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ جھاڑی کے قریب سے "ہائے" کی صدا بلند ہوئی۔ آواز میں اس شدّت کا کرب تھا کہ وہ لرز کر رہ گئے۔

آواز سُن کر ارجمند سُلطانہ پر ایسی رقت طاری ہوئی کہ بے ساختہ رُونے کو جی چاہا۔ ایک جھاڑی کے نیچے باپ بے سُدھ پڑے تھے اور وہ سہمی ہوئی اس طرح دم بخود کھڑی تھیں کہ بڑھ کر ان کے پاس بھی نہ جا سکیں۔ عین اس وقت ریل گاڑی کے انجن کی چنگھاڑ اُبھری۔ آن کی آن میں ریل گاڑی قریب پہنچ گئی۔ ہر طرف تیز روشنی پھیل گئی۔ ان دونوں کے علاوہ وہاں کوئی نہ تھا۔ ریل گاڑی لوہے کی پٹریوں پر کھٹ کھٹ کرتی سامنے آ گئی اور شور مچاتی ہوئی پُلیا پر سے گزر گئی۔

ریل گاڑی سے ڈھارس ملی۔ حواس بجا ہوئے تو راجہ یاور علی خاں کپڑے جھاڑتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ رائفل اٹھائی اور پُلیا کے نیچے جانے کا قصد کیا۔ مگر بیٹی نے

بڑھ کر بازو پکڑ لیا۔" آپ کہاں جا رہے ہیں، یہاں تو کوئی نظر نہیں آتا۔ کوئی ہوتا تو انجن کی تیز روشنی میں صاف نظر آجاتا۔ اللہ جانے! کیا بھید ہے؟" وہ ابھی تک خوفزدہ تھیں۔

راجہ یاور علی خاں بے نیازی سے بولے۔" اسی بھید کا تو سراغ لگانا ہے۔ جب یہاں آ ہی گیا ہوں تو اسے معلوم ہی کر کے جاؤں گا۔"

انھوں نے آگے بڑھنا چاہا۔ لیکن ارجمند سلطانہ نے بڑھنے نہ دیا۔ راستہ روک کر کھڑی ہو گئیں۔ بیٹی کی ضد کے سامنے ہمیشہ کی طرح وہ اس بار بھی مجبور ہو گئے۔ آگے جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔

دونوں واپس ہوئے۔ نشیب سے نکل کر اوپر پلیا پر پہنچے مگر رُکے نہیں، نہ مُڑ کر نالے کی سمت دیکھا، چپ چاپ ریل کی پٹری کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ ارجمند سلطانہ ابھی تک انجانے خوف سے سہمی ہوئی تھیں۔ لیکن راجہ یاور علی خاں خوب چاق چوبند نظر آتے تھے، سنبھل سنبھل کر قدم رکھتے ہوئے اطمینان سے آگے بڑھ رہے تھے۔

☆

صبح کے دھندلکے میں دونوں اپنے ٹھکانے پر پہنچے تو تھکن سے نڈھال ہو رہے تھے۔ جنگلی جھاڑیوں کے کانٹوں نے چہروں اور ہاتھوں پر جگہ جگہ خراشیں ڈال دی تھیں۔ لباس خاک سے اَٹے ہوئے تھے۔ سب پریشانی کے عالم میں انتظار ہی کر رہے تھے۔ ان کی حالت دیکھ کر ششدر رہ گئے۔ گھبرا کر پُرسشِ احوال کی تو راجہ یاور علی خاں نے اپنی رُوداد بیان کی۔ نالے کی پُلیا پر جو عجیب و غریب واقعہ پیش آیا تھا، ذرا تفصیل سے سُنایا۔ وہ ابھی تک ذہنی الجھن میں مبتلا تھے اور اس پُراسرار کراہ کا راز معلوم کرنے کے لیے بے چین تھے جو انھوں نے ایک بار نہیں، بار، بار سُنی تھی۔

سب حیران و پریشان بیٹھے ان کی باتیں سُنتے رہے۔ سُننے والوں میں ایک بُوڑھا تھارُو بھی شامل تھا۔ وہ خاموش نہ رہا۔ کہنے لگا۔" سرکار! وہ کوئی عورت دُورت نہیں تھی، اور نہ ہی گھائل تھی۔ وہ تو چڑیا تھی، ادھر کے جنگلوں میں پائی جاتی ہے۔

سُسری، ایسی درد بھری 'ہائے' نکالتی ہے کہ سُن کر من ڈوبنے لگتا ہے۔"
"تم کس چڑیا کی بات کر رہے ہو، بابا؟" کسی نے مداخلت کی۔" ایسی چڑیا تو نہ دیکھی نہ سُنی، جو زخمی عورت کی طرح کراہتی ہو۔ ہائے ہائے کرتی ہو۔ نہ جانے تم کہاں کی ہانک رہے ہو۔؟"
"ایسی بات مت کرو۔" بوڑھا بگڑ کر بولا۔" تم کو ادھر کے بارے میں کیا پتہ۔ اپنی تو یہاں رہتے بستے پیڑھیاں گزر گئیں۔ سارا جیون ہی ان جنگلوں کے اندر بیتا ہے، اب تو بال بھی پک گئے۔"
وہ غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ تھارُو ترائی کے علاقے کے قدیم باسی ہیں۔ جنگلوں کے درمیان جگہ جگہ ان کی چھوٹی چھوٹی بستیاں ہیں۔ وہ درختوں اور جھاڑیوں کو کاٹ کر زمین صاف کرتے ہیں، لکڑی سے مکان بناتے ہیں اور دوسری ضروریات کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ صاف زمین پر کھیتی باڑی کرتے ہیں۔ مویشی اور مرغیاں پالتے ہیں۔ فصل کی بوائی کے بعد گرد و نواح کے قصبات میں جا کر محنت مزدوری کرتے ہیں۔ شکاریوں کے لیے ڈھول اور ٹین کے پیپے بجا کر اور طرح طرح کی آوازیں مُنہ سے نکال کر ہانکا کرتے ہیں۔ وہ اور ان کی عورتیں جنگلی جانوروں اور درندوں سے ذرا خائف نہیں ہوتے۔ اطمینان سے جنگلوں کے پُرپیچ اور خطرناک راستوں پر گھومتے پھرتے ہیں۔ ہمالہ کی تلیٹی کے گھنے جنگلوں کے چپّے چپّے سے واقفیت رکھتے ہیں۔
بوڑھے تھارُو کی بات سُن کر راجہ یاور علی خاں نے کہا۔" تم کہتے ہو تو وہ چڑیا ہی ہو گی۔ مگر بدذات نے خواہ مخواہ پریشان کر دیا۔ نظر بھی تو نہ آئی۔ نہ معلوم کہاں چھپی بیٹھی تھی۔ ہوتی کیسی ہے؟ تم نے تو اُسے دیکھا ہو گا۔"
"نہیں سرکار، نہ میں نے اُسے دیکھا اور نہ اس کی کبھی آواز سُنی۔" بوڑھے نے صاف گوئی سے کام لیا۔" البتہ اپنے بڑے بوڑھوں سے اس کے بارے میں سُن ضرور رکھا ہے۔ کہتے ہیں چڑیا کے رُوپ میں وہ کوئی بلا ہوتی ہے۔ جو کوئی اس کی آواز سُنتا ہے، خود بخود کھنچا ہوا اُس کے پاس چلا جاتا ہے۔ اس کی 'ہائے'، ہائے سُن کر

رونے لگتا ہے اور روتے روتے، گر کر بے ہوش ہو جاتا ہے۔ تب وہ اس کا کلیجہ نکال کر کھا جاتی ہے۔" اس نے توقف کیا۔ "سرکار، آپ مائی باپ ہیں۔ اتنے بڑے حاکم ہیں۔ آپ کو رانی بیٹا کے ساتھ اس طرح رات کے سمے ایسے جوکھوں میں نہیں پڑنا چاہیے تھا۔ بھگوان نے بڑی کرپا کی۔"

ارجمند سلطانہ کا چہرہ تو خوف سے سفید پڑ گیا لیکن راجہ یاور علی خاں ذرا متاثر نہ ہوئے۔ بے نیازی سے ہنسے، کہنے لگے۔ "اماں، تم کیسی بات کر رہے ہو؟ ہم تو کبھی شیر، چیتے کو دیکھ کر نہ جھجکے، تم پدی کی بات کرتے ہو اور وہ بھی چڑیا کے برابر۔ اب تو صبح ہو گئی۔ کل رات جا کر یہ بھی دیکھ لیں گے کہ وہ کیسے کلیجہ نکال کر کھا جاتی ہے۔"

انھوں نے جو کہا تھا وہی کیا، روکنے پر بھی نہ رُکے۔ دوسرے روز آدھی رات کے بعد دو ملازم شکاریوں کے ساتھ پُلیا پر پہنچے، نشیب میں اُترے، نالے پر پہنچے۔ پُلیا کے نیچے بھی گئے۔ ایک ایک جھاڑی میں پہنچے۔ ایک ایک گوشہ چھان ڈالا، مگر نہ وہ چڑیا دکھائی دی، اور نہ ہی اس کی آواز سنائی دی، البتہ پوچھ گچھ کرنے پر صرف اتنا معلوم ہوا کہ اس جنگل میں ایسی چڑیا پائی جاتی ہے اور اس کا تعلق الو کی نسل سے ہے مگر کسی نے اسے دیکھا نہیں۔ اس کی آواز رات کے سناٹے میں شاذ و نادر سنائی دیتی ہے۔ لیکن اس مہم پر وہ بیٹی کو ساتھ نہ لے گئے تھے۔ وہ کیمپ میں ٹھہری رہیں اور بے قراری سے رات بھر ان کے انتظار میں جاگتی رہیں۔ واپس آئے تو بے اختیار رونے لگیں۔ وہ ہنس ہنس کر ان کی دلجوئی کرتے رہے، ایک، ایک تفصیل سناتے رہے۔

یہ پہلا موقعہ نہ تھا۔ اسی طرح ایک بار ایسا ہوا۔

راجہ یاور علی خاں کی مہم جوئی اور جرأت مندی کے نہ جانے کتنے ایسے ہی لرزہ خیز واقعات تھے۔ کچھ تو ایسے تھے جن کی وہ عینی شاہد تھیں اور بہت سے ایسے تھے جو انھوں نے خود بیٹی کو سنائے تھے یا نوکروں کی زبانی سننے میں آئے۔

اسی مہم جوئی کے نتیجے میں وہ اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ ارجمند سلطانہ کے لیے ان کی اچانک موت ایسا اندوہ ناک المیہ تھا جسے یاد کر کے آج بھی وہ اداس

ہو جاتیں۔ دل سے ہوک اٹھتی۔ رقّت طاری ہو جاتی۔

(۳)

ارجمند سُلطانہ خاموش بیٹھی یادوں کے چراغ روشن کرتی رہیں۔

رات کے قافلے نے کچھ اور سفر طے کیا۔ چاند کا رنگ روپ نکھر گیا۔ شہر کے ہنگامے اب سرد پڑ چکے تھے۔ سنسان گلیوں میں رُک رُک کتوّں کے بھونکنے کی آوازیں اُبھر رہی تھیں۔ ارجمند سُلطانہ کا جسم مسہری پر بیٹھے بیٹھے اکڑنے لگا تھا۔ وہ بے چین ہو کر بار بار پہلو بدلتی رہیں۔ ہر آہٹ پر چونک کر دروازے کی طرف دیکھتیں، مگر کوئی نہ آیا۔ کوئی حادثہ رُونما نہ ہوا، کوئی ہنگامہ نہ ہُوا۔

رات گزرتی رہی، ویرانی بڑھتی گئی اور ویرانی کے ساتھ ساتھ تھکن اور اکتاہٹ بھی بڑھتی گئی۔ ارجمند سُلطانہ نے بے چین ہو کر نرم نرم تکیوں کا سہارا لیا اور کروٹ کے بَل بستر پر لیٹ گئیں، لیکن وہ اس طور لیٹی تھیں کہ نظریں دروازے کی جانب تھیں۔

گیارہ بجے، ساڑھے گیارہ بجے۔ رات سنسان، اور سنسان ہو گئی۔ ارجمند سُلطانہ کی آنکھیں بوجھل ہو گئیں۔ بار بار نیند کا غلبہ ہوتا۔ آنکھیں جھپک جاتیں، لیکن وہ فوراً آنکھیں کھول کر دروازے کی جانب دیکھتیں۔ ایک بار نیند نے اس طرح چھاپہ مارا کہ ان کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ وہ بے خبر ہو کر سو گئیں۔

وقت گزُرتا رہا۔ ارجمند سُلطانہ سوتی رہیں۔ رات آدھی ہو گئی۔ کوتوالی کے گھڑیال نے ٹن، ٹن، بارہ بجائے۔ گھڑیال کی گرج دار آواز سنسان رات میں بڑی ہیبت ناک معلوم ہوئی۔ ہوا کی سرسراہٹ اب بڑھ گئی تھی۔ مُولسری کے خشک پتّے قہقہے لگاتے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔ اچانک ہوا کا تیز جھونکا آیا۔ دروازے کا ریشمی پردہ لہرایا۔ کمرے میں روشن شمع زور سے بھڑکی اور بھڑک کر بُجھ گئی۔

کمرے میں ہر طرف پرچھائیوں کا جال پھیل گیا۔ عین اس وقت سناّٹے میں آہٹ اُبھری۔ چھت کے پختہ فرش پر چاپ سنائی دی۔ کوئی بھاری بھاری قدموں سے چل

رہا تھا۔ عود اور عنبر کی تیز خوشبو ہوا کے جھونکوں کے ساتھ کمرے میں پھیلنے لگی۔ قدموں کی آہٹ اُبھرتی رہی۔ کھٹ، کھٹ، کھٹ۔!

آہٹ، قریب اور قریب آتی گئی۔ دروازے کے باہر آہٹ تھم گئی۔ گہری خاموشی چھا گئی۔ پھر دروازہ زور سے ہلا۔ پردہ ایک طرف ہٹا۔ دہلیز پر ایک سایہ اُبھرا۔ گہری گہری سانس بھرنے کی آواز اُبھری۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی زور زور سے ہانپ رہا ہو۔ آواز اتنی صاف اور بوجھل تھی کہ ارجمند سُلطانہ کی آنکھ کھُل گئی۔

انھوں نے دروازے کی سمت دیکھا، دھندلا، دھندلا سایہ آگے بڑھتا ہوا نظر آیا۔ وہ سہمی ہوئی دم بخود پڑی رہیں۔ ان کے جسم کے رونگٹے خوف سے کھڑے ہو گئے۔ کسی انجانے خطرے سے سانس سینے میں اُلجھنے لگی۔ گہری خاموشی میں انھوں نے اپنے سرہانے ہلکی سی آہٹ سُنی۔ پردے سے چھن چھن کر آتی ہوئی مدھم چاندنی میں دیوار پر پرچھائیں لہرائی۔ وہ لرز کر رہ گئیں۔ ایک گھٹی ہوئی چیخ ہونٹوں تک آکر رُک گئی۔

ارجمند سُلطانہ نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا، کوئی ان کے سرہانے جُھکا ہوا کھڑا تھا۔ اس کا جسم تیز عطر کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ سانس کی سرسراہٹ صاف سُنائی دے رہی تھی۔ کمرے میں پُر ہول سناٹا چھایا تھا۔ پھر اس پُر ہول سناٹے میں ایک مردانہ آواز اُبھری۔ وہ سرگوشی کے انداز میں ٹھہر ٹھہر کر بول رہا تھا۔

"طلعت آرا بیگم!"

"اے طلعت آرا!"

"سو گئیں تم ...؟"

"تم نے روشنی کیوں گُل کر دی؟"

ارجمند سُلطانہ نے سراسیمگی کے عالم میں آنکھیں بند کر لیں۔ آواز رُک رُک کر نہایت مدھم لہجے میں اُبھرتی رہی۔ اس میں بے قراری تھی، حلاوت تھی، اپنائیت تھی، وہ آنکھیں بند کیے سکتے کے سے عالم میں بے سُدھ پڑی رہیں۔ پھر ایک بوجھل مردانہ ہاتھ ان کے رخسار پہ آکر ٹکا۔ ساتھ ہی آواز اُبھری۔ وہ آہستہ آہستہ بول

رہا تھا۔

"طلعت آرا۔ طلعت آرا بیگم!"

"آنکھیں کھولو، دیکھو، میں آگیا ہوں۔"

"تم خاموش کیوں ہو؟"

"دیکھو، میں کتنی دُور سے چل کر آیا ہوں۔"

ارجمند سُلطانہ سہمی ہوئی چُپ لیٹی رہیں۔ نہ انھوں نے آنکھیں کھولیں، نہ زبان سے کچھ کہا اور نہ ہی جسم کو حرکت دی۔ کمرے میں گھُپ اندھیرا تھا اور اس اندھیرے میں وہ اُن کے اس قدر قریب کھڑا تھا کہ وہ اس کی سانس کی ہلکی ہلکی سرسراہٹ تک سُن سکتی تھیں۔ وہ کون تھا، کہاں سے آیا تھا، کیسے آیا تھا؟ ان کو کچھ پتہ نہ تھا۔ ان کی آنکھیں خوف سے ہنوز بند تھیں۔ وہ صرف اس کی آواز سُن رہی تھیں۔ وہ ان کے رُخسار کو ہولے ہولے تھپ تھپا کر کہہ رہا تھا،

"آج پرستان میں جشنِ مہتابی تھا۔ کیا بہار آئی تھی! پریوں کے تخت اُتر رہے تھے۔ دیوان کو اڑا کر لا رہے تھے۔ جدھر نظر جاتی تھی، پریوں اور پری زادوں کے غول کے غول نظر آتے تھے۔ پریاں باغ کی روشوں پر ہنستی قہقہے لگاتی ایک دوسرے سے چھیڑ چھاڑ کر رہی تھیں۔ ہر پری نے اس غضب کا بناؤ سنگار کیا تھا کہ واللہ نظر نہ ٹھیرتی تھی۔" اُس نے گہری سانس بھری۔ "نیلم پری نے تو قیامت ڈھادی۔ کم بخت کی آواز کیا ہے۔ جیسے کوئل کوک رہی ہو۔ گانے کے ساتھ نرت اس طرح بتاتی تھی کہ آنکھوں کے سامنے تصویر کھنچ جاتی۔ شہزادے اور پری زاد دِل تھام کے رہ گئے۔ شاہ جن نے موتیوں سے اس کا مُنہ بھر دیا۔"

وہ شکوہ کرنے لگا: "تم کو کیسے یقین دلاؤں۔ میرا وہاں بالکل دِل نہ لگ رہا تھا۔ تمھاری یاد رہ رہ کے ستاتی تھی۔ ابا حضور، تختِ شاہی پر فروکش تھے۔ رقص اور موسیقی سے دِل بہلاتے تھے، انعام اور اکرام دیتے تھے۔ میں ان کی نظر بچا کر نکلا تو سبز پری مل گئی۔ تم کو تو معلوم ہی ہے کہ وہ میری محبت کا کس قدر دم بھرتی ہے۔

اس نے روکنا چاہا، لگاوٹ کی باتیں شروع کر دیں۔ میں نے اس کو غچّا دیا اور سیدھا یہاں چلا آیا۔ کیا کروں، دل تمھارے لیے بے تاب تھا۔ اگر کسی نے چغلی کھا دی تو کل بادشاہ سلامت کے حضور طلبی ہوگی۔ جلال میں ہوئے تو عتاب نازل ہوگا۔"

وہ رُک رُک کر اور سنبھل سنبھل کر بول رہا تھا۔ اُس کے لباس سے خوشبو کی لپٹیں اُٹھ رہی تھیں۔ لہجے سے بے قراری عیاں تھی۔ اندھیرے میں وہ پُر اسرار سایہ معلوم ہو رہا تھا جو آہستہ آہستہ لہرا رہا تھا، گردش کر رہا تھا۔ ارجمند سُلطانہ دم بخود لیٹی تھیں اور سوچ رہی تھیں کہ یا الٰہی، یہ ماجرہ کیا ہے؟ خواب ہے یا واقعی جنوں کا شہزادہ اُن کے قریب کھڑا ہے؟

وہ اسی اُلجھن میں مُبتلا تھیں کہ یکایک اُس کے لباس میں سرسراہٹ پیدا ہوئی۔ وہ پیچھے ہٹ گیا، درشت لہجے میں گویا ہُوا۔

"تم طلعت آرا معلوم نہیں ہوتیں۔"

ارجمند سُلطانہ نے کچھ نہ کہا۔ دم سادھے پڑی رہیں۔

"کون ہو، تم؟" اس دفعہ اُس نے ڈپٹ کر پوچھا۔ "کیوں آئی ہو؟ کس لیے آئی ہو؟"

وہ پھر بھی خاموش رہیں۔ سہمی ہوئی بستر پر لیٹی رہیں۔ اسی اثنا میں ماچس جلانے کی آواز خاموشی میں اُبھری، ہلکا سا شعلہ بھڑکا، اندھیرے میں ایک ہاتھ نظر آیا جو کنول میں آویزاں موم بتی روشن کر رہا تھا۔ کمرے میں روشنی پھیل گئی۔ ارجمند سُلطانہ اُسے دیکھ نہ سکیں۔ حیران و پریشان ہو کر غور کرنے لگیں کہ وہ کہاں چلا گیا، کدھر چلا گیا؟

☆

وہ عقب سے نکل کر اُن کے سامنے آگیا۔ شمع کی اُجلی اُجلی روشنی میں اُنھوں نے دیکھا، وہ اُن کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ تن زیب کا نہایت عمدہ کڑھا ہُوا سفید

براق کرتا پہنے ہوئے تھا۔ کرتے کی آستینیں چنی ہوئی تھیں۔ کرتے کے اوپر سرخ مخمل کی صدری تھی جس کے حاشیے اور گریبان پر سنہری کلابتو سے زردوزی کا کام تھا۔ سر کے بال بڑے بڑے اور گھنگر والے تھے اور بکھر کر ماتھے پر آگئے تھے۔ بڑی بڑی غلافی آنکھیں، خوبصورت بیضوی چہرہ، سرخ و سفید رنگ، بھرے بھرے مضبوط ہاتھ پاؤں، لمبا تڑنگا جسم، گلے میں پھولوں کا مہکتا ہوا خوب موٹا گجرا۔ واقعی وہ اپنی سج دھج اور کج کلاہی سے پرستان کا شہزادہ ہی لگتا تھا۔

اُسے اپنے رُوبرو پاکر ارجمند سلطانہ بوکھلا گئیں۔ فوراً اُٹھ کر بیٹھ گئیں۔ اُنھوں نے اُس کی جانب دیکھا۔ وہ قہر آلود نظروں سے انھیں گھور رہا تھا۔ ارجمند سلطانہ اُس کی نگاہوں کی تاب نہ لاسکیں۔ اُنھوں نے نظریں جھکالیں۔ زبان سے بھی کچھ نہ کہہ سکیں۔ سہمی ہوئی خاموش بیٹھی رہیں۔

اُس نے غضب ناک ہوکر، ارجمند سلطانہ سے دریافت کیا۔ "کون ہو تم؟ یہاں آنے کی تم کو جرأت کیسے ہوئی؟" اُس کے نتھنے غصے سے پھڑکنے لگے۔ آنکھوں سے چنگاریاں اُڑنے لگیں۔ وہ آگے بڑھا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا عین اُن کے مقابل چٹان کی طرح تن کر کھڑا ہوگیا۔

ارجمند سلطانہ کی نظریں بدستور جھکی ہوئی تھیں اور دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ وہ بُت کی مانند خاموش تھیں۔

مگر وہ خاموش نہ رہا۔ ڈپٹ کر بولا۔ "میں ابھی اپنے غلام کو بلاتا ہوں وہ ہنٹر سے تمھاری کھال ادھیڑ دے گا۔ تم کو ایسی سخت سزا ملے گی کہ اوروں کو بھی عبرت حاصل ہو۔" اُس کی آنکھیں غصے سے سرخ ہوگئیں۔

ارجمند سلطانہ اور زیادہ خوف زدہ ہوگئیں۔ اُن کو نجّو یاد آگئی جس کی پیٹھ پر گہری گہری بلنٹیں پڑی تھیں جن سے خون رس رہا تھا۔

"بولو، تم یہاں کیوں آئیں؟ تم کو یہاں کس نے بھیجا؟ کس لیے بھیجا؟ کیوں بھیجا؟" غیض و غضب کے عالم میں اس کے خوبصورت چہرے پر درشتی چھا گئی۔

جھنجھلا کر پوچھا۔ "طلعت آرا کیوں نہیں آئی؟ اُسے میری نافرمانی کی جرأت کیسے ہوئی؟ اُس نے میرا جلال نہیں دیکھا۔ میں بارہ دری کو تہس نہس کر دوں گا۔ اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا۔"

ارجمند سلطانہ کی سٹّی گمُ ہو گئی۔ کچھ بھی نہ کہہ سکیں۔

"میں پوچھتا ہوں، وہ آج کیوں نہیں آئی؟ تم، اُس کے بجائے کیوں آئیں؟" وہ سخت طیش کے عالم میں تھا۔ تیزی سے ایک کے بعد دوسرا سوال کر رہا تھا۔

وہ اُس کے کسی سوال کا جواب نہ دے سکیں۔ وہ حواس باختہ ہو رہی تھیں۔ اُن کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ایسی خوفناک صورتِ حال سے دوچار ہونا پڑے گا۔ وہ حیران و پریشان بیٹھی تھیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کہیں اور کیسے کہیں۔ مُنہ پر جیسے قفل پڑ گیا تھا۔

"تم بولتیں کیوں نہیں؟" اس دفعہ اُس نے زور سے ڈانٹا۔ "بولو، چپ کیوں ہو؟ گونگی ہو؟ تمھارے مُنہ میں زبان نہیں ہے؟ بولو، بتاؤ۔"

"کیا۔؟" گھبراہٹ اور سراسیمگی میں ارجمند سلطانہ کے مُنہ سے صرف اتنا ہی نکل سکا۔

"یہ بتاؤ، تم کون ہو؟" اُس نے دریافت کیا۔

وہ آہستہ سے بولیں۔ "م... میں... میں، رانی حیدر گڑھ ہوں۔" وہ اٹکیں، جھجکیں پھر اُن کا لہجہ باوقار ہو گیا۔ "میرا نام پرنسس ارجمند سُلطانہ ہے۔"

ارجمند سُلطانہ نے جھجکتے ہوئے اُس کی جانب دیکھا۔ وہ کچھ سٹ پٹا سا گیا۔ حیرت زدہ ہو کر بولا۔ "آپ رانی حیدر گڑھ ہیں؟" اُس کے چہرے کا رنگ دفعتہً بدل گیا۔ لہجہ بھی تبدیل ہو گیا۔ "آپ یہاں کیوں آئی ہیں؟"

اُنھوں نے اُس کے لہجے کی تبدیلی کو بھانپ لیا۔ خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ اب وہ اس ڈراؤنے خواب سے بیدار ہو چکی تھیں جو کمرے کے آسیب زدہ ماحول نے طاری کر دیا تھا۔ اُن کے چہرے پر چھائے ہوئے خوف کے سائے آہستہ

آہستہ مٹنے لگے۔ دل کی بے ترتیب دھڑکن اعتدال پر آتی جارہی تھی۔

ارجمند سلطانہ نے اس دفعہ نظر بھر کر، اُس کا چہرہ دیکھا۔ شکل و صورت اور بات چیت سے وہ بالکل عام انسانوں کی طرح نظر آتا تھا۔ اُس میں کوئی بھی ایسی انوکھی اور غیر معمولی خصوصیت نہیں تھی جس سے اندازہ ہوتا کہ وہ جن یا پری زاد ہے۔ جس قدر یہ احساس قوی ہوتا گیا، اس کی پُراسرار شخصیت کا سحر کم ہوتا گیا۔

وہ ارجمند سلطانہ کے رُو برُو خاموش کھڑا تھا۔ اُس کا خوبصورت اور دل آویز چہرہ سوچتا ہوا نظر آرہا تھا۔ وہ اُس کی وجاہت اور رعنائی سے متاثر بھی ہوئیں۔ اُنھوں نے دریافت کیا۔ "تم یہ کیوں معلوم کرنا چاہتے ہو کہ میں یہاں کیوں آئی ہوں، کس لیے آئی ہوں؟" اُن کے لہجے سے دبا دبا خوف جھلکتا تھا۔ وہ اُس کی پُراسرار شخصیت کے حصار سے ہنوز باہر نہ نکل سکی تھیں۔

"دیکھیے، آپ اس معاملے میں نہ پڑیں ورنہ نتیجہ بہت بُرا ہوگا۔" یہ سیدھی سادی دھمکی تھی۔

مگر ارجمند سلطانہ اس دھمکی سے خائف نہ ہوئیں بلکہ رہا سہا خوف بھی جاتا رہا۔ وہ، اُن کو اب تم کے بجائے آپ کہہ کر مخاطب کر رہا تھا۔ اُس کے رویّے میں پہلے جو طنطنہ اور کرّوفر تھا، مدّھم پڑ چکا تھا۔ لہجے سے جارحیّت کے بجائے پسپائی جھلکتی تھی۔ ارجمند سلطانہ اب پوری طرح سنبھل چکی تھیں۔ وہ صرف ارجمند سلطانہ نہ رہی تھیں، رانی حیدر گڑھ بن چکی تھیں۔ ان کے چہرے پر رفتہ رفتہ جاگیردارانہ رُعب و دبدبہ اُجاگر ہو رہا تھا۔

"تم مجھے دھمکی دے رہے ہو؟" اُنھوں نے تیوری پر بل ڈال کر کہا۔

"میں دھمکی نہیں دے رہا ہوں، صرف آپ کو خبردار کرنا چاہتا ہوں۔"

ارجمند سلطانہ کا لہجہ جس قدر تیز اور تیکھا تھا، وہ اسی قدر نرمی سے بول رہا تھا۔ ارجمند سلطانہ کا حوصلہ اور بڑھا۔ نڈر ہو کر پوچھا۔ "تم چاہتے کیا ہو؟" اُن کے لہجے سے خود اعتمادی عیاں تھی۔

"میں چاہتا ہوں کہ آپ فوراً چلی جائیں اور طلعت آرا کو یہاں آنے سے روکنے کی کوشش نہ کریں۔"

"اگر وہ یہاں نہ آنا چاہے تو؟" ارجمند سلطانہ نے استفہامیہ نظروں سے اُسے دیکھا۔ پہلو بدلا اور تکیے کا سہارا لے کر اطمینان سے بیٹھ گئیں۔

"نہیں، وہ ایسی جرأت نہیں کر سکتی۔" ایک بار پھر اُس کا لہجہ جارحانہ ہو گیا۔

"وہ ہرگز ایسا نہیں کر سکتی۔"

"یہ بتاؤ، تم ہو کون؟"

"میں کوئی بھی ہوں۔" اچانک اُس کے چہرے پر جھنجلاہٹ اُبھری۔ آواز میں دبدبہ پیدا ہو گیا۔ "یہ معلوم کرنے کی کوشش نہ کریں۔" اُس نے ارجمند سلطانہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "آپ وہی کریں جو میں نے کہا ہے۔ ابھی آپ نے میرا جلال نہیں دیکھا۔"

اُس کا چہرہ سُرخ پڑ گیا۔ تیوری پر بل پڑ گئے۔ آنکھوں سے غیظ و غضب عیاں تھا۔ وہ ارجمند سلطانہ کو مرعوب کرنا چاہتا تھا مگر وہ ذرا مرعوب نہ ہوئیں۔ کہنے لگیں۔ "تم کوئی بھی ہو مگر یہ سمجھ لو کہ میں مغلانی کی بھانجی سنجو نہیں ہوں جسے تم نے ہنٹر مار مار کر اُدھیڑ ڈالا اور نہ میں حضور بیگم کی طرح وہمی اور توہم پرست ہوں۔ میں جنوں وتوں کو نہیں مانتی، بالکل نہیں مانتی۔ اُن کا لہجہ تند اور تیز ہو گیا۔

"آپ جنوں کو نہیں مانتیں؟" وہ حیرت زدہ ہو کر بولا۔ "واللہ! یہ آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔" اس کا سارا طنطنہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ آنکھیں پھاڑ کر احمق کی طرح، اُن کا مُنہ تکنے لگا۔

"کہہ تو دیا کہ میں بالکل نہیں مانتی۔" ارجمند سُلطانہ کا لہجہ اور درشت ہو گیا۔ "کہو تو پوائنیر اخبار کے ذریعے باقاعدہ اعلان کر دوں کہ میں جن، آسیب کو بالکل نہیں مانتی۔"

"بادشاہ غازی الدین حیدر کی ملکہ بادشاہ بیگم کے بارے میں تو آپ نے سُنا

ہی ہوگا۔"

ارجمند سلطانہ نے اُسے پوری بات کہنے کا موقع نہ دیا۔ مُنہ بگاڑ کر ٹوکا۔ "تم مجھے یہ بتانا چاہتے ہو کہ ان پر شاہِ جن عاشق تھے اور اُن کا یہ معمول تھا کہ ہر جمعرات کو لباسِ فاخرہ اور جواہرات پہنتی تھیں۔ خوب بناؤ سنگار کرتی تھیں اور خود کو عطر میں بسا کر محل کے ایک آراستہ و پیراستہ عالیشان کمرے میں شام ہوتے ہی دروازے بند کر کے بیٹھ جاتی تھیں۔ کسی خواص یا کنیز کو اندر جانے کی اجازت نہ تھی۔ شاہِ جن اُن کے پاس آتے تھے اور صبح تک قیام کرتے تھے۔" اُنھوں نے اُس کی جانب تیکھی نظروں سے دیکھا۔ "تم یہی بتانا چاہتے تھے، نا؟"

"جی ہاں، تو کیا یہ غلط ہے؟" اُس نے اپنی بات پر زور دے کر کہا۔ "میں نے تو یہ بھی سُنا ہے کہ وہ کمرہ نہیں بلکہ علیحدہ محل تھا، اُسے بیٹھک کہا جاتا تھا جب شاہِ جن آتے تو بادشاہ بیگم کے حکم پر بیٹھک میں ڈومنیاں بُلائی جاتیں جو شاہِ جن کے رُوبرُو گاتیں، انعام واکرام پاتیں۔ کسی کو پانچ سو، کسی کو ہزار اور کسی کسی کو تو دو، دو ہزار تک مِلتے۔" وہ آہستہ آہستہ بولتا رہا۔ "شاہ جن کے ہمراہ پریاں بھی آتیں تھیں اور ایک شہزادہ بھی آتا تھا جو شہزادہ نصیرالدّین حیدر کے ساتھ کھیلتا، جو خود بھی اس وقت بہت کم سن تھے اور بادشاہ بیگم کے ساتھ بیٹھک میں موجود ہوتے تھے۔" اُس نے ارجمند سلطانہ کے چہرے کو نظر بھر کر دیکھا۔ "یہ باتیں تو سب ہی جانتے ہیں۔ آپ نے بھی سُنی ہوں گی۔"

"بادشاہ بیگم کو تو مالیخولیا ہو گیا تھا۔ وہ تو خبطن اور سودائی تھیں۔ نہ جانے ایسی اور کیا کیا حرکتیں کرتی تھیں۔ بلکہ مشہور تو یہ ہے کہ غازی الدّین حیدر کو مرعوب کرنے کے لئے طرح طرح کے ڈھونگ رچاتی تھیں۔ ان کے بارے میں ایسے قصّے کہانیاں میں اپنی والدہ مرحومہ اور ان کی بُوڑھی خادماؤں کی زبانی بچپن میں بہت سُن چکی ہوں۔" اُنھوں نے بے نیازی سے کہا۔

"واللہ! یہ آپ کیا فرما رہی ہیں۔ کیا آپ کو شبہ ہے کہ ان کے پاس شاہ

جن اور پریاں نہیں آتی تھیں؟" اُس نے آنکھیں پھاڑ کر تعجّب کا اظہار کیا۔ "یہ تو آپ جانتی ہی ہوں گی کہ شہر میں ایک، چھوڑ، جنّوں کی دو مسجدیں بھی ہیں۔"

یہ بات اُس نے اس قدر سادگی سے کہی کہ اُس کا رہا سہا بھرم بھی ختم ہو گیا۔ اس کی باتیں سن کر ارجمند سلطانہ کو اندازہ ہو گیا کہ وہ جس قدر وجیہہ اور خوش رُو تھا، اتنا ذہین اور ہوشیار نہ تھا۔ پڑھا لکھا بھی واجبی سا معلوم ہوتا تھا۔ حضور بیگم کی طرح خود بھی توہم پرست تھا۔

"میں کیا جانتی ہوں اور کیا نہیں جانتی مگر یہ ضرور جانتی ہوں کہ تم نہ جن ہو، نہ پری زاد۔" اس دفعہ اُنھوں نے اُسے کھل کر دھمکی دی۔ "جو کچھ تم بتانا چاہتے تھے، بتا چکے۔ اب میں تم کو یہ بتانا چاہتی ہوں کہ پہلے میرا ارادہ تھا کہ پولیس میں رپورٹ کروں اور اُس کی مدد طلب کروں۔ مگر میں نے فی الحال یہ ارادہ ملتوی کر دیا۔ ورنہ اس کمرے میں آج میرے بجائے پولیس کا کوئی افسر یا تھانے دار ہوتا اور فراڈ اور جعل سازی کے جرم میں تمھارے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پڑی ہوتیں۔"

وہ نہایت اعتماد اور روانی سے بول رہی تھیں۔ وہ رفتہ رفتہ اُس پر حاوی ہوتی جا رہی تھیں اور ڈرا دھمکا کر اس طرح اپنے قابو میں لانا چاہتی تھیں کہ گھبرا کر سب کچھ، اُن کے سامنے صاف صاف اُگل دے۔ اُن کا یہ حربہ کارگر ثابت ہوا۔ پولیس کا نام سُن کر وہ اس قدر پریشان ہو گیا کہ چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ آنکھوں سے خوف جھلکنے لگا۔ حواس باختہ ہو کر صفائی پیش کرنے لگا۔

"دیکھئے، رانی صاحبہ! میں نے یہ سب کچھ جان بوجھ کر نہیں کیا۔"

"مجھے تو یہ کوئی خطرناک سازش معلوم ہوتی ہے۔" ارجمند سلطانہ اُس کی صفائی سے متاثر نہیں ہوئیں۔ تیکھے لہجے میں بولیں۔ "نواب پھوپھا" اُنھوں نے قدرے تامل کیا۔ "میرا مطلب ہے، طلعت آرا کے والد۔ وہ میرے رشتے کے پھوپھا تھے۔ اُن کی موت بھی بڑے پُر اسرار حالات میں ہوئی تھی۔ اُن کی موت کے بارے میں بھی جنّوں کا ڈھونگ رچایا گیا تھا۔" ارجمند سلطانہ نے نظر بھر کر، اُس کی جانب دیکھا۔ "مجھے تو شبہ ہے کہ اُن کو زہر دے کر قتل کیا گیا تھا۔"

"آپ کا شبہ درست ہے۔ نواب تقی کو قتل ہی کیا گیا تھا مگر زہر کے بجائے پان کی گلوری میں شیر کی مونچھ کا بال رکھ کر کھلایا گیا تھا۔ سُنا ہے، اُس سے دل کٹ کٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے۔ تب ہی تو اُن کو خون کی قے ہوئی تھی۔" وہ، اُن کی خوش نودی حاصل کرنے کی غرض سے سنبھل سنبھل کر تفصیل سے بتاتا رہا۔

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ میری اطلاع غلط نہ تھی کہ نواب پھوپھا کو باقاعدہ سازش کے تحت قتل کیا گیا۔"

"اس سازش میں نواب تقی مرحوم کا کبّن نامی ایک ملازم بھی شریک تھا۔" اُس نے مزید تفصیل بتائی۔ "ایک بار اس نے دیوان خانے میں بھی اُن کو قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔"

"یہ وہی تھا جو کفن لپیٹ کر، رات کو نمودار ہوتا تھا؟" ارجمند سلطانہ نے دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے دریافت کیا۔

"جی ہاں، وہ کبّن ہی تھا۔ سُنا ہے، نواب تقی کے انتقال کے کچھ ہی عرصے بعد اُس نے بارہ دری کی ملازمت چھوڑ دی تھی اور اب نواب صفی کا مُلازم ہے۔"

"تو گویا نواب پھوپھا کے قتل میں اُن کے سوتیلے بڑے بھائی نواب صفی کا ہاتھ تھا۔" ارجمند سلطانہ نے قیاس آرائی کی۔

"بالکل اُن کا ہاتھ تھا۔ بلکہ میں نے تو سنا ہے کہ انھی نے قتل کروایا تھا۔" اُس نے اُن کے خیال کی تصدیق کر دی۔ "یہ تو آپ جانتی ہی ہیں کہ جائیداد کے بٹوارے کے سلسلے میں دونوں بھائیوں کے درمیان مدّت سے مقدمے بازی ہو رہی تھی اور آپ کو یہ بھی علم ہوگا کہ نواب تقی کے مرتے ہی نواب صفی کا مقدمہ مضبوط ہو گیا۔"

اس سنسنی خیز انکشاف پر ارجمند سُلطانہ نے حیرت زدہ ہو کر دبی زبان سے پوچھا۔ "سچ سچ بتاؤ، کیا تم بھی اس سازش میں شریک تھے؟"

"قسم ہے، جناب امیر کی۔ میرا تو اس قضیے سے دُور دُور تک کوئی تعلق نہیں۔" وہ بوکھلا کر بولا۔ "میں، آپ سے غلط نہیں کہہ رہا ہوں۔ یہ باتیں بھی مجھے کچھ ہی عرصے

قبل معلوم ہوئی ہیں۔ تہوّر علی خان نے میرے دوست آغا جانی کو بتائی تھیں اور آغا جانی سے میں نے سُنیں۔ میں تو تہوّر علی خان کو جانتا بھی نہیں۔"

"جہاں تک مجھے یاد آتا ہے، تہوّر علی خان تو نواب صفی کی بیگم انجمن آرا کے چھوٹے بھائی ہیں۔" ارجمند سلطانہ نے کرید کر پوچھا۔ "تم ابھی تہوّر علی خان کے بارے میں کہہ رہے ہو، نا؟" اُنھوں نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر اُسے دیکھا۔ "مگر وہ ایسی باتیں اپنے بہنوئی کے خلاف کیسے کہہ سکتے ہیں۔ بلکہ میں نے سُنا ہے کہ وہ تو نواب صفی کے دستِ راست ہیں۔ سائے کی طرح ہر دَم اُن کے ساتھ رہتے ہیں۔"

"مگر آج کل دونوں میں سخت اَن بن ہے۔ ہوا یہ کہ پچھلے دنوں، بٹیروں کی پالی میں کسی بات پر ایسا زبردست جھگڑا ہوا کہ گالم گلوچ سے بڑھ کر ہاتھا پائی تک نوبت آگئی۔ سُننے میں تو یہاں تک آیا ہے کہ تہوّر علی خان نے غضب ناک ہوکر خنجر نکال لیا۔ وہ ہیں بھی بڑے شورہ پُشت۔ مگر لوگوں نے بیچ بچاؤ کرادیا۔ اس روز سے تعلقات ایسے کشیدہ ہوئے کہ نواب صفی نے اپنی محل سرا میں اُن کی آمد و رفت بند کرادی ہے، صُورت تک دیکھنے کے رَوادار نہیں۔ اب تہوّر علی خان، اُن کے خلاف زہر اُگلتے پھرتے ہیں، عقدہ کُشائی کرتے ہیں۔"

اُس کی باتوں میں نہ تصنّع تھی نہ بناوٹ۔ ایسی سادگی اور سادہ لوحی تھی جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ جرائم پیشہ نہ تھا۔ کسی طور کائیاں یا چلتا پُرزہ نظر نہ آتا تھا۔ عمر بھی بائیس تیئیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ اس قدر کچّا اور بڑبولا تھا کہ خود بخود ساری باتیں اُگلنے پر آمادہ ہوگیا۔

ارجمند سلطانہ بغور اس کے چہرے کا جائزہ لیتی رہیں۔ معاً ایسا محسوس ہوا کہ اُنھوں نے اسے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔ اس کا چہرہ، اُن کو مانوس سا معلوم ہوا۔ یہ خیال ذہن میں ایسا جاگزیں ہُوا کہ اُنھوں نے بے چین ہوکر پوچھا۔ "تم نے اب تک یہ نہیں بتایا کہ تمھارا نام کیا ہے؟" ارجمند سلطانہ نے اُس کے چہرے سے نظریں نہ ہٹائیں۔

"قیصر مرزا۔" اُس نے مختصر جواب دیا۔

مگر یہ نام ارجمند سلطانہ کے لیے قطعی اجنبی تھا۔ پہلی بار سُننے میں آیا تھا۔ اُنھوں نے مزید تفتیش کرنے کی غرض سے دریافت کیا۔ "کس کے لڑکے ہو؟"

"والد کا نام تو نواب تفضّل مرزا ہے۔ مگر سب اُن کو نواب بُوٹا کے نام سے جانتے ہیں۔"

نواب بُوٹا کا نام سُن کر ارجمند سلطانہ چونکیں۔ حیرت زدہ ہو کر بولیں۔ "وہی نواب بُوٹا تو نہیں جو پرانے حیدر گنج میں رہتے ہیں۔ ذرا سا ہکلا کر بولتے ہیں؟"

ارجمند سلطانہ بولتی رہیں اور قیصر مرزا کے چہرے کا بغور جائزہ لیتی رہیں۔ اُنھوں نے غور کیا کہ قیصر مرزا کے چہرے سے باپ کی شباہت صاف جھلکتی تھی۔ نواب بُوٹا لگ بھگ اُسی کی عمر کے تھے تو ہُو بہو ایسے ہی تھے۔ وہی غلافی آنکھیں، وہی سبل ناک نقشہ، وہی رنگ رُوپ، وہی گردن کو ہلکا سا خم دے کر، نظریں اُٹھانے کا انداز۔

"جی ہاں، وہی نواب بُوٹا۔" قیصر مرزا نے ان کی بات کی تصدیق کر دی۔ "میں اُن کا بیٹا ہُوں۔ مجھ سے چھوٹی دو بہنیں ہیں۔" اُس نے توقّف کیا پھر جھجکتے ہوئے دریافت کیا۔ "رانی صاحبہ! آپ ابّا جان کو جانتی ہیں؟"

ارجمند سلطانہ نے بڑی بے نیازی سے جواب دیا۔ "نہیں، میں اُن سے واقف نہیں۔ صرف نام سُنا ہے۔" وہ صاف مُکر گئیں۔ حالانکہ وہ نواب بُوٹا سے بخوبی واقف تھیں۔ اُن کو ایک بار نہیں، کئی بار دیکھا بھی تھا۔

(۴)

برسوں پُرانی بات ہے۔ اس وقت ارجمند سلطانہ بہت الھڑ اور شوخ تھیں۔ نواب بُوٹا اپنے والد نواب مرزا فضل علی کے ہمراہ بادشاہ باغ والی کوٹھی میں آئے تھے۔ ارجمند سلطانہ اپنے والد یاور علی خان اور والدہ کے ساتھ وہیں مقیم تھیں۔ اُنھیں اب تک یاد تھا۔ موسم گرما کا آغاز ہو چکا تھا۔ دُھوپ کی تمازت بڑھ گئی تھی مگر ابھی لُو چلنا شروع نہ ہوئی تھی۔ نینی تال جانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ راجہ یاور علی خان کے سیکرٹری، دو مُلازموں کے ہمراہ، کوٹھی کی صفائی اور دوسرے ضروری انتظامات کے

لیے پہلے ہی نینی تال پہنچ چکے تھے۔

نواب بوٹا کی والدہ، نجم النساء بھی آئی تھیں۔ ایسی ہنس مکھ اور خوش طبع تھیں کہ بات بات پر مسکراتیں۔ ارجمند سلطانہ نے جھک کر آداب کیا تو انھوں نے بڑے پیار سے بلا کر اپنے پہلو میں بٹھایا۔ شفقت سے سر پر ہاتھ پھیرا، سینے سے لگا کر دعائیں دیں۔ "جیتی رہو، پھولو پھلو۔" ان کا لباس تیز خوشبو سے مہک رہا تھا۔ خوشبو اس قدر تیز تھی کہ ارجمند سلطانہ کا دم گھٹنے لگا تھا۔

ارجمند سلطانہ کی والدہ قریب ہی بیٹھی تھیں۔ نجم النساء نے ان کو مخاطب کر کے کہا۔ "صغریٰ بیگم! تمھاری بچّی تو ماشاءاللہ، اب سیانی ہو گئی۔ کب تک کولھے سے لگا کر بٹھائے رکھو گی۔" انھوں نے مڑ کر ایسی معنی خیز نظروں سے دیکھا تھا کہ ارجمند سلطانہ، ان کا مطلب بھانپ گئی تھیں۔

انھیں یاد آیا کہ جب وہ کمرے سے نکل کر باہر آئی تھیں تو ان کی منہ چڑھی ملازمہ چندن نے مسکرا کر چھیڑا تھا۔ "کنور رانی: آپ کا رشتہ آیا ہے۔" پھر کان کے قریب منہ لا کر آہستہ سے بولی۔ "دولھا میاں بھی تو آئے ہیں۔ راجہ صاحب کے ساتھ مردانے میں بیٹھے ہیں۔" وہ کھلکھلا کر ہنسی۔

ارجمند سلطانہ بھی ہنسنے لگی تھیں۔ ان کو نہ تو شرم محسوس ہوئی نہ حجاب بلکہ دولھا میاں کو دیکھنے ڈرائنگ روم کی جانب چلیں۔ مگر دہلیز پر پہنچ کر ٹھٹک گئیں، کمرے کے اندر نہ گئیں۔ چندن بھی سائے کی طرح ساتھ ساتھ تھی۔ دونوں نے پردے کی اوٹ سے جھانک کر نظریں دوڑائیں۔ چندن نے اشارے سے بتایا۔

ارجمند سلطانہ نے دیکھا، نواب بوٹا سامنے ہی بیٹھے تھے۔ اس وقت وہ جامدانی کا انگرکھا پہنے ہوئے تھے۔ سر پر ذرا ترچھی دوپلّی ٹوپی، کھلی موری کا سفید برّاق پائجامہ اور پیروں میں زرد مخمل کا نیا جوتا جس پر چاندی کا بکلس لگا تھا۔ ترشی ہوئی ہلکی بھوری مونچھیں۔ وہ تو آبی آن بان سے خوب بن ٹھن کر آئے تھے۔ مگر بزرگوں کے روبرو شرمائے ہوئے مودّب بیٹھے تھے۔

اس خالص لکھنوی وضع قطع میں وہ بڑے بانکے سجیلے جوان نظر آرہے تھے۔ مگر جب وہ بات کرتے کرتے ذرا سا ہکلائے تو ارجمند سلطانہ کے لیے ہنسی ضبط کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ البتہ وہ اُن کی مردانہ وجاہت اور حسن و جمال سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں۔ بڑی بڑی خلافی آنکھیں تو ایسی غضب کی کشش انگیز تھیں کہ دل میں اُترتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ اس کا اندازہ اُن کو اس وقت ہوا جب نواب بوٹا نے گردن کو ہلکا سا خم دے کر اچانک دروازے کی سمت دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ ارجمند سلطانہ کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ چہرہ گلابی ہو گیا۔ نگاہیں خود بخود جھک گئیں۔

وہ فوراً دروازے سے ہٹ گئیں۔ بعد میں نواب بوٹا کے بارے میں دیر تک سوچتی رہیں۔ ان کو اچھی طرح یاد تھا کہ نواب بوٹا اپنے والد اور والدہ کے ساتھ شام تک ٹھہرے تھے۔ دوپہر کا کھانا کھا کر آرام بھی کیا تھا۔

اس روز گرمی کچھ زیادہ ہی تھی۔ ارجمند سلطانہ اپنے کمرے میں بستر پر لیٹی تھیں۔ یہ اپریل کی ایک تپتی ہوئی سہ پہر تھی۔ اُن کو نیند نہیں آرہی تھی۔ کمرے کی ایک کھڑکی باغ میں کھلتی تھی۔ کھڑکی کے عین نیچے خشک پتّوں پر قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ اُنھوں نے چونک کر اس طرف دیکھا۔ فوراً اُٹھ کر کھڑکی پر پہنچیں۔ جھک کر باہر نظر ڈالی اور یہ دیکھ کر حیران ہوئیں کہ نواب بوٹا چلچلاتی دھوپ میں دبے دبے قدموں دیوار کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ اُن کی پیٹھ ارجمند سلطانہ کی جانب تھی۔

اُنھوں نے چلتے چلتے ٹھٹک کر پیچھے دیکھا۔ ایک بار پھر دونوں کی نظروں کا تصادم ہوا۔ ارجمند سلطانہ گھبرا گئیں۔ اُنھوں نے جھٹ کھڑکی کے دونوں پٹ بند کر دیے۔ مُڑیں اور واپس جا کر بستر پر بیٹھ گئیں، اُن کے دل میں ہلچل برپا تھی۔ سانس ٹھہر ٹھہر کر چل رہی تھی۔

آدھ گھنٹہ بھی نہ گزرا تھا کہ چندن مسکراتی ہوئی، اُن کے کمرے میں داخل ہوئی اور کاغذ کا تہ کیا ہوا ایک پرزہ اُن کے ہاتھ میں دے دیا۔ ارجمند سلطانہ نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔ ”یہ کیا ہے؟“ وہ اُسے غور سے دیکھنے لگیں۔

چندن نے شوخی سے مُسکرا کر بتایا۔ "اُنھوں نے بھجوایا ہے، جن کی اماں جان آپ کو اپنی بہو بنانا چاہتی ہیں۔"

ارجمند سُلطانہ نے تیکھی نظروں سے چندن کی جانب دیکھا۔ کاغذ کھول کر پڑھا۔ اس پر یہ اشعار لکھے ہوئے تھے۔

میرے حال پر گر نہ تھی چشمِ لطف!
تو چھپ چھپ کہ آنکھیں لڑانا تھا کیا
دکھانا نہ تھا، پھر جو منہ چاند سا
تو پھر ایک بار صورت دکھانا تھا کیا

نواب بُوٹا کا یہ طرزِ اظہارِ محبّت ارجمند سُلطانہ کو بڑا عامیانہ سا معلوم ہوا۔ اُنھوں نے جھنجھلا کر کاغذ کے پرزے کو ہتھیلی میں دبا کر زور سے مَلا، چندن کے مُنہ پر مارا اور اُسے دھتکار کر کمرے سے باہر نِکال دیا۔

☆

راجہ یاور علی خان نینی تال کے لیے روانہ ہو گئے۔ بیگم کے علاوہ بیٹی ارجمند سُلطانہ بھی ان کے ہمراہ تھیں۔ سٹی اسٹیشن پر نواب فضل علی ان کو رخصت کرنے پہنچے۔ نواب بوٹا بھی باپ کے ساتھ تھے۔

ریل گاڑی آنے میں ابھی کچھ وقت رہتا تھا۔ راجہ یاور علی خان اور نواب فضل علی باتوں میں مصروف تھے۔ والدہ ویٹنگ روم میں بیٹھی تھیں۔ ارجمند سلطانہ سے ویٹنگ روم میں بیٹھا نہ گیا۔ اکتا کر باہر نکلیں اور پلیٹ فارم پر ٹہلتی ہوئی آخری سرے تک چلی گئیں۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ گرمیوں کی بوجھل شام آہستہ آہستہ نیچے اُتر رہی تھی۔

اسٹیشن کی چہل پہل رفتہ رفتہ بڑھتی جا رہی تھی۔ لیکن ارجمند سلطانہ پلیٹ فارم کے نکڑ پر الگ تھلگ خاموش کھڑی تھیں اور اس پل کی جانب دیکھ رہی تھیں جس کے

نیچے سے شاہ مینا روڈ گزرتی تھی۔ پل کے دائیں جانب نیم کے درختوں کا جھنڈ تھا جس پر کوّوں کا غول شور مچاتا ہوا منڈلا رہا تھا۔ درختوں کے نیچے مختصر سا قبرستان تھا۔ انھی قبروں میں میر تقی میر کی قبر بھی شامل تھی، جنھوں نے اپنی نازک مزاجی کا اظہار ایک شعر میں اس طرح کیا تھا۔

سرہانے میر کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

اب ان کی قبر کے سرہانے ریل گاڑیاں، لوہے کی پٹریوں پر دن رات شور مچاتی، چنگھارتی، دھڑ دھڑ کرتی گزرتی تھیں۔ قبر پر کسی نے مدّت سے چراغ بھی روشن نہیں کیا تھا۔ یہ بھی صحیح طور پر علم نہ تھا کہ ان قبروں میں میر تقی میر کی قبر کونسی ہے۔ کتنی ہی قبریں ٹوٹ پھوٹ کر کھنڈر بن چکی تھیں۔

ارجمند سلطانہ قبرستان کی زبوں حالی سے بے نیاز ان روشنیوں کو دیکھ رہی تھیں جو قبروں کے آس پاس جھونپڑیوں میں ٹمٹماتے ہوئے چراغوں سے پھوٹ رہی تھیں۔

دفعتاً اُنھوں نے اپنے عقب میں کسی کے آہستہ سے کھنکارنے کی آواز سنی۔ ارجمند سلطانہ نے مڑ کر دیکھا۔ نواب بوٹا اُن کے سامنے کھڑے تھے۔ ان کا شگفتہ چہرہ اُترا ہوا تھا۔ روشن آنکھوں کے کنول بجھے، بجھے نظر آتے تھے۔ ارجمند سلطانہ فوراً تاڑ گئیں کہ وہ اس قدر غم زدہ اور اُداس اس لیے ہیں کہ راجہ یاور علی خان نے ان کا رشتہ مسترد کر دیا تھا۔ انھوں نے اس سلسلے میں ارجمند سلطانہ سے بھی بات کرنے کی زحمت گوارہ نہ کی اور اگر وہ ان کی رائے معلوم بھی کرتے تو وہ بھی صاف انکار کر دیتیں۔

ارجمند سُلطانہ سوچ ہی رہی تھیں کہ اب وہ کیوں ان کے پاس آئے ہیں۔ لیکن انھوں نے خود ہی عقدہ حل کر دیا۔ بجھے ہوئے لہجے میں بولے۔ "میں اس لیے حاضر ہوا تھا کہ اس روز مجھ سے جو گستاخی سرزد ہوئی تھی، اس پر میں سخت نادم ہوں، معذرت خواہ ہوں۔" وہ نہ جھجکے نہ ہکلائے۔ نہایت روانی سے اپنی بات کہی، مڑے اور خاموشی سے چلے گئے۔

نواب بوٹا کو انھوں نے پھر کبھی نہیں دیکھا۔ البتہ نواب بوٹا کا نام بھی ان کے

عشاق کی فہرست میں شامل ہو گیا۔ عمر ڈھلی، حسن و رعنائی کے آفتاب کو گہن لگا اور جوانی نے رخت سفر باندھا تو ارجمند سلطانہ کو ماضی کی سہانی یادیں تڑپانے لگیں۔ ان یادوں کی یلغار میں نواب بوٹا کی یاد کی بھی کبھی کبھار جھلک نظر آتی۔ قیصر مرزا کو دیکھ کر وہ یاد تازہ ہو گئی مگر انھوں نے اس کا اظہار نہ کیا۔ گنجائش بھی نہ تھی۔ وہ یادوں کی پگڈنڈی پر بھٹکتی ہوئی بہت دور نکل گئیں تھیں۔

(۵)

کمرے میں گہرا سکوت تھا۔ باہر چاندنی میں مولسری کے خشک پتّے ہوا کے جھونکوں سے کھڑکھڑا رہے تھے۔ رات رفتہ، رفتہ ڈھلتی جا رہی تھی۔ یکایک گلی کے پختہ فرش پر گشت کرنے والے کانسٹیبل کے بھاری بھاری قدموں کی آواز رات کے سناٹے میں اُبھری۔ وہ زور سے کھنکارا، پھر اس کی آواز بلند ہوئی:

"ہوشیار، خبردار!"
"جاگنے والو، جاگتے رہو"
"گلی میں کھٹکا ہے"

عین اس وقت قریب کی کسی گلی میں سیٹی بجنے کی آواز سنائی دی۔ اس سیٹی کے ساتھ ہی مختلف سمتوں سے سیٹیاں بجنے لگیں۔ قیصر مرزا نے بے چین ہو کر دروازے کی طرف دیکھا۔ خوف اس کے چہرے پر سایہ بن کر پھیل گیا۔

رانی حیدر گڑھ نے بھی اس کی گھبراہٹ اور سراسیمگی محسوس کی۔ انھوں نے قیصر مرزا کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ نرم لہجے میں مخاطب کیا۔ "قیصر مرزا! کھڑے کیوں ہو؟ بیٹھ جاؤ۔"

اس نے کمرے کے ایک گوشے میں رکھی ہوئی کرسی اُٹھائی، قریب لایا اور اس پر بیٹھ گیا، مگر زبان سے ایک لفظ نہ نکالا۔ اس کے چہرے پر چھائی ہوئی گھبراہٹ اور سراسیمگی مٹتی جا رہی تھی۔ وہ اب غمزدہ اور اداس نظر آ رہا تھا۔

ارجمند سلطانہ مسہری پر تکئے کے سہارے بیٹھی تھیں۔ قیصر مرزا نظریں جھکائے ان کے روبرو گم صم بیٹھا تھا۔ انھوں نے اُس کے چہرے کو ایک بار پھر غور سے دیکھا۔ وہ اس وقت ہو بہو نواب بوٹا نظر آرہا تھا۔ اُس آنکھوں میں وہی حزن و ملال جھلک رہا تھا جو انھوں نے آخری ملاقات میں نواب بوٹا کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔ وہ ان کے بارے میں سوچنے لگیں۔

قیصر مرزا نے ان کو خاموش پایا تو زیادہ دیر چپ نہ رہ سکا۔ نگاہیں اُٹھا کر ارجمند سلطانہ کی جانب دیکھا۔ نرم لہجے میں دریافت کیا۔ "رانی صاحبہ! آپ کس سوچ میں پڑ گیئں؟"

انھوں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور فوراً بات بنائی۔ "سوچ رہی تھی کہ جب تم کمرے میں داخل ہوئے تھے تو گھپ اندھیرا تھا۔ تم نے اندھیرے میں کیسے اندازہ لگایا کہ بستر پر طلعت آرا کے بجائے کوئی اور موجود ہے؟"

"طلعت آرا جب یہاں آتی ہیں، تو ہمیشہ شمامتہ العنبر یا عطر حنا لگا کر آتی ہیں۔ مجھے ان کی خوشبو بہت پسند ہے۔ میں خاص طور پر ان کے لیے عطر حنا، اصغر علی محمد علی کے کارخانے سے لاتا ہوں۔ ان کو تاکید کر رکھی ہے کہ وہ صرف ان دونوں میں سے کوئی عطر لگا کر آیا کریں۔" قیصر مرزا نے کھل کر وضاحت کی۔ "مگر آپ کوئی ولایتی سینٹ لگائے ہوئے ہیں۔" اپنی بات کہتے کہتے وہ، لمحہ بھر کے لئے ٹھٹکا۔ "میں نے غلط اندازہ تو نہیں لگایا؟"

"تمھارا خیال درست ہے۔" ارجمند سلطانہ نے جواب دیا "ہاں، میں نے فرانسیسی پرفیوم ایمبروز لگایا تھا۔ اور اکثر شام کو ایمبروز یا ایوننگ ان پیرس استعمال کرتی ہوں۔ میں کبھی دیسی عطر نہیں لگاتی۔ اس کی خوشبو بڑی تیز ہوتی ہے۔"

قیصر مرزا چند لمحے خاموش بیٹھا سوچتا رہا، پھر اس نے دریافت کیا۔ "یہ بتایئے کہ، آج طلعت آرا کیوں نہیں آئیں؟ آپ ان کے بجائے کیوں آئیں؟"

"یہ بات تم نے پہلے بھی پوچھی تھی۔" ارجمند سلطانہ نے جواب دینے کے بجائے

الٹا اس سے سوال کیا۔ "تم بار، بار یہ بات کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"مجھے تو یہ سوال پوچھنا ہی چاہیئے۔" قیصر مرزا نے وضاحت کی۔ "میرے تو وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ آپ یہاں آسکتی ہیں۔" اس نے تامّل کیا۔ "سچ بتایئے، آپ کو یہاں کس نے بھیجا؟ دیکھئے، میں نے آپ کو ہر بات صاف صاف بتادی۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ بھی مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش نہ کریں۔"

"سچ کہہ رہی ہوں۔ مجھے کسی نے یہاں نہیں بھیجا۔ میں خود ہی آئی ہوں۔" ارجمند سلطانہ نے صاف گوئی سے کام لیا۔ "بلکہ پھوپھی جانی تو مجھے روکتی رہیں۔ ان کا بس چلتا تو مجھے دوڑ کر پکڑ لیتیں۔"

"اُن کے روکنے پر بھی آپ نہ رکیں۔" قیصر مرزا نے حیرت زدہ ہو کر ان کی جانب دیکھا۔ "یہ، خبر آپ کو مل ہی گئی ہوگی کہ آپ کے آنے سے پہلے نجّو یہاں آئی تھی۔"

"یہ تو میں تم کو پہلے ہی بتا چکی ہوں۔ میں نے تو اس کی پیٹھ پر وہ نیلی، نیلی بلیٹیں بھی دیکھی ہیں جو تمھارے ہنٹر کی مار سے پڑ گئی ہیں۔" انھوں نے گلہ کرنے کے انداز میں کہا۔ "تم نے بڑی بے رحمی سے مارا ہے، بہت بُرا کیا۔"

ان کی بات نظر انداز کرتے ہوئے قیصر مرزا نے پوچھا۔ "اُسے دیکھ کر بھی آپ نے ذرا خوف محسوس نہ کیا اور یہاں چلی آئیں۔ کیوں؟"

اس "کیوں" کا کوئی فوری جواب ان کے ذہن میں نہ آیا۔ وہ خاموش بیٹھی رہیں۔

قیصر مرزا نے بھی زور نہ دیا، صرف اتنا دریافت کیا۔ "اچھا یہ بتایئے کہ نجّو یہاں کیوں آئی تھی؟"

"مجھے بالکل خبر نہیں کہ وہ یہاں کیوں آئی تھی، کس لئے آئی تھی؟ کسی نے مجھے بتایا بھی نہیں۔"

"میں آپ کو بتاتا ہوں کہ وہ یہاں کیوں آئی تھی۔" قیصر مرزا نے ارجمند سلطانہ کو آگاہ کیا۔ "وہ یہاں کا بھید معلوم کرنے آئی تھی اور سرخ جوڑا پہن کر دلہن کی طرح بناؤ سنگار کر کے آئی تھی۔"

"میں نے جب اسے دیکھا تھا تو اس کے جسم پر سرخ جوڑا نہ تھا۔"
"آپ کو تو یہ معلوم نہ ہو گا کہ اُسے یہاں کس نے بھیجا تھا؟"
"پھوپھی جانی نے تو بہرحال اسے یہاں نہیں بھیجا ہو گا اور نہ ہی مغلانی ایسی ہمت کر سکتی ہیں۔" ارجمند سلطانہ نے قیصر مرزا کو بتایا۔ "وہ تو بنجو کو سگی اولاد سے زیادہ چاہتی ہیں۔" وہ حیران و پریشان ہو کر قیصر مرزا کا چہرہ تکنے لگیں۔ "ان دونوں کے علاوہ اسے یہاں کون بھیج سکتا ہے؟" انھوں نے قیاس آرائی کی۔ "ہو سکتا ہے طلعت آرا یہاں نہ آنا چاہتی ہو۔ اس نے اپنے بجائے اسے یہاں بھیجنے پر آمادہ کر لیا ہو۔"
"جی نہیں، تینوں میں سے کسی نے بنجو کو یہاں نہیں بھیجا۔" قیصر مرزا نے بتایا۔ "اُسے ہرمزی نے یہاں بھیجا تھا۔ ہرمزی بارہ دری کی پرانی خادمہ ہے۔"
"میں اسے نہیں جانتی۔" ارجمند سلطانہ نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر پوچھا۔ "مگر اس نے ایسا کیوں کیا؟"
"علی رضا کے اشارے پر۔"
"یہ علی رضا ہی تو نہیں جو طلعت آرا کا پھوپھی زاد بھائی ہے؟"
"جی ہاں، بالکل وہی ہے۔" قیصر مرزا نے مطلع کیا۔ "وہ طلعت آرا کی پھوپھی نفیسہ کا بیٹا ہے۔"
"مگر اس نے ایسا کیوں کیا؟"
"وہ طلعت آرا سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ اس کی والدہ بھی یہی چاہتی ہیں۔ مگر حضور بیگم اس رشتے کے خلاف ہیں۔"
"تم کو یہ تمام باتیں کیسے معلوم ہوئیں۔" ارجمند سلطانہ نے حیران ہو کر دریافت کیا۔ ان کے چہرے کے تاثرات سے صاف عیاں تھا کہ وہ اس پس منظر سے بالکل ناواقف تھیں۔
"مجھے تو آج ہی شام ان باتوں کا علم ہوا۔" قیصر مرزا نے صاف گوئی سے کام لیا۔ "بنجو نے بتایا تھا۔"

"نجو، تم کو جانتی ہے۔ اُس نے تمھیں دیکھا ہے؟"

"جی نہیں، میں اس کے سامنے نہیں آیا۔ وہ میرے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔" قیصر مرزا نے ارجمند سلطانہ کو مطلع کیا۔ "میرے تو خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ آپ یہاں آسکتی ہیں۔ مجھے کسی کی طرف سے کھٹکا تھا تو وہ صرف علی رضا سے تھا۔ میں تو یہ توقع کر رہا تھا کہ کسی روز علی رضا یہاں آنے کی جسارت کرے گا۔ اور میں نے اس خطرے سے نمٹنے کا پورا پورا بندوبست بھی کر لیا تھا۔" اس نے اپنی کارچوبی صدری کی جیب سے پیش قبض نکالا اور ارجمند سلطانہ کے سامنے کر دیا۔ "میں آج پوری تیاری کر کے آیا تھا۔"

ارجمند سلطانہ نے موم بتی کی اُجلی اُجلی روشنی میں پیش قبض کا جھلملاتا ہوا پھل دیکھا تو سخت پریشان ہو گئیں۔ سہمے ہوئے لہجے میں بولیں۔ "اس کا تو یہ مطلب ہوا کہ تم اندھیرے میں علی رضا سمجھ کر مجھے قتل کر دیتے" وہ حیران و پریشان ہو کر اسے دیکھنے لگیں۔ "میں نہیں سمجھتی تھی کہ تم اتنے خطرناک ہو سکتے ہیں۔"

"جتنا خطرناک آپ سمجھ رہی ہیں، میں اتنا ہوں نہیں۔ میں نے آج تک کسی کو قتل نہیں کیا۔" اس نے صفائی پیش کی۔ ساتھ ہی تڑپ کر بولا۔ "مگر جب آن کا سوال آجائے تو پیچھے نہیں ہٹوں گا۔ علی رضا اگر یہ چاہتا ہے کہ طلعت آرا کو زبردستی قبضے میں کر لے تو وہ میری لاش پر سے گزر کر ہی ایسا کر سکتا ہے۔"

"بھئی اپنی تو سمجھ میں کچھ نہیں آیا ہے۔" وہ گھبرا کر بولیں۔ "یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ کیوں ہو رہا ہے؟"

"سیدھا سیدھا جائیداد کا چکر ہے۔" قیصر مرزا نے بتایا۔ "سب کی نظریں اس پر لگی ہیں۔ نواب صفی بھی اس پر قبضہ کرنے کی تاک میں ہیں۔ علی رضا بھی اور ان کی والدہ بھی۔"

"اور تم بھی اس قطار میں لگے ہوئے ہو۔"

"میں کیوں اس قطار میں شامل ہونے لگا۔" قیصر مرزا کی تیوری پر بل پڑ گئے۔

"میرا تو اس جائیداد پر دور تک کوئی حق نہیں ثابت ہوتا۔ یہ تو آپ بھی جانتی ہیں۔"

ارجمند سلطانہ نے کسی ردِ عمل کا اظہار نہیں کیا۔ خاموش بیٹھی رہیں۔

کمرے میں کچھ دیر خاموشی رہی، پھر ارجمند سلطانہ کی آواز اُبھری۔ "قیصر مرزا!" انھوں نے پیش قبض کی طرف اشارہ کیا۔ "اسے اپنی جیب میں رکھ لو۔ اسے دیکھ کر مجھے وحشت ہو رہی ہے۔"

"آپ اس سے ڈر رہی ہیں؟" قیصر مرزا نے پیش قبض ان کے سامنے کر دیا۔

انھوں نے بڑے اعتماد سے کہا۔ "مجھے غلط سمجھنے کی کوشش نہ کرو۔ میں ایسی ڈرپوک ہوتی تو یہاں تنہا آنے کی جرأت نہ کرتی۔"

قیصر مرزا نے پیش قبض واپس رکھ لیا۔ چند لمحے خاموش رہا۔ پھر نہایت سنجیدگی سے گویا ہوا۔ "رانی صاحبہ! میں آپ کی ہمّت کی داد دیتا ہوں۔ آپ تو عورت ذات ہیں۔ یہاں تو کوئی مرد بھی تنہا آنے کی جسارت نہ کر سکتا تھا۔"

ارجمند سلطانہ نے بات کا رخ بدلتے ہوئے کہا۔ "قیصر مرزا، تمھارے والد تو خاندانی رئیس ہیں۔ شریف اور عزت دار ہیں۔ تم کو ایسی مجرمانہ حرکتیں زیب نہیں دیتیں۔"

وہ اسے بزرگوں کی طرح سمجھانے لگیں۔ "تم جو کھیل، کھیل رہے ہو وہ بہت خطرناک ہے۔"

"مجھے بھی معلوم ہے کہ یہ خطرناک کھیل ہے۔" قیصر مرزا نے نرم لہجے میں کہا۔ "اس کا اندازہ تو مجھے بہت ہی پہلے ہو گیا تھا۔"

"کبھی یہ بھی سوچا کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔" دفعتہً ان کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ چہرے پر جھنجلاہٹ جھلکنے لگی۔ "جیل کی ہوا کھانا پڑے گی۔ خاندان کا نام خوب روشن ہوگا۔"

قیصر مرزا نے کسی ردِ عمل کا اظہار نہ کیا۔ چپ بیٹھا رہا مگر اب اس کے بشرے سے پریشانی ہویدا تھی۔ پیشانی پر پسینے کے ننھے، ننھے قطرے بکھرے ہوئے تھے۔

ارجمند سلطانہ نے اُسے خاموش پایا تو سخت جھنجلائیں۔ تیکھے لہجے میں بولیں۔ "میں پوچھتی ہوں تم نے طلعت آرا کے ساتھ یہ فراڈ کیوں کیا؟ تم نے اس بھولی بھالی معصوم لڑکی کے لئے فریب کا یہ جال کیوں بچھایا؟ اُس کے لیے زندگی کو عذاب بنا دیا۔"

وہ تیزی سے بولتی رہیں۔ قیصر مرزا نظریں جھکائے گم صم بیٹھا رہا۔ اس نے اپنی صفائی میں کچھ نہ کہا۔

"تم کو کیا خبر، بے چاری پھوپھی جانی پر کیا بیت رہی ہے۔" انھوں نے دل گرفتہ ہو کر آہِ سرد بھری۔ "بیٹی کے غم نے ان کو موت کے دہانے پر کھڑا کر دیا۔"

رانی حیدر گڑھ کا چہرہ بڑا باوقار نظر آرہا تھا۔ آنکھوں سے غم و غصّہ آشکارا تھا۔ قیصر مرزا ہنوز خاموش تھا۔ اس نے نظریں اٹھا کر ان کی جانب نہ دیکھا۔

"تم بظاہر اتنے خطرناک اور جرائم پیشہ نظر نہیں آتے جتنی گہری سازش تم نے تیار کی ہے۔"

"رانی صاحبہ!" قیصر مرزا نے اس بار نظریں اٹھا کر ارجمند سلطانہ کی جانب دیکھا۔ تڑپ کر بولا۔ "ایسا سنگین الزام نہ لگائیں۔" وہ اپنی بات کہتے کہتے لمحہ بھر کے لیے ٹھٹکا۔ "واللہ، آپ یقین کریں، میں نے کوئی سازش وازش تیار نہیں کی۔" اس نے اچانک ان سے سوال کیا۔ "یہاں آنے سے پہلے آپ نے طلعت آرا سے بھی اس سلسلے میں بات کی تھی؟ انھوں نے آپ کو کیا بتایا؟"

"سچ سچ پوچھنا چاہتے ہو تو یہ حقیقت ہے کہ میری اس سے کوئی بات نہیں ہوئی۔" ارجمند سلطانہ نے صاف گوئی سے کام لیا۔ ساتھ ہی پہلی بار ان کو اپنی اس غلطی کا احساس ہوا کہ آنے سے پہلے انھیں پوری طرح چھان بین کر لینا چاہیے تھی۔ خصوصیت کے ساتھ طلعت آرا سے بات کرنا ضروری تھا تاکہ صورتِ حال پوری طرح سمجھ سکیں۔ وہ اچانک جذباتی ہو گئیں تھیں اور جذبات سے اس قدر مغلوب ہو گئیں کہ بغیر سوچے سمجھے دندناتی ہوئی اوپر پہنچ گئیں۔ وہ چند لمحے خاموش بیٹھی رہیں، پھر انھوں نے وضاحت کی۔ "مجھے طلعت آرا سے بات کرنے کا موقع ہی نہ ملا۔"

"تو پھر ایسا کیجیے، نیچے جائیے، طلعت آرا سے تخلیہ میں بات کیجیے۔" قیصر مرزا نے سنجیدگی سے ان کو مشورہ دیا۔

"میں نے تو یہ سنا ہے کہ وہ اس سلسلے میں کسی سے بات نہیں کرتی۔ ہر وقت

خاموش رہتی ہے۔" ارجمند سلطانہ نے بتایا۔" مگر تم یہ کیوں چاہتے ہو کہ میں طلعت آرا سے اس معاملے میں پوچھ گچھ کروں؟"

"میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ ان کا اس سلسلے میں اپنا کیا خیال ہے!"

"لیکن میں سمجھتی ہوں اب اس کی گنجائش نہیں۔" ارجمند سلطانہ نے اس کا مشورہ قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔" اب تو میں یہاں آ ہی گئی ہوں، اور جب آ گئی ہوں تو اس سازش کا سراغ لگا کر ہی واپس جاؤں گی۔"

"دیکھیے، آپ بار بار مجھ پر سازش کا الزام لگا رہی ہیں۔" قیصر مرزا نے تیوری پر بل ڈال کر تیکھے لہجے میں کہا۔" میں ایک بار پھر آپ سے یہی کہوں گا کہ میں نے کوئی سازش نہیں کی۔"

مگر ارجمند سلطانہ مرعوب نہ ہوئیں۔ جل کر بولیں۔" تم نے جو یہ جنوں کا ڈھونگ رچایا ہے، سازش نہیں تو کیا ہے؟"

قیصر مرزا نے کوئی جواب نہ دیا، خاموش بیٹھا سوچتا رہا۔

"دیکھو، قیصر مرزا! ہوش سے کام لو۔ معاملہ کی نزاکت کو سمجھنے کی کوشش کرو۔" ان کا لہجہ نرم تھا۔

"آپ کیا چاہتی ہیں؟" قیصر مرزا نے بھی نرمی سے پوچھا۔

"مجھے مجبور نہ کرو کہ بات بڑھ کر پولیس تک پہنچے۔" انھوں نے ایک بار پھر دھمکی دی۔ ساتھ ہی نرمی سے سمجھایا۔" اس میں دونوں خاندانوں کی بدنامی ہے۔" انھوں نے ٹھنڈی سانس بھری۔" مجھے رہ رہ کے طلعت آرا کا خیال آتا ہے۔" وہ لمحہ بھر خاموش رہیں، پھر گویا ہوئیں۔" اگر تم کو طلعت آرا سے ذرا بھی محبت ہے تو تم ہرگز یہ نہیں چاہو گے کہ اس کی رسوائی ہو۔" انھوں نے قیصر مرزا کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی۔" مجھے تو ڈر ہے کہ رسوائی کی صورت میں کہیں وہ سنکھیا سنکھیا کھا کر خودکشی نہ کر لے۔ وہ بڑی جذباتی لڑکی ہے۔"

ارجمند سلطانہ نے قیصر مرزا کو دہکانے کے لئے نفسیاتی حربہ استعمال کیا۔ تیر نشانہ

پر بیٹھا۔ قیصر مرزا تڑپ کر بولا۔ "نہیں رانی صاحبہ! میرے بارے میں اس طرح نہ سوچیں۔ واللہ! میں ایسا نہیں چاہتا۔"

"پھر تم کیا چاہتے ہو؟"

"قسم ہے جناب امیر کی۔ میں آپ سے غلط بیانی نہیں کروں گا۔" قیصر مرزا نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں آپ کو سب کچھ صاف صاف بتائے دیتا ہوں۔"

☆

باہر چھت پر دھم سے کودنے کی آواز اُبھری، پھر رات کے سناٹے میں قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ کوئی بھاری بھاری قدموں سے چل رہا تھا۔ ساتھ ہی لوبان کی تیز خوشبو پھیلنے لگی۔

ارجمند سلطانہ نے چونک کر دروازے کی جانب دیکھا۔ ان کے چہرے پر کسی انجانے خوف کا سایہ پھیل گیا۔ وہ سہمی ہوئی دم بخود بیٹھی تھیں۔ قیصر مرزا بھی گم صُم نظر آرہا تھا۔ وہ بھی ارجمند سلطانہ کی طرح نظریں اٹھائے دروازے کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ کمرے میں گہری خاموشی چھائی تھی۔ شمع کی ہلکی ہلکی روشنی میں دونوں بت کی مانند ساکت نظر آرہے تھے۔

قدموں کی آہٹ رفتہ رفتہ قریب آتی جارہی تھی۔ آنے والا کمرے کی سمت آرہا تھا۔ چاپ قریب، اور قریب آتی گئی اور دروازے کے سامنے پہنچ کر رک گئی۔ ہر طرف گہرا سناٹا چھا گیا۔

چاند اب غروب ہوچکا تھا۔ رات تاریک اور سنسان تھی۔ ارجمند سلطانہ اور قیصر مرزا دونوں دم بخود بیٹھے تھے۔ اور آنے والا باہر اندھیرے میں دروازے سے لگا ساکت کھڑا تھا۔ ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکوں سے پردہ آہستہ آہستہ لہرا رہا تھا اور لوبان کی تیز خوشبو کمرے کے اندر داخل ہورہی تھی۔

کچھ دیر خاموشی چھائی رہی۔ پھر کمرے کے باہر زور سے کھنکارنے کی آواز اُبھری۔

ارجمند سلطانہ کے چہرے پر چھایا ہوا خوف اور سراسیمگی کا غبار کچھ اور گہرا ہوگیا۔ وہ سہمی ہوئی نظروں سے ٹکٹکی باندھے دروازے کو تک رہی تھیں۔

ذرا دیر بعد رات کے سناٹے میں دروازے کے باہر آواز اُبھری۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "شہزادہ عالی مرتبت! غلام پرستان سے شاہ جم جاہ کا ایک ضروری پیغام لے کر حاضر ہوا ہے۔"

ارجمند سلطانہ نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر قیصر مرزا کی طرف دیکھا۔ وہ کرسی پر خاموش بیٹھا تھا۔

باہر سے پھر آواز اُبھری۔ "صاحب عالم! غلام شرف باریابی چاہتا ہے۔ کیا میں حاضر ہو سکتا ہوں؟"

قیصر مرزا نے کوئی جواب نہ دیا۔ نہ ہی مڑ کر ارجمند سلطانہ کی جانب دیکھا۔ خاموشی سے اُٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ دروازے کی جانب بڑھا اور باہر چلا گیا۔

سنسان چھت پر قدموں کی آہٹ ابھری اور رفتہ رفتہ دُور ہوتی گئی۔ پھر رات کے سناٹے میں تحلیل ہو کر ختم ہوگئی۔

ارجمند سلطانہ کمرے میں اب بالکل تنہا تھیں۔ وہ تکیوں کے سہارے مسہری سے ٹیک لگائے گم صُم بیٹھی تھیں۔ رات آہستہ آہستہ ڈھلتی جا رہی تھی۔ سناٹا اور بڑھ گیا تھا۔ باہر ویرانی چھائی تھی۔ نہ کوئی آہٹ تھی، نہ آواز۔ وہ بار بار بے چینی سے پہلو بدلتیں۔ نظریں اُٹھا کر دروازے کی طرف دیکھتیں۔ پردہ ہوا کے جھونکوں سے ہولے ہولے لہرا رہا تھا۔

قیصر مرزا جب دیر تک واپس نہ آیا تو ارجمند سلطانہ کو تشویش لاحق ہوئی۔ طرح طرح کے وسوسے ذہن میں پیدا ہونے لگے۔ یہ تو ان کو پہلے ہی اندازہ ہوگیا تھا کہ قیصر مرزا تنہا نہ تھا۔ اس کے ساتھ دوسرے بھی تھے۔ شروع ہی سے انھیں شبہ تھا کہ جو کچھ ہو رہا ہے کسی گہری سازش کے تحت ہو رہا ہے۔ اب یہ شبہ اور قوی ہوگیا تھا۔ معاً ان کو شدید خطرہ محسوس ہوا۔ انھوں نے پریشان ہو کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ مشرقی گوشے

میں عورت کا وہ خوفناک مجسّمہ موجود تھا، جس کی گردن کو ایک سیاہ ہاتھ نے نہایت سفّاکی سے دبوچ رکھا تھا۔ عورت کی آنکھیں دہشت سے پھٹی ہوئی تھیں اور ہونٹوں سے سرخ، سرخ خون بہہ رہا تھا۔ شمع کی زرد، زرد روشنی میں مجسّمہ اس قدر ڈراؤنا نظر آرہا تھا کہ کسی انجانے خوف سے ارجمند سلطانہ کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

انھوں نے سراسیمہ ہو کر سوچا کہ کمرے سے باہر نکل کر نیچے چلی جائیں، مگر باہر جانا اور بھی خطرناک تھا۔ ہر طرف خطرہ ہی خطرہ تھا۔ اس خطرے سے محفوظ رہنے کے لئے ارجمند سلطانہ نے یہ طے کیا کہ دروازہ بند کر کے کُنڈی چڑھا دی جائے اور صبح تک کمرے میں بند ہو کر بیٹھی رہیں۔ جب دن نکل آئے اور ہر طرف دھوپ پھیل جائے تو نیچے جانے کے لیے باہر نکلیں۔

☆

سُنسان چھت پر ایک بار پھر قدموں کی آہٹ اُبھری۔ ارجمند سلطانہ نے اپنا ارادہ ترک کر دیا اور سہمی ہوئی نظروں سے دروازے کی سمت دیکھنے لگیں۔ چاپ رفتہ رفتہ قریب آتی گئی اور اس کے ساتھ ساتھ ارجمند سلطانہ کے دل کی دھڑکن بھی تیز ہوتی گئی۔ وہ دم بخود بیٹھی تھیں۔ دیکھتے دیکھتے ایک انسانی سایہ دروازے پر اُبھرا۔ پردہ ایک طرف سرکا اور قیصر مرزا اندر داخل ہُوا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا آگے بڑھا، کُرسی کھسکائی اور تھکا ہوا سا اس پر بیٹھ گیا۔

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ گویا ہُوا۔" معاف کیجئے۔ مجھے واپسی میں کچھ دیر ہوگئی۔"

اس کے اظہارِ معذرت پر ارجمند سلطانہ کی سراسیمگی کم ہوگئی۔ انھوں نے خود کو سنبھالا۔ جھجکتے ہوئے پوچھا۔"کون تھا یہ؟"

"آغا جانی۔" قیصر مرزا نے مختصر جواب دیا۔

"کس لیئے آیا تھا؟" ان کے لہجے میں تجسّس تھا۔

"جب طلعت آرا یہاں موجود ہوتی ہیں تو وہ اکثر رات کو ایک بار ضرور آتا ہے۔"
"اسے مرعوب کرنے کے لئے۔" ارجمند سلطانہ نے اسے تیکھی نظروں سے دیکھا۔
"اس پر یہ ثابت کرنے کے لئے کہ تم جنوں کے شہزادے ہو اور پرستان سے آئے ہو۔ اسی لیے وہ آتا ہے نا؟"

قیصر مرزا نے کوئی جواب نہ دیا۔ خاموش بیٹھا رہا۔

مگر ارجمند سلطانہ خاموش نہ رہیں۔ ان کا لہجہ اور تیکھا ہوگیا۔ اب وہ پوری طرح خوف و دہشت کے حصار سے باہر نکل چکی تھیں۔ "آغا جانی کے علاوہ اور کون کون اس سازش میں تمھارے ساتھ شریک ہے؟"

"صرف آغا جانی" یہ کہتے، کہتے اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ اس کی آنکھوں سے جھنجلاہٹ آشکارہ تھی۔ "یہ آپ بار بار سازش کا ذکر کیوں کر رہی ہیں۔ میں آپ سے پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ میں نے کوئی سازش وازش نہیں کی ہے۔"

"سازش نہیں تو پھر یہ سب کیا ہے؟" وہ قیصر مرزا کی برہمی سے متاثر نہ ہوئیں۔ "تم نے اپنی حرکتوں سے خود ہی شبہ پیدا کیا۔ آغا جانی کی آمد سے یہ شبہ اور قوی ہوا۔ تم نے بھی سنا تھا، وہ کمرے کے باہر کھڑا کیا کہہ رہا تھا۔"

"اسے معلوم نہ تھا کہ کمرے میں طلعت آرا کے بجائے آپ موجود ہیں" قیصر مرزا نے صفائی پیش کی۔ مگر ارجمند سلطانہ ذرا مطمئن نہ ہوئیں۔ سنجیدگی سے گویا ہوئیں۔ "فضول باتیں نہ کرو۔ مجھے صاف صاف بتاؤ کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔" انھوں نے اسے ایک بار پھر دھمکی دی۔ "یاد رکھو معاملہ بہت سنگین صورت اختیار کر چکا ہے۔ پولیس تک جا سکتا ہے۔"

مگر اس دفعہ ان کا وار خالی گیا۔ قیصر مرزا ان کی دھمکی سے خائف نہ ہوا۔ نہایت ڈھٹائی سے بولا۔ "دیکھئے آپ مجھے پولیس سے ڈرانے کی کوشش نہ کریں۔" اس کا لہجہ تیکھا ہوگیا۔ "پولیس میرے خلاف کیا کارروائی کر سکتی ہے۔ طلعت آرا اپنی مرضی سے یہاں آتی تھیں۔ میں انھیں زبردستی اٹھا کر تو نہیں لاتا تھا۔" اس نے ارجمند سلطانہ کو خبردار کیا۔

"اگر پولیس تک آپ بات لے جائیں گی تو خواہ مخواہ بدنامی ہو گی اور بدنامی بھی طلعت آرا اور ان کے خاندان ہی کی ہو گی۔"

ارجمند سلطانہ پہلے تو بہت سٹ پٹائیں لیکن فوراً ہی بات کی تہہ تک پہنچ گئیں اور انھوں نے اس کا اظہار بھی کر دیا۔ "پہلے تو تمھارا رویّہ ایسا نہ تھا، معلوم ہوتا ہے یہ بات آغا جانی نے تم کو سُجھائی اور کچھ دیر پہلے سُجھائی ہے۔ وہ مجھے بہت گھاگ لگتا ہے۔" ارجمند سلطانہ نے فوراً پینترا بدلا۔ "مگر ابھی اس کا پولیس سے سابقہ نہیں پڑا۔ پولیس کے ہتھے چڑھ گیا تو مار، مار کر ایک ایک بات اُگلوا لے گی۔"

ارجمند سلطانہ کا اندازہ غلط نہ تھا۔ یہ نکتہ آغا جانی ہی نے اُسے بتایا تھا۔ مگر یہ نہ بتایا تھا کہ معاملہ واقعی اگر پولیس تک پہنچ گیا تو کیا ہو گا۔ قیصر مرزا کا کبھی پولیس سے سابقہ نہ پڑا تھا۔ تھانے جانے کی بھی نوبت نہ آئی تھی۔ وہ کیا اس کے والد تک پولیس کا نام سُن کر گھبرا جاتے تھے۔ صرف انھی پر منحصر نہیں، شہر کے دوسرے رئیسوں اور شرفاء کا بھی پولیس کے معاملے میں یہی رویّہ تھا۔

اس حقیقت سے ارجمند سلطانہ بخوبی واقف تھیں۔ انھوں نے قیصر مرزا کو خاموش پایا تو اسے خوفزدہ کرنے کی از سرِ نو کوشش کی۔ "کارروائی تو بعد میں ہو گی۔ ذرا یہ تو سوچو جب پولیس تمھارے گھر پہنچے گی تو تمھارے ابا جان کے دل پر کیا گذرے گی؟"

ارجمند سلطانہ جو چاہتی تھیں، وہی ہُوا۔ قیصر مرزا سخت پریشان ہوا۔ چہرہ فق ہو گیا۔ پیشانی پر پسینے کے قطرے جھلملانے لگے۔ آغا جانی نے جو ہَوا بھری تھی وہ آن کی آن میں نکل گئی۔ ارجمند سلطانہ نے اس مرتبہ ایسا نفسیاتی حربہ آزمایا کہ ساری اکڑفوں ختم ہو گئی۔

"بولو، جواب دو۔" ارجمند سلطانہ نے مزید دباؤ ڈالا۔ "خاموش کیوں ہو؟"

"آپ چاہتی کیا ہیں؟" قیصر مرزا نے زِچ ہو کر کہا۔

"میں یہ معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ تم نے طلعت آرا کے خلاف یہ سازش کیوں

کی ؟" ارجمند سلطانہ اپنی بات پر اڑی رہیں۔ "تم لاکھ انکار کرو لیکن میں تو اسے سازش ہی کہوں گی۔"

"دیکھئے میں ایک بار پھر عرض کروں گا کہ میں نے کوئی سازش وازش نہیں کی۔" قیصر مرزا نے نرمی سے کہا۔ "واللہ، میں آپ سے جھوٹ نہیں کہہ رہا۔"

"تو پھر یہ سب کیا ہو رہا ہے ؟"

"میں آپ سے کچھ نہیں چھپاؤں گا۔ سب کچھ صاف صاف بتائے دیتا ہوں۔" قیصر مرزا سنبھل سنبھل کر بول رہا تھا۔ "یہ جو برابر کا مکان ہے عشرت منزل۔" اس نے ہاتھ اُٹھا کر اشارہ کیا۔ "ایک عرصے سے میرے پاس کرائے پر ہے۔ ویسے تو اس کی ملکیت کے بارے میں نہ معلوم کب سے مقدمے بازی ہو رہی ہے لیکن میں کرایہ میر کلب علی کو دیتا ہوں۔ وہ نہ صرف ملکیت کے دعوے دار ہیں، بلکہ سر دست عشرت منزل قبضے میں بھی انھی کے ہے۔ فریق مخالف کوئی منجھو بیگم ہیں۔ وہ بیوہ ہیں۔ پریشان حال بھی ہیں۔ مقدمہ لڑنے کی ان میں سکت نہیں۔ سُنا ہے انھوں نے مُرلی دھر وکیل سے کچھ رقم لے کر مقدمہ فروخت کر دیا ہے۔ اب وہی مقدمہ لڑ رہے ہیں۔"

"مجھے عشرت منزل اور اس کی ملکیت کے بارے میں ہونے والی مقدمے بازی سے کوئی دلچسپی نہیں۔" ارجمند سلطانہ نے اُکتا کر قیصر مرزا کو ٹوکا۔ "میں جو کچھ پوچھ رہی ہوں اس کا جواب دو۔"

"وہی تو میں بتا رہا ہوں۔" قیصر مرزا نے وضاحت کی۔ "آغا جانی جو کچھ دیر پہلے آئے تھے میرے گہرے دوست ہیں۔ وہ دفینے نکالنے کی ٹوہ میں رہتے ہیں۔" اس نے قدرے تامّل کیا۔ "آپ نے قلزم شاہ کا نام تو سُنا ہی ہوگا۔"

"میں کسی قلزم شاہ ولزم شاہ کو نہیں جانتی۔" ارجمند سلطانہ نے بیزاری کا اظہار کیا۔

"بڑے پائے کے بزرگ ہیں۔ ایسی پتے کی بات بتاتے ہیں کہ میں آپ سے کیا عرض کروں۔ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔" ارجمند سلطانہ کی بے زاری سے بے نیاز وہ قلزم شاہ کے ساتھ بدستور اپنی عقیدت کا اظہار کرتا رہا۔ "ایک رات ان کو یہ بشارت

ہوئی کہ عشرت منزل کے تہہ خانے میں نواب شفوؔ کی بہت سی دولت دفن ہے۔ نواب شفوؔ بھی شہزادے تھے۔ غدر میں باغیوں کے ساتھ شریک ہو گئے تھے۔ مگر جب باغیوں کو شکست ہوئی اور بھگدڑ مچی تو مرزا شفوؔ کچھ عرصے تک اسی عشرت منزل میں روپوش رہے، پھر حضرت محل کے ساتھ انھوں نے بھی فرار ہونے کی کوشش، مگر کسی نے مخبری کردی اور پکڑے گئے۔ انگریزوں نے ان کو پھانسی پر لٹکا دیا۔ ان کی دولت عشرت منزل میں دبی کی دبی رہ گئی۔ نواب شفوؔ کو اتنی مہلت بھی نہ ملی کہ کسی کو اس کے بارے میں بتاتے۔"

"اور قلزم شاہ نے اپنے کشف و کرامت سے اس کا سُراغ لگا لیا" ارجمند سُلطانہ نے طنز کیا۔

قیصر مرزا اپنی دُھن میں ایسا مگن تھا کہ اس نے ارجمند سُلطانہ کے طنز کو مطلق محسوس نہ کیا۔ کہنے لگا۔ "جی ہاں! قلزم شاہ کو اس کا علم ہو گیا۔ انھوں نے مہربان ہو کر آغا جانی کو بتا دیا۔ وہ ان کی خدمت بھی بہت کرتا ہے۔ انھوں نے یہ مہربانی بھی فرمائی کہ دفینہ حاصل کرنے کے لئے چلّہ کشی کا طریقہ بھی بتا دیا۔ آغا جانی نے اس راز میں مجھے بھی شریک کر لیا۔"

"قلزم شاہ نے اسے خود نکالنے کی کوشش کیوں نہ کی؟" ارجمند سلطانہ نے تبصرہ کیا۔ "کیا ان کو مال و دولت کی ضرورت نہیں۔ بہت دولت مند اور خوشحال واقع ہوئے ہیں؟"

"آپ غالباً ان سے واقف نہیں۔ بڑے درویش صفت اور بے نیاز قسم کے بزرگ ہیں۔" قیصر مرزا نے ارجمند سُلطانہ کی غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کی۔ "ان کی شانِ استغنا کا یہ عالم ہے کہ جو سامنے آ گیا، کھا لیا۔ جو پہننے کو مل گیا، پہن لیا۔" اس نے نظر بھر کر ارجمند سلطانہ کو دیکھا۔ "واللہ، آپ میری بات کا یقین کریں کہ وہ تو کچھ بھی نہ چاہتے تھے۔ مگر میں نے اور آغا جانی نے یہ طے کر رکھا ہے کہ دفینہ ہاتھ آ گیا تو تہائی حصہ قلزم شاہ صاحب کو بھی نذرانے کے طور پر پیش کریں گے، بلکہ آغا نے تو ان سے اس کا اظہار بھی کر دیا ہے۔"

"اور قلزم شاہ آمادہ بھی ہو گئے۔" ارجمند سلطانہ نے مسکرا کر ایک بار پھر طنز کیا۔

اس دفعہ ان کے طنز کو قیصر مرزا نے محسوس کیا۔ فوراً صفائی پیش کی۔ "واللہ، وہ تو انکار ہی کرتے رہے لیکن جب آغا نے بہت زور دیا، قسمیں دیں، تب وہ رضامند ہوئے۔"

"میں طلعت آرا کے بارے میں پوچھ رہی تھی، تم نے بیچ میں قلزم شاہ کا ذکر چھیڑ دیا۔" ارجمند سلطانہ نے تیکھے لہجے میں اپنا ردِ عمل ظاہر کیا۔

"قلزم شاہ کا ذکر تو اس لئے بیچ میں آگیا کہ جب دفینے کے بارے میں علم ہوا تو میں نے بھاگ دوڑ کر کے کسی نہ کسی طرح عشرت منزل کو کرایے پر حاصل کر لیا۔ میں آغا کے ساتھ اس میں رہنے بھی لگا۔" قیصر مرزا نے بتایا۔ "دونوں رات کے سنّاٹے میں اٹھ کر تہہ خانے میں جاتے اور دفینے کے لئے کھدائی کرتے۔"

"تو پھر وہ دفینہ تم کو ملا بھی کہ نہیں؟" ارجمند سلطانہ نے بے چین ہو کر دریافت کیا۔

"جی نہیں۔ ابھی تک تو کچھ نہیں نکلا۔" قیصر مرزا نے بجھے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ "چالیس روز تو مایا جگانے کے لئے آغا جانی کو چلّہ کھینچنا پڑا۔ کئی جگہ زمین کھودی۔ مگر دفینے کی صحیح جگہ کا ابھی سراغ نہیں ملا۔"

"ملے گا بھی نہیں۔" ارجمند سلطانہ نے مسکرا کر تبصرہ کیا۔

"جی ایسا نہیں ہے۔" قیصر مرزا نے جھٹ وضاحت کی۔ "اب ایک جگہ دفینے کے کچھ آثار نظر آرہے ہیں۔ زمین بھی وہاں پولی ہے۔ اندر سے کسی بہت بڑے برتن کے کھنکنے کی ہلکی ہلکی آواز بھی سنائی دیتی ہے۔ دیگ دبی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔"

"دیکھو قیصر مرزا، مجھے عشرت منزل اور اس کے تہہ خانے میں دبے ہوئے دفینے سے ذرا بھی دلچسپی نہیں۔" انھوں نے اُکتا کر بے رُخی کا مظاہرہ کیا۔ "اب یہ قصّہ ختم کرو اور مجھے یہ بتاؤ کہ تم نے بے چاری طلعت آرا پر ظلم وستم کیوں ڈھایا؟"

"جی میں اسی کے بارے میں بتانے جا رہا تھا۔" قیصر مرزا نے ارجمند سلطانہ کو مطلع کیا۔ "پچھلے بسنت کی نوچندی کا ذکر ہے، سہ پہر کا وقت تھا۔ میں اپنے کمرے میں پڑا بے خبر سو رہا تھا۔ یکایک آغا نے آکر زور زور سے مجھے جھنجوڑا۔ میں ہڑ بڑا کر اُٹھا۔

جگانے کا سبب پوچھا تو آغا نے آباجان کے آنے کی اطلاع دی۔ وہ بہت گھبرایا ہوا تھا، میں بھی گھبرا گیا۔ بات دراصل یہ تھی کہ میں ہفتے بھر سے گھر نہیں گیا تھا۔ وہ میری تلاش میں خود آئے تھے۔"

"خود کیوں آئے تھے۔ کسی نوکر چاکر کو بھیج دیتے۔"

"نوکر چاکر تو کئی بار آچکے تھے، مگر آغا نے ہر ایک کو صاف ٹرخا دیا۔" قیصر مرزا نے دبی زبان سے بتایا۔" اب آپ سے کیا چھپانا، بات یہ ہے کہ آغا جانی سے میل جول رکھنے پر آباجان سخت خفا ہوتے ہیں۔ وہ آغا کو بالکل پسند نہیں کرتے۔ مجھے عشرت منزل میں آغا جانی کے ساتھ دیکھ لیتے تو قیامت برپا کر دیتے۔ ان کی آمد کی اطلاع ملنے پر میں بالکل بوکھلا گیا۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ عشرت منزل سے نکل کر کہاں جاؤں۔"

"کہیں جانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ تہہ خانے میں چھپ جاتے۔"

"ان کے ہمراہ ایک نہیں دو ملازم تھے۔ ڈر یہ تھا کہ ان کے ذریعے وہ عشرت محل کے چپے چپے کی تلاشی لیتے۔" قیصر مرزا نے ارجمند سلطانہ کو بتایا۔" کوئی ملازم تہہ خانے میں بھی پہنچ سکتا تھا بلکہ میرا خیال ہے کہ سب سے پہلے تہہ خانے میں ہی پہنچا ہوگا۔ میں گھبرا کر فوراً زینے میں داخل ہوا۔ اوپر پہنچا۔ وہاں چھپنے کی کوئی جگہ نہ تھی۔ میں نے بدحواس ہو کر اِدھر اُدھر دیکھا اور دیوار پھاند کر بارہ دری کی چھت پر چلا گیا۔"

بات کہتے کہتے وہ اچانک خاموش ہو گیا۔ اس کے خوبصورت چہرے پر سُرخی پھیل گئی۔ آنکھوں میں چراغ جھلملانے لگے۔ وہ گہری سوچ میں گم ہو گیا۔

ارجمند سلطانہ کو اس کی خاموشی بہت شاق گزری۔ انھوں نے بے چین ہو کر پہلو بدلا۔ قیصر مرزا کو مخاطب کیا۔" قیصر مرزا، جب تم بارہ دری کی چھت پر پہنچے تو کیا طلعت آرا وہاں موجود تھی؟"

"جی نہیں،" قیصر مرزا نے انکار میں آہستہ آہستہ گردن ہلائی۔" کچھ ایسا اتفاق ہوا کہ جیسے ہی میں بارہ دری کی چھت پر پہنچا، عین اسی وقت طلعت آرا بھی زینے کا دروازہ کھول کر آگئیں۔ میں بالکل ان کے سامنے کھڑا تھا۔ انھوں نے مجھے دیکھا تو ایسی ڈریں کہ

اُن کی گھگھی بندھ گئی۔ پھر چیخ مار کر وہیں فرش پر گریں اور بے ہوش ہوگئیں۔"

"تم نے کیا کیا؟" ارجمند سلطانہ نے تفتیش کرنے کے انداز میں سوال کیا۔

"طلعت آرا کو بے ہوش دیکھ کر میں سخت پریشان ہوگیا۔" قیصر مرزا نے ارجمند سلطانہ کو مطلع کیا۔" اسی اثناء میں زینے کے اندر قدموں کی آواز سُنائی دی۔ کوئی اوپر آرہا تھا۔ میں اور پریشان ہوگیا۔ بدحواس ہو کر آگے بڑھا۔ جھپاک سے زینے کا دروازہ بند کیا اور کنڈی لگادی۔ گھبراہٹ میں اس وقت مجھے یہی سُوجھی۔"

"دروازہ تو تم نے بند کردیا۔ مگر کسی نے کھٹکھٹایا نہیں؟" ارجمند سلطانہ نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔" میرا مطلب ہے دروازہ کھولنے کی بالکل کوشش نہ کی۔"

"جی نہیں۔ نہ کوئی دروازے تک آیا نہ کسی نے دستک دی۔" قیصر مرزا نے بتایا۔ "ادھر طلعت آرا دھوپ میں فرش پر بے حال پڑی تھیں۔ ان کو اپنے تن بدن کا ہوش نہ تھا۔ ذرا دیر تک میں ہکا بکا کھڑا رہا۔ پھر پریشانی کے عالم میں کمرے کے دروازے پر پہنچا۔ اسے کھولا۔ واپس طلعت آرا کے پاس آیا۔ ان کو دونوں ہاتھوں پر اُٹھا کر کمرے میں لے گیا اور مسہری پر لٹادیا۔ اسی مسہری پر جس پر آپ بیٹھی ہیں۔"

"یہ کمرہ تو میں نے سُنا ہے بند رہتا تھا۔"

"جی ہاں۔ باقاعدہ قفل پڑا رہتا تھا۔" قیصر مرزا نے صاف گوئی سے کام لیا۔" مگر آغا نے اسے کسی نہ کسی طرح پہلے ہی کھول لیا تھا۔ بات دراصل یہ ہے کہ یہاں کوئی بھولے سے بھی نہیں آتا۔ اس کا ہم کو بخوبی اندازہ تھا۔ چنانچہ میں اور آغا اکثر دیوار پھاند کر اِدھر آجاتے اور رات بھر یہاں رہتے۔ صبح تڑکے اُٹھ کر عشرت منزل میں واپس چلے جاتے۔ برسات میں جب بہت حبس ہوتا اور رک رک کر مینہ برستا تو ہم دونوں اسی کمرے میں سوتے تھے۔ دراصل عشرت منزل کی چھت پر کوئی کمرہ وغیرہ تو ہے نہیں۔ برسات میں بہت تکلیف ہوتی تھی۔ بارش اچانک شروع ہوجاتی تو گہری نیند سے اُٹھ کر نیچے بھاگنا پڑتا۔" اس نے بند کھڑکی کی طرف ہاتھ اُٹھا کر اشارہ کیا۔" اس کھڑکی کو کھول دیا جائے تو بہت اچھی ہَوا آتی ہے۔" اس نے قدرے تامّل سے کہا۔" یہ کمرہ پہلے ایسا نہ تھا۔

خاک دھول سے اٹا ہوا تھا۔ ہر طرف مکڑی کے جالے تنے تھے۔ ہم دونوں نے اسے اچھی طرح صاف کیا۔ ہر چیز کو جھاڑ پونچھ کر قرینے سے لگایا۔ نواب تقی مرحوم کا پرانا بستر میلا اور بوسیدہ ہوگیا تھا۔ اسے ہٹا کر مسہری پر صاف ستھرا بستر بھی بچھا دیا۔ اور بھی ضرورت کے مطابق کئی تبدیلیاں کیں۔"

ارجمند سلطانہ خاموش بیٹھی رہیں۔ انھوں نے یہ معلوم کرنے کی کوشش نہ کی کہ وہ اور آغا پہلی بار اس کمرے میں کس مقصد سے آئے تھے اور انھیں دروازے پر پڑا ہوا قفل کھولنے کی ضرورت کیوں لاحق ہوئی تھی؟ قیصر مرزا نے بھی اس سلسلے میں کچھ نہ بتایا۔ وہ کرسی پر اطمینان سے بیٹھا سنبھل سنبھل کر بولتا رہا۔

"مگر ہم دونوں ہمیشہ رات ہی کو یہاں آتے تھے اور کبھی پہر رات گزرنے سے قبل نہیں آئے۔ دن میں تو اسی روز آیا تھا جب طلعت آرا سے پہلی بار آمنا سامنا ہوا تھا اس وقت بھی جس مجبوری کے تحت آیا تھا، اس کا اظہار پہلے ہی کر چکا ہوں۔"

"معلوم ہوتا ہے تم دونوں کو دیوار پھاندنے کی پہلے سے خاصی مشق ہے۔" ارجمند سلطانہ نے قیصر مرزا کو مشتبہ نظروں سے دیکھا۔ "تب ہی تو اس قدر آسانی سے آتے جاتے ہو۔"

"جی نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔" قیصر مرزا نے فوراً صفائی پیش کی۔ "وہ ایسا ہے کہ بارہ دری کے زینے کی ممٹی کے پاس عشرت منزل کی چھت کا جو حصہ ہے اس کی دیوار زیادہ اونچی نہیں ہے۔ یہی کوئی گز سوا گز اونچی ہوگی۔ اس پر کوئی بھی آسانی سے چڑھ کر اِدھر آسکتا ہے۔ شاید آپ کو معلوم نہیں، ایک زمانے میں عشرت منزل بھی بارہ دری ہی کا حصّہ تھی بلکہ زینے میں کھڑکی نما ایسا دروازہ بھی تھا جسے دونوں گھروں میں آمد و رفت کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ مگر جب عشرت منزل کی ملکیّت کسی دوسرے کے پاس چلی گئی تو کھڑکی تڑوا کر دیوار چنوا دی گئی۔ البتّہ اس کا نشان ابھی تک صاف نظر آتا ہے۔"

ارجمند سلطانہ نے بات آگے بڑھانے سے گریز کیا۔ فوراً حرفِ مطلب پر آگئیں۔

"یہ بتاؤ کہ طلعت آرا کو جب ہوش آیا تو اس نے کیا کیا؟"

"ہوش میں آنے کے بعد بھی وہ بہت خوفزدہ تھیں۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے

دیکھ رہی تھیں۔"

"تم نے اسے واپس کیوں نہیں جانے دیا؟"

"وہ بھی خاموش تھیں اور میں بھی بالکل خاموش تھا۔ نہ وہ بولیں نہ میں۔ ہم دونوں ہی حیران و پریشان تھے۔" قیصر مرزا اپنی بات کہتے کہتے یکا یک شرما گیا۔ نظریں جھکا کر مدھم لہجے میں گویا ہُوا۔ "ویسے یہ بات بھی تھی کہ طلعت آرا کی خوبصورتی اور حسن کی دھوم تو میں نے اپنے گھر میں بہت سُنی تھی، لیکن جب اپنی آنکھوں سے دیکھا تو میں دل کے ہاتھوں مجبور ہو گیا۔" اس کے چہرے پر سُرخی دوڑ گئی۔ "جی چاہتا تھا کہ بس ان کو دیکھتا ہی رہوں۔"

ارجمند سلطانہ اس کی صاف گوئی پر بے ساختہ مُسکرا دیں۔

"میں نے بعد میں ان کو تسلی دینے کی بھی کوشش کی تھی۔" قیصر مرزا صفائی پیش کرنے لگا۔ "لیکن وہ اس قدر سہمی ہوئی تھیں کہ ان کے منہ سے آواز ہی نہ نکلی۔ سمٹی ہوئی مسہری کے ایک کونے پر خاموش بیٹھی رہیں۔ اسی اثنا میں آغا جانی مجھے تلاش کرتا ہوا کمرے میں پہنچ گیا۔"

"وہ بھی تمہاری طرح طلعت آرا پر عاشق ہو گیا۔" ارجمند سلطانہ نے تلخی سے اپنے ردِ عمل کا اظہار کیا۔

"جی نہیں۔ ایسا نہیں ہُوا۔" قیصر مرزا نے وضاحت کی۔ "آپ نے آغا جانی کو نہیں دیکھا۔ ایسا بدشکل ہے کہ میں آپ سے کیا عرض کروں۔ باپ اس کے شیدی تھے یا ماں حبشن ہوں گی۔ مجھے اس کے خاندان کے بارے میں کچھ معلوم نہیں لیکن اسے دیکھ کر یہی اندازہ ہوتا ہے۔ کالا رنگ اور اس پر چیچک کے داغ۔ یہ موٹی پچکی ہوئی ناک اور اس وقت تو وہ تہ خانے سے نکل کر آیا تھا۔ آنکھیں سرخ انگارہ ہو رہی تھیں۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ ایسا خوفناک اور ڈراؤنا نظر آ رہا تھا کہ طلعت آرا تو اسے دیکھتے ہی تھرتھر کانپنے لگیں۔ اس قدر ڈر گئیں کہ بے اختیار رونے لگیں۔ میری تو عقل چکرا گئی۔ مطلق سمجھ میں نہ آیا کہ بیٹھے بٹھائے ان کو کیا ہو گیا۔ آغا جانی بھی ہکا بکا کھڑا ان کو دیکھ رہا تھا۔"

"وہ جتنی معصوم اور بھولی ہے، اتنی ہی ناسمجھ اور سادہ لوح بھی ہے۔" ارجمند سلطانہ نے تبصرہ کیا۔ "بات دراصل یہ ہے کہ اسے گھر کی چار دیواری کے باہر کی دنیا کے بارے میں کچھ خبر

نہیں۔ ماں اسے ابھی تک ننھی بچی سمجھتی ہیں۔ قدم قدم پر روک ٹوک۔ نہ کہیں آنے کی اجازت، نہ کسی سے ملنے جلنے کی۔ عالم یہ ہے کہ میرے سامنے تک آنے پر پابندی لگا رکھی ہے۔" ان کے لہجے میں جھنجلاہٹ پیدا ہو گئی۔ "اور یہ پابندی صرف اس لئے ہے کہ میں بے پردہ رہتی ہوں۔ انھوں نے تو اسے کنوئیں کا مینڈک بنا رکھا ہے۔ بالکل چھوئی موئی کا پودا۔ ہاتھ لگاؤ تو مرجھا جائے۔"

"واللہ آپ نے بالکل درست فرمایا۔" قیصر مرزا نے ارجمند سلطانہ کی تائید کرتے ہوئے بتایا۔ "آغا سے تو وہ اس قدر دہشت زدہ ہوئیں کہ اُٹھ کر میرے پیروں پر گر پڑیں۔ سسکیاں بھر کر گڑگڑانے لگیں۔ میری خطا معاف کر دیجئے۔ میں اب کبھی بے ادبی نہیں کروں گی۔ انھوں نے نہ جانے کیا کیا گھبراہٹ اور پریشانی کے عالم میں کہا۔ کہتی کچھ تھیں، زبان سے نکلتا کچھ تھا۔ مجھے تو اب ٹھیک سے یاد بھی نہیں کہ اس وقت وہ کیا کہہ رہی تھیں۔ قسم ہے جناب امیر کی، اس طرح بلک بلک کر رو رہی تھیں کہ میں آپ سے کیا عرض کروں۔ یقین مانیئے، میں آپ سے بالکل صحیح بتا رہا ہوں۔"

"تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔" ارجمند سلطانہ نے تردید کرنے کی کوشش نہ کی۔ "مجھے اندازہ ہے کہ ایسا ہی ہوا ہوگا۔"

"میں آپ سے کیا کیا عرض کروں۔" قیصر مرزا کی حوصلہ افزائی ہوئی تو اس نے مزید تفصیل بیان کی۔ "میں نے بدحواس ہو کر ان کا بازو پکڑا۔ فرش سے اُوپر اُٹھانا چاہا تو وہ دُہائی دینے لگیں۔ مولا مشکل کُشا، مجھے ان جنوں کے نرغے سے بچا لیجئے۔ یا آقا! مجھے بچائیے۔ دُہائی دیتے دیتے وہ پھر بے ہوش ہو گئیں۔"

ارجمند سلطانہ خاموش بیٹھی دلچسپی اور توجہ سے قیصر مرزا کی باتیں سنتی رہیں۔ نہ انھوں نے دخل دیا، نہ اسے ٹوکا۔ نظریں اُٹھائے اس کے چہرے کو تکتی رہیں۔

(۶)

کمرے کے باہر چٹکی ہوئی چاندنی پھیکی پڑ چکی تھی۔ رات نڈھال اور دم بخود تھی۔

بارہ دری پر موت کا سناٹا طاری تھا۔

قیصر مرزا نے اپنی بات کہتے کہتے ٹھنڈی سانس بھری اور چپ ہو گیا۔ اسے بے ساختہ وہ سہانی گھڑی یاد آ گئی، جب طلعت آرا بے ہوش پڑی تھی۔ چہرہ گیندے کے پھول کی مانند مرجھا کر زرد پڑ گیا تھا۔ سانس آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ اسے اپنے گرد و پیش کی کچھ خبر نہ تھی۔

اس عالم میں وہ اتنی حسین نظر آ رہی تھی کہ قیصر مرزا ذہنی طور پر پریشان ہونے کے باوجود ٹکٹکی باندھے اس کے خوبصورت چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ آغا جانی اس کے برابر ہی کھڑا تھا۔ وہ بھی طلعت آرا کی جانب دیکھ رہا تھا۔ مگر اس کے چہرے پر نہ اب گھبراہٹ تھی، نہ پریشانی۔ وہ سخت حیرت زدہ تھا۔ اس کے ذہن میں طلعت آرا کے بارے میں طرح طرح کے سوالات کلبلا رہے تھے۔ وہ صورتحال سے قطعی طور پر نا آشنا تھا۔

قیصر مرزا کو اب تک یاد تھا کہ آغا نے آہستہ سے کھنکار کر اسے اپنی طرف متوجہ کیا تھا اور ہاتھ اُٹھا کر طلعت آرا کی جانب اشارہ کیا۔ وہ اس کے بارے میں جاننا چاہتا تھا لیکن قیصر مرزا نے جب کچھ نہ بتایا اور بت بنا کھڑا رہا تو آغا نے اس کا بازو پکڑا اور کمرے سے باہر لے گیا۔ دروازے سے ذرا ہٹ کر سرگوشی کے انداز میں آہستہ سے پوچھا۔ ”اماں قیصر مرزا! یہ ماجرا کیا ہے؟“ اس نے تجسس کا اظہار کیا۔ ”کون ہے یہ؟“

قیصر مرزا بدستور خاموش رہا۔ اس نے طلعت آرا کے متعلق آغا کو کچھ نہ بتایا حالانکہ وہ طلعت آرا ہی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ مگر آغا خاموش نہ رہ سکا۔ بے چین ہو کر بولا۔

”اماں اب کچھ مُنہ سے بھی بولو۔ یہ بتاؤ یہ ہے کون؟“

”نواب تقی مرحوم کی بیٹی، طلعت آرا۔“

”اچھا تو یہ چکر ہے۔“ آغا جانی نے بے تکلفی سے مُسکرا کر اپنے فوری ردِ عمل کا اظہار کیا۔ ”واللہ کمال کر دیا اُستاد۔ تم تو چھپے رستم نکلے۔ معلوم ہوتا ہے بہت دنوں سے یہ سلسلہ چل رہا تھا۔“

”آہستہ بولو۔“ قیصر مرزا نے سرگوشی کی۔ پلٹ کر دروازے کی جانب دیکھا۔ آغا جانی

کا ہاتھ پکڑا اور دُور لے جاکر اس کی بدگمانی دور کرنے کی کوشش کی۔ "تم کو مُغالطہ ہُوا۔ میں نے تو اسے آج پہلی بار دیکھا ہے۔ تم سے بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔"

"یار تمہاری بات سمجھ میں نہیں آتی۔" آغا جانی نے قیصر مرزا کو مشتبہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "اگر تم نے اسے پہلی مرتبہ دیکھا ہے تو وہ کمرے میں پہنچی کیسے؟ اور سَو باتوں کی ایک بات یہ ہے کہ یہاں تو کوئی آتا ہی نہیں۔ وہ چھت پر آگئی اور بالکل اکیلی۔"

"مجھے کیا معلوم کیسے آئی اور کیوں آئی؟" قیصر نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "میں تو اتنا جانتا ہوں کہ ابا جان کے ڈر سے دیوار پھاند کر اِدھر آیا اور زینے کے دروازے کی کُنڈی لگانے کے لئے بڑھا تو وہ دروازے سے نکل کر ایک دم میرے سامنے آگئی۔"

"پھر کیا ہوا؟" آغا نے کُرید کر پوچھا۔

"مجھے دیکھتے ہی بے ہوش ہوگئی۔" قیصر مرزا نے وضاحت کی۔ "ہوش آیا تو پوچھنے پر اپنا نام بتایا۔ مگر اتنی خوفزدہ تھی کہ منہ سے آواز نہ نکلتی تھی۔ زیادہ بات چیت کی نوبت ہی نہ آئی۔ اسی اثناء میں تم آگئے۔ پھر جو کچھ ہُوا تمہارے سامنے ہی ہُوا۔"

قیصر مرزا کو یاد آیا کہ اس کی بات سُن کر آغا جانی کچھ دیر خاموش کھڑا سوچتا رہا۔ پھر اس نے کہا تھا۔ "اماں، طلعت آرا کی باتوں سے تو ایسا لگتا ہے کہ وہ ہم دونوں کو کچھ جنات ونات سمجھ رہی ہے۔ تم نے غور نہیں کیا۔ کس طرح رو، رو کر دُعائیں مانگ رہی تھی۔ یا مولا مشکل کُشا مجھے ان جنوں سے بچایئے۔" وہ بے تکلفی سے مسکرایا۔ "ابے تو ویسے ہی دیکھنے میں گلفام لگتا ہے۔ تجھے وہ پرستان کا شہزادہ اور مجھے دیو یا تیرا غلام سمجھ بیٹھی ہے۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "کیا کروں۔ اللہ نے میری شکل ہی ایسی بنائی ہے۔"

"یہ باتیں چھوڑو۔ پہلے اسے ہوش میں لانے کی سوچو۔ بالکل مُردے کی طرح بے جان پڑی ہے۔ تم ایسا کرو۔ لوٹے یا کٹورے میں پانی بھر کر لاؤ۔ منہ پر چھینٹا دو تاکہ اسے ہوش آجائے۔"

"اس کی فکر نہ کرو۔" آغا جانی نے بے نیازی سے کہا۔ "خود بخود ہوش میں آجائے گی۔ خوف سے بے ہوش ہوگئی ہے۔ گھبرانے یا پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں۔"

"مگر اب کیا، کیا جائے؟" قیصر مرزا بدستور پریشان تھا۔

"یہ تو تم اپنے دل سے پوچھو کہ اب کیا کیا جائے؟"

"یار یہ سوچ لو، کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔" قیصر مرزا نے تشویش کا اظہار کیا۔

"گڑبڑ کیا ہو سکتی ہے؟" آغا نے مسکرا کر بے نیازی سے کہا۔

"مان لو۔ اس نے شور مچا کر کسی کو مدد کے لئے بلایا۔" قیصر مرزا نے آغا کو خطرے سے خبردار کیا۔ "بھاگنے کو راستہ بھی نہ ملے گا۔ ایسی آفت نازل ہوگی کہ لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ معاملہ کہیں پولیس تک نہ چلا جائے۔ کسی کے گھر میں اس طرح دیوار پھاند کر جانا معمولی جرم نہیں۔"

"احمق ہوئے ہو۔" آغا نے قیصر مرزا کو بے تکلفی سے ڈانٹا۔ "ایسی باتیں بدنامی کے ڈر سے تھانہ پولیس تک نہیں جاتیں۔" آغا جانی قیصر سے عمر میں کہیں زیادہ بڑا تھا۔ جہاندیدہ اور گھاگ بھی تھا۔ لہٰذا اس کا انداز بھی ناصحانہ تھا۔

قیصر مرزا ہنوز سہما ہوا تھا۔ "یار مجھے تو بڑا ڈر معلوم ہو رہا ہے۔"

"ڈر تو مجھے بھی معلوم ہو رہا ہے، مگر صرف تمہارے اباجان سے۔" آغا نے دبی زبان سے خدشہ کا اظہار کیا۔ "وہ تو ایسے ہی مزاج کے بہت کڑوے ہیں۔ مجھ سے تو ان کو خدا واسطے کا بیر ہے۔ دیکھتے ہی تیوری پر بل پڑ جاتے ہیں۔ ایسی قہر آلود نظروں سے دیکھتے ہیں کہ میری تو سٹی گم ہو جاتی ہے۔" آغا کا لہجہ مدّہم ہو گیا۔ "ان کے کانوں میں ذرا بھی بھنک پڑ گئی تو قیامت برپا کر دیں گے۔"

"ہاں یار، ان کے غصّے سے تو میرا بھی دم نکلتا ہے۔" قیصر مرزا پریشان ہو کر بولا۔

"تمہارا تو کچھ نہیں جائے گا۔ مجھے وہ ہرگز نہیں بخشیں گے۔ پہلے ہی مجھ سے سخت نالاں ہیں۔ عاق کر دیں تو کوئی تعجب نہیں۔"

آغا نے قیصر مرزا کی بات سُن کر کسی ردِّ عمل کا اظہار نہیں کیا۔ خاموش کھڑا سوچتا رہا۔

"اپنی سمجھ میں تو یہ آتا ہے کہ اب چُپکے سے یہاں سے کھسک جائیں۔" قیصر مرزا نے تجویز پیش کی۔ "ہوش میں آنے کے بعد طلعت آرا خود ہی اُٹھ کر نیچے چلی جائے گی۔"

"تو پھر چلو ایسا ہی کرتے ہیں۔" آغا جانی بھی آمادہ ہو گیا۔ "اب یہاں زیادہ دیر ٹھہرنا مناسب نہیں۔"

دونوں آگے بڑھے مگر قیصر مرزا زینے کے قریب پہنچ کر ٹھہر گیا۔ آغا جانی نے پلٹ کر پوچھا۔ "اماں رک کیوں گئے؟ ارادہ کیا ہے؟ صاف صاف بتاؤ۔"

"جی چاہتا ہے طلعت کو ایک بار اور دیکھ لوں۔"

"کیوں؟" آغا جانی نے تیکھے لہجے میں سوال کیا۔ پھر بے تکلفی سے مسکرا کر گویا ہوا۔ "اماں، تمہارا اس پر دل تو نہیں آ گیا؟ ظالم ہے بھی تو کس غضب کی حسین۔"

"واقعی غضب کی حسین ہے۔" قیصر مرزا نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "جی چاہتا ہے کہ بس اسے دیکھتے ہی رہو۔"

"وقت کم ہے یہ بتاؤ کہ تم چاہتے کیا ہو؟" آغا جانی نے آنکھ مار کر بے تکلفی سے کہا۔ "یہ سمجھ لو ایسا موقع پھر ہاتھ نہیں آئے گا۔ زندگی بھر پچھتاؤ گے۔"

"صاف بات تو یہ ہے کہ اپنا تو دماغ کام نہیں کر رہا۔ کچھ سمجھ ہی میں نہیں آ رہا ہے۔" قیصر مرزا نے بلا جھجک اپنی ذہنی کیفیت کا اظہار کر دیا۔ "کچھ تم ہی مشورہ دو۔ بتاؤ میں کیا کروں؟"

"بزدلی کا مظاہرہ نہ کرو۔" آغا نے سنجیدگی سے کہا۔ "مجھے ایک ترکیب سوجھی ہے۔ معاملہ ایسا فٹ بیٹھے گا کہ تم بھی کیا یاد کرو گے کہ کوئی آغا جانی ملا تھا۔"

"کیا ترکیب سوچی ہے تم نے؟" قیصر مرزا نے دلچسپی کا اظہار کیا۔

"تم شاہ جن کے شہزادے بن جاؤ۔ میں خود کو تمہارا غلام ظاہر کروں گا۔" آغا نے اپنا منصوبہ بیان کیا۔ "طلعت آرا آسانی سے یقین بھی کر لے گی۔ اس نے پہلے ہی ہم دونوں کے بارے میں یہی سوچ رکھا ہے۔ اس کی باتوں سے تو میں نے یہی اندازہ لگایا ہے۔ تم نے بھی ایسا ہی محسوس کیا ہوگا۔ تب ہی تو اس قدر ڈری سہمی ہوئی ہے۔"

"کہہ تو تم ٹھیک رہے ہو۔" قیصر مرزا نے اس کی تائید کی۔ "معاملہ تو مجھے بھی ایسا ہی نظر آتا ہے۔"

"تو ملاؤ پھر اسی بات پر پُلاؤ والا ہاتھ" آغا جانی نے قیصر مرزا کا ہاتھ تھام کر جوش و خروش سے دبایا۔ "بس تم کو ذرا ایکٹنگ کرنا ہوگی۔"

"مگر یار آغا! میں نے تو کبھی ایکٹنگ ویکٹنگ کی نہیں۔" قیصر مرزا نے نہایت سادگی سے جواب دیا۔

"تم نے نہیں کی، میں نے تو برسوں کی ہے۔" آغا نے مُسکرا کر کہا۔ "پہلے بھی تم کو بتا چکا ہوں۔ الفریڈ تھیٹر کمپنی کے کھیل 'لیلیٰ مجنوں' میں تو ہمیشہ لیلیٰ کے باپ کا پارٹ کرتا تھا۔ ماسٹر امیر جان کی اندر سبھا میں کالے دیو کا پارٹ کرتا تو وہ ہمیشہ تعریف کرتے تھے۔"

"تم دیکھنے ہی میں کالے دیو نظر آتے ہو۔" قیصر مرزا نے ہنس کر چوٹ کی لیکن آغا اسے خاموشی سے جھیل گیا۔ ذرا بُرا نہ مانا۔ جھینپ کر بولا "اصل چیز تو ایکٹنگ ہوتی ہے۔ کچھ تو میک اَپ سے چہرہ ڈراؤنا ہو جاتا ہے۔ مگر ایکٹنگ اور ڈائیلاگ کی ادائیگی سے اس طرح نبھانا پڑتا ہے کہ تماشائیوں پر خوف اور دہشت طاری ہو جائے۔ نقل پر اصل کا گمان ہو۔"

"تم تو پٹری سے اُتر کر نہ جانے کدھر نکل گئے۔" قیصر مرزا نے جھنجلا کر اسے ٹوکا۔

"تم کو کیا خبر ماسٹر امیر جان کے ساتھ رہ کر کیسے اچھے دن گزارے ہیں۔ ان کی اندر سبھا میں جانکی بائی سبز پری کا پارٹ کرتی تھی۔ حُسن کے ساتھ ساتھ آواز ایسی سُریلی تھی، جیسے کوئل کوک رہی ہو۔"

"اب بس کرو۔ کتنی بار جانکی بائی کا قصّہ سُناؤ گے۔ سُنتے سُنتے اب تو کان پک گئے۔" قیصر مرزا نے آغا جانی کو آگے بولنے کا موقع نہ دیا۔ بے زاری سے بولا۔ "یہ بتاؤ اب کیا کرنا ہے؟"

"اس کا مطلب یہ ہُوا کہ تم بالکل تیار ہو۔" آغا جانی نے مُسکرا کر آہستہ آہستہ گردن ہلائی۔ "اچھا اب تم ایسا کرو کہ دیوار پھاند کر عشرت منزل میں پہنچو۔ نہا دھو کر عمدہ لباس پہنو۔ کپڑوں پر عطر لگاؤ اور خوب بن ٹھن کر اس شان سے طلعت آرا کے سامنے جاؤ کہ بالکل پرستان کے شہزادے نظر آؤ۔"

"تم میرے ساتھ نہیں چلو گے؟"

"نہیں میں یہیں ٹھہروں گا۔" آغا نے کہا۔ "میں کمرے میں جا کر طلعت آرا کو ہوش میں لانے کی کوشش کروں گا۔ جب وہ ہوش میں آجائے گی تو تمہارا غلام بن کر ایسی ایکٹنگ کروں گا کہ جو کچھ اس سے کہوں، جیسا بتاؤں، آنکھ بند کر کے یقین کر لے۔"

قیصر مرزا کو معاً یاد آیا کہ جس وقت آغا جانی اسے اپنے منصوبے سے آگاہ کر رہا تھا اس وقت بارہ دری میں چہل پہل شروع ہو چکی تھی۔ صحن میں ماماؤں کی ملی جلی آوازوں کا مدہم شور اُبھر رہا تھا۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ دھوپ مٹیالی پڑ کر دُھندلی دُھندلی روشنی میں تبدیل ہو گئی تھی۔ شام کے سائے اُونچی اُونچی دیواروں سے اُتر کر فضا میں تحلیل ہو رہے تھے۔ قیصر مرزا کو طرح طرح کے اندیشے پریشان کرنے لگے تھے۔ اس نے خوفزدہ نظروں سے صحن کی سمت دیکھا اور آغا کو اپنے خدشات سے آگاہ کرنے کی کوشش بھی کی تھی۔

"یار آغا! میں تو چلا جاؤں گا، ڈرتا ہوں تم کسی مصیبت میں نہ پھنس جاؤ۔"

"تم میری فکر نہ کرو۔ میں تمہاری طرح ڈرپوک نہیں ہوں۔ ڈرنے والا ہوتا تو تہہ خانے میں بیٹھ کر آدھی رات کو تن تنہا چلّہ کشی نہ کرتا۔ مایا کو جگا نا تم ہنسی ٹھٹھا سمجھتے ہو۔ ذرا بھی دل میں خوف سمایا۔ فوراً ٹینٹوا دبوچ لیتی ہے۔ سینہ چیر کر کلیجہ چبا لیتی ہے۔"

"تمہاری ہمت کی تو میں داد دیتا ہوں۔ بہت نڈر اور جی دار ہو۔" قیصر مرزا نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی، مگر ساتھ ہی خبردار بھی کیا۔ "اگر کوئی طلعت آرا کی تلاش میں اُوپر آ گیا تو؟"

"زینے کے دروازے کی کُنڈی تو لگی ہے نا۔ جیسے ہی دروازے پر آہٹ ہوئی میں فوراً دیوار پھاند کر غڑاپ سے اپنی طرف کود جاؤں گا۔" آغا نے نہایت بے باکی سے قیصر مرزا کو اطمینان دلایا۔ "میرا کوئی کیا بگاڑ لے گا۔ فکر تو مجھے تمہاری ہے۔ تم کہیں پکڑے نہ جاؤ۔ سارے کیے دھرے پر پانی پھر جائے گا۔"

"تم جیسا کہو گے ویسا ہی کروں گا۔ خواہ مخواہ کی اکڑفوں نہ دکھاؤ۔"

"اچھا اب تم جاؤ۔" آغا نے ہاتھ سے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔" ایسا نہ ہو کہ طلعت آرا کو ہوش آجائے اور وہ کمرے سے نکل کر یہاں آجائے۔"

قیصر مرزا جانے کے لئے مڑا تو آغا نے ٹوکا۔" سنو، یہاں آتے وقت مٹی کے سکورے میں عُود و عنبر سُلگا کر لیتے آنا۔" آغا نے اس کا مقصد بھی بتایا۔" عود و عنبر کی خوشبو پھیلتے ہی میں سمجھ جاؤں گا کہ تم پہنچ گئے ہو۔ میں فوراً باہر آجاؤں گا اور تم کو بتاؤں گا کہ میں نے طلعت آرا کے سامنے کس طرح اپنی ایکٹنگ دکھائی اور تم کو کس طرح جنّوں کے شہزادے کا پارٹ ادا کرنا ہوگا۔" اس نے اپنے میلے میلے دانت نکال کر مسکرانے کی کوشش کی۔ " ایسا کرنا بہت ضروری ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ طلعت آرا کو ہم دونوں کے بارے میں ذرا بھی شبہ نہ ہو۔ کام سولہ آنے پکّا ہونا چاہیئے۔"

" مگر اس وقت عُود و عنبر کہاں سے لاؤں گا؟"

" تم گھاس تو نہیں کھا گئے۔" آغا نے جل کر قیصر مرزا کو ڈانٹا۔" تہہ خانے میں جاکر دیکھو۔ ایک نہیں دو طاقوں میں علیحدہ علیحدہ پُڑیوں میں عود اور عنبر رکھا ہے۔ لوبان بھی ہے اور اگر بتیاں بھی موجود ہیں۔ تم کو یہ بھی نہیں خبر کہ چلّہ کشی سے پہلے میں لوبان اور اگر بتیاں اور جمعرات کو عود و عنبر ضرور سُلگاتا ہوں۔"

☆

قیصر مرزا خاموشی سے مُڑا، آگے بڑھا اور دیوار پھاند کر عشرت منزل میں چلا گیا۔ اس نے غسل کیا۔ سر میں چنبیلی کا خوشبودار تیل ڈالا۔ آئینہ کے رو برو کھڑے ہو کر بالوں کو کنگھے سے سنوارا۔ عطر کی شیشی نکالی اور لباس پر اس قدر عطر لگایا کہ خوشبو سے مہکنے لگا۔

وہ دیر تک آئینے میں پہلو بدل بدل کر اپنی سج دھج دیکھتا رہا۔ اب شام کا اندھیرا پھیل گیا تھا۔ اس نے لالٹین روشن کی اور ہاتھ میں سنبھال کر تہہ خانے کے دروازے پر پہنچا۔ سیڑھیوں سے نیچے اُترا۔ ایک طاق سے عود و عنبر اُٹھایا۔ مٹی کی پیالی میں رکھ

کر اس طرح سلگایا کہ اس میں سے مہکتا ہوا دھواں اُٹھنے لگا۔

سُلگتے ہوئے عود و عنبر سے مہکتی ہوئی پیالی اُٹھائے وہ تہہ خانے سے باہر نکل آیا۔ لالٹین بُجھا کر ایک گوشے میں رکھی۔ ایک بار پھر آئینہ کے سامنے پہنچا اور لیمپ کی روشنی میں اپنے لباس پر ناقدانہ نظر ڈالی۔ بالوں کو از سرِ نو سنوارا۔ مُڑا اور سنبھل سنبھل کر قدم رکھتا ہوا زینے میں داخل ہُوا۔ سلگتے ہوئے عود و عنبر کی پیالی اس کے ہاتھ میں دبی تھی۔ سیڑھیاں طے کر کے اُوپر پہنچا۔ نہایت احتیاط سے دیوار پھاندی اور بارہ دری کی چھت پر پہنچ گیا۔

شام کا اندھیرا اب گہرا ہو چکا تھا۔ آغا جانی کہیں نظر نہ آتا تھا۔ البتہ کمرے کا دروازہ کھُلا تھا اور پردے سے روشنی چھن چھن کر مہتابی پر جھلملا رہی تھی۔ قیصر مرزا نے زینے کی طرف چوکنّا نظروں سے دیکھا۔ دروازے کی کنڈی بدستور لگی ہوئی تھی۔

قیصر مرزا نے جوتے اُتار کر ایک طرف رکھ دیئے اور ننگے پیر دبے دبے قدموں چلتا ہوا کمرے کے دروازے کی جانب بڑھا۔ مٹی کی پیالی اس کے ہاتھ میں تھی۔ سلگتے ہوئے عود و عنبر سے خوشبودار دُھواں اُٹھ کر فضا میں تحلیل ہو رہا تھا۔ قیصر مرزا دروازے کے قریب پہنچا اور دیوار سے لگ کر خاموشی سے کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنا دایاں ہاتھ آگے بڑھا دیا جس میں پیالی دبی ہوئی تھی۔

ہُوا کے ہلکے ہلکے جھُونکوں سے عود و عنبر کی خوشبو کمرے میں داخل ہونے لگی۔ کمرے میں گہری خاموشی چھائی تھی۔ ذرا ہی دیر بعد خاموشی میں آغا کی آواز اُبھری۔ وہ گُل بکاؤلی کے کسی کردار کی طرح خالص تھیٹریکل لہجے میں طلعت آرا سے کہہ رہا تھا۔

"ہَوا میں پھیلی ہوئی خوشبو بتا رہی ہے کہ شہزادہ گُل رُخ پرستان سے واپس تشریف لا رہے ہیں۔ غلام کو ان کے استقبال کے لیے خود حاضرِ خدمت ہونا ہو گا۔ میں اب جا رہا ہوں۔"

"میں بھی نیچے چلی جاؤں؟" یہ طلعت آرا کی آواز تھی۔ جسے قیصر مرزا نے پہچان لیا۔ اس کے لہجے میں استدعا تھی۔ "امّاں جان، حضرت عباس علمدار کی درگاہ سے اب

واپس آگئی ہوں گی۔ مجھے نہ پائیں گی تو بہت پریشان ہوں گی۔ وہ دل کی بہت کمزور ہیں۔"

"میں آپ سے پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ شہزادہ عالی قدر کی اجازت کے بغیر غلام کچھ نہیں کر سکتا۔" آغا نے اپنی پاٹ دار آواز میں بے رُخی سے کہا۔"میں اپنے آقا کے حکم کا تابع دار ہوں۔"

"میری پیش خدمت، نجو، کو اچھی طرح معلوم ہے کہ میں مہرعالم کی رخصتی دیکھنے یہاں آئی تھی۔" طلعت آرا نے نرم لہجے میں کہا۔ مگر اب اس کی آواز میں خوف اور گھبراہٹ کا عنصر بہت کم تھا۔" وہ اماں جان کو میرے بارے میں بتا دے گی۔ معلوم نہیں نجو یہاں کیوں نہیں آئی لیکن ڈھونڈ یا پڑی تو کوئی نہ کوئی مجھے تلاش کرتا ہوا یہاں آجائے گا"

"یہاں آئے گا تو اپنی زندگی سے ہاتھ دھوئے گا۔" آغا جانی کا لہجہ اچانک درشت ہو گیا۔" اس کا بھی وہی حشر ہو گا جو آپ کے والد نواب تقی کا ہُوا۔" وہ چند لمحے خاموش رہا۔" میں بار بار آپ کو خبردار کر چکا ہوں کہ شہزادے کی واپسی سے پہلے یہاں سے جانے کا خیال دل سے نکال دیجئے۔ ورنہ آپ کے حق میں بہت بُرا ہو گا۔"

"ہائے اللہ۔ میں کیا کروں؟" طلعت آرا نے بے بسی سے تڑپ کر دُہائی دی۔ اس دفعہ اس کی آواز قدرے اُونچی تھی۔

"ضد نہ کیجئے اور آہستہ بولئے۔" آغا جانی نے دھمکی دی۔" اگر شور مچانے یا چیخنے چلّانے کی کوشش کی تو میں آپ کو مکھی بنا کر ڈبیا میں بند کر دوں گا اور اسی حالت میں شہزادے کی خدمت میں پیش کر دوں گا۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ میں جن ہوں اور بالکل ایسا کر سکتا ہوں۔ کہئے تو ابھی آپ کو مکھی بنا کر دکھا دوں۔ ساری زندگی اسی شکل میں رہیں گی۔"

قیصر مرزا نے آغا کی مضحکہ خیز دھمکی سُنی تو بڑی مشکل سے اپنی ہنسی ضبط کی۔

"نہیں، نہیں، ایسا نہ کیجئے گا۔" طلعت آرا نے گڑگڑا کر کہا۔" خدا کے لیے یہ نہ کیجئے۔" اس کی آواز خوف اور دہشت سے تھرتھرا رہی تھی۔

"اگر آپ یہ چاہتی ہیں کہ میں ایسا نہ کروں تو چپ چاپ یہاں بیٹھی رہیں۔" آغا نے آواز میں کھرج پیدا کرتے ہوئے ترش روئی سے کہا۔ "نہ آپ یہاں سے جائیں گی۔ نہ کسی کو مدد کے لیے پکارنے کی کوشش کریں گی۔ سمجھ گئیں آپ!"

"جیسا آپ کہہ رہے ہیں، میں وہی کروں گی۔"

"میں اب شہزادے کے استقبال کے لیے جا رہا ہوں۔" آغا کی آواز کمرے میں ابھری۔ "آپ کو میری ہدایت پر سختی سے عمل کرنا ہوگا۔ ورنہ بارہ دری اور اس کے رہنے والوں پر ایسی تباہی نازل ہوگی کہ دنیا عبرت حاصل کرے گی۔" اس کا لہجہ اور درشت ہوگیا۔ "میں آپ کو آخری بار تنبیہہ کر رہا ہوں۔"

"جناب سیدہ کی قسم میں بالکل ایسا ہی کروں گی۔" طلعت آرا نے کپکپاتی ہوئی آواز میں آغا جانی کو یقین دلایا۔

"اچھا اب میں چلا۔" آغا نے چلتے چلتے طلعت آرا کو مزید دہشت زدہ کرنے کی غرض سے ایک بار پھر دھمکی دی۔ "باہر جنوں کا پہرہ ہے۔ وہ آپ کی نگرانی پر تعینات ہیں۔ آپ نے کمرے سے باہر نکلنے کی کوشش کی تو ان کے عتاب کا نشانہ بنیں گی۔"

طلعت آرا سہمی ہوئی بیٹھی رہی۔ آغا جانی کمرے سے باہر آیا۔ اس نے دروازہ بند کیا اور کنڈی بھی لگا دی۔

قیصر مرزا نے بولنا چاہا لیکن آغا نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ آہستہ سے اس کا بازو پکڑا۔ دروازے کے قریب رکھی ہوئی مٹی کی پیالی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سرگوشی کی۔ "سکورا اٹھا لو۔" قیصر مرزا نے اسے اٹھایا۔ آگے بڑھا اور اس کے ساتھ ساتھ چلا۔ دونوں خاموش تھے اور دبے دبے قدموں سے چل رہے تھے۔

قیصر مرزا نے مٹی کی پیالی ایک گوشے میں رکھ دی۔ سلگتے ہوئے عود و عنبر سے مہکتا ہوا دھواں اٹھتا رہا۔ فضا میں اس کی خوشبو رچی ہوئی تھی۔

قیصر مرزا نے جوتے پہنے۔ آغا کو مخاطب کیا۔ "آغا جانی، اب کیا ارادہ ہے؟"

اس کے لہجے سے بے قراری عیاں تھی۔

"یہاں نہیں، عشرت منزل میں بیٹھ کر اطمینان سے بات ہوگی۔" آغا نے مدّہم لہجے میں جواب دیا۔

"میں طلعت آرا کے پاس نہ جاؤں؟"

"اب تم اپنا لونڈا پن نہ دکھاؤ۔ جیسا کہہ رہا ہوں وہی کرو۔" آغا جانی نے قیصر مرزا کو پیار سے ڈانٹا۔ "آؤ میرے ساتھ۔"

قیصر مرزا نے مزید اڑنے کی کوشش نہ کی۔ دیوار پھاند کر دوسری طرف چلا گیا۔ آغا بھی اس کے پاس پہنچ گیا۔ دونوں زینے کی سیڑھیاں طے کر کے نیچے گئے اور کمرے میں جانے کے بجائے دالان میں پڑے ہوئے پلنگ پر بیٹھ گئے۔

"ہاں اب پوچھو، کیا پوچھتے ہو؟" آغا نے مسکرا کر کہا۔

"واللہ، مان گئے تم کو۔ بھئی جواب نہیں تمھارا۔" قیصر مرزا نے بے تکلفی سے آغا جانی کی پیٹھ تھپتھپائی۔ "کیا غضب کی ایکٹنگ کی ہے۔ میں تو دنگ رہ گیا۔ بالکل ایسا ہی معلوم ہوتا تھا جیسے تم اسٹیج پر کھڑے بول رہے ہو۔"

"تم نے تو کچھ دیکھا ہی نہیں۔" آغا نے گردن اونچی کر کے فخر سے بتایا۔ "اصل ایکٹنگ۔۔ تو وہ تھی جب ہوش میں آنے کے بعد طلعت آرا نے مجھے اپنے سامنے پایا۔ وہ بڑا نازک مرحلہ تھا۔ سب سے بڑا ڈر یہ تھا کہ خوف زدہ ہو کر کہیں چیخنا چلّانا نہ شروع کر دے۔"

"یار غضب ہو جاتا۔" قیصر مرزا پریشان ہو کر بولا۔ "مگر تم نے کیا تدبیر کی؟"

"بس پوچھو نہ کیا کرنا پڑا۔ باقاعدہ جن کا پارٹ ادا کیا۔ اسے ایسا دہشت زدہ کیا کہ تھر تھر کانپنے لگی۔ سسکیاں بھر کر گڑگڑانے لگی۔" آغا جانی مسکرا مسکرا کر قیصر مرزا کو بتاتا رہا۔ "ویسے یار بہت ہی بھولی بھالی لڑکی ہے۔ اسے دنیا کی کچھ خبر نہیں۔ جو کچھ میں نے کہا آنکھ بند کر کے یقین کر لیا۔ ذرا بھی تین پانچ نہیں کی۔ تمھارا تو میں نے زبردست رعب بٹھا دیا ہے۔ اس کے پاس جاؤ گے تو خود اندازہ ہو جائے گا۔"

"تم نے باہر سے دروازہ بند کر کے اچھا نہیں کیا۔" قیصر مرزا نے طلعت آرا کے لیے اپنے دِل میں ہمدردی اور لگاؤ کا جذبہ محسوس کیا۔ "حبس کے مارے بے چاری کا بُرا حال ہو جائے گا۔"

"تمھاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں نے پچھواڑے کی کھڑکی پہلے ہی کھول دی تھی۔ تم تو جانتے ہی ہو اس کھڑکی سے کیسی عمدہ ہَوا آتی ہے۔"

"اچھا، اب یہ بتاؤ کہ آگے کیا کرنا ہوگا؟"

"میں نے اسے بتایا ہے کہ تم شاہِ جن کے ولی عہد ہو اور پرستان میں رہتے ہو۔ جمعرات۔کے جمعرات تمھارا اِدھر کا پھیرا ہوتا ہے۔" آغا نے مطلع کیا۔ "میں نے جنّوں پری زادوں، پریوں اور پرستان کا ایسا نقشہ کھینچا ہے کہ کیا اندرسبھا میں دکھایا جائے گا۔ آواز کے اُتار چڑھاؤ سے وہ رنگ جمایا کہ اسے میری ہر بات کا سولہ آنے یقین آگیا۔ میں نے تمھارا نام شہزادہ گلرُخ بتایا ہے۔" وہ کھِل کھِلا کر ہنسا۔ "مجھے اس وقت یہی نام یاد آیا۔" آغا جانی اچانک سنجیدہ ہو گیا۔ "لیکن یہ نام اب بھولنا نہیں۔ ورنہ معاملہ گڑبڑ ہو جائے گا۔"

"مجھے تو اس نام کا اسی وقت علم ہو گیا تھا جب تم کمرے سے باہر آنے سے قبل اسے ڈرا دھمکا رہے تھے۔ میں تو بالکل دروازے سے لگا کھڑا تھا۔ تم دونوں کی ایک ایک بات سُن رہا تھا۔ جب تم نے طلعت آرا کو دہشت زدہ کرنے کے لیے اسے مکھی بنا کر ڈبیا میں بند کرنے کی دھمکی دی تو اس قدر زور کی ہنسی آئی کہ اسے روکنے کے لیے میں نے فوراً مُنہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ یار، تم تو غضب کے ایکٹر ہو۔ ایسا رُعب گانٹھا کہ وہ گڑگڑانے لگی۔"

"تم کو یہ نہیں معلوم کہ ڈبیا نکالنے کے لیے میں نے جھوٹ موٹ جیب میں ہاتھ بھی ڈالا تھا۔ آنکھیں نکال کر ایسی غضب ناک نظروں سے دیکھا تھا کہ وہ لرز کر رہ گئی۔ یہ تو تم نے سُن ہی لیا ہوگا کہ کس قدر عاجزی سے دُہائی دے رہی تھی۔" وہ اپنی بات کہتے کہتے ٹھٹکا، پھر اس کا لہجہ ناصحانہ ہو گیا۔ "اور دیکھو، یہ نہ بھولنا کہ وہ مجھے تمھارا

غلام سمجھتی ہے۔ میں نے اسے بتایا بھی یہی ہے۔" آغا نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "آگے چل کر ابھی اور نہ جانے کیا کیا بننا پڑے گا۔ اپنی، اپنی قسمت ہے۔"

"اب یہ دل توڑنے والی باتیں نہ کرو۔ میں نے کب کہا تھا کہ تم میرے غلام بن جاؤ۔"

"اب تو بن ہی گیا۔ اسے نبھانا ہی پڑے گا۔"

"طلعت آرا وہاں اکیلی بیٹھی ڈر رہی ہوگی۔ میں کب اس کے پاس جاؤں گا؟"

"چلے جانا، چلے جانا ذرا چھری کے نیچے دم تو لو۔" آغا نے بے تکلفی سے کہا۔ "ابھی تو سرِشام ہے۔ ہوسکتا ہے کوئی ڈھونڈتا ہوا اُوپر پہنچ جائے۔ جو کچھ ہونا ہے تمہاری عدم موجودگی میں ہوجائے۔ مان لو تم کمرے میں ہوئے اور کسی نے اوپر پہنچ کر زینے کا دروازہ بھڑبھڑانا شروع کردیا تو تم کو فوراً بھاگنا پڑے گا۔ تمہارے اس طرح بدحواس ہوکر بھاگنے سے سارا بھانڈا پھوٹ جائے گا۔" اس نے قدرے تامّل کیا۔ "ویسے اپنے طور پر تو میں نے طلعت آرا کو اس قدر دہشت زدہ کردیا ہے کہ وہ ہم دونوں کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتائے گی۔ اس نے دُنیا جہاں کی قسمیں کھا کھا کر یقین دلایا ہے۔ لیکن یار، اپنی طرف سے تو پوری، پوری احتیاط برتنا ہی چاہیئے۔"

آغا جانی کی بات قیصر مرزا کی سمجھ میں بھی آگئی۔ تائید کرتے ہوئے بولا۔ "کہتے تو تم ٹھیک ہو۔ جلد بازی میں کہیں معاملہ گڑبڑ نہ ہوجائے۔" قیصر مرزا کے چہرے پر خوف کا ہلکا سا سایہ پھیل گیا۔ "کام خطرناک ہے۔"

مگر قیصر مرزا کے برعکس آغا جانی قطعی مطمئن نظر آتا تھا۔ اس نے قیصر مرزا کی سراسیمگی محسوس بھی کی۔ ہاتھ بڑھا کر ہولے ہولے اس کی پیٹھ تھپکی۔ "اماں سب ٹھیک ہوجائے گا۔" آغا جانی نے قیصر مرزا کو تسلّی دی۔ "پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔"

"لیکن یار یہ تو سوچو۔ جوان جہاں لڑکی گھر سے غائب ہوجائے اور کوئی ہنگامہ برپا نہ ہو، کوئی ہلچل نہ ہو۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟" قیصر مرزا ایک بار پھر طرح طرح کے اندیشوں میں مبتلا ہوگیا۔ "وہاں تو کھلبلی پڑ گئی ہوگی۔ کوئی نہ کوئی طلعت آرا کو تلاش کرتا ہوا اُوپر بھی آسکتا ہے۔"

"آسکتا ہے اور بالکل آسکتا ہے۔ یہ خطرہ تو ہے۔" آغا نے اس کی تشویش نظر انداز کرنے کی کوشش نہ کی۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا، "مگر تم طلعت آرا کی ماں کو نہیں جانتے۔ تہوّر علی خان بتاتے تھے کہ وہ ایسی وہمی اور سادہ لوح ہیں کہ نواب تقی کو قتل کر دیا گیا اور اس قتل کے بارے میں شبہ بھی ظاہر کیا گیا مگر انھوں نے کسی کی ایک نہ سُنی۔ اب تک اس مراق میں مبتلا ہیں کہ جنّوں نے ان کا کلیجہ نکال کر چبا ڈالا۔" اس نے مُسکرا کر قیصر مرزا کی پیٹھ پر آہستہ سے دھپ لگایا۔

آغا جانی پُرانا گھاگ تھا۔ گھاٹ گھاٹ کا پانی پیئے ہوئے تھا۔ اس نے اس طرح گھُما پھرا کر بات کی کہ قیصر مرزا کے وسوسے کم ہو گئے۔ ویسے طلعت آرا سے اسے لگاؤ بھی پیدا ہو گیا تھا۔ دِل کے ہاتھوں مجبور ہو گیا۔ دبی زبان سے گویا ہُوا "یار سوچ لو۔"

"جو سوچنا تھا سوچ لیا۔" آغا نے نڈر ہو کر کہا۔ "پہلے یہ سوچو کہ طلعت آرا بھوکی پیاسی بیٹھی ہے۔ پہلے اس کے لیے کھانے پینے کا بندوبست ہونا چاہیئے۔ مجھے بھی بھوک لگی ہے۔"

"بھوک تو مجھے بھی معلوم ہو رہی ہے۔"

"ایسا کرو تم اپنے گھر چلے جاؤ۔ وہیں کھانا کھا لینا۔ تم ڈرے سہمے ہوئے بھی ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ جو کچھ ہونا ہے تمہاری غیر حاضری میں ہو جائے۔ تم پر کوئی آنچ نہ آئے۔" آغا نے اپنی محبت اور وفاداری کا مظاہرہ کیا۔ "اِدھر کچھ ہُوا تو میں نمٹ لوں گا۔ تم اس کی فکر نہ کرو۔ مجھے تو سب سے زیادہ تمہارے والد بزرگوار سے ڈر لگتا ہے۔ کہیں وہ تم کو ڈھونڈتے ہوئے پھر یہاں نہ آ جائیں۔ کہتے تھے تمہاری والدہ بہت پریشان ہیں۔"

"وہ تو خواہ مخواہ پریشان ہو جاتی ہیں۔"

"تم کو چاہتی بھی تو بہت ہیں۔ ہو بھی تو اکلوتے بیٹے۔" آغا جانی بے تکلفی سے مُسکرانے لگا۔ "تم گھر جا کر ان کو تسلّی دو۔ کوئی ایسا بہانہ بنانا کہ وہ مطمئن ہو جائیں۔ کچھ لاڈ پیار جتانا کچھ خوشامد درآمد کرنا اور ان سے کچھ رقم اینٹھ لینا۔"

"نہیں یار، اب وہ کچھ نہیں دیں گی۔ ابّا جان نے ان کو سختی سے منع کر دیا ہے۔ ان

سے کہتے ہیں کہ تم نے چپکے چپکے روپیہ پیسہ دے کر لڑکے کو بگاڑ دیا ہے۔ بُری صحبت میں پڑ کر ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے۔ بعد میں سر پر ہاتھ رکھ کر روتی رہو گی۔ اس کے لچھن اچھے نظر نہیں آتے۔"

"بس کرو، تم نے تو پورا دکھڑا سنانا شروع کر دیا۔" آغا نے اکتا کر اسے ٹوکا۔" میں تو یہ جانتا ہوں کہ تم ضد کرو گے تو کچھ نہ کچھ تو ضرور دے ہی دیں گی۔" اس نے تامل کیا، پھر سنجیدہ لہجے میں کہا۔" ورنہ کل لالہ بنارسی داس رستوگی کو رقعہ لکھ دینا۔ میں اس سے روپے لے آؤں گا۔ کم از کم تین سو کی ضرورت ہو گی۔" وہ ایک بار پھر بے تکلفی سے مسکرانے لگا۔" دفینہ نکل آیا تو اس کا ایک ایک پیسہ مع سود بیاج کے ادا کر دیں گے۔"

"مجھے تو وہ مزید قرضہ دیتا نظر نہیں آتا۔ پہلے ہی اس کی بہت رقم چڑھ گئی ہے۔ اسی کا بار، بار تقاضہ کرتا ہے۔ نالش کرنے کی دھمکی دیتا ہے۔"

"خالی دھمکی ہی دھمکی دیتا ہے۔" آغا نے بے نیازی سے اپنے ردِ عمل کا اظہار کیا۔" دے گا، اور اس کا باپ بھی دے گا۔ اُگاہی پر روپیہ نہ دے گا تو کیا مُچھٹے بھونتے گا۔ تم ابھی اناڑی ہو۔ اسے نہیں جانتے۔ بڑا خرانٹ بنیا ہے۔ ایک نمبر کا ٹیاں۔ اسے اچھی طرح خبر ہے کہ تم اپنے والد کے اکلوتے بیٹے ہو۔ ان کے بعد ساری جائیداد کے تم ہی وارث بنو گے۔ ایسی پوڑھی اسامی کو کہیں وہ چھوڑ سکتا ہے۔ وہ کبھی کبھی جو آنکھیں دکھاتا ہے تو یہ سب کاروباری پینترے ہیں۔"

"تم کہتے ہو تو میں کل ہی لالہ کے نام رقعہ لکھ دوں گا۔" قیصر مرزا رضامند ہو گیا۔ "اب اس سے پیسہ لانا تمھارا کام ہے۔ ویسے پرونوٹ کے بغیر قرض مشکل ہی سے دے گا۔"

"تم فکر نہ کرو۔ میں پرونوٹ کے بغیر بھی اُس سے روپیہ لے آؤں گا۔ یہ بتاؤ، اس وقت تمھارے پاس کتنے روپے ہیں؟"

قیصر مرزا نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ پانچ روپے نکالے اور آغا کی طرف بڑھا کر بولا۔" لو، آج تو ان سے کام چلاؤ۔"

"اماں، پانچ روپے میں کیا ہوگا۔ کم از کم پچاس تو نکالو۔" آغا نے پانچ روپے نہ لیے۔ " آج ایسا ویسا کھانا نہیں آئے گا۔ ایسا عمدہ اور پُر تکلف کھانا آئے گا کہ طلعت آرا کو یقین آجائے کہ پرستان سے آیا ہے۔ اور کسی شہزادے نے بھیجا ہے۔ کیا سمجھے؟"

"اچھا تو دس روپے لے لو۔"

"اب کنجوسی نہ دکھاؤ۔ دس روپے سے کام نہیں چلے گا۔ کم از کم پچاس تو نکالو۔" آغا نے بے تکلفی سے مسکرا کر قیصر مرزا کو دیکھا۔ "چوک جاؤں گا۔ پھاٹک حیدر حسین خاں والی گلی میں فضلو کی دوکان سے مزعفر لوں گا۔ پھر تحسین علی خاں کی مسجد کا رُخ کروں گا۔ عبداللہ نان بائی سے تنوری پراٹھے، یخنی پلاؤ، مرغ مسلّم، شامی کباب، دوپیازہ، متنجن، دست پیچ اور اس کے ساتھ، ساتھ قدرت حلوائی کی دُکان سے مٹھائی خریدوں گا۔ میوے ہوں گے۔ خوان پوش سے ڈھک کر باقاعدہ کشتیوں میں اس طرح طلعت آرا کے سامنے لے جاؤں گا کہ تمہاری دھاک بیٹھ جائے۔"

"اگر اتنا اہتمام کرکے تم اسے مرعوب ہی کرنا چاہتے ہو، تب بھی پچاس روپے تو بہت ہوئے۔"

"صرف کھانا نہیں لاؤں گا۔ ہار پھول لاؤں گا۔ عطر لاؤں گا۔ اور بھی بہت سا ساز و سامان ہوگا۔"

"وہ کاہے کے لیے؟" قیصر مرزا نے حیرت زدہ ہوکر پوچھا۔

"ابھی تم کو نہیں بتاؤں گا" آغا نے مسکرا کر جواب دیا۔ "لاؤ نکالو سیدھے ہاتھ سے پچاس روپے۔"

"تم تو معمّے میں باتیں کر رہے ہو۔ صاف صاف بتاؤ۔" قیصر مرزا ہنوز حیرت زدہ تھا۔

"تم سے جو کہہ رہا ہوں وہ کرو۔ پچاس روپے میرے حوالے کردو۔ گھر جاؤ اور کوئی ایسا بڑھیا لباس پہن کر آؤ کہ بالکل پرستان کے شہزادے لگو۔" آغا نے ناقدانہ نظروں سے قیصر مرزا کو دیکھا۔ "یار معاف کرنا، اس لباس میں تم کچھ زیادہ نہیں

بچ رہے ہو۔ شہزادوں والی شان و شوکت نظر نہیں آتی۔"

قیصر مرزا کچھ نہ بولا۔ خاموش بیٹھا رہا۔ مگر جب آغا جانی نے اصرار کیا تو وہ اُٹھا اپنے کمرے میں گیا۔ صندوق کا تالا کھولا۔ اس میں کُل اڑتالیس روپے تھے۔ اس نے تمام رقم اُٹھا کر جیب میں رکھی۔ واپس آغا کے پاس پہنچا۔ جیب سے چالیس روپے نکالے اور آغا کی جانب بڑھا کر بولا۔

"لو، یہ رکھ لو۔ میرے پاس اب صرف آٹھ روپے اور کچھ ریزگاری رہ گئی ہے۔ قسم لے لو، اس کے علاوہ اب کچھ نہیں۔"

"اسی سے کام چلانے کی کوشش کروں گا۔" آغا جانی نے روپے لے لئے۔

"مگر یہ سوچ لو، اماں جان نے اگر آج کچھ نہ دیا تو آئندہ کیسے کام چلے گا۔" قیصر مرزا نے خبردار کیا۔

"آئندہ کی تم فکر نہ کرو۔ تم صرف لالہ بنارسی داس کے نام پرچہ لکھ دینا۔ باقی میں سنبھال لوں گا۔" آغا نے اسے اطمینان دلایا۔ مسکرا کر بے تکلفی سے بولا۔" اب تم نو دو گیارہ ہو جاؤ۔"

"میں گھر تو چلا جاؤں گا، مگر جلدی نہ آسکوں گا۔" قیصر مرزا نے اپنی مجبوری بیان کی۔" ابا جان کے سونے سے پہلے نہ آسکوں گا۔ وہ آج کل زنان خانے ہی میں سوتے ہیں اور دس بجے سے پہلے بستر پر نہیں جاتے۔" وہ چند لمحے خاموش بیٹھا رہا۔ پھر گویا ہُوا۔" میں آج کے بجائے کل صبح گھر چلا جاؤں۔ کوئی حرج تو نہیں۔"

"میں تو کہتا ہوں تم اسی وقت چلے جاؤ تو مناسب ہے۔ تمہارے والد نہ آئے تو ہو سکتا ہے کوئی نوکر چاکر تم کو ڈھونڈتا ہُوا یہاں آجائے۔ یہ تو سب کو معلوم ہو ہی گیا ہے کہ آجکل تمہارا ٹھیا یہی ہے۔" آغا نے تشویش کا اظہار کیا۔" اگر کوئی آگیا تو سارا بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔ جہاں تک دیر سے واپس آنے کا سوال ہے تو سچ پوچھو میں چاہتا بھی یہی ہوں۔"

قیصر مرزا نے تیکھی نظروں سے آغا کو دیکھا۔" میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ تم چاہتے

کیا ہو؟ کبھی کچھ کہتے ہو کبھی کچھ۔"

"تم ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتے۔" آغا نے بے نیازی سے ہنس کر کہا۔ "جنوں اور پری زادوں کا تخت عین آدھی رات کو اُترتا ہے۔ تم کو بھی اسی وقت پہنچنا چاہیئے۔ بس تم دیکھتے جاؤ۔ میں نے کیسا زبردست کمپا لگایا گیا ہے۔" اس نے چہک کر ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ "کیا سمجھے تم؟"

مگر قیصر مرزا کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

"اچھا اب تم جاؤ۔" آغا نے زور دے کر کہا۔

"تم یہیں ٹھہرو گے۔" قیصر مرزا نے دریافت کیا۔

"میں اُوپر جا کر ٹوہ لگاؤں گا کہ کوئی خطرہ تو نہیں۔ کسی قسم کی گڑبڑ تو نہیں۔ بعد میں کھانا لانے اور پہنچانے کا بندوبست کروں گا۔"

"کیوں نہ میں بھی تمھارے ہمراہ چلوں۔" قیصر مرزا نے جھجکتے ہوئے اپنی بے قراری کا اظہار کیا۔ "تم کہو گے تو ایک نظر طلعت آرا کو بھی دیکھ لوں گا۔"

"ہرگز نہیں۔" آغا نے اس کی مطلق حوصلہ افزائی نہ کی۔ وہ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "اب تم بھی کھڑے ہو جاؤ۔"

☆

قیصر مرزا باہر چلا گیا۔ آغا نے دروازہ بند کیا اور اندر سے کنڈی لگا دی۔ قیصر مرزا نے کنڈی لگانے کی آہٹ سُنی۔ مُڑ کر دیکھا۔ مگر نہ دروازے کے قریب گیا نہ دستک دی۔ حالانکہ اس کے ذہن میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ اس نے قدم آگے بڑھائے اور اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

گھر پہنچا تو اس کا بے چینی سے انتظار ہو رہا تھا۔ خیریت یہ ہوئی کہ باپ گھر پر موجود نہ تھے۔ البتہ ماں نے خفگی کا اظہار کیا۔ اس نے سر جھکا کر ان کی جلی کٹی سُن لیں۔ جب وہ خوب برس چکیں اور غصّہ ذرا ٹھنڈا ہُوا تو حسبِ معمول اس نے طرح طرح کے

عذر پیش کئے۔ حیلہ سازی کے ساتھ ساتھ ماں کے گلے میں باہیں ڈال کر منت سماجت بھی کی۔ ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی ان کا دل پسیج گیا۔ ایسی مہرباں ہوئیں کہ مانگنے پر چپکے سے اسے ڈیڑھ سو روپے بھی دے دیئے۔

اس نے ماں کے ساتھ دسترخوان پر بیٹھ کر کھانا کھایا اور بستر پر جا کر لیٹ گیا لیکن بے قراری اس قدر تھی کہ لمحہ بھر کے لئے بھی آنکھ نہ لگی۔ رات گئے جب سب سو گئے اور گھر پر سناٹا طاری ہو گیا تو وہ نہایت خاموشی سے اٹھا اور دبے، دبے قدموں چلتا ہوا باہر نکل گیا۔ ڈیوڑھی میں بیٹھے ہوئے دربان نے ٹوکا تو قیصر مرزا نے ایک اٹھنی اس کے ہاتھ میں تھما دی۔ وہ اس رشوت پر خوش ہو گیا۔ یہ پہلا موقع نہ تھا وہ اسی طرح نوکروں کو رشوت دے کر اپنا رازدار بنا لیتا تھا۔

کوچہ و بازار اب سنسان ہو چکے تھے۔ گلیوں میں آوارہ کتے بھونک رہے تھے۔ پولیس والوں نے گشت شروع کر دیا تھا۔ رات کے سناٹے میں ان کی آوازیں وقفے وقفے سے ابھر رہی تھیں۔

قیصر مرزا عشرت منزل پہنچا تو ساڑھے گیارہ کا عمل تھا۔ اس نے آہستہ سے دروازے پر دستک دی۔ ذرا دیر بعد چاپ ابھری۔ کنڈی کھلنے کی آواز سنائی دی۔ دروازہ کھلا۔ اندھیرے میں آغا جانی اس کے سامنے اس طرح کھڑا تھا کہ اس پر سائے کا گمان ہوتا تھا۔ قیصر مرزا اندر داخل ہو گیا۔ آغا جانی نے دروازے کے دونوں پٹ بھیڑ کر کنڈی لگا دی۔

آغا جانی روشنی میں آیا تو قیصر مرزا اسے دیکھ کر پہلی نظر میں خوفزدہ ہو گیا۔ وہ سیاہ چوغہ پہنے ہوئے تھا۔ سر پر لومڑی کی کھال کی بدوضع ٹوپی تھی جس میں دو چھوٹے چھوٹے نوکیلے سینگ لگے ہوئے تھے۔ کانوں میں چاندی کے بڑے بڑے بالے جھول رہے۔ گلے میں سرخ مونگوں کا کنٹھا تھا۔ چہرے پر کالک ملی ہوئی تھی جس میں روغن زیتون کی آمیزش تھی۔ پیشانی پر سیندور کا لال، لال، قشقہ کھنچا تھا۔ اس کے کالے کلوٹے چہرے پر چمکتی ہوئی سفید سفید آنکھیں نہایت ڈراؤنی نظر آ رہی تھیں۔

قیصر مرزا نے سراسیمہ ہو کر پوچھا۔ "تم نے یہ کیا ہیبت ناک حلیہ بنا رکھا ہے۔ میں تو ایسا ڈرا کہ اب تک دِل بلیّوں اُچھل رہا ہے۔" اس نے گھبرا کر ایک ہاتھ سینے پر رکھ لیا۔

"نہ پوچھو، تمہاری خاطر کیا، کیا جتن کرنا پڑے ہیں۔" آغا نے جوش و خروش کا اظہار کیا۔ "تم سے دوستی جو ٹھہری۔ جان بھی دینا پڑی تو دریغ نہیں کروں گا۔ وقت پڑے تو آزما کر دیکھ لینا۔"

"مگر تم نے یہ سوانگ رچایا کیسے؟"

"ماسٹر امیر جان کی طرف چلا گیا تھا۔ ان کے پاس تھیٹر کا ابھی تک بچا کھچا بہت سا ساز و سامان رکھا ہے۔ وہ اس وقت بہت کام آیا۔" آغا نے قیصر مرزا کو بتایا۔ "تمہارے لیے مخمل کی کارچوبی صدری کے علاوہ ریشمی "بیا بھی لایا ہوں۔ پہن کر بالکل شہزادے لگو گے۔"

قیصر مرزا نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔ "بارہ دری کی چھت پر بھی گئے تھے؟"

"گیا تھا، ایک بار نہیں کئی بار آیا گیا۔" آغا جانی نے اطمینان سے جواب دیا۔ "طلعت آرا کو کھانا بھی کھلایا۔ دو چار لقمے سے زیادہ اس نے نہیں کھائے مگر کھانے کو حیرت سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھی۔ سب بچ کر آ گیا۔ دیکھو گے تو پھڑک اُٹھو گے۔ کیسے کیسے عمدہ کھانے لایا ہوں۔ زعفران اور کیوڑے کی خوشبو سے مہکتے ہوئے۔ سونے چاندی کے وَرق سے جھلکتے ہوئے۔ واللہ اس طرح سجا بنا کر پیش کیا تھا جیسے سیدھا پرستان سے آیا ہو۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "یہ نہ پوچھو اسے طلعت آرا کے سامنے پہنچایا کتنی دِقّت سے۔"

"کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوئی؟"

"ہوتے، ہوتے رہ گئی۔" آغا کے بُشرے سے پریشانی جھلکنے لگی۔ "ایسی مصیبت نازل ہوتی کہ لینے کے دینے پڑ جاتے۔" آغا سنبھلا اور سنبھل کر مُسکرانے لگا۔ "مگر میرا

نام بھی آغا جانی ہے۔ آئی بَلا کو ایسا ٹالا کہ میدان صاف ہو گیا۔"

"ہُوا کیا تھا؟" قیصر مرزا نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"وہی ہُوا، جس کا خطرہ تھا۔" آغا نے بتایا۔ "ایسا ہُوا کہ طلعت آرا کمرے کے اندر کھانا کھا رہی تھی۔ میں دروازے کے باہر کھڑا تھا۔ اچانک زینے کے اندر ماماؤں کی آوازیں سُنائی پڑیں۔ وہ طلعت آرا کی تلاش میں اُوپر آ رہی تھیں۔ آوازوں کو سُن کر پہلے تو میں گھبرا گیا۔ پھر ہمّت سے کام لیا۔ بڑھ کر زینے کے قریب پہنچا اور دروازہ کھول دیا۔"

"دروازہ کھول دیا؟" قیصر مرزا نے گھبرا کر اپنے ردِّ عمل کا اظہار کیا۔ "تم کو یہ کیا سوجھی؟"

"یہ نہ سوجھتی تو نہ جانے کیا ہو جاتا۔ بھاگنے پر بھی پیچھا نہ چھوٹتا۔"

آغا نے قیصر مرزا کو مطلع کیا۔ "میں نے یہ کیا کہ زینے میں داخل ہُوا اور آخری سیڑھی پر دونوں ٹانگیں پھیلا کر کھڑا ہو گیا۔ ایک ماما، ہاتھ میں لالٹین اُٹھائے آگے آگے تھی۔ جیسے ہی روشنی میں اس نے میری طرف دیکھا۔ میں نے اپنے دانت نکال کر قہقہہ لگایا وہ ایسی دہشت زدہ ہوئی کہ لالٹین اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گری۔ وہ بدحواس ہو کر پلٹی۔ اس کے ساتھ دوسری مامائیں بھی گرتی پڑتی اُلٹے پیروں بھاگیں۔ میں نے اطمینان سے زینے کا دروازہ بند کیا اور پھر کُنڈی لگا دی۔" اس نے اپنے سیاہ چوغے کی طرف اشارہ کیا۔ "اس چُلیئے نے ایسا کام دکھایا کہ اب کوئی اُوپر آنے کی ہمّت نہیں کرے گا۔ میاں صاحبزادے! اسے کہتے ہیں ایکٹنگ۔"

"بھئی آغا کمال کر دیا تم نے۔"

آغا نے قیصر مرزا کے لباس کی طرف دیکھا اور چونک کر بولا۔ "تم نے لباس تبدیل نہیں کیا۔ تم تو وہی کپڑے پہنے ہوئے ہو۔"

"لباس تبدیل کرنے کی کہاں گنجائش تھی۔" قیصر مرزا نے صفائی پیش کی۔ "نہ جانے کس طرح چھُپ چھُپا کر تو گھر سے باہر نکلا ہوں۔"

"اچھا اب تم نیا لباس پہنو، اور جلد سے جلد تیار ہو جاؤ۔ وقت بہت کم رہ گیا ہے۔"

قیصر مرزا نے کچھ نہ کہا۔ ایک بار پھر لباس تبدیل کیا۔ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے اُلجھے ہوئے گھنگروالے بال سنوارے اور خوب بن ٹھن کر آغا کے پاس واپس پہنچ گیا۔

آغا اسے دیکھ کر مُسکرایا۔ خوش ہو کر بولا "اُستاد اس وقت تو تم بس یہ ریشمی قبا پہن لو۔ ایکدم شہزادے بن جاؤ گے۔" اس نے فیروزی رنگ کی ریشمی قبا اُٹھا کر سامنے کی جس کی آستینوں اور مونڈھوں پر سنہری بادلے سے کشیدہ کاری کی گئی تھی۔ جگہ جگہ ستارے بھی ٹکے ہوئے تھے۔

"یہ بھی کوئی پہننے کی شے ہے۔" قیصر مرزا نے مُنہ بگاڑ کر کہا۔ "میں ہاتھی کی یہ جھول ہرگز نہیں پہنوں گا۔"

"نہ پہنو، تمہاری مرضی۔ میں تو خوشامد کر کے ماسٹر امیر جان سے خاص طور پر لایا تھا۔"

آغا نے اصرار نہ کیا البتہ مخمل کی سُرخ صدری قیصر مرزا کی جانب بڑھا کر نرمی سے کہا۔ "اسے تو پہن لو۔ کچھ تو شہزادوں کی وضع قطع بنانا ہو گی۔"

قیصر مرزا نے اسے پہننے میں تکرار نہ کی۔ جب اس نے مخمل کی صدری پہن لی تو آغا نے ڈھاک کے پتّوں کو کھول کر موتیے کے مہکتے ہوئے پھولوں کا خوب مُوٹا سا گجرا نکالا۔ اسے قیصر مرزا کے کپڑوں پر اس طرح عطر لگایا کہ دالان خوشبو سے مہکنے لگا۔

گجرا نکالا۔ اسے قیصر مرزا کی گردن میں ڈالا۔ شمامۃ العنبر کی شیشی اُٹھائی، کھولی اور قیصر مرزا کے کپڑوں پر اس طرح عطر لگایا کہ دالان خوشبو سے مہکنے لگا۔

قیصر مرزا بن سنور کر خاموش کھڑا تھا لیکن آغا خاموش نہ رہا۔ مُسکرا کر قیصر مرزا کی طرف دیکھا۔ بے تکلفی سے بولا۔

"یار نظر نہ لگ جائے۔ اس وقت تو تم بالکل پرستان کے شہزادے لگ رہے ہو۔" اس نے محبّت سے قیصر مرزا کی پیٹھ تھپتھپائی۔ "اب جا کر طلعت آرا کو دیکھو۔ کیسا بھاری جوڑا پہنے بیٹھی ہے۔ بالکل نئی نویلی دلہن لگ رہی ہے۔"

"یہ جوڑا تم کہاں سے لائے؟" قیصر مرزا نے حیرت کا اظہار کیا۔

"نہ پوچھو کہاں سے لایا اور کیسے لایا" آغا نے بتایا۔ "تم کو کیا خبر اس کے لیے مُمانی کی کتنی منّت سماجت کی۔ وہ جن دنوں نواب افسرالدولہ کی محل سرا میں آتو تھیں۔ انھی دنوں نواب صاحب کی منجھلی بہو کا اچانک انتقال ہو گیا۔ شادی کو مہینہ بھر بھی نہ گزرا تھا۔ اُس کے جہیز اور بری کے نہ جانے کتنے ایسے جوڑے تھے جنھیں پہننا بھی نصیب نہ ہوا۔ انھیں میں سے ایک بھاری جوڑا بیگم صاحبہ نے ممانی کو دے دیا۔ ان کے پاس رکھا تھا۔ رنگ بھی اس کا عروسی جوڑے کی طرح سرخ ہے۔ میں پہلے ہی اسے دیکھ چکا تھا۔ کسی نہ کسی طور مانگ لایا۔ ایسی پٹّی پڑھائی کہ انھوں نے اپنی نتھ بھی دے دی۔ ایسی مہربان ہوئیں کہ افشاں بھی کاٹ کر دی۔ یہ نہ پوچھو کیسے کیسے حیلے بہانے کرنے پڑے" آغا اپنی کارگزاری سُناتا رہا۔ سنبھل، سنبھل کر بولتا رہا۔

آغا جانی کی باتیں سُن کر قیصر مرزا کی بے قراری سوا ہو گئی۔

☆

رات اور سُنسان ہو گئی۔ خاموشی گہری اور گہری ہوتی گئی۔ وقت گزرتا رہا اور جب آدھی رات گزر گئی تو دونوں زینے کی سیڑھیاں طے کر کے چھت پر پہنچے۔ دیوار پھاند کر دوسری طرف گئے۔ آغا کے ہاتھوں میں مٹّی کی پیالی تھی جس میں عود و عنبر سُلگ رہا تھا۔ اس نے پیالی سائبان کے نیچے ایک گوشے میں رکھی۔ قیصر مرزا کو ٹھہرنے کا اشارہ کیا۔ خود آگے بڑھا اور کمرے میں داخل ہو گیا۔

قیصر مرزا دروازے کے قریب دم بخود کھڑا رہا۔ ذرا دیر بعد کمرے کے اندر آغا جانی کی آواز اُبھری۔ وہ طلعت آرا سے کہہ رہا تھا۔ "شہزادہ گُل رُخ پرستان سے تشریف لا رہے ہیں۔ غلام ان کی آمد کی اطلاع دینے حاضر ہُوا ہے۔" وہ تھیٹر کے اداکاروں کی طرح اپنی بھاری بھرکم آواز میں اُتار چڑھاؤ پیدا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

قیصر مرزا کے لیے آغا جانی کی طرف سے یہ اندر داخل ہونے کا اشارہ تھا۔ وہ آگے بڑھا۔ آہستہ سے پردہ سرکایا اور کمرے میں چلا گیا۔ اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا،

طلعت آرا زرتار جوڑا پہنے گردن جھکائے بیٹھی تھی۔ اگر سوز میں اگربتیاں سلگ رہی تھیں۔ ان سے مہکتا ہوا ہلکا دودھیا دُھواں اُبھر کر فضا میں لہرا رہا تھا۔ کمرے میں تیز خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔

قیصر مرزا ہکا بکا دہلیز کے پاس کھڑا تھا۔ آغا نے اس کی ذہنی کیفیت کو بھانپ لیا۔ فوراً جُھک کر کورنش بجا لایا اور مؤدب ہو کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ اس کی نظریں جُھکی ہوئی تھیں۔ وہ سیاہ چوغے اور خم دار سینگوں والی ٹوپی میں نہایت ڈراؤنا نظر آ رہا تھا۔

قیصر مرزا نے اس کی جانب زیادہ توجہ نہ دی۔ دھڑکتے دل سے طلعت آرا کو تکنے لگا۔

کمرے میں گہرا سکوت تھا۔ پھر اس خاموشی میں آغا جانی کی آواز اُبھری۔ وہ قیصر مرزا سے کہہ رہا تھا "صاحب عالم! غلام کو اجازت دی جائے۔ غلام کو اب پرستان پہنچ جانا چاہیئے۔ دو جن باہر تعینات کر دیئے ہیں۔"

قیصر مرزا نے مُڑ کر اس کی جانب دیکھا۔ وہ ہاتھ باندھے، نظریں جھکائے ادب سے کھڑا تھا۔ قیصر مرزا نے حکم دینے کے انداز میں اس سے کہا۔ "اب تم جا سکتے ہو۔"

آغا جانی مُڑا۔ اُلٹے قدموں دروازے کی جانب آہستہ، آہستہ ہٹا۔ دہلیز کے پاس ٹھٹکا اور پھر واپس چلا گیا۔ اس کے قدموں کی آہٹ چھت کے پختہ فرش پر اُبھرتی رہی، پھر سناٹے میں تحلیل ہو کر ختم ہو گئی۔

(۷)

گھڑیال نے ٹن، ٹن دو بجائے۔ قیصر مرزا نے چونک کر مسہری کی جانب دیکھا جس پر طلعت آرا کے بجائے ارجمند سلطانہ بیٹھی تھیں۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ قیصر مرزا نے گھبرا کر نگاہیں نیچی کر لیں۔

"بات کہتے، کہتے تم کس سوچ میں پڑ گئے؟" ارجمند سلطانہ نے اس کی طویل خاموشی سے اُکتا کر دریافت کیا۔

"میں طلعت آرا کے بارے میں سوچ رہا تھا۔" قیصر مرزا نے ارجمند سلطانہ کی جانب دیکھے بغیر جواب دیا۔ "شروع شروع میں تو وہ مجھ سے اس قدر خوفزدہ رہتی تھیں کہ مُنہ سے آواز نہ نکلتی تھی۔ بار، بار جنّوں کا ذکر کرتی تھیں۔"

"یہ سب اس کی والدہ کی ضعیف الاعتقادی اور توہم پرستی کا نتیجہ ہے۔" ارجمند سلطانہ نے تیکھے لہجے میں تبصرہ کیا۔ "ان پر تو دیوانگی کی حد تک جنّوں اور آسیب کا وہم سوار ہے۔ وہ کیا ساری ہی بیگمات اور رئیس زادیاں اسی وہم میں مُبتلا ہیں۔ جب کبھی مل بیٹھتی ہیں تو پیٹھ پیچھے ایک دوسرے کی عیب جوئی اور غیبت کرتی ہیں یا جن بھوت اور آسیب کے بارے میں نت نئے واقعات سُناتی اور سُنتی ہیں۔ کریں بھی کیا۔ گھر کی چار دیواری میں قیدیوں کی طرح بند رہتی ہیں۔ جاہل اور ان پڑھ خادماؤں کا ہر وقت کا ساتھ۔ گھر میں اخبار تک آنے کی اجازت نہیں۔ دو چار مذہبی کتابوں سے زیادہ تعلیم نہیں۔ اللہ اللہ خیر صلا۔"

قیصر مرزا گم صُم بیٹھا رہا۔

ارجمند سلطانہ نے دریافت کیا۔ "طلعت آرا اس رات یہاں کب تک رہی؟"

"تمام رات یہیں رہیں۔" قیصر مرزا نے دبی زبان سے بتایا۔ "صبح اُٹھ کر نیچے گئی تھیں۔"

"تم نے اسے روک لیا ہوگا۔" ارجمند سلطانہ نے تلخ لہجے میں اپنی خفگی کا اظہار کیا۔

"وہ تو بعد میں بھی آتی رہیں۔ پھر رات گزرتے ہی یہاں پہنچ جاتیں۔" قیصر مرزا نے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔ "وہ میری ہر بات بلا عذر مان لیتی ہیں۔ کہتی ہیں مجھے اُڑا کر پرستان نہ لے جایئے گا۔ میں آپ کی کسی بات پر انکار نہیں کروں گی۔" وہ سنبھل سنبھل کر بول رہا تھا۔ "سچ تو یہ ہے کہ میں جو کہتا ہوں، وہی کرتی ہیں۔ ان کو پورا پورا یقین تھا کہ میں شاہ جن کا ولی عہد شہزادہ گل رُخ ہوں۔ ان سے ملنے کے لیے اپنے

غلام کے ساتھ پرستان سے اُڑ کر آتا ہوں۔"

"تم نے جال بھی تو کیسا خوفناک اور پُراسرار پھیلایا ہے۔" ارجمند سلطانہ کے چہرے پر بدستور جھنجلاہٹ چھائی تھی۔" یہ مجسمہ ہی دیکھ لو۔" انھوں نے مشرقی گوشہ میں لکڑی کے اسٹینڈ پر رکھے ہوئے مجسمے کی جانب ہاتھ اُٹھا کر اشارہ کیا۔" کس قدر ڈراؤنا ہے۔ اسے دیکھ کر تو میں بھی گھبرا گئی تھی۔ اسے تم نے لا کر کیوں رکھا ہے؟"

"اسے تو آغا جانی ہاشمین کے آکشن مارٹ سے لایا تھا۔ ولایت واپس جانے والے کسی انگریز افسر کے سامان میں نیلام ہونے کے لئے آیا تھا۔ مگر کسی نے بولی نہیں لگائی۔" قیصر مرزا نے مجسمے کے بارے میں تفصیل سے بتایا۔" ایک مدت سے کاٹھ کباڑ میں پڑا تھا۔ آغا جانی نے اسے اونے پونے خرید لیا۔ البتہ اسے رکھنے کا یہ اونچا اسٹول نخاس کے کسی کباڑیئے سے خرید کر لایا تھا۔ مجسمے کو اس نے جھاڑ پونچھ کر صاف کیا۔ یہ جو اس پر خون نظر آرہا ہے آغا جانی نے لال رنگ لگا کر اپنے ہاتھ سے بنایا ہے۔"

"اور طلعت آرا کو دہشت زدہ کرنے کے لیے اس نے سجا کر اس کمرے میں رکھ دیا۔ اس کا یہی مقصد تھا نا؟"

قیصر مرزا خاموش بیٹھا رہا۔

"تمہارا غلام بھی تو وہی بنتا ہے نا۔" ارجمند نے تیکھی نظروں سے قیصر مرزا کو دیکھا۔ "تو گویا اس ساری کارروائی میں وہ تمہارا اُستاد بلکہ پیر و مُرشد ہے۔"

"پیر و مُرشد تو میں نہیں کہتا۔ مگر اتنا ضرور ہے کہ وہ ہر مرحلے پر اور ہر معاملے مین مجھے مشورہ دیتا رہتا ہے اور عام طور پر میں اس کا مشورہ مان بھی لیتا ہوں۔" قیصر مرزا نے سادگی سے اعتراف بھی کر لیا۔" واللہ غضب کا ہوشیار ہے۔ نہایت زیرک اور سمجھدار۔ ایسی دور کی کوڑی لاتا ہے کہ میں آپ سے کیا عرض کروں۔"

"نہ وہ مجھے ہوشیار لگتا ہے، نہ سمجھدار۔" ارجمند سلطانہ نے کھُل کر آغا جانی کے بارے میں اپنی نفرت کا اظہار کیا۔" تم ٹھہرے نواب زادے اور وہ نواب یا نوابزادہ ہی کیا ہوا جسے دو چار مصاحب رکھنے کا شوق نہ ہو۔ تم نے بھی دوسرے رئیس زادوں

کی طرح ایک الفتا پال رکھا ہے۔ تم لاکھ تعریف کرو مجھے تو یہ تمہارا آغا پرلے درجے کا چلتا پرزہ معلوم ہوتا ہے۔"

"میں آپ کو کس طرح یقین دلاؤں کہ وہ میرا کس قدر وفادار اور جانثار ہے۔" قیصر مرزا نے آغا جانی کی وکالت کی۔

"ہوگا۔ میں اس فضول بحث میں اُلجھنا نہیں چاہتی۔ تم مصاحب رکھو یا کتّے پالو یہ تمہارا ذاتی معاملہ ہے۔" ارجمند سلطانہ نے تیوری پر بل ڈال کر ایک بار پھر اسے دھمکی دی: "یہ بتاؤ تمہارے والد عام طور پر کس وقت گھر پر موجود رہتے ہیں؟"

"وہ آجکل تمام وقت گھر پر ہی رہتے ہیں۔" قیصر مرزا یکایک افسردہ ہوگیا۔

"کیوں، وہ کہیں آتے جاتے نہیں؟"

"جی نہیں، جب سے ان پر فالج گرا ہے ایسے معذور ہو گئے ہیں کہ چلنے پھرنے کے قابل نہیں رہے۔ ہر وقت بستر پر پڑے رہتے ہیں۔" قیصر مرزا نے بجھے ہوئے لہجے میں ارجمند سلطانہ کو مطلع کیا۔

"ہائیں، تمہارے والد پر فالج کا حملہ ہوا ہے؟" ارجمند سلطانہ نے پریشان ہو کر کہا۔ "تم نے مجھے پہلے کیوں نہ بتایا۔ کب ہوا فالج کا حملہ؟"

"تین مہینے سے اُوپر ہو گئے۔" قیصر مرزا نے دل گرفتہ ہو کر بتایا۔ "علاج تو برابر ہو رہا ہے۔ مگر طبیعت سنبھلنے کے بجائے روز بروز گرتی جا رہی ہے۔ فالج جسم کے بائیں حصے پر گرا ہے۔ حکیم صاحب بتاتے تھے کہ اس حصے پر فالج کا اثر مریض کے لیے خطرناک ہوتا ہے۔"

ارجمند سلطانہ کھوئی کھوئی سی چُپ بیٹھی رہیں۔ ان کے چہرے پر دُکھ کے سائے پھیل گئے۔ زندگی کے گوناگوں ہنگاموں میں وہ نواب بوٹا کو بھول چکی تھیں۔ مگر ان کو ایسا محسوس ہوا کہ وہ بھول کر بھی ان کو نہ بھول سکی تھیں۔ وہ ان کے سہانے ماضی کی ایک سہانی یاد تھے۔ اس یاد میں پھولوں کی مہک اور چاندنی راتوں کی رعنائی تھی۔

قیصر مرزا ان کے احساسات کی ہلچل سے بے نیاز چند لمحے خاموش بیٹھا رہا،

پھر گویا ہُوا۔ "آپ ان کے پاس جانا چاہتی ہیں تو عیادت کو چلی جائیں۔" اس کے لہجے میں عاجزی پیدا ہو گئی۔ "مگر ان سے میرے بارے میں کچھ نہ کہیئے گا۔ ان کو رنج ہوگا۔" وہ اپنی بات کہتے کہتے ٹھٹکا۔ "مگر آپ تو فرما رہی تھیں کہ ان کو جانتی ہی نہیں۔ پہلے کبھی ملنے کا اتفاق بھی نہ ہُوا ہوگا۔"

"ہاں، میں ان کو نہیں جانتی اور نہ ہی کبھی ملنے کا اتفاق ہوا۔" وہ صاف مُکر گئیں۔ انھوں نے خود کو سنبھالا اور ناصحانہ انداز میں بولیں۔ "قیصر مرزا تم کیسے بیٹے ہو۔ تمہارے باپ تشویشناک حالت میں بسترِ علالت پر پڑے ہیں اور تم ایسی مجرمانہ حرکتیں کر رہے ہو۔ یہ لااُبالی پن تم کو بالکل زیب نہیں دیتا۔" انھوں نے قدرے تامّل کیا۔ "تم کبھی گھر بھی جاتے ہو کہ نہیں؟"

"جب سے ابا جان پر فالج کا اثر ہوا ہے عام طور پر گھر ہی پر رہتا ہوں۔" قیصر مرزا نے فوراً وضاحت کی۔ "آپ کو یہ تو بتا ہی چکا ہوں کہ طلعت آرا پہلے روزانہ رات کو یہاں آتی تھیں لیکن ابا جان کی علالت کے بعد میرے ہی کہنے پر اب صرف جمعرات کو آنے لگیں۔"

"قیصر مرزا، اب تک جو کچھ ہوتا رہا، اسے بھول جاؤ۔" ارجمند سلطانہ نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "اب یہ کھیل ختم ہو جانا چاہیئے۔"

"کھیل تو اسی وقت ختم ہو گیا تھا جب آپ یہاں تشریف لائی تھیں۔"

اس کے لہجے میں تلوار کی کاٹ تھی۔ ارجمند سلطانہ نے اس کی جھنجلاہٹ کو محسوس کیا مگر طرح دے گئیں۔ بات بڑھانے کی کوشش نہ کی۔ نرم لہجے میں گویا ہوئیں۔ "ایک نہ ایک دن تو اسے ختم ہونا ہی تھا۔ آخر یہ سلسلہ کب تک چلتا؟"

"سچ پوچھیئے تو آغا سے یہ غلطی ہو گئی کہ آج زینے کا دروازہ بند کر کے کُنڈی لگانا بھول گیا۔" قیصر مرزا قائل نہ ہوا۔ "اس کا یہ معمول تھا کہ جمعرات کی شب طلعت آرا کی آمد سے قبل یہاں موجود رہتا تھا۔ جب وہ آتیں تو دروازہ کھول کر ان کا استقبال کرتا۔ زینے کی کنڈی لگاتا اور ان کو کمرے میں پہنچا کر واپس چلا جاتا۔ مگر وہ اس

مغالطہ میں رہا کہ بنجو کو دہشت زدہ کرنے کے لیے اس نے جو کڑی سزا دی تھی اس کے بعد طلعت آرا کے سوا کوئی اور یہاں آنے کی جرأت ہی نہیں کر سکتا تھا۔" اس نے تامل کیا۔ پھر گویا ہُوا۔" وہ اگر یہ غلطی نہ کرتا تو آپ یہاں تک پہنچ ہی نہیں سکتی تھیں۔"

ارجمند سُلطانہ تیوری پر بل ڈال کر بولیں۔" تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ وہ مجھے بھی بنجو کی طرح ہنٹر مار مار کر ڈرانے دھمکانے کی کوشش کرتا؟"

"بالکل کرتا۔" قیصر مرزا نے صاف گوئی سے کام لیا۔" اسے کیا خبر کہ آپ کون ہیں؟"

"تم نے اور آغا نے کبھی یہ بھی سوچا کہ ان مجرمانہ حرکتوں کا انجام کیا ہوگا؟"

"خطرہ تو بہرحال محسوس ہوتا ہی تھا اور اس بارے میں ہم دونوں سوچتے بھی رہتے تھے۔"

"میں تم سے اُلجھنا نہیں چاہتی۔" وہ ایک دم شعلے کی طرح بھڑک اُٹھیں۔ ان کا لہجہ تلخ ہو گیا۔" یہ بتاؤ، تم چاہتے کیا ہو؟"

قیصر مرزا سے جواب نہ بن پڑا۔ خاموش بیٹھا رہا۔

"بولو، تم بولتے کیوں نہیں؟" ارجمند سلطانہ نے زور دے کر کہا۔

"میرے پاس کہنے کو اب رہ کیا گیا ہے۔" قیصر مرزا پر فوری ردِ عمل کے طور پر جو جھنجلاہٹ طاری ہوئی تھی، مدھم پڑ گئی۔ اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔" آپ سے کیسے اپنے دِل کی کیفیت بیان کروں۔" اس کا لہجہ بدلا ہُوا تھا۔ اس نے افسردہ لہجے میں اپنی وارفتگی اور بے کلی کا اظہار کیا۔" آپ کو کیا معلوم میں ہفتہ بھر تک کس بیقراری سے طلعت آرا کا انتظار کرتا ہوں۔ یقین مانیئے۔"

ارجمند سلطانہ نے اسے اپنی بات مکمل نہ کرنے دی۔" قیصر مرزا! خود غرض نہ بنو۔ تمہاری وجہ سے ایک روز پھوپھی جانی کا کام تمام ہو جائے گا۔ وہ بیٹی کے غم میں گھُل گھُل کر ختم ہوتی جا رہی ہیں اور یہ جنّوں کا خوف تو طلعت آرا کو بھی موت کی نیند سُلا

دے گا۔ اس کی زبان کو تالا لگ گیا ہے۔ نہ کسی سے بولتی ہے نہ ہی بات کرتی ہے۔ ہر وقت کھوئی کھوئی نڈھال پڑی رہتی ہے۔ ایسی ڈری سہمی اور وحشت زدہ کہ اس کی حالت دیکھ کر ترس آتا ہے۔" انھوں نے اسے تیکھی نظروں سے دیکھا۔ "قیصر مرزا تم بے حد سنگدل اور سفّاک ہو۔ میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہہ سکتی۔"

"آپ مجھے سمجھنے کی کوشش کریں۔"

"مجھے اب کچھ سمجھنے کی ضرورت نہیں۔ میں سب کچھ سمجھ چکی ہوں۔" ارجمند سُلطانہ نے نہایت بے رُخی سے کہا۔ "اور یہ بھی سن لو کہ اب طلعت آرا یہاں کبھی نہیں آئے گی۔ اس کا خیال اپنے دِل سے نکال دو۔ کھیل ختم ہو گیا اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا!"

کمرے میں ایک بار پھر گہری خاموشی چھا گئی۔

☆

رات ڈھل رہی تھی۔ چاند کا زرد چہرہ، مولسری کی شاخوں کی اوٹ میں یرقان زدہ نظر آ رہا تھا۔ ہوا سسکیاں بھرتی ہوئی معلوم ہوتی۔ چاندنی مُردے کے چہرے کا نور بن گئی تھی۔ کنول میں جلتی ہوئی شمع گھٹتے، گھٹتے اب ختم ہونے والی تھی۔ قیصر مرزا بُت کی مانند چُپ بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر افسردگی کا غبار بکھرا ہُوا تھا۔ آنکھوں میں جھلملاتے ہوئے ستارے دُھندلے پڑ گئے تھے۔

"قیصر مرزا!" ارجمند سلطانہ نے کچھ دیر بعد جماہی لے کر کہا۔ "مجھے اب نیند معلوم ہو رہی ہے۔ تم بھی اب جا کر سو جاؤ۔ رات بہت گزر چکی ہے۔"

قیصر مرزا کچھ نہ بولا، اور نہ ہی باہر جانے کے لیے اُٹھا۔ گم صم بیٹھا رہا۔

مگر ارجمند سُلطانہ زیادہ دیر خاموش نہ رہ سکیں۔ نرم لہجے میں بولیں۔ "تم دِل ہی دل میں مجھے کوستے ہو گے۔ میں نے تمھارا بنا بنایا کھیل بگاڑ دیا۔" انھوں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ "ٹھنڈے دِل سے سوچو تو یہ تمھارے حق میں اچھا ہی ہُوا۔" ارجمند سلطانہ نے قدرے تامل کیا، پھر دریافت کیا۔ "تم نے کبھی یہ بھی سوچا تھا کہ

یہ گاڑی کہاں جا کر ٹھہرے گی؟"

"میری تو یہ دلی خواہش تھی کہ طلعت آرا سے شادی ہو جائے اور وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے میری بن جائیں۔" قیصر مرزا نے بتایا۔ "سوچا تھا کہ اماں جان کو کسی نہ کسی طرح راضی کر کے کسی مشاطہ کے ذریعے شادی کا پیغام بھجوانے کی کوشش کروں گا۔ مگر اسی اثنا میں ابا جان پر فالج گرا۔ ان کی طبیعت سنبھلنے کے بجائے روز بروز بگڑتی گئی۔ لہٰذا اماں جان سے اس سلسلے میں بات کرنے کی نوبت ہی نہ آئی۔"

"لیکن تم نے جو سوچا تھا، وہ تو ہوا نہیں۔" ارجمند سلطانہ نے اسے ایک بار پھر سمجھانے کی کوشش کی۔ "میں تو تم کو یہی مشورہ دوں گی کہ اب اسے بھول جانے کی کوشش کرو۔ بات یہیں ختم ہو جائے تو اچھا ہے۔"

"رانی صاحبہ! اگر آپ مشکل کشائی کریں تو سب ٹھیک ہو سکتا ہے۔"

"میں تمہاری کیا مدد کر سکتی ہوں؟" ارجمند سلطانہ نے حیرت سے قیصر مرزا کو دیکھا۔

"میرا مطلب ہے کہ اگر آپ طلعت آرا کی والدہ سے میرے رشتے کی بات کریں تو مجھے یقین ہے وہ انکار نہیں کریں گی۔" قیصر مرزا کے لہجے میں استدعا تھی۔
"یہ کام تو آپ کو کرنا ہی پڑے گا۔" وہ سخت جذباتی ہو گیا۔ "میں طلعت آرا کو بھول جاؤں، یہ ناممکن ہے۔"

"مسئلہ کا آبرومندانہ حل تو یہی ہے مگر اب یہ ممکن بھی تو نہیں۔" ارجمند سلطانہ مخمصے میں پڑ گئیں۔ "مشکل سب سے بڑی یہ درپیش ہے کہ تم نے جنوں کا جو ڈھونگ رچایا ہے، اس سے کیسے نمٹا جائے۔ یہ تو سوچو کہ جب یہ راز افشا ہو گا تو طلعت آرا پر کیا بیتے گی؟"

"طلعت آرا کی آپ فکر نہ کریں۔" قیصر مرزا نے ارجمند سلطانہ کو اطمینان دلانے کی کوشش کی۔ "آپ صرف ان کی والدہ کو راضی کر لیں۔"

"ان کو راضی کرنا آسان نہیں ہے۔" ارجمند سلطانہ تذبذب میں مبتلا ہو گئیں۔ "میں نے اگر تمام باتیں ان کو صاف صاف بتا دیں تو ہو سکتا ہے، وہ تم سے برگشتہ

ہو جائیں اور صاف انکار کر دیں۔"

"مجھے یقین ہے کہ حالات کو دیکھتے ہوئے وہ انکار نہیں کریں گی۔" قیصر مرزا گڑگڑانے لگا۔ "آپ مجھے ایک بار طلعت آرا سے ملنے کا موقع تو دیں۔"

ارجمند سلطانہ کی اُلجھن اور بڑھ گئی۔ وہ کچھ نہ بولیں۔ خاموش بیٹھی سوچتی رہیں۔

"میں آپ سے کس طرح بیان کروں کہ مجھے طلعت آرا سے کتنی محبت ہے۔" قیصر مرزا نے بے قرار ہو کر برملا دِل کا حال بیان کر دیا۔

"مجھے پہلے ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ تم اس کی محبت میں دیوانے ہو رہے ہو۔" انھوں نے ٹالنے کی کوشش کی۔ "مگر تم کو طلعت آرا سے مل کر اب حاصل کیا ہوگا۔ بجز اس کے کہ تمہاری دیوانگی اور بڑھے گی۔ دوبارہ ملنے کے لئے تم اسی طرح ضد کرو گے اور یہ سلسلہ کبھی ختم نہ ہوگا۔"

"جی نہیں۔ ایسا نہیں ہوگا۔ میں طلعت آرا کو سب کچھ صاف صاف بتا دوں گا۔ انھیں دُکھ تو ہوگا لیکن اتنا اعتماد ہے، وہ مجھے ضرور معاف کر دیں گی۔ اب تو وہ بھی مجھ سے محبت کرنے لگی ہیں۔ کہتی تھیں کہ جمعرات کا بڑی بے چینی سے انتظار رہتا ہے۔ دن کاٹے نہیں کٹتا۔"

"اگر تم نے سب کچھ بتا بھی دیا تو اس سے کیا حاصل ہوگا؟" ارجمند سلطانہ نے جرح کرنے کے انداز میں دریافت کیا۔ "تم یہ سمجھتے ہو کہ وہ اپنی والدہ کے سامنے کھل کر بات کر سکے گی تو یہ تمہاری بھول ہے۔ مان لو وہ تم سے محبت بھی کرتی ہے تب بھی ان کے رُو برو اسے زبان کھولنے کی جرأت نہ ہوگی۔ تم کو کیا خبر وہ اپنی والدہ سے کس قدر ڈرتی ہے۔ نظر ملا کر بات کرنے کی ہمت نہیں پڑتی۔ اتنی بڑی بات کہنے کے لئے کہاں سے حوصلہ لائے گی۔ وہ بہت دبی دبائی لڑکی ہے۔ اس کی پرورش ہی اس طرح ہوئی ہے۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ میں نہ کبھی طلعت آرا کو دیکھ سکوں گا نہ مل سکوں گا۔" قیصر مرزا نے بُجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ہاں!" ارجمند سلطانہ نے صاف گوئی سے کام لیا۔ "نظر تو یہی آرہا ہے۔"

"آپ میری اس سلسلے میں کوئی مدد نہیں کر سکتیں؟"

"مجھے افسوس ہے کہ میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکوں گی۔" ارجمند سلطانہ کے رویّے میں ذرا بھی لچک پیدا نہ ہوئی۔

"مگر ایک بار تو ان کو یہاں آنا ہی ہوگا۔ مجھے ان کے زیورات واپس کرنا ہیں۔"

"کیسے زیورات؟" ارجمند سلطانہ نے حیرت سے پوچھا۔

"وہی زیورات، جو پہن کر وہ یہاں آتی تھیں۔"

"کیا وہ زیورات تم اس سے لے کر اپنے پاس رکھ لیتے تھے؟" وہ ہنوز حیرت زدہ تھیں۔ "اس نے تم کو دے بھی دیئے اور واپس بھی نہیں مانگے۔" ارجمند سلطانہ ذہنی اُلجھن میں مُبتلا ہوگئیں۔ "سوال یہ ہے کہ وہ زیورات پہن کر آتی ہی کیوں تھی؟"

"میرے ہی کہنے پر انھوں نے ایسا کیا تھا۔" قیصر مرزا نے وضاحت کی۔ "دیکھئے میں نے آپ سے کچھ نہیں چھپایا۔ یہ بات بھی نہیں چھپانا چاہتا۔ ہوا یہ کہ جب اماں جان نے ہاتھ خرچ دینا بالکل بند کر دیا اور لالہ بنارسی داس نے بھی مزید قرض دینے سے صاف انکار کر دیا تو سخت تنگی ہوگئی۔ ان دنوں طلعت آرا روزانہ آتی تھیں۔ ان کی خاطر تواضع کے لئے کچھ نہ کچھ اہتمام کرنا پڑتا تھا۔ اِدھر دفینہ نکالنے کے سلسلے میں آغا جانی کو آئے دن کسی نہ کسی چیز کی ضرورت رہتی۔" قیصر مرزا سنبھل سنبھل کر بولتا رہا۔ "جب کہیں سے قرض اُدھار ملنے کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو آغا کے مشورے پر میں نے زیور پہن کر آنے کی طلعت آرا سے فرمائش کی۔ انھوں نے ایسا ہی کیا۔ روزانہ نت نئے زیورات پہن کر آتیں۔"

"مگر تم نے زیور مانگے کس طرح؟" ارجمند سُلطانہ نے مداخلت کی۔

"میں یہ کہہ کر ان سے زیورات لے لیتا کہ پرستان میں ان کو زیادہ قیمتی ہیرے جواہرات سے مرصّع کرادوں گا۔" قیصر مرزا نے ارجمند سلطانہ کو مطلع کیا۔ "طلعت آرا سے زیورات حاصل کرنے کے بعد میں آغا کو دے دیتا۔ وہ اُن کو لالہ بنارسی داس

رستوگی کے پاس لے جاتا اور رہن رکھ کر رقم لے آتا۔ اس طرح ہم دونوں کا کام چلتا رہا۔" اس کے لہجے میں قدرے تلخی پیدا ہو گئی۔ "سب سے زیادہ پریشان تو لالہ بنارسی داس کرتا تھا۔ بدبخت نے ناک میں دم کر رکھا تھا۔ تین چار روز کا غوطہ دے کر شام ہوتے ہی اُگاہی کے لیے نازل ہوتا۔ ساتھ میں لٹھ بردار محافظ ہوتا۔ وہ خبیث عین دروازے کے سامنے اس زور سے 'قیصر مرزا ہوُت' کی صدا بلند کرتا کہ دل دہل جاتا۔ اِدھر ہم دونوں نے عشرت منزل میں اپنی رہائش کو خفیہ رکھا تھا۔ ہمیشہ دروازہ بند رکھتے اور سورج ڈوبنے کے بعد جب اندھیرا خوب پھیل جاتا تو باہر نکلتے۔"

وہ باتوں کی دُھن میں بہک کر دوسری طرف نکل گیا۔ ارجمند سلطانہ نے اُکتا کر اسے ٹوکا۔ "طلعت آرا نے تمہاری باتوں میں آکر زیور دے تو دیئے، مگر کبھی واپس نہ مانگے ؟"

"صرف ایک بار دبی زبان سے ان کے بارے میں پوچھا تھا تو میں نے بات بنا دی کہ پرستان میں جڑاؤ زیورات کی مرصّع سازی کا کام جس قدر نفاست اور عمدگی سے کیا جاتا ہے اسی قدر اس کے لیے زیادہ وقت بھی درکار ہوتا ہے۔ وہ خاموش ہو گئیں۔ بات آئی گئی ہو گئی۔ بعد میں انھوں نے کبھی زیورات کا ذکر نہ کیا۔"

"مگر اب تم ان کو واپس کیسے کرو گے ؟ میرا مطلب ہے۔"

"میں آپ کی بات کا مطلب سمجھ گیا۔" قیصر مرزا نے فوراً صفائی پیش کی۔ "کہیں نہ کہیں سے روپے کا بندوبست کروں گا۔ لالہ بنارسی داس کو رہن کی رقم مع سود ادا کر کے زیورات چھڑاؤں گا اور طلعت آرا کو ان کی امانت لوٹا دوں گا۔ انھوں نے جس طرح مجھ پر اعتماد کیا ہے میں ان کے اس اعتماد کو مجروح نہیں کرنا چاہتا۔"

"میرا خیال ہے کہ نہ تم رقم کا بندوبست کر سکو گے اور نہ ہی مہاجن سے زیورات واپس لا سکو گے۔ اب تو تم ان کو واپس کرنے کا خیال دل سے نکال دو۔" ارجمند سلطانہ نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "تم طلعت آرا کی فکر نہ کرو۔ اس کی والدہ کو اللہ نے اتنا دے رکھا ہے کہ اور زیورات بنوا دینگی۔"

"طلعت آرا کو ضرورت ہو یا نہ ہو، مگر مجھے تو ان زیورات کو واپس کرنا ہے اور صرف زیورات ہی نہیں مُقدمہ کے وہ اہم کاغذات بھی واپس کرنا ہیں جو میرے پاس ان کی امانت ہیں۔"

"کون سے مُقدمے کے کاغذات؟" ارجمند سلطانہ نے چونک کر پوچھا۔

"وہی مقدمہ جو نواب صفی اور نواب تقی مرحوم کے ورثاء کے درمیان خاندانی جائیداد کے بٹوارے کے سلسلے میں عرصۂ دراز سے چل رہا ہے۔" قیصر مرزا نے نظر بھر کر ارجمند سلطانہ کی طرف دیکھا۔ "آپ کو تو اس مُقدمہ بازی کے بارے میں اچھی طرح علم ہوگا۔"

ارجمند سلطانہ نے حیران و پریشان ہو کر پوچھا۔ "مگر وہ کاغذات تمھارے پاس پہنچے کیسے؟" انھوں نے بے چین ہو کر پہلو بدلا۔ "طلعت نے تم کو خود دیئے ہوں گے۔"

"جی ہاں وہی لائی تھیں اور میرے کہنے پر لائی تھیں۔"

"کہاں ہیں وہ کاغذات؟" ارجمند سلطانہ کے بُشرے سے پریشانی جھلکنے لگی۔

"اسی صندوقچی میں محفوظ ہیں، جس میں آئے تھے۔"

"وہ صندوقچی ابھی تک تمھارے ہی پاس ہے نا؟"

"جی ہاں، میرے ہی پاس ہے۔"

ارجمند سلطانہ نے نہ یہ پوچھا کہ مُقدمے کے کاغذات اس نے کس مقصد سے حاصل کئے اور نہ ہی یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ طلعت آرا سے کس طرح منگوائے تھے۔ صرف یہ پوچھا۔ "ان کاغذات کے لیے نواب صفی سے کیا رقم طے ہوئی؟" ان کا لہجہ تیکھا اور تلخ تھا۔

"کوئی رقم طے نہیں ہوئی تھی۔" قیصر مرزا نے وضاحت کی۔ "میں ان سے آج تک ملا ہی نہیں اور نہ ایسا ارادہ ہے۔"

"آغا کے ذریعے سودا طے ہُوا ہوگا۔" ارجمند سلطانہ نے قیاس آرائی کی۔ "یہ بتاؤ، ان کاغذات کی واپسی کے لیے تم کتنی رقم چاہتے ہو۔ میں تم کو وہ رقم دینے کے لیے تیار ہوں۔"

"نہ میں کوئی رقم لے کر نواب صفی کو کاغذات دوں گا اور نہ رقم لے کر آپ کو دوں گا۔" قیصر مرزا نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔ "یہ کاغذات میں صرف اور صرف طلعت آرا کو واپس کروں گا۔" اس کے لہجے میں اس دفعہ التجا تھی۔ "میں طلعت آرا سے ایک بار ضرور ملنا چاہتا ہوں، صرف ایک بار اور یہ کام آپ ہی کو کرنا ہوگا۔ دیکھئے انکار نہ کیجیے گا۔"

ارجمند سلطانہ کچھ دیر خاموش بیٹھی سوچتی رہیں۔ پھر انھوں نے اس کی دل جوئی کی کوشش کی۔ "قیصر مرزا یقین مانو، مجھے تم سے ہمدردی ہے۔ میں تمھاری مدد بھی کرنا چاہتی ہوں، مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ تمھاری کس طرح مدد کروں۔"

قیصر مرزا نے ان کا بدلا ہوا رویّہ دیکھا تو اور عاجزی کا اظہار کیا۔ "آپ طلعت آرا کی والدہ سے بات تو کریں۔"

"اگر طلعت آرا سے تمھاری شادی ہو جائے تو اس سے اچھا اور کیا ہوگا۔ بلکہ مجھے تو دلی خوشی ہوگی۔" ان کا لہجہ اور نرم ہو گیا۔ وہ برگشتہ کرنے کے بجائے اب اس کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے کوشاں تھیں۔ مقدمہ کے کاغذات کی اہمیت سے وہ پوری طرح باخبر تھیں اور جب سے انھوں نے یہ سُنا تھا کہ وہ قیصر مرزا کی تحویل میں ہیں، ان کا رویّہ یکسر بدل گیا تھا۔ وہ مسئلہ کو جس قدر سیدھا سادا سمجھ رہی تھیں، ایسا نہ تھا۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ معاملہ اتنا پیچیدہ اور اُلجھا ہوا ہے۔ صورتِ حال کا تقاضہ تھا کہ مصلحت اندیشی سے کام لیا جائے۔ انھوں نے ایسا ہی کیا۔ "تم کہتے ہو تو میں پھوپھی جانی سے تمھارے رشتے کے بارے میں بات کروں گی لیکن فوری طور پر نہیں۔ اس کے لیے موقع و محل دیکھنا ہوگا۔ ایسا نہ ہو کہ بات بننے کے بجائے بگڑ جائے۔"

"رانی صاحبہ آپ بہت اچھی ہیں۔ بہت ہی اچھی ہیں۔" اس کے لہجے میں بچوں کی سی سادگی تھی۔ "اب یہ بھی بتا دیجیے کہ طلعت آرا کا میں کس روز انتظار کروں؟"

"آئندہ جمعرات کو وہ یہاں آئے گی۔" ارجمند سلطانہ نے وعدہ کیا۔

"دیکھئے اپنے وعدے کی لاج رکھئے گا۔" قیصر مرزا نے اصرار کیا۔

"تم مجھ پر اعتماد کر سکتے ہو۔" ارجمند سلطانہ نے یقین دلایا۔

کنول میں جھلملاتی ہوئی کافوری شمع زور سے بھڑکی اور بجھ گئی۔ کمرے میں تاریکی پھیل گئی۔ کچھ دیر بعد تاریکی میں قیصر مرزا کی آواز اُبھری۔ "اچھا رانی صاحبہ! اب آپ آرام فرمائیں اور مجھے اجازت دیں۔" وہ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

ارجمند سلطانہ خاموش بیٹھی رہیں۔

قیصر مرزا سنبھل سنبھل کر قدم رکھتا ہوا دروازے پر پہنچا۔ دہلیز کے پاس لمحہ بھر کے لیے ٹھٹکا۔ ہاتھ بڑھا کر پردہ سرکایا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔

سُنسان چھت پر قیصر مرزا کے قدموں کی آہٹ آہستہ آہستہ اُبھرتی رہی، پھر پچھلی رات کے گہرے سناٹے میں ڈوب کر ختم ہو گئی۔ ارجمند سلطانہ نے بے چینی سے پہلو بدلا اور بستر پر دراز ہو گئیں۔

رات اور نڈھال ہو گئی۔ جولائی کی ویران رات کا زرد رُو چاند غروب ہو چکا تھا۔ ہر طرف تاریکی کا جال پھیلا تھا۔ ارجمند سلطانہ کی نیند سے بوجھل آنکھیں بند ہو گئیں۔ ذرا دیر بعد وہ بے خبر ہو کر سو گئیں۔

(۸)

باہر چھت پر چمکیلی دُھوپ پھیلی تھی۔ کمرے میں خاموشی تھی۔ مسہری کے سرہانے جھُولتے ہوئے پھُولوں کے گجرے مُرجھا گئے تھے۔ آبنوسی اسٹینڈ پر رکھے ہوئے مجسّمے کی ہولناکی ختم ہو چکی تھی۔ اگر سوز کے اِرد گرد جلی ہوئی اگر بتّیوں کی راکھ بکھری ہوئی تھی۔ کنول میں پگھلی ہوئی موم بتّی کا صرف سفید سفید موم رہ گیا تھا۔ رات کی ہیجان انگیز محفل، اپنے نشانات کمرے میں جگہ جگہ چھوڑ گئی تھی۔

ارجمند سلطانہ بیدار ہو چکی تھیں۔ اُنھوں نے تھکی ہوئی انگڑائی لی اور اُٹھ کر بستر پر بیٹھ گئیں۔ حیرت زدہ نظروں سے کمرے میں اِدھر اُدھر دیکھا۔ مسہری کے قریب ابھی تک وہ خالی کرسی رکھی تھی جس پر قیصر مرزا بیٹھا تھا۔ وہ رات کے پچھلے پہر

چلا گیا تھا۔ کمرے میں اب وہ بالکل تنہا تھیں۔ اُنھوں نے دروازے پر لہراتے ہوئے پردے کی اوٹ سے چھت پر پھیلی ہوئی زرد، زرد دھوپ دیکھی، بستر سے نیچے اُتریں، آگے بڑھیں اور کمرے سے باہر چلی گئیں۔ چھت بالکل سنسان تھی۔ مولسری کی ایک شاخ پر بیٹھا ہوا کوّا کائیں کائیں کر رہا تھا۔ وہ زینے کی جانب بڑھیں، دروازہ کھولا اور زینے میں داخل ہو گئیں۔

زینے کی سیڑھیاں طے کر کے نیچے پہنچیں تو سخت اُلجھن میں مُبتلا تھیں۔ مسئلہ یہ درپیش تھا کہ رات کی رُوداد، حضورُ بیگم سے کس طرح بیان کی جائے؟ سب کچھ صاف صاف بتا دیا جائے یا مصلحت اندیشی سے کام لیتے ہوئے، فی الوقت گول مول بات کی جائے؟ حضورُ بیگم کے رو برُو پہنچ کر اُن کی اُلجھن کچھ اور بڑھ گئی۔ حالانکہ اُن کی عمر اب ڈھل چکی تھی۔ مگر ہنوز کنواری تھیں۔ اُلجھن کے ساتھ ساتھ اُنھوں نے کچھ حجاب بھی محسوس کیا۔ وہ پریشان اور گھبرائی ہوئی تھیں۔

حضورُ بیگم، اُن کے احساسات اور ذہنی خلفشار سے بالکل بے نیاز تھیں۔ دیکھتے ہی بے قرار ہو کر بولیں۔ ”مولا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تم ساتھ خیریت کے واپس آ گئیں۔ قسم لے لو، جو پَل بھر کو آنکھ لگی ہو۔ تمام رات دھڑکا لگا رہا۔ رہ رہ کے دل میں ہول اُٹھتا تھا۔“ اُن کے بُشرے سے اب تک پریشانی ہویدا تھی۔

ارجمند سلطانہ نے کچھ نہ کہا۔ خاموشی سے اُن کے قریب بیٹھ گئیں۔ وہ تھکی ہوئی اور نڈھال نظر آ رہی تھیں۔ شب بیداری سے اُن کی آنکھیں قدرے سُرخ ہو رہی تھیں۔ چہرہ مسلے ہوئے پھُولوں کی مانند مُرجھایا ہُوا تھا۔ ہونٹ خشک ہو رہے تھے۔

حضورُ بیگم خاموش نہ رہ سکیں۔ اُنھوں نے اپنی بے چینی کا اظہار کیا۔ ”یہ بتاؤ، اُنھوں نے تم کو کسی طرح کی ایذا تو نہیں پہنچائی؟“ حضورُ بیگم نے قدرے تامل کیا پھر کرید کر پُوچھا۔ ”ڈرایا دھمکایا تو ضرور ہو گا؟“

ارجمند سلطانہ شش و پنج میں مُبتلا ہو گئیں۔ اُن سے کچھ بھی نہ کہا گیا۔ گُم صُم بیٹھی رہیں۔

"خدا، ان جنّوں سے اپنی امان میں رکھے۔ سُنا ہے، وہ تو آتشی ہوتے ہیں، جس قالب میں چاہیں، خود کو ڈھال لیں۔ کبھی نظروں کے سامنے آ گئے، کبھی غائب ہو گئے۔ بچپن میں ہماری ایک انّا تھیں۔ اُن کے نانا جان بڑے پلّے کے بزرگ تھے۔ اتنے بڑے عالم تھے کہ جنّات اُن کے پاس پڑھنے کے لیے آتے تھے ہمیشہ آدھی رات کے بعد اس طرح چُپ چپاتے آتے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی۔"

ارجمند سلطانہ خاموش بیٹھی، حیرت سے حضور بیگم کا مُنہ تکتی رہیں۔ حضور بیگم آہستہ آہستہ پان چباتی رہیں اور سنبھل سنبھل کر بولتی رہیں۔ "اُنّا بتاتی تھیں کہ نانا جان سپاہی زادے تھے۔ جوانی میں، نواب امجد علی شاہ کی فوج میں برقندازرہ چکے تھے۔ بڑے نڈر اور بہادر تھے۔ ایک بار فیض آباد کے سفر میں، اُنھیں ایک سرائے میں رات بسر کرنا پڑی۔ سرائے نہ جانے کب سے اُجاڑ پڑی تھی۔ کوئی اُس میں آکر قیام کرتا تو صبح اپنی کوٹھری میں مردہ پڑا ہوا ملتا۔ اُن کو بھی سب نے سرائے میں ٹھہرنے سے منع کیا، بتایا کہ سرائے پر ایک جن کا قبضہ ہے۔ وہ مسافر کا گلا گھونٹ کر مار ڈالتا ہے مگر وہ بھی اپنی دُھن کے پکّے تھے۔ اَد بدا کے اُسی سرائے میں ٹھہرے۔ کسی کی ایک نہ سُنی، تلوار سرہانے رکھی اور اطمینان سے لمبی تان کر سو گئے۔"

ایک پیش خدمت نے شربت کا گلاس لاکر ارجمند سلطانہ کو پیش کیا مگر انھوں نے پینے سے انکار کر دیا۔ وہ صبح بیدار ہونے کے بعد بڈ ٹی پینے کی عادی تھیں۔ اس وقت بھی وہ ایک پیالی گرم گرم چائے پینا چاہتی تھیں۔ مگر بارہ دری میں چائے پینے کا چلن نہ تھا۔ وہ کہتیں بھی تو نہ ملتی۔ بازار سے منگوائی جاتی تو وہ پینے کے قابل نہ ہوتی۔ لہٰذا انھوں نے نہ شربت پیا اور نہ چائے پینے کی خواہش کا اظہار کیا۔

پیش خدمت خاموشی سے چلی گئی۔ حضور بیگم کی بات میں خلل پڑ گیا۔ اُنھوں نے منہ موڑ کر اُگالدان میں پان کی پیک تھوکی اور بات کا سلسلہ، جہاں سے ٹوٹا تھا، پھر وہیں سے شروع کر دیا۔ "ہاں تو، ارجمند! میں تم کو اپنی اُنّا کے نانا جان کے بارے میں بتا رہی تھی کہ سب کے منع کرنے کے باوجود، اسی ویران اور آسیب زدہ سرائے

میں ٹھہرے۔ جوانی کی ترنگ میں تھے۔ اپنے بازوؤں کی قوت اور شمشیر زنی پر ناز بھی تھا۔"

ارجمند سلطانہ نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ مگر توجہ سے اُن کی باتیں سُنتی رہیں۔

"اب آگے کا احوال سُنو۔" حضور بیگم نے بتایا۔ "ادھر آدھی رات گزری، اُدھر جن نازل ہوا۔ سرائے میں جیسے بھونچال آگیا۔ در و دیوار لرزنے لگے۔ اب تو اُن کی بھی آنکھ کھُل گئی۔ فوراً اُٹھ کر بیٹھ گئے۔ کیا دیکھتے ہیں، اچانک چھت شق ہوئی۔ پہلے ایک ہاتھ گرا، پھر دوسرا، پھر ایک ٹانگ گری، دوسری گری پھر دھڑ گرا، سر گرا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سب اعضا آپس میں جُڑ گئے۔ جن اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اُس کے یہ بڑے بڑے دانت تھے اور ایسے چمکتے تھے کہ چکاچوند ہو گئی۔ اُس نے اپنے ڈراؤنے دانت نکال کر زور سے ٹھٹھا مارا، دہشت زدہ کرنے کی غرض سے گرج کر بولا۔

"چمک دنداں دیدی۔"

"مگر انا کے نانا جان بھی بڑے حوصلے والے تھے۔ نہ ڈرے نہ جھجکے، جھٹ تلوار کی جانب ہاتھ بڑھایا، اسے اپنے قبضے میں کیا۔ تلوار ٹیک کر اُٹھے اور جھپٹ کر، اُس کے مُنہ پر ایسا تُلا ہوا وار کیا کہ سارے دانت جبڑے کے ساتھ کٹ کر نیچے گر گئے۔ اُنھوں نے ہنس کر اُسے للکارا۔

"ضرب مرداں دیدی؟"

"پھر تو وہ ایسا ڈرا کہ ہاتھ باندھ کر گڑگڑانے لگا۔ انا کہتی تھیں، اُسی وقت سے اُن کا غلام ہو گیا۔ جنوں پر انا کے نانا جان کی ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ نام سن کر کانپتے تھے۔ ہر طرح اُن کی خدمت کرتے تھے، اپنے بچوں کو اُن کے پاس تعلیم و تربیت حاصل کرنے کے لیے بھیجتے تھے۔" حضور بیگم نے ارجمند سلطانہ کی طرف نظر بھر کر دیکھا۔ "ہماری انا تو اپنے پوپلے مُنہ سے جنوں کے بارے میں ایسے ایسے عجیب و غریب واقعات سُناتی تھیں کہ رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ میں تو ڈر کر اکثر اُن سے چمٹ جاتی تھی۔ مجھ سے محبت بھی بہت کرتی تھیں۔ اسّی سے اوپر کا سن تھا مگر آخر وقت

تک ہوش و حواس بجا رہے۔"

ارجمند سلطانہ، اُن کی باتیں سُن کر ہکّا بکّا رہ گئیں۔ سوچنے لگیں کہ حضور بیگم کی توگھٹّی میں جنّوں کا وہم پڑا ہے۔ اُن کو رات کی واردات کے بارے میں صاف صاف بتایا گیا تو ہرگز یقین نہ کریں گی۔ بچپن ہی سے اُن کی ذہنی نشو و نما ایسے توہّم پرست ملول میں ہوئی تھی کہ جنّوں کا ہوّا حقیقت بن کر، سر میں سما گیا تھا۔ اب تو اُن کا وہم رفع کرنا کسی طور ممکن نظر نہ آتا تھا۔

"میں تو کہتی ہوں۔ ارجمند! تمھارے قبضے میں کوئی موکل وکل ہے یا کسی کا سایہ ہے اور کسی بہت اچھی ہستی کا سایہ ہے۔ تبھی تو بے دھڑک، کھٹ کھٹ کرتی اُوپر چلی گئیں۔"

ارجمند سلطانہ نے چونک کر حیرت زدہ نظروں سے حضور بیگم کو دیکھا۔ اُن کی سادہ لوحی پر بے اختیار ہنسنے کو جی چاہا مگر اُنھوں نے خود کو سنبھالا اور چُپ بیٹھی رہیں۔

"اچھا، یہ بتاؤ، جب تم اُوپر پہنچیں تو کیا ہُوا؟" حضور بیگم کا لہجہ تشویشناک تھا۔

"میرا تو سوچ سوچ کر دل بیٹھا جا رہا تھا۔ رہ رہ کر تمھارا خیال ستاتا تھا۔" اُنھوں نے بے چین ہو کر اصرار کیا۔ "خدارا کچھ تو بتاؤ۔"

"پھوپھی جانی! سرِدست میں اس سلسلے میں کچھ کہنا نہیں چاہتی۔" ارجمند سلطانہ کے لیے اب خاموش رہنا ممکن نہ تھا۔ اُنھوں نے ٹالنے کی کوشش کی۔ رسان سے حضور بیگم کو سمجھایا۔ "آپ کے لیے ان باتوں کا جاننا مناسب نہیں۔ جو بات جس طرح ہے، اُسی طور رہنے دیجیے، جو پردہ پڑا ہے، اُسے پڑا ہی رہنے دیجیے۔"

"اے، نہ بتاؤ۔ تمھاری مرضی۔" حضور بیگم نے ناک بھوں چڑھائی۔

"دیکھیے، اس معاملے میں مجھے مجبور کرنے کی کوشش نہ کریں۔" ارجمند سلطانہ نے اُن کی خفگی رفع کرنے کی غرض سے تنبیہہ کی۔ "آپ نے اِن باتوں کے جاننے کے لیے اصرار کیا اور میں نے کچھ بتایا تو ڈر ہے کہ کوئی نئی مصیبت نہ کھڑی ہو جائے۔ بہتر یہی ہے کہ خاموشی اختیار کی جائے۔ مجھے یہی ہدایت کی گئی ہے۔"

حضورُ بیگم نے نظریں اُٹھا کر، ارجمند سلطانہ کی جانب دیکھا مگر زبان سے کچھ نہیں کہا۔

"ایک بات اور آپ سے کہنا چاہتی ہُوں۔" ارجمند سلطانہ نے اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کی کوشش کی۔ "میرا کہا مانیے تو کسی سے بھی اس سلسلے میں ذکر نہ کیجیے۔" اُنھوں نے نظریں گھُما پھرا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ آس پاس کوئی نہ تھا، صرف حضورُ بیگم تھیں۔ نہ مغلانی تھیں نہ کوئی پیش خدمت۔ ارجمند سلطانہ نے تخلیے سے فائدہ اُٹھایا اور زور دے کر کہا۔ "کچھ اُلٹا سیدھا ہو جائے تو مجھے الزام نہ دیجیے گا۔ میں تو نیک نیتی سے آپ کو صرف مشورہ دے سکتی ہوں۔ عمل کرنا، نہ کرنا آپ کی ذمے داری ہے۔"

حضورُ بیگم اس دھمکی سے سراسیمہ ہو گئیں۔ گھبرا کر بولیں۔ "لو، بھئی! تو یہ کرتی ہوں جو ایک لفظ بھی اب میری زبان سے نکلے۔" اُنھوں نے دونوں ہاتھ اُٹھا کر کانوں پر رکھ لیے۔ "جیسی جی چاہے، قسم لے لو۔" انھوں نے ارجمند سلطانہ کو یقین دلایا۔

"حالات اور مصلحت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ زبان بند رکھی جائے۔" ارجمند سلطانہ نے خبردار کیا۔

"میں کچھ اور نہیں پوچھتی۔" حضورُ بیگم تنبیہہ کے باوجود بے قراری پر قابو نہ رکھ سکیں۔ دل کی بات بے اختیار زبان پر آ گئی۔ "کم از کم یہ تو بتا دو کہ طلعت آرا کے لیے کیا حُکم ہوا ہے؟"

حضورُ بیگم کی بے قراری بے جا نہ تھی۔ ارجمند سلطانہ کو اس کا احساس بھی تھا چنانچہ اُنھوں نے حضورُ بیگم کو نرمی سے تسلی دی۔ "پھوپھی جانی! آپ پریشان نہ ہوں۔ مجھے اُمید ہے کہ آیندہ جو کچھ ہو گا، ٹھیک ہی ہو گا۔"

"طلعت آرا اب رات کو اُوپر کی منزل پر جائے گی یا نہیں؟" حضورُ بیگم نے ہاتھ اُٹھا کر چھت کی جانب اشارہ کیا۔ "میں تو صرف یہ جاننا چاہتی ہوں کہ اس کے بارے میں کیا فیصلہ ہوا ہے؟" اُن کا لہجہ اور مدّھم ہو گیا۔ "یہ تو کہنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ تم نے تو اپنے طور پر پوری پوری کوشش کی ہو گی۔"

ارجمند سلطانہ کو معاً قیصر مرزا سے کیا ہُوا وعدہ یاد آگیا اور اس وعدے کی اہمیت کو بھی بخوبی سمجھتی تھیں۔ اُسے نظر انداز بھی نہیں کر سکتی تھیں، ورنہ وعدہ ہی نہ کرتیں۔ صاف انکار کر دیتیں۔ قیصر مرزا کے قبضے میں مقدمے کی نہایت اہم دستاویزات تھیں۔ اور جب تک وہ دستاویزات، اس کے قبضے میں تھیں، وہ آسانی سے بلیک میل کر سکتا تھا۔ صورتِ حال کچھ ایسی پیچیدہ اور نازک تھی کہ وہ مخمصے میں پڑ گئیں۔ حضور بیگم کے استفسار پر اُنھوں نے دو ٹوک جواب دینے سے گریز کیا۔ دبی زبان سے کہا۔ ”جمعرات تک تو طلعت آرا پہلے کی طرح اُوپر نہیں جائے گی۔ یہ میں بعد میں بتاؤں گی کہ جمعرات کو اُوپر جائے گی یا نہیں۔“ دراصل وہ خود بھی یہ فیصلہ نہیں کر پائی تھیں کہ آئندہ کیا قدم اُٹھایا جائے۔ کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے وہ طلعت آرا سے ملنا چاہتی تھیں۔ اُس سے ملنا ضروری تھا تاکہ معاملے کی نوعیت اُن پر عیاں ہو جائے۔ قیصر مرزا نے جو کچھ بتایا تھا وہ طلعت آرا سے اُس کی تصدیق کرنا چاہتی تھیں۔

مگر حضور بیگم، ان کا جواب سُن کر دل برداشتہ ہو گئیں۔ اُن کا چہرہ مُرجھا گیا۔ بُجھے ہوئے لہجے میں بولیں۔ ”تمھاری باتوں سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ طلعت آرا کو ابھی معافی نہیں ملی۔ آیندہ جمعرات کو وہ اُوپر جائے گی۔“

”یہ تو میں نے آپ سے نہیں کہا۔“ ارجمند سلطانہ نے حضور بیگم کی دل شکنی نہ کی۔ رسان سے کہا۔ ”آپ تو فوراً پریشان ہو جاتی ہیں۔ انتظار کریں اور دیکھیں، آیندہ کیا ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے، طلعت آرا جمعرات کو اُوپر نہ جائے۔“

حضور بیگم خاموش بیٹھی رہیں۔ اُن کے چہرے پر ہنوز افسردگی چھائی ہوئی تھی۔

ارجمند سلطانہ نے اُن کے افسردہ چہرے کو نظر بھر کر دیکھا۔ نرمی سے تسلی دینے کی کوشش کی۔ ”پھوپھی جانی! دل چھوٹا نہ کریں۔ میں فی الحال کچھ نہیں کہہ سکتی۔ البتہ اتنا جانتی ہُوں کہ طلعت آرا آیندہ جمعرات کو اُوپر جائے گی تو یہ آخری بار جانا ہوگا۔ مجھے یقین ہے، وہ پھر کبھی وہاں نہ جاسکے گی۔“

ارجمند سُلطانہ کی یقین دہانی کا حضور بیگم پر بڑا خوشگوار ردِ عمل ہُوا۔ اُن کے

مرجھائے ہوئے چہرے پر مسرت کی سُرخی دوڑ گئی۔ ”ایسا ہو جائے، تب بھی غنیمت ہے۔“ اُن کے لہجے سے اطمینان ہویدا تھا۔ ”میں تو کہتی ہوں کہ میری بچی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس عذاب سے نجات مل جائے۔ تم تو یہی کوشش کرو کہ اسے معافی مل جائے۔“ اُنھوں نے تامّل کیا، پھر جھجکتے ہوئے دریافت کیا۔ ”مگر اس کام کے لیے تو تم کو پھر اُوپر جانا ہوگا۔ کب جاؤ گی اُوپر؟ آج رات یا جمعرات کو؟ اور کیا تم بھی طلعت کے ساتھ جاؤ گی؟“

”میں نے عرض کیا نا کہ میں فی الحال کچھ نہیں کہہ سکتی۔“ ارجمند سُلطانہ نے گول مول جواب دیا۔

”بھئی جیسا تم مناسب سمجھو کرو۔“ حضور بیگم نے مزید اصرار نہ کیا۔ ”میں تو یہ سمجھتی ہوں، تم جو کچھ کرو گی، طلعت آرا کی بہتری کے لیے کرو گی۔“

ارجمند سُلطانہ نے گفتگو کو طول دینے سے گریز کیا۔ تکان سے اُن کا جسم ٹوٹ رہا تھا۔ طبیعت بے کیف اور مضمحل ہو رہی تھی۔ وہ حیدر گڑھ واپس جانے کے لیے بے چین تھیں۔ وہ اب آرام کرنا چاہتی تھیں اور یہ آرام اُن کو اپنی ہی خواب گاہ میں مل سکتا تھا۔

اُنھوں نے حضور بیگم سے اجازت لی اور اُٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔ حضور بیگم نے اُن کو روکنے کے لیے اصرار بھی کیا، اُن کی خواہش تھی کہ ارجمند سُلطانہ ناشتہ کرنے کے بعد جائیں، مگر وہ آمادہ نہ ہوئیں۔

حضور بیگم نے ٹوکا۔ ”اچھا یہ تو بتاتی جاؤ۔ اب تم کب آؤ گی؟“

”شام کو آؤں گی۔“ ارجمند سلطانہ نے جواب دیا۔ ”اب تو آنا جانا لگا ہی رہے گا۔“

”دیکھو آنا ضرور۔ میں بے چینی سے تمھارا انتظار کروں گی۔“ حضور بیگم نے اپنے خدشات کا اظہار کیا۔ ”طلعت آرا کل رات اُوپر نہیں گئی۔ دل میں رہ، رہ کے ہَول اُٹھ رہا ہے۔ تم آجاؤ گی تو ذرا ڈھارس ہو جائے گی۔“

ارجمند سُلطانہ نے حضور بیگم کو تسلّی دی۔ شام کو آنے کا حتمی وعدہ کیا اور آہستہ آہستہ

قدم اُٹھاتی ہوئی چلی گئیں۔

☆ ۰

دن ڈھلے حضور بیگم نے غسل کیا، لباس تبدیل کیا اور اپنے کمرے سے نکل کر نشست گاہ میں پہنچ گئیں۔ مغلانی اُن کے ہمراہ تھیں۔ بارہ دری کے ستونوں اور محرابوں کے سائے پھیلنے اور بڑھنے لگے۔ سورج اب مغرب میں اُتر رہا تھا۔ دھوپ چڑھ کر بارہ دری کی فصیل نما اونچی، اونچی دیواروں پر پہنچ چکی تھی۔ دن کا چل چلاؤ تھا۔

حضور بیگم گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے مسند پر بیٹھی تھیں۔ اُن کے کان ڈیوڑھی میں اُبھرنے والی ہر آواز پر لگے ہوئے تھے۔ لگتا ہے ارجمند سُلطانہ کی منتظر تھیں۔ مغلانی دیر سے خاموش بیٹھی تھیں۔ وہ یہ معلوم کرنے کے لیے بے چین تھی کہ ارجمند سُلطانہ نے رات کس طرح اوپر بسر کی اور اس کے بارے میں حضور بیگم کو کیا بتایا۔ حضور بیگم نے اب تک کچھ نہ بتایا تھا۔

مغلانی نے جھجکتے ہوئے استفسار کیا۔ "سرکار! اجازت ہو تو ایک بات دریافت کروں؟"

"پوچھو، کیا پوچھنا چاہتی ہو؟"

"رانی صاحبہ، تمام رات اوپر رہیں۔ اُنھوں نے وہاں کیا دیکھا۔ جنوں نے ان کے ساتھ کیا برتاؤ کیا۔ نظر بھی آئے یا نہیں؟" مغلانی نے کھُل کر اپنے تجسس کا اظہار کیا۔ "یہ معلوم کرنے کے لیے صبح سے طبیعت بے چین ہے۔ اس سلسلے میں اُنھوں نے آپ کو کیا بتایا؟"

"کھُل کر تو کچھ بھی نہیں بتایا۔" حضور بیگم نے بھی مغلانی کو کچھ نہ بتایا۔ بتاتیں بھی کیا۔ اُنھیں خود کچھ علم نہ تھا۔ ارجمند سُلطانہ نے جو کچھ بتایا تھا، اس کا بھی اظہار نہ کیا۔ ارجمند سُلطانہ نے سختی سے تاکید کردی تھی کہ کسی سے مطلق ذکر نہ کریں۔ احتیاط اور رازداری سے کام لیں۔ حضور بیگم نے ان کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے مغلانی کو ٹالنے کی کوشش کی۔ "ارجمند اس وقت آنے کا وعدہ کرکے گئی ہے۔ آئے گی تو تفصیل سے بات ہوگی۔ صبح وہ

بٹھری ہی کتنی دیر۔ ناشتے کے لیے کہتی رہی، وہ بھی نہ کیا۔ نہار مُنہ اُٹھ کر چلی گئی۔"

مغلانی نے مزید استفسار کرنے سے گریز کیا۔

شام ہو گئی۔ دالانوں، صحنچیوں، سہ دریوں اور کمروں میں فانوس، مردنگ، کنول اور دوشاخے روشن کر دیے گئے۔ کافوری شمعوں کی روشنیاں جھلملانے لگیں۔ حضوُر بیگم کی بے قراری اور بڑھ گئی۔ وہ بار بار پہلو بدلتیں۔ ہر آواز اور ہر آہٹ پر چونک کر دروازے کی جانب دیکھتیں مگر ارجمند سُلطانہ نظر نہ آئیں۔

پہر رات گزر گئی۔ ارجمند سُلطانہ وعدے کے مُطابق اب تک نہ پہنچی تھیں۔ حضوُر بیگم رات گئے تک اُن کا انتظار کرتی رہیں۔ آخر جب کوچہ و بازار پر ہو کا عالم طاری ہو گیا اور بارہ دری پر گہرا سناٹا چھا گیا تو وہ مسند سے اُٹھیں۔ تھکے تھکے قدموں چلتی ہوئی آگے بڑھیں اور بستر پر جا کر دراز ہو گئیں۔

دُوسرے روز بھی حضوُر بیگم انتظار کرتی رہیں لیکن ارجمند سُلطانہ نہ آئیں۔ یہ دو راتیں حضوُر بیگم نے نہایت بے چینی کے عالم میں بسر کیں۔ دل میں طرح طرح کے خدشات پیدا ہوتے رہے۔ چھت پر ذرا بھی آہٹ ہوتی، وہ سہم کر رہ جاتیں۔ اُٹھ کر بستر پر بیٹھ جاتیں۔ تشویش زیادہ ہوتی تو کمرے سے نکل کر گھبرائی ہوئی طلعت آرا کے پاس جاتیں۔ اُسے بستر پر سوتا ہوا پاتیں تو مطمئن ہو کر چُپ چاپ واپس آجاتیں مگر کسی اَن جانے خوف سے ہر دم دھڑکا لگا رہتا۔

☆

اتوار کی بھیگی ہوئی صُبح تھی۔ آسمان پر کالی کالی بدلیاں منڈلا رہی تھیں۔ رات بھر بوندا بوندی ہوتی رہی اور پہر دن چڑھے تک اس کا سلسلہ جاری رہا۔ حضوُر بیگم ناشتے سے فارغ ہو کر اپنے کمرے میں واپس جا چکی تھیں۔ طلعت آرا نے ان کے ساتھ ہی بیٹھ کر ناشتہ کیا تھا۔ وہ گُم سُم اور پریشان نظر آ رہی تھی۔ نہ حضوُر بیگم نے بیٹی سے پریشانی کا سبب دریافت کیا اور نہ ہی اس نے کچھ بتایا۔ دونوں ہی چُپ چُپ تھیں اور اپنی

اپنی سوچ میں گُم تھیں۔

حضوُر بیگم کمرے میں تنہا تھیں اور اس اُلجھن میں مُبتلا تھیں کہ ارجمند سُلطانہ پُختہ وعدہ کرنے کے باوجُود اب تک کیوں نہ آئی تھیں۔ وہ جنم جنم کی توہم پرست تھیں۔ رہ رہ کے یہ خیال ستاتا تھا، کہیں ایسا تو نہیں کہ ان پر بھی جنّوں کا عتاب نازل ہُوا اور وہ بیمار پڑ گئیں یا کسی آفت ناگہانی کا شکار ہو گئیں۔ حضوُر بیگم کی تشویش برابر بڑھتی جا رہی تھی۔ اسی عالم میں اُن کی خواص، گلبدن، دروازے پر نمودار ہوئی۔ اندر آنے کی اجازت لی۔ کمرے میں داخل ہوئی اور نہایت ادب سے گویا ہوئی۔

"سرکار! داروغہ غلام صفدر خاں آئے ہیں۔ وکیل صاحب بھی اُن کے ہمراہ ہیں۔ دونوں دیوان خانے میں بیٹھے ہیں۔"

حضوُر بیگم پہلے ہی کیا کم پریشان تھیں۔ وکیل کی آمد کی اطلاع سُن کر اور پریشان ہو گئیں۔ ان کی پریشانی بے سبب بھی نہ تھی۔ نواب تقی کے انتقال کے بعد وہ صرف ایک بار آئے تھے۔ پھر ضرورت ہی نہ پڑی۔ مقدمہ کے سلسلے میں کسی قسم کا مشورہ کرنا ہوتا یا کچھ معلوم کرنا ہوتا تو وہ غلام صفدر خاں سے رجوُع کرتے جو مقدمہ کی پیروی میں اُن کے معاون اور مددگار تھے۔ وہ وکیل کا پیغام حضوُر بیگم کو پہنچا دیتے اور وہ جو کچھ بتاتیں، وکیل کو اس سے آگاہ کر دیتے۔

حضوُر بیگم نے گھبرا کر گل بدن سے دریافت کیا۔ "گل بدن، تُو نے داروغہ غلام صفدر سے یہ نہیں پُوچھا کہ وکیل صاحب کیوں آئے ہیں؟"

"نہیں سرکار! نہ مَیں نے وکیل صاحب کے بارے میں اُن سے کچھ پُوچھا اور نہ ہی مجھے اُنھوں نے کچھ بتایا۔ آپ فرمائیں تو مَیں داروغہ صاحب سے جا کر پُوچھ لُوں کہ وکیل صاحب کیوں آئے ہیں؟"

"ہاں، تم دیوان خانے جاؤ اور معلوم کرو کہ وکیل صاحب آج کس سلسلے میں تشریف لائے ہیں؟"

گل بدن باہر جانے کے لیے مُڑی تو حضوُر بیگم نے ٹوکا۔ "اور ہاں سُنو گلبدن،

اگر داروغہ صفدر کوئی بہت ضروری بات کہنا چاہتے ہیں تو اُن سے کہو کہ ڈیوڑھی میں آکر بیٹھ جائیں تاکہ تم کو دیوان خانے سے یہاں تک بار بار دوڑ دھوپ نہ کرنا پڑے۔ وکیل صاحب ڈیوڑھی میں آنا چاہیں تو اُن کو بھی بُلا لو۔ کوئی مضائقہ نہیں۔"

گل بدن نے اُن کی ہدایت پر عمل کرنے کا یقین دلایا اور کمرے سے باہر چلی گئی۔

ذرا دیر بعد گل بدن نے واپس آکر بتایا۔ "سرکار! مَیں نے تو داروغہ صاحب ہی سے بات کی تھی مگر وہ خاموش رہے۔ وکیل صاحب نے فرمایا ہے کہ مقدمے کے وہ وہ کاغذات جو آپ کے پاس ہیں، ان کو وہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ مقدمہ کے سلسلے میں اُن کی ضرورت پڑ گئی ہے۔ اسی لیے وہ خود تشریف لائے ہیں۔"

حضور بیگم نے مزید بات چیت نہ کی۔ گل بدن کو کمرے کے باہر بیٹھنے کی ہدایت کی۔ وہ چلی گئی تو حضور بیگم نے تکیہ کے نیچے سے کُنجی نکالی۔ مسہری سے نیچے اُتریں۔ آگے بڑھیں۔ توشہ خانے کے دروازے کا قفل کھولا اور اندر داخل ہوگئیں۔ مگر یہ دیکھ کر سناٹے میں آگئیں کہ وہ صندوقچی غائب تھی جس میں مقدمہ کی دستاویزات نہایت حفاظت سے رکھی گئی تھیں۔ وہ دیر تک توشہ خانے میں اِدھر اُدھر تلاش کرتی رہیں۔ مگر صندوقچی کہیں نظر نہ آئی۔ حضور بیگم کے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔

وہ سخت پریشانی کے عالم میں توشہ خانے سے باہر آئیں تو ارجمند سُلطانہ کو کمرے میں موجود پایا۔ اُنھوں نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔ "ارجمند، تم کب آئیں؟"

ارجمند سُلطانہ اُن کو دیکھتے ہی احتراماً اُٹھ کر کھڑی ہوگئیں۔ جُھک کر آداب کیا۔ معذرت کرتے ہوئے صفائی پیش کی۔ "مَیں ابھی آکر بیٹھی ہی تھی۔ معلوم ہُوا کہ آپ توشہ خانے میں ہیں۔ بیٹھ کر آپ کا انتظار کرنے لگی۔" اُنھوں نے تامل کیا، پھر مطلع کیا۔ "پھوپھی جانی! معاف کیجیے، مَیں دو روز تک غیر حاضر رہی۔ حسبِ وعدہ حاضر نہ ہو سکی۔"

"خیریت سے تو رہیں؟" حضور بیگم نے مسہری پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "تم نہ آئیں تو طبیعت بہت پریشان رہی۔ نہ جانے کیسے، کیسے خیالات دل میں آرہے تھے۔ مگر تم

اب تک رہیں کہاں؟

"حیدر گڑھ ہی میں رہی۔ یہاں سے سیدھی وہاں گئی تھی۔" ارجمند سُلطانہ نے مطلع کیا۔" وہاں جا کر معلوم ہُوا کہ ہمارے مینجر صاحب کے والد، جو عرصہ سے بیمار تھے، رات کو انتقال کر گئے۔ آج اُن کا تیجا ہے۔ کسی نہ کسی طرح وقت نکال کر آئی ہوں۔" وہ اپنی بات کہتے کہتے لمحہ بھر کے لیے چُپ ہو گئیں۔ حضورُ بیگم کے چہرے کو غور سے دیکھا اور فوراً اپنی تشویش کا اظہار کیا۔" پھوپھی جانی! آپ کچھ پریشان نظر آ رہی ہیں بلکہ بہت زیادہ پریشان نظر آ رہی ہیں۔"

"پہلے ہی کیا کم پریشانی تھی۔" حضور بیگم نے آہ سرد کھینچی۔" اب ایک نئی پریشانی لاحق ہوئی ہے۔"

"خیریت تو ہے۔ ہُوا کیا؟"

"وکیل صاحب آئے بیٹھے ہیں۔ میرے پاس مقدمے کے جو کاغذات رکھے ہیں۔ اُنھیں دیکھنا چاہتے ہیں۔" حضورُ بیگم نے ارجمند سُلطانہ کو بتایا۔" نواب صاحب ان کو ایک صندوقچی میں بند کر کے رکھتے تھے اور یہ صندوقچی توشہ خانے میں حفاظت سے رکھی جاتی تھی۔ ضرورت کے وقت وہ اُسے نکالتے اور پھر اسی طرح سنبھال کر رکھ دیتے۔ اُن کے انتقال کے بعد بھی اسی جگہ رکھی رہی۔ مَیں نے تو اسے کبھی کھول کر بھی نہ دیکھا مگر آج توشہ خانے میں جا کر دیکھا تو صندوقچی غائب تھی۔"

ارجمند سُلطانہ نے نہ حیرت کا اظہار کیا نہ پریشانی کا۔ قیصر مرزا ان کو پہلے ہی بتا چُکا تھا کہ جس صندوقچی میں مقدمے کی اہم دستاویزات تھیں، وہ اب اُس کے قبضے میں پہنچ چکی تھی۔ حضورُ بیگم کی باتوں سے یہ تصدیق ہو گئی تھی کہ قیصر مرزا نے صندوقچی کے بارے میں جو کچھ کہا تھا وہ دُرست تھا۔ ارجمند سُلطانہ نے مصلحت اندیشی سے کام لیا۔ اُنھوں نے حضورُ بیگم کو حقیقت سے آگاہ کرنے سے گریز کیا۔ بے نیازی سے مُسکرا کر بولیں۔

" پھوپی جانی! اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟"

حضورُ بیگم کو ان کی بے نیازی شاق گزری۔ تنک کر کہنے لگیں۔" اے ارجمند،

تم نے تو حد کر دی۔ لو اور سنو، پریشانی کی کوئی بات ہی نہیں۔ پہلے ہی سننے میں آرہا ہے کہ مقدمہ بگڑ گیا۔ اب تو سمجھو بالکل ہی ہاتھ سے نکل گیا۔"

"آپ خود کو ہلکان نہ کریں۔" ارجمند سلطانہ نے حضور بیگم کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ "صندوقچی توشہ خانے ہی میں ہوگی۔ جائے گی کہاں؟ سامان اُلٹنے پلٹنے میں اِدھر اُدھر ہو گئی ہوگی۔"

"مَیں نے تو اپنے طور پر ہر طرح تلاش کیا مگر کہیں نظر نہ آئی۔"

"پریشان نہ ہوں۔ اطمینان سے تلاش کیجئے گا تو مل جائے گی۔"

"مگر اس وقت وکیل صاحب کو کیا جواب دُوں۔ وہ تو مقدمے کے کاغذات ہی دیکھنے کی غرض سے آئے ہیں۔" حضور بیگم نے وکیل کی آمد کی اہمیت پر زور دیا۔ "ایسی ہی کوئی اشد ضرورت ہوگی، تب ہی تو خود چل کر یہاں آئے ہیں، ورنہ وہ تو پہلے کبھی مقدمے کے سلسلے میں آئے نہیں۔"

"آپ ان کی فکر نہ کریں۔" ارجمند سلطانہ نے حضور بیگم کو تسلی دی۔ "مَیں خود جا کر وکیل صاحب سے بات کرتی ہوں۔"

وہ اُٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔ حضور بیگم خاموش بیٹھی رہیں۔

☆

ارجمند سلطانہ دیوان خانے میں پہنچیں۔ داروغہ غلام صفدر خاں کے ساتھ مرزا امجد حسین ایڈووکیٹ بھی ایک کرسی پر اطمینان سے بیٹھے تھے۔ ارجمند سلطانہ کو رانی حیدر گڑھ کی حیثیت سے دونوں ہی پہچانتے تھے۔ ان کو دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے۔ آداب کیا۔ مزاج پوچھا۔ غیر متوقع آمد کا سبب معلوم کرنا چاہا۔

"خیریت تو ہے۔" وکیل نے مسکرا کر دریافت کیا۔ "رانی صاحبہ! آپ یہاں کیسے تشریف لائیں؟"

"مَیں آپ ہی کے پاس آئی تھی۔" ارجمند سلطانہ نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا

"میں پھوپی جانی کے مقدمے کے بارے میں آپ سے بات کرنا چاہتی تھی۔" اُنھوں نے قدرے توقف کے بعد دریافت کیا۔" اب مقدمے کی پوزیشن کیا ہے؟"

"مقدمہ تو ہمارا بہت مضبُوط تھا۔ اب تک فیصلہ بھی ہمارے حق میں ہو جاتا مگر میر نصیر طرح طرح کی پیچیدگیاں پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔" وکیل نے بتایا۔" یہ تو آپ کو علم ہی ہو گا کہ میر نصیر پہلے اس سرکار سے وابستہ تھے اور مقدمے کی پیروی میں پیش پیش تھے۔ مگر نواب صاحب مرحوم کی حیات ہی میں وہ اُس سرکار سے علیٰحدہ ہو کر نواب صفی کے ملازم ہو گئے تھے۔ مقدمے کے سلسلہ میں کوئی بات اُن سے پوشیدہ نہیں۔ اگر کوئی کمزوری بھی ہے تو اس سے بھی وہ واقف ہیں۔ اس سے فائدہ اُٹھانے میں مطلق دریغ نہیں کرتے۔"

"کیا اب کوئی نئی مشکل پیدا ہو گئی ہے؟"

"جی ہاں۔" وکیل نے ارجمند سُلطانہ کو مقدمہ کی تازہ ترین صورتِ احوال سے مطلع کیا۔ "یہ تو آپ کو علم ہی ہو گا کہ بڑے بھائی نواب ذکی کے انتقال کے بعد مشترکہ جایداد کے بٹوارے کے سلسلہ میں نواب تقی مرحوم کی اپنے منجھلے بھائی نواب صفی سے مقدمے بازی شروع ہو گئی تھی۔ مگر نیلم پور کا موضع نواب تقی کو اپنی والدہ سیّدہ ناظمہ بیگم کی طرف سے ترکے میں مِلا تھا۔ اس کی نوعیت یہ تھی کہ نواب تقی کے والد، نواب سیّد علی مرحوم نے جب سیّدہ ناظمہ بیگم سے عقد کیا تو نکاح کے کچھ عرصہ بعد نیلم پور کا موضع اُن کے نام ہبہ کر دیا تھا۔ ہبہ نامہ کی باقاعدہ رجسٹری بھی ہُوئی تھی۔ لہٰذا اس کے بارے میں کوئی تنازعہ نہ تھا۔ وہ ہمیشہ نواب تقی کی ملکیت میں رہا۔ اُن کے انتقال کے بعد ورثا کو منتقل ہو گیا اور اب تک انھی کے قبضے میں ہے۔"

"وکیل صاحب نے بالکل بجا ارشاد فرمایا۔" داروغہ غلام صفدر خاں نے تائید کی۔ "اس سرکار کے مختار کار کی حیثیت سے نیلم پُور کی دیکھ بھال اب تک میں ہی کر رہا ہوں۔"

"کل میرے منشی نے اطلاع دی کہ نواب صفی نیلم پور کے بھی دعویدار ہیں اور اس کے حق ملکیت کو عدالت میں چیلنج کرنے کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔ بلکہ سُننے میں

تو یہاں تک آیا ہے کہ میر نصیر نے کل ہی ہبہ نامہ کی مصدّقہ نقل سب رجسٹرار کے دفتر سے نکلوانے کے لیے درخواست بھی پیش کی ہے۔" وکیل نے بتایا۔ "مجھے یہ اطلاع ملی تو تشویش پیدا ہوئی۔ چنانچہ میں آج اس لیے حاضر ہُوا تھا کہ مقدمہ دائر ہونے سے پہلے ہی اپنے طور پر تیاری کر لی جائے۔ مَیں ہبہ نامہ کی اصل دستاویز اور اس سے متعلق دیگر کاغذات دیکھنا چاہتا تھا۔"

"آپ کا پیغام، خادمہ نے پھوپی جانی کو پہنچا دیا ہے۔" ارجمند سُلطانہ نے مسکرا کر وکیل صاحب سے کہا۔ "مگر وکیل صاحب، آپ اتنی عجلت میں کیوں ہیں؟ ابھی تو مقدمہ شروع بھی نہیں ہُوا اور اگر شروع بھی ہو جاتا تو کوئی عذر، کوئی تاویل یا کوئی قانونی نکتہ نکال کر مقدمے کی سماعت، فی الوقت ملتوی کرائی جا سکتی ہے اور آئندہ پیشی کے لیے پیش کار کو کچھ دے دلا کر کوئی لمبی تاریخ آسانی سے لی جا سکتی ہے۔"

"مگر سرکار! اگر وکیل صاحب متعلقہ کاغذات ملاحظہ فرمالیں تو اس میں قباحت ہی کیا ہے۔" غلام صفدر خاں نے مداخلت کی۔ "وکیل صاحب اس مقصد کے لیے وقت نکال کر آج خاص طور پر تشریف لائے ہیں۔"

"داروغہ صاحب! کاغذات دکھانے میں تو کوئی قباحت نہیں۔ وکیل صاحب، کاغذات نہ ملاحظہ فرمائیں گے تو مقدمہ کی پیروی کس طرح کریں گے۔" ارجمند سُلطانہ نے وضاحت کی۔ "لیکن مشکل یہ آ پڑی ہے کہ جس صندوقچی میں مقدمے کے تمام کاغذات محفوظ کر دیئے گئے تھے، پھوپی جانی اسے کہیں رکھ کر بھول گئی ہیں۔ توشہ خانے میں جہاں صندوقچی رکھی گئی تھی، اُنھوں نے بہت تلاش کیا مگر ملی نہیں۔" وہ وکیل کی جانب متوجہ ہوئیں۔ "ویسے وکیل صاحب، پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ بعد میں سکون اور یکسوئی سے تلاش کی گئی، تو مل جائے گی۔"

"معاف کیجیے گا رانی صاحبہ، آپ صورتِ حال کی نزاکت کو سمجھ نہیں سکیں یا مَیں اسے پوری طرح سمجھانے سے قاصر رہا۔ بات واقعی پریشانی کی ہے۔" وکیل نے اپنی تشویش کا اظہار کیا۔ "یہ دیوانی مقدمہ نہیں ہے۔ نواب صفی، دفعہ ۱۷۴ کے تحت

جعل سازی کے الزام میں فوجداری مقدمہ چلانے کے لیے کوشاں ہیں۔ مَیں نے اس سلسلے میں جو کچھ سُنا ہے، اس کے مطابق وہ ہبہ نامہ کی نقل حاصل کرنے کے بعد یہ ثابت کرنے کی کوشش کریں گے کہ یہ دستاویز جعلی ہے۔"

"میں نے تو سُنا ہے، وہ پہلے بھی ایسی کوشش کر چکے ہیں۔ اُنھوں نے تو پھوپھا جان کی والدہ مرحُومہ کے نکاح نامے کو بھی جعلی دستاویز ثابت کرنا چاہا تھا" ارجمند سلطانہ بدستور مطمئن نظر آ رہی تھیں۔ "وکیل صاحب مَیں نے غلط تو نہیں سُنا؟"

"آپ نے بالکل درُست سُنا،" وکیل نے تردید نہ کی۔ "ایسی کوشش کی گئی تھی، مگر مقدمہ قائم بھی نہ ہُوا تھا کہ عبداللہ خان کا انتقال ہو گیا۔ اُن کے خلاف یہ الزام عائد کیا گیا تھا کہ جعلی نکاح نامہ انھی نے تیار کیا تھا،" وکیل نے قدرے تامل کیا۔ "عبداللہ خان کے انتقال کے بعد مقدمے میں جان نہ رہی۔ دونوں نکاح خواں بھی فوت ہو چکے ہیں۔ نہ کوئی گواہ رہا نہ کوئی دستاویزی ثبوت مہیا ہو سکا۔ لیکن کسی نے سچ کہا ہے کہ مقدمے بازی میں کبھی فریق مخالف کی جانب سے غافل نہیں رہنا چاہیئے۔ سُنا ہے نواب صفی اس سلسلے میں رائٹنگ ایکسپرٹ کو طلب کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ لہٰذا نکاح نامہ کا تنازعہ ابھی ختم نہیں ہُوا۔ سچ پُوچھیے تو ان کے مقدمے کا بڑی حد تک دارومدار اسی پر ہے۔"

"خدا اس قسم کی مقدمے بازی سے اپنی امان میں رکھے، نہ کسی کی عزّت محفوظ نہ آبرُو۔ مرنے والوں کو بھی نہ بخشا گیا۔ ان کی روحیں تڑپتی ہوں گی،" رانی حیدر گڑھ نے بجھے ہوئے لہجے میں اپنے ردِعمل کا اظہار کیا۔ "ذرا غور تو کیجئے کس قدر افسوس کا مقام ہے۔"

"بجا فرمایا آپ نے،" وکیل نے اتفاق رائے کیا۔ "مَیں نے تو بہت کوشش کی کہ باہمی رضامندی سے فریقین میں کوئی سمجھوتہ ہو جائے۔ نواب صاحب مرحُوم بھی اس کے لیے آمادہ تھے اور مجھے یقین ہے کہ بیگم صاحبہ بھی مفاہمت کے لیے رضامند ہو جائیں گی، مگر نواب صفی نہیں مانتے۔ وہ پوری جائیداد ہڑپ کر لینا چاہتے ہیں۔

نت نیا قانونی حربہ آزماتے ہیں۔ اب یہی دیکھئے، ہبہ نامہ کو متنازع فیہ قرار دینے کے لیے کوشاں ہیں۔"

"اس سلسلے میں وہ کیا کرنا چاہتے ہیں؟"

"مصدّقہ نقل حاصل کرنے کے بعد وہ جعلی دستاویز تیار کروانے اور اسے صحیح ثابت کرنے کے الزام میں تھانے میں رپورٹ درج کرائیں گے۔" وکیل نے ارجمند سُلطانہ کو مطلع کیا۔ "پولیس اس رپورٹ کی بُنیاد پر تفتیش کرے گی اور مقدمہ قائم کرکے عدالت میں چالان پیش کرے گی۔"

"مگر وہ ہبہ نامہ کو جعلی دستاویز کیسے ثابت کریں گے؟"

"سُنا ہے، وہ یہ الزام عائد کرنا چاہتے ہیں کہ جن تاریخوں میں ہبہ نامہ لکھا گیا اور رجسٹر کرایا گیا، ان دنوں نواب سیّد علی مرحوم موتیا بند میں مُبتلا تھے اور جس آنکھ میں پانی اُتر آیا تھا، اس کا آپریشن کرانے کلکتے گئے تھے اور ڈیڑھ ماہ تک وہاں مقیم رہے تھے۔" وکیل نے بتایا۔ "نواب صفی نے اس سلسلے میں اپنے ایک قابل اعتماد مصاحب کو کلکتہ بھیجا تھا۔ وہ وہاں سے ڈاکٹر کا سرٹیفکیٹ اور دیگر ایسی دستاویزات لے کر آیا ہے، جن کی بُنیاد پر یہ ثابت کیا جاسکے کہ ہبہ نامہ پر جو تاریخ درج ہے، اس وقت نواب سیّد علی لکھنؤ میں موجُود ہی نہ تھے۔ وہ اس وقت کلکتہ میں امراضِ چشم کے مشہُور انگریز معالج ڈاکٹر وکٹر ہنٹر کے زیر علاج تھے۔"

ارجمند سُلطانہ خاموش بیٹھی رہیں۔ غلام صفدر خاں نے بھی دخل نہ دیا۔ مرزا امجد حسین ایڈوکیٹ بتاتے رہے۔ "اس الزام کی بُنیاد پر دفعہ ۴۷۱ کا مقدمہ قائم ہوسکتا ہے اور الزام دُرست ثابت ہونے کی صُورت میں اس دفعہ کے تحت قید کے علاوہ جُرمانہ بھی ہوسکتا ہے۔"

ارجمند سُلطانہ گھبرا کر بولیں۔ "یہ تو بڑی سیریس سچویشن ہے۔" اُنھوں نے قدرے توقف کرنے کے بعد بے چینی سے دریافت کیا۔ "آپ اس سلسلے میں کیا کر رہے ہیں؟"

"میں ہبہ نامہ اور اس سے متعلّقہ کاغذات دیکھے بغیر کیا عرض کرسکتا ہوں۔" اُنھوں

نے اپنی مجبوری بیان کرنے کے ساتھ ساتھ رانی حیدر گڑھ کو اطمینان دلانے کی بھی کوشش کی۔ "بہت عرصہ ہوا جب مقدمہ کی تیاری کے سلسلہ میں ہبہ نامہ اور دوسرے کاغذات بھی دیکھے تھے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے، ان کاغذات کی رُو سے جب ہبہ نامہ تیار ہوا تھا تو نواب سید علی مرحوم لکھنؤ ہی میں تھے۔ وہ ہبہ نامہ کی رجسٹری ہونے کے بعد بغرض علاج کلکتہ تشریف لے گئے تھے۔ ہبہ نامہ کی رجسٹرڈ دستاویزات کے ساتھ ڈاکٹر کا سرٹیفکیٹ اور علاج معالجہ کے اخراجات کی ادائیگی کی رسید بھی موجود تھی۔ اس ہوٹل کا بل بھی تھا، جس میں نواب صاحب نے علاج کے دوران میں قیام فرمایا تھا۔ یہ تمام کاغذات مَیں نے پوری توجہ سے دیکھے تھے مگر صحیح تاریخیں اب حافظہ میں محفوظ نہیں۔"

"ایسی صورت میں تو کاغذات ملاحظہ کرنا آپ کے لیے نہ صرف ضروری بلکہ نہایت ضروری ہے۔" ارجمند سُلطانہ نے اظہارِ خیال کیا۔

"جی ہاں۔ کاغذات کو جلد سے جلد دیکھنا بہت ضروری ہے۔ اس میں تاخیر نہ ہونا چاہیئے۔ یہی تو میری پریشانی کا باعث ہے۔"

ارجمند سُلطانہ اب مرزا امجد حسین ایڈوکیٹ کی پریشانی سے پوری طرح آگاہ ہو چکی تھیں۔ مگر وہ یہ بھی جانتی تھیں کہ اگر کاغذات واقعی قیصر مرزا کی تحویل میں پہنچ چکے ہیں تو فوری طور پر اُن کا مہیّا ہونا ممکن نہ تھا۔ اس خیال سے وہ متفکر تو ہو گئی تھیں لیکن وکیل سے اُنھوں نے اپنی پریشانی کا اظہار نہ کیا۔ سنبھلے ہوئے لہجے میں بولیں۔

"گھبرانے کی چنداں ضرورت نہیں۔ کاغذات تلاش کرنے پر مل جائیں گے۔ آپ اطمینان سے اُن کو دیکھ لیجئے گا۔"

"مگر کاغذات جلد ہی ملنا چاہیئے۔ معاملہ پولیس تک جانے سے پہلے اس کا تدارک ہونا ضروری ہے۔" وکیل نے کاغذات کی فوری ضرورت پر زور دینے کے ساتھ ساتھ اپنے خدشات کا بھی اظہار کیا۔ "خدا کرے وہ محفوظ ہوں۔ اگر خدانخواستہ نواب صفی کے قبضے میں پہنچ گئے تو صورتِ حال بہت سنگین ہو جائے گی۔ اپنے پاس تو کوئی دستاویزی ثبوت بھی نہ رہے گا۔" اُنھوں نے تامل کیا۔ "مَیں اس اندیشے کا اظہار

اس لیے کر رہا ہوں کہ میر نصیر ایک عرصہ سے اس کوشش میں لگے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح مقدمے کے کاغذات حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔ اس مقدمے کی پیروی کے سلسلے میں عرصہ تک ان کا ساتھ رہا ہے اور اب بھی اُن سے سابقہ پڑ رہا ہے۔ مَیں نے اُن کا وہ رُخ بھی دیکھا اور یہ بھی دیکھ رہا ہُوں۔ مجھے بخوبی اندازہ ہے کہ وہ کس قدر ہوشیار اور کائیاں ہیں۔ اپنا کام نکالنے کے لیے کیا نہیں کر سکتے۔"

"رانی صاحبہ! نہ پُوچھیے' وہ شخص کس قدر چلتا پُرزہ ہے۔ ایسا گھاگ کہ مَیں آپ سے کیا عرض کروں۔" داروغہ غلام صفدر نے جو دیر سے خاموش بیٹھے تھے' میر نصیر کے خلاف اپنے غم و غصّے کا اظہار کیا۔" برسوں اس ڈیوڑھی کے وابستگان میں رہا ہے مگر آنکھ میں ذرا بھی لحاظ نہیں۔ بے مروّتی کا یہ عالم ہے کہ ہر طرح زک پہنچانے کے لیے کوشاں ہے۔"

"یہ بہت ہی اچھا ہُوا کہ آپ تشریف لے آئیں اور مقدمے کی نوعیت کو پُوری طرح سمجھ لیا۔ آپ بیگم صاحبہ کو بھی صحیح صُورتِ حال سے آگاہ کر سکتی ہیں۔" وکیل نے ارجمند سُلطانہ سے کہا۔" بیگم صاحبہ کو مقدمے کی پوزیشن کو پُورے طور پر سمجھنے کا موقع بھی نہ ملے گا۔ میرے لئے تو یہ بہت مشکل کام تھا۔ بالمشافہ تو اُن سے بات کرنا ممکن نہیں۔ خادمہ کے ذریعہ بات چیت ہوتی ہے۔ خادماؤں کا عالم یہ ہے کہ نہ وہ بات کا پُورا طرح مفہوم سمجھ پاتی ہیں اور نہ ہی سمجھا سکتی ہیں۔ بعض ایسے امُور ہیں کہ کسی پر اعتماد بھی نہیں کیا جا سکتا۔ خاص طور پر ایسی صُورت میں جب میر نصیر ہر راز جاننے کی ٹوہ میں لگے ہُوئے ہیں۔"

ارجمند سُلطانہ توجّہ سے وکیل کی باتیں سُنتی رہیں۔ وہ مقدمے کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں بتاتا رہا۔ ہر نشیب و فراز واضح کرتا رہا۔ تاکہ وہ مقدمے کی نوعیت کو جملہ تفصیلات کے ساتھ حضور بیگم کو سمجھا سکیں اور ان کو بھی صُورتِ احوال کا بخوبی اندازہ ہو جائے۔

☆

حضور بیگم ابھی تک کمرے میں تنہا تھیں۔ اُن کی پریشانی کم ہونے کے بجائے اور

بڑھ گئی تھی۔

معلانی دوبار اُن کے پاس آئیں۔ پریشان اور گم سُم پایا تو کرید کر اس کا سبب بھی پوچھا مگر حضور بیگم نے دردِ سر کا بہانہ کر کے ان کو ٹال دیا۔ مقدمے کے کاغذات کی گمشدگی کے بارے میں کچھ نہ بتایا۔ وہ ارجمند سُلطانہ سے مشورہ کیے بغیر کسی کو اعتماد میں لے کر اپنی پریشانی ظاہر نہ کرنا چاہتی تھیں۔

وہ بستر پر خاموش لیٹی تھیں۔ بے چینی سے بار بار کروٹیں بدلتی تھیں۔ آنکھیں دروازے پر لگی تھیں۔ وہ ارجمند سُلطانہ کا نہایت بے تابی سے انتظار کر رہی تھیں۔

ارجمند سلطانہ کمرے میں واپس آئیں تو حضور بیگم اُٹھ کر بیٹھ گئیں۔ اپنی گھبراہٹ اور پریشانی پر قابو نہ رکھ سکیں۔ بے قرار ہو کر پُوچھا۔ "خیریت تو ہے۔ وکیل صاحب کیا کہتے تھے؟ مقدمہ کے بارے میں کیا بتاتے تھے؟" وہ ایک کے بعد دوسرا سوال کرتی گئیں۔

ارجمند سُلطانہ نے اُن کی گھبراہٹ کی شدّت کو محسوس کیا مگر وکیل کی ہدایت کے باوجُود مقدمے کی سنگین نوعیت کے بارے میں اظہارِ حقیقت سے گریز کیا۔ وہ تھکی ہوئی سی کرُسی پر بیٹھ گئیں، مسکرا کر بولیں۔ "پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ مقدمہ بازی میں تو طرح طرح کی قانونی پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہی رہتی ہیں۔ ان سے نمٹنے کے لئے وکیل صاحب تو موجُود ہی ہیں۔ آپ خُود کو ہلکان نہ کریں۔ ویسے آپ کے وکیل بہت سمجھ دار اور قابلِ قانون دان ہیں۔"

"مگر مقدمے کے کاغذات کے بغیر وہ بے چارے کیا کریں گے؟"

"کاغذات بھی مِل جائیں گے۔" ارجمند سلطانہ نے حضور بیگم کو تسلی دی۔

"تمھارے جانے کے بعد مَیں نے کاغذات کی صندوقچی کو توشہ خانے میں جا کر ایک بار پھر تلاش کیا لیکن جس جگہ اسے رکھا تھا، وہاں تو ہے نہیں۔"

"اس وقت تو آپ پر گھبراہٹ طاری ہے۔ اطمینان سے دیکھئے گا تو صندوقچی مِل جائے گی۔" ارجمند سُلطانہ نے حضور بیگم کو دلاسا دیا۔ "مَیں نے وکیل صاحب کو

صُورتِ حال سے آگاہ کر دیا ہے۔ جب کاغذات مل جائیں تو داروغہ غلام صفدر کو بتا دیجیے گا، وہ انھیں بلا لائیں گے اور کاغذات دیکھ لیں گے۔"

حضور بیگم اُن کی باتوں سے کسی حد تک مطمئن بھی ہو گئیں۔ چہرے پر چھائی ہوئی پریشانی کا غبار مدھم پڑ گیا۔ ارجمند سُلطانہ نے مزید دل جوئی کی۔ ساتھ ہی یہ بھی مشورہ دیا۔ "ہو سکے تو جلد سے جلد بارہ دری خالی کر کے کہیں اور منتقل ہو جائیں۔ آپ کے حق میں یہی مناسب ہے۔ حالات کا تقاضا بھی یہی ہے۔ میری تو یہی رائے ہے۔ اس پر سنجیدگی سے غور کر لیجیے۔"

"تم نے تو میرے دل کی بات کہہ دی۔ میں تو خود یہی سوچ رہی تھی کہ بارہ دری خالی کر کے امیر محل چلی جاؤں۔" حضور بیگم نے ارجمند سُلطانہ کی رائے سے اتفاق کیا لیکن دہشت زدہ بھی تھیں۔ اُنھوں نے اپنے خدشات کا اظہار کیا۔ "میں تو اسے جلد سے جلد چھوڑ دینا چاہتی ہوں۔" اُنھوں نے ہاتھ اُٹھا کر چھت کی جانب اشارہ کیا۔ "مگر پہلے اُن سے تو اجازت لے لو۔ ایسا نہ ہو کہ وہ ناراض ہو جائیں۔" حضور بیگم نے جنّوں کا نام لینے سے اجتناب کیا۔ "بعد میں ان کا عتاب نازل ہو اور میری بچّی کی جان پر بن جائے۔"

"اجازت بھی مل جائے گی، آپ اس کی فکر نہ کریں۔"

"اے ایسا ہو جائے تو اس روز، روز کی مُصیبت سے نجات مل جائے گی۔" حضور بیگم نے اطمینان کی سانس لی۔ "مجھے تو شروع ہی سے یہاں کی رہائش پسند نہ تھی۔ پڑوس بھی ایسا مِلا ہے کہ خدا دُشمن کو بھی نہ دے۔ لے دے کے ایک عشرت منزل ہے۔" اُنھوں نے ہاتھ اُٹھا کر اشارہ کیا۔ "اس کا حال یہ ہے کہ نہ جانے کب سے خالی ڈھنڈار پڑی ہے۔ برسوں سے اس کی ملکیت کے لیے مقدمے بازی ہو رہی ہے۔ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی۔ آباد ہو تو کیسے۔ سُنا ہے اس پر بھی جنّوں کا سایہ ہے۔ کسی کو ٹھہرنے ہی نہیں دیتے۔"

ارجمند سُلطانہ نے چونک کر حضور بیگم کی جانب دیکھا۔ اُن کی باتوں سے صاف

ظاہر ہوتا تھا کہ عشرت منزل میں قیصر مرزا اور آغا جانی کے قیام کے بارے میں وہ بالکل بے خبر تھیں۔ اس کا سبب غالباً یہ تھا کہ دونوں نے اپنی رہائش کو مخفی رکھنے کی پوری پوری کوشش کی تھی۔ ہمیشہ رات کا اندھیرا پھیلنے کے بعد ہی کہیں آتے جاتے تھے۔ کبھی کئی روز باہر نہ نکلتے۔ پاس پڑوس میں بھی کسی سے ان کا ربط ضبط نہ تھا۔

عشرت منزل یوں تو بارہ دری سے بالکل متصل تھی۔ صرف ایک اونچی دیوار دونوں کو علیحدہ کرتی تھی لیکن عشرت منزل کا صدر دروازہ ایک ایسی گلی میں کھلتا تھا جو مکانات حائل ہونے کے باعث بارہ دری کی بیرونی ڈیوڑھی کے پھاٹک سے لگ بھگ نصف میل کے فاصلے پر تھی۔ لہٰذا بارہ دری اور عشرت منزل کے مکین ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہونے کی حد تک ناواقف تھے۔

ارجمند سلطانہ نے عشرت منزل کے ذکر ہی کو سرے سے نظر انداز کر دیا۔ انھوں نے مصلحت اندیشی سے کام لیا۔ البتہ حضور بیگم کا دل ٹٹولنے کی غرض سے کہا۔ "اُمید تو ہے کہ آپ جیسی اجازت چاہتی ہیں، مل جائے گی مگر آپ نے کبھی طلعت آرا کی شادی کے متعلق بھی غور کیا؟ ماشاءاللہ، اب وہ سیانی ہو گئی ہے۔"

"کیوں نہیں سوچا اس کی شادی کے بارے میں لیکن جس عذاب میں وہ گرفتار ہے، پہلے اس سے تو چھٹکارہ مل جائے۔" حضور بیگم نے ایک بار پھر اپنی پریشانی کا اظہار کیا۔ "میں تو یہ سمجھتی ہوں کہ نادانی میں اس سے کوئی ایسی بے ادبی ہو گئی جو ناگوار گزری اور میری بچی پر یہ مصیبت نازل ہوئی۔ اب تم ہی اس کو معافی دلا سکتی ہو۔" ان کے لہجے میں التجا تھی۔ "ارجمند! سچ کہتی ہوں۔ میرے روئیں روئیں سے تمھارے لیے دعا نکلتی ہے۔ تمھارا یہ احسان ہو گا جسے میں زندگی بھر فراموش نہ کر سکوں گی۔"

"پھوپھی جانی اس میں احسان کی کون سی بات ہے۔" ارجمند سلطانہ نے انکسار کا مظاہرہ کیا۔ "آپ خواہ مخواہ مجھے شرمندہ نہ کریں۔ طلعت آرا میری بھی تو چھوٹی بہن ہے۔ میں اس کے لیے جو کچھ کر سکتی ہوں، اس سے دریغ نہیں کروں گی۔" انھوں

نے جھٹ بات کا رُخ بدل دیا۔ "یہ فرمایئے، کوئی رشتہ ہے آپ کی نظر میں؟"
"ویسے تو نفیسہ بیگم اپنے بیٹے علی رضا کے لیے ایک مدت سے چکر کاٹ رہی ہیں۔ اس طرح رگڑ رگڑ کر رشتہ مانگ رہی ہیں کہ میں تم سے کیا بتاؤں۔" حضور بیگم نے ارجمند سلطانہ کو مطلع کیا۔ "مگر یہ تو تم بھی سمجھتی ہو کہ یہ ساری تگ و دو جائیداد ہتھیانے کے لیے ہو رہی ہے۔ میں برابر کسی نہ کسی طور ان کو ٹال رہی ہوں۔ لیکن وہ ایسی ڈھیٹ ہیں کہ باز ہی نہیں آتیں۔" ان کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ "کسی روز صاف صاف جواب دے دوں گی، بی بی! مجھے یہ رشتہ نہیں کرنا۔ کوئی اور گھر دیکھو۔"

ارجمند سلطانہ خاموش بیٹھیں ان کی باتیں سنتی رہیں۔ حضور بیگم نے قدرے توقف کے بعد بتایا۔ "دلاری بھی ایک رشتہ لائی تھی۔ پہلے وہ اس ڈیوڑھی پر ملازم تھی۔ اب مشاطہ گیری کرتی ہے۔ وہ رقعہ بھی لائی تھی۔ اب تک پڑا ہے۔ میں نے اسے دیکھا بھی نہیں۔ دیکھ کر، کرتی بھی کیا۔ میری بچی ایسی مصیبت میں گرفتار رہی کہ اس کی شادی بیاہ کے بارے میں سوچ بھی نہ سکتی تھی۔"

"میں تو کہتی ہوں، اس معاملہ میں اب آپ سنجیدگی سے غور کریں اور یہ کوشش کریں کہ جلد سے جلد اس فرض سے سبکدوش ہو جائیں۔"

"ایک نہ ایک دن تو اسے بیاہ کر پرائے گھر جانا ہی ہے۔ کب تک میرے کولہے سے لگی بیٹھی رہے گی۔ ادھر میرا حال یہ ہے کہ روز بروز صحت گرتی جا رہی ہے۔ نہ جانے کب آنکھ بند ہو جائے۔ میری زندگی ہی میں اگر وہ اپنے گھر بار کی ہو جائے تو اس سے اچھا اور کیا ہوگا۔" حضور بیگم نے دل گرفتہ ہو کر ٹھنڈی سانس بھری۔ "حالانکہ جب اس بارے میں سوچتی ہوں تو دل بیٹھنے لگتا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا، کس طرح اس جدائی کا غم برداشت کر سکوں گی۔" حضور بیگم نے نظر بھر کر ارجمند سلطانہ کے چہرے کو دیکھا۔ دبی زبان سے دریافت کیا۔ "تمھاری نظر میں کوئی مناسب رشتہ ہے؟"

ارجمند سلطانہ گردن جھکائے چند لمحے تک سوچتی رہیں، پھر حضور بیگم کی جانب متوجہ ہوئیں۔ "پھوپھی جانی! آپ نواب بوٹا اور ان کے خاندان سے تو واقف ہی ہوں

گی۔" انھوں نے محتاط رویہ اختیار کیا۔ کھُل کر بات کرنے سے گریز کیا۔ حرفِ مطلب پر آنے سے قبل وہ حضورؐ بیگم کا عندیہ معلوم کرنا چاہتی تھیں۔

"وہی نواب بوٹا تو نہیں، جو پُرانے حیدر گنج میں رہتے ہیں۔" حضورؐ بیگم نے جواب دیا۔

"جی ہاں، وہی نواب بوٹا۔" ارجمند سُلطانہ نے مختصر تعارف کرایا۔ "کھاتے پیتے خاندانی رئیس ہیں۔ ان کے والد، نواب افضل علی مرحوم کا تو عمائدینِ شہر میں شمار ہوتا تھا۔ اعلیٰ حکام سے ان کے بہت اچھے مراسم تھے۔ خان بہادر کا خطاب ملتے ملتے رہ گیا۔"

"مجھے نواب افضل علی کے متعلق تو زیادہ معلوم نہیں مگر نواب بوٹا کا ذکر اکثر سُننے میں آیا ہے۔" حضور بیگم نے بتایا۔ "ان کی بیوی سے شادی کی ایک تقریب میں ملاقات بھی ہوئی تھی۔ لیکن اُن کی چھوٹی نند سے حضرت عباس علمدار کی درگاہ میں تو ایک زمانے میں بہت ملنا جُلنا رہا۔ بڑی ملنسار اور ہنس مُکھ طبیعت پائی ہے۔ بیچاری جوانی ہی میں بیوہ ہوگئیں۔ وہ اپنی بھاوج اور بھائی، نواب بوٹا کا برابر تذکرہ کرتی رہتی تھیں۔ ادھر ایک عرصہ سے وہ درگاہ میں نظر نہیں آئیں۔ سُنا ہے، بیمار ہیں۔" وہ لمحہ بھر خاموش رہیں پھر قیاس آرائی کی۔ "نواب بُوٹا کا ایک جوان لڑکا بھی ہے۔ مجھے اس کا نام نہیں معلوم۔ تم اس کے رشتے کے بارے میں تو بات کرنا نہیں چاہتی ہو؟"

"جی ہاں! آپ نے پوچھا تو مجھے معاً اُسی کا خیال آیا۔ اس کا نام قیصر مرزا ہے۔" ارجمند سُلطانہ رفتہ رفتہ کھُلنے لگیں۔ "میں نے اسے دیکھا ہے۔ سن بھی زیادہ نہیں۔ بائیس سال کے لگ بھگ ہوگا۔ صحت مند اور تندرُست ہے۔ صُورت شکل کے اعتبار سے تو طلعت آرا کے لیے نہایت موزوں ہے۔ جیسی وہ کامنی سی من موہنی ہے، ویسا ہی وہ بھی وجیہہ اور خوب رُو ہے۔ بالکل شہزادہ لگتا ہے۔ آپ اُسے دیکھیں گی تو پسند کریں گی۔"

"مگر نواب بُوٹا کے بارے میں تو مَیں نے سُنا ہے کہ مالی طور پر بالکل کھوکھلے ہو چکے ہیں۔ بال، بال قرض میں بندھا ہے۔ ساری جائیداد اور املاک مہاجنوں کے پاس

رہن ہے۔" ارجمند سُلطانہ کے جوش و خروش کے جواب میں حضوُر بیگم نے سرد مہری کا مظاہرہ کیا۔" ذرا غور تو کرو ایسے مفلوک الحال گھر میں اپنی بچّی کو کیسے بیاہ سکتی ہوں۔ بکری کو بھی چرنے کے لیے چھوڑتے ہیں تو ہریالی پہلے دیکھ لیتے ہیں۔"

"مجھے نواب بُوٹا کے مالی حالات کے بارے میں کچھ علم نہیں۔" ارجمند سلطانہ نے ہمّت نہ ہاری۔ بگڑتی بات کو سنبھالنے کی کوشش کی۔" آپ اس معاملہ میں اتنی فکرمند کیوں ہیں۔ اللہ نے آپ کو اتنا دے رکھا ہے کہ ان کی جائیداد کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہیئے۔" وہ زیرِ لب مسکرائیں۔" اگر ایسا ہے تو کیا بُرا ہے۔ لڑکا، گھر داماد بن کر رہے گا۔ آپ کا کوئی بیٹا نہیں، اس کمی کو پُورا کردے گا۔ آپ کی جائیداد اور زمینداری کی دیکھ بھال کرے گا۔ طلعت آرا آپ کی اکلوتی اولاد ہے۔ اس کی جُدائی کے خیال سے آپ پہلے ہی پریشان ہیں۔ یہ رشتہ ہوگیا تو وہ آپ کے پاس ہی رہیگی۔ مَیں تو سمجھتی ہوں کہ رشتہ اس حیثیت سے بھی بُرا نہیں۔"

ارجمند سلطانہ نے اپنے طور پر قیصر مرزا کی پوری پوری وکالت کی مگر حضور بیگم کے روّیہ سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اُن کی باتوں سے متاثر نہیں ہوئیں۔ کہنے لگیں۔" یہ بھی تو نہیں معلوم کہ لڑکے کا چال چلن کیسا ہے۔ مردکی صوُرت شکل کا کیا دیکھنا۔ اوّل چیز تو سیرت ہے۔ اگر بُری صحبت میں پڑکر بگڑ گیا ہے تو باپ کی طرح، وہ بھی بیوی کی جائیداد عیاشی میں اُڑا دے گا۔" ان کا لہجہ تلخ ہوگیا۔" نواب بوٹا نے تو اس بُری طرح باپ دادا کی چھوڑی ہوئی دولت کو لٹایا ہے کہ تم سے کیا، کیا بتاؤں؟" اپنی بات کہتے کہتے وہ اچانک نرم پڑ گئیں۔" سُنا ہے کہ جب سے اُن پر فالج گرا ہے۔ ایسے پڑے ہیں کہ چلنے پھرنے سے معذور ہوگئے ہیں۔ ان کے متعلق اب کچھ کہتے ہوئے بھی دُکھ ہوتا ہے۔"

ارجمند سلطانہ کو یہ اندازہ نہ تھا کہ نواب بُوٹا کے بارے میں حضور بیگم ان سے بھی زیادہ باخبر تھیں مگر اُنھوں نے ہمّت نہ ہاری۔ سنجیدہ ہوکر گویا ہوئیں۔" یہ تو مَیں نے بھی سُنا ہے کہ نواب بُوٹا سخت علیل ہیں۔" ارجمند سلطانہ نے فوراً بات بنائی، علالت

ہی کے باعث ان کی خواہش ہے کہ بیٹے کا جلد سے جلد بیاہ کر دیں۔ دو بیٹیوں میں ایک ہی تو بیٹا ہے۔ اُسے دُولھا بنا ہوا دیکھنے کا ان کو بہت ارمان ہے۔"

"معلوم ہوتا ہے ان کے گھر تمھارا آنا جانا ہے۔" حضور بیگم نے اپنے ردِ عمل کا اظہار کیا۔

"جی نہیں، میں اُن کے گھر نہیں گئی۔" ارجمند سلطانہ نے وضاحت کی۔ "البتّہ قیصر مرزا کو دیکھا ہے۔ اس سے مل چکی ہوں۔ میرے مینجر کے چھوٹے بیٹے سے اس کا ملنا جُلنا ہے۔ اسی کے ہمراہ میرے پاس آیا تھا۔ بظاہر تو نیک اور سعادت مند نظر آتا ہے۔" انھوں نے قدرے تامّل سے کہا۔ "جہاں تک اس کے چال چلن کا تعلّق ہے تو میں نے اس سلسلے میں جو کچھ سُنا ہے، وہ یہ ہے کہ کسی فعل میں نہیں، عام رئیس زادوں کی طرح نہ طوائفوں سے رسم ہے، نہ بٹیر بازی کا شوق ہے، نہ کبوتر بازی کا۔"

قیصر مرزا کے بارے میں ارجمند سلطانہ نے مبالغہ سے کام لیا تھا۔ وہ اُس کے کردار کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھیں۔ اُنھوں نے تو صرف حضور بیگم کو متاثر کرنے کے لیے قیصر مرزا کی اس قدر تعریف و توصیف کی تھی۔ وہ چاہتی تھیں کہ قیصر مرزا کی طلعت آرا سے شادی ہو جائے۔ ان کے خیال میں یہ مسئلہ کا نہایت مناسب اور آبرو مندانہ حل تھا۔ جو راز اب تک افشا نہ ہوا تھا، اس پر پردہ پڑا رہتا۔ نہ رسوائی ہوتی نہ جگ ہنسائی، اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اگر حضور بیگم کسی طرح قیصر مرزا کو اپنا داماد بنانے پر رضامند ہو جاتیں تو وہ آسانی سے مقدمے کے کاغذات واپس لے سکتی تھیں۔ وکیل سے تفصیلی گفتگو کرنے کے بعد وہ نہ صرف ان دستاویزات کی اہمیت سے آگاہ ہو گئی تھیں، بلکہ صورتِ حال جس قدر سنگین تھی، اُس کا بھی ان کو پوری طرح ادراک ہو گیا تھا۔

"تم نے لڑکے کے بارے میں جو کچھ سُنا، درست ہی ہو گا۔ ظاہر ہے تم غلط بیانی تو کرنے سے رہیں۔" حضور بیگم نے ارجمند سلطانہ کی حوصلہ شکنی نہ کی۔ مگر اپنا عندیہ نہ دیا۔ صاف ٹال گئیں۔ "مجھے تو اس وقت یہ پریشانی دامن گیر ہے کہ میری بچّی جس مصیبت میں گرفتار ہے، اس سے کسی طرح اس کی گلو خلاصی ہو جائے۔ جب تک معافی نہ مل جائے

گی، میں تو اس کی شادی بیاہ کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہتی۔"

"اس کی آپ فکر نہ کریں۔" ارجمند سلطانہ نے حضور بیگم کو اس بار زیادہ اعتماد سے یقین دلانے کی کوشش کی۔" اب یہ میری ذِمّے داری ہے۔ اُسے آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔" وہ ایک بار پھر حرفِ مطلب پر آگئیں۔" میں نے طلعت آراء کی شادی کی بات کچھ سوچ کر ہی چھیڑی تھی۔"

"مجھے تمھاری بات سے اختلاف نہیں، مگر میں یہ جانتی ہوں کہ جو خطرات درپیش ہیں، تم کو ان کا کوئی اندازہ نہیں۔" حضور بیگم نے کھُل کر اپنی تشویش کا اظہار کیا۔" تمھارا کبھی ان سے سابقہ نہیں پڑا اور میں تو کہتی ہوں خدا کرے کسی سے ان کا سابقہ نہ پڑے۔" اُنھوں نے سرپوش اُٹھا کر خاصدان کھولا۔ پان کی گلوری نکالی کلّے میں دبائی اور یوں گویا ہوئیں۔

" خدا بخشے امّاں جانی کو، ان کا تو چشم دید واقعہ ہے۔ بتاتی تھیں۔ ان کی رشتے کی ایک خالہ زاد بہن تھیں۔ ان سے سِن میں کچھ بڑی تھیں۔ مفتی گنج میں رہتی تھیں۔ ثروت جہاں نام تھا۔ ان پر کسی جن کا سایہ تھا۔ رات کو سوتے سوتے چونک کر اُٹھ جاتیں۔ دیوانوں کی طرح چیختی چلّاتیں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ اچھی خاصی بیٹھی ہیں، ایکا ایکی بہکی بہکی باتیں کرنے لگتیں۔ آنکھیں سُرخ انگارہ ہو جاتیں۔ پھر، پھر کپڑے پھاڑنا شروع کر دیتی۔"

" ہسٹریا کا دورہ پڑتا ہوگا۔" ارجمند سلطانہ نے مسکرا کر لقمہ دیا۔

" خاندانی طبیب نے بھی کچھ ایسا ہی مرض تشخیص کیا۔ شادی کرنے کا مشورہ دیا۔" حضور بیگم پان چباتی رہیں اور سنبھل سنبھل کر بولتی رہیں۔" بڑی دھوم دھام سے شادی ہوئی۔ رُخصت ہو کر سُسرال پہنچیں۔ رات گزری۔ صُبح ہوئی۔ خادمہ جگانے پہنچی۔ بار بار دروازے پر دستک دی۔ جب کوئی جواب نہ ملا تو حجلۂ عروسی کا دروازہ کھولا۔ اندر نظر ڈالی تو کیا دیکھتی ہے۔ دُولھا اور دُلھن، دونوں مسہری پر خون میں لت پت پڑے ہیں، سر تن سے جُدا ہیں۔"

حضور بیگم نے گہری سانس بھری۔" بعد میں طرح طرح کی باتیں سُننے میں آئیں۔ کوئی کچھ کہتا تھا۔ کوئی کچھ۔ غرض یہ کہ جتنے مُنہ اتنی باتیں۔ امّاں جانی کہتی تھیں۔ شادی سے ایک رات قبل جن ثروت جہاں کو خواب میں نظر آیا تھا۔ اُس نے خبردار کیا کہ شادی اگر ہوئی

تو انجام بہت عبرت ناک ہوگا۔ ثروت جہاں نے ماں کو بتایا بھی، مگر اُنھوں نے دھیان نہ دیا۔ جن نے نافرمانی کرنے پر غضبناک ہو کر دُلھن کے ساتھ دُولھا کو بھی ختم کر دیا۔" اُنھوں نے ارجمند سلطانہ کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ "تم سے کیا، کیا بتاؤں۔ ایسے، ایسے ہولناک واقعات سُننے میں آئے ہیں کہ تم سنو تو ہوش اُڑ جائیں۔ تب ہی تو اس قدر ڈرتی ہوں۔"

حضور بیگم نے اپنی بات ختم ہی کی تھی کہ طلعت آرا کمرے میں داخل ہوئی۔ اُس نے جُھک کر ارجمند سلطانہ کو آداب کیا۔ قریب آئی۔ ارجمند سُلطانہ نے شفقت سے سر پر ہاتھ پھیرا مسکرا کر بولیں۔ "تم اب تک کہاں چھپی بیٹھی تھیں۔ کیا پھوپھی جانی نے مجھ سے پھر تمھارا پردہ شروع کرادیا؟" اُنھوں نے مڑ کر حضور بیگم کی جانب شوخی سے دیکھا۔

حضور بیگم تو چُپ رہیں، مگر طلعت آراء نے تخت پر بیٹھتے ہوئے وضاحت کی۔ "میں تو آپ کو آداب کرنے ایک بار پہلے بھی حاضر ہوئی تھی۔ مگر آپ وکیل صاحب سے بات کرنے دیوان خانے تشریف لے گئی تھیں۔"

"تم کو دیکھنے کے لیے تو طبیعت اس قدر بے چین تھی کہ تمھارے پاس آنے کو جی چاہتا تھا۔"

"تو پھر آپ چلی کیوں نہ آئیں۔" طلعت آراء نے سادگی سے کہا۔ "رانی بجیا آپ سے ملنے اور بات کرنے کو تو بہت جی چاہتا ہے۔" اُس نے قدرے توقف سے استفسار کیا۔ "اب تو آپ کھانا کھا کر ہی جائیں گی نا؟"

"اے بیٹی، تم نے کمال کر دیا۔" حضور بیگم نے نرمی سے طلعت آرا کو ڈانٹا۔ "اس روز نہار مُنہ چلی گئیں۔ کیا آج بھوکا بھیجنے کا ارادہ ہے؟"

"نہیں اماں جان، رانی بجیا آج کھانا کھائے بغیر نہیں جاسکتیں۔" طلعت آرا نے صفائی پیش کی۔ "میں تو چاہتی تھی کہ کھانے سے فارغ ہو کر رانی بجیا کو اپنے کمرے میں لے جاؤں گی۔ وہاں آرام بھی کریں گی۔" اُس نے مُڑ کر ارجمند سلطانہ کو دیکھا۔ "چلے گیئں نا میرے ساتھ؟"

ارجمند سلطانہ تو چاہتی بھی یہی تھیں۔ مسکرا کر گویا ہوئیں۔ "آئی تو میں اس

ارادے سے تھی کہ جلد چلی جاؤں گی، مگر تم نے اس محبت سے روکا ہے تو اب شام کو واپس جاؤں گی۔" اُنھوں نے مسکراتے ہوئے مُڑ کر طلعت آرا کی جانب دیکھا۔ "لو بھئی، اب تو خوش ہو۔"

طلعت آرا نے کچھ کہنا چاہا، مگر کہہ نہ سکی۔ اسی اثنا میں ایک پیش خدمت نے کمرے میں داخل ہو کر اطلاع دی کہ دسترخوان بچھایا جا چکا ہے۔ حضور بیگم مسہری سے نیچے اُتریں۔ ارجمند سلطانہ اور طلعت آرا بھی اُٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔ تینوں کمرے سے نکل کر نشست گاہ میں پہنچیں، اور دسترخوان کے قریب جا کر بیٹھ گئیں۔ خادماؤں نے ان کے پہنچتے ہی کھانا چُن دیا۔

کھانے کے دوران میں زیادہ بات چیت نہ ہوئی۔ صرف حضور بیگم بولتی رہیں، اور وہ بھی کھانے کے بارے میں۔ اُنھوں نے اصرار کر کے ارجمند سُلطانہ کو کچھ زیادہ ہی کھلا دیا۔

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد ارجمند سلطانہ حسبِ وعدہ طلعت آرا کے ہمراہ اس کے کمرے کی جانب روانہ ہوئیں۔ حضور بیگم اب ارجمند سلطانہ پر اس قدر مہربان ہو گئی تھیں کہ طلعت آرا کے ساتھ جانے پر منہ بگاڑنے کے بجائے خوش نودی کا اظہار کیا۔ حالانکہ پچھلی جمعرات سے قبل وہ طلعت آرا کو ارجمند سلطانہ کے سامنے ہرگز نہ آنے دیتی تھیں۔ نامحرموں کی مانند سخت پردہ کراتی تھیں۔

ارجمند سلطانہ اور طلعت آرا کے جانے کے بعد حضور بیگم بھی زیادہ نہ ٹھہریں۔ اب دسترخوان اُٹھایا جا چکا تھا۔ ایک خادمہ نے چاندی کا بھاری بھرکم پاندان لا کر رکھ دیا۔ مُغلانی نے پان لگا کر پیش کیا۔ حضور بیگم نے کلّے میں دبایا۔ چبایا اور پیکدان میں پیک تھوکی اور اُٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔ وہ اپنی خوابگاہ میں جا کر قیلولہ کرنا چاہتی تھیں۔

☆

ارجمند سلطانہ مسہری پر لیٹی تھیں۔ وہ بیٹھ کر طلعت آرا سے بات کرنا چاہتی

تھیں۔ ایک خادمہ نے اُن کے بیٹھنے کے لیے کرسی بھی لاکر کمرے میں رکھ دی تھی، مگر طلعت آرا نے جب بہت اصرار کیا تو وہ بستر پر جاکر دراز ہوگئیں۔ طلعت خود تخت پر گاؤ تکیہ کے سہارے بیٹھی رہی۔

باہر صحن میں رم جھم مینہ برس رہا تھا۔ بارش رفتہ رفتہ تیز ہوتی جارہی تھی چھت پر موٹی، موٹی بوندیں گرنے کی آواز کمرے میں صاف سُنائی دے رہی تھی۔ ارجمند سلطانہ نے کروٹ بدلی۔ اب اُن کا رُخ طلعت آرا کی جانب تھا۔ اُنھوں نے طلعت آرا کو مخاطب کیا۔

"طلعت آرا، معلوم ہوتا ہے باہر تیز بارش ہورہی ہے۔ یہ ساون کا مہینہ ہے نا؟"

"جی ہاں، آج تو تیز بارش ہورہی ہے۔" طلعت آرا نے ان کی تائید کی۔

ارجمند سلطانہ چند لمحے اُس کے چہرے کو بغور تکتی رہیں، پھر اُنھوں نے اچانک سوال کیا۔ "ایک بات تم سے پوچھنا چاہتی ہوں۔ دیکھو، سچ سچ جواب دینا۔ اس بات میں کہاں تک صداقت ہے کہ تم نے مقدمے کے کاغذات توشہ خانے سے نکال کر کہیں اور پہنچا دیے؟"

طلعت آرا اس سوال کے لیے ذہنی طور پر بالکل تیار نہ تھی۔ وہ ہکا بکا ہوکر ان کا مُنہ تکنے لگی۔ اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔

"اگر تم مجھ کو اس حقیقت سے آگاہ نہ کروگی، تو نہ صرف مقدمہ خراب ہو جائے گا، بلکہ ایسی پریشانیاں پیدا ہوجائیں گی، جن کا تم کو کوئی اندازہ نہیں۔"

"کیا مقدمے کے کاغذات کے بارے میں امّاں جان نے آپ کو بتایا ہے؟" طلعت آرا نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں، ان کو تو تم پر شبہ بھی نہیں۔" ارجمند سلطانہ نے کھُل کر بات کی۔ "مجھے تو اُس نے بتایا ہے، جس کو کاغذات کی صندوقچی تم نے پہنچائی ہے۔"

"آپ کا اشارہ شہزادہ گُل رُخ کی جانب ہے۔" طلعت آرا گھبرائی ہوئی تھی۔

"اگر اُنھوں نے آپ کو یہ بات بتائی ہے تو یہ بھی بتایا ہوگا کہ ان کی ہدایت پر ہی

میں نے ایسا کیا تھا۔ اُنھوں نے کہا تھا کہ کاغذات محفوظ نہیں ہیں، کسی بھی وقت ان کی چوری ہو سکتی ہے۔ جلد سے جلد لا کر مجھے دے دو تا کہ میں ان کو پرستان لے جاؤں اور حفاظت سے رکھ دوں۔ وہاں کوئی پہنچ ہی نہ سکے گا۔" وہ بغیر پوچھے خود ہی، ایک ایک بات بتانے لگی۔ "آپ کو کیسے بتاؤں کہ میں نے کس مشکل سے ان کو حاصل کیا۔ اماں جان سے ڈر بھی لگتا تھا۔ کنجی ہی حاصل کرنا آسان نہ تھا۔ ان کی غیر موجودگی میں چپکے سے تکیے کے نیچے سے کنجی نکالی۔ جب وہ حضرت عباس علمدار کی درگاہ جمعرات، کو گئیں تو میں نے ڈرتے، ڈرتے توشہ خانے کا دروازہ کھولا۔ اندر گئی۔ صندوقچی نکالی اور دوپٹے کی آڑ میں چھپا کر اپنے کمرے میں لے گئی۔ خیریت یہ ہوئی کہ مُغلانی یا سنجو کی نظر نہ پڑی۔ کسی خادمہ نے بھی نہ دیکھا۔ اسی طرح چھپا کر اوپر لے گئی۔"

"مگر تم نے یہ نہ سوچا کہ مقدمہ ابھی چل رہا ہے، کسی بھی وقت کاغذات کی ضرورت پڑ سکتی ہے،" ارجمند سلطانہ نے قدرے تیکھے لہجے میں کہا۔ "تم نے آنکھ بند کر کے شہزادہ گُل رُخ کے حکم کی تعمیل کر دی۔ اب جو ان کاغذات کی شدید ضرورت ہے، تم ہی بتاؤ کہاں سے مہیّا کر کے وکیل صاحب کو دیے جائیں۔" اُنھوں نے گہری سانس بھری۔ "طلعت، تم نے یہ اچھا نہیں کیا۔"

"رانی بجیا! مجھے شہزادہ گُل رخ سے بہت ڈر معلوم ہوتا ہے۔" طلعت آرا کے چہرے پر خوف کے سائے پھیل گئے۔ "اور ان کے غلام، عنبر کو تو دیکھتے ہی میرے ہوش و حواس اُڑ جاتے ہیں۔ ایسا خوفناک ہے کہ میں آپ سے کیا عرض کروں؟ اُس کی باتیں سُن کر دل اور بھی لرز جاتا ہے۔" اس نے سہمے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔ "آپ نے اُسے بھی دیکھا تھا؟"

"اُسے بھی دیکھا تھا، اور اُس کے آقا، شہزادہ گُل رخ کو بھی۔" ارجمند سلطانہ نے طلعت آرا پر اپنی دلیری کا سکّہ جمانے کے لیے سخن سازی سے کام لیا۔ "میں نے نہ صرف دونوں کو دیکھا تھا، بلکہ گفتگو بھی کی تھی۔" حالانکہ اُنھوں نے آغا جانی کو نہ عنبر کے رُوپ میں دیکھا تھا نہ اُس سے بات کی تھی۔ دروازے کے باہر صرف اُس کی آواز سُنی تھی۔

"آپ کو ڈر نہیں معلوم ہُوا؟" طلعت آرا نے حیران و پریشان ہو کر اپنے ردِ عمل کا اظہار کیا۔ "عنبر تو آپ کو دیکھ کر ضرور خفا ہوا ہو گا۔ نجّو بتاتی تھی کہ اُسے تو دیکھتے ہی ایسا غضبناک ہوا کہ ہنٹر مار، مار کر اُس کی کھال اُدھیڑ ڈالی۔"

"اُسے معلوم تھا کہ میں نجّو نہیں، رانی حیدر گڑھ ہوں۔" ارجمند سلطانہ اُٹھ کر بیٹھ گئیں۔ "اچھا یہ بتاؤ، شہزادہ گُل رخ کو دیکھ کر اب تم کو خوف نہیں معلوم ہوتا؟" اُنھوں نے ٹوہ لگانے کی کوشش کی۔ "آئندہ اگر شہزادہ گُل رُخ سے تمھاری کبھی ملاقات نہ ہو۔ نہ تم اسے دیکھ سکو نہ بات کر سکو تو تم کیا محسوس کرو گی؟" ارجمند سُلطانہ نے اس بار ذرا کھُل کر بات کی۔ "سچ، سچ بتانا تم کو اس کی یاد تو نہیں ستائے گی؟ مجھے صاف، صاف بتاؤ؟"

مگر طلعت آرا، نے کچھ نہ بتایا۔ سر جھکائے بیٹھی رہی۔ ارجمند سلطانہ نے اصرار کیا تو اس نے دبی زبان سے صرف اتنا کہا۔ "مجھے نہیں معلوم۔" اُس کا چہرہ، یاسے سُرخ ہو گیا۔ نظریں بدستور جھکی رہیں۔

"اگر شہزادہِ گُل رُخ کے ساتھ تمھاری شادی ہو جائے تو تم منظور کر لو گی؟" ارجمند سلطانہ نے اصرار کیا۔ "بولو، جواب دو۔ اگر تم نے میری بات کا جواب نہ دیا، تو میں تمھاری کوئی مدد نہ کر سکوں گی۔"

"وہ تو جن ہیں۔ جن تو آتشی ہوتے ہیں۔" طلعت آرا نے گول مول جواب دیا۔

"مان لو وہ بھی ہماری تمھاری طرح انسان ہوں۔" ارجمند سلطانہ اُسے توہّم پرستی کے حصار سے رفتہ رفتہ باہر لانا چاہتی تھیں۔ مگر اس کوشش سے پہلے وہ یہ اندازہ لگانا چاہتی تھیں کہ حضور بیگم کے مقابلہ میں وہ خود کس حد تک جن اور آسیب کے وہم میں مُبتلا ہے۔

"مگر وہ انسان کب ہوتے ہیں؟ وہ تو انسانی رُوپ اختیار کر لیتے ہیں۔" طلعت آرا نے اپنے خدشات کا بھی اظہار کیا۔ "رانی بجیا! وہ تو رہتے بھی پرستان میں ہیں۔" طلعت آرا نے یہ بات اتنی سادگی سے کہی کہ اس کی معصومیت اور سادہ لوحی

پر ان کو پیار آ گیا۔ وہ زیرِ لب مسکرا کر بولیں۔ "اگر وہ یہیں رہتے ہوں اور ہمیشہ یہیں رہیں، تب تمھارا جواب کیا ہوگا؟" ارجمند سلطانہ سربستہ راز پر سے ایک کے بعد دوسرا پردہ اٹھانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ اگر قیصر مرزا سے اُس کی شادی ہو جائے اور وہ دُولھا بن کر سامنے آئے تو اُسے دیکھ کر طلعت آرا خوف سے چیخنے چلّانے نہ لگے۔ بے ہوش نہ ہو جائے بلکہ ذہنی طور پر کسی حد تک اُس کے لیے تیار ہو۔

"لیکن ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟" طلعت آرا نے تعجب کا اظہار کیا۔ "یہ ناممکن ہے۔"

"اور اگر یہ ممکن ہوُا۔" ارجمند سلطانہ مسکراتیں رہیں۔

"نہیں رانی بجیا، یہ نہیں ہو سکتا۔ مجھے یقین نہیں آتا۔" طلعت آرا سخت تذبذب کے عالم میں تھی۔ "آپ مجھے صاف صاف بتائیے کہ جب آپ اُوپر گئیں تو کیا ہوُا؟"

مگر ارجمند سلطانہ نے اُسے مزید کچھ نہ بتایا۔ وہ جس حد تک آگے جا چکی تھیں، اس سے آگے جانا نہ چاہتی تھیں۔ ان کو خدشہ تھا کہ اگر کھُل کر سب کچھ بتا دیا گیا تو بات بننے کی بجائے بگڑ بھی سکتی تھی۔ طلعت آرا کو تو اعتماد میں لے کر وہ قائل بھی کر سکتی تھیں، لیکن حضور بیگم کو مطمئن کرنا بہت دُشوار تھا۔ ان کے ذہن سے جن اور آسیب کا وہم نکالنا ناممکن تھا۔ البتہ قیصر مرزا کے ساتھ طلعت آرا کی شادی کے لیے اُن کو آمادہ کرنا ممکن تھا۔ وہ سر جھُکا کر حضور بیگم کے بارے میں سوچنے لگیں۔

(۹)

بارش اب تھم گئی تھی، مگر ہوُا تیز تھی۔ حضور بیگم سو کر اُٹھ چکی تھیں اور اپنے کمرے میں بیٹھی مغلانی سے باتیں کر رہی تھیں۔

"وزیرن کا نام تو تم نے بھی سُنا ہوگا۔" حضور بیگم نے استفہامیہ نظروں سے مغلانی کو دیکھا۔

"سرکار! مَیں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔" مغلانی نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔

"حیرت ہے تم وزیرن کو نہیں جانتیں۔ ایک زمانے میں تو اس کا بڑا شہرہ رہا ہے۔ ہمارے میکے میں ایک محل دارنی تھیں، افروزی خانم، میں نے جب اُن کو دیکھا تو بہت بوڑھی ہو چکی تھیں۔ دکھائی بھی بہت کم دیتا تھا۔ کام کاج تو کچھ کرتی نہیں تھیں۔ کبھی کبھار امّاں جان کے پاس جا کر بیٹھ جاتیں اور اُن کا دل بہلانے کے لیے دنیا جہاں کے قصّے مزے لے لے کر سُناتی رہتیں۔ واجد علی شاہ کے محل سے وابستہ رہ چکی تھیں۔ معلوم نہیں کیا تھیں۔ کنیزوں میں شامل ہوں گی۔ اب تو ان کو مرے ہوئے بھی مدّت ہو گئی۔ وہ امّاں جان کو بتاتی تھیں کہ ولیعہدی کے زمانے میں غلام رضا خاں نے وزیرن کو معروضہ بنا کر بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ غلام رضا خاں گویّا تھا اور پری خانے میں داخل ہونے والیوں کو گانے ناچنے کی تعلیم دیتا تھا۔ اس کی دو بہنیں، امّن و امامن بھی پری خانے کی منتظمین میں پیش پیش تھیں۔ وہ بھی ناچنے گانے والیاں تھیں۔ فرخ آباد کی رہنے والی تھیں۔"

"سرکار! پری خانے کا ذکر پہلے بھی سُن چکی ہوں، یہ تھا کیا؟" مغلانی نے دریافت کیا۔

"یوں سمجھ لو، ولی عہدی کے زمانے میں، واجد علی شاہ نے دِل بہلانے کے لیے پری خانے کے نام سے ایک عشرت کدہ بنا رکھا تھا۔" حضور بیگم نے مغلانی کو آگاہ کیا۔

"افروزی خانم بتاتی تھیں کہ پری خانے کے لیے خوبصورت اور نوجوان لڑکیاں ڈھونڈ، ڈھونڈ کر لائی جاتی تھیں۔ رات دن ناچ گانے کی محفلیں جمی رہتی تھیں۔ جو لڑکیاں پری خانے میں نئی، نئی داخل ہوتیں اور ناچ گانے سے واقف نہ ہوتیں، ان کی تعلیم و تربیت کے لیے باقاعدہ گویّے ملازم تھے۔ نجم النسا بیگم، جو ولی عہد کے محل میں دارو غہ تھیں، پری خانے کی نگراں تھیں، واجد علی شاہ کی جاں نثار اور راز دار تھیں۔ امّن و امامن ان کی مددگار تھیں۔ ان کی ماں مجوّ بھی گانے والی تھی۔ باپ کا نام تھتّو تھا۔ ایک بھائی غلام علی اور دُوسرا غلام رضا تھا۔ گھمّن بہنوئی تھا۔ ولی عہد نے امّن و امامن کو مُنہ بولی بہن بنا لیا تھا۔ پری خانے کے لیے جو لڑکی لائی جاتی، اُسے معروضہ کہا جاتا تھا۔ اُن کا یہ نام خود ولی عہد

بہادر نے رکھا تھا۔ غلام رضا خاں کے علاوہ دوسرے خدمت گار بھی چھانٹ چھانٹ کر معروضے لاتے۔ ولی عہد کا دل خوش کرتے اور مُنہ مانگا انعام پاتے۔"

حضور بیگم اپنی دُھن میں بولتی رہیں۔ مُغلانی خاموشی سے سنتی رہیں مگر جب باتوں کی رَو میں حضور بیگم بہک کر دوسری طرف نکل گئیں تو مغلانی نے دبی زبان سے ٹوکا۔"حضور! آپ وزیرن کے بارے میں کچھ بتا رہی تھیں۔"

"ہاں میں اسی کے بارے میں بتا رہی تھی۔" حضور بیگم نے چونک کر مغلانی کی جانب دیکھا، پھر گویا ہوئیں۔"غلام رضا خاں نے وزیرن کو پیش کرنے سے پہلے اس کے حُسن کا ایسا نقشہ کھینچا کہ ولی عہد بن دیکھے اس پر فریفتہ ہو گئے، اور اس بُری طرح فریفتہ ہوئے کہ اس کے فراق میں سوز و گداز بھری ٹھُمریاں کہنے لگے۔ ہر وقت آہیں بھرتے۔ دن کا چین اور رات کی نیند جاتی رہی۔ نجم النساء بیگم سے ان کی یہ بے قراری دیکھی نہ گئی۔ ایک دن خود وزیرن کی ماں، بی جان کے گھر پہنچیں۔ امّن اور امامن بھی ہمراہ تھیں۔ بی جان سے اپنے آنے کا مقصد بیان کیا۔ وہ بڑی گھاگ تھی، صاف انکار کر دیا۔ اُس نے جو سوچا تھا، وہی ہوا۔ واجد علی شاہ ایسے دیوانے ہوئے کہ جانثاروں کو تشویش لاحق ہوئی۔ پلٹن کے سالار، بہادر الدولہ، دیوانِ عام کے کار پرداز، اکبر الدولہ، میر اکبر علی اور امیر الدولہ، بھی بی جان کے پاس پہنچے۔ مدّعا بیان کیا، مگر بی جان نے اُن کو بھی ٹھینگا دکھا دیا۔ صاف، صاف کہہ دیا کہ آئندہ اس ارادے سے اس کے در پر نہ آئیں۔ اِدھر ولی عہد کی حالت یہ ہوئی کہ دن رات وزیرن کی یاد میں آہیں بھرتے تھے۔"

"اے سرکار، بن دیکھے ایسے فریفتہ ہو گئے۔" مغلانی نے اپنے ردِّ عمل کا اظہار کیا۔" یہ کس طرح ممکن ہے۔ یقین نہیں آتا۔"

"یقین نہ آنے کی تو بات ہی ہے، مگر ہُوا ایسا ہی۔" حضور بیگم نے بتایا۔"ولی عہد کا یہ عالم تھا کہ کھانا پینا ترک کر دیا۔ گلزار منزل ان کا رہائشی محل تھا، اس کی ساری کھڑکیاں بند کیں اور اٹواٹی کھٹواٹی لے کر پڑ گئے۔"

"سرکار! ایسے واقعات تو پُرانے زمانے کے قصّے کہانیوں کے شہزادوں کے

بارے میں سُنتے تھے۔"

"افروزی خانم قسمیں کھا کھا کر یہی بتاتی تھیں۔ وہ گلزار محل سے وابستہ رہ چکی تھیں۔ انھوں نے تو سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔" حضور بیگم نے مغلانی کو یقین دلایا۔ "آخر غلام رضا خاں نے کچھ ایسا ایتھر پھینکا کہ وزیرن اس کے ہمراہ ولی عہد کے پاس، بی جان سے چھُپ کر جانے کے لیے آمادہ ہو گئی۔ غلام رضا خاں نے جب اُسے معروضہ بنا کر پیش کیا تو وزیرن نے ولی عہد کو اپنا نام ننھی جان بتایا۔" وہ آہستہ آہستہ پان چباتی رہیں اور سنبھل سنبھل کر بتاتی رہیں۔ "مزے کی بات یہ ہے کہ واجد علی شاہ کے چھوٹے بھائی، سکندر حشمت سے وزیرن کی پہلے ہی رسم و راہ تھی۔ اُن کے محل میں آنا جانا بھی رہتا تھا۔ وہاں بھی ناچ گانے کی محفلیں آراستہ ہوتی تھیں۔ وزیرن حسین ہونے کے ساتھ ساتھ ناچ گانے میں بھی طاق تھی۔ ایک رات شہزادہ سکندر حشمت نے بڑے بھائی کو بھی محفلِ رقص و سرود میں شرکت کے لیے بطورِ خاص مدعو کیا۔ ولی عہد محفل میں پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ننھی جان کا مجرا ہو رہا ہے۔ ولی عہد سخت حیرت زدہ ہوئے۔ اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ سکندر حشمت بہادر سے دریافت کیا۔ اس ناچنے والی کا نام کیا ہے؟ اُنھوں نے وزیرن نام بتایا۔ ولی عہد بہادر بہت چکرائے۔ پریشان ہو کر بولے۔ یہ تو ننھی جان ہے۔ اس معروضے کو تو غلام رضا خاں پری خانے کے لیے لایا تھا۔ میرے تو اس سے خاص مراسم ہیں۔ یہ وزیرن کب سے بن گئی؟ سکندر حشمت بھی اُن کی بات سن کر حیران و پریشان ہو گئے۔"

"حیران و پریشان ہونے کی بات ہی تھی۔" مُغلانی نے مسکرا کر کہا۔ "ایک ہی وقت میں دونوں بھائیوں کو اپنے جال میں پھنسایا۔ دیدہ دلیری کی حد ہو گئی۔"

"وزیرن کے کان میں دونوں بھائیوں کی گفتگو کی بھنک پڑ گئی۔ چہرہ فق ہو گیا۔ ایسی گھبرائی کہ محفل سے اُٹھ کر چلی گئی۔"

☆

بادل ایک بار زور سے گرجے اور موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔

مُغلانی خاموش بیٹھی سوچ رہی تھیں کہ حضور بیگم نے اب تک بادشاہ نصیر الدّین حیدر کا کوئی ذکر نہ کیا۔ وہ بات، بات پر اُن کا حوالہ ضرور دیتی تھیں۔ اُن کو توقع تھی کہ بادشاہ نصیر الدّین حیدر کا ذکر اب آیا ہی چاہتا ہے۔ آخر وہی ہوا جو مُغلانی کا قیاس تھا۔

"نہ ہوئے بادشاہ نصیر الدّین حیدر، اس چلتر بازی اور ہرجائی پن پر ایسی سخت سزا دیتے کہ عبرت ہوتی۔" حضور بیگم نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "ان کی ایک بہت حسین منظورِ نظر تھیں۔ ان سے محبّت بھی ٹوٹ ٹوٹ کر کرتے تھے۔ ٹھیک سے یاد نہیں۔ غالباً عمدہ بیگم نام تھا۔ وہ ہرجائی نکلیں۔ ایک شاہی دربان سے آشنائی کرلی۔ کسی نے مخبری کردی۔ راز کھلا تو بادشاہ اس قدر برہم ہوئے کہ ان کا سر منڈوایا۔ منہ کالا کیا اور ایک مہتر کے حوالے کرکے محل سے نکال باہر کیا۔"

"غضب خدا کا! اے حضور بادشاہ نصیر الدّین کا غصّہ تو قیامت کا تھا۔"

"نہ پوچھو کس قدر مغلوب الغضب تھے۔" حضور بیگم نے بتایا۔ "قدسیہ محل کا قصّہ تو میں نے تم کو بھی سنایا ہوگا۔"

"شاید سنایا ہو، مجھے یاد نہیں۔" مغلانی نے قدسیہ محل کے واقعہ میں دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے دریافت کیا۔ "ان پر کیا بیتی تھی؟"

"یہ جو کٹرہ وفا بیگ خاں ہے۔ قدسیہ محل کا تعلق انھی کے خاندان سے تھا۔ وہ قوم کے ترک تھے۔ اس حیثیت سے یہ بھی ترکی نژاد تھیں۔ شادی شدہ تھیں۔ میاں سے لڑ کر محل میں بادشاہ بیگم کے پاس ملازمت کے لیے آئیں۔ صورت شکل ایسی اچھی پائی تھی کہ بادشاہ سلامت دیکھتے ہی ان کے عشق میں مبتلا ہوگئے۔ اُن کو صاحبِ محل بنانا چاہتے تھے۔ مگر مشکل یہ درپیش ہوئی کہ شوہر کے ہوتے ہوئے یہ ممکن نہ تھا۔ ان کے شوہر کا نام مرزا بھجّو بیگ تھا۔ وہ طلاق دینے پر آمادہ نہ تھے۔ آخر حکیم مہدی علی خاں نے جو بادشاہ کے جاں نثار اور مقربِ خاص تھے، کسی نہ کسی طور مرزا بھجّو بیگ کو رام کیا۔ طلاق نامہ حاصل کیا۔ بادشاہ نے ان سے متعہ کیا۔ ملکۂ آفاق قدسیہ سلطان بیگم خطاب عطا فرمایا۔ مگر مشہور قدسیہ محل کے نام سے ہوئیں۔"

"تب تو وہ بہت اچھے خاندان کی تھیں۔" مغلانی نے حضور بیگم کی باتیں سن کر کہا۔
"وزیرن کی طرح ناچنے گانے والی طوائف نہ تھیں۔"
"بی مغلانی، تمھارا خیال بالکل درست ہے۔" حضور بیگم نے مغلانی کی تائید کی۔
"سُنا ہے نہایت اعلیٰ ظرف رکھتی تھیں۔ سخی ایسی تھیں کہ آتو جی کے بیٹے قادر علی خاں کو اس خدمت پر مقرر کیا کہ پانچ ہزار روپے ہر صبح غربا اور مومنین میں تقسیم ہوں۔ جب تک یہ خیرات تقسیم نہ ہو جاتی کھانے کی طرف ہاتھ بھی نہ بڑھاتی تھیں۔ ان کی فیاضی کی بدولت ہزاروں بن بیاہی لڑکیاں اپنے گھر بار کی ہو گئیں۔ بادشاہ ان کی محبت میں ایسے گرفتار تھے کہ ایک بار انھوں نے پشمینہ خانہ دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ بادشاہ کے حکم سے ایک علٰحدہ پشمینہ خانہ قائم ہوا۔ زمین سے چھت تک اُسے قیمتی سازوسامان سے بھر دیا گیا۔ سنا ہے ستّر لاکھ روپے خرچ ہوئے۔ قدسیہ محل اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔ مگر وہیں کھڑے کھڑے تمام پشمینہ، تمام سازوسامان نوکروں کو بخش دیا۔ تین برس میں تین کروڑ روپے نقد اسی طرح غربا اور حاجت مندوں میں تقسیم کر دیئے۔"
"سرکار! آپ کی باتیں سُن کر تو ایسا لگتا ہے قدسیہ محل، فیاضی میں تو گویا اپنے وقت کی حاتم طائی تھیں۔" مغلانی نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔ "ایسی غریب پرور ملکہ سے ایسی کیا غلطی سرزد ہوئی کہ بادشاہ کی نظروں میں موردِ عتاب ٹھہریں؟"
"ہوا یہ کہ بادشاہ سلامت کو ان دنوں اولاد کی بڑی تمنّا تھی۔" حضور بیگم نے تفصیل میں جانے سے گریز کیا۔ "خاصہ طول طویل قصّہ ہے۔"
"اے سرکار! ذری ہم بھی تو سنیں، آپ نے تو ادھوری بات بتا کر اشتیاق پیدا کر دیا۔" مغلانی کے رویّہ میں دلچسپی کے ساتھ، ساتھ عاجزی بھی تھی۔
"میں نے بتایا ناکہ بادشاہ کو اولاد کی بڑی تمنّا تھی۔ آتو جی دل سے قدسیہ محل کی جانثار اور بہی خواہ تھیں۔"
"حضور یہ آتو جی کون تھیں؟" مغلانی نے کرید کر دریافت کیا۔
"راجہ جھاؤلال نے اپنے گھر میں ایک طوائف ڈال لی تھی۔ اس کا نام نجبن

تھا۔ یہ جو جھاؤ لال کا پُل ہے، انھی کا بنوایا ہوا ہے۔" حضور بیگم نے بتایا۔" آتو جی ایک زمانے میں سنجبن کی خواصوں میں شامل رہ چکی تھیں۔ پانڈے صاحب رائے سے ان کی آشنائی تھی۔ اس سے دو بیٹے بھی پیدا ہوئے۔ قادر علی خاں، جو قدسیہ محل کی جانب سے روزانہ پانچ ہزار روپے غربا اور مومنین میں تقسیم کرتا تھا، آتو جی کے انھی بیٹوں میں سے ایک تھا۔"

"مگر آتو جی شاہی محل میں کیسے پہنچیں؟"

"جب راجہ جھاؤ لال پر ادبار آیا اور پریشاں حالی کا شکار ہوئے تو سارا کارخانہ بگڑ گیا۔ سنجبن کے عیش و آرام میں بھی فرق آیا۔ رنڈی بھلا کب بُرے وقت میں ساتھ دیتی ہے۔ اس نے راجہ جھاؤ لال سے مُنہ موڑا اور اشرف آباد کے ایک کائستھ سے تعلق پیدا کرلیا جو راجہ جھاؤ لال کا رشتہ دار تھا۔ آتو جی پر بھی بُرا وقت آیا۔ انھوں نے کسی نہ کسی طرح روشن الدولہ کے گھر میں رسائی حاصل کی۔ بات چیت، رکھ رکھاؤ بڑا شائستہ تھا۔ باتیں ایسی کرتی تھیں کہ ہر ایک کو اپنا گرویدہ بنا لیتیں۔ بادشاہ ان دنوں قدسیہ محل کے ساتھ رہتے تھے۔ ان کو رات بھر جاگنے کی عادت تھی اور ایک ایسی عورت کی ضرورت تھی جو رات بھر دلچسپ قصّے کہانیاں سُنا کر ان کا دل بہلائے۔ روشن الدولہ کو یہ اطلاع ملی تو انھوں نے بادشاہ کے مقربِ خاص، حکیم مہدی علی خاں سے آتو جی کا ذکر کیا۔" حضور بیگم ٹھہر ٹھہر کر بولتی رہیں۔" حکیم مہدی علی آتو جی سے ملے تو ان کے بات کرنے کا انداز بہت پسند آیا۔ انھوں نے آتو جی کو محل میں پہنچا دیا۔ حکیم مہدی ان سے مخبر کا کام لینا چاہتے تھے۔ وہ تو انھوں نے کیا نہیں۔ البتہ بادشاہ اور قدسیہ محل کے مزاج میں اس قدر دخل پیدا کرلیا کہ جب تک یہ نہ ہوتیں بادشاہ کھانا نہ کھاتے۔ محل سرا میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے آتو جی کو طلب کرتے۔"

"تب تو وہ بہت ہی سمجھ دار اور خوش گفتار ہوں گی۔" مغلانی نے تبصرہ کیا۔

"ایسا نہ ہوتا تو یہ قربت اور یہ مرتبہ کیسے حاصل کرتیں۔"

حضور بیگم نے مغلانی سے اتفاق رائے کیا۔" ہاں! تو میں یہ بتا رہی تھی کہ یہ قدسیہ محل

کی بڑی ہمدرد اور جاں نثار تھیں۔ قدسیہ محل کو بادشاہ کی نظروں میں افضل قرار دینے کے لیے انھوں نے ایک انوکھا نسخہ تجویز کیا۔ قدسیہ محل کو اس ڈھرّے پر لگانا چاہا کہ وہ خفیہ طور پر کسی اور سے تعلق پیدا کرلیں تاکہ اُمید سے ہوجائیں۔ مقصد ان کا یہ تھا کہ نطفہ کسی اور کا اور نام بادشاہ سلامت کا ہو۔"

"سرکار! یہ تو خیر خواہی نہ ہوئی۔ یہ تو بُرے راستے پر ڈالنا ہوا۔" مغلانی نے تیکھے لہجے میں اپنے ردّعمل کا اظہار کیا۔ "قدسیہ محل نے اسے کیسے قبول کرلیا؟ اُنھیں اپنی عزّت و ناموس کا ذرا خیال نہ آیا۔"

"مگر قدسیہ محل نے یہ تجویز قبول ہی کب کی۔ صاف انکار کردیا۔" حضور بیگم نے وضاحت کی۔ "لیکن آتو جی بھی اپنی دُھن کی پکّی تھیں۔ اُنھوں نے ہمت نہ ہاری۔ برابر اس کوشش میں لگی رہیں کہ قدسیہ محل کو اپنے ڈھب پر لے آئیں۔ آخر وہ اپنی کوشش میں کامیاب بھی ہوگئیں۔ مگر قدسیہ محل کسی غیر کے بجائے اپنے سابقہ شوہر، مرزا بھجّو بیگ سے تعلق پیدا کرنے پر راضی ہوئیں۔ وہ ان دنوں لکھنؤ میں موجود نہ تھا۔ گرفتاری کے خوف سے بھاگ کر کانپور چلا گیا تھا جو انگریزوں کی عملداری میں تھا۔ اسے تلاش کیا گیا۔ بھاری رقم کا لالچ دے کر ہموار کیا گیا۔ تحفے تحائف کی آڑ میں اسے ایک مقفّل صندوق میں بند کرکے محل سرا میں پہنچایا گیا۔ وہ کئی مہینے محل میں روپوش رہا۔ آخر قدسیہ محل اُمید سے ہوگئیں۔ بھجّو بیگ جس طرح خفیہ طور پر محل سرا میں داخل ہوا تھا اسی طرح واپس کانپور پہنچا دیا گیا۔ یہ ساری کارروائی اس قدر رازداری سے ہوئی کہ آتو جی اور چند نہایت بھروسے کے ملازمین کے علاوہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔"

حضور بیگم نے قدرے توقف کیا۔ "مگر وہ جو کسی نے کہا ہے کہ بُرے کام کا بُرا انجام ہوتا ہے۔ وہی مثال قدسیہ محل پر صادق آئی۔ آٹھواں مہینہ تو تم جانتی ہی ہو کہ زچّہ پر بھاری ہوتا ہے۔ کوئی ایسی بداحتیاطی ہوئی کہ حمل ساقط ہوگیا۔"

"حضور! آپ نے بالکل درست فرمایا۔ برائی کیسی بھی ہو، کبھی راس نہیں آتی۔"

"اب تم آگے کا حال سنو۔" حضور بیگم نے کہا۔ "بادشاہ سلامت تو خوشی سے

سے نہال ہو رہے تھے۔ اولاد کی تمنّا میں ایک ایک دن گنتے تھے۔ یہ خبر وحشت اثر ان کو ملی تو صدمے سے بُرا حال ہوا۔ کسی نے ان کے کان میں پھُسک دیا کہ یہ ساری کارستانی، پیاری نامی محل دارنی کی ہے۔ اس نے جادو ٹوٹکا کر کے حمل ساقط کرا دیا۔ بادشاہ یہ سنتے ہی ایسے جلال میں آئے کہ شمشیر برہنہ ہاتھ میں لیے محل سرا میں پہنچے۔ پیاری کو دیکھتے ہی شمشیر کا ایسا تلا ہوا ہاتھ مارا کہ اس کی گردن بھٹّا سی اُڑ کر دُور جا گری۔"

"قدسیہ محل سے بادشاہ نے کوئی باز پرس نہ کی؟" مغلانی نے پوچھا۔

"ان سے کیا باز پرس کرتے۔ ان کے کرتوتوں پر تو پردہ پڑا ہوا تھا۔ بادشاہ تو یہی سمجھتے تھے کہ نطفہ انھی کا تھا۔ اِدھر آتو جی تھیں کہ اپنی کارگزاری دکھانے پر تلی ہوئی تھیں۔ اُنھوں نے قدسیہ محل کو پھر بہلا پھسلا کر دھڑّے پر لگایا۔ بھجّو بیگ کو دوبارہ کانپور سے بلا کر محل سرا میں پہنچایا۔ اس دفعہ اس کے ٹھہرنے کے لیے دلکشا کوٹھی کا انتخاب کیا۔ قدسیہ محل ان دنوں وہیں فروکش تھیں۔" حضور بیگم نے مغلانی کی جانب دیکھا۔ انھوں نے فوراً پان کی گلوری پیش کی۔

حضور بیگم نے گلوری کلّے میں دبائی۔ سلسلۂ گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "قدسیہ محل پر ان دنوں بادشاہ ایسے فریفتہ تھے کہ ہر دم زبان پر انھی کا نام رہتا تھا۔ یہی چاہ ان کی بربادی کا باعث ہوئی۔ قدسیہ محل کے خلاف دوسری بیگمات اور منظورِ نظر خواصوں کے دل میں حسد پیدا ہونا فطری امر تھا۔ بیگمات تو خاموش تماشائی بنی اندر ہی اندر سلگتی رہیں۔ لیکن ایک مُنہ چڑھی خواص نے، جو اس راز سے کسی طرح واقف ہو گئی تھی، ایک رات خلوت میں بادشاہ سے جان کی اماں مانگی اور سب کچھ ان کے گوش گزار کر دیا۔ نورن دائی کا حوالہ دیا کہ اُسے ہر بات کا رتّی رتّی علم ہے۔ بادشاہ سخت غضبناک ہوئے۔ نورن دائی سے تصدیق چاہی لیکن آتو جی اور ان کے کارپرداز بھی کم کائیاں نہ تھے۔ انھوں نے بھجّو بیگ کے ساتھ نورن دائی کو بھی راتوں رات محل سرا سے نکال کر کانپور پہنچا دیا۔ نورن دائی کی ڈھنڈیا پڑی مگر وہ موجود ہوتی

تو ملتی۔"

"بادشاہ سلامت نے اس بار بھی قدسیہ محل سے کوئی باز پرس نہیں کی؟"
مغلانی نے کرید کر پوچھا۔

"مجھے یہ تو نہیں خبر کہ حضرت سلامت نے قدسیہ محل سے کسی قسم کی باز پرس
کی کہ نہیں۔ مگر اتنا ضرور علم ہے کہ بادشاہ کا دل ایسا پھر گیا کہ ان کی جانب توجہ ہی دینا
چھوڑ دی۔ قدسیہ محل نے جب یہ دیکھا کہ بادشاہ نے ان کے پاس آنا جانا بالکل ترک
کر دیا تو ایک رات خود ان کے پاس پہنچیں۔ خلوت گاہ میں داخل ہونے کا ارادہ کیا۔
بادشاہ نے انھیں دیکھ کر نفرت سے منہ پھیر لیا۔ بگڑ کر بولے۔ اب مجھے تم سے کوئی
سروکار نہیں۔ واپس چلی جاؤ۔ قدسیہ محل نے لاکھ صفائی پیش کی۔ لیکن بادشاہ کے
دل کا غبار صاف نہ ہوا۔ قدسیہ محل نے دل برداشتہ ہو کر جان کی بازی لگانے کی
دھمکی دی۔ عرض کیا۔ میں نے حضور سے ہمیشہ اپنا یہ عہد دہرایا ہے کہ جس روز آپ
کی نگاہ میری طرف سے پھر گئی اسی روز اس دنیا میں نہ رہوں گی۔ اپنی جان حضور
پر نچھاور کر دونگی۔ بادشاہ کا دل پھر بھی نہ پسیجا۔ بے نیازی سے فرمایا۔ میں نے تو
کوئی ایسا محبت کا دم بھرنے والا نہیں دیکھا جو میری محبت کی خاطر جان قربان
کر دے۔ کہتے تو بہتوں کو سُنا۔ لیکن مرتے کسی کو نہ دیکھا۔ قدسیہ بیگم نے بادشاہ
کا یہ جواب سنا تو دنیا اندھیر ہو گئی۔"

"سرکار! قدسیہ محل نے پھر کیا کیا؟" مغلانی نے بے چین ہو کر پوچھا۔

"وہ بھی اپنی بات کی دُھنی تھیں۔ اپنی ایک خواص سے زہر منگوایا۔ اُسی
روز غسل کیا۔ نئی پوشاک پہنی۔ پچاس ہزار روپے اور کئی ہزار اشرفیاں توشہ خانے
میں موجود تھیں۔ ساری رقم نکلوائی۔ بھجو بیگ سے جو بیٹا تھا اسے بلوایا۔ چار ہزار
روپے دے کر اسے سینے سے لگایا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ بیٹے کو رخصت
کیا۔ اور تمام روپیہ اور اشرفیاں نوکروں میں تقسیم کر دیں۔" حضور بیگم آہستہ آہستہ
بولتی رہیں۔ "اس کام سے فارغ ہونے کے بعد اپنے خاص کمرے میں پہنچیں۔ نور زری سے

جو ان کی جاں نثار خواص تھی، پینے کے لیے پانی طلب کیا۔ پانی آیا تو اُسے سامنے رکھا۔ پسا ہوا زہر ہتھیلی پر رکھ کر پھانکا اور پانی پی لیا۔ ذرا ہی دیر بعد تیورا کر فرش پر گریں۔ زہر نے اپنا کام کیا۔ خواصوں نے دوڑ کر اٹھایا اور بستر پر لٹا دیا۔ اس وقت وہ بیہوش تھیں۔ محل میں کھلبلی مچ گئی۔ بادشاہ کو خبر پہنچی۔ فوراً قدسیہ محل کے پاس گئے۔ طبیبوں کو طلب کیا۔ مگر قدسیہ محل کو ہوش نہ آیا۔ زہر پورے جسم میں سرایت کر چکا تھا۔ انھوں نے جو کہا تھا کر دکھایا۔ بادشاہ کو اُن کی موت کا سخت صدمہ ہوا۔ ان کے سوگ میں سیاہ ماتمی لباس پہنا۔ ایک عرصہ تک ان کا نام لے لے کر آنسو بہاتے تھے۔ عالم وحشت میں ویرانے کی طرف نکل جاتے تھے۔" حضور بیگم نے تامل کیا۔ " اب اندوہ و ملال کرنے سے کیا ہوتا۔ جو ہونا تھا، ہو گیا۔"

مغلانی کے چہرے پر غم کا سایہ پھیل گیا۔ چند لمحے خاموش رہیں، پھر بجھے ہوئے لہجے میں بولیں۔ " قدسیہ محل، واقعی اپنے قول کی دھنی تھیں۔"

" اس میں کیا شک ہے۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ جیسا کیا تھا اس کی سزا پائی۔" حضور بیگم نے کہا۔ " ان کی توقع تھی کہ آخر وقت پر شاید بادشاہ کا دل پسیج جائے۔ مگر وہ بھی بڑے ضدی اور ہٹیلے تھے۔"

" ہٹیلے بھی تھے اور غصہ بھی غضب کا تھا۔" مغلانی نے تبصرہ کیا۔ " جس پر عتاب نازل ہوتا ہو گا اس کے لئے تو قیامت آجاتی ہو گی۔"

" نہ پوچھو، غصے کا کیا عالم تھا۔" حضور بیگم نے بتایا۔ " ان کے غصے کے بارے میں تم سے کیا کیا بتاؤں۔ ایک رات بزم نشاط میں خوب شراب لنڈھائی گئی۔ کچھ خواصوں کی کم بختی جو آئی تو اتنی چڑھا گئیں کہ نشہ میں ہوش ٹھکانے نہ رہے۔ بدمستی میں بادشاہ سے بھی گستاخی کی۔ ایسی آپے سے باہر ہوئیں کہ آپس میں دھینگا مشتی کرنے لگیں۔ کسی نے سارنگی اٹھائی، کسی نے اسے بجاتے کا گز سنبھالا۔ کوئی طبلے پر جھپٹی کوئی پکھاوج پر۔ کسی نے کوئی اور ساز اُٹھایا۔ جو جس کے ہاتھ آیا اُٹھا اُٹھا کر ایک دوسرے پر مارا۔ گانے بجانے کے سارے ساز ٹوٹ پھوٹ گئے۔ ایسی

قیامت برپا کی کہ کئی خواصیں اور گانے والیاں زخمی ہو گئیں۔ اور یہ سب کچھ بادشاہ کے روبرو ہوا۔"

"حضور! ان شفتلوں کے یہ کرتوت دیکھ کر تو بادشاہ غصّے سے دیوانے ہو گئے ہوں گے۔" مغلانی نے منہ بگاڑ کر اپنی جھنجھلاہٹ کا اظہار کیا۔

"ایسے غضب ناک ہوئے کہ سب کو ایک کوٹھری میں بند کر دیا۔ قفل ڈلوایا اور کنجی اپنے پاس رکھ لی۔" حضور بیگم نے مغلانی کو بتایا۔ "گرمیوں کے دن تھے۔ حبس سے ان بدبختوں کا دم گھٹنے لگا۔ پیاس ایسی شدّت کی لگی کہ تڑپنے لگیں۔ بہت فریاد کی۔ کوئی ان کی مدد کر بھی کیا سکتا تھا۔ کنجی بادشاہ کے پاس تھی اور ان کے غصّے سے سب ڈرتے تھے۔ کسی کی مجال تھی کہ قفل توڑنے کی ہمت کرتا۔ آخر صبح جب بادشاہ بیدار ہوئے اور کوٹھری کا قفل کھولا گیا تو سب مردہ پڑی تھیں۔"

"اے حضور! یہ تو غصّہ نہ ہوا، جبر و ستم ہوا۔"

"نہ پوچھو غصّے میں کیسے دیوانے ہو جاتے تھے۔ کسی سے ناراض ہو جاتے تو کوئی سفارش نہ سنتے۔ کتنوں کو تو غیظ و غضب کے عالم میں زندہ درگور کروا دیا۔ محل کی کوئی خواص یا منظورِ نظر، ہرجائی پن کرتی تو راز کھل جانے پر درشن بلاس کی دیوار میں زندہ چنوا دیتے تھے۔ کہاں تک بیان کروں کہ غصّے میں دیوانے ہو کر کیسی کیسی لرزہ خیز سزائیں دیتے تھے۔ سنو تو رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔" حضور بیگم نے قدرے تامّل کیا۔ "صرف جان ہی لینے پر اکتفا نہ کرتے تھے۔ گھر تک کھدوا دیتے۔ اس طرح اُس کا نام و نشان مٹا دیتے کہ کھنڈر بھی باقی نہ رہتا تھا۔"

☆

"واجد علی شاہ تو ایسا نہ کرتے تھے۔ میں نے اُن کے بارے میں ظلم و ستم کا ایسا کوئی واقعہ نہیں سنا جیسے بادشاہ نصیر الدین حیدر کے متعلق بیان کیے جاتے ہیں۔"

"وہ تو بہت بھولے تھے۔ کسی سے خفا بھی ہوتے تو بعد میں معاف کر دیتے۔"

حضور بیگم نے مغلانی کی تائید کی۔ "پری خانے میں جو طوائفیں داخل ہوتی تھیں، دھوکے فریب سے کس کس طرح نہ لوٹتی تھیں۔ اب ان بی وزیرن ہی کو لے لو۔ ان کی بے وفائی آشکارہ ہوتے پر بھی کسی برہمی کا اظہار نہ کیا۔ الٹا اس کو منانے کے لیے ایک رات پالکی میں خفیہ طور پر سوار ہو کر محل سے نکلے۔ وزیرن کا مکان گولہ گنج میں عظیم اللہ کمیدان کے گھر کے قریب واقع تھا۔ وہ چھپ کر نجم النساء کے ساتھ کمیدان کے گھر پر پہنچے۔ نجم النساء منت سماجت کر کے وزیرن کو بلا کر لائیں۔ واجد علی شاہ نے، جو ان دنوں ولی عہد تھے، وزیرن کو محبت سے پاس بٹھایا۔ شکوہ و شکایت کا دفتر کھل گیا۔ وزیرن پھر محل میں پہنچنے لگی۔ کچھ عرصہ بعد نجم النساء اور امن دامن نے ایک نیا معروضہ پیش کیا۔ اس کا نام منّا تھا۔ وزیرن نے سنا تو جل کر آگ بگولہ ہو گئی۔ پہلے تو اسے کچہری صدر میں کوتوال سے ساز باز کر کے گرفتار کروا دیا مگر میر مہدی کے ذریعہ اُسے رہائی نصیب ہوئی۔ ولی عہد بہادر کے پہلو میں اسے دیکھ کر وزیرن ایسی سیخ پا ہوئی کہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محل چھوڑ دیا۔ کتنوں ہی سے مراسم پیدا کئے۔ ولی عہد بہادر کو دونوں ہاتھوں سے لوٹا تھا۔ دولت میں کھیلتی تھی۔ ایک نہیں کئی خصم کئے۔ آخر طوائف تھی نا۔"

"حضور! گستاخی معاف۔" مغلانی نے نہایت ادب سے کہا۔ "میں نے سُنا ہے کہ طوائف حضرت محل بھی تھیں۔"

"اُے بالکل تھیں۔ عمدہ خانم طوائف کی نوچی تھیں۔ امراؤ نام تھا۔" حضور بیگم نے مغلانی کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ "واجد علی شاہ کے پری خانے میں داخل ہوئیں تو مہک پری کہلائیں۔ ان سے جب ایک بیٹا پیدا تو اس وقت بھی واجد علی شاہ ولی عہد تھے۔ ان کے والد، بادشاہ امجد علی شاہ حیات تھے۔ ان کو یہ اطلاع ملی تو بہت خوش ہوئے۔ پوتے کا نام برجس قدر رکھا۔ ان کو حضرت محل کا خطاب عطا ہوا۔ خطاب کے ساتھ تنخواہ بھی مقرر ہوئی۔ باقاعدہ صاحب محل کا درجہ حاصل ہوا۔ خاص محل تو اعظم بہو تھیں۔ وہ درجہ تو کسی بیگم کو نہ ملا۔" انھوں نے مڑ کر مغلانی کی

جانب دیکھا۔ "تم کو خاص محل اور صاحب محل کا فرق معلوم ہے؟"

"نہیں سرکار!" مغلانی نے صاف گوئی سے اپنی لاعلمی کا اعتراف کیا۔

"وہ بیگم جو سہرے جلوے کے ساتھ بیاہ کر آتیں، خاص محل کہلاتی تھیں۔ دوسری تمام بیگمات خواہ نکاحی ہوں یا مُتاعی صاحب محل کہلاتی تھیں۔"

"سرکار! غدر میں تو حضرت محل نے بڑا نام پیدا کیا۔" مغلانی نے اظہار رائے کیا۔ "انگریزوں کے تو انھوں نے چھکے چھڑا دیئے۔ بڑی بہادری سے لڑیں۔"

"اے کیا خاک لڑیں۔ اپنے بیٹے برجس قدر کو اودھ کا بادشاہ بنانا چاہتی تھیں۔" حضور بیگم کے لہجے میں تلخی تھی۔ "ادھر وہ مُوا احمد اللہ شاہ تھا جو ڈنکہ شاہ کہلاتا تھا۔ اس کے سر میں بھی بادشاہ بننے کا خناس سمایا۔ سر پر تاج رکھا۔ اپنی بادشاہت کا اعلان کیا۔ اپنے نام کا سکہ جاری کیا۔ مگر انجام کیا ہوا۔ راجہ پوایاں کے ہاتھوں مارا گیا۔ راجہ نے سر کاٹ کر ایک رومال میں لپیٹا، شاہجہاں پور پہنچا۔ انگریز مجسٹریٹ کو کٹا ہوا سر پیش کیا۔ وہ اس قدر خوش ہوا کہ اس خدمت کے صلہ میں راجہ پوایاں کو ۵۰ ہزار روپے انعام دیا اور ڈنکہ شاہ کا سر کوتوالی کے پھاٹک پر لٹکا دیا۔ انگریزوں کے خلاف بغاوت اور سرکشی کرنا ہنسی ٹھٹھا نہیں تھا۔ ان کے پاس توپیں تھیں، بندوقیں تھیں۔ ادھر ان کے پاس کیا تھا۔ ایکا بھی نہ تھا۔ ہر ایک اپنی فکر میں لگا تھا۔ چپکے چپکے ایک دوسرے کی کاٹ کرتا تھا۔"

"یہ تو میں نے بھی سُنا ہے سرکار۔" مغلانی نے اتفاق رائے کیا۔

"تب ہی تو حضرت محل نے بھی شکست پر شکست کھائی۔ کسی نہ کسی طور بھاگ کر نیپال میں پناہ لی۔ مہاراجہ نیپال نے حضرت محل اور ان کے بیٹے برجس قدر کے سوا کسی کو بھی اپنی سلطنت کی حدود میں داخل نہ ہونے دیا بلکہ انگریزوں کو فوجی کمک بھی پہنچائی۔ وہ انگریزوں سے جنگ کرنے کا خطرہ کیوں مول لیتا۔" حضور بیگم بتاتی رہیں۔ "حضرت محل کے پاس جو ہیرے جواہرات تھے، وہ اپنے قبضے میں کیئے اور معمولی سا وظیفہ مقرر کر دیا۔ بڑی کسمپرسی کے عالم میں بے چاری نے

انتقال کیا اور وہیں دفن ہوئیں۔ والدہ کے مرنے کے بعد برجیس قدر کلکتہ پہنچے۔ جن انگریزوں کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تھا انھی سے پنشن کی درخواست کرتے تھے۔"
مغلانی خاموش رہیں۔ حضور بیگم بولتی رہیں۔ اچانک ان کا لہجہ تلخ ہوگیا "حضرت محل نے یہ بہادری دکھائی، خود تو جان بچا کر صاف نکل گئیں۔ ان کے کیے کی سزا دوسروں کو بھگتنی پڑی۔ پندرہ روز تک شہر لٹتا رہا۔ گول دروازے کے مہاجنوں نے تو رشوت دے کر اپنا محلہ بچا لیا۔ سعادت گنج بھی نہ جانے کیسے بچ گیا۔ بقیہ شہر کا یہ حال ہوا کہ انگریز، سکھ اور گورکھے سپاہی مکانوں کے بند دروازے توڑ کر گھس جاتے۔ تن پر تا بت لباس بھی نہ چھوڑا۔ کپڑوں میں جو گوٹا کناری لگا تھا، اسے جلا کر چاندی سونا نکالا۔ زیورات میں سے جواہرات اکھیڑ کر الگ کیے گئے۔ لوٹ کا یہ عالم تھا کہ درگاہ حضرت عباس علمدار بھی لوٹ مار سے محفوظ نہ رہ سکی۔ لوٹ کا مال کوڑیوں کے مول بکا۔ مہاجنوں نے سونا روپے تولہ خریدا۔ برقندازوں کے سامنے جو آیا تہہ تیغ ہوا، گولی سے اڑا دیا گیا۔ نہ کسی کی جان محفوظ رہی نہ عزت وآبرو۔"
"درست فرما رہی ہیں سرکار۔" مغلانی نے حضور بیگم کی تائید کی۔ "میری نانی اماں تو غدر میں ادھر ہی تھیں۔ سن تو زیادہ نہ تھا۔ مگر اتنا شعور تھا کہ ہر بات سمجھتی تھیں۔ وہ بتایا کرتی تھیں کہ عیش باغ میں پھانسیاں گڑی تھیں۔ روزانہ سیکڑوں پھانسی کے پھندے پر لٹکائے جاتے۔ انگریزوں کی فوج کے سپاہی دندناتے ہوئے گھروں میں گھس جاتے۔ ان کے ہاتھوں کسی کی بیٹی بہو کی عزت محفوظ نہیں تھی۔ نہ جانے کتنے گھروں میں لڑکیوں اور نوجوان عورتوں سے کنوئیں پٹ گئے۔ عزت کی خاطر انھوں نے مرنا گوارہ کیا۔" مغلانی نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "مگر حضور! یہ سب اپنے اعمالوں کا نتیجہ تھا۔ بادشاہ اور ان کے امراء ایسے عیش وعشرت میں پڑے کہ آنکھوں پر پردے پڑ گئے اور واجد علی شاہ نے تو حد کردی تھی۔ جو بھی عورت نظر آئی، دل دے بیٹھے۔ اس سے غرض نہیں کہ کالی ہے یا گوری۔ کون ہے، کس ذات کی ہے۔ مہترانی کو دیکھا تو اسی پر فدا ہوگئے۔ متعہ کیا، مصفّا محل خطاب دیا۔ بہشتن کو آب رساں

محل کا خطاب دیا۔ وہ بھی شاہی بیگمات کے زمرے میں شامل ہو گئیں۔"
"اس عیش و عشرت میں نہ پڑتے تو انتزاع سلطنت کیوں ہوتا۔" حضور بیگم نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ہمارے جدامجد کو تخت و تاج مل جاتا تو آج یہ دن دیکھنا نہ پڑتا۔" انھوں نے آہ سرد کھینچی۔ "بی مغلانی! تم کو تو معلوم ہی ہے کہ میں کتنے اعلیٰ اور بڑے خاندان سے تعلق رکھتی ہوں۔"

☆

حضور بیگم کو اپنے اعلیٰ حسب نسب اور خاندانی وجاہت پر بڑا ناز تھا۔ خود کو اودھ کے شاہی خاندان کا فرد بتاتی تھیں اور بڑے فخر سے اس کا اظہار بھی کرتی تھیں۔ ان کے والد رشتے میں کیوان جاہ کے پوتے تھے۔ کیواں جاہ کی والدہ ملکہ زمانی تھیں جو بادشاہ نصیرالدین حیدر کی چہیتی بیگم تھیں۔
مغلانی کو حضور بیگم کی خاندانی وجاہت کے بارے میں بخوبی علم تھا۔ انھیں اپنی ملازمت عزیز تھی۔ لہٰذا دم نہ مار سکتی تھیں۔ صرف ہاں میں ہاں ملا سکتی تھیں۔ وہ کیوان جاہ اور اُن کی والدہ ملکہ زمانی کے بارے میں بہت کچھ سُن چکی تھیں اور جو نہیں سنا تھا وہ نواب صفی کی بیگم انجمن آرا نے سنا دیا تھا۔ انہیں بھی اپنے خاندانی افتخار کا بڑا مان تھا۔ بات بات پر جتاتی تھیں کہ وہ واجد علی شاہ کی بھانجی یعنی امجد علی شاہ کی نواسی ہیں۔ اس رشتے کو حضور بیگم بھی تسلیم کرتی تھیں لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتاتی تھیں کہ ایک کنجڑن، واجد علی شاہ کے والد امجد علی شاہ کی منظور نظر ہو کر محلات میں شامل ہو گئی تھی۔ نام تو اس کا کریمن تھا مگر متعہ کرنے کے بعد بادشاہ سلامت نے امتیاز محل خطاب عطا کیا تھا۔ حضور بیگم کے بیان کے مطابق وہی کنجڑن، انجمن آرا کی نانی تھی۔
یہ عقدہ کشائی اس وقت شروع ہوئی جب جٹھانی دیورانی میں اس قدر ناچاقی پیدا ہو گئی کہ دونوں ایک دوسرے کے خون کی پیاسی ہو گئیں۔ وہ ان کے خاندان میں اور یہ ان کے خاندان میں کیڑے نکالتیں اور اپنی بڑائی ہانکتیں۔ اس طرح مغلانی کو

دونوں کی اصلیت سے آگاہ ہونے کا بخوبی موقع ملا۔ ان کو معلوم تھا کہ ملکہ زمانی کا نام حسینی خانم تھا۔ دہلی کی رہنے والی تھیں۔ باپ کندھے پر مشک لٹکائے کٹورا بجا بجا کر چاندنی چوک میں پانی پلاتے تھے۔ فقر و فاقہ کی زندگی بسر کرتے تھے۔ حسینی خانم پندرہ برس کی تھیں کہ دلاور خاں نامی ایک پٹھان سپاہی زاد سے شادی ہو گئی۔ وہ تلاشِ معاش میں دہلی سے بنارس چلا گیا۔ حسینی خانم بھی شوہر کے ہمراہ بنارس پہنچیں۔ بعد میں ان کے دو بھائی بھی بنارس پہنچ گئے۔ ایک کا نام وارث علی خاں اور دوسرے کا فتح علی خاں تھا۔ بہنوئی کے تعلق سے انھوں نے بھی اپنے نام کے ساتھ "خان" کا اضافہ کر لیا تھا۔

بنارس میں بھی زندگی بڑی عُسرت اور تنگ دستی میں کٹ رہی تھی۔ لہٰذا حسینی خانم ایک طبیب کے گھر میں خادمہ مقرر ہو گئیں۔ تنخواہ کچھ نہ تھی۔ صرف دو وقت کا کھانا ملتا تھا اور پہننے کو اُترن مل جاتی تھی۔ مگر یہ ملازمت زیادہ عرصہ برقرار نہ رہ سکی۔ جس طبیب کی ملازم تھیں ان کا ہاتھ بھی تنگ رہتا تھا۔ حالات اتنے خراب ہو گئے کہ ایک روز ان کو ملازمت سے جواب مل گیا۔ ملازمت ختم ہونے کے بعد فاقوں کی نوبت آگئی۔ شوہر سخت نکھٹو اور ہڈ حرام تھا۔ ظالم اس قدر تھا کہ آٹھ آٹھ چوٹ مارتا تھا۔ غصّے میں روئی کی طرح دُھنک کر رکھ دیتا تھا۔

آخر میاں سے لڑ جھگڑ کر قسمت آزمائی کے لئے لکھنؤ چلی گئیں۔ یہاں ایک فیل بان سے آشنائی ہو گئی۔ اس نے انھیں گھر میں ڈال لیا۔ فیل بان سے دو اولادیں بھی ہوئیں۔ ایک لڑکا تھا دوسری لڑکی تھی۔ لڑکے کا نام زنیب تھا۔ جن دنوں بیٹی پیدا ہوئی اتفاق سے اسی زمانے میں شاہی محل میں شہزادہ منّا جان کی بھی ولادت ہوئی۔ ان کو دودھ پلانے کے لئے ایک دایہ کی ضرورت ہوئی۔ ایک خواص کے وسیلے سے حسینی خانم، محل میں پہنچیں۔ بادشاہ غازی الدین حیدر کا عہد حکومت تھا۔ ان کی خاص محل، بادشاہ بیگم، نے حسینی خانم کو شہزادہ منّا جان کی دایہ مقرر کر دیا۔

محل میں کھانے پینے کو عمدہ غذا ملی۔ فراغت اور آسودگی نصیب ہوئی تو

حسینی خانم نے کینچلی بدلی۔ جوانی پر ایسا نکھار آیا کہ انگ انگ پھڑکتا تھا۔ صورت شکل پہلے ہی اچھی تھی۔ رنگ بھی کھلتا ہوا تھا۔ اب ایسا کھِلا کہ رُخساروں پر تازہ گلاب مہکتے تھے، آنکھوں میں کہکشاں اُتر آئی تھی۔ ایسی حسین اور طرح دار ہو گئیں کہ جدھر سے گزرتیں، دیکھنے والی نظریں دُور تک تعاقب کرتیں۔ نصیر الدین حیدر اس وقت ولی عہد تھے۔ چڑھتی جوانی تھی۔ مزاج بھی عاشقانہ پایا تھا۔ ان پر ایسے فریفتہ ہوئے کہ بیشتر وقت محل میں گزرنے لگا۔

نصیر الدین حیدر کی وارفتگی کا جب محل میں چرچا عام ہوا تو اس کی بھنک معتمد الدولہ آغا میر کے کانوں میں بھی پڑی۔ وہ بادشاہ غازی الدین حیدر کے وزیر تھے۔ انھوں نے ولی عہد کی خوش نودی حاصل کرنے کے لیے حسن باغ میں عیش و عشرت کا سامان مہیا کیا۔ شہزادہ نصیر الدین حیدر کے ہمراہ حسینی خانم کو وہاں پہنچایا۔ حسینی خانم کے بناؤ سنگار کے لیے لباسِ فاخرہ اور مرصّع زیورات مہیّا کیے۔ حسینی خانم سولہ سنگار کر کے اس اندازِ دل ربائی سے ولی عہد کے رو برو آئیں کہ وہ دل تھام کر رہ گئے۔ ان کے ہر انداز میں لگاوٹ تھی، عشوہ تھا۔ ولی عہد ان کی ہر ادا پر شیفتگی کا اظہار کرتے۔ اس ملاقات سے مراسم بڑھے، اور اتنے بڑھے کہ شہزادہ نصیر الدین حیدر نے حسینی خانم سے متعہ کر لیا۔ اس طرح حسینی خانم کو ولی عہد کی بیگم کا مرتبہ حاصل ہو گیا۔

حسینی خانم کے دن پھرے اور ایسے پھرے کہ ان کا اقبال بلند سے بلند تر ہوتا گیا۔ نصیر الدین حیدر ان کے والہ و شیدا تھے۔ پل بھر ان کے بغیر قرار نہ تھا۔ اسی زمانے میں بادشا غازی الدین حیدر ۱۴ برس اودھ پر حکمرانی کرنے کے بعد خلد آشیانی ہوئے۔ نصیر الدین حیدر ان کے جانشین مقرر ہوئے۔ اس وقت ان کی عمر ۲۵ برس تھی۔ انھوں نے لباسِ فاخرہ زیب تن کیا۔ تاج مرصّع سر پر رکھا۔ موتیوں کا ہار گلے میں ڈالا جس میں یاقوت اور زمرد بھی پروئے ہوئے تھے۔ اس سج دھج اور آن بان سے وہ تختِ شاہی پر جلوہ افروز ہوئے۔

یہ وہی تخت تھا جو غازی الدین حیدر نے بادشاہ کا مرتبہ حاصل کرنے کی خوشی

میں دو کروڑ روپے کی لاگت سے بنوایا تھا۔ ان سے پہلے اودھ کے حکمراں نواب کہلاتے تھے اور بادشاہ دہلی کے وزیر سمجھے جاتے تھے۔ اس تخت کی تزئین اور آرائش میں لعل، زمرد، یاقوت اور فیروزے کے چار حاشیے بنائے گئے۔ پکھراج، مروارید اور مونگے، کاریگروں نے اس ہنرمندی سے ان حاشیوں میں آویزاں کئے تھے کہ ان کی تزئین اور تابندگی دیکھ کر تاروں بھرے آسمان کا گمان ہوتا تھا۔ تخت پر سرخ مخمل کی مسند تھی اور اوپر کلابتو کی ڈوریوں سے کسا ہوا زربفت کا شامیانہ تھا۔ جس کی جھالر میں موتی اور مقیش ٹنکے تھے۔ تخت کی چوبیں سونے اور چاندی کی تھیں۔

بادشاہ نصیرالدین حیدر کے سر کے عین اوپر جواہر سے مرصع سونے کا چھتر تھا۔ سامنے ۴۰ گز لمبا اور ۲۰ گز چوڑا ایک اور کارچوبی شامیانہ استادہ تھا جس کے نیچے خوبصورت اور عشوہ طراز طوائفیں، چمکتے دمکتے لباس اور زیورات سے آراستہ ہو کر رقص کرتی تھیں۔ طبلہ ٹھنکتا تھا۔ گھنگرو چھنکتے تھے۔ پکھاوج، مندل، رباب اور دوسرے سازوں سے نغمے پھوٹتے تھے۔ معتمدالدولہ آغامیر نے ریذیڈنٹ موردنٹ رکیٹ کے لیے زرنگار کرسی لگوائی۔ ریذیڈنٹ بہادر اس پر تشریف فرما ہوئے۔ معتمدالدولہ آگے بڑھے اور پائے وزارت پر اس طرح مؤدب ہو کر کھڑے ہو گئے کہ نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ دونوں ہاتھ آگے باندھے ہوئے تھے۔ گردن میں ہلکا سا خم تھا۔ دائیں طرف صمصام الدولہ کھڑے مگس رانی کرتے تھے اور بائیں طرف مہاراجہ میوارام مورچھل ہلاتے تھے۔ میتابیگ کوتوال نے قرنا پھونک کر بادشاہ کی تخت نشینی کی منادی کرائی۔

تین روز تک جشن جلوس کا سلسلہ جاری رہا اور ہر روز محفل رقص و سرور کا اہتمام ہوتا۔ نصیرالدین حیدر نے تخت و تاج سنبھالتے ہی پہلے روز حسینی خانم کو ملکۂ زمانی کا خطاب عطا کیا۔ پرگنہ، مرہٹہ پروا، تعلقہ، چکلہ بیسواڑہ، کی جاگیر مرحمت کی جس کی آمدنی چھ لاکھ روپے تھی۔ حسینی خانم کے بھائی، وارث علی خاں اور فتح علی خاں کو اس جاگیر کا منتظم اعلیٰ مقرر کیا گیا۔ دونوں کو خلعت ہائے فاخرہ دے کر اعزاز بخشا گیا۔ حسینی خانم کے بیٹے، زینب کو کیوان جاہ کا خطاب عطا ہوا۔ منا جان

کو فریدوں بخت کا خطاب ملا اور خلعت ولی عہدی پہنا کر طلائی کرسی پر بٹھایا گیا۔

☆

تخت نشینی سے قبل حسینی خانم کے علاوہ بادشاہ نصیر الدین کی کوئی اور بیگم نہ تھی۔ منّا جان کی ماں بھی ایک خواص تھی۔ حسینی خانم ترقّی کر کے منّا جان کی دایہ سے بیگم اور پھر ملکۂ زمانی بنیں تو ان پر بادشاہ کی عنایات خسروانہ میں روز بروز اضافہ ہی ہوتا گیا۔ نواب آصف الدولہ کی والدہ بہو بیگم کا خزانہ، جو بادشاہ غازی الدین حیدر کے عہد حکمرانی میں ضبط ہو کر فیض آباد سے لکھنؤ آیا تھا، تیس لاکھ روپے سے اوپر تھا اور ابھی تک محفوظ رکھا تھا۔ یہ خزانہ ملکۂ زمانی کو دے دیا گیا۔ اس کے علاوہ وہ لاکھوں روپے بھی ان کی تحویل میں دیئے گئے جو تاج الدین خاں نے اپنے عہد نظامت میں غلام حسین خاں، چکلہ دار سلطان پور، کی متروکہ املاک سے ضبط کر کے بادشاہ غازی الدین حیدر کو پیش کئے تھے اور ابھی تک ویسے ہی رکھے تھے جیسے آئے تھے۔

ملکۂ زمانی پر بادشاہ کی نوازشات کا یہ عالم تھا کہ روزانہ مروارید اور زر و جواہر سے لبریز کشتیاں پیش کی جاتیں۔ اسی طرح ہیرے جواہر اور اشرفیوں سے بھری ہوئی تھیلیاں ہاتھیوں پر لد کر آتیں اور ملکۂ زمانی کی تحویل میں دیدی جاتیں۔

ملکۂ زمانی کا ایسا طنطنہ اور کرّوفر تھا کہ جب ان کی سواری بادبہاری محل سے نکلتی تو دو سو ہاتھی طلائی اور نقرئی ہودوں اور کارچوبی جھولوں سے آراستہ آگے آگے ہوتے۔ ملکۂ زمانی سونے چاندی سے مرصّع گنگا جمنی سکھ پال میں گاؤ تکیہ کے سہارے جلوہ افروز ہوتیں۔ دو خواصیں ان کے دائیں بائیں بیٹھی مورچھل سے مگس رانی کرتی رہتیں۔ سکھ پال پر زربفت کا پردہ پڑا ہوتا۔ سکھ پال کی پشت پر خواجہ سرا زرنگار چھتر اٹھائے موجود ہوتا۔ دائیں بائیں چوب دار ہوتے۔ سکھ پال کے پیچھے دو بُرجی رتھوں میں مغلانیاں اور خواصیں موجود ہوتیں۔ سواری کے جلوس میں خواجہ سراؤں اور مہریوں کا اس قدر ہجوم ہوتا کہ راستے بند ہو جاتے۔ کسی سواری کو گزرنے کے

لئے راستہ نہ ملتا۔

ملکۂ زمانی کی سواری کے جلوس کی اس شان و شوکت اور ان کے جاہ و حشم کے بارے میں حضور بیگم بارہا مغلانی کو بتا چکی تھیں۔ انھوں نے یہ سب کچھ اپنے والد بزرگوار سے سُنا تھا۔ جو نہایت فخر سے اپنی پردادی، ملکۂ زمانی، کا ذکر خیر کرتے تھے مسّرت اور افتخار محسوس کرتے تھے۔

ملکہ زمانی کے دونوں بھائیوں کا طنطنہ بھی کم نہ تھا۔ وہ شاہانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ عیش و عشرت کا یہ عالم تھا کہ شب و روز بزم آرائیاں ہوتیں۔ سو، سو طائفے ناچنے گانے والیوں کے ان کا دل بہلانے کو حاضر رہتے۔ شراب کا دور چلتا اور طبلہ کی تھاپ اور گھنگروؤں کے چھناکے پر گل رُخ اور خوش ادا رقاصائیں لہرا لہرا کر رقص کرتیں۔ نامی گرامی گویّے نغمہ سرائی کرتے۔ ان کا دسترخوان بادشاہ سے کم شاندار نہ ہوتا۔ انواع و اقسام کے کھانے چنے جاتے اور ایک وقت میں پچاس، پچاس مصاحبین اور مقرّبین شریکِ طعام ہوتے۔ ان کے ارد گرد ہردم زہرجبیں اور نوخیز حسیناؤں کا جمگھٹا ہوتا۔

بادشاہ نصیرالدین حیدر نے نہ صرف ملکۂ زمانی کے بھائیوں کو عروج بخشا بلکہ ان کے بیٹے کیوان جاہ کو شاہی فوج کا جرنیل بنادیا۔ ملکہ زمانی نے صرف اسی پر اکتفا نہ کیا، وہ اپنے بیٹے کو مستقبل کے بادشاہ کے روپ میں دیکھنا چاہتی تھیں۔ وہ اسے ولی عہد کا مرتبہ دلانے کے لئے تگ و دَو کرنے لگیں اور اس کوشش میں اس حد تک کامیاب بھی ہوگئیں کہ فریدوں بخت منّا جان رفتہ رفتہ بادشاہ کی شفقت سے محروم ہوتے ہوگئے اور کیوان جاہ زنیب کی جانب ان کا التفات بڑھتا گیا۔

کیوان جاہ پر بادشاہ نصیرالدین حیدر کا التفات اس قدر بڑھا کہ دربار میں اپنے برابر ولی عہد کی کرسی پر بٹھاتے۔ وہ فریدوں بخت کے بجائے کیوان جاہ کو ولی عہد بنانے کے لئے سنجیدگی سے غور کرنے لگے۔ مگر جس طرح بادشاہ کا تقرّر انگریز

گورنر جنرل کی اجازت اور مرضی کے بغیر ممکن نہ تھا اسی طرح ولی عہد کے تقرّر کے لئے بھی گورنر جنرل کی اجازت ضروری تھی۔ چنانچہ جب یہ چرچا عام ہوا کہ بادشاہ اپنا جانشین کیوان جاہ کو بنانا چاہتے ہیں تو انگریز افسران کو تشویش لاحق ہوئی۔ اسی دوران میں ریذیڈنٹ مورڈنٹ کیٹ کا تبادلہ ہو گیا۔ اس نے میر منشی غلام حسین کے ذریعے خوب رشوت کھائی تھی لہٰذا ہر معاملہ میں چشم پوشی سے کام لیتا تھا۔

کمپنی کی جانب سے مورڈنٹ کی جگہ مسٹر نادک کو قائم مقام ریذیڈنٹ مقرّر کیا گیا۔ وہ پروانۂ تقرّری ملنے کے بعد کلکتہ سے لکھنؤ پہنچا۔ اس نے خفیہ طور پر کیوان جاہ کے بارے میں تحقیقات کی۔ مدارالمہام رام دیال کو اعتماد میں لے کر اصل حقیقت معلوم کرنا چاہی۔ ساتھ ہی تاکید کی کہ بادشاہ کو یہ راز معلوم نہ ہو۔ مگر رام دیال نے وفاداری کا ثبوت دیا۔ بادشاہ کو سارا ماجرہ سُنا کر خبردار کر دیا۔ انھوں نے چند ہی روز بعد رزیڈنٹ نادک کو طلب کیا۔ وہ کیوان جاہ کو ولی عہد بنانے پر تلے ہوئے تھے لہٰذا رزیڈنٹ کے سامنے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔ اسے یقین دلانے کی غرض سے گویا ہوئے۔

"جناب رزیڈنٹ بہادر! اگر آپ کیوان جاہ کے متعلق تحقیق کرنا چاہتے ہیں تو لازم تھا کہ ہم سے رجوع کیا جاتا۔ اولاد کی پیدائش کے بارے میں باپ سے زیادہ کون جانتا ہے۔ کیوان جاہ میرا فرزند ہے۔ اس کی ماں میری متوعہ ہے۔ خلد آشیانی حضرت بادشاہ غازی الدین حیدر اور جنّت مکانی حضرت بادشاہ بیگم کے خوف سے پردہ پوشی سے کام لیا گیا جیسے ہی یہ علم ہوا کہ وہ امید سے ہے، ہم نے اسے علیحدہ مکان میں منتقل کر دیا۔ کچھ عرصہ بعد کیوان جاہ پیدا ہوا مگر تمام رازداری کے باوجود حضرت بادشاہ بیگم کو یہ اطلاع مل گئی۔ انھوں نے یہ مناسب نہ سمجھا کہ شہزادے کی پرورش غیر جگہ ہو۔ یہ شاہی وقار کے منافی تھا۔ چنانچہ ملکۂ عالیہ نے شہزادے اور اُس کی ماں کو محل میں بلا لیا۔ مصلحت اندیشی کے تحت شہزادے کی ماں کی بابت یہ مشہور کر دیا گیا کہ اسے دایہ مقرّر کیا گیا ہے۔ اس کلام میں کسی مبالغہ آرائی کو مطلق دخل نہیں۔"

بادشاہ نصیر الدین حیدر نے محض کیوان جاہ کو اپنی جائز اولاد ثابت کرنے کی

غرض سے صریحاً دروغ گوئی سے کام لیا تھا ورنہ یہ حقیقت ڈھکی چھپی نہ تھی کہ کیوان جاہ زینب ایک فیل بان کے بیٹے تھے اور بیب حسینی خانم، شاہی محل میں آئیں تو ان کے ساتھ ہی آئے تھے۔ اس حقیقت کی سُن گن رزیڈنٹ نادک کو بھی مل چکی تھی لیکن اس کی تصدیق نہ ہو سکی تھی۔ چنانچہ بادشاہ نے کیوان جاہ کے متعلق تفصیل سے صفائی پیش کی تو اس نے خاموشی سے اسے تسلیم کر لیا۔ مصلحت کا تقاضہ بھی یہی تھا کہ فی الوقت اس معاملہ کو بڑھایا نہ جائے، درگزر سے کام لیا جائے۔ اس کا نیا تقرر ہوا تھا اور وہ مستقل بھی نہ تھا۔ ویسے اسے یہ علم تھا کہ فریدوں بخت منا جان بھی ایک خواص، سکھ چین، کے بیٹے تھے۔ خود بادشاہ نصیر الدین حیدر ایک خواص، صبح دولت کے بیٹے تھے۔ غازی الدین حیدر کی خاص محل بادشاہ بیگم کے بطن سے تخت و تاج کا کوئی وارث نہ تھا۔ فطرتاً نہایت مغلوب الغضب بھی تھیں۔ چنانچہ نصیر الدین حیدر کی پیدائش پر وہ حسد سے اس قدر برافروختہ ہوئیں کہ صبح دولت کو قتل کروا دیا اور اس کی لاش جھانکڑ باغ میں دفن کرا دی۔ وہ نصیر الدین حیدر کو بھی گلا گھونٹ کر پیدا ہوتے ہی ہلاک کر دینا چاہتی تھیں مگر فیض النسا مغلانی نے منت سماجت کر کے کسی نہ کسی طور اس اقدام سے باز رکھا۔

ملکۂ زمانی کا عروج روز بروز بڑھتا گیا۔ نصیر الدین حیدر ان کے ایسے گرویدہ تھے کہ جو کہتیں وہ کرتے۔ بادشاہ کی ان بے پناہ عنایات اور ناز برداری نے ملکۂ زمانی کے کتنے ہی مخالف اور حاسد پیدا کر دیئے۔ ان میں بعض وزراء اور امراء پیش پیش تھے۔ دوسری محلات تھیں، جو رقابت کی آگ میں اندر ہی اندر سلگتی تھیں۔ ملکۂ زمانی اب واحد بیگم نہ تھیں۔ ان کے علاوہ بیاہتا بیوی، سلطان بہو، تھیں جو مغل شہزادے سلیمان شکوہ کی بیٹی تھیں۔ ولایتی محل تھیں، تاج محل تھیں، پھول محل تھیں۔ سلطان محل، بادشاہ محل، قدسیہ محل، عباسی محل، آفتاب محل، مہتاب محل اور صاحب محل تھیں۔ تاج محل، سلطان محل اور بادشاہ محل طوائفیں رہ چکی تھیں۔ آفتاب محل اور مہتاب محل ایک ڈھاڑی کی بیٹیاں تھیں۔ صاحب محل مہترانی رہ چکی تھیں۔

مغلانی کو اس حقیقت کا علم ہوتا کہ بادشاہ نصیر الدین حیدر کی محلات میں ایک مہترانی بھی شامل تھیں تو وہ واجد علی شاہ کی مصفّا محل کے بارے میں حضور بیگم کے سامنے ہرگز اظہار نہ کرتیں۔ اس لئے کہ مصفّا محل بھی مہترانی رہ چکی تھیں۔

بادشاہ نصیر الدین کی ایک بیگم، کنگال محل بھی تھیں جو کم عمر تھیں اور غضب کی حسین تھیں۔

وہ باقر علی خاں، سابق چکلہ دار، روہیلکھنڈ، کی دختر نیک اختر تھیں۔ نصیر الدین حیدر ان سے عقد کرنے کے لئے باقاعدہ سہرا باندھ کر نوبت نقارے کے ساتھ برات لے کر گئے تھے۔ مُنہ پر رومال رکھ کر شرماتے تھے۔ نگاہیں نیچی تھیں۔ وہ ہر طرح سے دولھا نظر آتے تھے۔ نکاح پڑھایا گیا۔ ایجاب و قبول ہوا۔ بادشاہ نصیر الدین حیدر نہایت دھوم دھام سے دلہن کو مرصّع سکھ پال میں بٹھا کر محل میں لائے۔

رخصتی کے بعد چوتھی ہوئی، چالے ہوئے۔ غرضیکہ شادی بیاہ کی ہر مروّجہ رسم ادا کی گئی اور نہایت اہتمام سے ادا کی گئی۔ تمام محلات نے نئی نویلی دلہن کو نذریں پیش کیں۔

بادشاہ نے ان کو ممتاز الدہر شاہ جہاں محل کا خطاب مرحمت فرمایا۔ ان کے حسن جہاں تاب سے ایسے متاثر ہوئے کہ مثل پروانہ نثار ہوتے تھے۔ مگر جلد ہی ان کا التفات کم ہو گیا۔ بات یہ تھی کہ شاہ جہاں محل بھلے گھر کی بیٹی تھیں۔ تمیز اور شائستگی، شرم و حیا کی تعلیم بچپن سے ملی تھی۔ بادشاہ کا مزاج عشوہ طراز، شوخ، طرّار اور ایسی طنّاز عورتوں کی صحبت میں رہ کر بگڑ گیا تھا جو دل لبھانے اور آتش شوق بھڑکانے کا ہر گُر اور ہر حربہ آزمانا جانتی تھیں۔

نصیر الدین حیدر ایک رات خلوت میں تھے۔ شاہ جہاں محل چھپر کھٹ کے پائنتی بیٹھی تھیں۔ بادشاہ نے چھیڑ چھاڑ شروع کی۔ شاہ جہاں محل نے کھلنے اور بے حجاب ہونے کے بجائے شرم و حیا کا مظاہرہ کیا۔ بادشاہ نصیر الدین حیدر نے

اسے بے التفاتی قرار دیا۔ ایسے غضب ناک ہوئے کہ دیوانوں کی مانند چیخنے لگے۔

"بچاؤ، بچاؤ۔ یہ عورت مجھے مارے ڈالتی ہے۔"

محل میں کھلبلی مچ گئی۔ قلماقنیاں پیچھے سونتے بدحواس ہو کر دوڑیں۔ خواصیں بھی ان کے ساتھ ساتھ تھیں۔ خواب گاہ میں داخل ہو کر انھوں نے پرسش احوال کی۔ نصیرالدین حیدر پر ہذیانی کیفیت طاری تھی۔ شاہ جہاں محل کی جانب اشارہ کرتے ہوئے غصّے سے فرمایا۔

"یہ میرے سینے پر چڑھ کر گلا گھونٹ رہی تھی۔ اسے میری نظروں کے سامنے سے دُور کر دو۔ لے جا کر خواص پورہ میں ڈال دو۔"

حکم ملتے ہی قلماقنیوں نے جھپٹ کر شاہ جہاں محل کی مشکیں کس لیں۔ گھسیٹتی ہوئی باہر لے گئیں اور خواص پورہ میں ڈال دیا۔ یہ ایسا بندی خانہ تھا جس میں زیر عتاب خواصوں کو قید کیا جاتا تھا۔ بادشاہ نے اظہار نفرت کے طور پر اُنھیں شاہ جہاں محل کے بجائے کنگال محل قرار دیا اور ملکہ سے کوسّے ہنکنی بنا دیا۔ شاہ جہاں محل کو دوبارہ بادشاہ کی صورت دیکھنا نصیب نہ ہوئی۔ بندی خانے ہی میں گھٹ گھٹ کر نہایت بے بسی کے عالم میں دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ زندگی کے آخری دَور میں سڑی پاگل ہو گئی تھیں۔ تن کے کپڑے پھاڑ کر پھینک دیتی تھیں۔ مادرزاد برہنہ پڑی رہتی تھیں۔ نہ بولتی تھیں نہ بات کرتی تھیں۔

ادھر ملکہ زمانی کا ستارہ بھی گردش میں آیا۔ بادشاہ نصیرالدین حیدر کی حد سے زیادہ بڑھی ہوئی چاہت اور شیفتگی ہی ان کے خلاف حسد اور رقابت کی آگ بھڑکانے کے لئے کیا کم تھی۔ ستم بالائے ستم یہ کہ ان کے دونوں بھائیوں نے ایسے پر پُرزے نکالے کہ اپنے پرائے ہو گئے۔ عیش و عشرت کا وہ بازار گرم کیا کہ ہر سُو اس کا چرچا ہوا۔

کیوان جاہ پر اقتدار کا نشہ ایسا سوار ہوا کہ انجام سے بے خبر ہو گئے۔ وہ شاہی فوج کے سربراہ تھے اور جرنیل کہلاتے تھے۔ آئے دن نت نئے احکامات جاری کرتے۔ فوجی افسروں کو بات بات پر ڈانٹتے پھٹکارتے۔ ان کی بے عزتی اور تذلیل

کرتے میں لذت محسوس کرتے۔ بادشاہ کے اس قدر منہ چڑھے تھے کہ امور سلطنت میں بھی اس طور دخل درمعقولات کرنے لگے جو وزیروں اور دوسرے منصب داروں کو نہایت شاق گزرتے۔ وہ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتے اور ان کی نازیبا حرکات کا ذمہ دار ملکہ زمانی کو ٹھہراتے۔

وزراء اور امراء کے ساتھ ساتھ محلات کی نظروں میں بھی ملکہ زمانی خار کی طرح کھٹکتی تھیں۔ چنانچہ ہر طرف سے ملکہ زمانی، ان کے بھائیوں اور بیٹے کیوان جاہ کے خلاف بادشاہ کے کان بھرے جانے لگے۔ وہ رفتہ رفتہ ملکہ زمانی سے برگشتہ ہو گئے۔ محبت کا شعلہ سرد پڑنے لگا۔ آخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ ملکہ زمانی پر شاہی عتاب نازل ہوا۔ بادشاہ کے حکم سے ان کی تمام جاگیر ضبط کر لی گئی۔ صرف چوبیس ہزار روپے وظیفہ مقرر ہوا۔

کیوان جاہ کو نہ صرف جرنیلی سے برطرف کر دیا گیا بلکہ رزیڈنٹ کے توسط سے گورنر جنرل کو ایک عرضداشت میں مطلع کیا گیا کہ بعد تحقیق کے یہ ثابت ہوا کہ کیوان جاہ بادشاہ کے فرزند نہیں ہیں۔ لہذا ان کی ولی عہدی منسوخ قرار دی جاتی ہے۔

کیوان جاہ کے ساتھ ساتھ فریدوں بخت منا جان پر بھی شاہی عتاب نازل ہوا۔ انگریز فوج متعینہ بیلی گارد سے استدعا کی گئی کہ آئندہ منا جان کو سلامی نہ دی جائے اور اس مضمون کے اشتہارات اودھ کی قلمرو میں جابجا مشتہر کئے گئے کہ منا جان کے نام کے ساتھ ولی عہد بہادر اور شہزادہ نہ لکھا جائے۔

جاگیر تو ضبط ہو گئی مگر ملکہ زمانی کو بیش بہا ہیرے، جواہر اور مروارید کے علاوہ جو لاکھوں روپے زر نقد کی صورت میں ملے تھے، وہ ان کے قبضے میں رہے۔ چوبیس ہزار روپے وظیفے کی منظوری سے پہلے بادشاہ نصیر الدین حیدر، ملکہ زمانی کے لئے دس ہزار روپے ماہانہ دوامی وثیقہ مقرر کرا چکے تھے۔ اس کی نوعیت یہ تھی کہ بادشاہ نے گورنر جنرل کو ایک مراسلہ ارسال کیا جس میں کہا گیا تھا کہ بادشاہ غازی الدین حیدر مرحوم کے عہد میں ایسٹ انڈیا کمپنی کو جو پچاس لاکھ روپے چوتھی مرتبہ قرض دیئے گئے تھے، وہ

دوامی قرار دے جائیں اور بارہ لاکھ چالیس ہزار روپے مزید بطور قرض دیئے جاتے ہیں۔ اس کل رقم کا سود تین لاکھ بارہ ہزار ہوتا ہے۔ اس رقم سے ان وابستگان سلطانی کا اور ان کے فوت ہونے کے ان کے ورثا کا دوامی وثیقہ مقرر کیا جائے جن کے نام شرائط قرض کے ساتھ مرکوز ہیں۔

حضور بیگم کے ترکے میں جو وثیقہ آیا وہ اسی قرض کی شرائط کی رُو سے ملتا تھا۔ اس وثیقے کے علاوہ ملکہ زمانی نے انتقال کے بعد اتنی بڑی جائیداد اور زر نقد چھوڑا کہ حضور بیگم کے والد کا شمار امراء اور رؤسا میں ہوتا تھا۔ ملکہ زمانی نے ایک امام باڑہ بھی تعمیر کرایا تھا جو آج بھی ان کے نام سے منسوب ہے۔ اسے ملکہ زمانی کی کربلا بھی کہا جاتا ہے۔ یہ کربلا فن تعمیر کے اعتبار سے تو شہر کی دوسری کربلاؤں کے مقابلہ میں زیادہ قابل ذکر نہیں مگر حضور بیگم ہمیشہ اسی کربلا میں حاضری دیتی تھیں اور اس کا سبب بڑے فخر سے یہ بتاتی تھیں کہ اسے ان کے پر دادا کی والدہ ماجدہ ملکہ زمانی نے بنوایا تھا۔

(۱۰)

بارہ دری کی فصیل نما اونچی اونچی دیواروں پر سہ پہر کے سائے پھیلنے لگے تھے۔ ہر طرف خاموشی چھائی تھی۔

حضور بیگم بھی خاموش تھیں اور مغلانی ان کے قریب بیٹھی ہوئی سوچ رہی تھیں کہ حضور بیگم کو وزیرن کیسے یاد آگئی۔ آخر انھوں نے دبی زبان سے اس کا اظہار بھی کر دیا۔ ”سرکار! آج یہ وزیرن کا ذکر کیسے آگیا۔ کوئی خاص بات ہے؟“

”بات تو میں نواب بوٹا کے بارے میں کرنا چاہتی تھی۔ وہ وزیرن کے نواسے ہیں۔“ حضور بیگم نے بتایا۔ ”آج ارجمند اعظمی کے بیٹے کا رشتہ لائی ہیں۔ مجھے تو اس کا نام بھی یاد نہیں رہا۔ اس کی تعریفوں کے پُل باندھتی تھیں۔“

”سرکار! اُنھوں نے کیا سوچ کر یہ رشتہ تجویز کیا ہے؟“ مغلانی نے حیرت کا

کا اظہار کیا۔ "میرا خیال ہے کہ رانی صاحبہ کو نواب بوٹا کے خاندانی حالات کا علم نہیں، ورنہ وہ ہرگز اُن کے بیٹے کے رشتے کی بات نہ کرتیں۔"

"ارجمند کو نواب بوٹا کے بارے میں اس قدر بے خبر نہیں ہونا چاہیئے۔" حضور بیگم نے مغلانی کے خیال سے اتفاق نہ کیا۔ "یہ بات میں اس لیے کہہ رہی ہوں کہ نواب بوٹا کے والد، نواب افضل علی نے اپنے بیٹے کے لیے ارجمند کو مانگا تھا۔ کئی بار پیغام لے کر یاور بھائی کی کوٹھی پر پہنچے مگر ہر بار انھوں نے انکار کر دیا۔ یاور بھائی بڑے تعلقدار تھے۔ راجہ یاور علی خاں بہادر کہلاتے تھے۔ نواب افضل علی حیثیت میں بھی اُن سے کم تر تھے اور سب سے بڑی انکار کی وجہ حسب نسب اور خاندان تھا۔ بھابھی نے یہ بات مجھے خود بتائی تھی۔ خدا بخشے بڑی نیک اور محبت کرنے والی تھیں۔ مجھے تو ہر بات بتا دیتی تھیں۔"

"ہو سکتا ہے بیٹی کو یہ بات نہ بتائی ہو۔" مغلانی نے قیاس آرائی کی۔ "ویسے بھی شادی بیاہ کے معاملے میں لڑکیوں سے بات ہی کب کی جاتی ہے۔"

"شاید ایسا ہی ہو۔" حضور بیگم کو مغلانی کی بات دل کو لگتی معلوم ہوئی۔ "اب تم ہی بتاؤ وزیرن ایسی بدنام عورت کے خاندان میں کیسے اپنی بچی کو بیاہ سکتی ہوں۔ دُنیا کیا کہے گی اور سب سے زیادہ اپنے ہی اُنگلیاں اُٹھائیں گے۔ بھائی صفی کے ساتھ تو پہلے ہی مقدمے بازی ہو رہی ہے۔ وہ اور اُن کی بیگم تو میرے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ جائیں گے۔ کہیں مُنہ دکھانے کے قابل نہ رکھیں گے۔"

"سرکار! میں تو سمجھتی ہوں کہ آپ اس معاملے میں رانی صاحبہ کو صاف صاف بتا دیں۔" مغلانی نے مشورہ دیا۔

"میں نے دَبی زبان سے انکار تو کر دیا تھا، مگر ارجمند کا اصرار بڑھا تو ٹال دیا۔" حضور بیگم نے مغلانی کو آگاہ کیا۔ "معلوم نہیں ارجمند کیوں نواب بوٹا کے بیٹے پر اس قدر مہربان ہو گئی۔ اس کی زبان سے تعریف و توصیف سُن کر میں نے جان بوجھ کر وزیرن کا ذکر نہیں کیا۔ مبادا وہ ناراض ہو جائے۔" اُنھوں نے قدرے تامل کیا۔ "میں

ارجمند کو ناراض بھی تو کرنا نہیں چاہتی۔"

"مگر کسی نہ کسی مرحلے پر یہ بات آپ کو کھُل کر ہی بتانا پڑے گی۔"

"ابھی وہ مرحلہ نہیں آیا۔" حضور بیگم نے کہا۔ "مجھے تو اس وقت اپنی بچّی کی فکر کھائے جا رہی ہے۔ جس مصیبت میں وہ گرفتار ہے، جب تک اس سے چھٹکارا نہیں مل جاتا، مجھے اس وقت تک کچھ اور سجھائی نہیں دیتا۔"

"رانی صاحبہ اس سلسلے میں کیا کہتی ہیں؟" مغلانی نے دبی زبان سے احتجاج کیا۔ "آپ نے تو کچھ بتایا ہی نہیں کہ وہ جمعرات کو جب اُوپر گئی تھیں تو وہاں ان پر کیا گزُری؟ یوں دیکھنے میں تو وہ بالکل مطمئن لگتی تھیں۔ چہرے پر ذرا بھی پریشانی یا خوف نظر نہیں آتا تھا۔"

"سچ کہتی ہوں، ارجمند نے مجھے کچھ نہیں بتایا۔ پوچھا بھی تو یہ کہہ کر خاموش کر دیا کہ سرِدست کچھ بتانا میرے اور آپ کے لیے مناسب نہیں۔" حضور بیگم نے مغلانی کو یقین دلایا۔ "البتہ یہ ضرور کہتی تھی کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ بارہ دری چھوڑ کر کسی اور مکان میں منتقل ہو جائیے۔ ارجمند نے یہ مشورہ بھی دیا تھا کہ طلعت کی جلد سے جلد شادی کر دیجئے۔ اس کے بارے میں تم کو پہلے ہی بتا چکی ہوں۔"

"سرکار۔ اس مکان کو تو واقعی جلد سے جلد چھوڑ دینا چاہیئے۔ ہر فرد خوف زدہ اور سہما ہوا رہتا ہے۔ شام ہوتے ہی ہُو کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔ جمعرات کی شب کو تو خوف سے نیند ہی نہیں آتی کہ نہ معلوم کب کیا ہو جائے۔"

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔" حضور بیگم نے مغلانی کی تائید کی۔ "مَیں نے بھی ارجمند سے یہی کہا تھا مگر جب تک اجازت نہیں مل جاتی، اس گھر کو کیسے چھوڑ سکتی ہوں۔"

"آپ نے رانی صاحبہ کو بھی یہ بات بتا دی؟" مغلانی نے پوچھا۔

"میں نے بتائی تھی۔ ارجمند نے وعدہ بھی کیا ہے کہ وہ اجازت بھی دلا دے گی اور طلعت کو معافی مل جائے گی۔" حضور بیگم نے چوکنّا نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ "مگر تم اس کا کسی سے بھی ذکر نہ کرنا۔ ارجمند نے مجھے سختی سے منع کر دیا تھا، مگر تم سے تو

مَیں کچھ نہیں چھُپاتی۔ تم سے دل کی بات نہ کہوں تو میرا اور کون ہمدرد اور غم گسار بیٹھا ہے۔"

"سرکار! آپ تاکید نہ بھی کرتیں، تب بھی میں کسی سے کچھ نہ کہتی۔ مَیں تو ہمیشہ محتاط رہتی ہوں۔" مغلانی نے حضور بیگم کو اطمینان دلایا۔ "رانی صاحبہ جو کچھ کہتی ہیں، اگر ایسا ہو جائے تو آئے دن کی مصیبتوں سے نجات مل جائے۔ مَیں تو کہتی ہوں بارہ دری خالی کرنے کے بعد پہلا کام یہ کیجئے کہ چھوٹی سرکار کی فکر کیجئے۔"

"یہی ارادہ ہے تم کو سب کچھ بتایا ہی اسی لیے ہے۔" حضور بیگم نے تنبیہہ کی۔ "لیکن ارجمند کے سامنے ایسا کوئی تذکرہ نہ نکالنا ورنہ اس کے اعتماد کو ٹھیس پہنچے گی۔" اُنھوں نے قدرے تامل کے بعد کہا۔ "ارجمند کے بارے میں سوچتی ہوں تو وہ مجھے فرشتۂ رحمت معلوم ہوتی ہے۔ ذرا غور تو کرو۔"

حضور بیگم نے اپنی بات پوری بھی نہ کی تھی کہ ارجمند سلطانہ دہلیز پر نظر آئیں۔ انھیں دیکھتے ہی حضور بیگم نے مسکرا کر اُونچی آواز سے کہا۔ "آؤ ارجمند۔ بڑی عمر ہے تمھاری۔ بس تمھارا ہی ذکر کر رہی تھی۔"

ارجمند سلطانہ آگے بڑھیں۔ کرُسی پر بیٹھتے ہوئے مسکرا کر بولیں۔ "دیکھئے آپ نے یاد فرمایا اور میں حاضر ہو گئی۔ انگریزی میں اُسے کہتے ہیں۔"

مگر حضور بیگم نے ان کو فوراً ٹوکا۔ "بھئی تم میرے سامنے انگریزی نہ چھانٹا کرو۔ مجھے تمہاری اس گٹ پٹ سے وحشت ہونے لگتی ہے۔"

"میں تو پوری پوری کوشش کرتی ہوں کہ آپ کے سامنے کوئی لفظ انگریزی کا نہ آئے، مجھے آپ کے مزاج کا پہلے ہی اندازہ ہے۔" ارجمند سلطانہ نے صفائی پیش کی۔

"اچھا اس قضیہ کو چھوڑو۔" حضور بیگم نے بات کا رُخ بدلتے ہوئے پوچھا۔ "کچھ دیر آرام بھی کیا یا چھوٹی بہن کے ساتھ بیٹھی باتیں کرتی رہیں؟"

"کوشش تو بہت کی، مگر مجھے اپنے بستر کے علاوہ کہیں نیند ہی نہیں آتی۔"

حضور بیگم نے مڑ کر مغلانی کی جانب دیکھا۔ "بی مغلانی! ذرا جا کر جلدی سے ارجمند کے لیے شربت تو بھجواؤ۔"

مغلانی مزاج شناس تھیں۔ فوراً تاڑ گئیں کہ حضور بیگم تخلیہ چاہتی تھیں۔ وہ خاموشی سے اٹھیں اور باہر چلی گئیں۔

☆

کمرے میں اب ہلکا، ہلکا اندھیرا پھیل گیا تھا۔ باہر بھی روشنی مدّھم تھی۔ بارش تو اب نہیں ہو رہی تھی، مگر آسمان پر ابر چھایا تھا۔ دن ختم ہوا چاہتا تھا۔ شام ہونے سے پہلے ہی در و دیوار پر شام اُترنے لگی تھی۔

ارجمند سُلطانہ چند لمحے خاموش رہیں، پھر اُنھوں نے وہ بات چھیڑی، جس کے لیے وہ حضور بیگم کے پاس آئی تھیں۔ "پھوپھی جانی! آپ نے میری تجویز کے بارے میں کیا سوچا؟"

"کس بات کے بارے میں؟" حضور بیگم انجان بن کر بولیں۔

"طلعت آرا کے رشتے کے بارے میں۔" ارجمند سلطانہ نے کھل کر بات کی۔ "میں چاہتی ہوں اس سلسلے میں آپ جلد سے جلد کوئی فیصلہ کر لیں۔"

"سوچنے کا موقع ہی کہاں ملا۔ مغلانی آ گئیں۔ ان سے اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔" حضور بیگم نے ٹالنے کی کوشش کی۔ "یہ شادی بیاہ کا معاملہ ہے۔ گڑیا گڈّے کا کھیل نہیں۔ بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا ہوگا۔ ساری زندگی کا سوال ہے۔ ایسے معاملات میں جلد بازی سے کام نہیں لیا جاتا۔ ہر پہلو کو سامنے رکھ کر غور کرنا پڑتا ہے۔"

"میں نہیں کہتی کہ آپ جلد بازی سے کام لیں۔ مگر جو فیصلہ کرنا ہے، اس میں تاخیر نہ کریں۔" ارجمند سلطانہ صاف صاف کہنا نہ چاہتی تھیں، لیکن اُنھوں نے اپنی بات کی اہمیت پر زور دینے سے گریز نہ کیا۔ "میں کچھ سوچ کر ہی آپ سے کہہ رہی ہوں۔"

"مگر مجھے کچھ مہلت تو دو۔" حضور بیگم نے ارجمند سلطانہ کی حوصلہ شکنی نہ کی۔

"اب میں آپ سے اجازت لُوں گی۔ شام ہُوا چاہتی ہے۔ جانا بھی بہت دُور ہے۔ بارش کے باعث راستے بھی خراب ہو رہے ہیں۔ زیادہ دیر نہ ٹھہر سکوں گی۔"

"چلی جانا۔" حضور بیگم نے ان کو روکنا چاہا۔ "شربت تو پی لو۔"

مگر ارجمند سلطانہ مزید ٹھہرنے پر آمادہ نہ ہوئیں۔ وہ اُٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔ معذرت کرتے ہوئے بولیں۔ "پھوپھی جانی! معافی چاہتی ہوں۔ اب مجھے نہ روکیے۔ جانے دیجیے۔ میں کل صبح آؤں گی اور شربت کے بجائے دوپہر کا کھانا آپ ہی کے ساتھ کھاؤں گی۔ اس وقت تک آپ میری تجویز کے بارے میں اچھی طرح غور کر لیجیے گا۔ ویسے آپ مجھ پر اعتماد کر سکتی ہیں۔ طلعت میری بہن ہی نہیں بلکہ اب تو اس سے اتنی محبت ہو گئی ہے کہ بتا نہیں سکتی۔ مجھے تو اتنی اچھی لگتی ہے، ڈرتی ہوں، کہیں میری نظر نہ لگ جائے۔ میں تو اُسے خوش و خرم ہی دیکھنا چاہتی ہوں۔" اُنھوں نے حضور بیگم کو اپنے طور پر مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

مگر حضور بیگم ان کی بات صاف نظر انداز کر گئیں، کہنے لگیں۔ "دیکھو، کل آنا ضرور۔ یُوں سمجھ لو رات اس طرح کٹے گی جیسے سُولی پر لٹکی ہوئی ہوں۔ ہر دم دھڑکا لگا رہے گا۔ تم آجاتی ہو تو بڑی ڈھارس ہو جاتی ہے۔"

ارجمند سلطانہ نے مسکرا کر ایک بار پھر حضور بیگم کو یقین دلایا۔ "آپ اطمینان رکھیں۔ میں کل آؤں گی اور ضرور آؤں گی۔"

"میں بے چینی سے تمھارا انتظار کروں گی۔" حضور بیگم نے اصرار کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی پریشانی کا بھی اظہار کیا۔ "جمعرات میں اب دِن ہی کتنے رہ گئے ہیں۔ جمعرات کے تو نام ہی سے مجھے ہول آنے لگتا ہے۔"

ارجمند سلطانہ آگے بڑھیں اور کمرے سے باہر چلی گئیں۔ حضور بیگم بھی اُٹھ کر اُن کے ہمراہ دالان میں پہنچ گئیں۔ خادماؤں نے دالان کے فانوس روشن کرنا شروع کر دیئے تھے۔ ہر طرف کافوری شمعوں کی اجلی اجلی روشنی جھلملانے لگی تھی اور اس روشنی میں دالان کے اونچے اونچے ستون سر اُٹھائے کھڑے تھے۔

ارجمند سلطانہ بارہ دری کے بیرونی پھاٹک سے باہر نکلیں۔ ان کی سیاہ فورڈ پھاٹک سے ذرا ہٹ کر سڑک کے کنارے کھڑی تھی۔ ڈرائیور نذیر خاں، پھاٹک میں دربانوں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ ارجمند سلطانہ کو دیکھتے ہی کھڑا ہو گیا۔ اس نے آگے بڑھ کر نہایت مستعدی سے دروازہ کھول دیا۔ ارجمند سلطانہ پچھلی نشست پر جا کر بیٹھ گئیں۔ ڈرائیور نے انجن اسٹارٹ کیا۔ کار آگے بڑھی اور سڑک پر دوڑنے لگی۔

چہارم

(۱)

عشرت منزل ویران اور اجاڑ نظر آرہی تھی۔ اونچے، اونچے دالان سُنسان تھے۔ سہ دریاں اور صحنچیاں بھائیں بھائیں کر رہی تھیں۔ ہر طرف شام کا اندھیرا پھیلا تھا۔ گہری خاموشی میں اچانک آہٹ اُبھری۔ آغا جانی تہ خانے کا دروازہ کھول کر باہر نکلا اس کے ایک ہاتھ میں لالٹین دبی ہوئی تھی۔ لالٹین روشن تھی۔ اس کی زرد، زرد روشنی در و دیوار پر لہرانے لگی۔ ویرانی کچھ کم ہوئی۔

آغا جانی کے چیچک زدہ چہرے پر پسینے کے قطرے بکھرے ہوئے تھے۔ بالوں اور لباس پر خاک کے ذرّے بہت نمایاں نظر آرہے تھے۔ دونوں ہاتھ مٹّی سے بھرے ہوئے تھے۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا ایک سہ دری سے نکل کر دالان میں پہنچا۔ لالٹین ایک ستون پر کھونٹی سے لٹکائی اور صحنچی کے باہر رکھی ہوئی گھڑونچی کی جانب بڑھا۔ وہ نڈھال اور تھکا ہوا نظر آرہا تھا۔

اس نے مٹّی کے گھڑے سے تانبے کے لوٹے میں پانی انڈیلا اور لوٹا سنبھالے ہوئے کچے صحن کے ایک گوشے میں بنے ہوئے پختہ چبوترے پر جا کر بیٹھ گیا۔ لوٹا قریب رکھا

اور ٹونٹی سے پانی نکال کر ہاتھ دھونے لگا۔ عین اس وقت دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز اُبھری۔ آغا جانی نے چونک کر ڈیوڑھی کی جانب دیکھا۔ اس نے جلدی جلدی ہاتھ دھوئے اُٹھا اور دالان میں پہنچا۔ لالٹین اُتاری اور اُسے ہاتھ میں لے کر ڈیوڑھی کی جانب بڑھا۔

ڈیوڑھی میں گھُپ اندھیرا تھا۔ آغا جانی ڈیوڑھی میں داخل ہوا تو لالٹین کی روشنی پھیل گئی۔ کھٹکھٹانے کی آواز بیرونی دروازے پر رُک رُک کر اُبھرتی رہی۔ آغا کھنکارتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔ قریب پہنچا۔ کنڈی کھولی۔ دروازے کا ایک پٹ ایک طرف کر کے باہر نظر ڈالی۔ دیکھا ایک ادھیڑ عمر قد آور شخص سامنے کھڑا تھا۔ آغا جانی نے لالٹین اُٹھا کر اجنبی کے چہرے کو غور سے دیکھا، مگر وہ اسے پہچان نہ سکا۔

آغا نے مسکرا کر شائستگی سے کہا۔ ”معاف کیجئے میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔“

”میرا نام نذیر خان ہے، میں رانی حیدر گڑھ کا ڈرائیور ہوں۔“

آغا جانی نے حیرت زدہ ہو کر اسے دیکھا۔ دریافت کیا۔ ”کیسے آنا ہوا؟“ اس کے لہجے میں تجسس تھا۔

”مجھے قیصر مرزا صاحب سے بات کرنا ہے۔“ نذیر خان نے جواب دیا۔ ”رانی صاحبہ ان سے ملنا چاہتی ہیں۔ اگر وہ موجود ہوں تو بھیج دیجئے۔ رانی صاحبہ کار میں بیٹھی ان کا انتظار کر رہی ہیں۔“ اس نے شمال کی سمت ہاتھ اُٹھا کر اشارہ کیا۔ ”کار ادھر سڑک کے کنارے کھڑی ہے۔“

”مگر قیصر مرزا صاحب تو اس وقت تشریف نہیں رکھتے۔“

”وہ کب تک واپس آجائیں گے؟“ ڈرائیور نے پوچھا۔

”کچھ کہا نہیں جا سکتا۔“ آغا نے نذیر خان ڈرائیور کو بتایا۔ ”یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ آج وہ یہاں آئیں گے بھی یا نہیں۔“ اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ ”مجھے آغا جانی کہتے ہیں۔ رانی صاحبہ کی خدمت میں میری طرف سے آداب عرض کرنا اور یہ پیغام دینا کہ قیصر مرزا صاحب آئیں گے تو ان کو مطلع کر دیا جائے گا۔“

نذیر خان نے مزید کچھ نہ کہا۔ واپس جانے کے لیے مڑا اور آگے بڑھ گیا۔

آغا جانی نے دروازہ بھیڑ کر کنڈی لگادی۔ صحن میں واپس پہنچا اور چبوترے پر بیٹھ کر منہ دھونے لگا۔ لیکن وہ مسلسل رانی حیدر گڑھ کے بارے میں سوچتا رہا۔ قیصر مرزا پہلے ہی اسے بتا چکا تھا کہ پچھلی جمعرات کو طلعت آرا کے بجائے رانی حیدر گڑھ آئی تھیں اور ان سے جو بات چیت ہوئی تھی اس سے بھی آگاہ کیا تھا۔

آغا شش و پنج میں پڑ گیا۔ وہ یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ خلاف توقع رانی حیدر گڑھ اس وقت یہاں کیسے آگئیں اور وہ قیصر مرزا سے کیوں ملنا چاہتی تھیں؟

اس کی اُلجھن کو صرف قیصر مرزا رفع کر سکتا تھا۔ وہ رانی حیدر گڑھ سے مل چکا تھا اور بارہ دری کی بالائی منزل کے کمرے میں رات بھر ان سے باتیں بھی کرتا رہا تھا۔ آغا جانی نے مُنہ ہاتھ دھوئے اور دالان میں پڑے ہوئے پلنگ پر جا کر لیٹ گیا۔ وہ بہت تھکا ہوا تھا اور کچھ دیر آرام کر کے تھکن دور کرنا چاہتا تھا۔

آغا جانی کو قیصر مرزا کا انتظار تھا۔ وہ جمعہ کی صبح کو گیا تھا اور اب تک واپس نہ آیا تھا۔ باپ کی شدید علالت کے باعث ان دنوں اس کا بیشتر وقت اپنے گھر ہی پر گزرتا تھا۔ جمعرات کے علاوہ کبھی کبھار آجاتا اور احتیاط کے طور پر ہمیشہ رات کا اندھیرا پھیلنے کے بعد ہی آتا تھا۔ مگر زیادہ دیر نہ ٹھہرتا۔ گھڑی، دو گھڑی بیٹھ کر چلا جاتا۔

اندھیرا اور بڑھ گیا تھا۔ عشرت منزل اب کچھ اور زیادہ سُنسان اور اجاڑ معلوم ہو رہی تھی۔ گہری خاموشی میں صرف جھینگروں کی تیز آوازیں رُک رُک کر اُبھر رہی تھیں۔ آغا خاموشی سے لیٹا قیصر مرزا کا انتظار کرتا رہا۔ اس کے کان ڈیوڑھی کے بیرونی دروازے پر لگے تھے۔ مگر نہ کوئی آہٹ اُبھری نہ آواز سنائی دی۔

پہر رات گزر گئی۔ آغا جانی کو بھوک محسوس ہوئی۔ وہ پلنگ سے نیچے اُترا۔ لالٹین اُتار کر ایک بار پھر ہاتھ میں لٹکائی۔ باورچی خانے میں گیا۔ دن کا بچا ہوا کھانا نکالا اور اسے سنبھالے ہوئے سہ دری میں پہنچا۔ سہ دری میں تخت بچھا تھا۔ آغا جانی تخت پر بیٹھ کر کھانا کھانے لگا۔ کھانا وہ خود ہی تیار کرتا تھا اور دونوں وقت کا دوپہر ہی کو پکا لیتا تھا۔ البتہ روٹی اکثر رات کو نانبائی سے خرید کر لاتا تھا۔ ایسا عام طور پر اس وقت ہوتا جب قیصر مرزا

موجود ہوتا۔ وہ رئیس زادہ تھا اس سے دوپہر کی باسی اور ٹھنڈی روٹی نہیں کھائی جاتی تھی حلق میں پھنستی تھی۔

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد وہ دیر تک قیصر مرزا کا انتظار کرتا رہا۔ مگر جب گلی کوچے سنسان ہو گئے اور شہر کے ہنگامے سرد پڑ گئے تو آغا جانی اُٹھا۔ غسل کیا۔ صاف ستھرا لباس پہنا۔ دوسری لالٹین روشن کی اور تہہ خانے کی جانب چلا۔ جہاں حصار کے اندر بیٹھ کر اُسے مایا کو جگانے کے لیے چلّہ کھینچنا تھا۔

آغا جانی تمام رات تہ خانے کے اندر رہا اور وظیفہ پڑھتا رہا۔ فجر کے وقت دروازہ کھول کر باہر نکلا اور بستر پر جا کر لیٹ گیا۔ وہ دوپہر تک سوتا رہا۔ آنکھ کھلی تو اُٹھ کر کھانا پکایا، کھایا اور دفینے کی تلاش کے لیے کھدائی کرنے پھر تہہ خانے میں چلا گیا۔

شام کو تہہ خانے سے باہر آیا تو بے چینی سے قیصر مرزا کا انتظار کرنے لگا۔ مگر وہ نہ آیا۔ دوسرے روز بھی نہ آیا۔ تیسرا روز بھی انتظار میں گزر گیا۔ رانی حیدر گڑھ کا ڈرائیور بھی دوبارہ نہ آیا۔

☆

جمعرات کو دن ڈھلے بوندا باندی شروع ہو گئی۔ شام کے کوئی سات بجے کا عمل ہو گا۔ بارش رک گئی تھی۔ مگر آسمان ابر آلود تھا۔ ہوا تیز اور بھیگی، بھیگی تھی۔ ڈیوڑھی کے بیرونی دروازے پر دستک سُنائی دی۔ آغا جانی تھوڑی ہی دیر پہلے تہ خانے سے باہر آیا تھا۔ تھکا ہوا بھی تھا۔ اس نے مڑ کر دیکھا اور اُٹھ کر ڈیوڑھی میں پہنچا۔ دروازہ کھول کر دیکھا تو قیصر مرزا کو سامنے پایا۔ آغا نے شکوہ کیا۔ "اماں، تم اب تک کہاں رہے؟" قیصر مرزا نے جواب نہ دیا۔ خاموشی سے اندر آ گیا۔

آغا نے دروازہ بند کیا۔ کنڈی لگائی۔ دونوں ڈیوڑھی سے نکل دالان میں پہنچے۔ قیصر مرزا بھی تھکا ہوا نظر آ رہا تھا۔ آغا جانی نے محبت سے ہاتھ پکڑ کر اُسے اپنے برابر پلنگ پر بٹھایا۔ بے چین ہو کر دریافت کیا۔ "خیریت تو ہے۔ تمہارے ابا جان کی طبیعت اب کیسی

ہے ؟" اس کے لہجے سے تشویش آشکارہ تھی۔

" پچھلے دنوں تو بہت خراب ہو گئی تھی۔ مگر اب خاصی سنبھل گئی ہے۔ بستر سے اُٹھ کر دو چار قدم چل بھی لیتے ہیں۔" قیصر مرزا نے بتایا۔ " مگر ذرا ان کی نظروں سے اوجھل ہوا فوراً یاد کرتے ہیں۔ میرا پلنگ بھی اپنے ہی کمرے میں ڈلوا لیا ہے۔ رات کو انھی کے کمرے میں سوتا ہوں۔ کہیں آنے جانے نہیں دیتے۔ آج شام کو حکیم صاحب نہیں آئے تھے۔ ان سے ملنے اور حال بتانے کا بہانہ بنا کر اِدھر آیا ہوں۔"

" اور یہاں میں تمہارا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔" آغا جانی نے اسے مطلع کیا۔ اُتوار کی شام کو رانی حیدر کا ڈرائیور آیا تھا۔ رانی صاحبہ تم سے ملنا چاہتی تھیں۔"

" وہ کیوں ملنا چاہتی تھیں؟" قیصر مرزا نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

" خود تو یہاں آئی نہیں۔ کار میں بیٹھی رہیں۔ ڈرائیور نے بھی کچھ نہیں بتایا کہ وہ کیوں تم سے ملنا چاہتی تھیں۔" آغا جانی نے اس کے استفسار پر بتایا۔ " اب یہ تو تم ہی بتا سکتے ہو کہ وہ کیوں آئی تھیں۔"

" طلعت آرا سے آج ملاقات ہو گی تو اس سے معلوم ہو سکے گا کہ وہ کیوں آئی تھیں۔ ویسے اس رات انھوں نے ایسا کوئی عندیہ نہیں دیا تھا۔" قیصر مرزا ہنوز حیرت زدہ تھا۔

" تم اس سلسلے میں طلعت آرا سے معلوم کرنا۔ اسے پتہ ہو گا کہ وہ تم سے کیوں ملنا چاہتی تھیں۔"

" یہ بات میں اس سے ضرور پوچھوں گا۔" قیصر مرزا نے کہا۔ " اچھا اب میں حمّام میں جا کر نہا دھو لوں۔ پسینے سے بدن چپ چپا رہا ہے۔ نہانے کے بعد لباس تبدیل کروں گا۔"

" اماں تم لباس نہ بھی تبدیل کرو تب بھی ایسے جچ رہے ہو، کہیں میری نظر نہ لگ جائے۔" آغا بے تکلفی سے مسکرانے لگا۔ " سچ کہہ رہا ہوں اس وقت بھی تم پرستان کے شہزادے لگ رہے ہو۔ جب ہی تو طلعت آرا کو تمھارے بارے میں کبھی شبہ نہ ہوا۔" اس نے تلخی سے منہ بگاڑا۔ " یہ رانی حیدر گڑھ کباب میں ہڈی بن کر کہاں سے آدھمکیں۔ سارا بنا بنایا کھیل بگاڑ دیا۔"

"ہاں یار، انھوں نے سارا معاملہ تلپٹ کر دیا۔ دیکھو اب آئندہ طلعت آرا سے دوبارہ ملاقات ہوتی بھی ہے کہ نہیں۔ آج تو سمجھو آخری ملاقات ہے۔" قیصر مرزا کے چہرے پر ہلکی ہلکی افسردگی پھیل گئی۔ "بڑی مشکل سے تورانی صاحبہ نے آج کی ملاقات کی اجازت دی ہے۔"

"مجھے تو پہلے ہی خطرہ تھا کہ ایک نہ ایک روز یہ ہوگا۔" آغا جانی نے شکوہ کیا۔ "میری بات مان لیتے۔ طلعت آرا کو بھگا لے جانے پر آمادہ ہو جاتے تو آج یہ آخری ملاقات نہ ہوتی۔"

"مگر یہ تو سوچو، میں اسے اغوا کر کے کیسے لے جاتا؟ کہاں لے جاتا، کس کے پاس رکھتا، کیسے رکھتا؟" قیصر مرزا نے اپنی مجبوری بیان کی۔ "ڈر لگتا تھا کہیں معاملہ پولیس تک نہ پہنچ جائے۔ پکڑ دھکڑ ہوتی۔ مقدمہ چلتا۔ کتنی بدنامی ہوتی۔"

"اماں، تم ابھی بالکل اناڑی ہو۔ تم کو یہ خبر نہیں کہ بدنامی کا ڈر تو تم سے زیادہ طلعت آرا کی ماں کو ہوتا۔ یہ ان کی بیٹی کا معاملہ ہے۔ وہ بدنامی کے خوف سے بات بڑھانے کے بجائے ہر طرح دبانے کی کوشش کرتیں۔" آغا جانی اپنی بات پر اڑا رہا۔ "ادھر تم چپکے سے طلعت آرا کے ساتھ نکاح پڑھوا لیتے یا لمبی مدت کے لیے متعہ کر لیتے۔ اس کا انتظام بھی میں کر لیتا۔ طلعت آرا کی ماں پہلے تو آپے سے باہر ہو جاتیں، مگر بعد میں جھک مار کر تیار ہو جاتیں۔ تم کو اپنے داماد کے طور پر قبول کر لیتیں۔ بیٹی کے ساتھ ان کی اتنی بڑی جائیداد بھی تمھارے قبضے میں آجاتی۔ رہ گئی طلعت آرا تو وہ اتنی سیدھی ہے کہ اس پر حقیقت کھل بھی جاتی تو فیل مچانے یا ہنگامہ کرنے کے بجائے حقیقت کو حقیقت کے طور پر مان لیتی۔ ویسے بھی وہ تم سے اب محبت کرنے لگی ہے۔ غلط کہہ رہا ہوں میں؟"

"یہ تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو، محبت تو وہ مجھ سے کرتی ہے۔" قیصر مرزا نے آغا جانی سے اتفاق کیا۔ "یار اب کچھ نہیں ہو سکتا؟"

"بہت مشکل ہے۔" آغا جانی نے اپنی مجبوری بیان کی۔ "رات بھر میں، میں کیا کر سکتا ہوں۔ ایسے کاموں کے لیے تو پہلے سے تیاری کی جاتی ہے۔"

"یار، آغا جانی! کچھ کرو۔ یہ سمجھ لو، آج کے بعد پھر طلعت آرا سے ملنا نصیب نہ ہوگا۔" قیصر مرزا کے لہجے میں التجا تھی۔

آغا جانی خاموش رہا۔ گردن جھکا کر گہری سوچ میں گم ہو گیا۔ مگر قیصر مرزا زیادہ دیر خاموش نہ رہا۔ اس نے بے چین ہو کر کہا۔ "اماں، تم نہ جانے کہاں کھو گئے۔ میری بات کا جواب دو۔ یہ بتاؤ ابھی کچھ ہو سکتا ہے کہ نہیں؟ یہ آخری موقع ہے۔ پھر کچھ نہ ہوگا۔"

"فی الحال تو ایک ہی صورت ممکن ہے۔" آغا جانی نے تجویز پیش کی۔ "لے دے کے ایک ممانی کا گھر ہے۔ وہیں طلعت آرا کو ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ حالانکہ وہ میری سگی ممانی نہیں ہیں۔ لیکن بے چاری بڑا خیال کرتی ہیں۔ وہ جو میں طلعت آرا کے لیے ان سے سرخ جوڑا لایا تھا، اس کے بارے میں پوچھا تو میں نے بات بنا دی اور انھوں نے یقین بھی کر لیا۔ دوبارہ پھر تقاضہ نہیں کیا۔"

"مگر طلعت آرا وہاں کب تک ٹھہر سکتی ہے؟"

"بعد میں کوئی مناسب مکان رہائش کے لیے کرائے پر لے لیں گے۔" آغا نے تفصیل سے اپنا منصوبہ بتایا۔ "طلعت آرا آج بھی کوئی نہ کوئی زیور تو پہن کر آئے گی۔ اسے بیچ کر کچھ دن کام چلائیں گے۔"

"اور اگر وہ کوئی زیور پہن کر نہ آئی تو کیا ہوگا؟" قیصر مرزا نے اپنی مجبوری کا اظہار کیا۔ "اماں جان تو اب ایک پیسہ بھی نہیں دیں گی۔ صاف صاف کہہ چکی ہیں۔"

"اماں، تم فکر کیوں کرتے ہو۔ طلعت آرا کے جو زیور رہن ہیں ان کو چھڑا کر بیچ دیں گے۔ ان سے اتنی رقم مل جائے گی کہ کئی مہینے ٹھاٹھ سے گزر بسر ہو سکتی ہے۔"

"لیکن زیور چھڑانے کے لیے روپیہ کہاں سے آئے گا؟"

"اس کا بندوبست تم کرو گے۔ اور اگر اس کا بندوبست نہیں کر سکتے تو پھر طلعت آرا کا خیال دل سے نکال دو۔ یہ سمجھ لو کہ آج کے بعد پھر اس سے نہ مل سکو گے۔" آغا جانی نے دو ٹوک جواب دیا۔

"اماں جان ہی کی منت سماجت کروں۔ اگر وہ کچھ دینے پر رضامند نہ ہوئیں تو پھر

ایک ہی صورت ہے کہ ان کا کوئی قیمتی زیور پار کردوں اور اسے فروخت کر دیا جائے تاکہ اس رقم سے طلعت آرا کے جو زیورات رہن ہیں انہیں چھڑایا جا سکے۔" قیصر مرزا نے آغا جانی کے بدلے ہوئے تیور دیکھے تو گھبرا گیا۔ فوراً اس کی بات مان لی۔ ساتھ ہی اپنے خدشات کا بھی اظہار کیا۔ "امید تو ہے کہ یہ کام ہو جائے گا لیکن آگے کیا ہوگا؟"

"طلعت آرا کو اغوا کرنے کے الزام میں دھر لئے جاؤ گے۔ پولیس کی حراست میں رہو گے۔ مقدمہ چلے گا۔ جیل کی ہوا کھانا پڑے گی۔" آغا جانی بے تکلفی سے ہنسنے لگا۔ "چلے ہیں عشق کرنے اور دل ابھی سے دھکڑ پکڑ کر رہا ہے۔ اماں یہ عشق وشق تمھارے ایسے نامرد کے بس کی بات نہیں۔ عشق کرنے والے تو ایسے دھاکڑ ہوتے ہیں کہ یہ نہیں سوچتے کہ آگے کیا ہوگا۔"

"اماں تم بھی عجیب شے ہو۔ کبھی کچھ کہتے کبھی کچھ۔" قیصر مرزا جھنجھلا کر بولا۔ "اگر تم کوئی مدد نہیں کر سکتے تو میرا مذاق کیوں اڑا رہے ہو؟"

"میں نے تمھاری مدد کرنے سے کب انکار کیا۔ تم پر اگر کوئی آنچ آئی تو پیچھے نہیں ہٹوں گا۔ جان لڑا دوں گا۔ مگر تم مرد تو بنو۔ بات بات پر اگر مگر کر رہے ہو۔" آغا جانی نے سنجیدگی سے کہا۔ "میں یہ نہیں کہتا کہ اس کام میں خطرہ نہیں ہے۔ خطرہ تو بہرحال ہے اور اس کے لیے پہلے سے تیار بھی رہنا چاہیئے۔ اب یہی دیکھو۔ روزانہ تہہ خانے میں جاتا ہوں تو جان خطرے میں ڈال کر جاتا ہوں۔ مگر یہ جانتا ہوں کہ جتنا بڑا خطرہ ہے، اتنا ہی بڑا فائدہ بھی ہے۔ دفینہ نکل آیا تو سارے دلدر ایک ہی روز میں دُور ہو جائیں گے۔"

"یہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن کوئی بات سمجھ میں نہ آئے اور اس کے بارے میں پوچھ لیا جائے تو اس میں حرج ہی کیا ہے۔" قیصر مرزا نرم پڑ گیا۔ "اب یہی دیکھو، میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ طلعت آرا کو کس طرح بارہ دری سے ادھر عشرت منزل میں لایا جائے۔"

"یہ بات تم نے کام کی پوچھی۔ میں نے اس کے بارے میں پہلے ہی سوچ لیا تھا۔" آغا جانی نے اسے اپنا منصوبہ بتایا۔ "جب تم طلعت آرا کے پاس ہو گے تو معمول کے مطابق میں وہاں آؤں گا۔ تم کو کمرے سے باہر بلاؤں گا۔ تم نہایت پریشانی کے عالم میں

طلعت آرا کے پاس جانا۔ اس سے کہنا کہ میرے غلام نے ابھی آکر یہ وحشت ناک اطلاع دی ہے کہ شاہ جن پرستان سے یہاں آرہے ہیں۔ نہایت جلال میں ہیں۔ تم کو بھی میرے ساتھ پرستان لے جائیں گے اور بلی یا بندر بنا کر قید میں ڈال دیں گے۔ یہ سن کر اس کے توحواس بجا نہیں رہیں گے۔ اس سے کہنا بارہ دری میں ٹھہرنا اب کسی طور مناسب نہیں۔ ان کے عتاب سے بچنے کی ایک ہی صورت ہے کہ فوراً یہ جگہ چھوڑ دی جائے۔ تم اسے اپنے ہمراہ کمرے سے باہر لانا۔ میں وہاں موجود رہوں گا۔ تم اسے میرے سپرد کر دینا۔ دیوار پھاندنا، عشرت منزل میں پہنچنا اور وہاں سے ممانی کے گھر لے جانا یہ تمہارا دردِ سر نہیں۔ یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔"

"تمہاری بات سمجھ میں تو آتی ہے۔ مجھے یہ بھی اُمید ہے کہ تم اس قدر ہوشیار ہو کہ طلعت آرا کو اپنی ممانی کے گھر بھی پہنچا دو گے۔ بعد میں کرائے کا مکان لے کر طلعت آرا کو اس میں منتقل کر دیا جائے گا۔" قیصر مرزا نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "یہاں تک تو ٹھیک ہے۔ اب ایک بات اور سمجھا دو۔ اور وہ یہ ہے کہ طلعت آرا وہاں کب تک چھپی بیٹھی رہے گی؟"

"صرف چند روز۔" آغا نے قیصر مرزا کو بتایا۔ "میں ممانی کو اعتماد میں لے کر سب کچھ بتا دونگا۔ ان کو طلعت آرا کی ماں کے پاس بھیجونگا۔ ممانی کئی محل سراؤں میں آتو رہ چکی ہیں۔ بیگمات کے مزاج کو سمجھتی ہیں۔ ان سے بات کرنے کا ڈھنگ جانتی ہیں۔ موقع و محل دیکھ کر طلعت آرا کی ماں کو مشورہ دیں گی کہ بدنامی سے بچنے کا یہی واحد راستہ ہے کہ تم کو اپنے داماد کی حیثیت سے قبول کر لیں۔ ساتھ ہی ان کو یہ بھی بتا دیں گی کہ تم دونوں کا نکاح یا متعہ پہلے ہی ہو چکا ہے۔ مجھے تو پورا یقین ہے کہ وہ ان کی بات مان لیں گی۔ اس طرح بدنامی سے بھی بچ جائیں گی اور بیٹی بھی ان کو مل جائے گی۔ اکلوتی اولاد ہے۔ اس کے غم میں پہلے ہی ان کا بُرا حال ہوگا۔ کچھ ضرورت سے زیادہ سادہ لوح بھی ہیں۔ اس کا اندازہ تم اس بات سے لگا سکتے ہو کہ مہینوں سے طلعت آرا تمہارے پاس آرہی ہے۔ انھوں نے ایک بار بھی اسے نہ روکا نہ ٹوکا۔"

"بھئی آغا جانی، تم کو مان گئے۔" قیصر مرزا نے اس کی باتیں سنیں تو چہرے پر چھایا

ہوا افسردگی اور پریشانی کا غبار زائل ہو گیا۔ چہک کر بولا۔ "اماں تم نے ذرا کے ذرا میں اتنا بڑا منصوبہ بنا لیا۔ یار کمال کر دیا تم نے۔"

"میں نے بہت پہلے اچھی طرح سوچ بچار کر اسے تیار کیا تھا۔ مگر تم اس وقت آمادہ ہی نہیں ہوئے۔" آغا جانی نے مطلع کیا۔ "مجھے تو اس وقت صرف یہ سوچنا پڑا کہ طلعت آرا کو فوری طور پر کہاں پہنچایا جائے۔"

قیصر مرزا نے بات کا رخ بدلتے ہوئے کہا۔ "آج بہت حبس ہے۔ میں تو اب نہانے کے لیے حمام میں جا رہا ہوں۔ تم بارہ دری کی چھت پر جا کر کنول روشن کر دو۔ اگر سوز میں اگر بتیاں لگا کر سلگا دینا۔ پھولوں کے گجرے تو تم سہ پہر ہی کو لے آئے ہو گے۔"

"تمہارے آنے سے ذرا ہی دیر پہلے تو تہہ خانے سے نکل کر باہر آیا ہوں۔ گجرے کس وقت لاتا۔" آغا جانی نے بتایا۔ "آج تہہ خانے میں کچھ زیادہ ہی دیر ہو گئی۔"

"یار حد کر دی تم نے۔ ابھی تک گجرے بھی نہیں لائے۔"

"گجرے تو میں بازار جا کر ابھی لیے آتا ہوں۔" آغا جانی نے کہا۔ "اتنی دیر میں تم جا کر کنول کی موم بتی روشن کر دو اور اگر سوز میں اگر بتیاں سلگا کر لگا دو۔ آج تو تم کو ہی زحمت کرنا ہو گی۔" اس نے قدرے تأمل کے بعد دریافت کیا۔ "کچھ روپے دُوپے بھی لائے ہو کہ نہیں؟ میرے پاس تو گجرے لانے کو بھی کچھ نہیں۔ تمہارا انتظار ہی کر رہا تھا۔ کھانا بھی لاؤں گا۔ آج تو تم بھی یہیں کھانا کھاؤ گے۔"

قیصر مرزا نے پانچ روپے جیب سے نکال کر دیئے۔

"اماں دس روپے تو دو۔ تم اب خسّت بہت کرنے لگے ہو۔ وہ تو کہو یہ غنیمت ہوا کہ طلعت آرا اب رات کا کھانا کھا کر آتی ہے۔ ورنہ دس روپے سے بھی کام نہیں چلتا۔" آغا جانی نے اصرار کیا۔ "لاؤ پانچ روپے اور نکالو۔ میں جا کر گجرے اور کھانا لاتا ہوں۔ تمہارے ساتھ کھانا کھاؤں گا اور فوراً ممانی کے پاس چلا جاؤں گا۔ طلعت آرا کو وہاں لے جانے سے پہلے ممانی کو بھی اعتماد میں لینا ہو گا۔ ان کو سمجھانا بجھانا ہو گا۔ میرے بازار سے واپس آنے سے پہلے پہلے تم کنول روشن کر دینا۔ وقت کم ہے۔

جلدی کرو۔"

قیصر مرزا نے اس سے الجھنے کی کوشش نہ کی۔ خاموشی سے پانچ روپے نکال کر آغا کو دے دیئے۔ قیصر مرزا تہہ خانے کی جانب بڑھا۔ آغا نے اسے ٹوکا "تہہ خانے میں جا رہے ہو تو نا۔ مگر مٹی کے سکورے میں عود و عنبر سلگا کر نہ لے جانا۔ اس کی خوشبو تو تمہاری آمد کی پہچان ہے۔ لوبان سلگا کر لے جانا جو میری پہچان ہے۔ اس وقت تم شہزادہ گل رُخ نہیں اس کے غلام عنبر ہو گے۔" اس نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ "چلو آج تم ہی عنبر بن جاؤ۔ ہر بار تو میں عنبر بنتا تھا۔" اس نے قدرے توقف کے بعد خبردار کیا۔ "بارہ دری کی چھت پر جاتے ہی پہلا کام یہ کرنا کہ زینے کی کنڈی لگا دینا اور واپسی پر اسے کھولنا نہ بھولنا۔ یہ بہت ضروری ہے۔"

قیصر مرزا نے اس کی تمام ہدایات سنیں۔ مگر خاموش رہا۔ وہ اس وقت اپنی دُھن میں مگن تھا۔ آغا ڈیوڑھی کی جانب چلا گیا اور قیصر مرزا تہہ خانے کی سمت بڑھا اس نے کھونٹی پر لٹکی ہوئی لالٹین اتاری اور اسے ہاتھ میں سنبھالے ہوئے تہہ خانے کے دروازے پر پہنچا۔ دروازہ کھولا۔ سیڑھیاں طے کر کے نیچے اترا۔ طاق سے مٹی کی پیالی اٹھائی۔ اس میں لوبان ڈال کر سلگایا۔ اگر بتیاں اٹھا کر ہاتھ میں دبائیں اور تہہ خانے سے باہر آ گیا۔ آغا جانی موجود نہ تھا۔ وہ گھر سے باہر جا چکا تھا۔

قیصر مرزا اگر بتیاں اور مٹی کی پیالی سنبھالے ہوئے سہ دری کی طرف چلا۔ سکورے سے لوبان کا دودھیا دھواں اُٹھ رہا تھا۔ اس کی تیز بو ہر طرف پھیلتی جا رہی تھی۔ سہ دری سے گزر کر وہ زینے میں داخل ہوا اور سیڑھیاں طے کرتا ہوا اوپر پہنچ گیا۔ بارش ابھی تک رُکی ہوئی تھی۔ مگر آسمان پر گہرے بادل چھائے تھے۔ اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ دیواریں بارش سے سیلی ہوئی تھیں۔ قیصر مرزا سکورا سنبھالے ہوئے آگے بڑھا۔ احتیاط سے دیوار پر چڑھا اور آہستہ سے نیچے اتر کر بارہ دری کی چھت پر پہنچ گیا۔

اس نے جاتے ہی آغا کی ہدایت کے مطابق زینے کی کنڈی لگا دی۔ طلعت آرا کے آنے میں ابھی دیر تھی۔ وہ اب پہر رات گزرنے کے بعد چھت پر پہنچتی تھی۔ سائبان

کی جانب بڑھتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا کہ طلعت آرا سے یہ اس کی آخری ملاقات نہ ہوگی۔ آغا نے ایسا جچا تلا منصوبہ بنایا تھا کہ اگر کامیاب ہوگیا تو طلعت آرا بلکہ اس کی والدہ کی بہت بڑی جائیداد بھی اس کی ہوجائے گی۔ اس کا ارادہ تھا کہ جائیداد اس کے قبضے میں آجائے تو آغا جانی کو اس کی خدمت کے صلے میں اپنا میر منشی مقرر کردے گا۔ وہ تھا تو کم علم مگر ہوشیار اور معاملہ فہم تھا۔ جائیداد اور املاک کی دیکھ بھال میں مددگار ثابت ہوسکتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ طلعت آرا کو بھی اس سلسلے میں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ ویسے بھی وہ اس کی ہر بات بلا چون وچرا مان لیتی تھی۔ اس سے والہانہ محبت بھی کرتی تھی۔ اس کا سر اپنے زانو پر رکھ کر اکثر شیفتگی کے عالم میں کہتی تھی۔ ”مجھے چھوڑ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پرستان تو نہیں چلے جائیے گا۔ ایسا کرنے سے پہلے مجھے زہر دیدیجئے گا۔“ قیصر مرزا اس کے خدشات اور وسوسے سنتا تو تڑپ کر اسے سینے لگا لیتا۔ طرح طرح سے دل جوئی کرتا۔ اس کی معصومیت اور الھڑپن پر وارفتہ ہوجاتا۔ واقعی طلعت آرا بڑی بھولی اور نادان ہے۔ اُسے کچھ خبر نہیں۔ جو کچھ وہ کہتا ہے اسے آنکھ بند کرکے تسلیم کرلیتی ہے۔ مگر اب تو وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس کی بن جائے گی۔ ہر دم کا دھڑکا ختم ہوجائے گا، ہر خدشہ مٹ جائے گا۔

وہ سہانے خوابوں کے جال بنتا ہوا سرشاری کے عالم میں سائبان کے نیچے پہنچا۔ سکورا دروازے کے قریب ایک گوشہ میں رکھا آگے بڑھا۔ مگر دروازے کی دہلیز کے پاس پہنچ کر ٹھٹھک کر رہ گیا۔ دروازے پر ہوا سے لہراتا ہوا پردہ نظر نہ آیا۔ حسب معمول وہ آہستہ سے کھنکارا اور کمرے کے اندر داخل ہوگیا۔

دھندلی دھندلی روشنی میں اس نے دیکھا۔ کمرہ بالکل خالی تھا۔ نہ دروازوں پر پردے تھے، نہ مسہری تھی، نہ کرسی تھی، نہ اگر سوز تھا اور نہ کنول۔ مجسمہ رکھنے کا اونچا اسٹینڈ فرش پر ایک طرف پڑا تھا۔ اس کے آس پاس پلاسٹر آف پیرس کے اس کریہہ المنظر مجسمے کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے جس نے کمرے کا ماحول آسیب زدہ اور نہایت ڈراؤنا بنادیا تھا۔

قیصر مرزا کا دل ڈوبنے لگا۔ سارے سہانے خواب بکھر کر تار تار ہو گئے۔ وہ کچھ دیر کمرے میں حیران و پریشان کھڑا رہا۔ پھر گھبرا کر باہر آگیا۔ اس کے سامنے دور تک پھیلی ہوئی لق و دق چھت تھی۔ ہر طرف ہو کا عالم طاری تھا۔ خلاف معمول نہ خادماؤں کی آوازیں اُبھر رہی تھیں۔ نہ کوئی چہل پہل تھی نہ گہما گہمی۔ ساون کی کالی کلوٹی شام دم بخود کھڑی تھی۔ مولسری کے پتے ہوا کے نم اور سبک جھونکوں سے ہلکی ہلکی سرسراہٹ پیدا کر رہے تھے۔

وہ حواس باختہ ہو کر زینے کی جانب بڑھا۔ کنڈی کھولی اور بے اختیار زینے میں داخل ہو گیا۔ وحشت کے عالم میں ایک کے بعد دوسری سیڑھی پر قدم رکھتا ہوا نیچے چلا گیا۔ مگر آخری سیڑھی پر پہنچتے پہنچتے اس کے قدموں کی رفتار سست پڑ گئی۔ اسے اچانک خطرے کا احساس ہوا۔ اس کے بڑھتے ہوئے قدم رک ہو گئے۔ وہ رُک رُک کر گہری سانسیں بھر رہا تھا۔ اس نے گردن بڑھا کر سن گن لی۔ ہر طرف خاموشی چھائی تھی۔ نہ کوئی آہٹ تھی نہ آواز۔

اس نے جھجکتے ہوئے قدم بڑھایا۔ دیوار کی اُوٹ سے باہر دیکھا۔ نہ دالانوں میں فانوس اور مردنگ روشن تھے نہ سہ دریوں اور صحنچیوں میں کنول اور دو شاخے جھلملا رہے تھے اور نہ دیوار گیریوں میں کافوری شمعیں چکا چوند پیدا کر رہی تھی۔ اونچے اونچے دالانوں اور وسیع صحن میں جگہ جگہ کوڑا کرکٹ بے ترتیبی سے بکھرا ہوا تھا۔ بارہ دری بھائیں بھائیں کر رہی تھی۔ وہاں کوئی نہ تھا۔

قیصر مرزا زینے سے نکل کر صحن میں پہنچا۔ تھکے تھکے قدموں سے آگے بڑھا مگر چند ہی قدم چلنے کے بعد نڈھال ہو کر شہ نشین پر بیٹھ گیا۔ رات آہستہ آہستہ بارہ دری میں اُتر رہی تھی۔ اندھیرا اور بڑھ گیا تھا۔ اس اندھیرے میں قیصر مرزا سائے کی مانند نظر آرہا تھا۔ وہ کھوئی کھوئی نظروں سے دھندلے دھندلے در و بام دیکھ رہا تھا۔ بارہ دری اجڑ چکی تھی۔ حضور بیگم اپنی خادماؤں اور ساز و سامان کے ساتھ اسے چھوڑ کر جا چکی تھیں۔ ان کے ساتھ طلعت آرا بھی جا چکی تھی۔ اب وہاں کوئی نہ تھا۔ نہ زندگی کی گہما گہمی تھی نہ چہل پہل۔

ہر سُو ویرانی برس رہی تھی۔

☆

عشرت منزل کے سنسان دالانوں میں چمگادڑوں کا ایک جوڑا بار بار چکر کاٹ رہا تھا۔ ان کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ گہری خاموشی میں صاف سنائی دے رہی تھی۔ بیرونی دالان کے آگے طویل چبوترہ تھا۔ اس کا پختہ فرش جگہ جگہ سے اکھڑ گیا تھا۔ آغا جانی واپس آگیا تھا۔ وہ پشت پر ہاتھ باندھے چبوترے پر بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ اسے قیصر مرزا کا انتظار تھا جو بارہ دری سے ابھی تک واپس نہ آیا تھا۔

بارش ابھی تک بند تھی۔ فضا میں حبس تھا اور اس میں سیلن کی بو رچی ہوئی تھی۔ آنگن کے ایک گوشے سے جہاں گل اشرفی اور گل چاندنی کی کیاریاں تھیں، جھینگروں کی تیز آوازیں رک رک کر ابھر رہی تھیں۔ آغا جانی وقفے وقفے سے نظریں اٹھاتا۔ زینے کی شکستہ محراب کی جانب دیکھتا اور پھر اپنی سوچ میں گم ہو جاتا۔ اس کی تشویش بڑھتی جا رہی تھی۔ قیصر مرزا کو اب تک واپس آجانا چاہیئے تھا۔ اسے اتنی دیر کیوں ہوگئی؟ اس کے ذہن میں طرح طرح کے وسوسے پیدا ہو رہے تھے۔

زینے کی سکوت میں قدموں کی آہٹ اُبھری۔ آغا جانی نے چونک کر اس طرف دیکھا اور ٹھہر کر زینے کی اُونچی محراب کو بے چینی سے تکنے لگا۔ سیڑھیوں پر رُک رُک کر چاپ اُبھرتی رہی اور دم بدم قریب آتی گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے قیصر مرزا زینے کے اندھیرے سے نکل کر باہر آگیا۔ آغا جانی بے قرار ہو کر اس کی سمت بڑھا۔

قیصر مرزا لالٹین کی ہلکی ہلکی زرد روشنی میں گم صُم نظر آرہا تھا۔ اس کی آنکھیں بجھی بجھی تھیں۔ چہرہ اُترا ہوا تھا۔ وہ نڈھال اور شکستہ نظر آرہا تھا۔ آغا نے اسے پریشان اور افسردہ پایا تو گبھرا کر دریافت کیا۔ "اماں خیریت تو ہے؟ تم نے اتنی دیر کہاں لگادی؟ میں تو مجرے اور کھانا لے کر بہت پہلے آگیا تھا۔ تمھارا انتظار کرتے کرتے اب تو بارہ دری میں جانے کا ارادہ کر رہا تھا۔" وہ قیصر مرزا کے نزدیک پہنچ گیا۔

قیصر مرزا نے کچھ نہ کہا۔ نگاہیں اُٹھا کر آغا جانی کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ بوجھل قدموں سے چلتا ہوا آگے بڑھا۔ دالان سے گزر کر سہ دری میں پہنچا۔ اس کے چہرے پر حزن و ملال کے سائے پھیلے ہوئے تھے۔

آغا جانی نے قیصر مرزا کو اس قدر افسردگی کے عالم میں دیکھا تو اور گھبرا گیا۔ بڑھ کر قیصر مرزا کے قریب پہنچا اور تخت پر اس کے پہلو میں بیٹھ گیا۔ آغا جانی نے مڑ کر اس کے ویران چہرے کو غور سے دیکھا۔ کرید کر پوچھا۔ "تم تو بہت پریشان لگ رہے ہو۔ آخر ہوا کیا؟" اس کے لہجے میں تجسس تھا۔

"نہ پوچھو کیا ہوا؟" اُس نے ٹھنڈی سانس بھری۔

"طلعت آرا سے ملاقات ہوئی؟"

"نہیں" قیصر مرزا نے انکار میں ہولے ہولے گردن ہلائی۔

"وہ آج بھی نہیں آئی؟" آغا جانی نے حیرت زدہ ہو کر دریافت کیا۔ "کیا آج بھی اس کے بجائے رانی صاحبہ آئی تھیں؟"

"دونوں میں سے کوئی بھی نہیں آیا۔" قیصر مرزا نے بتایا۔ "کمرہ بھی بالکل خالی ہے۔ نہ مسہری نہ کرسی، نہ کنول، نہ اگر سوز، کچھ بھی تو نہیں۔" اس نے مڑ کر آغا جانی کی جانب دیکھا۔ "یار کمرے کو خالی پا کر میرے تو پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ گھبرا کر باہر نکلا۔ لپک کر زینے کے قریب پہنچا۔ دروازہ کھولا۔ ایسا بدحواس ہوا کہ بغیر سوچے سمجھے زینے میں داخل ہو گیا۔ اندھیرے میں کئی بار سیڑھیوں پر قدم بھی لڑکھڑائے مگر کہیں رُکا نہیں۔ کھٹ کھٹ کرتا نیچے پہنچ گیا۔"

"اماں! تم نے یہ کیا غضب کیا؟" آغا جانی نے گھبرا کر اپنے خدشے کا اظہار کیا۔ "کوئی ہنگامہ دنگامہ تو نہیں ہوا؟"

"ہنگامہ کیسے ہوتا، وہاں کوئی تھا ہی نہیں۔ بارہ دری بالکل خالی پڑی ہے۔ ایسی ویرانی چھائی ہوئی تھی کہ خوف معلوم ہوتا ہے۔" قیصر مرزا نے آغا کو مطلع کیا۔ "مگر یار، یہ ہوا کیسے؟" اس کے لہجے میں استعجاب تھا۔ "رانی صاحبہ نے بڑے اعتماد سے مجھے یقین

دلایا تھا۔ طلعت آرا کے آنے کا پختہ وعدہ کیا تھا۔"

"میں تو کہتا ہوں یہ ساری کارستانی انھی کی ہے۔ کاٹ پھانس اور چھل بٹے دینا تو ان کو ورثے میں ملا ہے۔ ان کے دادا نثار علی تھے۔ غدر میں نواب ممو خاں کے ایسے معتمد بن گئے کہ ان کے ساتھ چولکھی پہنچنے لگے جہاں حضرت محل کا دربار ہوتا تھا جنگ کے نقشے بنائے جاتے تھے۔ یہ وہاں کی ایک ایک بات گوئندوں کے ذریعے انگریزوں کو پہنچاتے تھے۔ اس خدمت کے صلے میں حیدر گڑھ کی جاگیر ملی۔ ان کے بیٹے یاور علی خاں نے ان سے بھی زیادہ جاں نثاری دکھائی اور انگریزوں سے راجہ کا خطاب پایا۔ کیا سمجھے؟"
آغا جانی نے قیاس آرائی کی۔" ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رانی صاحبہ نے طلعت آرا کی والدہ کو سب کچھ صاف صاف بتا دیا۔ انھوں نے کوئی ہنگامہ کھڑا کرنے کے بجائے مصلحت اندیشی سے کام لیا۔ چپ چپاتے بارہ دری خالی کی اور کہیں اور چلی گئیں۔"

"یہ بھی تو خبر نہیں کہ وہ بارہ دری سے اُٹھ کر گئیں کہاں؟"

"اگر یہ معلوم بھی ہو جائے کہ وہ کہاں ہیں تو حاصل کیا ہوگا؟" آغا جانی نے قیصر مرزا کو آگاہ کیا۔" فی الحال تو طلعت آرا سے تمہاری ملاقات کا اب کوئی امکان نہیں۔ اس کی تو اب پرچھائیں بھی نظر نہیں آئے گی۔"

"تمہارا خیال بالکل درست معلوم ہوتا ہے۔ یہ سارا کیا دھرا رانی صاحبہ ہی کا ہے۔"
قیصر مرزا نے منہ بگاڑ کر تلخی کا اظہار کیا۔" وہ تو مجھ سے پہلے ہی کہہ چکی تھیں کہ اب یہ کھیل ختم ہو جانا چاہیئے۔" اس نے قدرے توقف کے بعد بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔" انھوں نے جو کہا تھا وہی کیا۔ مگر انھوں نے یہ اچھا نہیں کیا۔ مَیں ان کو ایسا نہیں سمجھتا تھا۔ صاف چوٹ دے گئیں۔"

"مجھے تو اسی وقت اندازہ ہو گیا تھا کہ یہی ہوگا جب تم نے بتایا تھا کہ طلعت آرا کے بجائے رانی حیدر گڑھ آئی ہیں۔" آغا جانی کا چہرہ سنجیدہ ہو گیا۔" اُن کا آنا ہی اس بات کی علامت تھی کہ اب کھیل ختم ہو گیا۔"

قیصر مرزا نے کوئی تبصرہ نہ کیا۔ وہ گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر افسردگی کے سائے اور گہرے ہو گئے تھے۔ آغا جانی بھی خاموش رہا۔ دونوں دُھندلا دُھندلی

روشنی میں بُت بنے بیٹھے تھے۔ عشرت منزل پر ویرانی برس رہی تھی۔ گوشے سے جھینگروں کی آوازیں مسلسل اُبھر رہی تھیں۔

ایک چمگادڑ اُڑتی ہوئی آئی اور قیصر مرزا کے کان کے اس قدر قریب سے پھڑپھڑاتی ہوئی گزری کہ وہ گھبرا کر ایک طرف جھک گیا۔ جھنجلا کر آغا سے مخاطب ہُوا۔ "یار آغا جانی یہ کیا مصیبت ہے۔ تم یہاں اکیلے کیسے رات بسر کرتے ہو؟"

"جیسے پہلے بسر کرتا تھا۔" آغا نے نہایت اطمینان سے جواب دیا۔ "اب تو اس گھر سے اس قدر مانوس ہو گیا ہوں کہ نہ تنہائی محسوس ہوتی ہے نہ گھبراہٹ۔"

"ذرا غور کرو یہاں کتنا سناٹا ہے۔ یہ گھر ہے یا کوئی ویران کھنڈر۔" قیصر مرزا اپنی بات پر اڑا رہا۔ "مجھے تو یہاں اس قدر وحشت معلوم ہو رہی ہے کہ تم سے کیا بتاؤں۔"

"تم آج پہلی بار تو یہاں آئے نہیں ہو۔ مہینوں ہو گئے تم کو یہاں رہتے ہوئے۔ راتیں بھی گزاری ہیں اور اکثر اکیلے ہی گزاری ہیں۔" آغا جانی نے اسے یاد دلایا۔ "مگر آج تم کو کچھ زیادہ ہی وحشت معلوم ہو رہی ہے اور اس کا سبب تم بھی جانتے ہو۔ بہر حال ایک روز تو یہ ہونا ہی تھا۔" اس کا انداز ناصحانہ ہو گیا۔ "اب تو تم کو میرا مخلصانہ مشورہ یہ ہے کہ طلعت آرا کا خیال، دل سے نکال دو اور اسے بھول جانے کی کوشش کرو۔"

"تم بھی ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔ اب یہی کوشش کروں گا۔ مجبوری کا نام صبر ہے۔" قیصر مرزا نے گہری سانس بھری۔ "دل اس قدر پریشان ہے کہ اس گھر سے بھی وحشت ہونے لگی ہے۔" اس نے قدرے تامل کیا۔ "یار اس مکان کو بھی اب چھوڑ دو۔"

"اماں! ابھی سے کیسے چھوڑ دوں۔" آغا نے پریشان ہو کر ٹوکا۔ "چلّہ بھی پورا نہیں ہُوا۔ ابھی تو مایا جگانے کے لیے بہت کام کرنا ہے۔" اس نے مڑ کر قیصر مرزا کی جانب مسکرا کر دیکھا۔ "دفینہ نکل آیا تو یہ سمجھ لو، دونوں کے دن پھر جائیں گے۔ عیش ہی عیش ہوں گے۔"

"یار چھوڑو کیا رکھا ہے ان باتوں میں۔" قیصر مرزا نے منہ بگاڑ کر کہا "نہ جانے کتنی مدت سے یہ باتیں سُن رہا ہوں۔ ایک چلّہ ختم نہ ہوا تھا کہ تم نے دوسرا شروع کر دیا۔"

"اماں! میں نے اپنی مرضی سے تو ایسا نہیں کیا۔" آغا جانی نے فوراً صفائی پیش کی۔ "قلزم شاہ کی ہدایت ہی پر پہلا چلّہ ادھورا چھوڑ کر دوسرا شروع کیا ہے۔ تم سے تو کچھ چھپا

نہیں۔ تم کو تو ہر بات کی خبر ہے۔"

"یہ کب کہہ رہا ہوں کہ مجھے نہیں معلوم؟" قیصر مرزا اس کی وضاحت سے متاثر نہیں ہوا۔ "مجھے تو یہ نظر آرہا ہے کہ تم یوں ہی چلّہ کشی کرتے رہوگے۔ حاصل کچھ نہ ہوگا۔ قریب قریب سارا تہہ خانہ کھود ڈالا۔ اگر کوئی دفینہ ہوتا تو کہیں تو اس کے آثار نظر آتے۔"

"یار چلّہ تو پورا ہوجانے دو۔ اب اس کے ختم ہونے میں دن ہی کتنے رہ گئے ہیں۔" آغا جانی نے نرمی سے کہا۔ "تم مانو یا نہ مانو لیکن میرا دل گواہی دیتا ہے کہ تہہ خانے میں دفینہ ہے اور بالکل ہے۔ کوشش کی جائے تو اپنے قبضے میں آ بھی سکتا ہے۔"

"تم افیمیوں کی طرح بیٹھے بس خواب دیکھتے رہو۔ ہوتا ہواتا کچھ نہیں۔" قیصر مرزا کے لہجے میں جھنجلاہٹ تھی۔ "میں تو یہی کہوں گا کہ دفینے کا خیال چھوڑو اور اس مکان کو خالی کرنے کے بارے میں سوچو، بلکہ سوچنا کیا ہے۔ کل نہیں تو پرسوں خالی کردو۔"

"اماں، اتنی جلدی۔ کچھ دنوں کی تو مہلت دو۔" آغا نے گھبرا کر کہا۔ چند لمحے خاموش رہا۔ پھر کچھ سوچ کر گویا ہوا۔ "مجھے معلوم ہے کہ آج تم بہت پریشان ہو۔ مگر فوری طور پر یہ جگہ چھوڑنا مناسب نہیں ہوسکتا ہے۔"

قیصر مرزا نے اسے پوری بات بھی نہ کہنے دی۔ فوراً مداخلت کی۔ "تم یہ کیا کہنا چاہتے ہو کہ طلعت آرا اپنی والدہ کے ہمراہ ایک بار پھر بارہ دری میں واپس آجائے گی۔"

"طلعت آرا تو خیر واپس نہیں آئے گی مگر رانی صاحبہ تو یہاں آسکتی ہیں۔"

"وہ اب کیوں آنے لگیں؟"

"مقدمہ کے کاغذات تو ابھی تمہارے قبضے میں ہیں۔" آغا جانی نے اس دفعہ سنبھلے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ان کو واپس لینے کے لئے تو وہ آسکتی ہیں۔ اور اگر کاغذات اہم ہوئے تو وہ ضرور آئیں گی۔" اس نے تامل کیا پھر زور دے کر کہا۔ "میرا تو خیال ہے کہ کاغذات اہم ہی ہیں۔ اگر اہم نہ ہوتے تو اس قدر حفاظت سے کیوں رکھے جاتے اور سب سے بڑی بات یہ کہ نواب صفی کے سالے تہوّر علی خان بار بار ان کا تذکرہ کیوں کرتے۔" آغا جانی نے قیصر مرزا کو یاد دہانی کی غرض سے بتایا۔ "اگر وہ اس طور ان کا ذکر نہ

سامنے نہ کرتے تو مَیں طلعت آرا کے ذریعہ مقدمے کے کاغذات منگوانے کے لیے تم سے اصرار کیوں کرتا۔" وہ کھُل کر مُسکرایا۔ "مجھے معلوم تھا کہ ایک روز یہ کاغذات بہت کام آئیں گے۔ یاد کرو، تم تو ان کو منگوانے سے کترا رہے تھے لیکن میں تمہارے پیچھے نہ لگتا تو تم ہرگز ایسا نہ کرتے۔ اب بتاؤ، مَیں کتنی دُور کی سوچتا ہُوں۔ یہی تو اپنا کمال ہے۔"

قیصر مرزا اب تک مقدمے کے کاغذات کو فراموش کیے بیٹھا تھا۔ آغا کی باتیں سُن کر چونکا۔ اُسے اندھیرے میں اُمّید کی ایک کرن نظر آئی۔ چہرے پر چھائی ہوئی افسردگی اور بے زاری کے سائے مٹنے لگے۔ "مقدمے کے کاغذات کے علاوہ طلعت آرا کے زیورات بھی تو ہیں۔" قیصر مرزا نے آغا کو مطلع کیا۔

"زیورات تو زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ طلعت آرا کی والدہ کی جائیداد اتنی ہے کہ اس کے سامنے زیورات کی کوئی حقیقت نہیں۔ انکے پاس اتنی دولت ہے کہ اس کے دہ گنے زیورات اپنی بیٹی کے لیے بنوا سکتی ہیں۔" آغا نے قیصر مرزا سے اتفاق نہ کیا۔ "ہاں مقدمہ کے کاغذات ضرور اہم ہیں۔ ان کا تعلق لاکھوں کی جائیداد سے ہے۔ اس کے لیے رانی صاحبہ آسکتی ہیں اور میں تو کہتا ہوں وہ ضرور آئیں گی۔"

"ان کو آنا تو چاہیئے۔" قیصر مرزا نے اعتراف کیا۔ "مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب مَیں نے مقدمے کے کاغذات کا ذکر کیا تو وہ ایک دم نرم پڑ گئی تھیں اور طلعت آرا کو آج رات بھیجنے کا وعدہ بھی کیا تھا۔" وہ اپنی بات کہتے کہتے لمحہ بھر کے لیے رُکا پھر اس کا لہجہ تشویشناک ہو گیا۔ "لیکن یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ طلعت آرا کے آنے کے بجائے بارہ دری ہی خالی کر دی گئی۔ یار یہ راز اپنی سمجھ میں نہیں آیا۔"

"اس کے بارے میں تو رانی صاحبہ ہی بتا سکیں گی۔" آغا جانی نے کہا۔ "مگر میں یہ کہہ سکتا ہُوں کہ وہ آئیں گی۔ میرا کہا مانو تو تم روزانہ شام کو یہاں آتے رہو۔ معلوم نہیں وہ کس روز یہاں آجائیں۔"

"تم کہتے ہو تو میں آتا رہوں گا۔" قیصر مرزا نے اس کا مشورہ قبول کر لیا۔

"اچھا آؤ اب کھانا کھالیں۔ مجھے اس کے بعد تہہ خانے میں جانا ہے۔" آغا جانی اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "چلّے کا ناغہ نہیں ہونا چاہیئے ورنہ پھر سے شروع کرنا پڑے گا۔"

قیصر مرزا نے گھر واپس جانا چاہا مگر آغا نے اصرار کر کے روک لیا۔ کہنے لگا۔ "بادل گھر کر آئے ہیں، کسی بھی وقت بارش ہو سکتی ہے۔ گھر پہنچتے پہنچتے بھیگ کر شرابور ہو جاؤ گے۔" اسی وقت بادل زور سے گرجے۔ ہَوا بھی تیز ہو گئی۔ قیصر مرزا نے گھر جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔

آغا جانی نے کھانا نکال کر تخت پر لگایا اور دونوں کھانا کھانے لگے۔

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد آغا جانی نے غسل کیا۔ صاف سُتھرا لباس پہنا اور چلّہ کشی کے لیے تہہ خانے میں داخل ہو گیا۔

رات بھر بارش ہوتی رہی۔ صبح سورج طلوع ہونے سے قبل آغا جانی تہہ خانے سے نکل کر باہر آیا۔ بارش اب بند ہو چکی تھی۔ مطلع صاف تھا۔ قیصر مرزا موجود نہ تھا۔ وہ آغا جانی کے آنے سے پہلے ہی عشرت منزل سے جا چکا تھا۔

☆

جھٹ پٹا وقت تھا۔ عشرت منزل شام کے اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ آغا جانی لالٹین روشن کر رہا تھا۔ اسی اثناء میں قیصر مرزا آ گیا۔ آغا نے نظریں اُٹھا کر اس کی جانب دیکھا۔ مسکرا کر بولا۔ "تم ٹھیک وقت پر پہنچ گئے۔ میں تمہارا انتظار ہی کر رہا تھا۔" قیصر مرزا نے کچھ نہ کہا۔ خاموشی سے آگے بڑھا اور دالان میں بچھے ہوئے پلنگ پر جا کر بیٹھ گیا۔ آغا جانی نے لالٹین روشن کی، اسے کھونٹی پر لٹکایا اور قیصر مرزا کے قریب جا کر وہ بھی پلنگ پر بیٹھ گیا۔

"پچھلی رات تم ٹھہر گئے۔ ابا جان ناراض تو نہیں ہوئے؟" آغا نے دریافت کیا۔

"وہ تو خاموش رہے، ویسے بھی جب سے فالج کا اثر ہوا ہے اُن سے بولا ہی کہاں جاتا ہے۔" قیصر مرزا نے بتایا۔ "البتہ اماں جان بہت خفا تھیں مگر ان کی خفگی

تو گھڑی دو گھڑی کی ہوتی ہے پھر ٹھیک ہو جاتی ہیں۔" وہ زیرِ لب مسکرایا۔ "اب تو مَیں ان کی خفگی کا عادی ہو گیا ہوں۔ خاموشی سے ان کی ہر بات سر جھکا کر سُن لیتا ہوں۔"

"مَیں آج کھُدائی کے لیے تہہ خانے میں نہیں گیا۔" آغا جانی نے بات کا رُخ بدلتے ہوئے اپنی کارگزاری سُنائی۔ "تمام دن صفائی کرتا رہا۔ بڑا کوڑا کرکٹ اکٹھا ہو گیا ہو گیا تھا۔ ہر چیز پر خاک دُھول جم گئی۔ جگہ جگہ مکڑیوں کے جالے تنے تھے۔"

"یہ تم نے بہت اچھا کیا۔" قیصر مرزا نے داد دی۔ "واقعی بڑی گندگی ہو گئی تھی۔ یہاں آکر گھٹن محسوس ہوتی تھی۔" اس نے نظریں گھُما پھرا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ "صفائی تو نظر آرہی ہے۔"

"اس وقت کیا نظر آئے گا۔ دن کی روشنی میں دیکھو گے تو صحیح اندازہ ہو گا۔" آغا جانی نے بتایا۔ "یار بڑی محنت کرنا پڑی۔" اس نے قیصر مرزا کی جانب دادطلب نظروں سے دیکھا۔ "سب سے زیادہ محنت تو دُوچھتی کے برابر والے کمرے پر کرنا پڑی۔ وہی کمرہ جس میں تم کبھی جاڑوں کی راتوں میں سویا کرتے تھے۔ وہ تو خاک دُھول سے اس بُری طرح اٹا ہُوا تھا کہ تم سے کیا بتاؤں۔"

"مُدّت سے بند جو پڑا ہے۔"

"مَیں نے اسے اچھی طرح صاف کر کے بستر پر اُجلی چادر بچھائی۔ تکیوں کے غلاف بدلے، تخت اور کُرسیوں کو خُوب اچھی طرح جھاڑا پُونچھا۔" آغا جانی اپنی کارگزاری سُناتا رہا۔ قیصر مرزا خاموشی سے سُنتا رہا۔ "لیمپ کو بھی خوب چمکایا۔ تیل ڈالا۔ نئی بتی ڈالی اور چمنی ایسی صاف کی ہے کہ چما چم کر رہی ہے۔"

"مگر تم نے اس کمرے کو اتنا صاف کرنے کی زحمت کیوں اُٹھائی؟" قیصر مرزا نے حیرت زدہ ہو کر پُوچھا۔ "مَیں رات کو یہاں رہوں گا نہیں اور نہ ہی اب اس کمرے میں میرا قیام کرنے کا کوئی ارادہ ہے۔"

"یار تم نے یہ بھی سوچا کہ رانی صاحبہ آئیں گی تو ان کو بٹھاؤ گے کہاں؟ اس پلنگ

پر یا تخت پر؟" آغا نے ہاتھ اُٹھا کر اشارہ کیا۔ "فی الحال تو وہی ڈھنگ کا کمرہ ہے۔ ہوادار بھی ہے۔ ایک کھڑکی چھت پر اور دوسری صحن کی جانب کھلتی ہے۔" اس نے قیصر مرزا کا ہاتھ تھاما اور اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "آؤ میں تم کو کمرہ دکھاؤں۔ لیمپ بھی روشن کرنا ہے۔"

قیصر مرزا بھی کھڑا ہو گیا۔ دونوں آگے بڑھے اور زینے میں داخل ہو گئے لیکن پورا زینہ طے کر کے اُوپر نہ گئے۔ دس بارہ سیڑھیاں چڑھنے کے بعد دروازہ آ گیا جو مشرقی دیوار میں تھا۔ آغا نے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ سامنے کھلی چھت تھی مگر زیادہ وسیع نہ تھی۔ اس کے نیچے غسل خانہ، مودی خانہ اور توشہ خانہ تھا۔ غسل خانے کے ساتھ کنواں تھا مگر اسے پاٹ کر بند کر دیا گیا تھا۔ چھت پر صرف ایک کمرہ تھا اور آخری سرے پر تھا۔

آغا اور قیصر مرزا کمرے کے قریب پہنچے۔ آغا جانی دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہو گیا۔ قیصر مرزا دہلیز کے قریب چھت پر کھڑا رہا۔ آغا جانی نے لیمپ روشن کیا۔ مُڑ کر دروازے کی جانب دیکھا اور قیصر مرزا کو مخاطب کیا۔

"اماں قیصر مرزا تم باہر کیوں کھڑے ہو؟ اندر آ جاؤ۔"

قیصر مرزا کمرے میں چلا گیا۔ لیمپ کی روشنی میں اُجلا اُجلا بستر چمک رہا تھا۔ ہر چیز صاف ستھری نظر آ رہی تھی۔ اُس نے خوش ہو کر داد دی۔ "بھئی آغا تم نے تو کمرے کا بالکل حُلیہ ہی بدل دیا۔ دیکھ کر طبیعت خوش ہو گئی۔" وہ کُرسی پر بیٹھ گیا۔

آغا جانی بھی کُرسی کھسکا کر اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ دونوں مطمئن اور پُرسکون نظر آ رہے تھے اور اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہے تھے۔ ان کے کان ڈیوڑھی کے بیرونی دروازے کی جانب لگے تھے۔ ان کو رانی حیدر گڑھ، ارجمند سلطانہ کا انتظار تھا۔

کمرے کی دونوں کھڑکیاں کھُلی تھیں۔ ہُوا کے ہلکے ہلکے جھونکے اندر آ رہے تھے۔ اندھیرا بڑھتا گیا۔ عشرت منزل زیادہ ویران اور اجاڑ نظر آنے لگی۔ قیصر مرزا اور آغا جانی ہر آہٹ پر چونک کر اس کھڑکی سے باہر دیکھتے جو صحن میں کھُلتی تھی۔ مگر بیرونی دروازے پر نہ کوئی دستک اُبھری نہ کسی کی آواز سُنائی دی۔ بھری رات گزر گئی۔ دونوں بے چینی سے انتظار

کرتے رہے لیکن رانی حیدر گڑھ نہ آئیں۔

دس بجے قیصر مرزا اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اُکتائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "یار آغا جانی اب رانی صاحبہ کے آنے کا امکان نظر نہیں آتا۔"

"تمہارا خیال درست ہے۔" آغا جانی نے اتفاق رائے کیا۔ "رات خاصی ہو چکی ہے اب وہ نہیں آئیں گی۔"

"اچھا تو اب میں واپس گھر جاؤں گا۔" قیصر مرزا نے اپنے ارادے سے آغا کو آگاہ کیا۔ "کھانا اماں جان ہی کے ساتھ بیٹھ کر کھاؤں گا۔ ان سے وعدہ کر کے آیا تھا۔ انتظار کرتی ہوں گی۔"

آغا جانی نے قیصر مرزا کو رُکنے کے لیے زور بھی نہ دیا۔ اُسے بھوک بھی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ بھی اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ دونوں کمرے سے نکل کر باہر آ گئے۔

قیصر مرزا اپنے گھر چلا گیا۔

دوسرے روز چراغ جلے قیصر مرزا عشرت منزل پہنچا۔ آغا جانی موجود تھا۔ دونوں رانی حیدر گڑھ کا انتظار کرتے رہے مگر جب اُن کے آنے کی کوئی توقع نہ رہی تو قیصر مرزا مایوس ہو کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ آغا نے چاہا بھی کہ کچھ دیر اور ٹھہر جائے مگر قیصر مرزا آمادہ نہ ہوا۔ رات گئے وہ اپنے گھر چلا گیا۔

تیسرے روز بھی شام ہوتے ہی وہ عشرت منزل پہنچ گیا۔ آغا جانی کے ساتھ بیٹھا بے چینی سے رانی حیدر گڑھ کا انتظار کرتا رہا لیکن وہ نہ آئیں۔ قیصر مرزا نا اُمید نہ ہوا۔ اسے اُمید تھی کہ رانی حیدر گڑھ ضرور آئیں گی۔ آغا جانی بھی اسے برابر دلاسا دیتا رہا، ہر طرح حوصلہ افزائی کرتا رہا۔

قیصر مرزا جھٹ پٹا ہوتے ہی پابندی سے عشرت منزل پہنچ جاتا۔
ہفتہ بھر رانی حیدر گڑھ کے انتظار میں گزر گیا۔ مگر وہ نہ آئیں۔

☆

اس روز قیصر مرزا رات کو دس بجے کے بعد بھی کمرے میں بیٹھا رہا۔

برسات کی اندھیری رات تھی۔ آسمان پر کالے کالے بادل چھائے تھے۔ عشرت منزل کچھ زیادہ ہی سنسان نظر آرہی تھی۔ آغا جانی موجود تھا۔ وہ بھی رانی حیدرگڑھ کا منتظر تھا مگر قیصر مرزا بہت بے چین تھا۔ بار بار پہلو بدلتا۔ اٹھ کر کھڑکی پر بھی گیا اور چوکھٹ کا سہارا لے کر تاریک صحن کو تکتا رہا۔ اس کی نظریں اِدھر اُدھر بھٹکتی رہیں۔ ڈیوڑھی میں گہری خاموشی چھائی تھی۔

قیصر مرزا نے مڑ کر آغا جانی کو دیکھا۔ "یار انتظار کرنا فضول ہے۔ رانی صاحبہ یہاں نہیں آئیں گی۔" اُس کے لہجے میں بے زاری تھی۔ "سوچتا ہوں کل یہاں آنے کے بجائے حیدرگڑھ چلا جاؤں۔ اب مجھ میں مزید انتظار کرنے کی تاب نہیں۔"

"حیدرگڑھ جاکر کیا کرو گے؟" آغا جانی نے دریافت کیا۔

"رانی صاحبہ کو ان کا وعدہ یاد دلاؤں گا۔"

"تم کو یقین ہے کہ وعدہ یاد دلانے سے کوئی ایسی سبیل پیدا ہو جائے گی کہ طلعت آرا سے تمہاری ملاقات ہو جائے؟" آغا جانی نے نہایت سنجیدگی سے سوال کیا۔

"طلعت آرا سے ملنے کی کوئی سبیل پیدا ہو یا نہ ہو مگر اس روز روز کے انتظار کی مصیبت سے تو نجات مل جائے گی۔"

"میں سمجھتا ہوں تمہارا وہاں جانا مناسب نہیں۔" آغا جانی نے نرم لہجے میں کہا۔

"کیوں مناسب نہیں؟" قیصر مرزا نے جھنجلا کر اپنے ردِّ عمل کا اظہار کیا۔ "وہ مجھے وہاں قتل تو نہیں کروا دیں گی۔"

"وہ چاہیں تو ایسا بھی کر سکتی ہیں۔" آغا جانی نے سنجیدگی سے کہا۔ "اس حقیقت سے تو تم انکار نہیں کر سکتے کہ حیدرگڑھ بہر حال ان کی عمل داری کا علاقہ ہے۔ وہاں ان کا حکم چلتا ہے۔ مگر وہ فی الحال ایسا کریں گی نہیں۔"

"تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ میں حیدرگڑھ نہ جاؤں۔"

"ہاں میں یہی چاہتا ہوں۔" آغا جانی بدستور سنجیدہ تھا۔ "وہ تو چاہتی یہی ہیں کہ تم خود چل کر ان کے پاس جاؤ اور جب تم بن بلائے اپنی مرضی سے جاؤ گے تو اس

وقت تمہاری جو حیثیت ہے ویسی نہ رہے گی۔ تم غرض مند بن کر ان کے رُو برُو حاضر ہو گے۔ تمہاری بات میں کوئی وزن نہ رہے گا۔"

"یار اب کونسا وزن ہے۔"

"بہت وزن ہے۔" آغا اپنی بات پر اڑا رہا۔ "وہ یہاں آئیں گی تو وہ بھی غرض مند بن کر آئیں گی۔ اپنی یہی کمزوری وہ ظاہر نہیں کرنا چاہتیں ورنہ وہ اب تک آچکی ہوتیں۔"

"مجھے تو یہاں آتی ہوئی معلوم نہیں ہوتیں۔" قیصر مرزا نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا "ہفتہ بھر سے اوپر تو انتظار کرتے ہو گیا۔" اس نے نظریں اُٹھا کر آغا جانی کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ "وہ خود نہ آسکتی تھیں تو اپنے ڈرائیور ہی کو بلانے کے لئے بھیجتیں۔"

"وہ کسی کو بلانے کے لئے بھیجیں بھی تو ہرگز حیدر گڑھ نہ جانا۔"

"یار تم کہنا کیا چاہتے ہو؟" قیصر مرزا نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر پوچھا۔ وہ بات کی تہہ تک نہ پہنچ سکا تھا۔

"میں یہ کہہ رہا تھا کہ وہ بلائیں بھی تو نہ جانا۔" آغا جانی نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "ان کی غرض ہو گی تو وہ خود یہاں آئیں گی۔" اُس نے مُڑ کر قیصر مرزا کی جانب نظر بھر کر دیکھا۔ "جب تک مقدمے کے کاغذات تمہارے قبضے میں ہیں، اُن کو مجبور ہو کر یہاں آنا پڑے گا۔ مَیں تو کہتا ہُوں وہ یہاں آئیں گی اور ضرور آئیں گی۔"

"مگر ان کو آنا ہوتا تو اب تک آجاتیں۔" قیصر مرزا نے قیاس آرائی کی۔ "یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ مقدمے کے کاغذات کو تم جس قدر اہم سمجھتے ہو وہ اتنے اہم نہ ہُوں۔"

"اس کا بھی امکان ہے۔" آغا جانی نے قیصر مرزا کی بات کو یکسر رد نہ کیا۔ "یہ معلوم کرنے کے لیے تو ٹوہ لگانا ہو گی کہ یہ کاغذات کس قدر اہم ہیں۔"

"مگر تم یہ سُراغ لگاؤ گے کیسے؟" قیصر مرزا نے اظہار خیال کیا۔ "تمہاری رسائی تو تہوّر علی خان تک ہے اور یہ تم بھی جانتے ہو کہ نواب صفی سے ان کی آجکل سخت اَن بَن ہے۔"

"یہ تو ٹھیک ہے مگر ان سے بہت کچھ معلومات حاصل کی جا سکتی ہیں۔" آغا جانی نے

قیصر مرزا کو مطلع کیا۔ "اور کچھ نہیں تو کم از کم یہ تو معلوم ہو جائے گا کہ نواب صفی کے کس ملازم سے اس سلسلے میں ملنے کی کوشش کی جائے اور اس سے ضروری معلومات حاصل کی جائیں۔"

"ضرور معلومات حاصل کرو۔ مگر مجھ سے یہاں بیٹھ کر اب رانی صاحبہ کا انتظار نہیں کیا جا سکتا۔" قیصر مرزا نے بے زاری کا اظہار کیا۔

"اماں تم تو بہت جلد گھبرا جاتے ہو۔" آغا جانی نے نرمی سے قیصر مرزا کو سمجھایا۔ "ذرا صبر سے کام لو۔ عجلت کی ضرورت نہیں۔ جو بھی قدم اٹھاؤ سوچ سمجھ کر اٹھاؤ۔" اس نے لمحہ بھر توقّف کرنے کے بعد کہا۔ "کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جب تک میں مقدمے کے کاغذات کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کروں، اس عرصے میں تم کچھ نہ کرو۔ خاموشی سے رانی صاحبہ کا انتظار کرتے رہو۔"

قیصر مرزا نے مزید بات چیت نہ کی۔ رات کے گیارہ بجنے والے تھے اور اُسے گھر واپس جانا تھا۔ آسمان پر گھرے گھرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ بار بار بجلی بھی چمک رہی تھی اور اس کی چمک کے ساتھ ہی بادل زور سے گرجتے۔ بارش کسی بھی وقت شروع ہو سکتی تھی۔ آغا جانی نے اُسے روکنا چاہا مگر وہ آمادہ نہ ہُوا۔ عشرت منزل سے نکلا اور تیز تیز قدم اُٹھاتا ہُوا گھر کی سمت روانہ ہو گیا۔

(۲)

بادل ایک بار بہت زور سے گرجے اور موٹی موٹی بُوندیں گرنے لگیں۔ موسلا دھار بارش شروع ہو گئی لیکن قیصر مرزا اس وقت تک اپنے گھر کے قریب پہنچ چکا تھا۔ دربان جاگ رہا تھا۔ اس نے دروازہ کھولا اور قیصر مرزا ڈیوڑھی میں داخل ہو گیا۔ زنان خانے میں پہنچا تو ماں اور بہنوں کو سخت پریشانی کے عالم میں پایا۔ گھر میں سب ابھی تک جاگ رہے تھے۔ کوئی سویا نہ تھا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہُوا کہ اس کے باپ کی حالت اوّل شب ایسی بگڑی کہ اب تک قرار نہ آیا تھا۔

وہ دبے قدموں چلتا ہُوا ان کے کمرے میں گیا۔ دیکھا بستر پر بے حال پڑے تھے۔

ہلکی ہلکی روشنی میں ان کا چہرہ مرجھایا ہوا نظر آرہا تھا۔ رخساروں کی ہڈیاں ابھر کر نمایاں ہوگئی تھیں۔ طویل علالت کے باعث وہ پہلے ہی بہت کمزور ہو گئے تھے اب اور زیادہ نحیف اور لاغر لگ رہے تھے۔ وہ بار بار بے چینی سے اپنی گردن اِدھر اُدھر ہلاتے تھے۔ قیصر مرزا کو روبرو پایا تو بولنے کی کوشش کی مگر بولا نہ گیا۔ زبان نے ساتھ نہ دیا۔ وہ ٹکٹکی باندھے قیصر مرزا کو دیکھتے رہے۔ پھر ان کی آنکھیں بھر آئیں۔ دو آنسو پلکوں سے ڈھلک کر رخساروں پر بکھر گئے۔

ان کی بے بسی پر قیصر مرزا کا دل بھر آیا مگر اس نے خود کو سنبھالا۔ آگے بڑھا اور جاکر سرہانے بیٹھ گیا۔ ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھاما اور دل جوئی کی باتیں کرنے لگا۔ وہ خاموش لیٹے رُک رُک کر سانس لیتے رہے۔ اچانک ان پر کھانسی کا دورہ پڑا۔ ایسے بے چین ہوئے کہ زور زور سے ہانپنے لگے۔ حالت اس قدر غیر ہوگئی کہ قیصر مرزا گھبرا گیا۔ چھوٹی بہن پر ایسی رقت طاری ہوئی کہ منہ پھیر کر بے اختیار رونے لگی۔ ماں نے اشارہ سے منع کیا تو سسکیاں بھرتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی۔

بارش اور تیز ہوگئی تھی۔ بجلی رہ رہ کے کڑکتی۔ بادل اس طرح گرجتے کہ دل دہل جاتے۔ ہوا کے جھکڑ شور مچاتے ہوئے چل رہے تھے۔ برسات کی اس طوفانی رات میں نواب بُوٹا بستر پر اُکھڑی اُکھڑی سانسیں لے رہے تھے۔ ان کی بے قراری بڑھتی جا رہی تھی۔ قیصر مرزا کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ حکیم صاحب نے جو دوا تجویز کی تھی ان کی ہدایت کے مطابق پلائی جا چکی تھی۔ وہ پریشان ہو کر کبھی بیمار باپ کے سینے کو سہلاتا کبھی سر کو۔

رات کے پچھلے پہر نواب بُوٹا کو ذرا قرار آیا۔ ان کی آنکھ لگ گئی۔ وہ گہری نیند سو گئے مگر قیصر مرزا ان کے سرہانے بیٹھا رہا اور جاگتا رہا۔ وہ تو ساری رات جاگ کر گزارنا چاہتا تھا لیکن ماں کے اصرار پر اُٹھا اور بستر پر جا کر لیٹ گیا۔ اس کا پلنگ بھی اُسی کمرے میں تھا۔

صبح ہوتے ہوتے بارش کا زور ٹوٹا۔ پہر دن چڑھے حکیم صاحب آئے۔ نبض دیکھی حال پوچھا۔ نواب بُوٹا کی زبان لڑکھڑاتی تھی۔ انھوں نے بولنے کی کوشش کی تو حکیم صاحب

نے نہایت نرمی سے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ قیصر مرزا کی جانب متوجہ ہوئے۔ اس نے رات کی کیفیت بیان کی۔ حکیم صاحب نے نسخہ لکھا مریض کی دیکھ بھال کے بارے میں ضروری ہدایات دیں اور اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ قیصر مرزا ان کو رخصت کرتے ڈیوڑھی کے بیرونی دروازے تک گیا۔

حکیم صاحب نے اسے اعتماد میں لے کر مریض کے متعلق مطلع کیا۔ "فالج کا دوبارہ حملہ ہوا ہے اور اس دفعہ زیادہ شدید ہوا ہے۔ جسم کا بایاں حصہ مفلوج ہو کر رہ گیا ہے۔" ان کے لہجے سے تشویش آشکارہ تھی۔ انھوں نے ایک بار پھر ضروری ہدایات دیں اور شام کو آنے کا وعدہ کر کے چلے گئے۔

شام کو حکیم صاحب آئے تو قیصر مرزا موجود تھا۔ وہ رات بھر باپ کے پاس ہی رہا۔ ان کی طبیعت ابھی سنبھلی نہ تھی۔ یہ رات بھی انھوں نے سخت بے چینی کے عالم میں کاٹی۔ ان کے ساتھ تیماردار بھی بے چین رہے۔ جب وہ بے خبر ہو کر سو گئے تو قیصر مرزا بھی اپنے بستر پر گیا مگر ماں موجود رہیں۔

٭

نواب بُوٹا کی شدید علالت کی خبر پھیلی تو عیادت کرنے والوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ان میں طرح طرح کے لوگ شامل تھے۔ عزیز و اقارب تھے۔ دوست احباب تھے۔ پاس پڑوس کے رہنے والے تھے اور پرانے ملازم بھی تھے۔ کچھ ایسے بھی تھے جو قیصر مرزا کے لیے اجنبی تھے۔ لیکن جو بھی عیادت کے لیے آتا تسلّی اور تشفّی کے ساتھ ساتھ نہایت خلوص اور نیک نیتّی سے کوئی نہ کوئی مشورہ دیتا۔ شہر کے کسی نامی گرامی طبیب حاذق یا ڈاکٹر سے رجوع کرنے پر زور دیتا۔ کوئی ٹوٹکہ بتاتا۔ کوئی مجرّب اور آزمودہ علاج معالجہ تجویز کرتا۔

عیادت کے لئے آنے والوں میں نصرت علی خاں بھی شامل تھے۔ کسی زمانے میں نواب بُوٹا سے ان کے گہرے مراسم تھے۔ بات بات پر ہمدردی اور غم گساری کا اظہار کرتے تھے۔ انھوں نے نہایت ہی خلوص کے ساتھ قیصر مرزا کو مشورہ دیا۔ "میاں صاحبزادے!

میرا کہا مانیے تو فوری طور پر نواب بڈھن سے رجوع کیجیے، فالج کے مرض کا بے مثل علاج کرتے ہیں۔ سعادت گنج میں گاڑی اڈے کے قریب ہی ان کی محل سرا ہے۔ ان سے دیرینہ نیازمندی ہے۔ بہت اچھی طرح واقف ہوں۔" وہ دیر تک نواب بڈھن کے تیر بہدف علاج کی تعریف و توصیف کرتے رہے۔

قیصر مرزا نے ٹالنے کی کوشش کی۔ "حکیم صاحب سے اس سلسلہ میں عرض کروں گا۔ آپ کا فرمانا سر آنکھوں پر لیکن حکیم صاحب کے مشورے کے بغیر کسی دوسرے معالج سے علاج معالجہ کرانا بہتر نہ ہوگا۔"

"بھئی میں تو سمجھتا ہوں حکیم صاحب سے مشورہ کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ ان کا علاج جاری رکھیے۔" نصرت علی خاں برابر مصر رہے۔ "نواب بڈھن کو دکھانے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ ان کا طریق علاج بھی بالکل جداگانہ ہے۔ اللہ نے ان کے ہاتھ میں شفا دی ہے۔ کیا عجب کہ ان کے علاج سے مرض جاتا رہے۔"

قیصر مرزا نے سعادت مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے وعدہ تو کر لیا لیکن نصرت علی کے مشورے پر سنجیدگی سے توجہ نہ دی۔ حکیم صاحب سے بھی اس سلسلہ میں کوئی تذکرہ نہ کیا۔ معمول کے مطابق ان کا علاج جاری رکھا مگر کوئی افاقہ نہ ہوا۔ نواب بوٹا ہنوز نیم غشی کی حالت میں تھے۔ نہ بول سکتے نہ کچھ بتا سکتے تھے۔ بستر پر تمام وقت بے جان سے پڑے رہتے۔ جب ان کی حالت سنبھلتی نظر نہ آئی تو دوسرے حکیموں کے ساتھ ساتھ ڈاکٹروں کا علاج بھی شروع کیا۔ روزانہ نت نئے نسخے تجویز کیے جاتے۔ دوائیں بدلی جاتیں لیکن مرض میں ذرا کمی نہ ہوئی۔ مریض کی حالت سنبھلنے کے بجائے بگڑتی گئی۔ ادھر نصرت علی خاں کا اصرار جاری رہا۔ وہ صبح ہی صبح آجاتے اور گھنٹوں بیٹھے رہتے۔

نصرت علی کے اصرار سے متاثر ہو کر قیصر مرزا نے آخر ماں سے ذکر کیا۔ مریض کی تشویشناک حالت سے وہ سخت پریشان تھیں۔ لہٰذا آمادہ ہو گئیں۔ ماں سے اجازت لینے کے بعد قیصر مرزا دیوان خانے میں پہنچا۔ نصرت علی اس وقت موجود تھے۔ ان کے ہمراہ نواب پیارے آغا بھی تھے۔ وہ بھی اس کے والد کے پرانے ملنے والوں میں تھے اور

عیادت کے لیے آئے تھے۔ مگر قیصر مرزا نے ان کو پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ بار بار صفائی پیش کرتے تھے۔ اظہار معذرت کرتے تھے کہ ان کو نواب بُوٹا کی علالت کی اطلاع آج ہی صبح ملی ورنہ عیادت کے لئے پہلے ہی آتے۔ وہ قیصر مرزا کو تسلّی دیتے رہے اور دل جوئی کی باتیں کرتے رہے۔

پیارے آغا سے گفتگو کرنے کے بعد وہ نصرت علی خاں کی جانب متوجہ ہوا۔ اُنھوں نے حسبِ معمول نواب بڈھن کا ذکر چھیڑا۔ ان سے علاج کرانے پر زور دیا۔ "برخوردار! جہاں آپ نے دوسرے حکیموں اور ڈاکٹروں سے علاج شروع کرایا ہے۔ میری خواہش پر ایک بار نواب بڈھن سے تو رجوع کر کے دیکھئے۔ اس میں حرج ہی کیا ہے۔" نواب پیارے آغا نے بھی ان کی تائید کی۔ وہ بھی نواب بڈھن سے بخوبی واقف تھے بلکہ ان کے طریقِ علاج کے بے حد معترف بھی تھے۔

"آپ فرماتے ہیں تو ایسا ہی کروں گا۔" قیصر مرزا نے اپنی رضامندی کا اظہار کیا۔ "اب یہ زحمت بھی آپ ہی کو کرنا ہوگی۔ نواب بڈھن کو جا کر لے آیئے اور ابّا جان کو دکھا دیجئے۔ کہیئے تو میں بھی آپ کے ہمراہ نواب بڈھن کے پاس چلوں۔"

"مگر مشکل یہ درپیش ہے کہ نواب بڈھن کسی مریض کو دیکھنے کہیں جاتے نہیں۔ ضعیف بھی ہو گئے ہیں۔ کچھ تو سن وسال کا تقاضہ ہے اور پھر یہ بھی کہ وہ خاندانی رئیس ہیں۔ فی سبیل اللہ علاج معالجہ کرتے ہیں۔ نہ کوئی فیس لیتے ہیں نہ نذرانہ۔" نصرت علی نے صورت حال کی وضاحت کی۔ "مریض کو تو ان کے پاس ہی لے جانا ہوگا۔"

پیارے آغا خاموش بیٹھے رہے۔

"لیکن ابّا جان کی تو ایسی حالت نہیں کہ وہ کہیں جا سکیں۔" قیصر مرزا نے مجبوری بیان کی ساتھ ہی درخواست کی۔ "قبلہ! آپ کے نواب بڈھن سے دیرینہ مراسم ہیں۔ آپ اگر زور دیں گے تو نواب بڈھن ضرور اتنی زحمت گوارہ کر لیں گے۔"

"مجھے معلوم ہے کہ وہ کسی صورت میں نہیں آئیں گے۔ ان کے علاج کی تو یہ بُنیادی شرط ہے۔" نصرت علی خان نے قیصر مرزا کو آگاہ کیا۔ "مریض کو بہر حال ان کے پاس لے جانا

ہوگا۔ میں تو سمجھتا ہوں نواب صاحب چوپہلے میں آرام سے وہاں جا سکتے ہیں۔ کسی قسم کی تکلیف نہ ہوگی۔ میں نے تو ایسے مریضوں کو نواب بڈھن کے پاس علاج کی غرض سے آتے دیکھا ہے جن کی صرف سانس چلتی تھی۔ آپ کے والد ماجد کی خدانخواستہ ایسی نازک حالت تو نہیں" انھوں نے نظریں اُٹھا کر قیصر مرزا کی جانب دیکھا۔ "میرا کہا مانئے تو مزید تاخیر نہ کیجئے۔ چوپہلے میں مریض کو آرام سے لٹائیے اور نواب بڈھن کے پاس آج کیا بس ابھی لے جانے کا بندوبست کیجئے۔"

"آپ تو بہرحال میرے ساتھ نواب بڈھن کے پاس چلیں گے نا؟"

"جی نہیں، معذرت خواہ ہوں۔ میں آپ کے ساتھ نہ چل سکوں گا۔" نصرت علی اس کے ہمراہ جانے پر آمادہ نہ ہوئے۔ "آپ پیارے آغا صاحب کو اپنے ہمراہ لے جائیے۔" وہ نواب پیارے آغا کی جانب متوجہ ہوئے۔ "آغا صاحب! اگر آپ زحمت فرماسکیں تو نہایت مناسب ہوگا۔"

مگر نواب پیارے آغا نے بھی معذرت کرلی۔ صفائی پیش کرتے ہوئے بتایا۔ "میں تو گھر سے حیدرگڑھ جانے کے لئے نکلا تھا۔ سوچا نواب صاحب کی خیریت معلوم کرلوں۔ دو گھڑی بیٹھ کر حیدرگڑھ چلا جاؤں گا۔"

حیدرگڑھ کا نام سُن کر قیصر مرزا چونکا۔ جھجکتے ہوئے دریافت کیا۔ "آپ کب حیدرگڑھ جارہے ہیں؟" اس کے لہجے سے تجسس آشکارہ تھا۔

"بس ابھی جارہا ہوں۔ رانی صاحبہ نے یاد فرمایا ہے۔" پیارے آغا نے جواب دیا۔ "کچھ دیر پہلے ان کا ڈرائیور موٹر لے کر غریب خانے پر آیا تھا۔ فوری طور پر پہنچنے کا پیغام دیا ہے۔ اس کے ساتھ حیدرگڑھ جارہا ہوں۔ میں ادھر آگیا۔ وہ سڑک پر موٹر میں بیٹھا میرا انتظار کررہا ہے۔" انھوں نے ایک بار پھر اظہار معذرت کیا۔ "واللہ! میں آپ کے ساتھ نواب بڈھن کے پاس ضرور جاتا۔ مگر کیا کروں مجبور ہوں۔ حیدرگڑھ جانا نہایت ضروری ہے۔"

نواب پیارے آغا اس وقت بہت عجلت میں تھے۔ انھوں نے نواب بڈھن

کی محل سرا کا پتہ بتایا۔ نصرت علی خان نے مزید تفصیل بتائی۔ نواب بڈھن کی محل سرا کو جانے والے راستے کے ہر موڑ اور ہر گلی کوچے سے آگاہ کیا۔

پیارے آغا اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ قیصر مرزا کو گلے لگا کر تسلی اور تشفی دی۔ خاصدان سے گلوری نکال کر کلے میں دبائی۔ آگے بڑھے اور آہستہ آہستہ چلتے ہوئے باہر چلے گئے۔

قیصر مرزا باپ کی تشویش ناک علالت کے باعث اس قدر ذہنی پریشانی میں مبتلا تھا کہ نواب پیارے آغا سے مزید بات چیت نہ کر سکا۔ یہ بھی نہ پوچھ سکا کہ وہ کس سلسلے میں، حیدر گڑھ جا رہے ہیں اور کب تک واپسی کا ارادہ رکھتے ہیں۔

✡

پہر دن گزر چکا تھا۔ کوئی ساڑھے دس کا عمل ہو گا۔ نیلا آسمان سفید سفید بادلوں کے دوڑتے ہوئے ٹکڑوں کی اوٹ سے جھلک رہا تھا۔ بارش کے کوئی آثار نہ تھے قیصر مرزا نے بیمار باپ کو اپنے مضبوط ہاتھوں پر اٹھایا اور نہایت آرام سے فینس میں لٹا دیا۔ خود بھی فینس میں سوار ہوا اور دیکھ بھال کے لیے سرہانے بیٹھ گیا۔ دو نوکروں کو ہمراہ لیا اور نواب بڈھن کی محل سرا کی جانب روانہ ہو گیا۔

نواب بڈھن خاندانی رئیس تھے۔ محل سرا بھی خوب وسیع اور عالیشان تھی۔ روکار میں بلند پھاٹک تھا۔ پھاٹک پر نوبت خانہ تھا۔ جس کے خوبصورت کنگورے دور سے نظر آتے تھے۔ پھاٹک کے دونوں طرف دربانوں کے لیے چھوٹے چھوٹے بغلی سہ درے تھے۔ سہ دروں کی محرابوں کے آگے کھلے ہوئے چبوترے تھے۔ دو دربان ایک چبوترے پر بیٹھے حقہ گڑگڑا رہے تھے۔ قیصر مرزا نے فینس رکوائی۔ اتر کر نیچے آیا۔ ایک دربان بڑھ کر اس کے قریب پہنچا۔ قیصر مرزا نے آنے کا مقصد بتایا۔ دربان نے رہنمائی کی۔ قیصر مرزا اس کے ساتھ ساتھ چلا۔ کہاروں نے مریض کی فینس اٹھائی اور پیچھے پیچھے چلے۔ دونوں ملازم بھی فینس کے دائیں بائیں چل رہے تھے۔

فینس دیوان خانے میں پہنچی۔ نواب بڈھن دیوان خانے میں مصاحبین اور احباب

کے ساتھ مصروف گفتگو تھے۔ عمر تو ان کی ساٹھ سے تجاوز کر چکی تھی مگر صحت بہت اچھی تھی۔ جسم مضبوط اور گٹھا ہوا تھا۔ چہرہ دمکتا تھا۔ آنکھیں روشن اور کشادہ تھیں۔ قیصر مرزا کو دیکھتے ہی اپنی نشست سے اٹھے۔ نہایت خندہ پیشانی سے پیش آئے۔ نواب بوٹا سے واقف بھی تھے۔ بڑھ کر فینس کے قریب گئے۔ نواب بوٹا کو دیکھا۔ آداب کیا۔ مزاج پوچھا۔ دل جوئی کی باتیں کیں اور قیصر مرزا کے ساتھ واپس اپنی نشست پر آکر بیٹھ گئے۔

انھوں نے قیصر مرزا کو اپنے پہلو میں بٹھایا۔ تسلی دیتے ہوئے نرم اور شگفتہ لہجے میں گویا ہوئے۔ "حالت زیادہ تشویش ناک نہیں۔ اللہ نے چاہا تو جلد صحت یاب ہو جائیں گے۔"

"میں نے آپ کی بہت تعریف سنی ہے۔ ہر طرف سے نا امید ہو کر حاضر خدمت ہوا ہوں۔" قیصر مرزا نے اپنی پریشانی بیان کی۔

"میاں! میں کوئی حکیم یا ڈاکٹر تو ہوں نہیں۔ اس موذی مرض کا علاج کسی طور حاصل کر لیا ہے۔ اسے آزماتا ہوں۔ اللہ شفا دیتا ہے۔ میں تو ایک وسیلہ ہوں۔" نواب بڈھن نے عجز و انکسار کا مظاہرہ کیا۔ "مگر اتنا عرض کر دوں کہ اس علاج میں اعتقاد بنیادی شرط ہے۔ اعتقاد پختہ نہ ہو گا تو علاج کارگر نہ ہو گا۔"

قیصر مرزا نے دونوں ہاتھ باندھ کر سعادت مندی کا اظہار کیا۔ "حضور کا فرمانا سر آنکھوں پر۔ بالکل بجا ارشاد فرمایا۔"

نواب بڈھن نے اپنے ایک خاص خدمت گار کو طلب کیا۔ اُسے ضروری ہدایات دیں۔ ذرا دیر بعد وہ ایک انگیٹھی لے کر آیا۔ نواب بڈھن اُٹھ کر بیرونی دالان میں آ گئے۔ اسی دالان میں ایک طرف فینس رکھی تھی جس میں نواب بوٹا نیم غشی کے عالم میں لیٹے تھے۔ خدمت گار نے انگیٹھی میں کوئلے بھر کر آگ روشن کی۔ کوئلے جب خوب دہکنے لگے تو خدمت گار نے انگاروں پر لوہے کا روپے برابر ایک گول ٹکڑا رکھ دیا۔ لوہا گرم ہو کر انگارے کی مانند سُرخ ہو گیا۔ نواب بڈھن کی ہدایت پر خدمت گار نے انگیٹھی اُٹھائی اور ان کے روبرو رکھ دی۔

قیصر مرزا ان کے قریب کرسی پر بیٹھا تھا اور خاموشی سے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ نواب

بڈھن نے چمٹی سے گرم لوہے کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور جب یہ اطمینان ہو گیا کہ لوہا پوری طرح سرخ ہو چکا ہے تو انھوں نے چمٹی سے پکڑ کر اسے اُٹھایا۔ مُنہ کے قریب لائے۔ زبان نکالی اور دہکتے ہوئے سرخ سرخ لوہے پر آہستہ آہستہ اِدھر اُدھر پھیرنے لگے۔

انھوں نے گرم لوہے کے ٹکڑے پر جس وقت پہلی بار زبان رکھی تھی تو آہستہ سے چھَن کی آواز اُبھری۔ اس آواز کو سُن کر قیصر مرزا اس قدر خوف زدہ ہُوا کہ اُس کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی مگر نواب بڈھن اطمینان سے بیٹھے رہے۔ نہ انھوں نے تکلیف سے منہ بگاڑا نہ ہائے کی۔ خدمت گار کو اشارہ کیا۔ اس نے اگالدان اُٹھا کر سامنے کیا۔ نواب بڈھن نے اس میں تھُوک کر منہ صاف کیا۔

نواب بڈھن اُٹھے اور فینس کے قریب پہنچے۔ چمٹی ابھی تک ان کے داہنے ہاتھ میں تھی جس میں لوہے کا دہکتا ہُوا ٹکڑا دبا تھا۔ انھوں نے خدمت گار کی مدد سے مریض کے فالج زدہ بائیں حصّے کو جگہ جگہ سے داغ دیا۔ نواب بُوٹا نے تکلیف سے تڑپ کر اُف کی آواز نکالی۔ یہ پہلی آواز تھی جو فالج کے حالیہ حملے کے بعد اُن کے منہ سے نکلی تھی۔ نواب بڈھن نہایت سکون سے مریض کے جسم کو داغتے رہے اور آہستہ آہستہ قرآن پاک کی کسی آیت کریمہ کی تلاوت کرتے رہے۔

قیصر مرزا فینس کے سامنے خاموش کھڑا تھا۔ اس نے نواب بڈھن سے کچھ پُوچھا۔ نہ ٹوکا، نہ کسی قسم کی مداخلت کی۔ نواب بڈھن نے فارغ ہونے کے بعد قیصر مرزا کی جانب مُڑ کر دیکھا۔ ایک بار پھر تسلّی اور تشفّی دی۔ ضروری ہدایات دیں۔ ڈیوڑھی تک رخصت کرنے اس کے ساتھ ساتھ گئے۔ ان سے رُخصت ہو کر قیصر مرزا گھر پہنچا۔ ماں اور بہنیں بے چینی سے اس کی منتظر تھیں۔

نواب بُوٹا کا جسم جہاں جہاں سے داغا گیا تھا وہاں کی کھال جل کر سیاہ پڑ گئی تھی۔ نواب بڈھن نے جلی ہُوئی کھال پر لگانے کے لئے مرہم کا نسخہ بھی بتایا تھا۔

مرہم تیار کر کے بار بار زخموں پر لگایا جاتا لیکن نواب بُوٹا کو قرار نہ تھا۔ وہ بار بار تڑپ کر گردن کے ساتھ ساتھ جسم کے داہنے حصّے کو اِدھر اُدھر ہلاتے۔ قیصر مرزا تمام رات

معمول کے مطابق اس روز بھی باپ کے پاس موجود رہا۔ ان کو شدید اذیت میں مبتلا دیکھ کر اس کا دل بھر آتا۔ پریشان ہو کر کمرے سے باہر چلا جاتا۔ پھر واپس آجاتا۔

رات بھر یہی ہوتا رہا۔ صبح ہوتے ہوتے مریض کے منہ سے کراہ کے ساتھ ساتھ بے ترتیب اور ٹوٹے پھوٹے الفاظ ادا ہونے لگے۔ قیصر مرزا نے غور کیا کہ جب وہ بے قرار ہو کر پہلو بدلنے کی کوشش کرتے تو جسم کے دائیں حصے کے ساتھ فالج زدہ بائیں حصے میں بھی ہولے ہولے حرکت ہوتی۔

دن نکلا تو بائیں طرف کے ہاتھ اور پاؤں کی حرکت میں اور اضافہ ہو چکا تھا۔ حکیم صاحب آئے۔ مریض کی حالت میں یہ تبدیلی دیکھی تو سخت حیرت زدہ ہوئے۔ البتہ زخم دیکھ کر قدرے پریشان ہوئے مگر ان پر جو مرہم نواب بڈھن کی ہدایت کے مطابق لگایا جا رہا تھا، اسے جاری رکھا۔ اپنے نسخے میں تبدیلی کی اور چلے گئے۔ شام تک مریض کی حالت اور سنبھل چکی تھی۔ نواب بوٹا اب کچھ بولتے تو اس کا مفہوم سمجھ میں آجاتا لیکن زخموں کی تکلیف سے بے چینی بدستور لاحق تھی۔

نواب بوٹا رفتہ رفتہ صحت یاب ہو رہے تھے۔ جب تک وہ صاحب فراش رہے قیصر مرزا ان کی تیمارداری میں اس قدر اُلجھا رہا کہ اسے اپنا بھی ہوش نہ رہا۔ تمام وقت گھر ہی پر رہتا۔

(۳)

صبح سے بُوندا باندی ہو رہی تھی۔ کبھی بارش تیز ہو جاتی، کبھی مدّھم۔ کبھی بادل چھٹ جاتے۔ سُورج بادلوں سے جھانکتا۔ آنکھ مچولی کرتا۔ کہیں دُھوپ ہوتی کہیں چھاؤں۔ دن ڈھلے بارش بالکل بند ہو گئی مگر موسم خوشگوار تھا۔ قیصر مرزا گھر سے نکلا اور عشرت منزل کی جانب روانہ ہُوا۔

قیصر مرزا سُورج ڈوبنے سے پہلے ہی عشرت منزل میں پہنچ گیا۔ آغا جانی نے اسے دیکھتے ہی شکوہ کیا۔ "اماں تم تو ایسے غائب ہوئے جیسے گدھے کے سر سے سینگ، ویسے بھی تم کو

اُب اس جگہ سے کیا دل چسپی رہ گئی۔ وہ شاخ ہی نہ رہی جس پر آشیانہ تھا۔" وہ ابھی نہ جانے اور کیا کیا کہتا مگر قیصر مرزا نے جب اپنے والد کی شدید علالت کے بارے میں بتایا تو گلے شکوے کا سلسلہ ختم ہو گیا۔

قیصر مرزا نے آغا جانی کو غور سے دیکھا۔ اس نے کچھ ہی دیر قبل نہا دھو کر اُجلا لباس پہنا تھا۔ قیصر مرزا نے ٹوہ لگانے کی کوشش کی۔" یہ بن سنور کر کہاں جانے کا ارادہ ہے؟" وہ زیرِ لب مُسکرایا۔

"اگر تم تھوڑی دیر بعد آتے تو مَیں نکل گیا تھا۔"

"یہ بھی اچھا ہُوا کہ مَیں وقت پر پہنچ گیا۔" قیصر مرزا نے کہا۔" پہلے یہ بتاؤ کہ رانی صاحبہ تو میری غیر حاضری میں نہیں آئیں۔"

"نہ وہ آئیں، نہ ان کا ڈرائیور۔" آغا جانی نے بتایا۔" مَیں تو سمجھتا ہُوں کہ اب وہ آئیں گی بھی نہیں۔ آثار تو کچھ ایسے ہی نظر آ رہے ہیں۔"

"ایسا تو نہیں کہ وہ آئی ہُوں اور تم یہاں موجود نہ ہو؟" قیصر مرزا نے قیاس آرائی کی۔" میرا تو خیال ہے کہ وہ ضرور آئی ہوں گی اور اگر نہ آئی ہوں گی تو اپنے ڈرائیور یا کسی ملازم کو ضرور بھیجا ہو گا۔"

"جب سے تم گئے ہو اس وقت سے آج پہلی بار ذرا جلدی نکل کر جانے کا ارادہ تھا۔" آغا نے صفائی پیش کی۔" سُورج ڈوبتے ہی ان کے انتظار میں بیٹھ جاتا تھا۔ گھر سے باہر بھی گیا تو اتنی رات گئے جب ان کی آمد کا کوئی امکان نہ رہا۔ تم کو کیا خبر ان کے انتظار میں کیا، کیا پریشانی اُٹھانا پڑی، کئی بار تو رات کو بھُوکے ہی سونا پڑا۔"

قیصر مرزا خاموش رہا۔ گردن جُھکا کر سوچنے لگا۔

"اماں کیا سوچنے لگے؟" آغا نے خاموشی سے اُکتا کر ٹوکا۔

"ان کے روّیے سے تو لگتا ہے کہ مقدمے کے کاغذات سے ان کو کوئی دلچسپی نہیں۔" قیصر مرزا نے بجھے ہوئے لہجے میں اظہارِ خیال کیا۔" مَیں تو یہ سوچ رہا تھا کہ کاغذات کو جتنا اہم اور ضروری تم سمجھ رہے ہو، وہ اتنے اہم ہی نہ ہوں۔"

"ایسا نہیں ہے۔" آغا نے اتفاق رائے نہ کیا۔ "میری اطلاع تو یہ ہے کہ کاغذات بہت اہم ہیں اور مقدمے کے دونوں ہی فریقوں کے لیے اہم ہیں۔"

"تم نے کاغذات کے بارے میں کسی سے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی تھی؟"

"ہاں۔" آغا نے اعتراف کیا۔ "تم سے تو اس سلسلہ میں بات بھی ہوئی تھی۔ پچھلے اتوار کا ذکر ہے۔ مَیں صبح ہی صبح گھر سے نکلا اور سیدھا تہوّر علی خان کے پاس پہنچا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد میں نے نواب صفی کا ذکر چھیڑا۔ مگر خلافِ معمول اس دفعہ انھوں نے نواب صفی کے خلاف کچھ نہ کہا۔ مَیں نے تاؤ دلانے کی کوشش بھی کی لیکن وہ ذرا نہ بھڑکے۔ میں نے تو ان کی باتوں سے یہ اندازہ لگایا کہ وہ نواب صفی سے صلح صفائی کے لیے بے چین ہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ آج کل تہوّر علی خان کی حالت بہت پتلی ہے۔ ان کا سارا خرچ تو نواب صفی اُٹھاتے تھے۔ انھی کے بل بوتے پر عیش کرتے تھے۔"

"کاغذات کے بارے میں وہ کیا کہتے تھے؟" قیصر مرزا نے مداخلت کی۔

"مَیں نے باتوں باتوں میں نواب صفی کے مقدمے کے بارے میں پوچھا۔" آغا نے بتایا۔ "مقدمے کی بات شروع ہوئی تو دستاویزات اور کاغذات کا بھی ذکر آیا۔"

"مقدمے کے کاغذات کی بات تم نے شروع کی تھی یا انھوں نے؟"

"تم مجھے اناڑی سمجھتے ہو؟" آغا نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "مَیں کیوں کاغذات کا ذکر نکالتا۔ انھوں نے خود ہی ان کے بارے میں بتایا۔ کہنے لگے مقدمے کا دارومدار ان کاغذات پر ہے جو نواب تقی مرحوم کے پسماندگان کی تحویل میں ہیں۔ داروغہ میر نصیر ان کو حاصل کرنے کے لیے بھاگ دوڑ کر رہا ہے۔" آغا نے مُڑ کر قیصر مرزا کی جانب دیکھا۔ "تم میر نصیر کو نہیں جانتے، پہلے وہ نواب تقی مرحوم کا ملازم تھا۔ مقدمہ کی پیروی میں وہی پیش پیش تھا۔ اب وہ نواب صفی کی سرکار سے وابستہ ہے۔"

"داروغہ میر نصیر کا ذکر مَیں نے طلعت آرا سے سُنا تھا مگر اسے کبھی دیکھا نہیں۔ طلعت آرا کی رائے اس کے بارے میں کچھ اچھی نہیں۔" قیصر مرزا نے جھجکتے ہوئے دریافت کیا۔ "تم اس سے ملے تھے؟"

"ہاں! چند ہی روز قبل میری اس سے ملاقات ہوئی تھی۔" آغا نے بتایا۔ "ہوا یہ کہ جب تہوّر علی خان نے کاغذات کی اہمیت جتائی تو میں چوکنا ہوا۔ اس وقت تو خاموش رہا۔ ایک روز کا غوطہ دے کر پھر تہوّر علی خان کے پاس پہنچا۔ ان کو کچھ اور کریدا پھر یہ اشارہ دیا کہ مقدمے کے کاغذات مل سکتے ہیں۔"

"تم نے ان کو سب کچھ صاف صاف تو نہیں بتادیا؟" قیصر مرزا نے گھبرا کر پوچھا۔

"اماں، تم مجھے بھی اپنی طرح لونڈا سمجھتے ہو۔" آغا نے فوراً وضاحت کی۔ "میں نے بہت گھما کر بات کی تھی۔ تہوّر علی خان نے بہت اصرار کیا مگر میں نے ذرا ہوا نہ لگنے دی۔ یہ تک نہ بتایا کہ میں ان دنوں عشرت منزل میں رہتا ہوں۔" وہ زیرِ لب مسکرایا۔ "لیکن ان کو تو بہانہ چاہیئے تھا۔ اسی روز اپنی بہن کے پاس پہنچے۔ ان سے ذکر کیا۔ انھوں نے نواب صفی کو بُلا کر سالے بہنوئی کے درمیان صلح صفائی کرادی۔ تہوّر علی خان نے مقدمے کے کاغذات کے سلسلے میں میرا بھی ذکر کیا۔"

"یار تم کو کیسے معلوم ہوا کہ تہوّر علی خان نے نواب صفی سے تمھارا ذکر کیا تھا؟"

"دوسرے یا تیسرے روز کا ذکر ہے۔ میں تہوّر علی خان کی ڈیوڑھی سے نکل رہا تھا کہ گلی میں خاقان مرزا مل گئے۔ وہ میرے انتظار میں نہ جانے کب سے کھڑے تھے۔ میری ان سے کچھ زیادہ شناسائی نہیں مگر داروغہ میر نصیر سے ان کی گاڑھی چھنتی ہے" آغا جانی سنبھل سنبھل کر بولتا رہا۔ "خاقان مرزا مجھے میر نصیر کے پاس لے گئے۔ میر نصیر سے باتیں ہوئیں تو یہ عقدہ کھُلا کہ نواب صفی نے ان سے میرا ذکر کیا تھا۔ اگر تہوّر علی خان نہ بتاتے تو نواب صفی میرا حوالہ کیوں دیتے۔ میری تو اُن سے کبھی ملاقات ہی نہیں ہوئی۔"

"میر نصیر تم سے کیا کہتا تھا؟" قیصر مرزا نے دریافت کیا۔

"اماں، وہ تو ایک نمبر گھاگ ہے۔ اُس نے بھی بڑا زور مارا مگر میں نے پٹھے پر ہاتھ نہ رکھنے دیا۔ اُسے بھی کچھ نہ بتایا لیکن اس سے ملنے کے بعد یہ اندازہ ہوگیا کہ ان کاغذات کی بڑی اہمیت ہے۔ میر نصیر ان کو حاصل کرنے کے لئے بہت بے چین نظر آتا ہے۔" آغا نے قیصر مرزا کو صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ "پرسوں ہی تو اس سے

ملاقات ہوئی تھی۔ وہ تو کل ہی صبح ملنے پر مصر تھا مگر میں نے اس کا اشتیاق بڑھانے کے لیے بہانہ کر دیا۔ اس وقت اسی کے پاس جا رہا تھا۔ میرا انتظار ہی کر رہا ہو گا۔" اس نے قدرے تامل کے بعد کہا۔ "اچھا ہوا وہاں جانے سے قبل تم سے ملاقات ہو گئی۔"

"مگر یار رانی صاحبہ سے جب تک ملاقات نہ ہو جائے، داروغہ میر نصیر سے تم کو نہیں ملنا چاہیئے تھا۔" قیصر مرزا پر آغا جانی کی باتوں کا خوشگوار ردِ عمل نہ ہوا۔

"اماں، میر نصیر سے مل لینے میں حرج ہی کیا ہے۔ میں نے تو اُسے کچھ بھی نہیں بتایا بلکہ اس سے کچھ معلومات ہی حاصل ہو گئیں۔" آغا جانی نے فوراً صفائی پیش کی۔ "میر نصیر ہی کی زبانی یہ بھی معلوم ہو گیا کہ طلعت آرا کی والدہ بارہ دری خالی کر کے اپنے دوسرے مکان امیر محل میں چلی گئی ہیں۔ میں نے تو ان کے بارے میں کچھ پوچھا نہیں۔ پوچھ بھی نہ سکتا تھا ورنہ اُسے شبہ ہو جاتا۔ اس نے باتوں باتوں میں خود ہی بتا دیا۔"

"آج اس نے تم کو کیوں بُلایا ہے؟"

"مقدمے کے کاغذات ہی کے بارے میں بات کرنا ہو گی۔" آغا نے جواب دیا۔

"خالی صورت دیکھنے کے لیے تو مجھے بلانے سے رہا۔"

"لیکن اس کے پاس جانے سے پہلے رانی صاحبہ سے تو بات چیت ہو جائے۔"

"اُن سے تو تم بات کرو گے۔ مجھے تو اُن سے کوئی بات کرنا نہیں۔" آغا جانی نے بے نیازی سے کہا۔ "ویسے مجھے تو اب وہ آتی ہوئی معلوم نہیں ہوتیں۔ یار انتظار کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔" اس نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ "تم یہاں بیٹھ کر اُن کا انتظار کرو۔ میں تو اب میر نصیر کے پاس جاؤں گا اس سے مل کر کچھ کام ہی کی باتیں معلوم ہوں گی اور وہ باتیں میرے بجائے تمہارے ہی لیے دلچسپی کا باعث ہوں گی۔"

آغا جانی اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ قیصر مرزا خاموش بیٹھا رہا۔

(۴)

برسات کی سانولی سلونی شام تھی۔ عشرت منزل کے پچھواڑے کسی پُرانی عمارت

کا کھنڈر تھا۔ کھنڈر کے سامنے وسیع میدان تھا۔ میدان کے ایک گوشہ میں کمہاروں کے مکانات تھے۔ مکانوں کے آگے نیم کا تناور درخت تھا۔ درخت کی ایک موٹی اور مضبوط ڈال پر کمہاروں کی نوجوان عورتوں اور لڑکیوں نے جھولا ڈالا تھا۔ اس سمت سے لہک لہک کر گانے کی آوازیں اُبھر رہی تھیں۔

کوئل کُوکے، مُور دا بولے
گائے پپیہا ملہار رے
جائے کہیو مُورے پی سے
بھیجے نہ اب کے کہار رے

ساون کا مہینہ ختم ہو رہا تھا۔ اس روز گڑیوں کا تہوار تھا۔ بازاروں میں گہما گہمی اور چہل پہل تھی۔ حلوائیوں کی دکانوں پر خریداروں کی بھیڑ تھی۔ بھٹیوں پر کڑھاؤ چڑھے تھے۔ اندرسوں اور اندرسے کی گولیوں کو گھی میں تلا جا رہا تھا۔ گھروں میں بھی طرح طرح کے پکوان پک رہے تھے۔ ان کی تیز خوشبو فضا میں رچی ہوئی تھی۔ ہر گھر میں مسرت و شادمانی تھی۔ گڑیوں کے میلے میں جانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔

محل سراؤں اور کوشکوں میں خوانوں اور کشتیوں کو نہایت اہتمام سجایا جا رہا تھا۔ کسی خوان میں اندرسے تھے، کسی میں اندرسے کی گولیاں تھیں، کسی کشتی میں رنگ برنگی چُنریاں اور دھانی چُوڑیاں تھیں۔ کسی میں نقرئی ورق لگے ہوئے آم تھے۔ خوانوں اور کشتیوں کو گوٹا کناری لگے۔ خوان پوشوں سے ڈھانپا جا رہا تھا۔ یہ ساوُنی تھی۔ کہار اور مہریاں ساوُنی کے ان خوانوں اور کشتیوں کو سروں پر رکھ کر نئی نویلی دلہنوں کے لئے میکے سے سسرال پہنچانے جا رہے تھے۔

گلی کوچوں کے چوراہوں پر بچوں کے ساتھ بڑوں کا بھی ہجوم تھا۔ چراغ روشن ہوتے ہی ہندوؤں کے بچے اور بچیاں گھروں سے نکل نکل کر چوراہوں پر اکٹھے ہو رہے تھے۔ ان کے ہاتھ میں ڈیڑھ ڈیڑھ گز اُودی، اور چُنریوں کی طرح رنگیں اور لہریا لکڑی کی

پتلی پتلی چھڑیاں اور کپڑے کی بنی ہوئی گڑیاں دبی تھیں۔ گڑیوں کو چوراہے پر رکھا جاتا اور چھڑیوں سے پیٹا جاتا تاکہ آنے والی الا بلا کا سدّباب ہو جائے۔

شام ہو گئی۔ دھندلی دھندلی روشنی میں چوراہوں پر گڑیاں پٹ پٹ کر پھٹ رہی تھیں بچے خوش ہو کر تالیاں بجا رہے تھے۔ قہقہے لگا رہے تھے۔ شور مچا رہے تھے۔

☆

اکھاڑوں پر صبح ہی سے چہل پہل شروع ہو گئی تھی۔ مہینوں پہلے اُستادوں نے اپنے اکھاڑے کے پٹھوں پر ریاض شروع کر دیا تھا۔ نت نئے داؤں پیچ سکھاتے تھے۔ ہر اکھاڑا دوسرے کی سرگرمیوں کی ٹوہ میں رہتا۔ مخبر چھوڑے جاتے۔ وہ چوری چھپے جاتے اور حریفوں کے بارے میں تازہ بہ تازہ اور نو بہ نو اطلاعات لے کر آتے۔ ان اطلاعات کی روشنی میں دنگل کے لیے اور زور و شور سے تیاریاں کی جاتیں۔ بلوچ پورہ اور جھنوائی ٹولہ کے اکھاڑے ان دنوں مشہور بھی تھے اور ایک دوسرے کے حریف بھی تھے۔ دونوں اکھاڑوں کی تیاری کا ہر طرف چرچا تھا۔

دوپہر کو اکھاڑوں کی رونق اپنے شباب پر پہنچ گئی۔ پہلوانوں کی ٹولیاں رنگین پگڑیاں باندھے، کڑھے ہوئے کرتے پہنے، ریشمی تہہ بند باندھے، ڈھول پیٹتی، جھانج بجاتی نعرے لگاتی اپنے اپنے اکھاڑوں سے نکل نکل کر باہر آتیں اور بازاروں میں شمشیر زنی، بانے پٹے اور پھری گدکے کے کمالات دکھاتیں، تماشائیوں سے داد و تحسین وصول کرتیں، دنگل کی جانب روانہ ہو جاتیں۔

شہر میں جگہ جگہ دنگلوں کا اہتمام کیا گیا تھا۔ پہلوان اپنے کسرتی جسموں کی خوبصورتی اور بناوٹ کی نمائش کرتے، اُچھلتے کودتے۔ "یا علی" کے نعرے لگاتے اکھاڑوں میں اُتر رہے تھے۔ خم ٹھونک کر حریفوں کو للکار رہے تھے۔ زور آزمائی کر رہے تھے۔ جیت رہے تھے، ہار رہے تھے، برابر چھوٹ رہے تھے۔ مگر چراغ جلے نئی جوڑیوں کی کشتیوں کا دور ختم ہو گیا اور استادوں کے مایہ ناز پٹھے مقابلے پر آنے لگے تھے۔ اپنے اکھاڑے کا نام روشن کرنے کے لیے جان لڑا دینے کا عزم رکھتے تھے۔

اس بار بھی معرکے کا دنگل صادق اور اُدھا کے درمیان تھا۔ دونوں ہی شہر کے نامی گرامی پہلوان تھے۔ ہر سُو ان کی کُشتی کا چرچا تھا۔ اس کُشتی کا اعلان بہت پہلے ہو چکا تھا۔ شہر کی دیواروں پر بڑے بڑے پوسٹر چسپاں کئے گئے تھے، جن پر دونوں پہلوان لنگوٹ باندھے، سینہ تانے، گردنیں اُونچی کئے، بھاری بھر کم گرُز اُٹھائے، اپنے کسرتی جسموں کی سج دھج کے ساتھ نظر آتے تھے۔ اُدھا پہلوان پہلے دنگل میں صادق سے کُشتی ہار چکا تھا۔ وہ شادی شدہ تھا۔ کسی قدر ڈھل بھی گیا تھا۔ یہ اس کی آخری کُشتی تھی۔ سُننے میں آیا تھا کہ اس بار اُدھا پوری تیاری کے ساتھ صادق کے مقابلے پر آیا تھا۔

اس دنگل کا اہتمام سرکار کی نگرانی میں کیا گیا تھا۔ انگریز ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ دنگل کی انتظامی کمیٹی کا سرپرست تھا۔ دنگل کا آغاز بھی اسی وقت ہوتا تھا جب وہ اکھاڑے میں اپنی مخصوص نشست پر براجماں ہو جاتا تھا۔ اس کی میم بھی ہمیشہ ہمراہ ہوتی تھی اور نہایت ذوق و شوق سے کُشتی دیکھتی تھی۔ ہار جیت کے فیصلے بھی ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی منظوری سے کئے جاتے تھے اور دنگل کے اختتام پر وہی انعامات بھی تقسیم کرتا تھا۔ شہر کے رئیس اور اُمراء اس کا قرب حاصل کرنے کی غرض سے دنگل میں شریک ہوتے تھے اور کئی سو روپے کے ٹکٹ خرید کر شریک ہوتے تھے۔

قیصر مرزا بھی اپنے والد کے ہمراہ دنگل دیکھنے جاتا تھا۔ اسے پہلوانی سے لگاؤ بھی تھا اور ایک زمانے میں تو ایسا شوق سوار ہُوا تھا کہ اُستاد چھوٹے سید کی شاگردی اختیار کر لی تھی۔ ان دنوں وہ صبح ہی صبح جھنوائی ٹولے پہنچ جاتا۔ چھوٹے سید اپنے اکھاڑے میں اُسے زور کراتے۔ نواب بُوٹا نے پہلوانی اور ورزش میں بیٹے کا بڑھتا ہُوا شوق دیکھا تو گھر کے احاطے میں اکھاڑا کھُدوا کر ایک پہلوان بھی مقرر کر دیا۔ مگر پچھلے کئی سال سے اسے پہلوانی سے کوئی دلچسپی نہ رہی تھی۔ البتہ صبح اُٹھ کر ورزش کرتا تھا اور وہ بھی پابندی سے نہ کرتا تھا۔

لیکن صادق اور اُدھا پہلوان کی کُشتی سے اُسے گہری دلچسپی تھی۔ دونوں کا پچھلا دنگل اس نے بڑے شوق سے دیکھا۔ اس بار وہ باپ کی شدید علالت کے باعث

ایسا پریشان رہا کہ دنگل دیکھنے کا خیال ہی نہ آیا۔ اس وقت بھی وہ نہ صرف دنگل بلکہ کوچہ و بازار کی گھما گھمی اور ہنگاموں سے بے نیاز عشرت منزل کی ایک ویران صحنچی میں تنہا اور گم صم بیٹھا تھا۔

☆

اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ قیصر مرزا لالٹین کی ہلکی ہلکی زرد روشنی میں سائے کی مانند نظر آ رہا تھا۔ ہر طرف ویرانی برس رہی تھی۔ در و دیوار دم بخود تھے۔ قیصر مرزا کو آغا جانی کا انتظار تھا لیکن وہ ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ قیصر مرزا اکتا کر کھڑا ہو گیا۔ صحنچی سے نکل کر باہر صحن میں پہنچ گیا اور دالان کے سامنے بے چینی سے ٹہلنے لگا۔

ڈیوڑھی کے بیرونی دروازے پر آہٹ ہوئی تو قیصر مرزا نے مڑ کر اس سمت دیکھا۔ دروازے پر رُک رُک کر آہٹ ہوتی رہی اور رفتہ رفتہ تیز اور اُونچی ہوتی گئی۔ قیصر مرزا نے ڈیوڑھی کی جانب بڑھتے ہوئے بلند آواز میں کہا۔ "اماں آغا جانی ذرا صبر تو کرو۔" مگر آہٹ بند ہونے کے بجائے دروازے کی کنڈی کو اور زور سے کھٹکھٹایا جانے لگا۔

قیصر مرزا لمبے لمبے ڈگ بھرتا ڈیوڑھی کے اندر داخل ہُوا۔ دروازہ کھولتے ہی بھینی بھینی خوشبو کا جھونکا آیا۔ اس نے بے قرار ہو کر دیکھا، دُھندلی دُھندلی روشنی میں ایک عورت سامنے کھڑی تھی۔ وہ سیاہ ریشمی بُرقع پہنے ہوئے تھی۔ چہرے پر نقاب پڑی تھی۔ اس کے ہمراہ ادھیڑ عمر کا ایک آدمی بھی تھا۔ قیصر مرزا حیرت سے آنکھیں پھاڑے عورت کو دیکھ رہا تھا۔ وہ چند لمحے خاموش رہی پھر قریب کھڑے ہوئے آدمی کی جانب متوجہ ہوئی۔ "ڈرائیور! تم کار کے پاس جا کر میرا انتظار کرو۔ میں تھوڑی دیر بعد واپس پہنچ جاؤں گی۔" اس کے انداز میں حاکمانہ طنطنہ تھا۔

قیصر مرزا نے آواز سن کر فوراً پہچان لیا۔ وہ رانی حیدر گڑھ ارجمند سلطانہ تھیں۔

ڈرائیور نے کچھ نہ کہا۔ خاموشی سے مڑا اور آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ اس کے قدموں کی آہٹ گلی کے پُختہ فرش پر دُور تک سُنائی دیتی رہی۔

قیصر مرزا نے جُھک کر آداب کیا۔ گھبرائے ہوئے لہجے میں گویا ہوا۔" ارے رانی صاحبہ! یہ آپ ہیں۔ معاف کیجیے میں بالکل پہچان نہ سکا۔"

ارجمند سلطانہ نے چہرے پر سے نقاب اُلٹ دی۔ مُسکرا کر گویا ہوئیں۔" شاید تم اس لیے نہ پہچان سکے کہ میں آج برقع پہنے ہوئے ہوں۔" اُنھوں نے قدرے توقّف کے بعد کہا۔" ویسے میں برقع استعمال نہیں کرتی۔ ساری زندگی بے پردہ رہی مگر یہاں آتے ہوئے مجھے برقع پہننا پڑا۔ میں نہیں چاہتی کہ کسی کو میرے یہاں آنے کی اطلاع ہو۔" انھوں نے تاکید کی۔" تم بھی اس سلسلے میں احتیاط سے کام لینا۔ کسی سے میری آمد کے بارے میں ذکر نہ کرنا۔"

"جیسا آپ نے فرمایا ویسا ہی کروں گا۔" قیصر مرزا نے ان کو یقین دلایا۔ ہاتھ بڑھا کر دروازے کا ایک پٹ کھول دیا اور ایک طرف ہٹ کر بولا۔" اندر تشریف لائیں۔"
ارجمند سلطانہ خاموشی سے ڈیوڑھی میں داخل ہوگئیں۔ قیصر مرزا نے دروازہ بند کر کے کُنڈی لگا دی۔ ڈیوڑھی میں گھُپ اندھیرا ہوگیا۔

ارجمند سلطانہ پریشان ہو کر بولیں۔" یہاں تو سخت اندھیرا ہے۔ مجھے تو کچھ نظر نہیں آرہا۔"

قیصر مرزا نے ان کو اطمینان دلایا۔" پریشان نہ ہوں۔ یہیں ٹھہر جائیے۔ میں ابھی روشنی کا بندوبست کرتا ہوں۔" وہ مڑا اور تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا صحن سے گزر کر دالان میں پہنچا۔ کھونٹی پر لٹکی ہوئی لالٹین اُتاری اور اسے ہاتھ میں سنبھالے ہوئے واپس ڈیوڑھی میں پہنچا۔ ارجمند سلطانہ کو اپنے ہمراہ آنے کا اشارہ کیا۔

دونوں ڈیوڑھی سے نکل کر باہر آئے۔ قیصر مرزا لالٹین سنبھالے آگے آگے تھا۔ ارجمند سلطانہ لالٹین کی روشنی میں اس کے پیچھے پیچھے چل رہی تھیں۔ قیصر مرزا کہیں رُکا نہیں۔ صحن عبور کر کے دالان میں پہنچا۔ اور دالان سے گزر کر زینے میں داخل ہوگیا۔ ارجمند سلطانہ سنبھل سنبھل کر چل رہی تھیں۔ عشرت منزل پر ویرانی برس رہی تھی۔ وہ اس ویرانی سے پریشان بھی ہوئیں مگر خاموش رہیں۔ زینے میں گہرا اندھیرا تھا۔ سیڑھیاں بھی شکستہ تھیں۔

وہ رُک رُک کر قدم اُٹھاتی ہوئی ایک کے بعد دوسری سیڑھی طے کرتی رہیں۔ قیصر مرزا بار بار پلٹ کر ان کی جانب دیکھتا۔ لالٹین سے راستہ دکھاتا۔

اندھیرے اور سنسان زینے سے گزر کر دونوں کمرے میں پہنچے۔ ارجمند سلطانہ بالکل خاموش تھیں۔ ان کے داخل ہوتے ہی کمرہ خوشبو سے مہکنے لگا۔ قیصر مرزا نے لالٹین ایک طرف رکھی۔ آگے بڑھ کر لیمپ روشن کیا اور کرسی کھسکا کر سامنے کرتے ہوئے بولا "تشریف رکھیئے۔" لیمپ کی اُجلی اُجلی روشنی میں اس نے دیکھا کہ ارجمند سلطانہ ہاتھوں پہ ہلکے گلابی رنگ کے ریشمی دستانے پہنے ہوئے تھیں۔ ان کی آنکھوں میں دنبالہ کاجل تھا اور ہونٹوں پر سرخی تھی۔ وہ سلیقے سے میک اَپ کیے ہوئے تھیں اور ڈھلتی عمر کے باوجود اس وقت باوقار اور دل کش نظر آرہی تھیں۔

ارجمند سلطانہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولیں۔ "قیصر مرزا، تم اس ویران مکان میں کیسے رہتے ہو؟ تمھارا دل نہیں گھبراتا؟"

"شروع شروع میں بہت گھبراتا تھا مگر اب تو اس ماحول کا عادی ہو گیا ہوں۔" قیصر مرزا مُسکرا کر بولا۔ "مَیں تو کبھی کبھی اُکتا بھی جاتا ہوں لیکن آغا نہایت اطمینان سے رہتا ہے۔ آپ نے تہہ خانہ نہیں دیکھا۔ وہ تو اور بھی زیادہ ویران ہے۔ آغا نہ گھبراتا ہے، نہ ڈرتا ہے۔ اطمینان سے وہاں بیٹھ کر رات رات بھر چِلّہ کشی کرتا ہے۔"

"اس وقت بھی وہ تہہ خانے میں چِلّہ کشی کر رہا ہے؟" ارجمند سلطانہ نے دریافت کیا۔

"جی نہیں، ایک کام کے سلسلہ میں باہر گیا ہے۔" قیصر مرزا نے کام کی نوعیت نہ بتائی اور نہ ہی ارجمند سلطانہ نے اس کے بارے میں استفسار کیا۔ انھوں نے بات کا رُخ بدلتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ "معاف کرنا قیصر مرزا! تم کو میرا بہت انتظار کرنا پڑا۔"

"انتظار کرتے کرتے میں تو اب مایوس ہو چکا تھا۔" قیصر مرزا نے دبی زبان سے گلہ کیا۔ "سوچا، شاید آپ اپنا وعدہ بھُول گئیں۔"

"نہیں مَیں اپنا وعدہ نہیں بھُولی۔" ارجمند سلطانہ نے اسے مطلع کیا۔ "میں نے دو بار اپنے ڈرائیور کو یہاں بھیجا۔ ایک بار صرف آغا سے ملاقات ہوئی۔ دوسری بار کوئی نہ

ملا۔ دروازے پر نالا پڑا تھا۔ آج میں خود ہمت کر کے آ گئی حالانکہ یقین نہ تھا کہ تم مل جاؤ گے۔"

"آنے سے پہلے آپ نے پیارے آغا صاحب کے ذریعہ کہلوا دیا ہوتا۔"

ارجمند سلطانہ نے چونک کر قیصر مرزا کو دیکھا۔ "تم پیارے آغا کو جانتے ہو؟" ان کے لہجے میں استعجاب تھا۔

"پچھلے دنوں ان سے ملنے کا اتفاق ہُوا۔ پہلے سے واقفیت نہ تھی۔" قیصر مرزا نے وضاحت کی۔ "ابا جان سخت علیل تھے۔ نواب پیارے آغا اُن کی عیادت کے لیے آئے تھے۔ انھی کے ملنے والے ہیں۔ مگر میں نے ان کو پہلی بار دیکھا۔"

ارجمند سلطانہ نے پیارے آغا کے متعلق مزید گفتگو نہ کی۔ "اب تمہارے والد کی طبیعت کیسی ہے؟ تشویش کی تو کوئی بات نہیں؟"

"اب تو طبیعت بہتر ہے۔ ان پر فالج کا دوبارہ اثر ہوا تھا۔ میں تو ان کی بیماری کے باعث یہاں بھی نہ آیا۔ آج عرصے بعد آیا تھا۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "جب سے بارہ دری خالی ہوئی ہے میں نے یہاں آنا جانا قریب قریب چھوڑ ہی دیا ہے۔" اُس نے نظریں اُٹھا کر ارجمند سُلطانہ کی جانب دیکھا۔ "میں تو بالکل یہ سوچ کر اس جمعرات کو بارہ دری کے کمرے میں گیا تھا کہ طلعت آرا وہاں ہوں گی۔ آپ نے فرمایا تھا کہ وہ ضرور آئیں گی۔ یہی وعدہ فرمایا تھا نا آپ نے؟"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ میں نے یہی کہا تھا۔" ارجمند سلطانہ نے دبی زبان سے اعتراف کیا۔ "مگر تم یہ بھی جانتے ہو کہ میں اس کی ماں نہیں ہوں۔ اپنی ماں کی مرضی کے بغیر وہ کیسے آ سکتی تھی؟"

"لیکن پہلے تو وہ برابر آتی رہیں اور ان کی والدہ نے کبھی روکا نہ ٹوکا۔ یہ بات خود طلعت آرا نے مجھے بتائی تھی۔ یہ اچانک کیسے ہو گیا کہ ان کی والدہ نے نہ صرف آنے نہ دیا بلکہ بارہ دری خالی کر کے امیر محل میں منتقل ہو گئیں۔ یہ سب کیسے ہو گیا؟" وہ اپنی بات کہتے کہتے رُکا۔ لمحہ بھر خاموش رہا۔ پھر جھجکتے ہوئے پوچھا۔ "کیا آپ نے ان کو سب کچھ صاف صاف بتا دیا؟"

"یقین مانو قیصر مرزا، میں نے ان کو کچھ نہیں بتایا۔" ارجمند سلطانہ نے نرم لہجے میں کہا۔ "انھوں نے بارہ دری کیوں خالی کر دی۔؟ میں اس سلسلے میں کچھ بتانا نہیں چاہتی۔ تم سے صرف یہی کہہ سکتی ہوں کہ کچھ نہ پوچھو تو مناسب ہے۔ میں تم کو کچھ نہ بتا سکوں گی۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ طلعت آرا سے اب میں کبھی نہ مل سکوں گا، ان کو کبھی نہ دیکھ سکوں گا۔" اس نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ہاں، تم اب اس سے کبھی نہ مل سکو گے۔" ارجمند سلطانہ نے دو ٹوک لہجے میں کہا۔ "میں نے تو بہت کوشش کی کہ چوری چھپے ملاقاتوں کے بجائے طلعت آرا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تمہاری ہو جائے۔ تمہارے رشتے کے لیے میں نے بہت زور دیا۔ مگر پھوپھی جانی کسی طور راضی نہ ہوئیں۔"

"اپنی نند کے بیٹے علی رضا سے طلعت آرا کی شادی کرنا چاہتی ہوں گی۔" قیصر مرزا نے قیاس آرائی کی۔ "وہ تو ایک مدت سے اس کوشش میں لگا ہوا تھا۔" اچانک اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ "مگر رانی صاحبہ، یہ آسانی سے نہ ہو سکے گا۔ میرے جیتے جی تو یہ نہیں ہوگا۔" وہ اور غضبناک ہو گیا۔ "خون بہے گا۔ لاشیں گریں گی۔ میں رہوں گا یا علی رضا۔"

"خواہ مخواہ خود کو بدگمانی میں مبتلا نہ کرو۔" ارجمند سلطانہ نے قیصر مرزا کو غیظ و غضب کے عالم میں دیکھا تو غصہ ٹھنڈا کرنے کے لیے رسان سے کہا۔ "طلعت آرا کا رشتہ نہ علی رضا سے طے ہو رہا ہے اور نہ کسی اور سے۔" وہ زیرِ لب مسکرائیں۔ "جہاں تک مجھے علم ہے، علی رضا سے تو طلعت آرا کی شادی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"یہ بات آپ اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتی ہیں؟" قیصر مرزا نے مشتبہ نظروں سے ارجمند سلطانہ کو دیکھا۔

"شاید تم کو یہ نہیں معلوم کہ جائیداد کے بٹوارے کے سلسلہ میں نواب صفی سے جو مقدمہ بازی ہو رہی ہے، اس میں علی رضا کی والدہ نفیسہ بیگم، درپردہ نواب صفی کی طرفدار ہیں۔ ویسے بھی وہ ان کی سگی بہن ہیں۔" ارجمند سلطانہ نے وضاحت کی۔ "چھوٹی

جانی کو اس کا علم ہے۔ سارا جھگڑا تو جائیداد ہی کا ہے۔ اگر ملی رضا سے طلعت آرا کی شادی ہو گئی تو نہ صرف ددھیال کی جائیداد بلکہ پھوپھی جانی کی اپنی بھی جائیداد طلعت آرا کے ساتھ دوسرے فریق کے قبضے میں چلی جائے گی۔ تم خود ہی سوچو کہ پھوپھی جانی کس طرح یہ بات مان لیں گی۔"

"واللہ، مجھے اس مقدمہ بازی کی ان پیچیدگیوں کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔" قیصر مرزا نرم پڑ گیا۔ "مقدمے کے کاغذات بھی میں نے آغا کے بار بار کہنے پر منگوا لیے تھے۔ اس سلسلہ میں پہلے بھی آپ کو بتا چکا ہوں۔"

"وہ کاغذات اب کہاں ہیں؟"

"میرے ہی پاس ہیں اور یہیں رکھے ہیں۔"

"تم نے ان کے بارے میں کیا سوچا ہے؟" ارجمند سلطانہ نے جھجکتے ہوئے دریافت کیا۔ "میرا مطلب ہے کہ تم نے ان کو اپنے پاس کس لئے رکھ چھوڑا ہے؟"

"میں نے پہلے بھی آپ سے عرض کیا تھا کہ طلعت آرا جمعرات کو آئیں گی تو مقدمے کے کاغذات انھی کو واپس کر دوں گا۔" قیصر مرزا نے نہایت سادگی سے بتایا۔ "آپ کو ان کے بارے میں اس وقت تک علم ہی نہ تھا۔ میں نے خود ہی آپ کو آگاہ کیا تھا۔ یاد ہے نا آپ کو؟"

"بالکل یاد ہے۔" ارجمند سلطانہ نے جواب دیا۔ "لیکن طلعت آرا تو آئی نہیں۔"

"رانی صاحبہ، کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ طلعت آرا ایک بار صرف ایک بار میرے پاس آ جائیں۔ میں کاغذات اپنے ہاتھ سے ان کو واپس دینا چاہتا ہوں۔ ان کے زیورات تو میں ابھی نہیں لوٹا سکوں گا مگر کبھی نہ کبھی ضرور دے دوں گا۔" قیصر مرزا اس قدر جذباتی ہو گیا کہ گڑگڑانے لگا۔ "میں ایک بار طلعت آرا سے ضرور ملنا چاہتا ہوں۔ آپ کوشش کریں تو وہ آ سکتی ہیں۔ میری خاطر آپ کوشش کر کے تو دیکھیں۔ میرا دل گواہی دیتا ہے کہ طلعت آرا کی والدہ آپ کی بات نہیں ٹالیں گی۔"

ارجمند سلطانہ کچھ نہ بولیں۔ گردن جھکا کر سوچ میں گم ہو گئیں۔

قیصر مرزا نے چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بے چین ہو کر اصرار کیا۔ "رانی صاحبہ! آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔"

"تم کو یہ سن کر دکھ ہوگا کہ طلعت آرا سخت علیل ہے۔" ارجمند سلطانہ نے بجھے ہوئے لہجے میں قیصر مرزا کو بتایا۔ "اُسے تپ دق ہو گئی ہے۔ دن بہ دن اس کی حالت بگڑتی جا رہی ہے۔ چلنے پھرنے سے بھی قریب قریب معذور ہو گئی ہے۔" اُنھوں نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "تم ہی بتاؤ ایسی صورت میں کس طرح میں اُسے لا سکتی ہوں۔ وہ آج کل یہاں ہے بھی نہیں۔ حکیم صاحب کے مشورے پر پھوپھی جانی اُسے اپنے ہمراہ آب و ہوا کی تبدیلی کے لیے نیلم پور لے گئی ہیں۔ نیلم پور ہے تو چھوٹا سا گاؤں مگر بڑا پُرفضا مقام ہے۔ پھوپھی جانی کی زمین داری ہی میں واقع ہے۔ میں پچھلے ہی دنوں وہاں گئی تھی۔"

"وہاں جانے کے بعد طلعت آرا کی طبیعت کچھ سنبھلی؟" قیصر مرزا نے بے قرار ہو کر دریافت کیا۔

"مجھے تو کوئی خاص فرق نظر نہیں آیا۔"

قیصر مرزا خاموش بیٹھا رہا۔ اسکے چہرے پر غم کے سائے پھیل گئے۔ آنکھیں بجھی بجھی نظر آنے لگیں۔ وہ کھڑکی کی جانب دیکھ رہا تھا۔ کھڑکی کے دونوں پٹ کھلے تھے۔ ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے اندر آ رہے تھے۔ ساون کی سرمئی شام اب کالی کاجل ہو گئی تھی۔ عشرت منزل اندھیرے میں بھائیں بھائیں کر رہی تھی۔

"قیصر مرزا!" رانی حیدر گڑھ نے اسے مخاطب کیا۔ "تم طلعت آرا کو دیکھو گے تو پہچان نہ سکو گے۔ سوکھ کر کانٹا ہو گئی ہے۔ آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے ہیں۔ وہ تو پہلے ہی نازک اور دھان پان تھی۔ بیماری نے اور لاغر بنا دیا ہے۔ گھن کی طرح اس کی صحت کو کھا گئی۔"

قیصر مرزا گم صم بیٹھا رہا۔

ارجمند سلطانہ نے بے چین ہو کر پہلو بدلا۔ گہری خاموشی میں ان کی آواز اُبھری۔ "مجھے

اب چلنا چاہیئے۔"

"چلی جایئے گا۔" قیصر مرزا نے آہستہ سے کہا۔" طلعت آرا سے تو اب کیا ملاقات ہوگی۔ آپ سے بھی شاید نہ ہو سکے۔" اس نے گہری سانس بھری۔" رانی صاحبہ، یہ تو بتایئے کبھی طلعت آرا سے میرے بارے میں بھی بات ہوئی؟"

"ہاں، ایک بار۔ اس نے بتایا تھا کہ مقدمے کے کاغذات اس نے تم کو دے دیئے ہیں مگر زیورات کا کوئی ذکر نہیں کیا۔" ارجمند سلطانہ نے جواب دیا۔" کاغذات کے ذکر پر مجھے یاد آیا۔" انھوں نے قدرے توقف کے بعد پوچھا۔" تم نے ان کے بارے میں کیا فیصلہ کیا؟"

"مجھے کیا فیصلہ کرنا ہے؟ جیسا آپ فرمائیں گی وہی کروں گا۔" قیصر مرزا نے نرم لہجے میں کہا۔" مگر مجھے کچھ مہلت دیں تاکہ میں آغا جانی سے بھی بات کرلوں۔" اس نے اپنی بات کا جواز بھی پیش کیا۔" یہ تو آپ کو بتا ہی چکا ہوں کہ اسی کے کہنے پر یہ کاغذات منگوائے گئے تھے۔"

"نہ تم مقدمے میں فریق ہو، نہ آغا جانی، لہٰذا یہ کاغذات تمہارے کام کے نہیں۔" ارجمند سلطانہ نے اس دفعہ صاف اور کھرے انداز میں بات کی۔" اگر تم کچھ رقم لینا چاہتے ہو تو میں اس کے لیئے تیار ہوں۔" انھوں نے نظریں اُٹھا کر قیصر مرزا کی جانب دیکھا اور بڑے باوقار انداز میں پوچھا۔" پانچ ہزار کی رقم مناسب رہے گی؟"

ارجمند سلطانہ تعلقہ دار تھیں۔ ان کے رویّہ میں جاگیردارانہ طنطنہ تھا۔ مگر قیصر مرزا بھی رئیس زادہ تھا۔ اس کی انا کو سخت ٹھیس پہنچی۔ رگ حمیت پھڑکی تو تیکھے لہجے میں بولا۔" میں نے اگر صاف دلی سے اپنی پریشانی آپ پر ظاہر کردی تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ آپ مجھے اس طرح ذلیل کرنے کی کوشش کریں۔ معاف کیجیئے رانی صاحبہ، مجھے آپ کی یہ بات بالکل پسند نہیں آئی۔"

ارجمند سلطانہ نے بات بگڑتے دیکھی تو فوراً نرم پڑ گئیں۔" دیکھو قیصر مرزا! بُرا ماننے کی بات نہیں۔" انھوں نے صفائی پیش کی۔" تم اگر آغا جانی سے مشورہ کرنے کا عذر پیش

نہ کرتے تو میں ہرگز یہ بات نہ کہتی۔ میں نے تو یہ سوچا تھا کہ آج تمہارے پاس آئی ہوں تو مقدمہ کے کاغذات بھی اپنے ساتھ ہی لیتی جاؤں۔" وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش رہیں پھر انھوں نے نفسیاتی حربہ استعمال کیا۔ "طلعت آرا کو جب یہ معلوم ہوگا کہ مقدمہ کے کاغذات واپس آگئے ہیں تو اُسے خوشی ہوگی۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تم بھی اُسے خوشی پہنچانا چاہو گے۔ میں نے غلط تو نہیں سوچا؟"

"آپ نے بالکل درست فرمایا۔ میں طلعت آرا کو خوش ہی دیکھنا چاہتا ہوں۔ طلعت آرا کو مقدمے کے کاغذات کی واپسی سے خوشی ہوگی تو میں ابھی حاضر کیے دیتا ہوں۔"

وہ بے قرار ہو کر اُٹھا۔ کمرے کے ایک گوشے میں رکھے ہوئے صندوق کے قریب گیا۔ اس کا تالا کھولا۔ اندر سے لکڑی کی ایک منقش صندوقچی نکالی۔ صندوق کو بند کر کے دوبارہ تالا لگایا۔ صندوقچی اٹھائی اور اسے سنبھالے ہوئے ارجمند سلطانہ کے پاس پہنچا۔ صندوقچی ان کے حوالے کرتے ہوئے بولا۔ "لیجیے، یہ طلعت آرا کی امانت حاضر ہے۔ میری گزارش ہے کہ اسے اُنھی کے ہاتھ میں دیں اور اتنا فرما دیں کہ میں ان کو اب تک یاد کرتا ہوں اور زندگی بھر یاد کرتا رہوں گا۔" اس کی آواز بھرّا گئی۔ وہ مُڑا اور اپنی جگہ پر جا کر بیٹھ گیا۔

کمرے کی فضا سوگوار ہو گئی۔ دونوں خاموش بیٹھے تھے۔ شہر کے ہنگامے جاگ رہے تھے۔ کوچہ و بازار میں ملی جلی آوازوں کا شور گونج رہا تھا۔ اسی اثنا میں ڈیوڑھی کے دروازے پر آہٹ ہوئی۔ کوئی رُک رُک کر کنڈی کھٹکھٹا رہا تھا۔

قیصر مرزا نے چونک کر صحن میں کھلنے والی کھڑکی سے اس طرف دیکھا اور اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے ارجمند سلطانہ کو مخاطب کیا۔ "رانی صاحبہ، باہر کوئی دستک دے رہا ہے، جا کر دیکھتا ہوں کون ہے۔"

"اگر ڈرائیور آیا ہو تو اُسے روک لینا۔" ارجمند سلطانہ نے کہا۔

قیصر مرزا نے لالٹین اُٹھائی۔ مُڑا اور لالٹین ہاتھ میں سنبھالے ہوئے باہر چلا گیا۔ ارجمند سلطانہ کمرے میں خاموش بیٹھی رہیں۔ مقدمے کے کاغذات کی صندوقچی ان کی

گود میں رکھی تھی۔

☆

قیصر مرزا نے دروازے پر جا کر دیکھا۔ آغا جانی واپس آ گیا تھا۔ اس کے چہرے سے اطمینان اور سرخوشی آشکارہ تھی۔ مگر قیصر مرزا اُداس اور غم زدہ نظر آ رہا تھا۔ طلعت آرا کی شدید علالت کی خبر سُن کر وہ دل گرفتہ اور پریشان ہو گیا تھا۔ وہ ابھی تک اسی کے خیال میں گم سُم تھا۔ اس نے آغا سے اپنی پریشانی کا کوئی ذکر نہ کیا۔ یہ بھی نہ پُوچھا کہ میر نصیر سے اس کی ملاقات ہوئی کہ نہیں۔

لیکن آغا چُپ نہ رہ سکا۔ اس نے خود ہی بتایا۔ "میر نصیر میرا انتظار ہی کر رہا تھا۔ اس سے بات کرنے کے بعد تو اور بھی معلومات ہوئیں۔"

"کیا کہتا تھا وہ؟" قیصر مرزا نے بے نیازی سے پُوچھا۔

"طلعت آرا تو یہاں موجود ہی نہیں ہے۔ میر نصیر نے بتایا کہ وہ بیمار ہے۔ ماں اسے اپنے گاؤں تیلم پُور لے گئی ہیں۔" آغا جانی نے قیصر مرزا کو مطلع کیا۔ "اُسے وہاں گئے ہوئے ہفتہ بھر سے زیادہ ہو گیا اور فوری واپس آنے کا کوئی امکان بھی نہیں۔"

قیصر مرزا نے کوئی تبصرہ نہ کیا۔ یہ اطلاع اس کے لیے نئی نہ تھی۔ وہ اُسے پہلے ہی سُن چکا تھا۔ البتہ اس بات سے یہ تصدیق ہو گئی کہ ارجمند سلطانہ نے طلعت آرا کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا وہ بالکل درست تھا۔

آغا جانی نے قیصر مرزا کو گم صم پایا تو پریشان ہو کر بولا۔ "خیریت تو ہے، تم کچھ چُپ چُپ نظر آ رہے ہو۔"

"طبیعت کچھ گری گری ہو رہی ہے۔" قیصر مرزا نے ٹالنا چاہا۔

"ذرا باہر نکل کے دیکھو۔ ہر طرف کیا رونق ہے۔" آغا نے مسکرا کر کہا۔ "آج گڑیوں کا میلہ ہے۔ کمپنی باغ کے دنگل میں صادق نے پھر کُشتی مار لی۔ ہاتھ ملاتے ہی وہ داؤں مارا کہ اُدھا پہلوان چاروں خانے چت گرا۔"

"تم دنگل دیکھنے گئے تھے؟" قیصر مرزا نے پوچھا۔

"نہیں، میں تو سیدھا میر نصیر کے پاس سے آرہا ہوں۔ وہیں کسی نے بتایا تھا۔ سارے شہر میں دھوم مچی ہے۔" آغا نے بات کہتے کہتے نظریں اوپر اٹھا کر دیکھا۔ "تمہارے کمرے میں تو روشنی ہو رہی ہے۔ کیا وہیں بیٹھے تھے؟"

"ہاں۔" قیصر مرزا نے بتایا۔ "رانی صاحبہ آئی ہیں۔ ان کے پاس بیٹھا تھا۔"

"تم نے اب تک بتایا بھی نہیں۔" آغا نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔ "کب آئیں وہ؟"

"تمہارے جانے کے کچھ ہی دیر بعد آگئی تھیں۔"

"مقدمے کے کاغذات کے بارے میں تو ان سے کوئی بات نہیں ہوئی؟" آغا نے اپنے سوال کے جواب کا انتظار بھی نہ کیا۔ فوراً تاکید کی۔ "اس سلسلے میں ان سے بات بھی نہ کرنا۔ میر نصیر تو کاغذات حاصل کرنے کے لیے بہت بے تاب نظر آتا ہے۔ کہتا تھا کہ کاغذات دے جاؤ اور پورے دو ہزار گن کے لے جاؤ۔ وہ اگر کائیاں ہے تو میں بھی کچی گولیاں کھیلے ہوئے نہیں ہوں۔ صاف انکار کر دیا کہ اتنے میں معاملہ نہیں بنے گا۔ وہ تین ہزار روپے دینے پر تیار ہو گیا۔"

"رانی صاحبہ تو پانچ ہزار دے رہی تھیں۔"

"پانچ ہزار دے رہی تھیں؟" آغا نے حیران ہو کر پوچھا۔ "تم سچ کہہ رہے ہو؟"

"مجھے تم سے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے۔" قیصر مرزا نے سنجیدگی سے کہا۔

"اس کا صاف مطلب تو یہ ہوا کہ میں نے غلط نہیں سوچا۔ کاغذات واقعی بہت اہم ہیں۔" آغا نے اظہار رائے کیا۔ "میر نصیر سے بات کی جائے تو وہ اور زیادہ دے سکتا ہے۔ چھ سات ہزار تک بھی دے جائے تو کچھ تعجب نہیں۔"

"وہ دس ہزار بھی دے، تب بھی میں اُسے ہرگز کاغذات نہیں دُوں گا۔"

"رانی صاحبہ، کیا اس سے بھی زیادہ دینے پر تیار ہیں۔" آغا نے اپنے فوری ردِعمل کا اظہار کیا۔ "میں تو کہتا ہوں جو بھی زیادہ دے اسی کو دے دو۔" وہ خوش ہو کر مسکرانے لگا۔ "اتنی بڑی رقم ہاتھ آجائے تو ساری پریشانیاں دور ہو جائیں۔ معلوم ہوتا ہے اب

اپنا ستارہ گردش سے نکل آیا ہے۔ مَیں تو کہتا ہوں دفینہ بھی نکل آئے گا اور ضرور نکل آئے گا۔"

قیصر مرزا نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "اچھا، اب مَیں رانی صاحبہ کے پاس جا رہا ہوں۔ وہ میرا انتظار کر رہی ہیں۔"

"چلے جانا۔ یہ تو بتاؤ، ان سے کیا کیا باتیں ہوئیں؟" آغا نے بے چین ہو کر پُوچھا۔

"باتیں تو بہت ہوئیں، مگر ان کے جانے کے بعد اطمینان سے بتاؤں گا۔"

قیصر مرزا زینے کی جانب مڑا۔ آغا نے اسے ٹوکا۔ "بات تو سنو۔ مقدمے کے کاغذات کے بارے میں رانی صاحبہ سے ابھی کچھ طے نہ کرنا۔ یہ معلوم کرنے کی کوشش کرنا کہ وہ زیادہ سے زیادہ کتنی رقم دے سکتی ہیں۔ اس کے بعد میں داروغہ نصیر سے بات کروں گا کہ وہ اس سے بھی زیادہ دے سکتا ہے کہ نہیں۔ میں تو کہتا ہوں۔"

مگر قیصر مرزا نے اسے آگے بولنے کا موقع نہ دیا۔ اس کی بات کاٹ کر گویا ہوا۔ "لیکن مَیں تم سے پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ میر نصیر کو مقدمے کے کاغذات ہرگز نہیں دے سکتا۔"

"کیوں؟" آغا جانی نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر قیصر مرزا کو دیکھا۔

"کاغذات میں نے رانی صاحبہ کو دے دیئے ہیں۔"

"مگر پانچ ہزار کی رقم تو ان سے لے لی ہے نا؟"

"اس سلسلے میں تم سے بعد میں بات کروں گا۔" قیصر مرزا نے کھُل کر بات نہ کی۔

"یار تم نے بہت جلدی کی۔" آغا نے گِلہ کیا۔ "کم از کم میرے آنے کا انتظار تو کر لیا ہوتا۔" اس نے قدرے تامّل کیا، پھر مشورہ دیا۔ "خیر، ابھی کچھ نہیں ہوا۔ رانی صاحبہ تو موجود ہی ہیں۔ کاغذات انھی کے پاس ہوں گے۔ واپس مل سکیں تو کوئی حیلہ بہانہ کر کے لے لو۔" اس نے اصرار کیا۔ "میں تو کہتا ہوں ضرور واپس لے لو۔ تم میں اگر ہمت نہیں تو میں آ کر کوئی ایسا پتھر پھینکوں کہ وہ کاغذات واپس دے دیں۔ بولو کیا کہتے ہو؟"

"تمہارا وہاں آنا مناسب نہیں۔" قیصر مرزا نے حوصلہ افزائی نہ کی۔ "ضرورت ہوگی تو میں خود تم کو بلا لوں گا۔" اس نے بات کا رُخ بدلتے ہوئے پُوچھا۔ "تم نے ابھی کھانا

تو نہیں کھایا ہوگا؟"

"میں نے چوک میں کھانا کھا لیا تھا۔ سخت بھوک لگی تھی۔" آغا نے بتایا۔"میں تو اب چلہ کشی کرنے تہہ خانے میں جاؤں گا۔" اس نے مڑ کر قیصر مرزا کی جانب دیکھا۔ "میرے ساتھ تہہ خانے میں چلو۔ وہاں سے لالٹین واپس لے آنا۔ یہاں اس کی ضرورت ہوگی۔"

قیصر مرزا خاموش رہا۔ آغا نے لالٹین ہاتھ میں سنبھالی اور آگے بڑھا۔ قیصر مرزا اس کے ساتھ ساتھ چلا۔ لالٹین کی پھیکی پھیکی روشنی میں دونوں دالانوں، سہ دریوں اور غلام گردش سے گذرتے ہوئے تہہ خانے کے دروازے پر پہنچے۔ آغا نے لالٹین فرش پر رکھ دی۔ قمیص کی آستینیں چڑھائیں اور جھک کر تہہ خانے کا دروازہ کھول دیا۔

تہہ خانے کے اندر جھینگروں کے بولنے کی تیز آوازیں اُبھر رہی تھیں۔ پہلے آغا لالٹین اُٹھائے تہہ خانے میں داخل ہوا پھر قیصر مرزا۔ دونوں سنبھل سنبھل کر سیڑھیوں پر قدم رکھتے ہوئے نیچے اُترے۔ تہہ خانے میں ہُو کا عالم تھا اور سیلن کی تیز بُو پھیلی ہوئی تھی۔ آغا نے ماچس جلائی اور طاقوں میں رکھے ہوئے مٹی کے چراغوں کو روشن کرنے لگا۔ تہہ خانے کا اندھیرا کم ہوگیا۔ ہر طرف روشنی پھیل گئی۔ چراغ جلانے کے بعد آغا نے اگربتیاں سلگائیں۔ ان سے اُبھرتا ہوا خوشبودار دھواں فضا میں لہرانے لگا۔ آغا جانی کا چیچک زدہ چہرہ تہہ خانے کے آسیب زدہ ماحول میں بھوتوں کی طرح ڈراؤنا نظر آنے لگا۔

تہہ خانے میں جگہ جگہ فرش کھدا ہوا تھا۔ مٹی کے چھوٹے بڑے ڈھیر چراغوں کی جھلملاتی روشنی میں صاف نظر آ رہے تھے۔ ایک گوشے میں صاف ستھرا فرش تھا۔ اس کے بیچ میں خاصہ بڑا دائرہ بنایا گیا تھا۔ یہ حصار تھا۔ جس کے اندر بیٹھ کر آغا جانی مایا جگانے کے لیے ہر رات عمل پڑھتا تھا۔ آغا نے قیصر مرزا کو مخاطب کیا۔" قیصر مرزا اب تم جاؤ۔ رانی صاحبہ اکیلی بیٹھی گھبرا رہی ہونگی۔" قیصر مرزا نے کچھ نہ کہا۔ لالٹین اُٹھائی اور زینے کی جانب بڑھا۔

آغا اس کے ساتھ ساتھ چلا۔ دونوں سیڑھیاں چڑھ کر اُوپر پہنچے۔ قیصر مرزا لالٹین

سنبھالے ہوئے تہہ خانے سے باہر چلا گیا۔

آغا جانی نے دروازہ بند کیا۔ سیڑھیوں سے نیچے اُترا۔ آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا ہوا آگے بڑھا۔ حصار کے اندر داخل ہوا اور دائرے کے بیچوں بیچ آلتی پالتی مار کر اطمینان سے بیٹھ گیا۔ آنکھیں بند کیں۔ زیرِ لب کچھ پڑھا۔ تالی بجا کر تین بار دستک دی اور گردن جھکا کر عمل پڑھنے لگا۔

☆

ارجمند سلطانہ گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ ان کے جسم کا نصف سے بھی کم حصہ روشنی کے سامنے تھا۔ اندھیرے نے چہرے پر سایوں کا جال بچھا دیا تھا۔ کمرے میں گہرا سکوت تھا۔ قیصر مرزا اندر داخل ہوا۔ قدموں کی آہٹ اُبھری۔ ارجمند سلطانہ نے نظریں اُٹھا کر اسے دیکھا۔ مگر زبان سے کچھ نہ کہا۔

قیصر مرزا نے غور کیا کہ اب ارجمند سلطانہ کے چہرے پر سیاہ جالی کی نقاب پڑی تھی۔ مگر اس کے بارے میں قیصر مرزا نے نہ حیرت کا اظہار کیا نہ استفسار۔ اس نے صرف اظہارِ معذرت کیا۔ "معاف کیجئے رانی صاحبہ، مجھے کچھ دیر ہو گئی۔"

"نہیں، کچھ ایسی زیادہ دیر تو نہیں ہوئی۔" وہ مسکرا کر نرم لہجے میں بولیں۔ "میرا ڈرائیور تو نہیں آیا؟"

"جی نہیں۔" قیصر مرزا نے بتایا۔ "آغا جانی آگیا ہے۔"

ارجمند سلطانہ نے کوئی تبصرہ نہ کیا۔ کمرے میں ایک بار پھر سکوت طاری ہو گیا۔ قیصر مرزا کچھ دیر تو خاموش رہا پھر اُکتا کر گویا ہوا۔ "رانی صاحبہ، کیا سوچ رہی ہیں؟"

"میں طلعت آرا کے بارے میں سوچ رہی تھی۔" وہ بجھے ہوئے لہجے میں بولیں۔ "وہ ابھی تک خوف سے سہمی ہوئی ہے۔ ہر وقت کھوئی کھوئی سی رہتی ہے۔ نہ کسی سے بات کرتی ہے۔ نہ ہنستی ہے نہ مسکراتی ہے۔ جنوں کی دہشت اس پر ایسی حاوی ہوئی ہے کہ تپ دق بن کر اس کی جان سے چمٹ گئی۔ وہ اندر ہی اندر گھلتی جا رہی ہے۔"

قیصر مرزا کا چہرہ بجھ گیا۔ اس نے بے قرار ہو کر پہلو بدلا۔ ٹھنڈی سانس بھر کر بولا۔ "رانی صاحبہ! مَیں بہت بُرا اور قابلِ ملامت ہوں۔ جس بات کو محض کھیل سمجھ رہا تھا۔ اس کا یہ ہولناک انجام ہوگا واللہ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ اگر خدانخواستہ ان کے دشمنوں کو کچھ ہو گیا تو مَیں خود کو کبھی معاف نہ کروں گا۔ میری ہی وجہ سے طلعت آرا کی یہ حالت ہوگئی۔ جی چاہتا ہے کہ مقدمے کے کاغذات اپنے ہاتھ سے ان کے حوالے کر دُوں اور سب کچھ صاف صاف بتا دُوں۔" وہ عاجزی سے گڑگڑانے لگا۔ "رانی صاحبہ، خدارا، طلعت آرا سے ملنے کی کوئی سبیل نکالیئے۔ آپ کوشش تو کریں۔ آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہ بھُولوں گا۔" وہ بہت جذباتی ہو گیا تھا۔ آواز میں رقت پیدا ہو گئی۔ آنکھیں دُھواں دُھواں ہو گئیں۔

"نہیں قیصر مرزا، اب کوئی صورت نہیں نکل سکتی۔" وہ آمادہ نہ ہوئیں۔ "تمہارے لیے اب یہی مناسب ہو گا کہ اسے بھُول جانے کی کوشش کرو۔"

"آپ مجھے اس قدر خودغرض کیوں سمجھ رہی ہیں۔" قیصر مرزا نے صفائی پیش کی۔ "بخدا میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ طلعت آرا کے دل پر جو خوف چھایا ہے، رفع ہو جائے۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا۔" ارجمند سلطانہ نے اس کی حوصلہ افزائی نہ کی۔ "نہ تو پھوپھی جانی کسی طور پر تیار ہوں گی اور نہ ہی طلعت آرا کی حالت اس قابل ہے کہ میں اُسے تمہارے پاس لا سکوں۔"

"آپ طلعت آرا کو یہاں نہ لائیں مگر یہ تو کر سکتی ہیں کہ ان کو اپنی محل سرا میں بلا لیں، میں وہاں پہنچ جاؤں گا۔" قیصر مرزا نے تجویز پیش کی۔ "میں طلعت آرا سے صرف ایک بار ملنا چاہتا ہوں۔ یقین مانیئے، اس کے بعد اِن کا نام بھی زبان پر نہ لاؤں گا۔"

"تم کو معلوم نہیں، میں نے پہلے یہی کوشش کی تھی۔" ارجمند سلطانہ نے انکشاف کیا۔ "اسی لیے میں اب تک تمہارے پاس نہیں آسکی، مگر مجھے کامیابی نہ ہوئی۔ پھوپھی

جانی اُسے ایک لمحہ کے لیے بھی تنہا چھوڑنے کے لیے تیار نہیں اور نہ وہ کسی طور پر یہ گوارہ کریں گی تم طلعت آرا سے تنہائی میں ملو، اس سے بات چیت کرو۔ اس معاملہ میں وہ کتنی سخت گیر اور کٹّر ہیں، اس کا تم اندازہ نہیں کر سکتے۔"

"اچھا، آپ یہ تو کر سکتی ہیں کہ طلعت آرا کی والدہ کو سب کچھ صاف صاف بتا دیں۔" قیصر مرزا نے اصرار کیا۔

"کیا تم سمجھتے ہو، میں نے ایسی کوشش نہیں کی۔" ارجمند سلطانہ نے بتایا۔ "میں نے پہلے تو اشاروں اور کنایوں میں بات چھیڑی۔ پھر ذرا کھل کر بات کی مگر وہ اس قدر توہّم پرست ہیں اور جنوں کے وہم میں اس بُری طرح مبتلا ہیں کہ ان پر ذرا اثر نہ ہُوا۔"

قیصر مرزا دل برداشتہ ہو کر خاموش ہو گیا۔ ارجمند سلطانہ بھی چُپ تھیں۔ کھلی ہوئی کھڑکی سے ہَوا کے بھیگے بھیگے جھونکے اندر آ رہے تھے۔ لیمپ کی لَو آہستہ آہستہ تھرتھراتی تو کمرے کی دیواروں پر پرچھائیاں لہرانے لگتیں۔

"مقدمے کے یہ کاغذات آپ طلعت آرا کے حوالے کریں گی یا ان کی والدہ کے؟" کمرے کی خاموشی میں قیصر مرزا کی آواز اُبھری۔ ارجمند سلطانہ نے نظریں اٹھا کر قیصر مرزا کو دیکھا اور اس کے سوال کا جواب دینے کی بجائے خود اس سے دریافت کیا۔ "تمہارے خیال میں مجھے کاغذات کسے دینا چاہیئے؟"

"میری تو یہی خواہش ہے کہ آپ کاغذات طلعت آرا ہی کو دیں اور ان کو صاف صاف سب کچھ بتا دیں تاکہ جنوں کے جس خوف میں مبتلا ہو کر وہ بیمار ہو گئی ہیں، اس سے ان کو نجات مل جائے۔" قیصر مرزا نے مشورہ دیا۔ "جو کام میں کرنا چاہتا تھا اگر آپ کے ہاتھوں انجام پا جائے تو مجھے خوشی ہو گی۔"

"تم کہتے ہو تو میں اسی کو کاغذات دے دُوں گی حالانکہ اس صندوقچی کو اس کے پاس لے جانے میں خاصی دشواری ہو گی۔" انھوں نے گود میں رکھی ہوئی صندوقچی کی طرف اشارہ کیا۔ "مگر وہ میری باتوں پر یقین نہیں کرے گی۔ سچ تو یہ ہے کہ واقعات کی نوعیّت کچھ ایسی ہے کہ طلعت آرا کے لیے اب کسی شبہ کی گنجائش ہی نہیں رہی۔ وہ تم کو ابھی

تک جنوں کا شہزادہ سمجھتی ہے اور یہ سب کچھ پھوپھی جانی کی حد سے بڑھی ہوئی توہم پرستی کا نتیجہ ہے۔ میں تو سمجھتی ہوں کہ ان کی یہ توہم پرستی بے سبب بھی نہیں۔"

قیصر مرزا خاموش بیٹھا ان کی باتیں سنتا رہا۔

حیدر گڑھ کی رانی، ارجمند سلطانہ آہستہ آہستہ بولتی رہیں۔" قیصر مرزا بات دراصل یہ ہے کہ بعض واقعات وحادثات کچھ ہوتے ہی ایسے ہیں کہ عقل کام نہیں کرتی۔ میں تم کو اپنی ہی زندگی کا ایک واقعہ سناتی ہوں۔ سنو گے تو دنگ رہ جاؤ گے۔ تم کیا کوئی بھی سنے گا تو اس کے لیے یقین کرنا مشکل ہو گا۔ مگر اس کو کیا کہا جائے کہ یہ ایک جیتی جاگتی حقیقت ہے۔"

☆

قیصر مرزا خاموش تھا۔ باہر ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ ہوا بھی قدرے تیز ہو گئی تھی۔ ارجمند سلطانہ نے چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بتایا۔" مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ جاڑوں کا موسم تھا۔ پاپا ان دنوں حیات تھے۔ انھوں نے نئے کمشنر کے اعزاز میں ڈنر دیا تھا۔ کوٹھی میں آدھی رات تک ہنگامہ رہا۔ لیکن ان دنوں میں کچھ اداس اور پریشان تھی۔ ہوا یہ کہ چند ہی روز پہلے کنور علی بہادر نے اپنے ہی پستول سے گولی چلا کر خودکشی کر لی تھی اور اس کی تمام تر ذمہ داری مجھ پر عائد کی جا رہی تھی۔ وہ دلاور نگر کے تعلقہ دار راجہ محمد نواب کے بڑے صاحبزادے تھے۔ شادی شدہ تھے اور بیوی کو طلاق دے کر مجھ سے شادی کرنے کے خواہشمند تھے۔" اپنی بات کہتے کہتے وہ کچھ شرما گئیں۔

قیصر مرزا نے چونک کر ان کی جانب دیکھا۔ لیکن خاموش رہا۔

"ہاں تو میں یہ کہہ رہی تھی کہ اس رات میری طبیعت پریشان تھی۔ اسی لیے میں پارٹی کے ہنگاموں سے الگ تھلگ اپنے کمرے میں خاموش لیٹی تھی۔ کوئی دس بجے پاپا کے پرائیویٹ سیکریٹری مرزا علی حسن میرے پاس آئے اور کہنے لگے، ذرا دیر کے لیے پروفیسر رگھو ناتھ سانیال سے مل لیجیے۔ بے چارے بہت دیر سے

بیٹھے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ میں نے ٹالنا چاہا لیکن مرزا علی حسن نے اس قدر اصرار کیا کہ مجبوراً مجھے پروفیسر سانیال کے پاس جانا پڑا۔ وہ ادھیڑ عمر کے آدمی تھے۔ صورت شکل سے ٹھیٹ بنگالی لگتے تھے۔ ذرا دیر تک مجھے ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہے۔ پھر جو انھوں نے میری خوبصورتی کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے تو میں اس قدر شرمائی کہ جی چاہا اُٹھ کر بھاگ جاؤں۔"

ان کا چہرہ حیا سے گلابی ہو گیا لیکن قیصر مرزا نے اس دفعہ ان کی جانب نظریں اُٹھا کر نہ دیکھا۔ بُت کی مانند چپ بیٹھا رہا۔ ارجمند سلطانہ نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ کھل کر مسکرائیں۔ "پروفیسر سانیال بھی عجیب آدمی تھے۔ مجھے تو کچھ خبطی سے معلوم ہوئے۔ کہنے لگے۔ میری بیٹی سخت بیمار ہے، یوں سمجھیے کچھ ہی دنوں کی مہمان ہے، اگر آپ میری کچھ مدد فرمائیں تو اُسے کچھ اور زندگی مل جائے گی۔ ان کی بات سُن کر میں ہکّا بکّا رہ گئی۔ بات ہی ایسی تھی۔ نہ میں ڈاکٹر ہوں، نہ حکیم اور نہ ہی کوئی وجہ سمجھ میں آئی کہ میں ان کی کیا مدد کر سکتی ہوں۔"

"آپ نے ان سے پوچھا نہیں کہ وہ ایسا کیوں چاہتے تھے؟" قیصر مرزا نے دریافت کیا۔ وہ بھی حیرت زدہ نظر آ رہا تھا۔

"میں ان سے کیا پوچھتی۔ حیران و پریشان بیٹھی ان کا منہ تکتی رہی۔" ارجمند سلطانہ نے بتایا۔ "مجھے حیرت زدہ دیکھ کر وہ کہنے لگے۔ اپنی بچّی کے لیے صرف اتنا چاہتا ہوں کہ مجھے اپنی عمر میں سے ایک سال دے دیں۔ یقین مانیئے اس سے آپ کی زندگی پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ صرف اتنا ہو گا کہ آئندہ سالگرہ پر آپ کی عمر میں ایک کے بجائے اکٹھا دو سال کا اضافہ ہو جائے گا۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ آپ کے یہ ۳۶۵ دن میں واپس کر دوں گا۔ آپ مجھ پر وشواس کر سکتی ہیں۔ آپ کو کسی طرح کی پریشانی نہ ہو گی۔ ان کی عجیب و غریب باتیں سُن کر سچ تو یہ ہے کہ میں گھبرا گئی۔"

"گھبرانے کی تو بات ہی تھی۔" قیصر مرزا نے تبصرہ کیا۔

"لیکن پروفیسر سانیال برابر اصرار کرتے رہے۔" ارجمند سلطانہ مسکرا کر گویا ہوئیں

"وہ اصرار کر رہے تھے اور ادھر میں حیران کہ یا الٰہی یہ ماجرہ کیا ہے۔ بھلا اس طرح کوئی کسی کو زندگی اُدھار دے سکتا ہے۔"

وہ اور کھُل کر مُسکرائیں۔ "پروفیسر نے جب بہت اصرار کیا تو پیچھا چھڑانے کے لیے میں نے ہامی بھر لی۔ فوراً ان کے مُرجھائے ہوئے چہرے پر تازگی آ گئی۔ انھوں نے اسی وقت کاغذ اور قلم منگوایا۔ میری تاریخ پیدائش دریافت کی۔ قلم سنبھالا اور کاغذ پر میری جنم پتری بنائی۔ پورے برسوں کا حساب نکالا اور جنم پتری میرے سامنے رکھ کر بولے۔ اس میں سے آخری سال کاٹ دیجیے۔ میں نے یہ بھی کر دیا۔ انھوں نے کاغذ تہہ کر کے جیب میں رکھا اور شکریہ ادا کر کے چلے گئے۔"

"رانی صاحبہ، یہ تو آپ نے بڑا عجیب و غریب واقعہ سنایا۔" قیصر مرزا نے حیرت کا اظہار کیا۔

"کچھ عرصہ تک تو خوف بھی محسوس ہوا۔ رہ رہ کے خیال آتا تھا کہ پروفیسر سانیال بنگال کے رہنے والے ہیں اور بنگالے کا جادو مشہور ہے۔ نہ جانے کیا ہو مگر جب عرصے تک کچھ نہ ہوا تو میں اس واقعہ کو بھول گئی۔"

"بھول نہ جاتیں تو آپ کیا کرتیں۔" قیصر مرزا نے اپنے ردِّ عمل کا اظہار کیا۔

"لیکن تم کو یہ سُن کر تعجب ہو گا کہ کوئی پچیس سال بعد پروفیسر سانیال مجھے اچانک مسوری میں مل گئے۔" ارجمند سلطانہ نے قیصر مرزا کو مطّلع کیا۔ "اب وہ بہت بوڑھے ہو گئے تھے۔ وہیں میں نے ان کی بیمار بیٹی کو دیکھا۔ اس کی رنگت اس قدر زرد تھی اور چہرہ اتنا بے رونق تھا کہ دیکھ کر ڈر لگتا تھا۔ اس کے آگے مہکتے ہوئے پھولوں کا ڈھیر لگا تھا جن سے وہ بچّوں کی طرح بیٹھی کھیل رہی تھی۔"

قیصر مرزا بیچ میں بول پڑا۔ "اس لڑکی کو بیماری کیا تھی؟"

"خدا معلوم کیا بیماری تھی۔" ارجمند سلطانہ نے کہا۔ "دیکھنے میں تو بیمار نہیں لگتی تھی مگر اس کا رنگ اس قدر زرد تھا، خاص طور پر چہرہ، جسے دیکھ کر یہ محسوس ہوتا تھا کہ وہ عام لوگوں سے بالکل مختلف تھی۔ سن بھی اس کا اچھا خاصا تھا لیکن وہ بچّوں کی

سی تھوڑی حرکتیں کر رہی تھی۔" انھوں نے قدرے توقف کیا۔" اس دفعہ بھی پروفیسر سانیال نے میرے چہرے کو بغور دیکھا لیکن کچھ بولے نہیں پچیس سال میں بہت کچھ بدل چکا تھا۔ پہلے امّی سرکار نے داغ مفارقت دیا پھر پاپا نے۔ میں بالکل تنہا رہ گئی تھی۔"

"پروفیسر سے ملنے کے بعد آپ کی کوئی بات چیت نہیں ہوئی؟"

"جب میں رخصت ہونے لگی تو انھوں نے خود ہی ٹوک کر کہا۔ اچھا ہوا کہ آپ یہاں مل گئیں۔ میں تو آپ سے ملنے لکھنؤ آنے والا تھا۔" ارجمند سلطانہ نے قیصر مرزا کے دریافت کرنے پر بتایا۔" اب وقت آگیا ہے کہ آپ اپنا سال واپس لے لیں۔"

"تو کیا پروفیسر صاحب نے آپ کو وہ سال واپس کر دیا؟"

"ہاں۔" ارجمند سلطانہ نے مختصر جواب دیا۔

قیصر مرزا ابھی تک حیران و پریشان تھا۔ کہنے لگا۔" رانی صاحبہ، یقین نہیں آتا یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"اس حقیقت کو تم جو چاہے کہو مگر بالکل ایسا ہی ہوا۔" ارجمند سلطانہ نے مسکرا بتایا۔" پروفیسر نے پہلے مجھے ایک دن واپس کیا۔ اس کی اطلاع انھوں نے مجھے رات کے وقت دی تھی مگر مجھے یقین نہ آیا۔ تم خود ہی سوچو کیسے یقین آتا۔ مگر صبح اُٹھ کر آئینہ دیکھا تو ششدر رہ گئی۔ ایک دم پچیس سال پہلے کے زمانے میں لوٹ گئی تھی۔ ہر بات بالکل ویسی ہی تھی۔ وہی آنکھیں، وہی چہرہ، وہی رنگ رُوپ، وہی چال ڈھال، بار بار آئینہ حیرت سے دیکھتی تھی۔ تم میری اس وقت کی خوشی کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ یہ بڑی عجیب مسرّت تھی۔ ایسی اکسائیٹڈ ہوئی کہ مارے خوشی کے میرے آنسو نکل آئے۔"

اپنی بات کہتے کہتے وہ دم بھر کے لیے رُکیں، مُڑ کر قیصر مرزا کی جانب دیکھا۔ وہ حیرت زدہ بیٹھا تھا۔ ارجمند سلطانہ نے مزید بتایا۔" پھر تو میں نے تقاضا شروع کر دیا۔ ایک کے بعد دوسرا دن واپس لیتی رہی۔ کئی مہینوں تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔"

"کسی نے آپ کو ٹوکا نہیں؟"

"کسی کی سمجھ ہی میں یہ راز نہ آیا" ارجمند سلطانہ نے قیصر مرزا کے سوال کے جواب میں کہا۔ "جن لوگوں نے ان دنوں مجھے پچیس سال پہلے کے رُوپ میں دیکھا تھا وہ آج تک کہتے ہیں کہ رانی حیدر گڑھ کے پاس ایک بڑی حسین لڑکی آکر ٹھہری تھی۔ پھر نہ جانے کہاں غائب ہو گئی" انھوں نے مُسکرا کر شرم سے نظریں جُھکا لیں۔ "اس سال مسوری بھر میں میری دھوم تھی۔ ہر جگہ میری ہی خوبصورتی کا چرچا تھا۔ لکھنؤ واپس آئی تو یہاں بھی یہی عالم تھا۔ خود میری یہ حالت تھی کہ کوئی پوچھتا تو شروع شروع میں گھبرا جاتی۔ اشاروں میں حقیقت کا اظہار کرنا چاہا تو کسی کو یقین نہ آیا۔ بات ہنسی میں اُڑ گئی۔ مجبوراً مجھے فرضی نام رکھنا پڑا۔ دو خادماؤں کو اپنا ہم راز بنا لیا تھا۔ پھر بھی بعض اوقات ایسی پیچیدگیاں پیدا ہوتیں کہ تم سے کیا بیان کروں۔"

"گھر میں بیٹھی رہتیں۔ باہر ہی نہ نکلتیں۔"

"گھر میں رہ کر بھی تو چین نہ تھا۔ آنے والے تو پہنچ ہی جاتے۔ ویسے گھر میں بیٹھا بھی نہ جاتا۔ شام ہوتی تو باہر جانے کو دل مچلتا۔ گھر ہی میں بند ہو کر بیٹھنا ہوتا تو وہ یادگار دن واپس ہی کیوں لیتی۔ بہرحال ایسے ایسے دلچسپ حادثات پیش آئے کہ اب تم کو کیا کیا بتاؤں۔" انھوں نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "ہائے کیا خوبصورت تھے، وہ دن، وہ راتیں۔" وہ یادوں کی پگڈنڈیوں پر بھٹکتی ہوئی بہت دُور نکل گئیں۔

قیصر مرزا نے ان کو خاموش پایا تو بے چین ہو کر پُوچھا۔ "پروفیسر صاحب نے تقاضا کئے بغیر تمام دن لوٹا دیئے؟"

"نہیں۔" انھوں نے آہستہ سے جواب دیا۔ "پروفیسر سانیال میرے ساتھ ہی مسوری سے لکھنؤ آگئے تھے۔ بادشاہ باغ والی کوٹھی کے ایک حصّے میں میرے ساتھ ہی ٹھہرے تھے۔ ان کی بیٹی بھی ہمراہ تھی۔ مگر ایک صبح پروفیسر نے لگاتار تمام دن واپس کرنے سے انکار کر دیا۔ کہنے لگے 'میں پُورا سال ایک ساتھ نہیں لوٹا سکتا۔ آپ ہی کی طرح مجھے اوروں کو بھی دن واپس کرنا پڑتے ہیں۔ ان کا تقاضا بھی مجھے پُورا کرنا ہوتا ہے۔'

"تو گویا انھوں نے آپ ہی کی طرح دوسروں سے بھی اپنی بیٹی کے لیے سال قرض لے رکھے تھے۔" قیصر مرزا نے قیاس آرائی کی۔

"ہاں! بالکل ایسا ہی معاملہ تھا۔" ارجمند سلطانہ نے اعتراف کیا۔ "میں نے اس سلسلہ میں ان سے پوچھا تو بتانے لگے کہ میں نے اپنی بیٹی نیلما کو تو دوسروں سے زندگی اُدھار مانگ کر زندہ رکھا ہے۔ دراصل پروفیسر کی اپنی زندگی بھی بڑی الم ناک تھی۔ ان کو اپنی بیوی سے دیوانگی کی حد تک محبت تھی مگر وہ بھری جوانی میں انتقال کر گئیں۔ بیوی کی یادگار اکلوتی بیٹی رہ گئی تھی۔ وہ بھی بیمار رہتی تھی۔ وہ اسے زندہ رکھنا چاہتے تھے اور نوجوان اور خوبصورت بھی دیکھنا چاہتے تھے۔ اسی لیے وہ نوجوان اور خوبصورت لڑکیوں سے ان کی زندگی کے سال اُدھار لیتے رہتے تھے۔ مگر سب کے ایک ایک دن کا حساب رکھتے تھے اور ان کو لوٹاتے بھی رہتے تھے۔"

"انھوں نے آپ کے بقیہ دن بھی اب تک واپس کیے کہ نہیں؟"

"وہ وقفے وقفے سے قسطوں کی صورت میں سال کے باقی دن لوٹاتے رہے۔"

"بڑی عجیب و غریب بات لگتی ہے۔" قیصر مرزا ابھی تک حیران و پریشان تھا۔

"سچ پوچھیے تو یقین نہیں آتا۔"

"حیرت کی تو بات ہی ہے مگر یہ حقیقت اپنی جگہ ہے۔" انھوں نے قیصر مرزا کو باور کرانے کی کوشش کی۔ "اس زمانے کی تو میرے پاس ایک تصویر بھی ہے۔ شاید اس وقت بھی موجود ہو۔" انھوں نے اپنا چمڑے کا خوبصورت بیگ کھولا۔ لیمپ کی روشنی میں جھک کر اندر دیکھا۔ پھر ایک پرانا پوسٹ کارڈ سائز کا فوٹو نکالا۔ اُسے نظر بھر کر دیکھا اور قیصر مرزا کی طرف بڑھا کر بولیں۔ "پچھلے جمعہ کا ذکر ہے۔ میں لائبریری میں ایک کتاب ڈھونڈ رہی تھی۔ اتفاق سے میری ایک پرانی ڈائری مل گئی۔ اسے کھول کر دیکھا تو یہ تصویر سامنے آگئی۔ آج اسے اس لیے لائی تھی کہ فوٹو گرافر سے انلارج کرانے کی کوشش کروں گی۔ بڑی یادگار تصویر ہے۔"

قیصر مرزا نے تصویر لے کر دیکھی تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ یہ ارجمند سلطانہ کی جوانی کی تصویر

تھی۔ واقعی وہ اس زمانے میں بلا کی حسین تھیں۔ تصویر کا رنگ امتدادِ زمانہ سے قدرے پھیکا پڑ گیا تھا۔ مگر ان کے دل کش نقش ونگار کی تراش خراش نمایاں تھی۔ اس تصویر میں وہ بڑی معصوم اور الھڑ نظر آ رہی تھیں۔

ارجمند سلطانہ خاموش بیٹھی تھیں۔ بارش اب بند ہو چکی تھی مگر ہوا بھیگی ہوئی تھی۔ موسم سہانا اور خوشگوار تھا۔ عشرت منزل تاریک اور سنسان نظر آ رہی تھی۔ ذرا دیر بعد قیصر مرزا کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اس نے چونک کر ارجمند سلطانہ کی جانب دیکھا۔ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”آپ کی یہ تصویر تو بہت خوبصورت ہے۔“ اس نے قدرے توقف کے بعد اپنے فوری ردِ عمل کا اظہار کیا۔ ”رانی صاحبہ، آپ نے پروفیسر کو ایک سال کے بجائے اس وقت زیادہ سال کیوں نہ دے دیئے۔“

”مگر وہ بھی ایک نہ ایک دن ختم ہی ہو جاتے۔“

قیصر مرزا نے ان کی بات نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ”اس تصویر کو دیکھنے کے بعد تو یہ جی چاہتا ہے کہ کاش اس زمانے میں آپ کو میں نے بھی دیکھا ہوتا۔“

ارجمند سلطانہ نے کچھ نہ کہا۔ وہ کرسی کی پُشت سے سر لٹکائے گم صم بیٹھی تھیں۔ ان کا چہرہ لیمپ کی روشنی میں باریک جالی کی نقاب کے پیچھے ایسا اُجلا اُجلا نظر آ رہا تھا جیسے چاندنی چھٹکی ہو۔ ان کی بڑی بڑی روشن آنکھوں میں ستارے جگمگا رہے تھے۔ وہ سامنے کی دیوار کو تک رہی تھیں اور کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔

قیصر مرزا نے نظر بھر کر ارجمند سلطانہ کے چہرے کو دیکھا۔ بے تاب ہو کر پوچھا۔ ”پروفیسر سانیال ابھی تک زندہ ہیں؟“

”ہاں وہ ابھی تک زندہ ہیں۔“ ارجمند سلطانہ نے جواب دیا۔ ”وہ آج کل کلکتہ میں ہیں۔ پچھلے دنوں ان کا ایک خط بھی آیا تھا۔“

”رانی صاحبہ، جب پروفیسر صاحب اپنی بیٹی کے لیے آپ سے ایک سال قرض لے سکتے ہیں تو آپ بھی ان سے ایک سال نہیں تو کم از کم کچھ دن تو اپنی اس زمانے کی زندگی کے مانگ سکتی ہیں۔“ قیصر مرزا نے نہایت سادگی سے کہا۔ ”وہ چاہیں تو ایسا کر سکتے

ہیں۔ وہ ضرور کوئی ایسا علم جانتے ہیں کہ ایسا کر بھی دیں تو کوئی تعجب نہیں۔"

"تم یہ دیکھنا چاہتے ہو کہ اس تصویر کے رُوپ میں، مَیں تمہارے سامنے جیتی جاگتی بیٹھی ہوں۔" وہ زیرِلب مُسکرائیں۔ "یہی چاہتے ہو نا؟"

"جی ہاں، یہی چاہتا ہوں۔" قیصر مرزا نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "مگر اب یہ ممکن بھی تو نہیں۔"

"نہیں، یہ ممکن ہے۔" ارجمند سلطانہ نے بتایا۔ "پروفیسر سانیال کو میں نے اپنی زندگی سے جو سال دیا تھا، اس کا ابھی ایک دن باقی ہے۔ پروفیسر نے اُسے واپس دینے ہی کے لیے مجھے کلکتہ سے خط لکھا ہے۔"

"کیا واقعی ایک دن باقی ہے؟" قیصر مرزا نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر پوچھا۔ "آپ سچ کہہ رہی ہیں۔"

"ہاں" انھوں نے نہایت مختصر جواب دیا۔

قیصر مرزا نے کچھ کہنا چاہا مگر اپنی بات کہہ نہ سکا۔ اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے بے قراری ہویدا تھی۔ ارجمند سلطانہ نے بھی اس کی بے قراری کو محسوس کیا۔ وہ چند لمحے خاموش بیٹھی اس کے چہرے کو تکتی رہی۔ پھر انہوں نے نرم لہجے میں کہا۔ "قیصر مرزا مَیں نے تم کو دُکھ پہنچایا ہے۔ اگر میں تمہارے راستے میں حائل نہ ہوتی تو طلعت آرا تم سے اس طرح ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جُدا نہ ہوتی اور جدائی ہوتی بھی تو شاید اتنی جلدی نہ ہوتی۔ تم نے اس روز میری بات مان لی۔ مجھ پر اعتماد کیا۔ حالانکہ میں اپنا وعدہ نہ نبھا سکی۔" انھوں نے صندوقچی کی جانب اشارہ کیا۔ "تم نے تو مجھ پر اتنا اعتماد کیا کہ بغیر کسی عذر کے مقدمے کے کاغذات میرے حوالے کر دیئے۔ میں تو ان کے لیے پانچ ہزار بلکہ اس سے بھی زیادہ رقم دینے کو آمادہ تھی۔"

"رانی صاحبہ، آپ مجھے کیوں بار بار شرمندہ کر رہی ہیں؟" قیصر مرزا نے رسان سے کہا۔ "یہ کاغذات تو میرے پاس امانت تھے۔ ان کو تو مجھے لوٹانا ہی تھا۔"

"میں اپنے اس آخری دن کے بارے میں تم کو یا کسی کو بھی بتانا نہیں چاہتی تھی۔

مگر اب بتا ہی دیا ہے تو یہ بھی سُن لو کہ اس روز تم میرے محل میں موجود رہو گے جب یہ دن مجھے واپس ملے گا۔ تم مجھے اسی رُوپ میں دیکھ سکو گے جس میں تم مجھے دیکھنا چاہتے ہو۔ یہ دن میں نے تمہارے لیے وقف کر دیا ہے۔ اور یہ فیصلہ میں نے اچانک کیا ہے اور ابھی ابھی کیا ہے۔" ارجمند سُلطانہ سنبھل سنبھل کر بولتی رہیں۔ "شاید اس طرح تمہارے اس دُکھ کی کچھ تلافی ہو جائے جو میری وجہ سے تم کو پہنچا ہے۔"

قیصر مرزا دفعتہً بہت جذباتی ہو گیا۔ اس نے گہری سانس بھری۔ بے چین ہو کر پہلو بدلا۔ اُلجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ "کیا رانی صاحبہ، ایسا ہو سکتا ہے؟" وہ آگے کچھ نہ کہہ سکا۔ آنکھیں پھاڑے ہونّق کی طرح ارجمند سلطانہ کے چہرے کو تکنے لگا۔

"تم نے مجھ پر پہلے بھی اعتماد کیا ہے۔ اس بار بھی تم اعتماد کر سکتے ہو۔" انھوں نے اُٹھنے کے لیے پہلو بدلا۔ "بارش تھم گئی ہے اب مجھے چلنا چاہیئے۔"

"آپ اتنی رات گئے حیدر گڑھ جائیں گی؟"

"نہیں، میں آج کل بادشاہ باغ والی کوٹھی میں مقیم ہوں۔" ارجمند سلطانہ نے کہا۔ "آج ۱۰ اگست ہے، میں تم کو ۲۸ اکتوبر کو حیدر گڑھ بلاؤں گی۔ وہ اتوار کا دن ہو گا اور تم شام کو حیدر گڑھ پہنچو گے۔ میں تو اب تمہارے پاس نہ آسکوں گی البتہ اپنے ڈرائیور کو بھیجوں گی کہ وہ تم کو اپنے ہمراہ حیدر گڑھ لے آئے۔ اگر وہ کسی وجہ سے نہ پہنچ سکے تو تم خود حیدر گڑھ پہنچ جانا۔"

"آپ مجھے حیدر گڑھ کیوں بُلا رہی ہیں؟" قیصر مرزا ہنوز گھبرایا ہوا تھا۔

اس کے احمقانہ سوال پر ارجمند سُلطانہ جھنجلا گئیں۔ مگر انھوں نے خود کو سنبھالا اور صرف اس قدر کہا۔ "قیصر مرزا! تم اتنے ناسمجھ تو نہیں ہو جتنی ناسمجھی کی باتیں تم کبھی کبھی کرتے ہو۔"

قیصر مرزا پھر بھی بات کی تہہ تک نہ پہنچ سکا۔ خاموش بیٹھا ان کے چہرے کو تکتا رہا۔

"اب تم کو یہ بھی بتا دوں کہ ۲۸ اکتوبر کو پروفیسر سانیال نے میرا بقیہ دن واپس

کرنے کا وعدہ کیا ہے۔" ارجمند سلطانہ نے کھل کر بات کی۔" اب تو تم میری بات کا مطلب سمجھ گئے نا؟"

قیصر مرزا کا چہرہ خوشی سے سُرخ پڑ گیا۔ مُسکرا کر بولا" رانی صاحبہ! آپ بھی تو پہیلیوں میں باتیں کرتی ہیں۔"

" دیکھو ۲۸ اکتوبر کی تاریخ اور اتوار کا دن نہ بھولنا۔ تم کو اس روز شام کے وقت حیدر گڑھ پہنچنا ہے۔" ارجمند سلطانہ نے اپنی بات پر زور دے کر کہا۔" تاریخ یاد رہے گی نا؟"

" آپ اطلاع نہ بھی دیں تب بھی میں ۲۸ اکتوبر کی تاریخ اور اتوار کا دن ہرگز نہ بھولوں گا۔" قیصر مرزا نے یقین دلایا۔

" یاد رکھو تم صرف رات بھر کے لیے میرے مہمان ہو گے۔ اور کسی سے بھی اس کا ذکر نہ کرو گے۔ حتیٰ کہ آغا جانی کو بھی اس سلسلے میں کچھ نہیں بتاؤ گے۔" انھوں نے اسے خبردار کیا۔" یہ تنبیہ میں اس لیے کر رہی ہوں کہ میری جوانی کے اس آخری دن کے اور بھی کئی طلب گار ہیں اور خود کو زیادہ مستحق سمجھتے ہیں۔ مگر میں نے کسی کو اس دن کی تاریخ اب تک نہیں بتائی۔ صرف اور صرف تم کو بتائی ہے۔"

" میں کسی سے اس بات کا ہرگز ہرگز ذکر نہیں کرونگا۔" قیصر مرزا نے ایک بار پھر ان کو یقین دلایا۔" آپ بالکل اطمینان رکھیں، یہ راز، راز ہی رہے گا۔ حالانکہ میں آغا جانی سے کوئی بات نہیں چھپاتا۔ مگر اُسے بھی ذرا ہوا نہ لگنے دُونگا۔"

" اب میں چلوں گی۔" وہ اُٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔ انھوں نے نقاب اُلٹ دی۔ برقعے کا بالائی حصّہ دوپٹے کے پلّو کی طرح گردن کے گرد کچھ اس انداز سے ڈال لیا کہ سیاہ برقعے میں ان کا چہرہ اور تابناک نظر آنے لگا۔

قیصر مرزا کو اس روپ میں وہ اپنی عمر سے کم اور ایسی طرح دار نظر آئیں کہ وہ بے قرار ہو گیا۔ تڑپ کر اُٹھا اور ان کے چہرے کو اس طرح دیکھنے لگا کہ اس کی آنکھوں میں بجلیاں کوند رہی تھیں۔

"قیصر مرزا!" رانی حیدر گڑھ نے اسے ٹوکا۔ ان کے لہجے میں ایسا طنطنہ تھا کہ قیصر مرزا کی نظریں فوراً جھک گئیں۔ اس نے لیمپ اٹھایا اور کمرے سے باہر نکلا۔ ارجمند سلطانہ اس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھیں۔ لیمپ ہوا کے جھونکوں سے بار بار بھڑکتا رہا مگر بجھا نہیں۔ دونوں نے چھت عبور کی۔ زینے میں داخل ہوئے اور نیچے پہنچ گئے۔ آغا جانی موجود نہ تھا۔ وہ تہہ خانے میں بیٹھا چلّہ کشی کر رہا تھا۔

ڈیوڑھی میں پہنچ کر قیصر مرزا نے لیمپ طاق میں رکھ دیا۔ ارجمند سلطانہ کے ہمراہ ڈیوڑھی سے نکل کر گلی میں پہنچا۔ گلی میں کیچڑ تھی اور اندھیرا ہر طرف پھیلا تھا۔ دونوں کیچڑ سے بچتے بچاتے سنبھل سنبھل کر قدم اٹھاتے گلی سے گزر کر سڑک پر پہنچے۔ سڑک کے کنارے ارجمند سلطانہ کی سیاہ فورڈ کھڑی تھی۔ ڈرائیور نے ان کو دیکھتے ہی باہر نکل کر دروازہ کھولا اور ادب سے ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ ارجمند سلطانہ نے قیصر مرزا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈرائیور سے کہا "دیکھو ڈرائیور! یہ قیصر مرزا صاحب ہیں۔ تم ان کو پہچان لو اور جس روز میں کہوں اس روز یہاں آ کر انہیں اپنے ساتھ کار میں حیدر گڑھ لے آنا۔" وہ کار میں بیٹھ گئیں۔ ڈرائیور نے دروازہ بند کیا۔ قیصر مرزا نے جھک کر رانی حیدر گڑھ کو آداب کیا۔

ذرا دیر بعد کار چھینٹے اڑاتی ہوئی سڑک پر تیزی سے دوڑنے لگی۔

(۵)

ساون کی اودی اودی بدلیوں کا غول اب چھٹ چکا تھا۔ گہرے نیلے آسمان پر ستاروں کی افشاں بکھری ہوئی تھی۔ رات جاگ رہی تھی مگر شہر کے ہنگامے اب سو گئے تھے۔ عشرت منزل سناٹے میں ڈوبی ہوئی اونگھ رہی تھی۔

قیصر مرزا تھکا ہوا سا کمرے میں داخل ہوا۔ میز پر ارجمند سلطانہ کی تصویر پڑی تھی۔ وہ اسے واپس لے جانا بھول گئی تھیں۔ قیصر مرزا میز کے قریب گیا۔ تصویر اٹھائی اور جھک کر اسے دیکھنے لگا۔ پھر تصویر ہاتھ میں دبائے ہوئے اس کرسی پر بیٹھ گیا جس

پر چند منٹ پہلے ارجمند سلطانہ بیٹھی تھیں۔ وہ ٹکٹکی باندھے تصویر دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ ماہ و سال نے ارجمند سلطانہ کو کس قدر بدل دیا ہے۔

کھڑکی کی راہ سے ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے کمرے کے اندر آ رہے تھے۔ لیمپ کی لَو بار بار بھڑکتی۔ دیواروں پر نت نئی شکلیں بنتیں اور بگڑ جاتیں۔ ان دُھندلی دُھندلی پرچھائیوں میں قیصر مرزا کو ارجمند سلطانہ کی جھلک نظر آتی۔ وہ اپنی چھب دکھا کر سایوں میں تحلیل ہو جاتیں۔ اسے رہ رہ کر خیال آتا کہ ارجمند سلطانہ نے اپنے بارے میں جو کچھ بتایا تھا، کیا وہ درست ہے؟ کیا ایسا ہو سکتا ہے؟

وہ تذبذب میں مبتلا تھا۔ کبھی ان کی باتوں کو تسلیم کر لیتا۔ کبھی من گھڑت قرار دیتا۔ اس کے ذہن میں ہلچل برپا تھی۔ بیک وقت دو لہریں اُبھر رہی تھیں۔ ڈوب رہی تھیں۔ ایک سُست پڑ جاتی، تو دوسری تیز ہو جاتی۔ دوسری دھیمی پڑتی تو پہلی شدت اختیار کر لیتی۔ وہ کشتی کی مانند اِدھر اُدھر ڈول رہا تھا۔

آغا جانی تہ خانے میں، چلّہ کشی میں محو تھا۔ سویرا ہونے سے پہلے اس کے باہر آنے کی کوئی توقع نہیں تھی۔ رات اب خاصی گذر چکی تھی۔ قیصر مرزا کو بھوک بھی محسوس ہو رہی تھی، مگر اس نے اپنے گھر واپس جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ وہ اُٹھ کھڑا ہوا، ہاتھ بڑھا کر لیمپ کی لَو مدھم کی اور بستر پر پہنچ گیا۔

ارجمند سُلطانہ کی تصویر ابھی تک اس کے ہاتھ میں دبی تھی۔ اس نے تصویر تکیئے کے نیچے رکھنا چاہی۔ جُھک کر تکیہ اُٹھایا تو چونک پڑا۔ وہاں رُومال میں کچھ لپٹا ہوا رکھا تھا۔ وہ چند لمحے تک رُومال کو حیرت سے تکتا رہا، پھر اسے اُٹھا کر کھولا۔ رُومال میں نوٹوں کی گڈی رکھی تھی۔ قیصر مرزا نے ان کو گنا۔ یہ پانچ ہزار روپے تھے۔ اسے فوراً اندازہ ہو گیا کہ یہ وہی رقم ہے جو ارجمند سلطانہ مقدمے کے کاغذات کے عوض اسے دینا چاہتی تھیں اور اس کی غیر حاضری میں انھوں نے یہ رقم خاموشی سے تکیے کے نیچے رکھ دی تھی۔ اس کے بارے میں بتانے سے بھی گریز کیا، مُبادا وہ اسے قبول کرنے سے انکار کر دے۔

لیمپ کی دُھندلی روشنی میں وہ نوٹوں کو دیکھتا اور خاموش بیٹھا سوچتا رہا۔ رقم پاکر اسے خوشی بھی ہوئی۔ اتنی بڑی رقم یک مُشت ابھی تک اس کے ہاتھ میں نہ آئی تھی، مگر ساتھ ہی یہ خیال بھی ستا رہا تھا کہ اگر یہ رقم اس نے رکھ لی تو وہ ارجمند سلطانہ کی نظروں میں بے وقعت ہو جائے گا۔ وہ ان کے سامنے خود کو بے وقعت کرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ اپنی خاندانی وجاہت برقرار رکھنا چاہتا تھا جو اسے بے حد عزیز تھی۔

دیر تک سوچ بچار کرنے کے بعد اس نے طے کیا کہ جب وہ ۲۸ اکتوبر کو ارجمند سلطانہ کے پاس حیدر گڑھ جائے گا تو ان کے پانچ ہزار روپے واپس کر دے گا۔ قیصر مرزا نے روپے رُومال میں رکھے۔ احتیاط سے اسے تہ کیا۔ بستر سے نیچے اُترا۔ صندوق کھولا اور رقم رکھ کر تالا بند کر دیا۔ ارجمند سلطانہ کی تصویر بھی اس نے تکیے کے نیچے رکھنے کے بجائے صندوق میں رکھ دی۔

رات گئے تک قیصر مرزا طرح طرح کے خیالات میں گم رہا۔ پھر اس کی آنکھ لگ گئی اور وہ گہری نیند سو گیا۔

صبح آنکھ کُھلی تو دیکھا کہ آغا جانی سرہانے کھڑا اُس کا کندھا جھنجوڑ رہا ہے۔ قیصر مرزا آنکھیں مَلتا ہوا اُٹھ بیٹھا۔ آغا مُسکرا کر بولا۔ "ذرا کمرے سے باہر دیکھو۔ دِن کتنا چڑھ گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے رات دیر تک جاگتے رہے ہو۔"

قیصر مرزا نے مُڑ کر کھڑکی کی جانب دیکھا۔ صاف شفاف نیلا نیلا آسمان جھلکتا نظر آ رہا تھا۔ بادلوں کا دُور دُور تک نام و نشان نہ تھا۔ صحن میں دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ قیصر مرزا انگڑائی لے کر گویا ہوا۔ "واقعی دن بہت چڑھ گیا۔ آنکھ ہی نہ کُھلی۔ رات سویا بھی کچھ دیر سے تھا۔" اس کی آنکھوں میں ابھی تک نیند کا خمار تھا۔

"رانی صاحبہ کس وقت گئی تھیں؟" آغا نے بیٹھتے ہوئے دریافت کیا۔

"وہ تو جلدی جانا چاہتی تھیں۔ مگر میں نے اصرار کر کے روک لیا تھا۔ بوندا باندی بھی شروع ہو گئی تھی۔ ان کی موٹر سڑک پر کھڑی تھی۔ وہاں تک پہنچتے پہنچتے بھیگ جاتیں۔"

"مقدمے کے کاغذات بھی تم نے ان سے واپس لے لئے کہ نہیں؟" آغا نے یہ معلوم

کرنے کے لیے بے چین تھا۔

"نہیں۔" قیصر مرزا نے آہستہ سے کہا۔ "کاغذات کی صندوقچی وہ اپنے ساتھ لے گئیں۔"
آغا جانی چند لمحے سکتے کے عالم میں بیٹھا رہا، پھر اس نے گلہ کیا۔ "تم تو ان سے ایسے مرعوب ہو گئے کہ کاغذات مانگنے کی ہمت ہی نہ ہوئی ہو گی۔"

"تمہارا خیال درست ہے۔ میں نے کاغذات واپس لینے کے بارے میں بات ہی نہیں کی۔"

"اور وہ جو پانچ ہزار روپے کاغذات کے لئے دینے کو کہتی تھیں، وہ بھی نہ لئے ہوں گے۔" آغا جانی نے جھنجلا کر اپنے ردِّ عمل کا اظہار کیا۔

"وہ روپے دینے کو آمادہ تھیں، مگر میں نے صاف انکار کر دیا۔" قیصر مرزا نے وضاحت کی۔ "یار صاف بات یہ ہے کہ میرا جی ہی نہ چاہا۔ سوچا روپے لے لوں گا تو ان کی نظروں میں میری کوڑی بھر عزّت نہ رہے گی۔"

"تم سمجھتے ہو کہ ان کی نظروں میں تمہاری بہت عزّت ہے۔ اس گمان میں بھی نہ رہنا۔" آغا نے جل کر کہا۔ "وہ تو صرف مقدمے کے کاغذات واپس لینے آئی تھیں، وہ ان کو مل گئے۔ اب پلٹ کر بھی ادھر نہ دیکھیں گی۔ کبھی مل بھی گئیں تو پہچانیں گی بھی نہیں۔ تم ہو کس ہوا میں۔"

قیصر مرزا تلملا کر بولا۔ "فضول باتیں نہ کرو۔ تم کو کیا خبر ان کا دل کتنا بڑا ہے۔ وہ پانچ ہزار روپے کی کیا پروا کرتی ہیں۔" وہ آغا جانی کو بتانا تو نہیں چاہتا تھا، مگر طیش میں آ کر اس نے اُگل دیا۔ "میں نے کچھ لینے سے صاف انکار کر دیا تھا، مگر جب میں اُٹھ کر تمہارے پاس آیا تھا تو میری غیر موجودگی میں انھوں نے پانچ ہزار کی رقم رُومال میں لپیٹ کر میرے تکیے کے نیچے رکھ دی۔ مجھے اس کے بارے میں بتایا بھی نہیں اور خاموشی سے اُٹھ کر چلی گئیں۔"

"تو یوں کہو کہ وہ پانچ ہزار دے کر گئی ہیں۔ تم بھی تو مگمّم میں باتیں کرتے ہو۔" آغا جانی کے چہرے پر چھائی ہوئی کدُورت دُور ہو گئی۔ وہ مسکرا کر گویا ہوا۔ "میر نصیر شاید زیادہ رقم

دے دینا، مگر یہ بھی کم نہیں۔"

"کم ہو یا زیادہ، میں نے تو اسے امانت سمجھ کر رکھ لیا ہے۔" قیصر مرزا نے آغا جانی کو اپنے ارادے سے آگاہ کیا۔ "میں اسے جلد ہی واپس کر دوں گا۔"

"ایسی غلطی بھی نہ کرنا۔" آغا جانی نے گھبرا کر احتجاج کیا۔ "تم کو معلوم نہیں اس وقت ہاتھ کتنا تنگ ہے۔ کوڑی کوڑی کو محتاج ہو رہا ہوں۔ لالہ بنارسی داس نے پہلے ہی اُدھار دینے سے صاف انکار کر دیا ہے۔ کل ہی شام کو اُگاہی کے لیے آیا تھا۔ اپنی رقم کی واپسی کے لیے سخت تقاضا کر رہا تھا۔ دھمکی دے کر گیا ہے کہ پندرہ روز کے اندر اندر اُدھار مع سود نہ ملا تو نالش کر دے گا۔ مکان دار نے الگ جان کھا رکھی ہے۔ چھے مہینے ہو گئے اب تک کرایہ نہیں پہنچا۔ کہتا تھا مکان خالی کر دو۔ رہنے کا کہیں اور بندوبست کر لو۔"

"میں اماں جان سے کچھ روپے لے کر مکان کا کرایہ جلد ہی ادا کر دوں گا۔" قیصر مرزا نے آغا کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ "تم فکر نہ کرو۔"

"یہ بھی خوب رہی۔ کیسے فکر نہ کروں۔" آغا نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "تم تو اب یہاں رہتے نہیں۔ تم کو کیا خبر کہ قرض خواہوں نے میری زندگی کس طرح عذاب بنا دی ہے۔" اسکے لہجے میں اچانک رقت پیدا ہو گئی۔ دل گرفتہ ہو کر گویا ہوا۔ "عالم یہ ہے کہ دودھ والے نے بھی آج دودھ دینے سے انکار کر دیا کہ جب تک پچھلا حساب بے باق نہ ہوگا دودھ نہیں ملے گا۔ میں تو یہ سوچ کر آیا تھا کہ تم سے کچھ لے کر بازار سے دودھ لاؤں۔ ناشتے کا بندوبست کروں۔ مگر میرے پاس تو کھوٹا پیسہ بھی نہیں۔"

قیصر مرزا نے اس کی باتیں سن کر نرمی سے کہا۔ "میرے پاس آٹھ روپے پڑے ہیں۔ وہ لے لو۔ ان سے کچھ دن کام چلاؤ۔ آج ہی اماں جان سے بھی کچھ اینٹھنے کی کوشش کروں گا۔" وہ زیرِ لب مسکرایا۔ "اماں پریشان کیوں ہوتے ہو۔ دفینہ نکل آیا تو ساری پریشانیاں دُور ہو جائیں گی۔ سب کا ایک ایک پیسہ ادا کر دیں گے۔"

"نہیں بھئی اس طرح کام نہیں چلے گا۔" آغا جانی اپنی بات پر اڑا رہا۔ "دفینہ

"ہرگز دفینہ اس طرح نہیں نکلے گا۔ اس کے لئے ہاتھ کھول کر خرچ کرنا ہوگا۔ میرا تو کوئی ذریعہ آمدنی نہیں۔ تمھارے ہی بھروسے پر دفینہ نکلنے کا بیڑا اُٹھایا تھا۔ تم نے یقین دلایا تھا کہ جو کچھ اس سلسلے میں خرچ ہوگا، وہ تم اُٹھاؤ گے۔" اس نے یاد دہانی کرائی۔ "طے تو یہ ہوا تھا کہ پیسہ تمہارا محنت میری۔" اس کا لہجہ تلخ ہوگیا۔ "اگر تم یہ اطمینان نہ دلاتے تو مجھے باؤلے کتے نے تو نہیں کاٹا تھا کہ اچھی خاصی لگی لگائی روزی کو لات مار کر تمہارے ساتھ لگ گیا۔"

"تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔ مجھے یاد ہے کہ یہی طے ہوا تھا۔" قیصر مرزا اس کی جلی کٹی باتیں سُن کر ذرا بھی نہ بھڑکا۔ اس نے رسان سے آغا کو سمجھایا۔ "مگر مجھے یہ کب معلوم تھا کہ دفینہ نکلنے میں اتنا لمبا وقت لگے گا۔ میرے حالات بھی تم سے پوشیدہ نہیں۔ جس طرح بھی بنتا ہے، کہیں نہ کہیں سے کام چلانے کے لئے روپے کا بندوبست کرتا ہی رہتا ہوں۔ سب سے بڑا سہارا تو لالہ بنارسی داس کا تھا، اب وہ بھی آنکھیں دکھانے لگا ہے۔"

"لالہ سے اب کوئی توقع نہ رکھو۔ وہ تو اب ایک کوڑی بھی دینے کا نہیں بلکہ کسی دن نالش کر دے اور قرقی لے کر آجائے تو کوئی تعجب نہیں۔" آغا جانی نے قیصر مرزا کو خبردار کیا۔ "مان لو اس نے نالش کر دی تو کیا ہوگا۔ مجھے تو سب سے زیادہ فکر تمہارے والد کی طرف سے ہے۔ وہ پہلے ہی علیل ہیں، اس بدنامی کو کیسے برداشت کر سکیں گے۔ معاملہ عدالت تک گیا تو بدنامی و خواری ہی تو ہوگی۔"

آغا جانی کی اس دھمکی سے قیصر مرزا خائف ہوگیا۔ پریشان ہو کر بولا۔ "یار ایسی باتیں نہ کرو۔ لالہ نے کہیں نالش کر دی تو واقعی بڑی بدنامی ہوگی۔ گھر میں تو کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہوں گا۔"

آغا نے اسے سنبھلنے کا موقع نہ دیا۔ اس نے فوراً پینترا بدلا۔ اس دفعہ نیا حربہ آزمایا۔ نرم لہجے میں مشورہ دیا۔ "میں تو کہتا ہوں جب رانی صاحبہ اپنی مرضی سے رقم دے گئی ہیں تو اسے واپس کرنے کی کیا تک ہے۔ تم ان کی نظروں میں تو سرخ

رد ہو جاؤ گے لیکن یہ تو سوچو کہ قرض خواہوں کے ہاتھوں جو خواری ہو رہی ہے اگر اس کی اطلاع ان کو مل گئی تو تمہارے بارے میں کیا کہیں گی۔ اب تک جو عزت برقرار ہے وہ بھی خاک میں مل جائے گی۔"

اس نے بات دِل لگتی کہی تھی۔ قیصر مرزا اس سے متاثر بھی ہوا۔ مگر اس نے کسی فوری ردِ عمل کا اظہار نہیں کیا۔ خاموش بیٹھا رہا۔ آغا جانی بولتا رہا۔ "میرا کہا مانو تو پہلی فرصت میں لالہ بنارسی داس کا قرض ادا کر دو، جتنی دیر کرو گے، اتنا ہی سود در سود کے ساتھ قرض بڑھے گا۔ مکان کا کرایہ فوراً دے دو۔ اتنی زیادہ رقم بھی نہیں۔ مکان دار کو تو کُل ۴۸ روپے کرائے کے دینا ہیں۔"

"کرایہ ادا کرنے کے بارے میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں۔"

آغا جانی اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے گویا ہوا۔ "اگر تم رانی صاحبہ کی خوشنودی ہی حاصل کرنا چاہتے ہو تو بہتر ہو گا کہ طلعت آرا کے جو زیورات مہاجن کے پاس رہن ہیں، ان کو چھڑا لو اور جا کر رانی صاحبہ کو دے دو۔ وہ طلعت آرا کو پہنچا دیں گی۔ زیورات ملنے کے بعد طلعت آرا بھی خوش ہو جائے گی اور رانی صاحبہ بھی۔ مقدمے کے کاغذات تم پہلے ہی واپس کر چکے ہو۔ بھئی میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ رانی صاحبہ اسی مقصد کے لیے یہ پانچ ہزار روپے چھوڑ گئی ہیں۔ وہ کھُل کر اس سلسلے میں تم سے کہہ نہ سکیں۔"

آغا جانی رُک رُک کر قیصر مرزا کو اُونچ نیچ سمجھاتا رہا۔ قیصر مرزا توجہ سے اس کی ایک ایک بات سُنتا رہا۔ آغا اس کے مزاج سے بخوبی واقف تھا۔ تھا تو کم علم، مگر جہاں دیدہ تھا۔ گھاٹ گھاٹ کا پانی پیئے ہوئے تھا۔ اس نے کچھ اس ڈھب سے بات کی کہ قیصر مرزا پسیج گیا۔ اس نے رقم واپس کرنے کا ارادہ ترک کر دیا اور آغا جانی کا مشورہ قبول کر لیا۔

بستر سے نیچے اُترا۔ صندوق کھولا۔ کچھ دیر گردن اُٹھائے سوچتا رہا، پھر اس نے ڈھائی ہزار روپے نکالے۔ صندوق میں دوبارہ تالا لگایا اور واپس آغا جانی کے پاس پہنچا۔ آغا اس عرصے میں بالکل خاموش بیٹھا رہا۔ قیصر مرزا نے روپے اس کے

حوالے کیے۔" لو یہ ڈھائی ہزار رکھ لو۔ آج ہی لالہ کے پاس جانا۔ طلعت آرا کے زیورات چھڑا کر لے آنا۔ لالہ کا قرض بھی بے باق کر دینا۔ ہو سکے تو مکان کا کرایہ بھی آج ہی ادا کر دو۔ جو روپے بچیں وہ اپنے پاس رکھ لینا۔" اس نے تاکید کی۔" دیکھو زیورات آج چھڑا کر ضرور لے آنا۔"

" اطمینان رکھو۔ پہلی فرصت میں یہ کام کروں گا۔" آغا جانی کے ہاتھ میں ڈھائی ہزار کی رقم آئی تو چہک کر بولا۔" اماں تم کو کیا خبر، زیورات کتنے قیمتی ہیں۔ زیورات کو تو جتنی جلدی ہو سکے واپس لے لینا چاہیئے۔ لالہ تو ان کو بغیر ڈکار لئے ہضم کرنے کی تاک میں ہے۔ اپنے قرض کی واپسی کا تو برابر تقاضہ کرتا رہتا ہے۔ جب دیکھو اُگاہی کے لئے دروازے پر کھڑا ہے، مگر زیورات کے بارے میں تو بھولے سے بھی بات نہیں کرتا۔" اس نے قدرے توقف سے کہا۔" سارے ہی زیورات جڑاؤ ہیں اور ان کے تمام موتی اور جواہرات سچے ہیں۔ بعض میں تو بڑے قیمتی نگ جڑے ہیں۔ میں نے تو اپنے ہاتھوں سے ان کو رہن رکھا ہے۔ سچ کہتا ہوں زیورات چھڑا کر بیچے بھی جائیں تو چودہ پندرہ ہزار سے اُوپر ہی ملیں گے اور صرف گیارہ سَو میں رہن پڑے ہیں۔"

" پھر تمہاری نیت خراب ہو گئی۔ اب تم یہ چاہتے ہو کہ زیورات بیچ کر ان کی رقم بھی کھا جاؤں۔" قیصر مرزا نے تیوری پر بل ڈال کر غصے سے کہا۔" نہیں میں ان کو ہرگز نہ بیچوں گا۔ زیورات تو میں فوراً رانی صاحبہ کو دے دوں گا تاکہ وہ ان کو طلعت آرا کے سپرد کر دیں۔"

" اماں، میں اب ان کو بیچنے کے لیے کہہ رہا ہوں۔ میں تو صرف یہ بتانا چاہتا تھا کہ وہ کتنے قیمتی ہیں۔" آغا ہرچند کہ زیورات واپس کرنے کے حق میں نہ تھا، مگر قیصر مرزا کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر دب گیا۔ کھسیانا ہو کر مسکرانے لگا۔" جیسی تمہاری مرضی۔ میں اس معاملہ میں ٹانگ اڑانے والا کون ہوتا ہوں۔"

" تم کو اچھی طرح خبر ہے کہ طلعت آرا نے یہ زیورات امانت کے طور پر میرے حوالے کئے تھے۔ تم یہ چاہتے ہو کہ میں امانت میں خیانت کروں۔" قیصر مرزا نے آواز

میں درشتی پیدا کرتے ہوئے بڑے طنطنے سے کہا۔" یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔ میں اتنا کم ظرف اور خود غرض نہیں ہو سکتا۔"

"یار اب زیادہ اڑنے کی کوشش نہ کرو۔" آغا جانی اس دفعہ ذرا مرعوب نہ ہوا۔ ہنس کر بولا۔" ہم ایک دوسرے کو برسوں سے جانتے ہیں کہ کون کتنے پانی میں ہے۔" وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔" اب اس قضیے کو چھوڑو۔ اُٹھ کر مُنہ ہاتھ دھو ڈالو۔ میں اتنی دیر میں بازار جاکر دُودھ لے آؤں گا۔ ناشتے کے لئے بھی کچھ لیتا آؤں گا۔"

"میں تو اب گھر جاؤں گا۔" قیصر مرزا آمادہ نہ ہوا۔" پہلے ہی خاصا دِن چڑھ گیا ہے۔ راہ گیروں کی آمدورفت شروع ہو چکی ہے۔ اِدھر اُدھر دیکھ بھال کر نکلنا ہوگا۔" قیصر مرزا نے قدرے توقف کے بعد آغا کو تنبیہ کی۔" کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو کہ رانی صاحبہ یہاں آئی تھیں۔ انھوں نے سختی سے منع کیا ہے۔"

"تم تاکید نہ بھی کرتے تب بھی میں کسی سے یہ بات نہ بتاتا۔ اب تو بالکل نہ کروں گا۔" آغا نے اسے یقین دلایا۔" مگر اب تم ناشتہ کر کے ہی جانا۔ نہار مُنہ نکل کر اتنی دُور کیسے جاؤ گے۔"

آغا جانی نے بہت اصرار کیا لیکن قیصر مرزا ٹھہرنے پر رضامند نہ ہوا۔ وہ جلد سے جلد اپنے گھر پہنچ جانا چاہتا تھا۔ اسے اپنے بیمار باپ کی جانب سے فکر لاحق تھی۔

قیصر مرزا عشرت منزل سے نکل کر گھر پہنچا۔ حکیم صاحب موجود تھے۔ کچھ ہی دیر پہلے آئے تھے۔ قیصر مرزا نے حکیم صاحب سے باپ کی طبیعت کے بارے میں پوچھا۔ انھوں نے اطمینان کا اظہار کیا۔ حکیم صاحب سے گفتگو کرنے کے بعد قیصر مرزا زنان خانے میں گیا۔ سیدھا باپ کے کمرے میں پہنچا۔ ان کو دیکھا۔ اب وہ پہلے سے بہتر نظر آتے تھے۔

قیصر مرزا دن بھر گھر میں رہا لیکن جھٹ پٹا ہوتے ہی واپس عشرت منزل پہنچا۔ مگر ڈیوڑھی کے صدر دروازے پر تالا پڑا تھا۔ آغا جانی کہیں گیا ہوا تھا۔ قیصر مرزا کو اس کی غیر حاضری، کسی قدر شاق گذری۔ مگر تالے کی دو کنجیاں تھیں۔ ایک آغا جانی

کے پاس اور دوسری قیصر مرزا کی تحویل میں رہتی تھی۔ قیصر مرزا کی جیب میں اس وقت کنجی موجود تھی۔ اس نے تالا کھولا اور اندر چلا گیا۔

شام کے دھندلکے میں عشرت منزل کسی کھنڈر کی مانند اُجاڑ اور ویران نظر آتی تھی۔ سناٹا اس قدر گہرا تھا کہ دم گھٹتا تھا۔ قیصر مرزا نے فوراً لالٹین روشن کی۔ روشنی ہوئی تو ہر سُو چھائی ہوئی ویرانی کچھ کم ہوئی۔ آسمان پر کالے کالے بادل چھائے تھے لیکن ہوا رُکی ہوئی تھی۔ فضا میں اُمس اور گھٹن تھی۔ قیصر مرزا دُور سے چل کر آیا تھا۔ بار بار چہرے پر آیا ہُوا پسینہ رومال سے پونچھتا۔ اس نے مونڈھا اُٹھا کر صحن میں ڈالا اور اس پر بیٹھ کر آغا کا انتظار کرنے لگا۔

٭

آغا جانی واپس آگیا۔ وہ بازار سے کھانا لے کر آیا تھا۔ کھانا اس نے احتیاط سے ایک طرف رکھا۔ مونڈھا اُٹھایا اور قیصر مرزا کے قریب ڈال کر اس پر بیٹھ گیا۔

قیصر مرزا نے پوچھا۔ ”طلعت آرا کے زیورات لالہ بنارسی داس سے چھڑا کر لے آئے؟“ اس کے لہجے سے بے چینی آشکارا تھی۔

”زیورات بھی لے آیا اور لالہ کا قرض بھی بے باق کر دیا۔“ آغا نے مسکرا کر نہایت مستعدی سے بتایا۔ ”مگر اس کی بیٹھک سے نکلا تو میرے پاس صرف ۴۳ روپے اور کچھ ریزگاری بچی تھی۔ جتنا میں نے سوچا تھا، سود اس سے کہیں زیادہ نکلا۔ اس کے منیم نے بہی کھاتہ کھول کر اصل رقم مع سود بتائی تو میرے ہوش اُڑ گئے۔“

”یار اچھا ہی ہُوا کہ اس نے اُگاہی پر روپیہ دینا بند کر دیا، ورنہ اس کا قرض تو کبھی ادا نہ ہوتا۔“ قیصر مرزا نے اپنے فوری ردِ عمل کا اظہار کیا۔ ”سُود بھی تو دس روپے فی سیکڑا ماہانہ لگاتا ہے اور وہ بھی سُود در سُود۔ مگر اتنا سُود تو سارے ہی مہاجن لگاتے ہیں۔“ اس نے قدرے توقف سے پوچھا۔ ”تم نے روپیہ دینے سے پہلے حساب کتاب بھی سمجھ لیا تھا؟“

"بالکل سمجھ لیا تھا۔ بلکہ اس کا منیم جب اپنی بہی کھولے حساب بتا رہا تھا تو میں نے پریشان ہو کر کہا۔ لالہ تم نے سود بہت لگایا ہے۔ جانتے ہو وہ کیا بولا؟"

"کیا کہتا تھا؟" قیصر مرزا نے دریافت کیا۔

"کہنے لگا، میاں جی رام رام کرو۔ اس بہی کا لکھا تو ہائی کورٹ تک مانا جاتا ہے۔" آغا جانی نے بتایا۔ "وہ بھی تو ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ اُگاہی پر روپیہ لو یا کچھ رہن رکھو۔ عام طور پر کوئی لکھت پڑھت تو ہوتی نہیں۔ رسید نہ پٹا۔ مہاجن اپنے بہی کھاتے میں جو جی چاہے لکھ لے۔ اسے کون مائی کا لال جھٹلا سکتا ہے۔"

"نہیں یار ایسا نہیں ہوتا۔ مہاجن معاملے کے کھرے ہوتے ہیں۔ ان کا حساب سچا ہوتا ہے۔" قیصر مرزا نے آغا جانی سے اتفاق رائے نہ کیا۔ "آخر اعتبار بھی تو کوئی چیز ہے۔ ایسا نہ ہو تو کوئی ان کے پاس کیوں جائے۔"

"اسی اعتبار کی بدولت تو نوابوں اور رئیسوں کی جائیدادیں ایک ایک کر کے بنیوں کے قبضے میں پہنچتی جا رہی ہیں۔" آغا جانی اپنی بات پر اڑ گیا۔ "یہ جو امین آباد کے عقب میں گونگے نواب کا باغ ہے۔ انھی گونگے نواب کے بڑے بیٹے کا ذکر ہے۔ کسی بات پر ایسے ناراض ہوئے کہ گھر میں رہنا سہنا چھوڑ دیا۔ خاندانی جائیدادوں میں سے ایک مکان خالی پڑا تھا۔ اور انھی کے نام بھی تھا۔ وہ اس میں جا کر رہنے لگے۔ مکان لب سڑک تھا۔ سامنے ہی حلوائی کی دُکان تھی۔ اس سے صبح ناشتے کے لئے پوری، کچوری اور مٹھائی منگوا لیتے۔ مصاحبین اور دوسرے ملنے جلنے والے بھی پہنچنے لگے۔ روز گرم گرم پوری، کچوری سے ان کے ساتھ ناشتہ کرتے۔ ضرورت پڑتی تو حلوائی سے کبھی کبھار کچھ قرض اُدھار بھی لے لیتے۔ سال ڈیڑھ سال تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ ایک روز حلوائی اپنا بہی کھاتا لے کر ان کے پاس پہنچا۔ حساب پیش کیا۔ کئی ہزار کا قرض نکلتا تھا۔ نواب صاحب نے حساب دیکھا تو بہت چکرائے۔ چکرانے کی بات ہی تھی۔ سستا زمانہ تھا۔ ایک پیسہ کی دو پوریاں بھاجی کے ساتھ ملتی تھیں۔ مٹھائی بھی روپے کی آٹھ سیر نہیں تو چھ سیر ضرور ملتی ہو گی۔"

قیصر مرزا گم صم بیٹھا رہا۔ آغا جانی روانی سے بولتا رہا۔" قرض ادا کرنے کی مقدرت نہ تھی۔ نواب صاحب نے ٹالنا چاہا، مگر حلوائی بھی بنیے کا پوت تھا۔ کل تک بھیگی بلی بنا رہا۔ اب اس نے گرگٹ کی طرح رنگ بدلا۔ نالش کرنے کی دھمکی دینے لگا۔ تم جانتے ہو کچہری، عدالت کے نام سے نوابوں، رئیسوں پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔ کچھ تو عدالت کی ہیبت اور کچھ بدنامی کا خوف۔ حلوائی نے دباؤ ڈالا تو گھبرا کر وہی مکان اس کے نام لکھ دیا۔ جس میں رہتے تھے۔ کچھ عرصے کے لئے اور ناشتے کا تو بندوبست ہو گیا، مگر صرف پوری، کچوری کے بدلے اتنا عالیشان مکان ہاتھ سے نکل گیا۔ اماں، میں اسی دو منزلہ پیلی کوٹھی کی بات کر رہا ہوں جو امین آباد کے عین چوراہے پر بازار کے بیچوں بیچ واقع ہے۔ لاکھوں روپے کی جائیداد ہے۔ سیکڑوں روپیہ تو دکانوں اور اُن کے اُوپر کے مکانوں کا کرایہ ہے۔ حلوائی کی دکان اب تک بازار کے نکڑ پر موجود ہے اور اب تو بہت بڑی ہو گئی ہے۔ حلوائی مزے سے کرایہ وصول کرتا ہے۔ عیش کرتا ہے۔ گو نگے نواب کے پوتے بے چارے جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں۔" اس نے نظر بھر کر قیصر مرزا کو دیکھا۔" میری بات کا یقین نہ ہو تو کسی سے بھی پوچھ لو۔ ڈھکی چھپی بات نہیں۔ سب جانتے ہیں۔"

"تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو کسی سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔" قیصر مرزا نے آغا جانی کی باتوں سے پریشان ہو کر گفتگو کا رُخ موڑ دیا۔" دوسرے قرض خواہوں کو بھی تم نے کچھ دیا؟"

"کہاں سے دیتا۔ بتا تو چکا ہوں کہ کل ۴۲ روپے بچے تھے۔" آغا جانی نے کہا۔" صبح ہی صبح دُودھ والا دروازے پر ہنکارنے لگے گا۔"

قیصر مرزا نے مزید رقم دینے کا وعدہ کیا تو آغا نے مُسکرا کر پوچھا۔" یار قیصر مرزا، تم نے یہ تو بتایا نہیں کہ رانی صاحبہ سے اور کیا کیا باتیں ہوئیں۔" اس نے ٹوہ لگانے والی نظروں سے قیصر مرزا کو دیکھا۔ مگر قیصر مرزا نہ کھلا۔ اس نے آغا جانی کو کچھ نہ بتایا۔ صرف اتنا کہا۔ " طلعت آرا ہی کے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔ وہ کچھ عرصے سے سخت بیمار ہے۔ طبیعت

سنبھلنے کے بجائے روز بروز بگڑتی ہی جارہی ہے۔ رانی صاحبہ بتاتی تھیں کہ اسے تپ دق ہو گئی ہے۔"

"یہ تو مجھے میر نصیر نے بھی بتایا تھا۔ کہتا تھا وہ آج کل لکھنؤ میں نہیں ہے۔ اپنی والدہ کے ساتھ نیلم پور میں ہے۔" آغا جانی کہتے کہتے کچھ گڑبڑایا۔ "لو میں بھول ہی گیا۔ کل رات تو تم کو اس سلسلے میں بتا چکا ہوں۔"

"میر نصیر نے تم کو ٹھیک ہی بتایا۔ طلعت آرا نیلم پور میں ہے۔"

"رانی صاحبہ نے تم کو حیدر گڑھ تو نہیں بلایا؟" آغا نے دریافت کیا۔

"نہیں۔" قیصر مرزا صاف مکر گیا لیکن کچھ سوچ کر اس نے فی الفور بات بنائی۔ "اگر وہ یہاں نہ آئیں تو طلعت آرا کے زیورات پہنچانے، مجھے شاید حیدر گڑھ جانا پڑے۔"

"مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ اب وہ یہاں نہیں آئیں گی۔" آغا نے قیاس آرائی کی اور اس کا جواز بھی پیش کیا۔ "ان کو مقدمے کے کاغذات کی ضرورت تھی، وہ ان کو مل گئے۔ اب وہ یہاں کیوں آنے لگیں۔"

"وہ نہ آئیں تو میں خود حیدر گڑھ چلا جاؤں گا۔" قیصر مرزا نے بات بڑھانے کی کوشش نہ کی۔ "زیورات تو بہرحال ان کو پہنچانے ہی ہوں گے۔"

آغا جانی اُٹھ کر کھڑا ہوا۔ "آؤ اب کھانا کھالیں۔ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔"

قیصر مرزا بھی کھڑا ہو گیا۔ آغا جانی نے تخت پر دسترخوان بچھایا۔ نہایت اہتمام سے کھانا لگایا۔ کھانا عمدہ اور لذیذ تھا۔ آغا ایک ایک پلیٹ آگے بڑھا کر اصرار کرتا رہا۔ قیصر مرزا رغبت سے کھانا کھاتا رہا۔

کھانے سے فارغ ہوتے ہی آغا جانی نے زیورات کی پوٹلی لا کر قیصر مرزا کے سامنے رکھ دی۔ قیصر مرزا نے کھول کر دیکھا۔ زیورات پورے تھے۔ اس نے زیورات سنبھالے اور اُوپر جانے کے لئے زینے میں داخل ہو گیا۔ آغا اس کے ہمراہ تھا۔ کمرے میں پہنچ کر آغا جانی نے لیمپ روشن کیا۔ قیصر مرزا نے صندوق کھولا اور زیورات کو اندر رکھا۔ پچاس روپے نکالے اور آغا جانی کو دے دیئے۔ وہ مزید رقم چاہتا تھا، مگر قیصر مرزا نے

ٹال دیا۔

آغا جانی زیادہ دیر کمرے میں نہ ٹھہرا۔ جب وہ چلا گیا اور قیصر مرزا کو اندازہ ہو گیا کہ وہ چلّہ کشی کے لئے تہ خانے میں جا چکا ہے تو وہ خاموشی سے اُٹھا۔ صندوق کھولا۔ ارجمند سلطانہ کی تصویر نکالی۔ اسے دیکھا اور محویت کے عالم میں دیر تک دیکھتا رہا۔

☆

قیصر مرزا کی بے چینی کم ہونے کے بجائے روز بروز بڑھتی ہی گئی۔ چند روز میں اس کے چہرے کی شگفتگی ماند پڑ گئی۔ آنکھوں سے ویرانی جھلکنے لگی۔ اب وہ کھویا کھویا سا رہتا۔ بات چیت بھی کم کرتا۔ ارجمند سلطانہ اس کے ذہن پر اس طرح چھا گئی تھیں کہ طلعت آرا کی یاد بھی اس میں دب کر دُھندلی پڑ گئی۔ وہ اس کے لئے ایک معمّہ بن گئی تھیں۔ وہ جتنا ان کے متعلّق غور کرتا' اتنا ہی اُلجھتا جاتا۔ کبھی ان کی باتوں پر یقین کر لیتا۔ کبھی شک و شبہے میں مُبتلا ہو جاتا۔ اپنی اس اُلجھن کا اظہار وہ آغا جانی سے نہ کر سکا۔ حالانکہ اب وہ چوتھے پانچویں روز، شام ہوتے ہی عشرت منزل میں پہنچ جاتا اور رات وہیں بسر کرتا۔

آغا جانی ان دِنوں بہت ہشاش بشاش نظر آتا تھا۔ بات بات پر اس کی باچھیں کھل جاتیں۔ نہ اب قرض خواہوں کا دھڑکا تھا' نہ کھانے پینے کی فکر تھی۔ پہر رات گذرتے ہی وہ تہ خانے میں چلا جاتا اور مایا جگانے کے لیے رات بھر چلّہ کشی کرتا۔ دن میں لمبی تان کر سوتا۔ وہ اپنی دُھن میں ایسا مگن تھا کہ قیصر مرزا کی پُر اسرار خاموشی پر بھی توجہ نہ دے سکا۔

ایک رات دونوں کھانا کھا رہے تھے۔ آغا جانی کو اچانک طلعت آرا کا خیال آ گیا۔ اس نے قیصر مرزا سے دریافت کیا۔ "اماں قیصر مرزا! کچھ طلعت آرا کا بھی حال احوال معلوم ہُوا۔ کیسی ہے۔ کہاں ہے؟" وہ شوخی سے مُسکرایا۔ "اس کی یاد تو ستاتی ہوگی؟"

"مجھے اس کے متعلّق کچھ خبر نہیں۔ یہ بھی نہیں معلوم کہ اب تک نیلم پور میں ہے یا اپنی والدہ کے ساتھ واپس آ گئی۔" قیصر مرزا نے بے نیازی سے جواب دیا۔" اس کے

بارے میں تم کو ہی اطلاع ہوگی۔ میں تو آج کل کہیں آتا جاتا بھی نہیں۔"

"اپنا بھی یہی حال ہے۔" آغا نے کہا۔ "میر نصیر کے پاس تو اس روز کے بعد گیا ہی نہیں۔ راستے میں کبھی کبھار دکھائی بھی دیا تو نظر بچا کر گذر جاتا ہوں۔ اس سے ملنا جلنا ہوتا تو طلعت آرا کے بارے میں کچھ معلوم ہوتا اور میرا کوئی ایسا جاننے والا نہیں جو طلعت آرا اور اُس کے خاندان سے واقفیت رکھتا ہو۔" قیصر مرزا خود فراموشی کے عالم میں بیٹھا تھا۔ اس نے آغا جانی کی باتوں پر کسی ردِ عمل کا اظہار نہ کیا۔ آغا جانی نے قدرے توقف کیا۔ پھر نظریں اُٹھا کر قیصر مرزا کو دیکھا۔ حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔ "اماں کیا سوچنے لگے۔" وہ بے تکلفی سے کھل کھلا کر ہنسا۔ "تم اس وقت ہو کہاں؟"

قیصر مرزا نے چونک کر آغا جانی کو دیکھا اور ایک ٹک دیکھتا رہا۔ زبان سے کچھ نہ کہا۔

"اماں میرے چہرے کی طرف کیا دیکھ رہے ہو؟" آغا بدستور مُسکراتا رہا۔ "تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔"

قیصر مرزا کیا جواب دیتا۔ اس نے آغا جانی کی بات توجہ سے سُنی ہی نہ تھی۔ وہ ارجمند سلطانہ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس نے خواہ مخواہ مُسکرانے کی کوشش کی۔ دفعتہً دِل کی بات زبان پر آگئی۔ "یار آغا جانی یہ تو بتاؤ کہ بڑھاپے میں کوئی جوان ہو سکتا ہے۔" کہنے کو تو قیصر مرزا نے یہ بات کہہ دی، مگر گھبرا بھی گیا۔

"اس وقت اس بات کی کیا تُک تھی۔" آغا نے حیرت زدہ ہو کر قیصر مرزا کے چہرے پر نظر ڈالی۔ مُسکرا کر بولا۔ "یہ تم کو بیٹھے بٹھائے سُوجھی کیا؟"

قیصر مرزا نے جھٹ بات بنائی۔ "بس یونہی ایک بات ذہن میں آئی تھی۔" وہ ذرا جھجکا، پھر گویا ہُوا۔ "بھئی مجھے تو یقین نہیں آتا کہ ایسا ہو سکتا ہے۔"

"یہ نہ کہو۔ ایسا ہو سکتا ہے۔" آغا جانی نے اس کی بات میں دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔ "تم جوان ہونے کی بات کرتے ہو۔ اماں مُردے زندہ ہو جاتے ہیں۔ بنگال کے بھاول سنیاسی کا واقعہ تو تم نے بھی سُنا ہوگا۔ اس کا تو کریا کرم بھی ہو گیا تھا۔ جن لوگوں

نے اس کی چتا کو اپنے ہاتھ سے آگ لگائی تھی، ابھی تک موجود ہیں، مگر ایک روز وہ زندہ سلامت نمودار ہو کر سب کے سامنے آگیا۔"

"مگر وہ تو یہ دعویٰ کرتا ہے کہ جب چتا کی لکڑیوں کو آگ دکھائی گئی تو اچانک بارش اور آندھی آگئی۔ لکڑیاں گیلی ہو کر بجھ گئیں۔ لاش جلی ہی نہیں۔ وہ مرا نہیں تھا۔ سکتہ طاری ہو گیا تھا۔ ہوش آیا تو چتا سے اُٹھ کر باہر آگیا۔" قیصر مرزا نے تبصرہ کیا۔ "لیکن کتنے ہی ایسے ہیں جو اس کے دعوے کو تسلیم نہیں کرتے۔ اس کے بیان کو من گھڑت بتاتے ہیں۔"

"اس کی وجہ تو دراصل اس کی ریاست ہے۔ جن لوگوں نے اس پر قبضہ کر لیا ہے وہ اپنا قبضہ برقرار رکھنے کے لئے اسے جھٹلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان ہی لوگوں نے تو اس کو زہر دے کر مار ڈالنے کی کوشش کی تھی اور تو اور خود بھاول سنیاسی کی بیوی اس سازش میں شریک تھی۔" آغا اپنے موقف پر ڈٹا رہا۔ "اماں، یہ جائیداد اور دولت کا چکر ہی ایسا ہوتا ہے، مگر جس کو اللہ رکھے اُسے کون چکھے۔ بھئی میں تو سمجھتا ہوں کہ بھاول سنیاسی سچا ہے۔"

"ہو سکتا ہے تمہارا خیال درست ہو۔" قیصر مرزا نے اُلجھنے کی کوشش نہ کی۔ وہ گھوم پھر کر پھر اپنی بات کی جانب واپس آگیا۔ "لیکن بھئی یہ تو نہ کبھی دیکھا نہ سُنا کہ کوئی بڑھاپے میں جوان ہو گیا ہو۔"

"تم نے نہ سُنا ہو گا لیکن میں تو یہ جانتا ہوں کہ امر پھل کھا کر تو ساٹھ سال کا بوڑھا بھی جوان بن جاتا ہے۔"

"اچھا تو امر پھل کی یہ خاصیت ہے؟" قیصر مرزا نے تعجب کا اظہار کیا۔ "مگر یار یہ امر پھل ہوتا کہاں ہے؟ بس سُنا ہی سُنا ہے۔"

"کیوں نہیں ہوتا امر پھل۔" آغا جانی نے جما کر کہا۔ "وہ اپنے میر اغن ہیں۔ اماں وہی میر اغن جو نواب فریدوں کی سرکار میں ملازم ہیں۔ ان کا چشم دید واقعہ ہے۔"

"کیا واقعہ ہے؟" قیصر مرزا نے بے چین ہو کر دریافت کیا۔ "تم نے کبھی بتایا

ہی نہیں۔"

"کسی روز انھی کی زبان سے تم کو سنوا دوں گا۔" آغا جانی نے تفصیل میں جانے سے گریز کیا۔

"اماں اس وقت تو تم ہی سنا دو۔"

آغا نے ٹالنے کی کوشش کی، مگر جب قیصر مرزا نے بہت اصرار کیا تو وہ مجبور ہو گیا۔ اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور یوں گویا ہوا "تم کو تو یاد ہی ہوگا، جس زمانے میں نواب فریدوں کا علاقہ چیف کورٹ کے منصرم کی تحویل میں نہ گیا تھا، میرا عزیز بہرائچ میں رہتے تھے اور نواب فریدوں کی زمین داری کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ وہیں یہ واقعہ پیش آیا۔ ہوا یہ کہ گاؤں کا ایک بوڑھا گھر والوں سے لڑ جھگڑ کر نشان گاڑھا اسٹیشن سے آگے نیپال کی سرحد کی طرف نکل گیا۔ راستے کا کچھ اتہ پتہ نہ تھا۔ کئی روز تک ترائی کے جنگلوں میں بھٹکتا رہا۔ کھانے پینے کو اس کے پاس کچھ تھا نہیں۔ کئی وقت کے فاقے گذر گئے۔ اب اسے یہ تلاش ہوئی کہ کوئی پھل دار درخت مل جائے جس کے پھل توڑ کر پیٹ کی آگ بجھائی جائے۔ ڈھونڈتا ڈھانڈتا ایک سمت نکل گیا۔ کیا دیکھتا ہے کہ ایک پیڑ پر سرخ سرخ پھل لٹک رہے ہیں۔ یہ امر پھل تھے۔ بوڑھا آنکھیں بند کر کے ان پر ٹوٹ پڑا۔ توڑ توڑ کر پھل کھانے لگا۔ کوئی تین چار ہی پھل کھائے ہوں گے کہ نشے سے جھومنے لگا۔ ایسی غنودگی طاری ہوئی کہ وہیں پڑ کے بے خبر سو گیا۔"

"کسی جنگلی جانور نے بھی اس پر حملہ نہ کیا؟" قیصر مرزا نے دریافت کیا۔

"یار جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔ موت اپنے وقت پر ہی آتی ہے۔ کچھ زندگی باقی تھی۔ بوڑھا بے سدھ پڑا رہا۔" آغا جانی نے بتایا۔ "خدا معلوم وہ کب تک سوتا رہا۔ جب آنکھ کھلی تو دیکھا کہ اس کا تمام جسم سوج کر مشک بن گیا ہے۔ اس نے ہاتھ پاؤں کو جنبش دینے کی کوشش کی تو وہ من من بھر کے ہو گئے تھے۔ ایک دن اور ایک رات اسی حالت میں پڑا رہا۔ تیسرے روز اس کا سوجا ہوا جسم اپنے

لگا۔ پھر غبارے کی طرح خود بخود پھٹ گیا۔"

"پھر وہ زندہ کیسے بچا؟" قیصر مرزا نے گھبرا کر پوچھا۔

"پہلے پوری بات تو سن لو۔" آغا جانی نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "بیچ میں نہ ٹوکو۔"

"اچھا اچھا تم اپنی بات جاری رکھو۔" قیصر مرزا اس کی خفگی کو خندہ پیشانی سے جھیل گیا۔ "اب نہیں ٹوکوں گا۔"

آغا نے سلسلۂ گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ اس کا جسم پچخ کر پھٹ گیا۔ اس کے پھٹنے سے ایسی دہشت ناک آواز نکلی کہ وہ دہل کر بے ہوش ہو گیا۔ جب ہوش آیا تو کیا دیکھتا ہے کہ اس کا جسم رطوبت اور آلائش میں لتھڑا ہوا ہے۔ قریب ہی پھٹی ہوئی کھال پڑی ہے۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا لیکن یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس کے بدن پر جوانوں کی مانند کھال آ گئی تھی اور جسم مضبوط ہو گیا تھا؛ اب اس میں خوب طاقت بھی آ گئی تھی۔ وہ اُٹھا۔ اپنے پرانے کپڑوں کو قریب کی پہاڑی ندی میں دھویا۔ کپڑے سکھانے کو ڈال دیئے اور ندی میں نہانے لگا۔ کپڑے سوکھ گئے تو انہیں پہنا اور ایک طرف روانہ ہو گیا، مگر کچھ ہی دُور گیا تھا کہ لکڑ ہاروں کی ایک ٹولی مل گئی۔ وہ بھی ان میں شامل ہو گیا لیکن مزا اس وقت آیا جب وہ اپنے گھر پہنچا۔"

"وہاں کیا واردات گذری؟" قیصر مرزا نے حیرت سے پوچھا۔

لیکن اس بار قیصر مرزا کی مداخلت پر آغا نے خفگی یا جھنجلاہٹ کا اظہار نہ کیا۔ ہنس کر بولا۔ "اماں وہ بغیر آواز دیے گھر میں دندناتا ہوا داخل ہو گیا۔ کنڈی کھٹکھٹانے یا آواز دینے کی ضرورت بھی نہ تھی۔ اس کا اپنا گھر تھا۔ دن کا وقت تھا۔ اس کے لڑکے بالے کھیتوں میں کام کرنے گئے تھے۔ عورتوں نے جو یہ دیکھا کہ ایک نوجوان گھر میں گھس آیا ہے تو انھوں نے شور مچانا شروع کر دیا۔ انھوں نے اسے بالکل نہ پہچانا۔ شور و غل سن کر دروازے پر سارا گاؤں اکٹھا ہو گیا۔ کچھ سر پھروں نے آگے بڑھ کر مارنا شروع کر دیا۔ وہ بار بار اپنا نام بتاتا، مگر کسی نے کان نہ دھرا۔ ایسا مارا کہ زخمی ہو کر ڈھیر

ہوگیا۔ کچھ بڑے بوڑھوں کو اس پر ترس آیا۔ آگے بڑھ کر پوچھ گچھ کی۔ اس نے پتہ نشان بتایا۔ قسمیں کھا کھا کر سارا ماجرا بیان کیا، تب اس کی جان بچی۔"

"بھئی آغا کچھ یقین نہیں آتا۔" قیصر مرزا نے دبی زبان سے اپنے شبہے کا اظہار کیا۔

"تم بھی کمال کرتے ہو۔" آغا جانی نے زور دے کر کہا۔ "میرا غن خود اس وقت اتفاق سے گاؤں میں موجود تھے۔ ان کا چشم دید واقعہ ہے۔ کئی بار سنا چکے ہیں اور اکثر سناتے رہتے ہیں۔ ایک بار سلّو تنبولی نے ان کی بات سن کر شبہے کا اظہار کیا تو سو سو روپے شرط باندھ کر بہرائچ لے جا کر تصدیق کرانے پر آمادہ ہو گئے تھے۔ اس وقت تو بات آگے نہ بڑھی، معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ سنا ہے کہ بعد میں نشان گاڑھا کے اسٹیشن ماسٹر لکھنؤ آئے۔ میرا غن سے بھی ملے۔ وہ بھی اس واقعہ کے عینی شاہد تھے۔ انھوں نے سب کے سامنے میرا غن کے بیان کی تصدیق بھی کر دی تھی۔"

قیصر مرزا نے مزید استفسار نہ کیا۔ بات آئی گئی ہو گئی۔ آغا چلّہ کشی کے لئے حسبِ معمول تہہ خانے میں داخل ہو گیا۔ قیصر مرزا اپنے کمرے کی جانب چل دیا۔

آغا جانی سے بات کرنے کے بعد اس کا شک و شبہ رفتہ رفتہ زائل ہونے لگا۔ اسے نہ صرف ارجمند سلطانہ کی باتوں پر یقین آ گیا تھا بلکہ اب وہ ہر وقت انھی کے بارے میں سوچتا رہتا۔

آغا سے بھی اس کی بہت کم بات چیت ہوتی۔ آغا کے سر میں ابھی تک دفینہ نکالنے کا سودا سمایا ہوا تھا۔ بلکہ کچھ زیادہ ہی شدّت اختیار کر گیا تھا۔ اس نے قلزم شاہ کی ہدایت پر ایک نیا چلّہ شروع کر دیا تھا۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ اس بار دفینہ ضرور نکل آئے گا۔ قیصر مرزا سے بات ہوتی تو وہ اپنے اسی یقین کا اظہار کرتا۔ قیصر مرزا اس کی باتیں سن کر عام طور پر خاموش رہتا۔ کبھی کبھار اس کی حوصلہ افزائی کے لئے مسکرا کر کچھ کہہ بھی دیتا۔

اسے ان دنوں آغا سے اور دفینے سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ اپنی دھن میں مگن

تھا۔ ہر دم ارجمند سلطانہ کے تصوّر میں گم رہتا۔ اس کی شیفتگی کا یہ عالم تھا کہ وقت کاٹنا دوبھر ہوگیا۔ ارجمند سلطانہ سے ملنے اور ان کو دیکھنے کے اشتیاق میں ایک ایک دِن گننے لگا۔

(۶)

یہ ۲۷ اکتوبر کی رات تھی۔

کاتک کا مہینہ لگ چکا تھا۔ لیکن موسم ابھی بدلا نہ تھا۔ آسمان پر بادلوں کا غُبار چھایا رہتا، مگر بارش نہ ہوتی۔ سورج بادلوں کی اوٹ سے اس طرح جھانکتا کہ دھوپ کی تمازت سے جسم پگھلتے ہوئے معلوم ہوتے۔

اس روز ہوا بند تھی۔ درخت دم بخود اور ساکت تھے۔ پتّا بھی نہ ہلتا تھا۔ کمرے کے اندر سخت اُمس تھی۔ عشرت منزل پر ہُو کا عالم طاری تھا۔ آغاجانی سرِ شام ہی تہ خانے میں چلّہ کشی کے لئے چلا گیا تھا۔

قیصر مرزا گرمی اور اُمس سے پریشان ہو کر کمرے سے باہر نکل آیا اور بے چینی سے چھت پر ٹہلنے لگا۔ پچھلے پانچ روز اس نے سخت کش مکش کے عالم میں گذارے تھے۔ ایک ایک گھڑی کا شمار کیا تھا۔ ایک ایک پل کا انتظار کیا تھا۔ ارجمند سلطانہ اب اس کے لئے بہت پُراسرار بن گئی تھیں۔ ان کو دیکھنے کی تمنّا شدّت اختیار کرتی جارہی تھی۔ اس انتظار میں مسرّت و استعجاب دونوں جذبے کچھ اس طرح گھُل مل گئے تھے کہ اس کے لئے یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔

پریشانی زیادہ بڑھی تو وہ کمرے کے اندر واپس چلا گیا۔ ارجمند سُلطانہ کی تصویر نکالی اور میز پر دیوار کے سہارے رکھ دی۔ چھبیس ستائیس سال قبل کی ارجمند سلطانہ کا عکس اس کے روبرو تھا۔ وہ تصویر کو محویت کے عالم میں تکنے لگا۔ اس کے اردگرد سہانے خوابوں کا جال پھیل گیا۔ وہ کسی سحرزدہ انسان کی طرح بُت بنا سوچ رہا تھا۔ مُردے اگر زندہ ہو سکتے ہیں۔ بہاریں اگر لوٹ کر آسکتی ہیں۔ پت جھڑ کے مارے ہوئے

خشک درختوں میں اگر کونپلیں پھوٹ سکتی ہیں تو ارجمند سلطانہ تم بھی اسی روپ میں پھر جلوہ گر ہو سکتی ہو۔ اس نے وارفتگی کے عالم میں آنکھیں بند کر لیں اور میز پر سر ٹکا دیا۔

رات آہستہ آہستہ اپنا سفر طے کر رہی تھی۔ ستاروں کے کنول جگمگا رہے تھے۔ قیصر مرزا جاگ رہا تھا، ٹکٹکی باندھے ارجمند سلطانہ کی تصویر دیکھ رہا تھا۔ ناگاہ گہرے سناٹے میں چھت پر قدموں کی آہٹ اُبھری۔ قیصر مرزا نے چونک کر دروازے کی جانب دیکھا۔ چاپ قریب آتی جا رہی تھی۔ اس نے تصویر اُٹھائی اور فی الفور تکیے کے نیچے چھپا دی۔

آغا جانی دروازے پر نمودار ہُوا۔ وہ آہستہ سے کھنکارا۔ قیصر مرزا نے گردن کو خم دے کر اس کی جانب دیکھا۔ وہ پسینے میں شرابور تھا۔ چہرے اور بالوں پر خاک کے ذرات بکھرے ہوئے تھے۔ آنکھیں جنگلی کبوتر کی مانند سُرخ ہو رہی تھیں۔

"خیریت تو ہے؟" قیصر مرزا نے گھبرا کر پوچھا۔ "تم ابھی سے کیسے باہر نکل آئے؟"

آغا جانی تھکے ہوئے لہجے میں بولا۔ "بھئی میں تو پریشان ہو کر تہہ خانے سے باہر آگیا۔" وہ قیصر مرزا کے قریب ہی ایک کُرسی پر بیٹھ گیا۔

"گرمی بھی تو آج کس غضب کی ہے۔" قیصر مرزا نے اپنے ردِّعمل کا اظہار کیا۔ "تہہ خانے کے اندر تو دَم گھٹتا ہو گا۔ بالکل تنور کی طرح دیواروں سے بھبکے نکلتے ہوں گے۔"

"گرمی تو کئی روز سے ایسی ہی سخت پڑ رہی ہے۔ اس کی تو مجھے پروا نہیں، مگر آج رات مجھے تہہ خانے میں کچھ عجیب سی وحشت معلوم ہوئی۔" یہ کہتے ہوئے اس کا چہرہ دُھندلا پڑ گیا۔ آنکھوں سے خوف جھلکنے لگا۔ "اب تم سے کیا بتاؤں کیا واردات گزری۔ آنکھیں بند کر کے جیسے ہی عمل شروع کرتا، ایسا لگتا جیسے کوئی عورت چھم چھم کرتی ہوئی تہہ خانے میں چل پھر رہی ہو۔ اس کے چلنے کی آواز جب بالکل قریب آجاتی تو میں گھبرا کر آنکھیں کھول دیتا۔ آنکھوں کے سامنے اس کی پرچھائیں لہراتی۔ وہ زور زور سے قہقہے لگاتی اور اُلٹے ہاتھ کی دیوار میں سما کر غائب ہو جاتی۔ کم بخت ایسا ہولناک قہقہہ بلند کرتی کہ دِل دہل کر رہ جاتا۔"

قیصر مرزا اُس کی باتیں سُن کر سہم گیا۔ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "یار چھوڑو اس

جنجال کو۔ بڑا جان جوکھوں کا کام ہے۔ مایا جگانے کے چکر میں کہیں جان کے لالے نہ پڑ جائیں۔"

"اماں، اُن باتوں میں کیا رکھا ہے۔" آغا جانی کے چہرے پر چھائے ہوئے خوف کے سائے مدّہم پڑ گئے۔ وہ ایک دَم شیر ہو گیا۔ چہک کر بے نیازی سے بولا۔" اسی طرح ڈرنے لگا تو کر چکا چلّہ کشی۔ بات دراصل یہ ہے کہ دِن کو ٹھیک سے سو نہ سکا۔ تہہ خانے میں داخل ہوتے ہی کھُدائی شروع کر دی اور دیر تک کھُدائی کرتا رہا۔ خاصی گہرائی تک چلا گیا۔ تھکن سے بار بار غنودگی طاری ہو جاتی تھی۔ تب ہی اس کی اتنی ہمّت ہوئی۔"

"میں تو سمجھتا ہوں کہ اب تو وہ روز ہی تم کو دہشت زدہ کرنے کی کوشش کرے گی۔" قیصر مرزا بدستور خوفزدہ تھا۔" مایا کو جگانا اور اسے قابو میں کرنا بڑا مشکل کام ہے۔"

"مجھے بھی معلوم ہے کہ یہ کتنا مشکل کام ہے۔ مگر تم پروانہ کرو۔" آغا نے مُسکرا کر قیصر مرزا کو اطمینان دلایا۔" حصار میں تو وہ داخل ہو نہیں سکتی۔ اسے میں عمل شروع کرنے سے پہلے ہی کھینچ دیتا ہوں۔ حصار کے باہر ہی باہر خوف زدہ کرنے کی کوشش کرتی رہتی ہے۔ میں بھی اس کی تاک میں لگا ہوں۔ چُڑیا ہاتھ میں آگئی تو اسے مروڑ کر دہ زنانے کے ہاتھ لگاؤں گا کہ سارا عزّہ نکل جائے گا۔" اس نے پیشانی پر آیا ہوا پسینہ پونچھا۔ "بہر حال اب تو کل اسے دیکھوں گا۔ آج تھکن بھی محسوس ہو رہی ہے۔ اسی لئے تہہ خانے سے باہر آ گیا۔ کل سہ پہر ہی سے چلا جاؤں گا۔ دیکھنا اسے کس طرح قابو میں لاتا ہوں۔ ایسا اینچر پھینکوں گا کہ ساری چوکڑی بھُول جائے گی۔ پیروں پر گر کر دُہائی دے گی۔" اس نے جماہی لے کر بات کا رُخ بدل دیا۔" بھئی یہاں تو بڑی گرمی ہے۔ نیچے چلو، صحن میں پلنگ ڈال کر آرام سے سوئیں گے۔ کمرے میں تو نیند آنے سے رہی۔"

مگر قیصر مرزا آمادہ نہ ہُوا۔ آغا کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ وہ مزید نہ ٹھہرا۔ اُٹھا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔

قیصر مرزا کی آنکھوں میں نیند کا کوسوں پتہ نہ تھا۔ اس نے بستر پر لیٹ کر سونے کی کوشش کی مگر آنکھ نہ لگی۔ کچھ دیر بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔ پھر اُٹھ بیٹھا۔ کمرے

میں لیمپ کی پھیکی پھیکی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ وہ کھڑکی کے قریب بیٹھا رہا اور سوچتا رہا۔ باہر صحن میں درخت سر اُٹھائے دم بخود کھڑے تھے۔ خاموشی بہت گہری تھی۔ کوتوالی کے گھڑیال نے ٹن ٹن دو بجائے۔ قیصر مرزا چونکا اور پھر بستر پر لیٹ گیا۔

☆

سویرے ہی سویرے دروازے پر دستک ہوئی۔ قیصر مرزا کی آنکھ کھل گئی۔ وہ بہت گہری نیند سو رہا تھا۔ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ کھڑکی سے جھک کر نیچے صحن میں دیکھا۔ آغا جانی کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ اس کا بستر خالی تھا۔ قیصر مرزا آنکھیں ملتا ہُوا نیچے آیا۔ ڈیوڑھی میں گیا۔ دروازہ کھولا۔ سامنے ارجمند سلطانہ کا ڈرائیور کھڑا تھا۔ قیصر مرزا کو دیکھتے ہی ڈرائیور نے جھک کر آداب کیا اور ارجمند سلطانہ کا یہ پیغام پہنچایا۔ "رانی صاحبہ نے آپ کو یاد فرمایا ہے۔ آج رات دس بجے آپ کو حیدر گڑھ پہنچنا ہے۔ میں آپ کو لینے شام کو سات بجے تک پہنچ جاؤں گا۔"

"اور اگر تم کسی وجہ سے نہ پہنچ سکے تب کیا صورت ہو گی؟" قیصر مرزا نے دریافت کیا۔

"اگر میں نہ آسکا تو آپ کو خود ہی زحمت کرنا ہو گی۔ رانی صاحبہ نے یہی فرمایا ہے۔" ڈرائیور نے وضاحت کی۔

قیصر مرزا مزید بات چیت نہ کر سکا۔ اس اثنا میں آغا جانی بھی پہنچ گیا۔ وہ حیرت سے ڈرائیور کو دیکھنے لگا۔ ڈرائیور نے اس کی جانب کوئی توجہ نہ دی۔ خاموشی سے واپس چلا گیا۔ قیصر مرزا اندر پہنچا تو آغا جانی نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔ "یہ رانی صاحبہ کا ڈرائیور تھا نا؟ مجھے تو وہی لگتا تھا۔"

"ہاں وہی تھا۔" قیصر مرزا انکار نہ کر سکا۔

"صبح ہی صبح کس لئے آیا تھا؟"

"رانی صاحبہ کا پیغام لے کر آیا تھا۔ انھوں نے مجھے بُلایا ہے۔" قیصر مرزا نے صاف گوئی سے کام لیا۔

"بادشاہ باغ والی کوٹھی پر بُلایا ہے یا حیدر گڑھ؟"

"حیدر گڑھ۔" قیصر مرزا نے آغا کو بتایا۔ "آج رات دس بجے مجھے وہاں پہنچنا ہوگا۔"

"اس نے یہ نہیں بتایا کہ کیوں بُلایا ہے؟" آغا جانی کے انداز میں تجسّس تھا۔

"نہ اس نے بتایا اور نہ میں نے پوچھا۔"

"بھئی حد کر دی تم نے۔" آغا نے مُنہ بگاڑ کر بیزاری کا اظہار کیا۔ "اس سے یہ تو پوچھا ہوتا کہ کیوں بلایا ہے؟"

"میرا خیال ہے کہ ڈرائیور کو معلوم ہی نہیں ہوگا۔ اگر معلوم ہوتا تو ضرور بتاتا۔" قیصر مرزا نے اس دفعہ پردہ پوشی سے کام لیا۔ اس نے آغا کو مزید کُریدنے کا موقع نہ دیا۔ فوراً بات بنائی۔ "مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ طلعت آرا بھی وہاں موجود ہوگی۔ انہوں نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ طلعت آرا کو مجھ سے ایک بار ضرور ملائیں گی۔ تم سے اس کا ذکر بھی کر چکا ہوں۔" اس نے قدرے تامّل کیا پھر گویا ہوا۔ "زیورات تو واپس پہنچانا ہی تھے۔ رانی صاحبہ کے بجائے طلعت آرا کو اپنے ہاتھ سے زیورات دوں گا تو وہ کتنی خوش ہوگی، تم اس کا اندازہ نہیں کر سکتے۔"

"اماں چھوڑو کیا رکھا ہے ان باتوں میں۔" آغا جانی کے ہونٹوں پر زہر خند تھا۔ "معلوم ہوتا ہے تمہارے سر سے عشق کا بھوت ابھی تک اُترا نہیں۔"

قیصر مرزا خاموش رہا۔ شوخی سے زیرِ لب مُسکراتا رہا۔

"میرا کہا مانو تو حیدر گڑھ نہ جاؤ۔" آغا جانی نے قیصر مرزا کو روکنا چاہا اور یہ جواز پیش کیا۔ "خواہ مخواہ خوش فہمی میں مبتلا ہونے کی کوشش نہ کرو۔ طلعت آرا وہاں ہرگز نہ ہوگی۔ تم تو اسے اب بھول جانے کی کوشش کرو اور یہ سوچو۔ خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سُنا افسانہ تھا۔" وہ بے تکلّفی سے مُسکرایا پھر ایکا ایکی سنجیدہ ہوگیا۔ "میری سمجھ میں تو یہ بھید نہ آیا کہ رانی صاحبہ نے تم کو کیوں بُلایا ہے۔ غرض ہوگی تو وہ زیورات لینے خود آئیں گی۔ تم جاؤ بھی تو زیورات لے کر ہرگز نہ جانا۔ تم رانی صاحبہ کی نظروں میں سُرخ رو ہونے کی فضول کوشش کر رہے ہو۔ ان پر ذرا اثر نہ ہوگا۔"

"میں جاؤں گا اور زیورات لے کر جاؤں گا۔" قیصر مرزا نے دو ٹوک جواب دیا۔ آغا جانی نے قیصر مرزا کے بدلے ہوئے تیور دیکھے تو اُلجھنے کی کوشش نہ کی۔

☆

قیصر مرزا اُس روز دِن ڈھلتے ہی اپنے گھر سے نکلا اور سورج غروب ہونے سے قبل عشرت منزل پہنچ گیا۔ وہ خوب بن سنور کر آیا تھا۔ لباس کے انتخاب میں بھی بڑی خوش ذوقی اور نفاست کا خیال رکھا تھا۔ سر پر مُکلّف دوپلّی ٹوپی تھی۔ کُرتا عمدہ ململ کا تھا اور کڑھا ہوا بھی تھا۔ گرمی کے باوجود جامدانی کی اُجلی اچکن تھی اور پیروں میں وارنش کے چمکتے دمکتے پمپ شو تھے۔ آغا جانی بھی کچھ ہی دیر پہلے ہاتھ مُنہ دھو کر غسل خانے سے نکلا تھا۔ اس نے قیصر مرزا کی سج دھج دیکھی تو مُسکرا کر بولا۔ "واللہ کہیں نظر نہ لگ جائے۔"

قیصر مرزا مُسکرایا اور جھک کر تین بار آغا کو شوخی سے آداب کیا۔

"تو گویا تم حیدر گڑھ ضرور جا رہے ہو۔"

"آیا تو اسی ارادے سے ہوں۔"

"کب تک واپسی ہو گی؟" آغا جانی نے دریافت کیا۔

"فی الحال کچھ کہہ نہیں سکتا۔" قیصر مرزا نے گول مول جواب دیا۔ "رات کو تو آنا مشکل ہو گا۔"

"میں تو اب تہہ خانے میں جا رہا ہوں۔" آغا نے گفتگو کا سلسلہ ختم کرتے ہوئے کہا۔ "حیدر گڑھ جانے سے پہلے تہہ خانے کی کُنڈی کھٹ کھٹا کر مجھے بُلا لینا تاکہ میں باہر آ جاؤں اور تمہارے جانے کے بعد ڈیوڑھی کا دروازہ بند کر دوں۔"

قیصر مرزا نے اس کی ہدایت پر عمل کرنے کا وعدہ کیا۔ آغا تہہ خانے میں چلا گیا۔ قیصر مرزا زینے میں داخل ہُوا اور سیڑھیاں چڑھ کر اُوپر کمرے میں پہنچ گیا۔ اپنے کمرے میں داخل ہو کر اس نے اچکن اُتاری اور کھونٹی پر احتیاط سے لٹکا دی۔ ٹوپی بھی سر سے اُتار کر میز پر رکھ دی۔ ہَوا چل تو رہی تھی مگر رُک رُک کر موسم بدل رہا تھا۔ اس روز گرمی بھی

کم تھی۔ کھڑکی کی راہ سے کوئی جھونکا آتا تو جسم کو فرحت اور ٹھنڈک محسوس ہوتی۔

سائے طویل ہوتے گئے۔ دھوپ دیواروں کی بلندی پر پہنچ کر اوجھل ہو گئی۔ اندھیرا آہستہ آہستہ ہر طرف پھیلنے لگا۔ شام ہو گئی۔ قیصر مرزا نے لیمپ روشن کیا۔ اس کی بے چینی اب بڑھ گئی تھی۔ سات بج گئے۔ اس نے ایک بار پھر منہ ہاتھ دھویا۔ واپس کمرے میں پہنچ کر آئینے کے سامنے بال سنوارے۔ سر پر ٹوپی جمائی اچکن پہنی اور نیچے چلا گیا۔

آغا جانی ابھی تک تہہ خانے کے اندر تھا۔ عشرت منزل پر گہرا سناٹا چھایا تھا۔ قیصر مرزا بے قراری سے ڈرائیور کا انتظار کرنے لگا۔ بار بار کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھتا۔ وقت گذرتا رہا۔ ساڑھے سات بجنے میں چند منٹ رہتے تھے۔ اس اثنا میں دروازے پر دستک ہوئی۔ ارجمند سلطانہ کا ڈرائیور پہنچ چکا تھا۔

قیصر مرزا نے چونک کر ڈیوڑھی کی جانب دیکھا۔ عین اسی وقت تہہ خانے کے اندر سے آغا کی گھٹی گھٹی چیخیں ابھریں۔ قیصر مرزا پریشان ہو گیا۔ بدحواسی کے عالم میں تہہ خانے کے دروازے پر پہنچا، مگر دروازہ اندر سے بند تھا۔ آغا جانی کے چیخنے چلانے کی آواز بھی بند ہو چکی تھی۔ اس نے بار بار دروازے کو زور زور سے کھٹ کھٹایا۔ آغا کو پکارا مگر کوئی جواب نہ ملا۔ دروازہ بند تھا اور تہہ خانے میں گہری خاموشی چھائی تھی۔

ڈیوڑھی کے بیرونی دروازے پر رُک رُک کر دستک اُبھر رہی تھی۔ قیصر مرزا نے پریشان ہو کر ایک مرتبہ پھر تہہ خانے کے دروازے کی کُنڈی کھٹ کھٹائی۔ آغا کو پکارا بھی۔ لیکن تہہ خانے کے اندر نہ قدموں کی آہٹ اُبھری نہ آغا کی آواز سُنائی دی۔ خاموشی بدستور چھائی رہی۔ وقت کم تھا اور ڈرائیور کے واپس جانے کا خدشہ تھا۔ قیصر مرزا مُڑا۔ دالانوں اور سہ دریوں سے گذر کر صحن میں پہنچا۔ پلٹ کر ایک بار پھر تہہ خانے کی سمت دیکھا۔ وہاں ہنوز سکوت طاری تھا۔

قیصر مرزا نے ڈیوڑھی میں داخل ہو کر بیرونی دروازہ کھولا۔ سامنے ڈرائیور کھڑا تھا۔ قیصر مرزا کو دیکھتے ہی شکوہ کرنے کے انداز میں بولا "سرکار! میں تو سمجھا تھا کہ اندر کوئی موجود ہی نہیں ہے۔ دیر سے دروازے کی کُنڈی کھٹکھٹا رہا تھا۔ نا اُمید ہو کر واپس جانے کا ارادہ

ہی کر رہا تھا۔" اس کے لہجے سے پریشانی ہویدا تھی۔

قیصر مرزا اُس وقت کچھ ایسی ذہنی پریشانی میں مبتلا تھا کہ وضاحت بھی نہ کر سکا۔ اُسے خاموش پا کر ڈرائیور نے کہا۔ "آیئے اب اور دیر نہ کیجئے۔ پہلے ہی دیر ہو چکی ہے۔ آدھا رستہ بھی نہ گزرا تھا کہ اچانک پچھلے پہیئے میں پنکچر ہو گیا۔ کچھ وقت اسٹپنی لگانے میں لگا۔ کچھ شہر میں پہنچ کر پنکچر جڑوانے میں۔ مجھے دس بجے سے پہلے پہلے حیدر گڑھ پہنچنا ہے۔ رانی صاحبہ کا یہی حکم ہے۔"

وہ آگے بڑھا۔ قیصر مرزا واپس اندر بھی نہ جا سکا اس نے دونوں پٹ بھیڑ کر دروازہ بند کر دیا اور ڈرائیور کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ گلی سے گزر کر دونوں سڑک پر پہنچے۔ سامنے ارجمند سلطانہ کی کار کھڑی تھی۔ ڈرائیور نے بڑھ کر کار کی پچھلی نشست کا دروازہ کھولا۔ قیصر مرزا اندر داخل ہو کر بیٹھ گیا۔ ڈرائیور اپنی نشست پر پہنچا۔ اسٹیئرنگ وھیل سنبھالا اور کار کا انجن اسٹارٹ کر دیا۔

کار فراٹے بھرتی ہوئی سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ کوچۂ بازار کی چہل پہل بڑھ گئی تھی۔ دُکانوں اور مکانوں میں روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ شہر کے ہنگامے جاگ رہے تھے اور قیصر مرزا گم صُم بیٹھا تھا۔ وہ ابھی تک پریشان تھا۔ اسے بار بار آغا کا خیال آ رہا تھا۔ نہ معلوم اس پر ایسی کیا افتاد پڑی تھی جو اس بُری طرح چیخا تھا۔ قیصر مرزا کو طرح طرح کے وسوسے ستا رہے تھے۔ معاً اُسے طلعت آرا کے زیورات کا خیال آیا۔ وہ گھبراہٹ اور بدحواسی میں صندوق سے زیورات نکالنا ہی بھول گیا۔ وہ ارجمند سلطانہ کو ان کی تصویر بھی واپس کرنا چاہتا تھا۔ مگر تصویر بھی صندوق ہی میں رہ گئی تھی۔ واپس عشرت منزل بھی جانا اب ممکن نہ تھا۔ پہلے ہی تاخیر ہو چکی تھی۔ ڈرائیور بروقت پہنچنے کی خاطر کار بہت تیز رفتار سے دوڑا رہا تھا۔

شام اب گہری ہو گئی تھی۔ اندھیرا بڑھتا اور پھیلتا جا رہا تھا۔ ڈرائیور اپنی نشست پر جما ہوا بیٹھا تھا۔ اس کی نگاہیں سامنے شیشے پر ٹکی ہوئی تھیں۔ کار کی رفتار دم بدم تیز اور تیز ہوتی جا رہی تھی۔ ڈرائیور اپنی دُھن میں اس قدر مگن تھا کہ ایک بار بھی اس نے

پلٹ کر قیصر مرزا کی جانب نہ دیکھا۔

کار حیدر گڑھ میں داخل ہوئی تو پہر رات گزر چکی تھی۔ بازار کی رونق اُجڑ چکی تھی۔ گلی کوچوں میں سنّاٹا چھایا تھا۔ مکانوں میں کہیں کہیں چراغ جھلملاتے تھے۔

☆

حیدر گڑھ پرانی بستی تھی۔ سیتاپور روڈ پر واقع ہونے کے باعث غلّے کی بڑی منڈی بن گئی تھی۔ حیدر گڑھ میں پولیس کا تھانہ تھا، ڈاک خانہ تھا اور بچوں کی تعلیم کے لئے ایک پرائمری اسکول بھی تھا۔ پختہ مکانات بھی تھے، مگر کم تھے۔ آبادی کا بیشتر حصہ مٹی کے بنے ہوئے کچے مکانوں میں رہتا تھا۔ آس پاس کے گاؤں یا قصبات میں آمدورفت کے لئے یکّے کی سواری تھی یا بیل گاڑیاں استعمال ہوتی تھیں۔ دور دراز کے سفر کے لئے لاریاں چلتی تھیں۔ ریلوے اسٹیشن بھی تھا، مگر حیدر گڑھ سے کوس بھر کے فاصلے پر تھا۔ لاریوں کا اڈہ حیدر گڑھ کے نکڑ پر تھا۔

لاریوں کے اڈّے سے ایک کشادہ سڑک نکلتی تھی، جو سیدھی محل تک جاتی تھی۔ یہ سڑک راجہ یاور علی خان نے تعمیر کرائی تھی اور صرف محل میں آنے جانے والوں کے لئے استعمال ہوتی تھی۔ کار اس سڑک پر مُڑی تو قیصر مرزا نے دیکھا۔ لاریوں کے اڈّے پر ابھی تک کسی قدر چہل پہل تھی۔ چند دُکانیں کھُلی تھیں اور ایک لاری مسافروں سے بھری ہوئی کھڑی تھی۔ لاری سے کچھ مسافر اُتر رہے تھے کچھ سوار ہو رہے تھے۔

لاری سے اُترنے والوں میں ایک ایسا شخص بھی تھا جسے دیکھ کر قیصر مرزا چونکا۔ اُسے شبہ ہوا کہ وہ پیارے آغا ہے۔ قیصر مرزا نے صرف اس کی ایک جھلک دیکھی تھی۔ وہ اُسے غور سے نہ دیکھ سکا۔ کار آن کی آن میں مُڑ کر آگے نکل گئی۔ قیصر مرزا سوچنے لگا کہ پیارے آغا اس وقت حیدر گڑھ کیوں آیا ہے؟

سڑک بالکل سنسان تھی۔ نصف میل سے زیادہ طویل نہ تھی۔ سڑک کے ایک جانب بستی کے مکانات تھے۔ دوسری طرف کھیت تھے جن کا سلسلہ حدِ نظر تک پھیلا ہوا تھا۔

ڈرائیور نے رفتار اب کم کردی تھی۔ محل کی عمارت دُور ہی سے نظر آرہی تھی۔ یہ پرانی وضع کی دو منزلہ حویلی تھی۔ بہت زیادہ بڑی اور عالی شان بھی نہ تھی۔ اس کے چاروں طرف قدِ آدم پختہ چاردیواری تھی۔ اُونچا آہنی پھاٹک تھا۔ پھاٹک پر مسلّح پہرے دار تعینات تھے۔ کار نزدیک پہنچی تو پہرے داروں نے پھاٹک کھول دیا۔ کار چاردیواری میں داخل ہوگئی۔

عمارت کے اردگرد وسیع باغ تھا جس میں قسم قسم کے گھنے اور سائے دار درخت تھے۔ پھل دار درخت بھی تھے۔ پورے ایک قطعے پر عمدہ قلمی آم کے درخت تھے۔ عمارت کے سامنے سبزہ زار تھا۔ سبزہ زار کے بیچ میں سنگِ مرمر کا خوبصورت فوارہ تھا۔ فوارے کے آس پاس جگہ جگہ پھولوں کے تختے تھے۔ درمیان سے روشیں گزرتی تھیں۔

ہر طرف گہرا سناٹا طاری تھا۔ نہ کوئی آمدورفت تھی، نہ چہل پہل۔ دو منزلہ عمارت اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ کہیں کہیں دریچوں کے شیشوں سے روشنی جھلکتی تھی، صدر دروازہ اونچا اور خاصا چوڑا تھا۔ اس کی بلندی پر پیتل کی قندیل روشن تھی۔ صدر دروازے تک پہنچنے کے لئے کئی سیڑھیاں چڑھنا پڑتی تھیں۔ دروازے کے آگے چھجا تھا جس پر سُرخ اور سفید پھولوں سے لدی ہوئی بیلیں جھول رہی تھیں۔

ڈرائیور نے کار درختوں تلے ایک سُنسان جگہ پر روکی۔ نیچے اُترا۔ بڑھ کر پچھلا دروازہ کھولا۔ قیصر مرزا کو مخاطب کیا۔ "باہر آجائیے۔"

قیصر مرزا خاموشی سے نیچے اُترا۔ وہ صدر دروازے کی جانب دیکھ رہا تھا۔ مگر ڈرائیور اس طرف نہ گیا۔ قیصر مرزا کو حیرت بھی ہوئی، لیکن چُپ رہا۔ ڈرائیور آگے بڑھا۔ قیصر مرزا اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ دونوں درختوں کے نیچے چل رہے تھے۔ خشک پتّے ان کے پیروں کے نیچے ہلکی ہلکی آہٹ پیدا کر رہے تھے۔

درختوں کے نیچے سے نکل کر دونوں ایک پگڈنڈی پر چلنے لگے۔ پگڈنڈی سیدھی عمارت تک جاتی تھی۔ پگڈنڈی طے کر کے دونوں مُڑے اور عمارت کے ساتھ ساتھ آگے بڑھے۔ نکڑ پر پہنچ کر وہ ایک بار پھر مُڑے اور عمارت کے پچھواڑے پہنچ گئے۔ سامنے کھُلا میدان تھا۔ میدان کے آگے درختوں کے جھنڈ تھے۔ کہیں کہیں خود رَو گھنی جھاڑیاں تھیں۔ اُونچی اُونچی

گھاس تھی۔ گھاس کے درمیان قدرتی تالاب تھا، جس میں ابھی تک بارش کا پانی بھرا تھا۔ تالاب کی سمت سے مینڈکوں کے زور زور سے ٹرّانے اور جھینگروں کے بولنے کی آوازیں رات کی گہری خاموشی میں اُبھر رہی تھیں۔ محل کی عمارت کے پچھواڑے روشنی بھی بہت کم تھی۔

ڈرائیور اطمینان سے چل رہا تھا۔ مگر قیصر مرزا کو سنبھل سنبھل کر قدم اٹھانا پڑتے۔ دھندلی دُھندلی روشنی میں دُو بار ٹھوکر کھا کر لڑکھڑایا اور فرش پر مُنہ کے بل گرنے سے بال بال بچا۔ لیکن اس نے ڈرائیور کو نہ ٹوکا۔ نہ روکا۔ وہ سخت شش و پنج میں مبتلا تھا اور یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ ڈرائیور کہاں جا رہا ہے اور کس کے پاس جا رہا ہے؟ لیکن ادھیڑ عمر ڈرائیور اس کی اُلجھن سے بے نیاز آگے، اور آگے بڑھتا گیا۔ آخر وہ ایک دروازے کے قریب جا کر ٹھہر گیا۔

دروازہ مختصر تھا اور بند تھا۔ ڈرائیور نے کھنکار کر ہولے ہولے دروازے پر دستک دی۔ ذرا دیر بعد دروازہ کھل گیا۔ دُھندلی دُھندلی روشنی میں ایک عورت دروازے پر نمودار ہوئی۔ روشنی اتنی کم تھی کہ قیصر مرزا اس کا چہرہ بھی نہ دیکھ سکا۔ وہ ڈرائیور کے عقب میں گم صُم کھڑا تھا۔ ڈرائیور نے عورت کو دیکھتے ہی مدھم لہجے میں مخاطب کیا۔ "صندلی!"

"تم نے بہت دیر لگا دی۔ میں نہ جانے کب سے تمہارا انتظار کر رہی تھی۔" صندلی نے شکوہ کیا۔ "لیکن اب تو ہَول آنے لگا تھا۔ کہاں لگا دی اتنی دیر؟"

"ارے تُو، تو ایسے ہی گھبرا جاتی ہے۔" ڈرائیور نے بے تکلفی سے کہا۔ "موٹر میں پنکچر ہو گیا تھا۔ سسُر نے پریشان کر دیا۔ نہ پوچھ موٹر کتنی تیز دوڑاتا ہوا آیا ہوں۔ مُلا پہنچ ہی گیا۔" اس نے قدرے تامّل کیا۔ پھر جھجکتے ہوئے دریافت کیا۔ "رانی صاحبہ نے تو نہیں پوچھا؟"

"سرکار دو بار پوچھ چکی ہیں۔" صندلی نے نظریں اُٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ "مہمان کو لے آئے؟"

"ہاں!" ڈرائیور نے مُڑ کر قیصر مرزا کی جانب دیکھا جو اندھیرے میں سائے کی مانند نظر آ رہا تھا۔ "یہ قیصر مرزا صاحب ہیں ان کو اندر لے جاؤ۔"

"اندر آیئے۔" صندلی نے ہاتھ اُٹھا کر قیصر مرزا کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔

قیصر مرزا جھجکتا ہوا آگے بڑھا۔ سیڑھیاں طے کر کے اوپر پہنچا اور اندر چلا گیا۔ مندلی نے دروازہ بند کر دیا۔

یہ ایک تنگ غلام گردش تھی۔ روشنی بھی اس میں برائے نام تھی۔ مندلی آگے بڑھی۔ قیصر مرزا اس کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ غلام گردش سے گزر کر دونوں وکٹورین طرز کے ایک ہال میں داخل ہوئے۔

مندلی نے ایک صوفے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "تشریف رکھیے میں رانی صاحبہ کو جا کر اطلاع کر دوں کہ آپ آ گئے ہیں۔"

☆

قیصر مرزا خاموشی سے صوفے پر بیٹھ گیا۔ صوفہ خوب چوڑا چکلا اور نرم تھا۔ مشرقی دیوار کے ساتھ لکڑی کا زینہ تھا جو نیم دائرہ بناتا ہوا اوپر کی منزل پر جاتا تھا۔ مندلی مڑی اور زینے کی سیڑھیاں طے کرتی ہوئی اوپر چلی گئی۔ قیصر مرزا کھویا کھویا سا بیٹھا تھا۔ وہ ہال کی فضا سے بہت مرعوب ہوا۔

قیصر مرزا ذرا دیر تک بت بنا بیٹھا رہا۔ جب ہال کے ماحول سے کسی قدر مانوس ہو گیا تو اس نے نظریں گھما پھرا کر دیکھا۔ ہال بہت وسیع تھا۔ جگہ، جگہ موٹے موٹے صوفے قرینے سے لگے تھے جن پر زربفت کے سنہری غلاف چڑھے تھے۔ ہال کی چھت بہت بلند تھی۔ دیواروں پر قدیم طرز کی بندوقیں اور قرابین آویزاں تھیں۔ بندوقوں کی نالیاں لمبی لمبی تھیں اور ہلالی شکل کی تلواریں بھی تھیں۔ ان کے دستے مختلف قسم کے تھے۔ تلواروں کے بیچ میں مضبوط ڈھالیں بھی تھیں۔

دو دیواروں پر شیر کی کھالیں آویزاں تھیں۔ شیر کا ایک سر بھی تھا۔ جو منہ کھولے بہت ہیبت ناک نظر آتا تھا۔ قریب ہی ایک بڑی تصویر تھی جس میں ارجمند سلطانہ شکاریوں کے لباس میں اپنے والد، راجہ یاور علی خان کے پہلو میں کھڑی تھیں۔ ان کا سر کھلا ہوا تھا اور بال صرف گردن تک تھے۔ مگر راجہ یاور علی خان کے سر پر چھجے دار سولا ہیٹ تھا!

مونچھیں گھنی تھیں اور اوپر چڑھی ہوئی تھیں۔ آنکھوں سے جلال ٹپکتا تھا اور چہرے سے تمکنت ہویدا تھی۔ وہ وجیہہ اور قد آور تھے۔ گردن اُٹھائے نہایت رعب داب سے کھڑے تھے۔

سامنے کی دیوار پر ایک قدآدم تصویر تھی۔ اس تصویر میں ارجمند سلطانہ ہاتھ میں بندوق سنبھالے شیر کی لاش پر ایک پیر ٹکائے شان سے نظریں بلند کئے کھڑی تھیں۔ شکاری لباس کے ساتھ ساتھ اس تصویر میں ان کے سر پر بھی ہیٹ تھا۔ قریب ہی اتنی ہی بڑی دوسری تصویر تھی، جس میں راجہ یاور علی خان بھی ایک مردہ شیر کی پیٹھ پر ایک پیر ٹکائے ہوئے کھڑے تھے۔

دیواروں پر چند تصاویر ایسی بھی تھیں، جن میں راجہ یاور علی خان انگریز افسروں کے ہمراہ نظر آتے تھے۔ کہیں کھڑے ہوئے کہیں کرسی پر بیٹھے ہوئے ایک تصویر میں ارجمند سلطانہ بھی انگریز افسروں کے ساتھ کھڑی تھیں۔ یہ تصویر ان کی نوجوانی کی نہ تھی۔ مگر بوڑھی بھی نظر نہ آتی تھیں۔ اس تصویر میں راجہ یاور علی خان بھی موجود نہ تھے۔ یہ تصویر غالباً ان کے انتقال کے بعد کے زمانے کی تھی۔

ہال میں سُرخ ایرانی قالین کا فرش تھا۔ دروازوں اور دریچوں پر بھی سُرخ مخمل کے پردے پڑے تھے۔ قیصر مرزا ایک ایک تصویر غور سے دیکھ رہا تھا۔ لیکن جہاں بیٹھا تھا، وہیں بیٹھا رہا۔ اشتیاق کے باوجود اُٹھ کر کسی تصویر کے قریب نہ گیا۔ اسے صندلی کی واپسی کا بے چینی سے انتظار تھا اور وہ کسی بھی لمحے زینے پر نمودار ہوسکتی تھی۔ اس کی نگاہیں بار، بار زینے کی جانب اٹھ جاتیں۔ چھت کی بلندی سے ایک خاصا بڑا اور نفیس بلوری جھاڑ لٹک رہا تھا۔ ہال کی روشنیوں سے جھاڑ جگ مگ جگ مگ کر رہا تھا۔ قیصر مرزا نے ہال میں داخل ہوتے وقت سب سے پہلے جھاڑ ہی دیکھا تھا اور اس کی خوبصورتی سے متاثر بھی ہوا تھا۔ مگر اس نے دوبارہ سر اُٹھا کر اس جانب نہ دیکھا۔ اسے جھاڑ سے زیادہ ارجمند سلطانہ کی تصاویر سے دلچسپی تھی۔

وہ ارجمند سلطانہ کی ایک تصویر کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا کہ اسی اثناء میں قدموں کی آہٹ اُبھری۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ صندلی زینے کی بلندی پر کھڑی تھی۔ وہ دم بھر کے

لئے ٹھٹکی اور پھر سیڑھیوں سے نیچے اُترنے لگی۔ قیصر مرزا سنبھل کر بیٹھ گیا۔ صندلی اس کے قریب آگئی۔ قیصر مرزا نے پہلی بار اُسے نظر بھر کر دیکھا۔ آنکھیں روشن اور بڑی بڑی تھیں۔ جن سے شوخی ٹپکتی تھی۔ چہرے کے نقش و نگار تیکھے اور دل کش تھے۔ ہونٹوں پر ہلکا ہلکا تبسم تھا۔ وہ مشرُوع کا خوب گھیر دار لہنگا پہنے ہوئے تھی۔ لہنگے کے نچلے حصے میں دو بالشت چوڑی گرنٹ کی سرخ گوٹ لگی تھی۔ چولی بھی سُرخ تھی اور اتنی چست اور کسی ہوئی تھی کہ اس کی جوانی اُبلتی ہوئی معلوم ہوتی تھی چولی اتنی اونچی تھی کہ اس کی پتلی کمر کی اجلی اجلی جلد صاف نظر آتی تھی جسے چھپانے کے لئے وہ اپنی چُنری کے ایک آنچل کو کندھے پر ڈال لیتی اور وہ بار بار ڈھلک جاتا۔ وہ سرو قامت اور طرح دار لڑکی تھی۔ اس کے ہر انداز میں شوخی تھی۔ الھڑپن تھا۔

قیصر مرزا نے صندلی سے نگاہیں ملتے ہی گردن جھکالی۔ صندلی نے شگفتہ لہجے میں مطلع کیا۔ "رانی صاحبہ آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔ ان کو آپ کے آنے کی خبر مل چکی ہے۔"

"کیا فرمایا انھوں نے؟" قیصر مرزا نے دریافت کیا۔

صندلی نے اس کا سوال نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "میرے ساتھ آیئے۔"

قیصر مرزا اُٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ صندلی آگے بڑھی۔ وہ خاموشی سے اس کے ہمراہ چلنے لگا۔ اس کی بے قراری بڑھ گئی تھی۔ سانس رک، رک کر چل رہی تھی۔ قدم اٹھاتا تو بھاری، بھاری معلوم ہوتے۔ صندلی دائیں ہاتھ کے ایک دروازے کے قریب پہنچ کر ٹھہر گئی۔

وہ اتنی تیزی سے بڑھ کر دروازے تک پہنچی کہ قیصر مرزا کئی قدم پیچھے رہ گیا۔ صندلی چُپ چاپ کھڑی اس کا انتظار کرتی رہی۔ جب وہ نزدیک پہنچا تو صندلی نے آہستہ سے کمرے کا دروازہ کھولا اور اندر چلی گئی۔ قیصر مرزا بھی کمرے میں داخل ہوگیا لیکن کمرہ خالی تھا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ قیصر مرزا کمرے میں گم صُم کھڑا تھا کہ خاموشی میں صندلی کی آواز اُبھری۔ "آپ یہاں بیٹھیں میں جلد ہی واپس آنے کی کوشش کروں گی۔"

قیصر مرزا نے آہستہ سے کہا۔ "اچھا۔"

مندلی کمرے سے باہر چلی گئی۔ اس نے باہر جاتے ہوئے دروازہ بھی بند کردیا۔ کمرے میں صرف ایک صوفہ سیٹ پڑا تھا۔ صوفوں پر نارنجی مخمل کے غلاف چڑھے تھے۔ پردے بھی نارنجی تھے۔ ہلکے اور ریشمی تھے۔ کمرہ زیادہ بڑا نہ تھا۔ فرش پر خوش رنگ قالین بچھا تھا۔ کمرے میں صرف ایک لیمپ روشن تھا جس کے شیڈ سے ہلکی ہلکی روشنی پھوٹ رہی تھی۔ دیواروں پر دلکش اور نظر نواز لینڈ اسکیپ کی پینٹنگز آویزاں تھیں۔

ایک طرف دیوار میں آتش دان تھا جس کے ساتھ آگ کریدنے کا آہنی پوکر رکھا تھا۔ موسم سرما میں آتش دان گرم اور روشن رہتا ہوگا۔ مگر اب خالی تھا۔ نہ دہکتے انگارے تھے نہ شعلے بھڑکتے تھے۔ آتش دان کی چوڑی کارنس پر ارجمند سلطانہ کی نوجوانی کی ایک تصویر اس طرح رکھی تھی کہ کمرے میں داخل ہوتے ہی اس پر نظر پڑتی تھی۔

قیصر مرزا چند لمحے خاموش کھڑا رہا۔ پھر اس نے مڑ کر اس دروازے کی جانب دیکھا، جس سے گزر کر مندلی باہر گئی تھی۔ قیصر مرزا آگے بڑھا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا آتش دان کے نزدیک پہنچ گیا۔

اس نے نگاہیں اٹھا کر ارجمند سلطانہ کی تصویر کی طرف دیکھا۔ ان کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔ آنکھوں میں دوشیزگی کی معصومیت تھی۔ سیاہ بالوں کی ایک خم دار لٹ بکھر کر ایک دل نواز زاویئے سے ان کے دائیں رخسار پر لٹک رہی تھی۔ ان کے چہرے پر تازہ پھولوں کی سی شگفتگی تھی۔ وہ خوابیدہ نظروں سے ارجمند سلطانہ کی تصویر تکنے لگا۔ کئی منٹ اسی محویت کے عالم میں گزر گئے۔ مندلی ابھی تک واپس نہ آئی تھی۔

قیصر مرزا نے تصویر سے نگاہیں ہٹا کر ایک بار پھر کمرے کا جائزہ لیا۔ لیمپ کی ہلکی ہلکی روشنی میں اس نے دیکھا۔ شمالی دیوار میں ایک اور دروازہ تھا۔ یہ دروازہ بھی بند تھا۔ اور پردہ ایک طرف ذرا سا سرکا ہوا تھا۔ معاً قیصر مرزا کے ذہن میں یہ خیال اُبھرا۔ کہیں ارجمند سلطانہ اسی کمرے کے اندر نہ بیٹھی ہوں اور اس کا انتظار کر رہی ہوں۔ وہ چند لمحے دروازے کو تکتا رہا۔ پھر ہولے ہولے قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھا اور دروازے کے روبرو جا کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

اس نے ہاتھ بڑھا کر دروازے کو آہستہ سے دھکا دیا۔ ہاتھ رکھتے ہی دروازہ چرچراتا ہوا کھل گیا۔ قیصر مرزا جھجکتا ہوا اندر داخل ہوگیا۔

کمرے میں گھُپ اندھیرا تھا۔ مگر دروازہ کھلنے سے دوسرے کمرے کی روشنی اندر آئی تو اندھیرا کم ہوگیا۔ قیصر مرزا دہلیز کے پاس ٹھٹھک کر رہ گیا۔ کمرے کی گہری خاموشی میں ہلکی سی سرسراہٹ اُبھری۔ قیصر مرزا نے چونک کر دیکھا۔ دُھندلی دُھندلی روشنی میں ایک سایہ لہرایا اور آن کی آن میں نظروں سے اوجھل ہوگیا۔

☆

قیصر مرزا اپنی جگہ پر دم بخود کھڑا رہا۔ سامنے بھی ایک دروازہ تھا۔ اس کا پٹ کھلا تھا۔ دروازے کے دوسری جانب روشنی تھی۔ چند لمحے وہ حیران و پریشان کھڑا اس دروازے کو تکتا رہا۔ پھر ہمت کر کے آگے بڑھا۔ دروازے کے قریب پہنچا۔ گردن بڑھا کر دروازے سے دیکھا۔ یہ ایک نیم کشادہ گلیارا تھا اور بالکل سُنسان تھا۔ گلیارے میں ایک دیوار گیری روشن تھی۔ اس کی ہلکی، ہلکی روشنی میں اس نے اِدھر اُدھر نظریں گھما پھرا کر دیکھا۔ لیکن کوئی نظر نہ آیا۔ اس نے دروازے کا ایک پٹ جس طرح کھلا تھا کھلا رہنے دیا۔ مڑا اور دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ البتہ دروازہ اس نے بند کر دیا اور اپنی جگہ پر جا کر بیٹھ گیا۔

وہ حیرت زدہ بیٹھا ہوا غور کر رہا تھا کہ برابر کے کمرے میں کون تھا جو اندھیرے میں موجود تھا اور اس کے پہنچتے ہی چھلاوے کی مانند اوجھل ہوگیا۔ اسی اثناء میں دروازہ کھلا۔ مگر وہ صندلی نہ تھی ایک ادھیڑ خادمہ تھی۔ وہ نظریں جھکائے ہوئے اندر داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں طشت تھا۔ طشت پر شیشے کا گلاس رکھا تھا۔ عورت نے آگے بڑھ کر طشت آتش دان کی کارنس پر رکھ دیا۔ ایک چھوٹی میز اٹھا کر قیصر مرزا کے سامنے رکھ دی۔ واپس آتش دان کے نزدیک گئی۔ طشت اٹھایا اور جھک کر خاموشی سے میز پر رکھ دیا۔

"کھانساماں نے یہ شربت پینے کے لئے بھیجا ہے۔" خادمہ نے دیہاتی لہجے میں آہستہ سے کہا۔ وہ بھی لہنگا اور شلوکہ پہنے ہوئے تھی۔ لباس صاف ستھرا بھی تھا۔ مگر

وہ صندلی سے بالکل مختلف تھی۔ صندلی کے رویّے میں شوخی کے ساتھ ساتھ رکھ رکھاؤ اور سلیقہ تھا۔ لہجے میں شائستگی اور شگفتگی تھی۔

قیصر مرزا نے اس فرق کو محسوس کیا۔ خادمہ سے پوچھا۔ "صندلی کہاں ہے؟"

"ہم کا کھیر نا ہیں وُہ کدھر ہے۔ وہ کوئی ایک جگہ تو ٹکتی نا ہیں۔" ادھیڑ عمر خادمہ نے منہ بگاڑ کر بتایا۔" سرکار، سربت پیئیں۔ ہم را کہا مانیں تو اس کا انتجار نا ہیں کریں۔ وہ کمت کچھ ہے کرت کچھ ہے۔"

قیصر مرزا نے محسوس کیا، وہ صندلی سے خوش نہیں تھی۔ مگر اس نے کسی ردِّ عمل کا اظہار نہ کیا۔ خاموشی سے گلاس اُٹھا کر ہونٹوں سے لگایا۔ ایک گھونٹ بھرا۔ شربت دُودھ کا تھا۔ ٹھنڈا تھا اور خوش ذائقہ بھی تھا۔ اس میں زعفران کی مہک تھی۔ خوب گاڑھا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس میں دودھ کے ساتھ ساتھ بادام اور پستے گھوٹ کر حل کئے گئے تھے۔ قیصر مرزا کو پیاس بھی محسوس ہو رہی تھی وہ رُک رُک کر شربت کے گھونٹ بھرتا رہا۔ اور یہ محسوس کرتا رہا کہ زعفران کی مہک کے ساتھ ساتھ اس میں ایسی بہک بھی تھی جو اُس کے لئے قطعی نامانوس تھی۔ گلاس بڑا تھا اور لبالب بھرا ہوا تھا۔ وہ لیکن قیصر مرزا پورا گلاس چڑھا گیا۔

خادمہ ایک طرف ادب سے سر جھکائے کھڑی تھی۔ قیصر مرزا نے گلاس ختم کیا تو اس نے نگاہیں اٹھائیں۔ غور سے قیصر مرزا کے چہرے کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں تیز چمک تھی۔ مگر وہ بولی نہیں۔ خاموشی سے طشت اٹھایا اور کمرے سے چلی گئی۔

شربت پینے کے بعد قیصر مرزا کو مُنہ میں ہلکی سی تلخی معلوم ہوئی۔ گرمی کا بھی اچانک شدت سے احساس ہوا۔ پیشانی پر پسینے کی نمی بھی محسوس ہوئی۔ اس نے جیب سے رومال نکال کر پسینہ پونچھا اور اچکن کے بٹن بھی کھول دیئے۔ سر بھی کچھ بھاری بھاری ہو رہا تھا۔ مگر وہ خاموش بیٹھا صندلی کا انتظار کرتا رہا۔

صندلی جب دیر تک واپس نہ آئی تو وہ بے چین ہو کر کھڑا ہو گیا۔ عین اس وقت صندلی دروازہ کھول کر داخل ہوئی۔ قیصر مرزا نے شکوہ کیا۔" تم یہاں بٹھا کر کہاں چلی

گئی تھیں؟

"معاف کیجئے، مجھے کچھ دیر ہو گئی۔" صندلی نے معذرت کا اظہار کیا۔ "میں رانی صاحبہ کے پاس تھی۔"

"وہ یہاں تشریف لا رہی ہیں یا مجھے ان کے پاس جانا ہو گا؟"

"آپ نے اب تک کھانا بھی نہیں کھایا۔ بھوک لگ رہی ہو گی۔" صندلی نے مسکرا کر بات کا رُخ موڑ دیا۔ "آیئے پہلے کھانا کھا لیجئے۔"

قیصر مرزا انکار نہ کر سکا۔ اسے اب سخت بھوک لگ رہی تھی۔ دن میں بھی اس نے گھر پر بہت کم کھانا کھایا تھا۔ صندلی دروازے کی جانب بڑھی۔ قیصر مرزا اس کے ساتھ ساتھ چلا۔ دونوں کمرے سے باہر نکلے۔ اس دفعہ اسے مختلف گلیاروں اور غلام گردشوں سے گزرنا پڑا۔

طویل غلام گردشیں، اونچے، اونچے ستون، جھکی ہوئی خم دار محرابیں، جھروکوں کی جالیوں سے پھوٹتی ہوئی روشنی، دروازوں پر لہراتے ہوئے ریشمی پردے۔ پیروں کے نیچے نرم، نرم قالین کا فرش۔ راہ میں مؤدب کھڑے ہوئے صف بستہ خدام، پرچھائیوں کی مانند سبک رفتار سے اِدھر اُدھر چلتی ہوئی شوخ خادمائیں۔ اس جاہ و حشم کے نیچے قیصر مرزا دبا چلا گیا۔

وہ حیرت سے کبھی اِدھر دیکھتا، کبھی اُدھر۔ کبھی ٹھٹک جاتا۔ کبھی اس کے قدموں کی رفتار اس قدر تیز ہو جاتی کہ صندلی سے بھی آگے نکل جاتا۔ صندلی بڑے وقار سے گردن اٹھائے سنبھل، سنبھل کر آگے بڑھ رہی تھی۔ وہ ایک کھلے دروازے سے قیصر مرزا کے ہمراہ اندر داخل ہوئی۔ یہ کھانے کا کمرہ تھا۔ بیچ میں ایک لمبی میز تھی، جس پر پہلے سے کھانا چنا ہوا تھا۔ میز پر چاندی کے شمع دانوں میں لمبی، لمبی موم بتیاں روشن تھیں۔ صندلی نے بڑھ کر ایک کرسی کھسکائی اور قیصر مرزا سے اس پر بیٹھنے کے لئے کہا۔ "تشریف رکھیے۔" قیصر مرزا خاموشی سے کرسی پر بیٹھ گیا۔

صندلی نے کھانے کی ایک قاب اُٹھا کر قیصر مرزا کے سامنے پیش کی۔ اس میں گرم، گرم پلاؤ تھا۔ قاب سے کھانے کی تیز مہک اُٹھ رہی تھی۔ قیصر مرزا نے پلاؤ اپنی پلیٹ

میں ڈالا، مگر نوالہ نہ اٹھایا۔ صندلی نے نہایت ادب سے کہا۔ "سرکار! آپ کھانا کھائیں۔ میں رانی صاحبہ کے پاس جارہی ہوں۔"

"کیا رانی صاحبہ میرے ساتھ کھانا نہیں کھائیں گی؟" قیصر مرزا نے دریافت کیا۔

"جی نہیں" صندلی نے اسے مطلع کیا۔ "وہ یہاں نہیں آسکتیں۔ آپ کو اکیلے ہی کھانا کھانا ہوگا۔"

قیصر مرزا نے مزید استفسار نہ کیا۔ صندلی چلی گئی۔

قیصر مرزا کھانا کھانے لگا۔ میز پر قسم، قسم کے کھانے تھے خوش ذائقہ بھی تھے قیصر مرزا بھوکا بھی تھا مگر اس نے زیادہ نہ کھایا۔ البتہ پانی زیادہ پیا۔ پیاس بھوک سے بھی زیادہ شدت سے محسوس ہورہی تھی۔

وہ کھانے سے فارغ ہی ہوا تھا کہ صندلی پہنچ گئی۔ اس نے ایک بار پھر قیصر مرزا کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ اس دفعہ صندلی نے طویل راستہ اختیار نہ کیا۔ ایک غلام گردش سے گزر کر ہال میں پہنچ گئی۔ زینے کے قریب پہنچ کر قیصر مرزا ٹھٹکا۔ اس نے صندلی سے پوچھا۔ "تم مجھے رانی صاحبہ کے پاس اوپر نہیں لے جاؤ گی؟" اس نے ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔

"جی، وہ اوپر کی منزل سے نیچے تشریف لاچکی ہیں۔"

"میں نے تو ان کو دیکھا نہیں۔"

"آپ اس وقت کھانا کھارہے تھے۔"

قیصر مرزا نے مزید بات چیت نہ کی۔ صندلی آگے بڑھی اور ایک دروازے کے سامنے جاکر کھڑی ہوگئی۔

صندلی نے آہستہ سے دروازہ کھولا۔ گردن بڑھا کر اندر دیکھا۔ دروازے کی چوکھٹ پر لمحے بھر کے لئے ٹھٹکی، پھر کمرے میں داخل ہوگئی۔ قیصر مرزا کے دل کی دھڑکن ایک بار پھر تیز ہوگئی۔ اس نے جلدی، جلدی اچکن کے بٹن لگائے ٹوپی درست کی اور ڈگمگاتے قدموں سے اندر داخل ہوا۔

مگر یہ کمرہ بھی خالی تھا۔ دیوار گیریوں کے نیلے نیلے شیشوں سے ہلکی ہلکی روشنی اس طرح جھلک رہی تھی گویا چاندنی چھٹکی ہو۔ کمرے میں پھولوں کی خوشبو رچی ہوئی تھی۔ بیچ میں خاصی بڑی میز تھی جس پر چینی کا خوبصورت گل دان رکھا تھا۔ گُل دان میں نرگس کے پھولوں کو بڑے سلیقے سے آراستہ کیا گیا تھا۔ کمرے میں دو کھڑکیاں تھیں جو باغ کے رُخ پر کھُلتی تھیں۔ صندلی نے جلدی جلدی کھڑکیاں کھول دیں۔ نیلگوں روشنی میں صندلی کا چہرہ جنوبی ہند کے کسی قدیم مندر کی دیو داسی کی مانند دل کش اور پاکیزہ نظر آرہا تھا۔ اس نے مسکرا کر قیصر مرزا کی جانب دیکھا۔ نرم لہجے میں گویا ہوئی۔ "ارے آپ وہاں کیوں کھڑے ہیں؟" اس کی آنکھوں سے حیرت آشکارا تھی۔

قیصر مرزا نے کچھ نہ کہا۔ اپنی جگہ پر خاموش کھڑا رہا۔

دروازے کے مقابل تین، سوا تین فٹ اُونچی شہ نشین تھی۔ اس پر غالیچہ بچھا تھا۔ دو گاؤ تکیے رکھے تھے، جن پر فیروزی مخمل کے غلاف چڑھے تھے۔ شہ نشین کے چاروں طرف گنگا جمنی جالیوں کا سوا ہاتھ اونچا کٹہرا تھا جس پر جگہ جگہ بیلے اور گلاب کے گجرے جھول رہے تھے۔ شہ نشین کے اُوپر جانے کے لئے تین سیڑھیاں تھیں، جن کے سامنے کٹہرا کھُلا ہُوا تھا۔

صندلی نے شہ نشین کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "آپ یہاں تشریف رکھیں اور رانی صاحبہ کا انتظار کریں۔"

قیصر مرزا ہنوز خاموش تھا۔ وہ آگے بڑھا اور سنبھل سنبھل کر سیڑھیاں طے کرتا ہُوا اُوپر پہنچ گیا۔ شہ نشین کے کٹہرے میں داخل ہونے سے قبل اس نے نچلی سیڑھی کے ایک گوشے میں پیروں سے جُوتے اُتار دیئے تھے۔ گاؤ تکیہ کا سہارا لے کر مسند پر بیٹھ گیا۔ صندلی، شہ نشین سے نیچے ہی کھڑی رہی۔ قیصر مرزا کا چہرہ پسینے سے بھیگا ہُوا تھا۔ کھڑکی سے تازہ ہَوا کے جھونکے اندر آئے تو فرحت محسوس ہوئی۔ اس نے صندلی کی جانب دیکھا۔ آہستہ سے گویا ہُوا۔ "تم نے یہ بہت اچھا کیا کہ کھڑکیاں کھول دیں۔"

"آج گرمی بھی کچھ زیادہ ہے۔" صندلی نے ادب سے کہا۔

"گرمی تو کچھ ایسی زیادہ نہیں مگر جب سے شربت پیا ہے۔ نہ جانے کیوں گرمی

شدت سے محسوس ہونے لگی ہے۔ بار بار چہرے پر پسینہ آرہا ہے۔" اس نے جیب سے رُومال نکال کر پسینہ خشک کیا۔" اس وقت سے کچھ سر بھی بھاری سا ہوگیا ہے۔ خدا معلوم کیسا شربت تھا۔"

"اے لیجیے، شربت میں کیا تھا۔" صندلی نے اُسے مشتبہ نظروں سے دیکھا۔" میں نے اپنے سامنے کھڑے ہوکر تیار کرایا تھا۔ آپ کو خواہ مخواہ وہم ہوگیا۔"

"شاید بہت مقوّی تھا۔ اس میں بادام کچھ زیادہ ہی گھوٹ کر ملا دیے گئے تھے۔" قیصر مرزا نے اُلجھنے کی کوشش نہ کی۔

"صرف بادام نہیں، چاروں مغز بھی تھے۔" صندلی نے وضاحت کی۔

"ایسا شربت صبح تو پیا جا سکتا ہے مگر رات کو نہیں۔" قیصر مرزا نے کہا۔" تب ہی تو اس قدر گرمی محسوس ہو رہی ہے۔" وہ مُسکرایا۔ پھر بات کا رخ موڑتے ہوئے گویا ہوا۔ "رانی صاحبہ اس وقت کہاں ہیں؟"

"میں اُن کے پاس جا رہی ہوں۔ آپ یہیں ٹھیریں۔" صندلی مڑی اور دروازے کی جانب بڑھی۔ قیصر مرزا نے اسے ٹوکا۔" دیکھو زیادہ انتظار نہ کرانا۔"

صندلی نے کچھ نہ کہا۔ چپ چاپ کمرے سے باہر چلی گئی۔ قیصر مرزا کی نگاہوں نے اس کا تعاقب کیا۔ یہاں تک کہ وہ نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ قیصر مرزا مسند پر خاموش بیٹھا تھا۔ آنکھوں میں خمار تھا۔ ذہن پر سائے منڈلا رہے تھے۔ کمرے کی نیلگوں فضا اور گہری ہوگئی تھی۔ پھولوں کی مہک تیز ہوگئی تھی۔ قیصر مرزا بے چین ہوکر بار بار پہلو بدلتا۔ اس کی وارفتگی، رفتہ رفتہ شوریدہ سری میں ڈھلنے لگی۔

صندلی واپس نہ آئی تھی۔ انتظار اس کے لیے جاں گُسل بنتا جا رہا تھا۔ وہ بے قرار ہوکر کھڑا ہوگیا۔ نظریں اُٹھائے چند لمحے تک دروازے کو تکتا رہا۔ پھر آگے بڑھا۔ شہ نشین سے نیچے اُترنے لگا تو اُس نے محسوس کیا کہ قدم ڈگمگا رہے تھے۔ اُس نے جوتے پہنے، نیچے پہنچا۔ ہوا کا ایک جھونکا آیا۔ اس کے پیر لڑکھڑائے۔ وہ گرتے گرتے بچا۔ وہ سنبھل سنبھل کر قدم اُٹھاتا دروازے کے قریب پہنچا۔ اُسے کھولا اور باہر

نکل گیا۔ چند قدم کا فاصلہ طے کر کے وہ ایک کشادہ غلام گردش میں داخل ہوا۔ غلام گردش سنسان تھی۔ نہ کوئی آہٹ تھی، نہ آواز۔ چھت سے پیتل کی ایک مخروطی قندیل لٹک رہی تھی۔ اس کی ہلکی ہلکی روشنی غلام گردش میں پھیلی ہوئی تھی۔ غلام گردش طے کر کے وہ بائیں ہاتھ کو مڑا تو سامنے ایک کمرہ تھا، جس کے دروازے پر ایک مدوّر تابدان تھا۔ تابدان کے شیشوں سے گہری سرخ روشنی پھوٹ رہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا دروازے کے سامنے پہنچا۔ مگر یہ کمرہ خلافِ توقع خالی نہ تھا۔ کمرے کے اندر بہت دھیمے لہجے میں بولنے کی آوازیں رک رک کر ابھر رہی تھیں۔

قیصر مرزا نے تجسس انگیز نگاہوں سے دروازے کو دیکھا۔ پھر پلٹ کر پیچھے نگاہیں دوڑائیں۔ آس پاس کوئی نہ تھا۔ وہ دروازے کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ اس نے ایک کان دروازے سے لگا دیا اور سن گن لینے کی کوشش کی۔ مگر کمرے میں اب خاموشی چھا گئی تھی۔ قیصر مرزا دروازے سے لگا کھڑا رہا۔ اس کے ذہن میں ہلچل برپا تھی۔ اس نے دارفتہ ہو کر دروازہ کھولنا چاہا۔ ہاتھ آگے بڑھایا لیکن اس کا اٹھا ہوا ہاتھ خود بخود نیچے لٹک گیا۔ عین اس وقت کمرے کے اندر بولنے کی آواز ابھری۔ قیصر مرزا نے اسے پہچان لیا۔ وہ ارجمند سلطانہ کی آواز تھی۔ آواز اس قدر مدھم تھی کہ وہ بالکل نہ سمجھ سکا کہ وہ کیا کہہ رہی تھیں۔

قیصر مرزا دم بخود کھڑا تھا۔ تابدان سے پھوٹتی ہوئی روشنی میں اس کا چہرہ انگارے کی مانند دہک رہا تھا۔ وہ رک رک کر سانس بھر رہا تھا اور گومگو کے عالم میں سوچ رہا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیئے؟

(۷)

کمرے میں ارجمند سلطانہ قدِ آدم آئینے کے روبرو بیٹھی تھیں۔ ہر طرف سرخ روشنی پھیلی ہوئی تھی اور اس سرخ روشنی میں ان کا چہرہ بھی سرخ بھبوکا ہو گیا تھا۔ ان کی آنکھوں میں گہرا کاجل تھا۔ کان میں سرخ آویزے جگ مگ، جگ مگ کر رہے تھے۔ ان کا

لباس بھی ہلکا ارغوانی تھا۔

ان کے پہلو میں دائیں ہاتھ پر ایک گول میز تھی جس پر چوڑے منہ کا نہایت نازک گوبلٹ رکھا تھا جو شیمپین سے لبریز تھا۔ گوبلٹ کے قریب شیشے کی ایش ٹرے تھی۔ چاندی کا نقشین سگریٹ کیس تھا اور ماچس بھی موجود تھی۔ انھوں نے گوبلٹ اُٹھا کر شیمپین کا گھونٹ بھرا۔ گوبلٹ میز پر رکھا۔ سگریٹ کیس کھول کر سگریٹ نکالی۔ اسے سُلگا کر کش لگایا۔ سگریٹ سے اٹھتے ہوئے مرغولوں سے ان کا چہرہ دُھواں دھواں ہو گیا۔ صندلی ان کی پشت پر خاموش کھڑی تھی۔ اُس کی نظریں جُھکی ہوئی تھیں۔ کمرے میں تیز خوشبو پھیلی ہوئی تھی اور خاموشی بہت گہری تھی۔ اچانک دروازے پر آہٹ ہوئی۔ ارجمند سُلطانہ نے صندلی کی جانب دیکھے بغیر سرگوشی کے انداز میں آہستہ سے کہا۔ "صندلی!"

"جی سرکار!" صندلی نے بھی دھیمے لہجے میں جُھک کر جواب دیا۔

"وہی معلوم ہوتا ہے۔" ارجمند سُلطانہ نے قیاس آرائی کی۔

"سرکار کا خیال دُرست ہے۔" صندلی نے ارجمند سُلطانہ کی تائید کی۔ "وہی ہو سکتے ہیں۔"

ارجمند سلطانہ خاموش بیٹھی رہیں اور آہستہ آہستہ سگریٹ کے کش لگاتی رہیں۔ کمرے میں ایک بار پھر گہرا سکوت پھیل گیا۔ دروازے پر رُک رُک کر ہولے ہولے آہٹ اُبھرتی رہی۔ "تم اس کو کسی دُوسرے کمرے میں لے جاؤ۔" ارجمند سُلطانہ نے اس بار بھی پلٹ کر نہ دیکھا۔ اُن کی پشت ہنوز اس کی جانب تھی۔ وہ آئینے میں اپنا عکس دیکھ رہی تھیں۔ اُس سے کہو کہ کچھ دیر اور انتظار کرے۔"

"کوئی اور حکم سرکار؟"

"نہیں۔" ارجمند سُلطانہ نے مختصر جواب دیا۔

صندلی آگے بڑھی تو ارجمند سُلطانہ نے اُسے ٹوکا۔ "سُنو۔" صندلی جہاں تھی وہیں رُک گئی۔ ارجمند سلطانہ دبی زبان سے اسے ہدایت دے رہی تھیں۔ "آیندہ یہ خیال رکھنا کہ نیئر مرزا اس کمرے کے دروازے پر نہ پہنچے۔"

"بہت بہتر سرکار۔" صندلی نے دروازہ کھولا اور کمرے سے باہر چلی گئی۔

☆

قیصر مرزا دروازے کے سامنے کھڑا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ صندلی لمحہ بھر کے لیے ٹھٹکی۔ پھر آگے بڑھتے ہوئے قیصر مرزا کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ مگر وہ اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ وہیں کھڑا رہا۔ صندلی نے اصرار کیا۔ "آپ میرے ساتھ تو آیئے۔"

"کیا رانی صاحبہ اس کمرے میں ہیں؟"

"آپ میرے ساتھ آئیں۔" صندلی نے اس کا سوال نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔ "یہاں کھڑے ہونا مناسب نہیں۔" وہ بچوں کی طرح اس کو دلاسا دینے لگی۔ "بس تھوڑی دیر اور۔ اب آپ کو زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔"

صندلی آگے بڑھی۔ قیصر مرزا رُوٹھا ہُوا سا اس کے پیچھے پیچھے چلا۔ دونوں غلام گردش سے گزر کر، ایک بار پھر اسی کمرے کے دروازے پر پہنچے، جس میں کچھ دیر پہلے قیصر مرزا بیٹھا تھا۔ دروازہ کھُلا تھا۔ دونوں اندر داخل ہو گئے۔ صندلی نے شہ نشین کی سمت ہاتھ اُٹھا کر قیصر مرزا سے کہا۔ "آپ یہاں اطمینان سے بیٹھیں۔ رانی صاحبہ آیا ہی چاہتی ہیں۔"

"اگر وہ یہاں نہ آئیں تو مَیں خود ان کے کمرے میں پہنچ جاؤں گا۔"

"ایسا ہرگز نہ کیجئے گا۔ رانی صاحبہ آپ کی اس حرکت کو بالکل پسند نہ فرمائیں گی۔" اُس نے قیصر مرزا کو تنبیہہ کی۔

قیصر مرزا اس کی تنبیہہ سے مرعوب بھی ہو گیا۔ وہ خاموشی سے آگے بڑھا اور سیڑھیاں چڑھ کر ایک بار پھر شہ نشین پر پہنچا۔ "یہاں بیٹھ کر مجھے اُلجھن معلوم ہوتی ہے۔" اُس نے گاؤ تکیے کے سہارے مسند پر بیٹھتے ہوئے شکوہ کیا۔

"مَیں نے عرض کیا نا، کہ اب آپ کو زیادہ انتظار نہیں کرنا ہو گا۔"

قیصر مرزا کچھ نہ بولا۔ صندلی بھی خاموش رہی۔ مگر وہ کمرے میں زیادہ دیر نہ ٹھہری۔ اس نے قیصر مرزا کو اطمینان دلایا اور جلد ہی واپس آنے کا وعدہ کر کے باہر چلی گئی۔

قیصر مرزا بے قراری کے عالم میں پہلو بدلنے لگا۔ اس کی نگاہیں بار بار دروازے کی جانب اُٹھ جاتیں۔ آخر دروازے کا ایک پٹ کھُلا۔ صندلی اندر داخل ہوئی۔ وعدے کے مطابق وہ جلد ہی واپس آگئی۔

اس کے ہاتھ میں ایک خوش نما طشت دبا تھا۔ اُسے سنبھالے ہوئے وہ شہ نشین پر پہنچی اور طشت قیصر مرزا کے رُو برُو رکھ دیا۔ قیصر مرزا نے طشت میں رکھی ہوئی چینی کی خوبصورت پیالی کی طرف اشارہ کر کے دریافت کیا۔ "اس پیالی میں کیا ہے؟" اس نے بے زاری سے مُنہ بگاڑا۔ "مَیں چائے نہیں پیتا۔"

"یہ چائے نہیں، کافی ہے۔" صندلی نے بتایا۔ "کافی پی لیجئے۔ اس کے پینے سے آپ کو سکون ملے گا۔"

قیصر مرزا کو اب تک کافی پینے کا اتفاق نہ ہُوا تھا۔ اس نے انکار کرنے کے انداز میں آہستہ آہستہ گردن ہلائی۔ "نہیں، مَیں اسے ہرگز نہیں پیوں گا۔"

صندلی نے اس کے انکار پر توجہ نہ دی۔ پیالی اُٹھائی اور قیصر مرزا کی جانب بڑھا کر نرم لہجے میں بولی۔ "اسے پی کر تو دیکھئے۔" وہ مسکرانے لگی اور پیالی قیصر مرزا کے ہاتھ میں تھما دی۔ "رانی صاحبہ بھی رات کو کھانے کے بعد ایک پیالی کافی ضرور پیتی ہیں۔ مہمانوں کو بھی اصرار کر کے پلاتی ہیں۔ میں انھی کی ہدایت پر آپ کے لئے کافی لائی ہوں۔" اس نے آنکھوں کو گردش دے کر ایک خاص ادا سے قیصر مرزا کو دیکھا۔ "دیکھئے اب انکار نہ کیجئے گا۔"

وہ مزید انکار نہ کر سکا۔ اُس نے کافی کا ایک گھونٹ بھرا۔ مُنہ بگاڑ کر بولا۔ "یہ تو کڑوی ہے۔"

"زیادہ کڑوی معلوم ہو رہی ہے، تو مَیں اس میں شکر اور دُودھ اور ملائے دیتی ہوں۔" صندلی نے پیالی طشت میں رکھی اور شکر دانی اُٹھا کر پیالی میں شکر کے ساتھ دُودھ کی مقدار بھی بڑھا دی۔ "اب آپ کو تلخی محسُوس نہ ہوگی۔" وہ کھُل کر مُسکرائی۔ "ویسے کافی میں تلخی تو ہوتی ہی ہے مگر اسے پینے کے بعد آپ تازگی محسوس کریں گے۔ یہ جو آپ سر

بوجھل ہونے کی شکایت کر رہے ہیں، بالکل رفع ہو جائے گی۔"
صندلی کے لہجے کی شگفتگی اور مسلسل اصرار کے سامنے قیصر مرزا مزید انکار نہ کر سکا۔ کافی کا ذائقہ بھی اب تلخی کم ہو جانے کے باعث خاصا بدل گیا تھا۔ اس نے کافی ختم کی اور خالی پیالی طشت میں رکھ دی۔ صندلی نے مسکرا کر طشت، قیصر مرزا کے سامنے سے ہٹا کر ایک طرف رکھ دیا۔ خود بھی ذرا ہٹ کر بیٹھ گئی۔ قیصر مرزا نے کوئی تبصرہ نہ کیا۔ گاؤ تکیے سے لگا گم صم بیٹھا رہا۔ کمرے میں خاموشی چھائی تھی۔ فضا میں تازہ پھولوں کی مہک رچی ہوئی تھی۔ گزرتی رات کے ساتھ ساتھ خنکی اور خوشبو میں برابر اضافہ ہو رہا تھا۔ باہر گہرا سناٹا تھا۔ حیدر گڑھ کی بستی سو رہی تھی اور رات جاگ رہی تھی۔ قیصر مرزا بھی جاگ رہا تھا۔ صندلی بھی جاگ رہی تھی۔ مگر قیصر مرزا دیر تک سکون سے نہ بیٹھ سکا۔ اس نے بے چینی محسوس کی۔ ہوا کا ایک بھرا ہوا جھونکا آیا اور اس کے ساتھ ہی قیصر مرزا جھوم کر رہ گیا۔ صندلی نے گردن کو خم دے کر اس کی جانب دیکھا اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ قیصر مرزا نے اُسے ٹوکا۔ "کہاں چلیں؟"

"رانی صاحبہ کے پاس۔"

"میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔" قیصر مرزا اُٹھ کر کھڑا ہوا۔ "میں اب مزید انتظار نہیں کر سکتا۔"

"بس تھوڑی دیر اور انتظار کر لیں۔" صندلی نے نرمی سے اُسے سمجھایا۔

"نہیں اب میں تمہاری کوئی بات نہیں سنوں گا۔" قیصر مرزا جھنجلا کر بولا۔ "دیکھو تم مجھے زیادہ پریشان نہ کرو۔" وہ سیدھا کھڑا نہ رہ سکا۔ اس کے پیر ڈگمگا رہے تھے اور جسم ہولے ہولے جھول رہا تھا۔ "مجھ سے اب انتظار نہیں کیا جا سکتا۔" اس کی آواز اونچی ہو گئی۔ "سُن رہی ہو تم؟"

"سُن رہی ہوں۔ بالکل سُن رہی ہوں لیکن آپ آہستہ بولیں۔" صندلی نے اسے خبردار کیا۔ "رات کے سناٹے میں آپ کی آواز دُور تک سنی جا سکتی ہے۔"

"مجھے کسی کی پروا نہیں۔"

"مگر رانی صاحبہ کا تو آپ کو خیال کرنا چاہیے۔" صندلی نے اُسے رام کرنے کی کوشش

کی۔" یہ تو سوچیے، وہ آپ کے بارے میں کیا کہیں گی۔"

"تم چاہتی کیا ہو؟" قیصر مرزا نے خمار آلود نظروں سے گھور کر صندلی کو دیکھا۔

"میں چاہتی ہوں کہ آپ ذرا دیر اور انتظار کریں۔" صندلی نے نرم اور شگفتہ لہجے میں کہا۔" میں رانی صاحبہ کے پاس جا رہی ہوں۔ جب تک میں واپس نہ آؤں۔ آپ اسی کمرے میں ٹھہریں۔"

"مگر تم جلدی واپس آجانا۔" وہ لڑکھڑا کر دھم سے مسند پر بیٹھ گیا۔ صندلی نے طشت اُٹھایا اور چلی گئی۔

(۸)

ارجمند سُلطانہ ہنوز آئینے کے رُو برُو بیٹھی تھیں۔ صندلی کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے قدموں کی آہٹ ارجمند سُلطانہ نے سُنی لیکن مُڑ کر اُس کی جانب نہ دیکھا۔ صندلی چُپ چاپ اُن کے عقب میں جا کر کھڑی ہو گئی۔ کمرے کی خاموشی میں ارجمند سُلطانہ کی آواز اُبھری۔

"صندلی، تو اتنی جلدی واپس کیوں آ گئی؟"

"سرکار! وہ بے قابو ہوئے جا رہے ہیں۔" صندلی نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"نہیں، تم اسے جا کر سمجھاؤ۔"

"وہ میری بات ہی نہیں سُن رہے ہیں۔" صندلی نے دبی زبان سے احتجاج کیا۔

"معلوم ہوتا ہے شربت میں فلک سیر زیادہ مقدار میں ڈال دی گئی۔"

"شربت پینے کے بعد تو یہ کیفیت نہیں ہوئی تھی۔ کھانا بھی اطمینان سے بیٹھ کر کھایا تھا، لیکن۔" وہ بات کہتے کہتے رُک گئی۔

"لیکن کیا؟" ارجمند سلطانہ نے بے چین ہو کر پوچھا۔

"مَیں نے ان کو کافی بھی پلا دی ہے۔"

"اور کافی میں۔" ارجمند سُلطانہ نے جملہ اُدھورا چھوڑ دیا۔

"مجھے جو ہدایات دی گئی تھیں۔ میں نے وہی کیا۔" صندلی نے پورے اعتماد سے جواب دیا۔

"اب اس کی کیا حالت ہے؟"

"سرکار! وہ آپ سے ملنے کے لئے آپے سے باہر ہوئے جا رہے ہے۔" صندلی نے آگاہ کیا۔

"واقعی؟" ارجمند سلطانہ نے حیرت کا اظہار کیا۔ ان کے ہونٹوں پر ہلکا ہلکا تبسم بکھر گیا۔ چہرہ دمکنے لگا۔ آنکھوں میں ستارے جھلملانے لگے۔ "نشہ کچھ زیادہ تو اُسے نہیں ہو گیا؟"

"مَیں آپ سے کیا عرض کروں کہ ان کا کیا حال ہے۔" صندلی نے ارجمند سلطانہ کو بتایا۔ "میرے ساتھ ہی آ رہے تھے۔ بڑی مُشکل سے اُن کو روکا ہے۔"

ارجمند سلطانہ نے ایک لمبی 'ہوں' کی اور ذرا ترچھی ہو کر ایک خاص زاویے سے اپنا چہرہ دیکھنے لگیں۔ ذرا دیر تک ٹکٹکی باندھے، وہ آئینے میں اپنا عکس دیکھتی رہیں۔ پھر اُنھوں نے گوبلٹ اُٹھایا۔ شیمپین کا بڑا سا گھونٹ بھرا اور منہ بگاڑ کر بولیں۔ "یہ شیمپین بہت ہلکی شراب ہوتی ہے۔ ذرا نشہ نہیں ہوتا۔" ارجمند سلطانہ نے صندلی کو مخاطب کیا۔ "صندلی! بارین سے جا کر کہو۔ میرے لئے ڈمپل کا ایک بڑا پیگ بنا دے۔ مجھے اس وقت تھوڑی سی وہسکی پینا چاہیئے۔" انھوں نے جُھک کر آئینے میں اپنا عکس دیکھا اور گردن کو ہلکا سا جھٹکا دے کر بولیں۔ "میں چاہتی ہوں اتنا نشہ ہو جائے، اتنا نشہ ہو جائے کہ آئینے میں مجھے اپنا چہرہ یوں نظر آئے۔ کچھ دھندلا دھندلا، کچھ بکھرا بکھرا جیسے خواب دیکھ رہی ہوں۔ کیا سمجھیں؟" ارجمند سلطانہ نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

"سرکار! اب بس کیجئے۔ آپ بہت دیر سے شغل کر رہی ہیں۔ کچھ کھایا بھی نہیں۔" صندلی نے ڈرتے ڈرتے انہیں ٹوکا اور فوراً قیصر مرزا کا ذکر چھیڑ دیا۔ "وہ یہاں آنے کے لئے بے قرار ہو رہے ہیں۔ میں ان سے کیا کہہ دوں؟"

ارجمند سلطانہ نے سگریٹ کا لمبا کش لگایا اور آہستہ آہستہ بڑبڑانے لگیں۔ "نہیں

نہیں، اُسے ابھی یہاں نہیں آنا چاہیئے۔"

"لیکن وہ میرے روکنے سے نہیں رُکیں گے۔" صندلی نے مداخلت کی۔

"صندلی!" ارجمند سُلطانہ کے لہجے میں اچانک دبدبہ پیدا ہوگیا۔" تو قیصر مرزا کو یہاں آنے سے نہیں روک سکتی؟" اُنھوں نے قدرے تامّل کیا۔ پھر سنبھلے ہوئے لہجے میں کہا۔" نہیں، تو قیصر مرزا کو روک سکتی ہے۔ مجھے یقین ہے تو ایسا کرسکتی ہے۔" انھوں نے مُڑ کر اُس کی جانب دیکھا۔" تیرا یہ چاند سا چہرہ۔ یہ خوبصورت آنکھیں۔ یہ سجیلا جسم۔ یہ چڑھتی جوانی۔ تو کیا نہیں کرسکتی۔"

"سرکار! مَیں آپ کی کنیز ہُوں۔" صندلی نے شرما کر کہا۔"میری عزّت افزائی کے لیے یہی کیا کم ہے۔"

ارجمند سُلطانہ نے ایک بار پھر آئینے میں اپنا عکس دیکھا اور آہستہ سے بولیں۔ "صندلی۔" مگر وہ پُوری بات نہ کہہ سکیں۔ دروازے پر ہلکی سی آہٹ ہوئی۔ ارجمند سلطانہ دم بخود رہ گئیں۔ صندلی کے چہرے پر پریشانی کے سائے پھیل گئے۔" سرکار، وہ اندر آرہے ہیں۔" اُس کے لہجے سے گھبراہٹ عیاں تھی۔

"ہاں، یہ قیصر مرزا ہی ہوسکتا ہے۔"

"میرے لیے کیا حکم ہے؟" صندلی نے دریافت کیا۔

"اسے اندر نہ آنے دو۔" ارجمند سلطانہ نے حکم صادر کیا۔ صندلی کی ساری تیزی اور طرّاری جواب دے گئی۔ وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ گم صُم کھڑی رہی۔ دروازے پر رُک رُک کر آہٹ اُبھرتی رہی۔" صندلی، تو ابھی گئی نہیں۔" ارجمند سُلطانہ کا لہجہ اس دفعہ تیکھا اور تند تھا۔ اس سے گھبراہٹ بھی آشکارا تھی۔" کہیں وہ اندر نہ آجائے۔"

"سرکار، وہ نہیں مانیں گے۔ وہ دیوانوں کی سی حرکتیں کررہے ہیں۔ مَیں، اُن کو کس طرح روکوں۔" صندلی نے عاجزی سے کہا۔" وہ میری ایک نہیں سنیں گے۔"

"وہ ابھی یہاں نہیں آسکتا۔ وہ کیسے یہاں آسکتا ہے۔" اُنھوں نے نظریں اُٹھا کر دیوار پر آویزاں گھڑی کو دیکھا۔ اس میں گیارہ بج کر سینتالیس منٹ ہوئے تھے۔

ارجمند سُلطانہ نے صندلی کو مخاطب کیا۔ "صندلی! گھڑی دیکھ رہی ہے۔"

"جی سرکار! دیکھ رہی ہوں۔" اس نے نظریں گھما کر گھڑی کی سمت دیکھا۔

دروازے پر رُک رُک کر اُبھرنے والی آہٹ یکایک تیز ہو گئی۔ ارجمند سُلطانہ نے ڈپٹ کر کہا۔ "صندلی اُسے روکو۔ وہ اندر آ رہا ہے۔" ان کا لہجہ اور سخت ہو گیا۔ جاؤ، جس طرح بھی ممکن ہو، اُسے روکو۔"

صندلی مجبور ہو گئی۔ کچھ اور کہنے کی گنجائش نہ تھی۔ وہ مڑی اور تیز تیز قدم اُٹھاتی ہوئی آگے بڑھی۔ دروازہ کھولا اور باہر چلی گئی۔

ارجمند سُلطانہ کا چہرہ گہری سُرخ روشنی میں دمک رہا تھا۔ ان کے ہونٹ آہستہ آہستہ لرز رہے تھے۔ آنکھوں میں شفاف جھیلوں کی سی جھلملاہٹ تھی۔ وہ آئینے کے رُو برُو بُت بنی بیٹھی تھیں۔

باہر دروازے پر قیصر مرزا کے رُک رُک کر بولنے کی آواز آ رہی تھی۔ وہ کمرے کے اندر جانے کے لیے مُصر تھا۔ صندلی نرم اور شگفتہ لہجے میں اسے سمجھا رہی تھی۔ منا رہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ اور سنبھل سنبھل کر بول رہی تھی۔

ارجمند سُلطانہ نے گردن کو خم دے کر بند دروازے کی سمت دیکھا اور چند لمحے ٹکٹکی باندھے دروازے کو تکتی رہیں، پھر اُنھوں نے پلٹ کر آئینے پر نظر ڈالی۔ اپنا عکس دیکھا اور مسلسل دیکھتی رہیں۔

باہر دروازے پر قیصر مرزا اور صندلی کی آوازیں رات کے سناٹے میں وقفے وقفے سے اُبھر رہی تھیں۔ کبھی اُونچی ہو جاتیں، کبھی مدھم ہو کر رُک جاتیں۔ کچھ دیر خاموش رہی۔ پھر قیصر مرزا کی آواز اُبھری۔ اس دفعہ وہ اتنی اُونچی آواز سے بولا کہ ارجمند سُلطانہ نے بے چین ہو کر کُرسی پر پہلو بدلا۔ مگر دروازے کی جانب نہ دیکھا۔ ان کے ہونٹوں پر ہلکی ہلکی مسکراہٹ رقصاں تھی۔ آنکھوں میں چراغ روشن ہو گئے تھے۔

اُنھوں نے گھڑی کی جانب دیکھا۔ بارہ بجنے میں ابھی دس منٹ باقی تھے۔ وہ اُٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔ شیشے کا گوبلٹ اُٹھایا اور اسے سنبھالے ہوئے آگے بڑھیں۔ جنوبی

گوشے میں جو دروازہ تھا، اس کے قریب پہنچیں، دروازے کا ایک پٹ کھولا۔ پلٹ کر اس دروازے کی سمت دیکھا جس کے سامنے قیصر مرزا کھڑا تھا اور ٹھہر ٹھہر کر بول رہا تھا۔ ارجمند سلطانہ نے گہری سانس بھری اور دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔

خالی کمرے میں گھڑی کا پنڈولم، دل کی مانند دھڑکتا رہا۔ کھٹ، کھٹ، کھٹ!!

(۹)

قیصر مرزا دروازے سے ٹیک لگائے پتھر کے مجسّمے کی طرح خاموش کھڑا تھا۔ وہ ٹکٹکی باندھے دروازے کو تک رہا تھا۔ جس کے پیچھے ارجمند سلطانہ کا شبستان تھا۔ جھروکوں کی جالیوں سے پھوٹتی ہوئی سرخ روشنی میں صندلی کا چہرہ شعلے کی مانند دہک رہا تھا۔ وہ قیصر مرزا کے قریب ہی کھڑی تھی۔ غلام گردش بالکل سنسان تھی۔ آس پاس کوئی نہ تھا۔ نہ کوئی آہٹ تھی نہ آواز۔ ہر طرف پراسرار سکوت طاری تھا۔

قیصر مرزا نے مڑ کر صندلی کی جانب دیکھا۔ "تم یہاں کھڑی کیوں ہو؟" اس کا لہجہ تیکھا اور تحکمانہ تھا۔ "تم مجھے رانی صاحبہ کے پاس کیوں نہیں لے جاتیں؟"

صندلی نے خود کو سنبھالا۔ نرم لہجے میں کہا۔ "ذرا دیر اور ٹھہر جایئے۔" وہ زیرِلب مسکرائی۔ "آپ کو اب زیادہ انتظار نہیں کرنا ہوگا۔"

قیصر مرزا نے نظریں اٹھا کر اس کے شعلہ گوں چہرے کو دیکھا اور لمحہ بھر تک محویت کے عالم میں دیکھتا رہا۔ پھر اس نے نظریں نیچی کر لیں۔ زبان سے ایک لفظ نہ نکالا۔ گُم صُم کھڑا رہا۔

مگر صندلی خاموش نہ رہی۔ آہستہ سے بولی۔ "آیئے، میں آپ کو بتاؤں کہ ابھی وہ آپ سے کیوں نہیں مل سکتیں۔"

قیصر مرزا اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ دیوار کے سہارے کھڑا رہا۔ بیزاری سے بولا۔ "کیوں نہیں مل سکتیں؟" اس نے بے قرار ہو کر صندلی کو دیکھا۔

"آپ آدھی رات سے پہلے ان کے پاس نہیں جا سکتے۔" صندلی نے نرم لہجے

میں جواب دیا۔ "نہ وہ آدھی رات سے پہلے آپ کے سامنے آسکتی ہیں۔" اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی چھاگئی۔ لہجہ کچھ اور نرم ہوگیا۔ "بارہ بجنے میں ابھی کچھ وقت باقی ہے۔"

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو؟" قیصر مرزا نے صندلی کو مشتبہ نظروں سے دیکھا۔

"میں آپ سے غلط نہیں کہہ رہی ہوں۔" صندلی نے اسے باور کرانے کی کوشش کی۔ "مجھے جو حکم ملا ہے وہی آپ کو بتا رہی ہوں۔" اس نے لمحہ بھر کے لئے توقف کیا۔ پھر گویا ہوئی۔ "یقین مانئے، میں آپ سے بالکل درست عرض کر رہی ہوں۔"

"نہیں، تم ٹھیک ہی کہہ رہی ہو۔" قیصر مرزا نے اُسے اطمینان دلایا۔ "مجھے تمہاری بات پر یقین ہے۔" وہ ہنوز دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا رہا۔ "مگر میں اب کہیں جاؤں گا نہیں۔" اس نے نظریں اُٹھا کر صندلی کو دیکھا۔ "میں یہیں کھڑا آدھی رات ہونے کا انتظار کرتا رہوں گا۔"

"آپ کا اس طرح یہاں کھڑے رہنا مناسب نہیں۔" صندلی نے گردن اُٹھا کر چوکنا نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔

لیکن قیصر مرزا ذرا متاثر نہ ہوا۔ اپنی جگہ پر جما ہوا کھڑا رہا۔ اس نے نگاہیں جھکا کر کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھی۔ "بارہ بجنے میں اب دیر ہی کتنی رہ گئی ہے۔ میں اب یہاں سے نہیں جاؤں گا۔" وہ اپنی بات پر اڑا رہا۔

صندلی نے بھی اس کی ضد کے سامنے ہتھیار نہ ڈالے۔ مگر اس نے جھنجلاہٹ کا مطلق اظہار نہ کیا۔ رسان سے کہا۔ "رانی صاحبہ، ہرگز یہ نہیں چاہتیں کہ آپ یوں ان کی خواب گاہ کے سامنے کھڑے رہیں۔"

عین اس وقت قدموں کی آہٹ اُبھری۔ کوئی اسی سمت آرہا تھا۔ صندلی کے چہرے سے گھبراہٹ جھلکنے لگی۔ پریشان ہوکر بولی۔ "کوئی آرہا ہے۔" وہ فوراً آگے بڑھی اور قیصر مرزا کو اپنے ہمراہ آنے کا اشارہ کیا۔ "آیئے میرے ساتھ۔" اس بار قیصر مرزا نے اڑنے کی کوشش نہ کی۔ اس نے قدم بڑھایا اور صندلی کے پیچھے

پیچھے چلنے لگا۔

صندلی زیادہ دُور نہ گئی۔ غلام گردش کے نکڑ پر ایک دروازہ تھا۔ اس کے سامنے پہنچ کر وہ رُک گئی۔ ہاتھ بڑھا کر دروازہ کھولا۔ مُڑ کر قیصر مرزا کو دیکھا "اندر آجائیے۔"
قدموں کی آہٹ اور قریب آگئی تھی۔ صندلی نے اس طرف دیکھا۔ مگر کوئی نظر نہ آیا۔ غلام گردش ابھی تک سنسان تھی۔

صندلی تیزی سے آگے بڑھی اور کمرے میں داخل ہوگئی۔ قیصر مرزا بھی اس کے ساتھ ساتھ کمرے میں چلا گیا۔

☆

یہ کمرہ دوسرے کمروں سے بہت مختلف تھا۔ یہاں روشنی بھی نسبتاً بہت کم تھی۔ ایک اونچے اسٹول پر شمعدان رکھا تھا۔ اس میں صرف ایک موم بتی روشن تھی۔ کمرے کی چھت بھی نیچی تھی۔ کھڑکی صرف ایک تھی اور اس وقت بند تھی۔ فرنیچر میں صرف ایک لمبا صوفہ تھا جس کے آگے چھوٹی سی میز رکھی تھی۔

صندلی نے بڑھ کر کھڑکی کھول دی۔ باہر گہرا اندھیرا تھا۔ اُونچے، اُونچے درخت سر اٹھائے کھڑے تھے۔ دُور بستی میں کہیں، کہیں چراغ جھلملا رہے تھے۔ درختوں کے عقب میں سڑک تھی۔ جس پر ایک بیل گاڑی اس وقت گزر رہی تھی۔ بیل گاڑی کے پہیے رُوں رُوں کر رہے تھے۔ بیلوں کی گردنوں میں پڑی ہوئی پیتل کی گھنٹیاں بھی رُک رُک کر رات کے سناٹے میں بج رہی تھیں۔

کھڑکی کھول کر صندلی نے پردہ ایک طرف سرکا دیا۔ ہوا کا تازہ جھونکا آیا تو قیصر مرزا نے تازگی محسوس کی۔ صندلی نے اس کی جانب دیکھا۔ مُسکرا کر صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ "تشریف رکھئے۔" قیصر مرزا نے کچھ نہ کہا۔ ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے آگے بڑھا اور نڈھال ہو کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ صندلی بھی اپنا لہنگا سمیٹ کر اس کے رُو بہ رُو فرش پر بیٹھ گئی۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ رخساروں پر رکھ لئے اور

قیصر مرزا کے چہرے کو تکنے لگی جو سُرخ گلاب کی مانند شگفتہ نظر آرہا تھا۔ اس کی نملائی آنکھوں میں خمار تھا اور پچھلی رات کے ستاروں کی جگمگاہٹ تھی۔

قیصر مرزا نے مسکرا کر پوچھا۔ "مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہی ہو؟"

"بُرا لگ رہا ہے تو نہ دیکھوں"۔ اس نے شوخی سے مسکرا کر کہا۔ اس کے انداز میں عشوہ تھا، لگاوٹ تھی، خود سپردگی تھی۔

مگر قیصر مرزا کے ذہن پر ارجمند سلطانہ چھائی ہوئی تھیں۔ اس نے صندلی سے پوچھا۔ "رانی صاحبہ یہاں کب آئیں گی؟"

"وہ یہاں نہیں آسکتیں"۔ صندلی نے گہری سانس بھری اور اُٹھ کر کھڑی ہوگئی۔

"کہاں چلیں؟" قیصر مرزا نے پوچھا۔

صندلی حسبِ معمول شگفتہ لہجے میں گویا ہوئی۔ "میں رانی صاحبہ کے پاس جارہی ہوں لیکن جلد ہی آنے کی کوشش کروں گی۔"

قیصر مرزا نے اسے ٹوکا۔ "صندلی!"

لیکن صندلی اس وقت تک دروازے پر پہنچ چکی تھی۔ اس نے پلٹ کر قیصر مرزا کو دیکھا۔ مُسکرائی اور تیزی سے آگے بڑھی۔ دروازہ کھولا اور ہوا کے جھونکے کی طرح آن کی آن میں باہر چلی گئی۔

قیصر مرزا کھویا کھویا سا بیٹھا تھا۔ اس کی طبیعت بوجھل ہو رہی تھی۔ سر میں ہلکا ہلکا درد بھی تھا اور آنکھیں سلگتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔ اس کی نظریں بار بار دروازے کی جانب اٹھتیں۔ مگر دروازہ ہنوز بند تھا۔ اسے صندلی کے واپس آنے کا بے چینی سے انتظار تھا۔

(۱۰)

صندلی خواب گاہ کے بغلی دروازے کے سامنے سہمی ہوئی کھڑی تھی۔ دروازہ بند تھا اور ارجمند سلطانہ ابھی تک اسی کمرے میں تھیں۔ صندلی نے جھجکتے ہوئے آہستہ

سے دروازے پر دستک دی۔ ذرا دیر بعد دروازہ چرچراتا ہوا کھل گیا۔ سامنے ارجمند سلطانہ کھڑی تھیں۔

"سرکار! میں اندر آسکتی ہوں؟"

"آجاؤ۔" ارجمند سلطانہ دروازے سے ہٹ کر ایک طرف ہوگئیں۔

صندلی خاموشی سے کمرے میں داخل ہوگئی۔ وہ ابھی تک سہمی ہوئی تھی۔ کمرے میں روشنی اس قدر کم تھی کہ ارجمند سلطانہ سائے کی مانند نظر آرہی تھیں۔ وہ چند لمحے حیرت زدہ نظروں سے صندلی کو دیکھتی رہیں۔ پھر آہستہ سے دریافت کیا۔

"صندلی!" ان کے لہجے میں تجسس تھا۔ "تو اتنی جلدی کیسے واپس آگئی؟"

صندلی نے کوئی جواب نہ دیا۔ سر جھکائے خاموش کھڑی رہی۔

"کیا وہ بہت زیادہ سرکشی کر رہا ہے؟" ارجمند سلطانہ نے مسکرا کر پوچھا۔ "یہاں آنے پر بضد ہے۔"

"جی ہاں!" صندلی نے مختصر جواب دیا۔

"ابھی تک دروازے کے سامنے کھڑا ہے؟"

"جی نہیں، وہ اب وہاں نہیں ہیں۔" صندلی نے سنبھلے ہوئے لہجے میں ارجمند سلطانہ کو مطلع کیا۔

"اب وہ کہاں ہے؟"

"میں نے ان کو نکڑ والے کمرے میں پہنچا دیا۔" صندلی سنبھل سنبھل کر بول رہی تھی۔ "دروازے کے سامنے سے کسی طور ہٹنے کو تیار ہی نہ تھے۔ میں نے بڑی مشکل سے ان کو آمادہ کیا۔"

"جب وہ اس کمرے میں چلا گیا تو تجھے ابھی یہاں آنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟" ارجمند سلطانہ کے لہجے میں جھنجھلاہٹ تھی۔ "ابھی تو بارہ بھی نہیں بجے۔"

"سرکار! بارہ بجنے میں دیر ہی کتنی رہ گئی ہے۔"

"بارہ بجے تک اُسے روکے رکھو۔ بلکہ اس کے بعد بھی وہ یہاں اس وقت آئے

جب میں اجازت دوں۔" اُن کی آواز میں رُعب اور دبدبہ تھا۔ "صندلی! تیرے لئے یہ مشکل کام نہیں۔ تو جب تک چاہے اُسے روک سکتی ہے۔" انھوں نے صندلی کو نظر بھر کر دیکھا۔ زیرِلب مُسکرائیں۔ "مجھے تجھ پر پورا اعتماد ہے۔"

صندلی نے کسی ردِعمل کا اظہار نہ کیا۔ خاموش کھڑی رہی۔

ارجمند سلطانہ نے صندلی کو خاموش پایا تو حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔ "کس سوچ میں پڑ گئی ہے؟"

صندلی بدستور خاموش کھڑی رہی۔

"بولتی کیوں نہیں۔ خاموش کیوں ہے؟" اس بار ان کے لہجے میں تشویش تھی۔

"سرکار!" صندلی نے نگاہیں اُٹھا کر ارجمند سلطانہ کے چہرے کی جانب دیکھا اور ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ایک ٹک دیکھتی رہی۔ پھر اس نے گہری سانس بھری۔ "اب یہ کھیل ختم ہو جانا چاہیئے۔"

"کیا مطلب؟" ارجمند سلطانہ نے حیران و پریشان ہو کر پوچھا۔

"مجھے جو عرض کرنا تھا، عرض کر دیا۔" اس دفعہ صندلی اُن سے نظریں نہ ملا سکی۔ مُڑی اور کمرے سے باہر جانے کے لئے آگے بڑھی۔ "میں اب جا رہی ہوں۔"

"ٹھہر جا صندلی۔" ارجمند سلطانہ نے اُسے ٹوکا۔

مگر صندلی نہ رُکی۔ اس نے زبان سے بھی کچھ نہ کہا۔

"ٹھہر جا۔" ارجمند سلطانہ نے اس بار ڈپٹ کر صندلی کو روکا۔ "تو اس طرح یہاں سے نہیں جا سکتی۔"

صندلی جہاں تھی وہیں رُک گئی۔ اس نے پلٹ کر ارجمند سلطانہ کی طرف دیکھا "فرمایئے۔" وہ مطلق خوف زدہ نہ تھی۔ اس کا لہجہ بھی تیکھا تھا۔

"یہاں آؤ۔" ارجمند سلطانہ نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے قریب بلایا۔

صندلی آہستہ آہستہ چلتی ہوئی ان کے رُوبرُو جا کر کھڑی ہو گئی۔

"تو کہنا کیا چاہتی ہے؟"

صندلی نے نظریں اٹھا کر ارجمند سلطانہ کی جانب دیکھا۔ "میں چاہتی ہوں وہ یہاں نہ آئیں۔ میں انہیں یہاں نہیں آنے دوں گی۔" اس کے لہجے میں سرکشی کے ساتھ ساتھ خوداعتمادی بھی تھی۔

"کہیں تو اسے دل وِل تو نہیں دے بیٹھی؟ وہ بہت خوبصورت ہے۔ عورت کے دل کو آسانی سے فتح کر لیتا ہے۔"

صندلی نے اس دفعہ کچھ نہیں کہا۔ خاموش کھڑی رہی۔

"صاف صاف بتا۔ کیا واقعی تو اس سے محبت کرنے لگی ہے؟"

"کیا مجھے محبت کرنے کا حق نہیں؟" صندلی نے گردن اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔

"گستاخ، تیری یہ مجال۔" ارجمند سلطانہ کے چہرے پر جھنجھلاہٹ چھا گئی۔ انھوں نے ہاتھ اٹھا کر صندلی کے منہ پر تڑاخ سے تھپڑ مارا۔ غصّے سے بولیں۔ "تو اپنی اوقات بھول کر حد سے تجاوز کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔" انھوں نے اُسے قہر آلود نظروں سے دیکھا۔ "جا، جو میں کہہ رہی، وہ کر۔ تو اچھی طرح جانتی ہے کہ میں حکم عدولی برداشت نہیں کرتی۔"

صندلی نے کسی ردِّعمل کا اظہار نہ کیا۔ تھپڑ کھا کر بھی اپنی جگہ پر جمی کھڑی رہی۔

ارجمند سلطانہ کو اس کی خاموشی نہایت شاق گزری۔ لیکن وہ چپ رہیں۔ غیظ و غضب کے عالم میں گہری گہری سانسیں بھرتی رہیں۔ ان کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ وہ نشے سے ہولے ہولے لہرا رہی تھیں۔

صندلی نظریں جھکائے گم صُم کھڑی رہی۔

☆

کمرے میں کچھ دیر سکوت طاری رہا۔ پھر خاموشی میں ارجمند سلطانہ کی آواز ابھری۔ "یہ بیٹھے بٹھائے تجھے ہو کیا گیا تھا۔ آخر تو چاہتی کیا ہے؟" ان کا لہجہ اب بدلا ہوا تھا۔ اس تبدیلی کو صندلی نے بھی محسوس کیا۔ لیکن خاموش رہی۔ ارجمند سلطانہ نے قدرے تاَمّل

کیا۔ پھر اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "بول، بولتی کیوں نہیں؟"

صندلی نے نگاہیں اٹھا کر ارجمند سلطانہ کی طرف دیکھا۔ ٹھنڈی سانس بھری اور نگاہیں نیچی کرلیں۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ آنسو اُمڈے اور پلکوں سے ڈھلک ڈھلک کر رخساروں پر بہنے لگے۔

"تو رُو رہی ہے؟" ارجمند سلطانہ نے گھبرا کر پوچھا

"آپ نے درست فرمایا۔ میں اپنی اوقات بھول گئی تھی۔" صندلی کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ "مجھے بالکل یاد نہ رہا کہ میں آپ کی ادنیٰ خادمہ ہوں۔ خانہ زاد ہوں، مجبور اور لاوارث ہوں۔ میرا کوئی نہیں، کوئی بھی تو نہیں۔" صندلی نے نظریں اُٹھا کر ارجمند سلطانہ کو دیکھا۔ "میں تو وہ بدنصیب ہوں جسے ماں کے ہوتے ہوئے بھی ماں کی مامتا نہ ملی۔" وہ بلک بلک کر رونے لگی۔

"اس طرح نہ رُو صندلی۔" ارجمند سُلطانہ کی آواز میں رقّت تھی۔

لیکن صندلی خاموش کھڑی روتی رہی۔ ارجمند سلطانہ اسے روتے ہوئے دیکھتی رہیں۔ انھوں نے زبان سے ایک لفظ نہ نکالا۔ تڑپ کر آگے بڑھیں اور صندلی کو بے اختیار گلے سے لگا لیا۔

صندلی نے ان کے مہکتے ہوئے جسم کی حرارت اور گداز کو محسوس کیا۔ اُسے یہ بھی اندازہ ہو گیا کہ وہ بھی رو رہی تھیں۔ ان کے رویّے میں تاسّف تھا، شفقت تھی، پیار تھا۔ اس نے کبھی ان کو اس عالم میں نہیں دیکھا تھا۔ وہ موم کی مانند پگھل گئی۔ بے قرار ہو کر بولی۔

"سرکار! مجھ سے غلطی ہو گئی۔ مجھے معاف کر دیجیے۔"

ارجمند سلطانہ خاموش رہیں۔ صندلی کے کندھے پر سر ٹکائے روتی رہیں۔ کمرے کے گہرے سکوت میں ان کی سسکیوں کی ہلکی ہلکی سرسراہٹ صاف سُنائی دے رہی تھی۔

"سرکار! اس طرح خود کو ہلکان نہ کریں۔" صندلی نے عاجزی سے کہا۔

ارجمند سلطانہ کچھ نہ بولیں۔ علیٰحدہ ہوئیں اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی ڈریسنگ رُوم کی جانب بڑھیں۔ ڈریسنگ رُوم کا دروازہ سامنے ہی تھا۔ انھوں نے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوگئیں۔ صندلی نظریں اٹھائے اس سمت دیکھتی رہی۔ پھر وُہ مڑی اور کمرے سے چلی گئی۔

(۱۱)

قیصر مرزا اکتا کر کھڑا ہوگیا اور بے چینی سے کمرے میں ٹہلنے لگا۔ مگر قرار نہ آیا۔ وُہ مُڑ مُڑ کر دروازے کی جانب دیکھتا رہا۔ دروازہ بند تھا۔ اچانک آہٹ سنائی دی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ کھڑکی پر ایک دھندلا، دھندلا سایہ نظر آیا اور آن کی آن میں اوجھل ہوگیا۔

وہ حیرت زدہ نظروں سے کھڑکی کی جانب دیکھتا رہا۔ لیکن دوبارہ وہ سایہ نظر نہ آیا۔ قیصر مرزا کچھ دیر حیران و پریشان کھڑا رہا، پھر اس نے ہمت سے کام لیا۔ آگے بڑھا اور کھڑکی کے قریب پہنچ گیا۔ باہر گھُپ اندھیرا تھا۔ اُس نے چوکھٹ کا سہارا لیا۔ گردن باہر نکالی اور جُھک کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ مگر دُور دُور تک کسی کا نام و نشان نہ تھا۔ اُونچے اُونچے گھنے درخت سائیں سائیں کر رہے تھے۔

دروازہ آہستہ سے چر چرایا۔ قیصر مرزا نے مُڑ کر عقب میں دیکھا۔ صندلی دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں لکڑی کی ٹرے تھی۔ جس پر باریک جالی کا سَرپوش پڑا تھا۔ صندلی نے دوسرے ہاتھ سے دروازہ بند کیا اور ٹرے سنبھالے ہوئے آگے بڑھی، جھکی اور ٹرے میز پر رکھ دی۔

قیصر مرزا کھڑکی کے قریب کھڑا رہا اور خاموشی سے صندلی کو دیکھتا رہا۔ ٹرے میز پر رکھنے کے بعد صندلی اس کی جانب متوجّہ ہوئی۔ مسکرا کر بولی۔ ”معاف کیجیے، مجھے واپس آنے میں کچھ دیر ہوگئی۔“ اس نے فوراً بات کا رُخ پلٹ دیا۔ حیرت زدہ ہو کر دریافت کیا۔ ”یہ آپ کھڑکی کے پاس کیوں کھڑے ہیں؟ گرمی محسوس ہو رہی ہے؟“

"نہیں!" قیصر مرزا نے آہستہ آہستہ گردن ہلا کر انکار کیا۔ "ذرا دیر پہلے مجھے کھڑکی کے باہر کوئی کھڑا ہوا نظر آیا تھا۔"

"آپ نے اُسے دیکھا تھا؟" صندلی بدستور حیرت زدہ تھی۔

"میں نے اُسے دیکھا تو تھا۔ مگر کوئی اندازہ نہ لگا سکا۔" قیصر مرزا نے بتایا۔ "اندھیرے میں صرف دھندلا سا سایہ نظر آیا۔ میں نے یہاں آکر دیکھا تو باہر کوئی نہ تھا۔"

صندلی نے مزید استفسار نہ کیا۔ خاموشی سے آگے بڑھی۔ قیصر مرزا کے قریب پہنچی اور کھڑکی کی چوکھٹ کا سہارا لے کر باہر دیکھنے لگی۔ بے نیازی سے بولی۔ "یہاں تو کوئی نہیں۔ ہر طرف سناٹا چھایا ہے۔ اتنی رات گئے اس طرف آ بھی کون سکتا ہے۔ پہریدار ہوتا تو اس کی اتنی ہمت نہیں ہو سکتی کہ کھڑکی سے اندر جھانکے۔" وہ بے تکلفی سے مسکرانے لگی۔ اس نے گردن کو خم دے کر قیصر مرزا کی جانب دیکھا۔ دونوں کے چہرے اس قدر نزدیک آگئے کہ وہ ایک دوسرے کے جسموں کی خوشبو اور حرارت محسوس کر سکتے تھے۔ چند لمحے تک دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتے رہے۔ قیصر مرزا کی نظروں میں ایسی چکا چوند تھی کہ صندلی ان کی تاب نہ لا سکی۔ نظریں جھکا کر بولی۔ "شاید آپ کو مغالطہ ہوا۔"

"مغالطہ تو نہیں ہوا۔ سایہ تو میں نے صاف دیکھا تھا۔" قیصر مرزا نے اُلجھے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

صندلی نے اس کی بات نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔ "آیئے، ادھر صوفے پر بیٹھ جایئے۔"

"کتنی دیر اور انتظار کرنا ہوگا۔؟" قیصر مرزا اب سنبھل چکا تھا۔ اس نے صوفے کی جانب بڑھتے ہوئے پوچھا۔

"ابھی تو رات آدھی بھی نہیں ہوئی۔" صندلی نے گول مول جواب دیا۔

قیصر مرزا جا کر تھکا ہوا سا پھر صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس نے صندلی کی جانب دیکھا۔ "تم رانی صاحبہ کے پاس گئی تھیں؟"

"جی ہاں!" صندلی نے بتایا۔ "میں اب تک انہی کے پاس تھی۔"

"میرے بارے میں کیا فرماتی تھیں؟"

"آپ کو اس وقت تک انتظار کرنا ہوگا جب تک وہ آپ کو یاد نہ فرمائیں۔"

صندلی نے اس دفعہ بھی کھل کر بات نہ کی۔ ٹال مٹول سے کام لیا۔ قیصر مرزا نے مشتبہ نظروں سے صندلی کو دیکھا، سنجیدگی سے پوچھا۔ "مگر بارہ بجے کے بعد تو مجھے مزید انتظار کرنا نہیں ہوگا؟"

صندلی اس کے استفسار کو صاف نظر انداز کر گئی۔ اس نے ٹرے پر پڑا ہوا سر پوش ہٹایا۔ ٹرے میں خشک میوہ، پھل اور کافی کی پیالیاں، کیتلی اور دوسرا ساز و سامان رکھا تھا۔ صندلی ایک پیالی میں کافی ڈالنے لگی۔

قیصر مرزا نے منہ بگاڑ کر کہا۔ "نہیں صندلی! میں اب کچھ نہیں پیوں گا۔"

"آپ اس کے پینے سے اتنا گھبرا کیوں رہے ہیں؟" صندلی نے کافی انڈیل کر دودھ ڈالا۔ شکر ملائی اور پیالی بڑھا کر بولی۔ "دیکھئے انکار نہ کیجئے۔ اس کے پینے سے آپ تازگی اور سکون محسوس کریں گے۔"

"تم مجھے پریشان نہ کرو۔" قیصر مرزا پیچھے ہٹا اور سر صوفے سے ٹکا دیا۔ "میرے سر میں پہلے ہی ہلکا، ہلکا درد ہے۔ اسے پی کر نہ جانے اور کیا حال ہو جائے۔"

"سر درد کے لئے تو یہ دے رہی ہوں۔" صندلی کھل کر مسکرائی۔ "اسے پی کر تو دیکھئے۔ طبیعت کیسی بشاش ہو جائے گی۔"

وہ بیزاری سے بولا۔ "تم مجھے یہ کڑوی کسیلی کافی کیوں پلانا چاہتی ہو؟ مجھے ذرا اچھی نہیں لگتی۔ اس کے پینے سے نہ جانے طبیعت کیسی ہو جاتی ہے۔"

صندلی میز کے قریب فرش پر بیٹھ گئی۔ اس نے پیالی بڑھا کر قیصر مرزا کے ہونٹوں سے لگا دی۔ "آپ اسے پی کر تو دیکھیں۔" اس کے لہجے میں عاجزی تھی۔

قیصر مرزا انکار نہ کر سکا۔ اس نے پیالی صندلی کے ہاتھ سے لے لی اور کافی کا گھونٹ بھر کر منہ بگاڑا۔ "یہ تو بہت کڑوی ہے۔"

"اسے ختم کر لیجیے۔ بچوں کی طرح ضد نہ کیجیے۔" صندلی نے مسکرا کر اصرار کیا۔
قیصر مرزا کچھ نہ بولا۔ رُک، رُک کر کافی کے گھونٹ بھرتا رہا۔ صندلی بھی خاموش بیٹھی رہی۔ اس نے چھُری سے ایک سیب چھیلا اور کاٹ کاٹ کر اس کی قاشیں ایک پلیٹ میں رکھنے لگی۔ قیصر مرزا نے پیالی خالی کر کے ٹرے میں رکھ دی۔
صندلی نے پلیٹ قیصر مرزا کی جانب بڑھائی۔ "لیجیے سیب کھائیے۔ اس کے کھانے سے مُنہ کا ذائقہ درست ہو جائے گا۔"
قیصر مرزا پلیٹ سے سیب کی قاشیں اٹھا، اٹھا کر کھانے لگا۔ سیب خوش ذائقہ تھا۔ قیصر مرزا کو پسند آیا۔

☆

کمرے میں خاموشی چھائی تھی۔ کھڑکی کی راہ سے نرم، نرم جھونکے آرہے تھے۔ شمع دان میں موم بتی کی لَو آہستہ آہستہ تھرتھرا رہی تھی۔ دیواروں پر پرچھائیاں لہرا رہی تھیں۔ قیصر مرزا کو بھی اپنا جسم آہستہ، آہستہ لہراتا ہوا محسوس ہوا۔ آنکھیں بوجھل ہو کر بند ہونے لگیں۔ اس نے گردن جھٹک کر خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ آنکھیں پھاڑ کر حیرت سے صندلی کو دیکھا۔ جھجکتے ہوئے دریافت کیا۔ "صندلی! کافی میں افیم تو ملی ہوئی نہیں تھی؟" اس نے مشتبہ نظروں سے کافی کی خالی پیالی کو دیکھا۔
صندلی اس اچانک سوال پر پریشان ہو گئی۔ چہرہ فق ہو گیا۔ اس نے مسکرا کر اپنی گھبراہٹ چھپانے کی کوشش کی۔ "یہ خیال آپ کو کیسے آیا؟"
"کافی پینے کے بعد مجھے کچھ ایسا ہی محسوس ہو رہا ہے۔"
"کیا آپ افیم سے بھی شوق فرماتے ہیں؟" صندلی نے بے تکلفی سے ہلکا قہقہہ لگایا۔
"نہیں!" قیصر مرزا نے فوراً تردید کی۔ "مجھے کبھی ایسا شوق نہیں رہا۔ ایسی علت سے ہمیشہ دُور رہا۔"
"پھر آپ کو ایسا شبہ کیوں ہوا؟"

"سُنا ہے افیم کے نشے سے جسم میں سنسناہٹ محسوس ہوتی ہے۔ نیند معلوم ہوتی ہے۔" قیصر مرزا نے وضاحت کی۔ "کچھ ایسی ہی حالت میری بھی ہو رہی ہے۔"

"یہ نیند کا تو وقت ہے۔" صندلی مسکرا کر بولی۔ "معلوم ہوتا ہے، آپ کو جلد ہی سونے کی عادت ہے۔" اس نے ایک سرخ سرخ سیب قیصر مرزا کی جانب بڑھایا۔ "لیجیے اس سے شوق فرمایئے۔"

قیصر مرزا نے سیب نہ لیا۔ خاموش بیٹھا صندلی کو بغور دیکھتا رہا۔

"کیا دیکھ رہے ہیں آپ؟"

قیصر مرزا اس کے اچانک استفسار پر چونکا۔ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "میں سوچ رہا تھا۔" وہ اپنی بات کہتے کہتے رک گیا۔

صندلی نے اصرار کیا۔ "کیا سوچ رہے تھے آپ؟"

قیصر مرزا کی آنکھوں سے اب ہلکا ہلکا نشہ جھلک رہا تھا۔ اس نے آہستہ آہستہ پلکیں جھپکائیں۔ ہولے سے جھوم کر بولا۔ "سوچ رہا تھا، تم میں رانی صاحبہ کی خاصی شباہت ہے۔ تمھاری پیشانی، آنکھوں کا یہ انداز۔"

"ہٹیے، میں بھلا کہاں اُن سے ملتی ہوں۔" صندلی نے اُسے آگے بولنے نہ دیا۔ "آپ کو خواہ مخواہ وہم ہو گیا۔" وہ کھل کر مسکرانے لگی۔ "آپ کو تو اس وقت ہر طرف رانی صاحبہ ہی نظر آ رہی ہیں۔" مگر اس کا انداز صاف چغلی کھا رہا تھا کہ قیصر مرزا کی بات سے اُسے مسرت محسوس ہوئی تھی۔

قیصر مرزا نے چبھتی ہوئی نظروں سے صندلی کو دیکھا۔ "تم خواہ کچھ ہی کہو۔ میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ میں نے اب تک یہ بات کیوں نہیں محسوس کی۔" اس نے گہری سانس بھری اور بے قرار ہو کر دونوں ہاتھ بڑھائے اور صندلی کے دل آویز چہرے کو ہولے سے تھام لیا۔ لہرا کر بولا۔ "صندلی! تم بہت حسین ہو۔ اتنی حسین۔" وہ اپنی بات پوری نہ کہہ سکا۔ سانس کی رفتار تیز ہو گئی۔ وہ مبہوت ہو کر اس کے چہرے کو خوابیدہ نظروں سے تکنے لگا۔

محل کے گھڑیالی نے مُوگری سے ٹن، ٹن بارہ بجائے۔ یہ آدھی رات ہونے کا اعلان تھا۔ قیصر مرزا گھڑیال کی آواز سُن کر چونکا۔ اس نے فوراً کہا۔ "صندلی! بارہ بج گئے۔" اس نے بے چین ہو کر پہلو بدلا۔

صندلی نے کوئی جواب نہ دیا۔ خاموش بیٹھی رہی۔

"اُٹھو صندلی۔" قیصر مرزا نے اصرار کیا۔ "تم خاموش کیوں بیٹھی ہو؟"

"کہیئے، کیا حکم ہے؟" صندلی اُٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ اس کے لہجے سے جھنجھلاہٹ آشکارہ تھی۔

قیصر مرزا جھوم کر بولا۔ "رات آدھی ہوگئی۔" اس کی زبان اب لڑکھڑا رہی تھی۔

"مجھے معلوم ہے، رات آدھی ہوگئی۔" صندلی نے بے رخی سے کہا۔ "مگر آپ کو ابھی اور انتظار کرنا ہوگا۔"

قیصر مرزا نے جھوم کر صندلی کو دیکھا۔ بے قراری نے شدّت کے ساتھ اس پر چھاپا مارا۔ تیوری پر بل ڈالکر تیکھے لہجے میں گویا ہوا۔ "نہیں، اب میں ایک لمحہ بھی انتظار نہیں کروں گا۔ تم مجھے ارجمند کے پاس جانے سے نہیں روک سکتیں۔" اس نے پہلی بار نہایت بے تکلفی سے ارجمند سلطانہ کا نام لیا تھا۔ وہ اُٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ نتھنے غصے سے پھڑ پھڑا رہے تھے۔

صندلی اس کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر دم بھر کے لئے سہم گئی۔ نرم لہجے میں بولی۔ "آپ تو کچھ زیادہ ہی بے قرار ہوتے جا رہے ہیں۔" صندلی نے مسکرا کر قیصر مرزا کو رام کرنے کی کوشش کی۔ اس کے انداز میں لگاوٹ تھی، عشوہ تھا۔

مگر وہ ذرا متاثر نہ ہوا۔ دروازے کی جانب بڑھتے ہوئے بولا۔ "مجھے تمہاری رہنمائی کی ضرورت نہیں۔" اس نے مڑ کر صندلی کی جانب دیکھا بھی نہیں۔

صندلی لپک کر اس کے سامنے آگئی۔ راستہ روک کر گویا ہوئی۔ "آپ اس طرح نہیں جا سکتے۔" اس کے چہرے پر سنجیدگی چھائی تھی۔

"کیوں؟" قیصر مرزا نے قدرے اُونچی آواز سے کہا۔ "کیوں نہیں جا سکتا؟"

وہ ایک بار پھر نرم پڑ گئی۔ "پہلے مجھے سرکار سے اجازت لے لینے دیجیے۔" وہ باہر جانے کے لئے دروازے کی جانب بڑھی۔ "ابھی آپ کو کچھ دیر اور انتظار کرنا ہوگا۔"

قیصر مرزا نے اسے باہر جانے نہ دیا۔ بڑھ کر اس کے راستے میں حائل ہوگیا۔ "نہیں، اب مجھے کوئی نہیں روک سکتا۔"

صندلی ذرا جھجکی، پھر ڈٹ کر اس کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ "میں اس طرح آپ کو رانی صاحبہ کے پاس جانے نہیں دوں گی۔" اس نے خود کو سنبھالا۔ جھنجلاہٹ پر قابو پانے کی کوشش کی۔ "آپ مجھے جانے دیں اور میری واپسی کا انتظار کریں۔" اس کے ہونٹوں پر ہلکا، ہلکا تبسم تھا۔ "آپ کو زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ میں جلد ہی واپس آجاؤں گی۔ میری مجبوری سمجھنے کی کوشش کریں۔" اس کے لہجے میں عاجزی تھی۔

قیصر مرزا بجائے نرم پڑنے کے اور مشتعل ہوگیا۔ "ہٹ جاؤ میرے راستے سے۔" وہ آگے بڑھا۔

"نہیں!" صندلی نے برجستہ جواب دیا۔ وہ اس کے رُو برُو جم کر کھڑی ہوگئی۔ "آپ نہیں جا سکتے۔" قیصر مرزا نے لہرا کر قہر آلود نظروں سے صندلی کی جانب دیکھا۔ "تم بھول رہی کہ تم ارجمند سلطانہ کی ایک معمولی خادمہ ہو۔" اس نے حقارت سے منہ بگاڑا اور پاگلوں کی طرح جھپٹ کر اس کی گردن اپنی سخت انگلیوں سے دبوچ لی۔ صندل نے گھبرا کر اپنی گردن چھڑانے کی کوشش کی۔ قیصر مرزا نے انگلیوں کے شکنجے کو اور کسا۔ خوف اور تکلیف سے صندلی کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اس نے منہ پھاڑ کر چیخنے کی کوشش کی۔ مگر آواز نہ نکلی۔ قیصر مرزا نے اس پر ذرا ترس نہ کھایا۔ اپنی گرفت مضبوط کی اور اس زور سے دھکا دیا کہ وہ دیوار سے ٹکرا کر گری اور دُور تک لڑھکتی چلی گئی۔

صندلی نے اف تک نہ کی۔ آنکھیں بند کئے فرش پر پڑی رہی۔ وہ رک، رک کر سانس لے رہی تھی۔ وہ اس وقت لاش کی مانند بے جان نظر آرہی تھی۔

قیصر مرزا نے بڑھ کر دروازہ کھولا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔ غلام گردش میں گہرا

سناٹا تھا۔ آس پاس کوئی نہ تھا۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے آگے بڑھا۔ ارجمند سلطانہ کی خواب گاہ کے سامنے پہنچ کر رک گیا۔ دروازہ بند تھا۔ وہ ذرا دیر تک خاموش کھڑا ہانپنے کے سے انداز میں گہری گہری سانسیں بھرتا رہا۔ جب ذرا قرار آیا تو اس نے دستک دینے کے لئے دروازے پر جھکتے ہوئے ہاتھ رکھا۔ لیکن ہاتھ رکھتے ہی دروازہ آہستہ سے چرچرایا اور ایک پٹ ذرا سا کھل گیا۔

مگر وہ اندر نہ گیا۔ دروازے کے سامنے تذبذب کے عالم میں کھڑا رہا اور سوچتا رہا کہ اُسے کمرے میں جانا چاہیئے یا نہیں۔ خدشہ یہ تھا کہ بلا اجازت اندر جانے پر ارجمند سلطانہ خفگی کا اظہار نہ کریں۔ اُسے رہ رہ کر صندلی یاد آرہی تھی جو اُسے روکنے پر بضد تھی۔ وہ کوئی فیصلہ نہ کرسکا۔ گُم صُم کھڑا رہا۔ کمرے میں سکوت طاری تھا۔ اسی اثناء میں قدموں کی آہٹ اُبھری۔ قیصر مرزا چاپ سُن کر گھبرا گیا۔ اُس نے پلٹ کر دیکھا۔ غلام گردش ہنوز سُنسان تھی۔ لیکن چاپ دم بہ دم قریب آتی جا رہی تھی۔ قیصر مرزا کی گھبراہٹ برابر بڑھتی جارہی تھی۔ پھر ایک لمحہ ایسا آیا کہ وہ آگے بڑھا اور کمرے میں داخل ہو گیا۔

☆

دیوار گیریوں سے گہری سُرخ روشنی پھوٹ رہی تھی۔ در و دیوار پر گویا شعلے دہک رہے تھے۔ فضا میں تیز خوشبو رچی ہوئی تھی۔ خواب گاہ کا ماحول نہایت ہیجان انگیز تھا۔ قیصر مرزا نے آہستہ سے پردہ سرکایا اور ٹھٹھک کر رہ گیا۔

کمرے میں گہری خاموشی چھائی تھی۔ قیصر مرزا دہلیز کے پاس کھڑا تھا۔ اس نے دیکھا۔ رانی حیدر گڑھ سُرخ بانات کی ایک چوڑی چکلی کُرسی پر خاموش بیٹھی تھیں۔ ان کے عین مقابل، قدِ آدم آئینہ تھا۔ جس میں ان کے نصف چہرے کی ہلکی سی جھلک نظر آرہی تھی۔

قیصر مرزا چند لمحے سہما ہوا کھڑا رہا، پھر اس نے قدم بڑھایا اور آہستہ آہستہ

ارجمند سلطانہ کی جانب بڑھنے لگا۔ لیکن وہ بدستور خاموش بیٹھی رہیں۔ انھوں نے مڑکر قیصر مرزا کی طرف نہ دیکھا۔ اب وہ سرخ کے بجائے سیاہ لباس پہنے ہوئے تھیں۔

قیصر مرزا ان کے عقب میں جاکر کھڑا ہوگیا۔ اس نے جھجکتے ہوئے نظریں اٹھائیں۔ ان کو نظر بھر کر دیکھا اور اس طرح چونک پڑا جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ ان کے بال خوب سیاہ اور چمکدار تھے۔ خوشبو سے مہک رہے تھے۔ مگر غور سے دیکھنے پر صاف اندازہ ہوتا تھا کہ بالوں کو خضاب لگاکر سیاہ کیا گیا تھا۔ عمدہ میک اپ کے باوجود آنکھوں کے حلقوں کے نیچے ہلکی ہلکی جھرّیاں صاف نظر آتی تھیں۔

وہ ٹکٹکی باندھے بجھی بجھی نظروں سے ارجمند سلطانہ کو دیکھتا رہا۔ اس کی سانس کی رفتار سُست پڑ گئی تھی۔ وہ اس وقت کچھ ایسے عالم میں تھا کہ نہ حیرت تھی، نہ استعجاب۔ نہ دُکھ کی خلش تھی۔ نہ زخم کی کسک۔ نہ کوئی پشیمانی تھی نہ جھنجھلاہٹ۔ نہ معلوم سا بوجھ تھا۔ جس کے احساس سے وہ نیچے اور نیچے دھنستا جا رہا تھا۔

سرخ روشنی کا جال شیشے کی طرح چکنا چور ہوکر بکھر گیا تھا اور اس کے اندر سے اندھیرا اژدہے کی مانند پھنکارتا ہوا ابھر رہا تھا۔

ارجمند سلطانہ ہنوز خاموش بیٹھی تھیں۔ نہ وہ اس کی جانب متوجّہ ہوئیں۔ نہ زبان سے ایک لفظ نکالا، نہ جسم کو حرکت دی۔

قیصر مرزا نے جھجکتے ہوئے رسان سے کہا۔ ”رانی صاحبہ!“ اس کی آواز میں ہلکی ہلکی کپکپاہٹ تھی۔

ارجمند سلطانہ نے جواب نہ دیا۔ اسی طرح چپ بیٹھی رہیں۔

قیصر مرزا نے لمحہ بھر رک کر ان کو پھر مخاطب کیا۔ لیکن وہ خاموش رہیں۔

اس نے رک رک کر ان کو مخاطب کیا اور ہر بار اس کی آواز کمرے میں چھائے ہوئے پراسرار سکوت میں ابھر کر ڈوب گئی۔ ارجمند سلطانہ کے نہ تو ہونٹ ہلے اور نہ انھوں نے مڑ کر اس کی جانب دیکھا۔ ان کی نظریں آئینے کی سمت اٹھی ہوئی تھیں اور ایک جگہ جم کر رہ گئی تھیں۔

قیصر مرزا کسی انجانے خوف سے پریشان ہو گیا۔ وہ قدم اٹھا کر قریب پہنچ گیا۔ اس نے دھڑکتے دل سے ہاتھ بڑھایا۔ ارجمند سلطانہ کے کندھے پر رکھا۔ آہستہ سے جھنجوڑ کر گویا ہوا۔ "رانی صاحبہ!" اور رانی صاحبہ کا کرسی کی پشت سے ٹکا ہوا سر ایک طرف ڈھلک گیا۔

وہ دہشت زدہ ہو کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ عین اس وقت دروازے پر آہٹ ہوئی۔ قیصر مرزا نے پلٹ کر دیکھا۔ سامنے صندلی کھڑی تھی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ ابرو کھنچے تھے۔ آنکھیں سرخ تھیں۔ چہرے پر جھنجھلاہٹ تھی۔

دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ لیکن خاموش رہے اور جہاں تھے وہیں کھڑے رہے۔

آخر صندلی آگے بڑھی اور جب نزدیک پہنچ گئی تو قیصر مرزا نے کہا۔

"صندلی! تم نے بہت دیر کر دی۔"

صندلی نے مڑ کر اس کو تیکھی نظروں سے دیکھا۔ لیکن زبان سے کچھ نہ کہا۔

قیصر مرزا نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ "رانی صاحبہ گزر گئیں۔ ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئیں۔"

"نہیں، یہ نہیں ہو سکتا۔" صندلی چیختی ہوئی آگے بڑھی اور رانی حیدر گڑھ کے قدموں سے چمٹ گئی۔ "ہائے اللہ! یہ کیا ہو گیا۔"

رانی حیدر گڑھ واقعی مر چکی تھیں۔ ان کا جسم سرد پڑ گیا تھا۔ قیصر مرزا نے ہاتھ بڑھا کر ان کی کھلی ہوئی بے جان آنکھوں کو بند کر دیا۔

صندلی ان کے قدموں پر پڑی سسکیاں بھر کر روتی رہی۔ قیصر مرزا خاموش کھڑا رہا۔ ان کی کرسی کے قریب میز تھی۔ جس پر ان کا داہنا ہاتھ ٹکا ہوا تھا۔ ہاتھ کے نیچے کھلا ہوا ایک خط رکھا تھا۔ قیصر مرزا کی نظر خط پر پڑی تو چونکا۔ اب تک اس نے خط دیکھا ہی نہ تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر خط اٹھا لیا اور اسے پڑھنے لگا۔ خط میں لکھا تھا۔

رانی صاحبہ، آداب!
سخت شرمندہ ہوں کہ آپ کا وہ بقیہ دن آج واپس نہیں کر سکتا جسے دینے کا میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا۔ بات یہ ہے کہ میری بیٹی نیلما کی طبیعت اچانک بگڑ گئی۔ سہ پہر سے اس پر دو بار دورہ پڑ چکا ہے۔ ایسی صورت میں آپ خود اندازہ لگا سکتی ہیں کہ میں اپنا وعدہ کیسے نبھا سکتا ہوں۔ آپ کا یہ آخری دن میری طرف واجب الادا ہے۔ اگر نیلما کی طبیعت جلد سنبھل گئی تو میں عنقریب آپ کا قرض چکانے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ اُمید ہے میری مجبوری کو محسوس کرتے ہوئے آپ مجھے معاف کر دیں گی۔

خط نہایت بچکانہ تحریر میں لکھا گیا تھا۔ حروف اس قدر ٹیڑھے بیڑھے تھے کہ رک رک کر پڑھنا پڑتا تھا۔ خط کے آخر میں پروفیسر رگھوناتھ سانیال کے دستخط تھے۔

قیصر مرزا خط ہاتھ میں لئے حسرت انگیز نظروں سے رانی حیدر گڑھ کو دیکھتا رہا۔ جن کی لاش ابھی تک کرسی پر پڑی تھی۔ صندلی ان کے قدموں میں بیٹھی زار و قطار رو رہی تھی۔ اس کی سسکیاں وقفے وقفے سے کمرے کی خاموشی میں اُبھر رہی تھیں۔

(۱۲)

گھڑیال نے ایک بجایا۔
صندلی آنسو پونچھتی ہوئی اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اُس نے سرسری نظروں سے قیصر مرزا کو دیکھا، پھر آگے بڑھی اور دیوار گیریوں میں جھلملاتی ہوئی روشنیوں کو گل کرنے لگی۔ وہ سائے کی مانند آہستہ آہستہ اِدھر اُدھر آجا رہی تھی۔
اب صرف ایک شمع رہ گئی تھی۔ جو رانی حیدر گڑھ کی لاش کے قریب رکھے ہوئے لیمپ میں روشن تھی۔ اس کی دھندلی دھندلی روشنی میں رانی حیدر گڑھ کے بے جان

چہرے کی رنگت مٹیالی پڑ گئی تھی۔ جھریاں اور نمایاں ہو گئی تھیں۔ وہ اب بوڑھی اور بُڈھی نظر آ رہی تھیں۔

قیصر مرزا گم صم کھڑا تھا۔ وہ صندلی کو دیکھتا رہا، جس نے خواب گاہ کی تیز روشنی کو بہت مدھم کر دیا تھا۔ قیصر مرزا نے پروفیسر سانیال کا خطاب میز پر رکھ دیا تھا۔ صندلی نے اس کی جانب مطلق توجہ نہ دی، نہ ہی رانی حیدر کے بے جان جسم کو ہاتھ لگایا۔ وہ قیصر مرزا کے قریب پہنچی اور سرگوشی کی۔ "باہر آ جائیے۔" قیصر مرزا چپ رہا۔ صندلی دروازے کی جانب بڑھی۔ قیصر مرزا اس کے ساتھ ساتھ چلا۔

کمرے سے نکل کر دونوں باہر آئے۔ غلام گردش پر سناٹا طاری تھا۔ دونوں آگے بڑھے۔ مگر غلام گردش سے باہر نہ گئے۔ قریب ہی ایک سہ دری تھی۔ صندلی اس میں داخل ہوئی اور ایک محراب کے ستون سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔ قیصر مرزا اس کے نزدیک ہی موجود تھا۔ سہ دری میں روشنی بہت مدھم تھی۔ خواب گاہ سامنے ہی تھی اور اس کے جھروکوں سے پھوٹتی ہوئی ہلکی ہلکی شعاعیں سہ دری کو روشن کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ اس روشنی میں دونوں سایوں کی مانند نظر آ رہے تھے۔

سہ دری کے عقبی حصے میں ایک دروازہ تھا۔ صندلی نے گردن کو خم دے کر دروازے کو دیکھا۔ چند لمحے تک اُسے دیکھتی رہی۔ پھر آگے بڑھی۔ آہستہ سے دروازے کو دھکا دیا۔ دروازہ کھل گیا۔ صندلی اندر داخل ہوئی۔ قیصر مرزا بھی اس کے پیچھے پیچھے چلا۔ یہ مختصر سا حجرہ تھا۔ اُس کے عقب میں کشادہ غلام گردش تھی۔ حجرے میں کوئی کھڑکی نہ تھی۔ البتہ دیواروں میں جالی لگے ہوئے جھروکے تھے۔ ان سے چھن کر غلام گردش کی دیوارگیریوں کی روشنی اندر آ رہی تھی۔ اس دھندلی روشنی میں قیصر مرزا نے دیکھا، دائیں ہاتھ کی دیوار میں ایک اونچا طاق تھا جس میں شمع دان رکھا تھا۔ اس کے قریب ہی دیا سلائی بھی موجود تھی۔ صندلی نے دیا سلائی اٹھائی اور شمع دان کی اکلوتی موم بتی روشن کر دی۔

حجرے میں ایک طرف لکڑی کا تخت تھا۔ اس پر بوسیدہ غالیچہ بچھا تھا۔

قیصر مرزا نے حیرت سے دیکھا ایک سیاہ رنگ کی موٹی تازی بلی غالیچے پر نہایت اطمینان سے بیٹھی تھی۔ موم بتی روشن ہوئی تو اس نے اپنے بدن کو جنبش دی۔ تیز چمکتی ہوئی آنکھوں سے دونوں کو گھور کر دیکھا اور دم پھلا کر آہستہ، آہستہ غرانے لگی۔ لیکن ذرا ہی دیر بعد وہ کود کر نیچے گئی اور خاموشی سے باہر چلی گئی۔

صندلی نے تخت کی جانب ہاتھ اٹھا کر قیصر مرزا سے کہا۔ "تشریف رکھیئے۔" اس تمام عرصہ میں وہ پہلی بار بولی تھی۔ قیصر مرزا نے کچھ نہ کہا۔ چپ چاپ تخت پر بیٹھ گیا۔ صندلی بھی تخت کے ایک سرے پر بیٹھ گئی۔ دونوں خاموش تھے اور سروں کو جھکائے گہری سوچ میں غرق تھے۔

قیصر مرزا مسلسل بوڑھے پروفیسر کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اسے رہ رہ کے اس پر غصہ آرہا تھا۔ اس نے وعدہ خلافی کر کے رانی حیدر گڑھ کو اس قدر شدید صدمہ پہنچایا تھا۔ جس سے وہ جانبر نہ ہو سکیں اور اب ان کا بے جان جسم خوابگاہ میں پڑا تھا، آس پاس کوئی نہ تھا۔

دروازے پر ہلکی سی آہٹ ہوئی۔ دونوں نے چونک کر سہمی ہوئی نظروں سے اس طرف دیکھا۔ کالی بلی حجرے میں داخل ہو رہی تھی۔ مگر وہ ان کے قریب نہ آئی۔ سامنے دیوار کے پاس خاموشی سے لیٹ گئی۔

قیصر مرزا نے صندلی کو مخاطب کیا۔ "صندلی!" وہ اپنی بات کہتے کہتے لمحہ بھر کے لئے ٹھٹکا۔ "تم نے ابھی تک محل میں کسی کو رانی صاحبہ کے انتقال کی اطلاع نہیں دی۔"

"بہت دیر سے یہی سوچ رہی تھی۔"

"تم نے کیا طے کیا؟" قیصر مرزا نے دریافت کیا۔

"میرا خیال ہے کہ مجھے صبح ہونے کا انتظار کرنا چاہیئے۔" صندلی نے بتایا۔

"کیوں؟" قیصر مرزا نے حیران ہو کر پوچھا۔

"اس خبر کے پھیلتے ہی ہر طرف کہرام برپا ہو جائے گا۔"

"یہ تو ہو گا۔"

"میں چاہتی ہوں کہ آپ جب یہاں سے چلے جائیں تو یہ اطلاع سب کو پہنچائی جائے۔" صندلی نے جھجکتے ہوئے کہا۔

قیصر مرزا اس کی بات کی تہہ تک نہ پہنچ سکا۔ حیرت سے صندلی کا منہ تکنے لگا۔

"آپ کا اب محل میں ٹھہرنا مناسب نہیں۔" صندلی نے اپنے خدشہ کا اظہار کیا۔ "ہو سکتا ہے، آپ خواہ مخواہ کسی مصیبت میں پھنس جائیں۔"

"لیکن اس وقت تو میں لکھنؤ جا نہیں سکتا۔" قیصر مرزا نے گھبرا کر اپنی مجبوری کا اظہار کیا۔ "کوئی سواری نہیں ملے گی۔" اس نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ "لاری بھی صبح ہی ملے گی۔"

"ہاں اس وقت تو جانے کے لئے کوئی سواری نہیں ملے گی۔" صندلی نے بھی اتفاق رائے کیا۔

"اگر ڈرائیور چاہے تو مجھے واپس پہنچا سکتا ہے۔" قیصر مرزا نے تجویز پیش کی۔ "تم جا کر اس سے بات کرو۔ شاید وہ تیار ہو جائے۔"

"مگر پہلے رانی صاحبہ کے انتقال کی اطلاع دینا ہو گی۔" صندلی رضامند نہ ہوئی۔ "ابھی میں کسی کو یہ بتانا نہیں چاہتی۔"

قیصر مرزا نے اصرار کرنے سے گریز کیا۔

☆

حجرے میں سکوت طاری تھا۔ سیاہ بلی دیوار سے پیٹھ ٹکائے چپ چاپ لیٹی تھی۔ وہ بار بار اپنی تیز چمکتی آنکھوں سے دونوں کو دیکھتی اور پھر آنکھیں بند کر لیتی۔ اس کے جسم کے سیاہ بال روشنی میں مخمل کی طرح نرم اور چمکدار نظر آ رہے تھے۔

قیصر مرزا حجرے میں چھائے ہوئے سکوت سے اُکتا گیا۔ چند لمحے کھوئی کھوئی نظروں سے طاق میں رکھے ہوئے شمع دان کی جھلملاتی ہوئی موم بتی دیکھتا رہا، پھر مڑ کر صندلی کو

دیکھا۔ وہ نظریں جھکائے گم صم بیٹھی تھی۔ اس کے چہرے پر گہری افسردگی چھائی تھی اور آنکھیں ویران اور بجھی بجھی معلوم ہو رہی تھیں۔

صندلی کو اس عالم میں دیکھ کر قیصر مرزا کو معاً وہ تصویر یاد آ گئی جو ارجمند سلطانہ عشرت منزل میں اس کے پاس چھوڑ گئی تھیں۔ قیصر مرزا نے صندلی کے چہرے کو بغور دیکھا۔ اس کا جائزہ لیا اور پوری توجہ سے اسے دیکھنے لگا۔ صندلی اس کی نگاہوں سے بے خبر کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ لیکن اس کے چہرے کی ساخت میں، اس کی آنکھوں اور نقش و نگار میں کوئی ایسی بات ضرور تھی جسے دیکھ کر قیصر مرزا کو برابر رانی حیدر گڑھ کی تصویر کا خیال آ رہا تھا۔

قیصر مرزا زیادہ دیر اپنے تجسس پر قابو نہ رکھ سکا۔ اس نے دبی زبان سے پوچھا۔ "صندلی! نہ معلوم کیوں مجھے بار بار یہ محسوس ہو رہا ہے کہ تم میں رانی صاحبہ کی بہت شباہت پائی جاتی ہے۔"

صندلی نے گردن کو خم دے کر قیصر مرزا کی طرف دیکھا اور بڑی بے رخی سے جواب دیا۔ "یہ بات آپ ایک بار پہلے بھی کہہ چکے ہیں۔" اس کے رویے سے جھنجھلاہٹ آشکارہ تھی۔

قیصر مرزا سٹ پٹا کر رہ گیا۔ مزید استفسار کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ صندلی کی ناگواری کا اُسے بخوبی اندازہ ہو گیا تھا مگر وہ خاموش رہنا بھی نہ چاہتا تھا۔ حجرے کی گھٹی ہوئی فضا سے اُسے وحشت معلوم ہو رہی تھی۔ ذرا دیر چپ رہنے کے بعد اس نے رسان سے کہا۔ "صندلی! سویرا ہونے میں ابھی بہت دیر ہے۔ مجھے یہاں سخت گھٹن محسوس ہو رہی ہے۔" اس نے قدرے تامل کیا۔ "کیا یہ مناسب نہ ہو گا کہ کسی اور کمرے میں جا کر بیٹھا جائے اور سویرا ہونے کا انتظار کیا جائے۔" اس نے کھل کر اپنی ذہنی الجھن کا اظہار کیا۔

"بہتر یہی ہے کہ آپ یہیں بیٹھے رہیں۔" صندلی نے اس کی حوصلہ افزائی نہ کی۔ "چند گھنٹے کی تو بات ہی ہے۔ صبح بھی ہو جائے گی۔" اس دفعہ اس کے لہجے میں تلخی کے بجائے نرمی تھی۔ "آپ تنہا نہیں ہیں۔ میں بھی تو آپ کے ساتھ ہی یہاں بیٹھی ہوں۔"

قیصر مرزا نے اس سے اختلاف رائے نہ کیا۔ خاموش بیٹھا رہا۔ اب اُسے ایک

بار پھر پروفیسر سانیال کا خیال آرہا تھا۔ اُس نے دریافت کیا۔ "کیا بوڑھا پروفیسر کل شام یہاں آیا تھا؟" دل کی بات بے ساختہ زبان پر آگئی۔

"جی نہیں۔" صندلی کے لہجے سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ قیصر مرزا کا سوال اُسے ناگوار گزرا تھا۔ "وہ یہاں کبھی نہیں آیا۔"

"پھر وہ خط کون لایا تھا جو رانی صاحبہ کی کرسی کے قریب میز پر رکھا تھا؟" قیصر مرزا نے جھجکتے ہوئے دریافت کیا۔

"میں نے وہ خط نہیں دیکھا۔" صندلی نے بے زاری سے کہا۔ "مجھے اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔"

قیصر مرزا نے صندلی کی بے زاری کو محسوس کیا مگر خاموش نہ رہا۔ آہستہ سے بولا۔ "میں نے اس خط کو پڑھا تھا۔"

"اچھا!" صندلی نے اس دفعہ بے نیازی کا اظہار کیا۔

"میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ وہ خط کون لایا تھا؟" قیصر مرزا باز نہ آیا۔ اس نے کرید کر پوچھا۔

"کوئی نہیں۔" صندلی نے مختصر جواب دیا۔

"کیا مطلب؟" قیصر مرزا نے چونک کر اپنے ردّ عمل کا اظہار کیا۔ وہ حیرت زدہ نظر آرہا تھا۔

صندلی نے اس کے سوال کا کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے مڑ کر اس طرح تیکھی نظروں سے دیکھا کہ قیصر مرزا گھبرا گیا۔ اس نے نرمی سے کہا۔ "صندلی! تم مجھ سے کچھ ناراض ہو؟"

"یہ میری کہاں مجال۔" صندلی کے لہجے میں گہرا طنز تھا۔ "آپ ٹھہرے رئیس زادے۔ رانی صاحبہ کے مہمان اور میں ان کی ایک معمولی خادمہ۔ میں اپنی اوقات اچھی طرح جانتی ہوں۔ بھول گئی تھی تو آپ نے یاد دلادیا۔"

"تم خواہ مخواہ الٹی سیدھی باتیں سوچ رہی ہو۔"

"الٹی سیدھی باتیں۔" صندلی نے اُسے مزید بولنے نہ دیا۔ اس کے ہونٹوں پر زہر خند

تھا۔" کیا وہ آپ کے علاوہ کوئی اور تھا جس نے ذرا ہی دیر پہلے مجھے نہایت حقارت سے دھکا دے کر اپنے سامنے سے ہٹا دیا تھا۔" اس نے اپنا سر سامنے کر دیا۔" یہ دیکھئے اس کی نشانی بھی موجود ہے۔"

قیصر مرزا نے دیکھا، صندلی کے بالوں کی جڑوں میں کنپٹی سے اوپر ابھی تک گہرا سُرخ خون منجمد تھا۔ اُسے دیکھ کر وہ گھبرا گیا۔ اظہار پشیمانی کی غرض سے صفائی پیش کرنے لگا۔ "نہ جانے مجھے اس وقت کیا ہو گیا تھا۔ بالکل ہوش وحواس کھو بیٹھا تھا۔ معلوم نہیں وہ کانی کیسی تھی۔ پیتے ہی عجیب حالت ہو گئی۔ واقعی میں نے تمہارے ساتھ بہت بد سلوکی کی۔ تم کو بہت دکھ پہنچایا۔ سچ کہتا ہوں مجھے تو اپنا بھی ہوش نہ رہا تھا۔"

"آپ کو تو اس وقت ایک ہی دُھن تھی، ایک ہی سودا سر میں سمایا تھا۔" صندلی نے تیکھے لہجے میں کہا۔" اور وہ تھا رانی صاحبہ کا خیال۔"

"صندلی! اب یہ بات نہ یاد دلاؤ، مجھے تکلیف ہوتی ہے۔" قیصر مرزا نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔" اگر مجھے وہ خبیث پروفیسر مل جائے تو جی چاہتا ہے کہ اس کا گلا گھونٹ دُوں۔"

صندلی کچھ نہ بولی۔ خاموش بیٹھی زیرِ لب مسکراتی رہی۔

قیصر مرزا نے اس کی معنی خیز مسکراہٹ سے بے نیاز ہو کر پوچھا۔" تم نے مجھے اب تک یہ نہیں بتایا کہ پروفیسر سانیال کا خط رانی صاحبہ کے پاس پہنچا کس طرح؟" اس نے قدرے توقف کے بعد کہا۔" مگر اس خط سے مجھے یہ اندازہ ہو گیا کہ وہ اس وقت لکھنؤ میں موجود ہے۔"

صندلی ہنوز مسکراتی رہی۔ یہ مسکراہٹ نہ تھی زہر خند تھا۔

"کیا بات ہے صندلی؟" قیصر مرزا نے حیران و پریشان ہو کر پوچھا۔" تم میری کسی بات کا جواب نہیں دے رہی ہو؟ ابھی تک ناراض ہو مجھ سے؟"

"نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں۔"

"کوئی نہ کوئی بات تو ہے۔"

صندلی پھر خاموش ہو گئی۔ صرف مسکراتی رہی۔

قیصر مرزا جل کر بولا۔" اگر تم کو میری موجودگی ناگوار گزر رہی ہے تو چلا جاؤں یہاں سے۔"

"ارے آپ تو ایک دم خفا ہو گئے"۔ صندلی نے آہستہ سے کہا۔

قیصر مرزا کچھ نہ بولا۔ مُنہ پھلائے چپ بیٹھا رہا۔ اس کی تیوری پر بل پڑے تھے۔ چہرے پر جھنجھلاہٹ چھائی تھی۔

صندلی نے اس کی خفگی کو محسوس کیا۔ نرم لہجے میں بولی۔ "کتنی باتیں ایسی ہیں جن کے بارے میں آپ کو کچھ خبر نہیں۔ اب اس خط ہی کو لیجیے، جس کا آپ بار بار ذکر کر رہے ہیں۔" وہ اپنی بات کہتے کہتے اچانک رک گئی۔

"تم خاموش کیوں ہو گئیں؟" قیصر مرزا نے بے چین ہو کر استفسار کیا۔ "آخر یہ خط آیا کہاں سے؟"

"کہیں سے بھی نہیں"۔ وہ جھجکتے ہوئے بولی۔ "یہ خط کچھ ہی دیر پہلے لکھا گیا تھا۔"

"کس نے لکھا تھا اسے؟" قیصر مرزا کی بے چینی میں اور اضافہ ہو گیا۔

"میرا خیال ہے اُسے خود رانی صاحبہ نے لکھا تھا۔"

قیصر مرزا ششدر رہ گیا۔ اس کے مُنہ سے بے ساختہ نکلا۔ "واقعی؟" پھر یقین نہ آنے کے انداز میں دریافت کیا۔ "نہیں صندلی، ایسا کس طرح ہو سکتا ہے؟"

"میں آپ سے جھوٹ نہیں بول رہی ہوں۔" صندلی نے اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کی کوشش کی۔ "جب سے آپ یہاں آئے ہیں۔ میرے علاوہ رانی صاحبہ کے پاس کوئی نہیں گیا۔ کسی کو اجازت ہی نہیں تھی۔ ایسی صورت میں۔"

قیصر مرزا نے اُسے اپنی پوری بات نہ بتانے دی۔ بیچ میں بول اٹھا۔ "ہو سکتا ہے کہ جب تم میرے پاس تھیں، تمہاری غیر حاضری میں کوئی نہایت رازداری سے یہ خط پہنچا گیا ہو۔"

"جی نہیں، ایسا کوئی امکان نہیں۔" وہ اپنی بات پر اڑی رہی۔

قیصر مرزا کے ذہن کو جھٹکا لگا۔ وہ شش و پنج میں مبتلا ہو گیا۔ اگر صندلی کی بات درست تھی تو پھر ارجمند سلطانہ کی نوجوانی کا آخری دن، پروفیسر مانیال، اس کی دائم المریض بیٹی، یہ سب کیا تھا؟ اس کے ذہن میں طرح طرح کے شبہات کلبلانے لگے۔

اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "تم کو یہ تو معلوم ہو گا صندلی کہ پروفیسر سانیال آجکل کہاں ہے؟"

"کیوں؟" صندلی نے جواب دینے کے بجائے اُلٹا اس سے سوال کیا۔ "آپ اس سے ملنا چاہتے ہیں؟"

"ہاں!" اس نے صاف گوئی سے کام لیا۔ وہ واقعی پروفیسر سانیال سے ملنا چاہتا تھا تاکہ اس راز کا سراغ لگا سکے جس نے اسے شدید ذہنی انتشار میں مبتلا کر دیا تھا۔ "صندلی! میں اس سے ایک بار ضرور ملنا چاہتا ہوں۔"

"مگر آپ اس سے کبھی نہیں مل سکیں گے۔"

"کیوں؟" وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر بولا۔

"اس لئے کہ وہ رانی صاحبہ کے ساتھ ہی مر گیا۔" صندلی نے نہایت سنجیدگی سے بتایا۔

قیصر مرزا بھونچکا ہو کر صندلی کا منہ تکنے لگا۔ چند لمحے اسی عالم میں بیٹھا رہا۔ پھر اس نے دریافت کیا۔ "کیا پروفیسر بھی مر گیا؟"

صندلی اس کی سادہ لوحی پر جھنجھلا کر بولی۔ "آپ بھی بڑے عجیب و غریب واقع ہوئے ہیں۔" اس نے تامل کیا پھر رسان سے کہا۔ "مجھے تو اب آپ پر ترس آنے لگا ہے۔"

"میں سمجھا نہیں تم کہنا کیا چاہتی ہو۔"

"دیکھئے صاف بات یہ ہے کہ نہ تو کوئی پروفیسر سانیال تھا اور نہ ہی اس کی کوئی بیٹی دیٹی تھی۔ دونوں ان کے اپنے ذہن کی پیداوار تھے اور یہ خیال کوئی قصہ کہانی پڑھ کر یا کسی سے سُن کر ان کے ذہن میں آیا تھا۔" صندلی نے قیصر مرزا کو مطلع کیا۔ "بہر حال ان دونوں کے نام پر یہ کھیل کئی سال سے اس محل میں کھیلا جا رہا تھا۔ نہ معلوم آپ کی طرح کتنوں کو اسی طرح رات کے سناٹے میں بلایا گیا۔ ان کے ساتھ نت نئے سوانگ رچائے گئے۔ ان کو مختلف طریقوں سے طرح طرح کی نشہ آور اشیاء پلا کر مدہوش اور دیوانہ بنایا جاتا، بالکل اسی طرح جیسے چند گھنٹے پہلے آپ کی حالت ہو رہی تھی۔ اُن سب کی دیوانگی کا نشانہ مجھے بننا پڑتا۔ مجھ پر کیا کیا بیتی۔ میری کیا کیا درگت بنی، اس کا کچھ اندازہ تو آپ بھی لگا سکتے ہیں۔"

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو صندلی، میں نے بھی تم پر بہت ظلم ڈھایا۔" قیصر مرزا نے معذرت کے انداز میں اعتراف کیا۔ "سچ پوچھو تو مجھے اتنا ہوش ہی نہ رہا تھا کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ کچھ عجب سی حالت ہو رہی تھی۔"

"آپ نے تو صرف دھکا ہی دیا تھا۔ سر میں سے تھوڑا سا خون بہہ گیا۔" صندلی کے چہرے پر افسردگی چھا گئی۔ لہجہ رقت انگیز ہو گیا۔ "یہاں تو ایسے وحشی بھی آئے کہ میں ان کے ظلم و ستم کے بارے میں آپ سے اب کیا کیا بتاؤں۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "ہائے اللہ! مجھ پر کیا کیا ستم نہ ڈھایا گیا۔"

"رانی صاحبہ کو ان تمام باتوں کا علم تھا؟" قیصر مرزا نے دریافت کیا۔

"کیوں نہیں تھا؟" صندلی نے جھنجھلا کر بتایا۔ "میرے ذمّہ کام ہی یہ تھا کہ راتوں کو محل میں آپ کی طرح کے آنے والوں کی آگ بھڑکاؤں۔ اپنی جوانی داؤں پر لگا کر اُنھیں مدہوش اور دیوانہ بناؤں اور ان کی دیوانگی ہنس ہنس کر برداشت کروں۔ ہر ظلم و ستم پر خاموش رہوں۔ یہاں تک کہ رات آدھی ہو جائے اور رانی صاحبہ کے کمرے کی تمام روشنیاں گُل ہو جائیں۔"

قیصر مرزا کے لئے یہ انکشاف سخت حیرت انگیز تھا۔ وہ آنکھیں پھاڑے صندلی کی ایک ایک بات دلچسپی اور توجہ سے سُنتا رہا۔ اُسے ٹوکنے کی کوشش نہ کی۔ لیکن صندلی بات کہتے کہتے اچانک خاموش ہو گئی۔

قیصر مرزا بھی چند لمحے خاموش رہا مگر اس کا تجسّس برقرار رہا۔ آخر اس نے دریافت کیا۔ "صندلی، یہ تو بتاؤ، رانی صاحبہ کی یہ اچانک موت کس طرح واقع ہوئی؟" اس کا لہجہ مدھم اور رازدارانہ ہو گیا۔ "کسی نے ان کو قتل کر دیا؟"

"جی نہیں!" صندلی نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ "ان کو کسی نے قتل نہیں کیا۔ میرا خیال ہے انھوں نے زہر کھا لیا۔"

"خودکشی کر لی، مگر کیوں؟"

"یہ مجھے نہیں معلوم کہ انھوں نے ایسا کیوں کیا۔" صندلی نے بتایا۔ "جس وقت انھوں

نے خودکشی کی میں تو آپ کے پاس موجود تھی۔"

"مگر اس کی کوئی تو وجہ ہوگی۔" قیصر مرزا نے اصرار کیا۔ "تمہارا اس سلسلہ میں کیا خیال ہے؟"

"مجھے صرف اتنا معلوم ہے کہ میں جب آخری بار ان کے پاس گئی تھی تو ایک بات پر وہ مجھ سے سخت ناراض ہو گئی تھیں۔"

قیصر مرزا نے مداخلت کی۔ "کس بات پر؟"

"آپ ہی کے بارے میں ایک بات تھی۔" صندلی نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"کیا؟" قیصر مرزا نے بے چین ہو کر پوچھا صندلی نے قیصر مرزا کو دُزدیدہ نظروں سے دیکھا، پھر سر جُھکا لیا۔ آہستہ سے بولی "میں نہیں چاہتی تھی کہ آپ ان کے کمرے میں جائیں۔" اس نے قدرے تامّل کیا پھر بتایا۔ "میں نے ان سے صاف صاف کہہ دیا کہ اب یہ کھیل ختم ہو جانا چاہیئے۔ میری بات سُنتے ہی وہ ایک دم بپھر گئیں۔ میں سر جھکائے کھڑی رہی اور وہ مجھ پر برستی رہیں۔ پھر انہوں نے غصّے سے میرے مُنہ پر تھپّڑ مارا۔ میں نے زبان سے ایک لفظ نہ نکالا، البتہ میرے آنسو نکل پڑے۔" صندلی اپنی بات کہتے کہتے کسی سوچ میں کھو گئی۔

قیصر مرزا نے کرید کر پوچھا۔ "پھر کیا ہوا؟"

"مجھے روتے دیکھ کر نہ جانے ان کو کیا خیال آیا کہ مجھے گلے سے لگایا اور خود بھی رونے لگیں۔" صندلی نے بتایا۔ "انھوں نے مجھ سے کچھ بتایا تو نہیں مگر مجھے یہ اندازہ ضرور ہوا کہ وہ بہت پشیمان تھیں۔ خود سے نفرت کرنے لگی تھیں۔"

"مگر تم نے ایسی کونسی بات کہی کہ ان کو اس قدر صدمہ پہنچا کہ خودکشی کر لی۔"

"میں نے کبھی نافرمانی نہیں کی تھی۔ ہر ستم سہا مگر کبھی اُف نہ کی۔" صندلی نے قیصر مرزا کو صاف بات نہ بتائی صرف اتنا کہا۔ "پہلی بار میں نے ان کا حُکم ماننے سے انکار کیا تھا۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "میری اس سرکشی نے ان کا دل توڑ دیا۔ پہلے وہ سرخ لباس پہنے ہوئے تھیں۔ لگتا ہے کہ میرے جانے کے بعد انہوں نے سیاہ ماتمی لباس پہنا اور زہر کھا لیا۔"

"ہاں! یہ تو میں نے بھی دیکھا کہ وہ سیاہ لباس پہنے ہوئے تھیں۔" قیصر مرزا نے اس کی تائید کی۔

صندلی اس کی بات نظرانداز کرتے ہوئے بولی۔ "میں نے اچھا نہیں کیا۔" اس کے چہرے پر غم کے سائے پھیل گئے۔ آواز بھرّا گئی۔ "میری ہی وجہ سے ان کی جان گئی۔ میں ان کی قاتل ہوں۔" اس کی آنکھیں بھر آئیں اور آنسو ٹپ ٹپ رخساروں پر گرنے لگے۔

قیصر مرزا نے اس کی دل جوئی کی۔ "جو ہونا تھا ہو گیا۔ تم خواہ مخواہ خود کو پریشانی اور دکھ میں مبتلا نہ کرو۔ تم بالکل بے قصور ہو۔ ایک دن تو یہ کھیل ختم ہونا ہی تھا۔"

صندلی کچھ نہ بولی۔ سر جھکائے آنسو بہاتی رہی۔

"تم کو صدمہ تو پہنچے گا مگر میں یہ ضرور کہوں گا کہ رانی صاحبہ تھیں بہت خطرناک۔" قیصر مرزا نے دبی زبان سے اپنی نفرت کا اظہار کیا۔

"واقعی وہ بہت خطرناک تھیں۔" صندلی نے احتجاج کرنے کے بجائے اس کی رائے سے اتفاق کیا۔ "میں نے خود زندگی بھر ان سے نفرت کی۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "حالانکہ وہ میری ماں تھیں۔"

قیصر مرزا اس تازہ انکشاف پر ہکا بکا ہو کر صندلی کا منہ تکنے لگا۔ وہ سنبھل سنبھل کر بولتی رہی۔ "مجھے نہیں معلوم کہ میرا باپ کون ہے۔ میں نے اس کو کبھی نہیں دیکھا۔ خدا معلوم زندہ ہے کہ مر گیا۔" اپنی بات کہتے کہتے وہ لمحہ بھر کے لیے رکی۔ پھر اس نے کہا۔ "یوں تو میرا باپ بھی موجود ہے اور ماں بھی ہے جنھوں نے مجھے پالا پوسا ہے اور آج بھی میں انھی کے پاس رہتی ہوں۔"

"کون ہے وہ؟"

"رانی صاحبہ کے ڈرائیور کو تو آپ نے دیکھا ہو گا۔"

"وہی جو مجھے موٹر میں بٹھا کر یہاں لایا تھا؟" قیصر مرزا نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔ "اسے تو میں نے ایک بار پہلے بھی دیکھا تھا۔"

"جی ہاں وہی۔" صندلی نے بتایا۔ "میں بچپن ہی سے ان کے ساتھ رہتی ہوں۔ ان کا

نام نذیر خاں ہے۔"

"رانی صاحبہ کو معلوم تھا کہ تم اس راز کو جانتی ہو؟"

"پہلے ان کو شبہ تک نہ ہوا۔" صندلی نے قیصر مرزا کو مطلع کیا۔ "ہونا بھی نہ چاہیئے تھا۔ خود مجھے بھی کچھ اپنے بارے میں معلوم نہ تھا۔ یہ راز تو چند ہی مہینے پہلے مجھے معلوم ہوا۔ اور جب سے مجھے یہ معلوم ہوا ہے اسی وقت سے میں پیچ و تاب کھا رہی تھی۔ دل ہی دل میں سلگ رہی تھی۔ آخر جو دل میں تھا وہ کسی نہ کسی طرح زبان پر آ گیا۔ میں نے کھل کر تو کچھ نہیں کہا مگر مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میری آج کی باتوں سے اُن کو اندازہ ہو گیا تھا کہ میں اس راز سے واقف ہو گئی ہوں۔"

قیصر مرزا نے کوئی تبصرہ نہ کیا۔ چپ بیٹھا اس کی باتیں دلچسپی اور انہماک سے سنتا رہا۔ صندلی رک رک کر بولتی رہی۔ "میں قطعی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتی۔ یہ میرا خیال ہی خیال ہے۔ ہو سکتا ہے کہ مجھے آنسو بہاتے دیکھ کر ان کی ممتا جاگ اٹھی ہو۔"

"شاید ایسا ہی ہو۔"

"مگر ان کا انجام یہ نہیں ہونا چاہیئے تھا۔"

قیصر مرزا خاموش رہا۔ اس کے اعصاب اب شل ہو چکے تھے۔ وہ خود کو بے حد تھکا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ لیکن صندلی کے چہرے پر ایسا سکون تھا جو طوفان کے بعد محسوس ہوتا ہے۔ اس کے ذہن پر ایک عرصے سے جو بوجھ تھا، قیصر مرزا کو سب کچھ بتانے کے بعد اُتر گیا تھا۔ اب وہ خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔

☆

رات ختم ہو رہی تھی۔ شمع دان میں موم بتی اب بجھا چاہتی تھی۔ اس کی لو بار بار بھڑکتی۔ دور قصبے میں کہیں مرغ نے بانگ دی۔ یہ صبح کی آمد کا اعلان تھا۔

صندلی نے چونک کر قیصر مرزا کی جانب دیکھا۔ "سویرا ہوا چاہتا ہے۔ اب آپ کو محل سے چلا جانا چاہیئے۔" وہ اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ قیصر مرزا بھی فوراً کھڑا ہو گیا۔

دونوں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے حجرے سے باہر نکلے۔ غلام گردش ہنوز ویران تھی۔ بائیں ہاتھ کو ذرا ہٹ کر سامنے کے رُخ پر رانی حیدر گڑھ کی خواب گاہ تھی۔ اس کی جالیوں سے اب روشنی نہیں پھوٹ رہی تھی۔ شمع بجھ چکی تھی۔ خواب گاہ اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔

صندلی نے خواب گاہ میں جانے کی کوشش نہ کی۔ وہ مڑی اور آہستہ آہستہ قدم اٹھا کر غلام گردش میں چلنے لگی۔ قیصر مرزا اس کے ہمراہ تھا۔ روشنی کم تھی۔ لہٰذا دونوں سنبھل سنبھل کر چل رہے تھے۔ غلام گردش سے گزر کر دونوں ایک کشادہ برآمدے میں پہنچے۔ صندلی نے رک کر چوکنا نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ آگے بڑھی اور چند قدم چلنے کے بعد دائیں ہاتھ کو مڑ گئی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ قیصر مرزا سائے کی طرح اس کے ساتھ ساتھ تھا۔

دونوں ایک تنگ گلیارے میں داخل ہوئے اس میں روشنی اس قدر کم تھی کہ چند قدم کے فاصلے پر کچھ نظر نہ آتا تھا۔ احتیاط سے چلنے کے باوجود قیصر مرزا ایک بار لڑکھڑا کر فرش پر منہ کے بل گرنے سے بال بال بچا۔ صندلی نے فوراً اُسے خبردار کیا۔ "سنبھل کر چلئے آگے اور اندھیرا ہے۔" اس کی آواز بہت مدّھم تھی اتنی مدّھم گویا سرگوشی کر رہی ہو قیصر مرزا کچھ نہ بولا۔ خاموشی سے اس کے ہمراہ چلتا رہا۔

گلیارے کے اختتام پر ایک مختصر دروازہ تھا۔ صندلی نے آگے بڑھ کر آہستہ سے دروازے کی کنڈی کھولی اور ایک پٹ ہٹا کر باہر دیکھا۔ یہ محل کا پچھواڑہ تھا سامنے گھنے درخت اور خودرو پودوں کی جھاڑیاں تھیں۔ ہر طرف گہرا سناٹا تھا۔ اندھیرا تھا۔ آسمان پر بادل چھائے تھے۔ صندلی نے دروازے کا دوسرا پٹ بھی کھول دیا۔ اس نے گردن آگے بڑھائی اور چوکنا نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ آس پاس کوئی نہ تھا مگر وہ دروازے سے باہر نہ گئی۔

قیصر مرزا نے سرگوشی کی۔ "تم مجھے محل سے باہر جانے کا راستہ بتا دو۔ میں چلا جاؤں گا۔"

"نہیں آپ تنہا نہیں جائیں گے۔" صندلی نے آہستہ سے کہا۔ "میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گی۔ راستہ خراب ہے اور ابھی اندھیرا بھی ہے۔ آپ راستے سے بھٹک کر

نہ معلوم کس طرف نکل جائیں۔"

"تم مطمئن رہو۔ میں چلا جاؤں گا۔" قیصر مرزا نے اصرار کیا۔ "راستہ زیادہ طویل نہیں۔ صرف چار دیواری عبور کرنا ہے۔"

"ضد نہ کریں۔ جیسا میں کہہ رہی ہوں وہی کریں۔" صندلی نے اس کی تجویز رد کردی۔ "پہلے مجھے یہ بتائیں کہ آپ کی گھڑی میں بجا کیا ہے؟"

قیصر مرزا نے گھڑی دیکھی۔ لیکن روشنی اس قدر کم تھی کہ وہ ٹھیک سے دیکھ نہ سکا۔ اس نے اٹکل سے بتایا۔ "ابھی کچھ رات باقی ہے۔ چار بھی نہیں بجے۔" اس نے مڑ کر صندلی کی جانب دیکھا۔ "اندھیرا کچھ زیادہ ہی ہے۔ تھوڑی دیر انتظار نہ کرلیں۔"

"نہیں، اب آپ کا یہاں ٹھہرنا ٹھیک نہیں۔" صندلی نے اختلاف رائے کیا۔ "محل سے باہر جانے کے لئے یہی مناسب وقت ہے۔"

قیصر مرزا نے مزید اصرار نہ کیا۔ صندلی محل کے چور دروازے سے باہر نکلی۔ قیصر مرزا بھی اس کے ہمراہ باہر آگیا۔ دروازے کے آگے کشادہ راستہ تھا مگر کچا تھا۔ راستے کے دوسری جانب گھنے درختوں اور جھاڑیوں کا سلسلہ تھا جو دُور تک پھیلا ہوا تھا۔ صندلی نے دروازے کے سامنے رک کر سُن گُن لی۔ ایک بار پھر چوکنا نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا اور جب اطمینان ہوگیا کہ آس پاس کوئی نہیں ہے تو اس نے آگے قدم بڑھایا۔ قیصر مرزا اس کے ساتھ ساتھ چلا۔

دونوں سنبھل سنبھل کر قدم اٹھاتے ہوئے کچے راستے پر چل رہے تھے۔ یہ راستہ محل کے بیرونی پھاٹک تک جاتا تھا۔ مگر بالکل سیدھا نہ جاتا تھا۔ محل جہاں ختم ہوتا تھا وہیں سے مڑتا تھا اور کنکر کی اس سڑک سے مل جاتا تھا جو باغ سے گزر کر پھاٹک تک جاتی تھی۔ دونوں آگے بڑھتے گئے لیکن محل کے نکڑ تک نہ گئے۔ صندلی چلتے چلتے رک گئی۔ اس جگہ سے ایک پگڈنڈی نکلتی تھی جو جھاڑیوں میں داخل ہوکر نظروں سے اوجھل ہوگئی تھی صندلی نے کچا راستہ چھوڑ دیا۔ مڑی اور پگڈنڈی پر چلنے لگی۔ قیصر مرزا بھی اس کے پیچھے پیچھے چلا۔

اندھیرا تھا اور پگڈنڈی کے دونوں طرف جھاڑیاں تھیں۔ درختوں کی شاخیں بھی پگڈنڈی پر جھکی ہوئی تھیں جن سے اندھیرا اور گہرا ہو گیا تھا۔ دونوں جھاڑیوں سے دامن بچاتے آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ تاریکی میں وہ دُھندلی دُھندلی پرچھائیوں کی مانند نظر آ رہے تھے۔ صندلی راستے سے آشنا تھی۔ لہٰذا اطمینان سے چل رہی تھی۔ مگر قیصر مرزا کو بار بار رکنا پڑتا۔ کئی بار لڑکھڑایا بھی لیکن گرا نہیں فوراً سنبھل گیا۔

دونوں درختوں کے نیچے سے نکل کر کھلے میدان میں آ گئے۔ لیکن یہ چٹیل میدان نہ تھا۔ خود رُو پودوں اور جھاڑیوں سے بھرا ہوا تھا۔ پگڈنڈی اُن کے درمیان سے پیچ و خم کھاتی ہوئی گزرتی تھی۔ میدان میں داخل ہوتے ہی صندلی چلتے چلتے رک کر کھڑی ہو گئی۔

قیصر مرزا نے حیرت زدہ ہو کر ٹھہرنے کا سبب معلوم کرنا چاہا۔ مگر دریافت کرنے سے پہلے ہی صندلی کی آواز ابھری۔ "اب آپ آگے آگے چلیں میں پیچھے رہوں گی۔"

"کیوں ؟" قیصر مرزا نے چونک کر پوچھا۔

"ہر معاملہ میں دخل دینا اچھا نہیں ہوتا۔" صندلی کے لہجے سے جھنجھلاہٹ عیاں تھی۔ "جیسا کہہ رہی ہوں، اس پر عمل کیجئے اور جلد سے جلد اس میدان سے گزر کر درختوں کے نیچے پہنچنے کی کوشش کیجئے۔" اس نے قیصر مرزا کو خبردار کیا۔ "یہ خطرناک جگہ ہے۔ کوئی بھی ہم کو دُور سے دیکھ سکتا ہے۔"

قیصر مرزا نے قدم بڑھایا اور صندلی کے آگے آگے چلنے لگا۔ دونوں نے اپنی رفتار [illegible] دی تھی۔ قیصر مرزا بھی اب محتاط ہو گیا تھا۔ وہ صندلی کی ہدایت کے مطابق جلد سے جلد میدان عبور کر لینا چاہتا تھا۔ دونوں میدان کے وسط میں بھی نہ پہنچے تھے کہ محل کی بالائی منزل کے ایک دریچے سے روشنی اُبھری۔ روشن دریچہ اندھیرے میں دُور سے زرد دھبے کی مانند نظر آ رہا تھا۔

صندلی نے مڑ کر اس طرف دیکھا۔ روشنی فوراً بجھ گئی۔ روشن دریچہ تاریک ہو گیا۔ صندلی پریشان ہو گئی۔ اس نے قیصر مرزا سے کہا۔ "ذرا قدم بڑھا کے چلئے۔" اس کے لہجے سے سراسیمگی اور گھبراہٹ عیاں تھی۔

قیصر مرزا بھی سراسیمہ ہو گیا۔ اس نے قدموں کی رفتار اور تیز کر دی۔ ناگاہ میدان کے مغربی گوشے سے آواز اُبھری۔ "قیصر مرزا!"

قیصر مرزا ٹھٹھک کر رہ گیا۔ صندلی بھی رک گئی۔ اس نے قیصر مرزا کو خبردار کیا۔ "بولئے گا نہیں۔ بالکل خاموش رہیں۔"

مگر قیصر مرزا خاموش نہ رہ سکا۔ اُس نے محسوس کیا کہ یہ آواز پہلے بھی سنی ہے۔ اُس نے فوراً آواز دینے والے کو پہچان لیا۔ وہ نواب پیارے آغا تھا۔ قیصر مرزا کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ "کون؟ قبلہ پیارے آغا صاحب!" وہ سخت حیرت زدہ تھا۔

صندلی جھپاک سے آگے بڑھی اور جھک کر قیصر مرزا کو اس زور سے دھکّا دیا کہ وہ سنبھل نہ سکا۔ لڑکھڑا کر دھڑام سے گرا۔ صندلی نے فوراً ہی خود کو بھی زمین پر گرا دیا۔ قیصر مرزا اس کی اس حرکت پر سخت بھنّایا۔ چاہا کہ باز پرس کرے لیکن اسی وقت رات کے پر ہول سنّاٹے میں بندوق چلنے کی آواز ابھری اور گولی سنسناتی ہوئی قیصر مرزا کے سر پر سے گزر گئی۔ قیصر مرزا لرز کر رہ گیا۔ وہ پگڈنڈی پر اس طرح بے حال پڑا تھا کہ دھڑ زمین پر تھا اور چہرہ ایک جھاڑی کی شاخوں سے الجھا ہوا تھا۔ اس کے قریب ہی صندلی بھی زمین پر سہمی ہوئی پڑی تھی۔

دونوں دم بخود تھے اور جس حال میں تھے ویسے ہی سانس روکے پڑے رہے۔

ذرا ہی دیر بعد کچھ فاصلے پر جھاڑیوں میں سرسراہٹ ہوئی اور پھر کچے راستے پر تیز تیز قدموں سے دوڑنے کی آواز ابھری اور رفتہ رفتہ دور ہوتی گئی۔ حتیٰ کہ خاموشی میں ڈوب کر گم ہو گئی۔

صندلی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ مُنہ کھولے زور زور سے ہانپ رہی تھی۔ قیصر مرزا بھی کپڑے جھاڑتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ اس کے گھٹنے میں درد ہو رہا تھا۔ گردن اور ایک رخسار کی خراشوں میں جلن محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے اپنی چوٹ نظر انداز کرتے ہوئے ممنونِ احسان ہونے کا اظہار کیا۔ "صندلی! تم نے میری جان بچا لی، ورنہ اس مردود پیارے آغا نے تو مجھے ہلاک ہی کر دیا تھا۔"

"باتیں بعد میں کیجیۓ گا۔ آگے بڑھیۓ اور جلد سے جلد یہاں سے نکل جانے کی کوشش کیجیۓ۔" صندلی ابھی تک سراسیمہ تھی۔" یہ سمجھ لیجیۓ خطرہ ابھی ٹلا نہیں۔"

قیصر مرزا اس کی تنبیہ پر گھبرا گیا۔ وہ اپنی گردن سہلاتا ہوا آگے بڑھا۔ صندلی اس کے ساتھ ساتھ چلی۔ دونوں چوکنّا نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتے، جھاڑیوں میں الجھتے لگے اور آگے بڑھتے گئے۔ انھوں نے جھاڑیوں سے بھرا ہوا میدان عبور کیا اور درختوں کے ایک جھنڈ کے نیچے پہنچ گئے۔

درختوں کے نیچے گہرا اندھیرا تھا۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ قریب ہی کسی گھنی جھاڑی میں جھینگر زور زور سے بول رہے تھے۔ تیز رفتاری سے چلنے کے باعث دونوں کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ وہ سانس درست کرنے کے لئے دم بھر کو ٹھہر گئے۔

قیصر مرزا مسلسل نواب پیارے آغا کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس نے اپنی الجھن کا صندلی سے بھی اظہار کیا۔" صندلی! نہ جانے آج کون سی نیکی آڑے آگئی۔ بال بال بچ گیا۔ تم مجھے دھکا دے کر نیچے نہ گراتیں تو پیارے آغا نے سمجھو میری جان لینے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔"

"وہ تو یہی سوچ رہا ہوگا کہ آپ کو ختم کر کے اس نے اپنا کام کامیابی سے انجام دے دیا۔" صندلی نے اسے بتایا۔" وہ آواز پر نشانہ لگاتا ہے۔ سنا ہے اس کا نشانہ کبھی خطا نہیں کرتا۔" یکایک اس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔" مگر آپ تو خود اپنی جان سے ہاتھ دھونے پر تلے ہوئے تھے۔ میں نے منع بھی کیا لیکن خاموش نہ رہے۔ یہ آپ کو ہو کیا گیا تھا؟"

"تم کو معلوم نہیں، میں اُسے بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ ابّا جان کا ملنے والا ہے۔ وہ آج کل سخت علیل ہیں۔ پچھلے دنوں دو تین بار ان کی عیادت کو آیا۔ گھنٹوں دیوان خانے میں میرے پاس بیٹھا رہتا۔ دل جوئی اور دل داری کی اس طرح باتیں کرتا کہ میں تم سے کیا بتاؤں۔" قیصر مرزا نے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔" مجھے کیا خبر تھی کہ اس خبیث کے دل میں کیا ہے۔ کبھی گمان بھی نہ ہوا تھا کہ وہ میری جان لینے کے درپے ہو سکتا ہے۔" وہ اپنی بات کہتے کہتے لمحے بھر کے لئے رکا۔" مگر وہ مجھے کیوں قتل کرنا چاہتا ہے؟ میں نے

اس کا کیا بگاڑا۔ کسی طرح کی رنجش یا کدورت بھی نہیں۔"

"رنجش اور کدورت کا سوال نہیں۔" صندلی نے قیصر مرزا کو آگاہ کیا۔ "سوال اُس چھ ہزار روپے کی رقم کا ہے جو آپ کو قتل کرنے کے عوض اُسے پیشگی مل چکی ہے۔"

"یہ تو بتاؤ وہ کس کے اشارے پر مجھے قتل کرنا چاہتا تھا؟"

"کیا کیجئے گا یہ معلوم کر کے۔" صندلی نے ٹالنا چاہا۔

"نہیں صندلی، یہ بات تو تم کو بتانا ہی ہوگی۔" قیصر مرزا اصرار کرنے لگا۔

صندلی پھر بھی آمادہ نہ ہوئی۔ مگر جب قیصر مرزا کا اصرار عاجزی کی حد تک پہنچ گیا تو صندلی نے دبی زبان سے کہا۔ "اس کام پر اُسے رانی صاحبہ نے مقرر کیا تھا۔"

"تمہاری باتوں سے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ راتوں کو آنے والے میری طرح کے دوسرے مہمانوں کے ساتھ بھی وہ ایسا ہی خوفناک سلوک کرتی ہوں گی۔" قیصر مرزا نے قیاس آرائی کی۔ "میرا خیال ہے وہ اس لئے ایسا کرتی ہوں گی تاکہ ان کے راز پر پردہ پڑا رہے۔"

"اس سلسلے میں صحیح طور پر میں کچھ نہیں بتا سکتی۔ مہمان کو رانی صاحبہ کی خواب گاہ میں پہنچانے کے بعد میرا کام ختم ہو جاتا تھا۔ بعد میں اس کے ساتھ کیا سلوک اختیار کیا جاتا تھا یہ مجھے نہیں معلوم۔" صندلی نے وضاحت کی۔ "مجھے صرف اتنا معلوم ہے کہ پچھلے سال ایک ایسی واردات ہوئی تھی اور وہ قتل بھی آواز پر گولی چلا کر پیارے آغا ہی نے کیا تھا۔"

"مگر انھوں نے اُسے کیوں قتل کرایا تھا؟"

"وہ اپنے راز میں کسی کو بھی شریک نہیں کرتی تھیں۔" صندلی نے قیصر مرزا کو آگاہ کیا۔ "مگر میں نے ان کی باتوں سے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ اُس سے انتقام لینا چاہتی تھیں۔"

"صندلی تم پر تو ان کو بہت اعتماد تھا۔" قیصر مرزا نے اُسے نظر بھر کر دیکھا۔ "میں نے غلط اندازہ تو نہیں لگایا؟"

"سب یہی کہتے ہیں۔" صندلی نے کھل کر بات نہ کی۔ قدرے توقف کے بعد پوچھا۔ "مگر آپ یہ کیوں معلوم کرنا چاہتے ہیں؟"

"گویا وہ مجھ سے بھی انتقام لینا چاہتی تھیں۔" قیصر مرزا نے اس کا سوال نظر انداز کرتے ہوئے

دریافت کیا۔ "مگر وہ مجھ سے کیوں انتقام لینا چاہتی تھیں؟"

"اس سازش میں پیارے آغا کے علاوہ ایک شخص اور بھی شریک ہے۔ اُسی نے گولی چلنے سے پہلے محل کے دریچے پر روشنی کی تھی اور دم بھر میں بجھا بھی دی تھی۔ یہ پیارے آغا کے لئے اشارہ تھا" صندلی سنبھل سنبھل کر بولتی رہی۔ "اس کا نام عابد ہے۔ وہ باڈی گارڈ کی حیثیت سے عام طور پر رانی صاحبہ کے ہمراہ رہتا ہے۔ رانی صاحبہ نے تو مجھے کچھ نہیں بتایا تھا۔ مگر عابد نے آج شام مجھے اس راز سے آگاہ کر دیا تھا" وہ بے ساختہ مسکرانے لگی۔ "وہ میری محبت کا دم بھرتا ہے۔ تنہائی میں کبھی مل جاتا ہے تو اُس کا اظہار بھی کرتا ہے مگر مجھے اس سے نفرت ہے۔"

"مگر صندلی، جب تم کو یہ راز معلوم تھا تو تم نے مجھے پہلے سے خبردار کیوں نہ کر دیا؟"

"اُس کی ضرورت ہی نہ تھی" صندلی نے صفائی پیش کی۔ "آپ نے محل سے باہر آتے ہوئے صحیح وقت بتایا ہوتا تو آپ کا اس واردات سے سابقہ نہ پڑتا۔ اطمینان سے نکل جاتے۔" اس کا لہجہ تیکھا ہو گیا۔ "آپ نے خود ہی تو اپنے لئے مُصیبت کا سامان پیدا کیا۔ میرے دریافت کرنے پر آپ نے چار بجے کا وقت بتایا تھا۔ حالانکہ اس وقت پانچ بجے تھے۔ آپ نے گھڑی کو پوری توجہ سے دیکھا ہی نہیں۔"

"تمہارا خیال درست ہے۔" قیصر مرزا نے صاف گوئی سے کام لیا، کھل کر اپنی غلطی کا اعتراف کیا۔ "اندھیرا ابھی بہت تھا۔ میں نے گھڑی غور سے دیکھنے کے بجائے قیاس سے وقت بتایا تھا۔" اس نے مڑ کر صندلی کی جانب دیکھا۔ "صندلی! تم نے یہ نہیں بتایا۔ رانی صاحبہ مجھ سے کیوں انتقام لینا چاہتی تھیں؟"

"مجھے اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔ عابد نے بھی کچھ نہیں بتایا۔ میرا خیال ہے کہ اُسے بھی اس سلسلے میں کچھ نہیں معلوم، ورنہ وہ مجھے بتا دیتا۔" صندلی نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔ "یہ تو آپ ہی کو علم ہونا چاہیئے کہ وہ آپ سے اتنا خوف ناک انتقام کیوں لینا چاہتی تھیں؟"

قیصر مرزا گردن جھکا کر گہری سوچ میں ڈوب گیا، مگر صندلی نے اُسے زیادہ دیر سوچنے کا

موقع نہ دیا۔ اس نے قیصر مرزا کو ٹوکا۔ "یہاں کھڑے کب تک سوچتے رہیں گے۔ کیا باہر جانے کا ارادہ نہیں ہے؟" اس نے خبردار کیا۔ "یہ سوچ لیجئے، جب تک آپ یہاں موجود ہیں، خطرہ چاروں طرف منڈلا رہا ہے۔"

"کیا پیارے آغا کے دوبارہ ادھر آنے کا امکان ہے؟"

"وہ تو گولی چلانے کے بعد عابد کو یہ اطلاع بھی پہنچا چکا ہوگا کہ اس نے اپنا کام خوش اسلوبی سے انجام دے دیا۔ اور فوراً ہی محل سے نکل گیا ہوگا۔ وہ اپنا کام ختم کرنے کے بعد یہاں ایک لمحے کو بھی نہیں ٹھہرتا۔" صندلی نے مڑ کر محل کی جانب دیکھا۔ "عابد اپنے اعتماد کے گرگوں کے ساتھ ادھر آنے ہی والا ہوگا۔ اُسے تو پیارے آغا سے یہی معلوم ہوا ہوگا کہ آپ کا خدانخواستہ کام تمام ہو چکا ہے۔ اب لاش اٹھانا ہے اور گڑھا کھود کر دفن کرنا ہے۔ یہ کام اُسے سورج نکلنے سے پہلے ہی پہلے مکمل کرنا ہوتا ہے۔ پچھلے سال جب یہاں قتل ہوا تھا تو لاش کو اسی طرح اندھیرے میں ٹھکانے لگایا گیا تھا۔ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی۔"

"تب تو یہاں سے فوراً نکل جانا چاہیئے۔"

"جی ہاں! اب یہاں مزید رُکنا کسی طور مناسب نہیں۔"

☆

مشرقی افق پر اب ہلکا ہلکا اجالا پھیلنے لگا تھا۔ سرمئی بادلوں کے پیچھے سپیدی پھوٹ رہی تھیں۔ دُور بستی میں مویشیوں اور انسانوں کی ملی جلی آوازوں کا مدھم شور اُبھر رہا تھا۔ درختوں کی شاخوں میں پرندوں نے چہچہانا شروع کر دیا تھا۔ رات ختم ہو رہی تھی۔ صبح کاذب نمودار ہو رہی تھی۔

درختوں کے نیچے ابھی تک اندھیرا تھا۔ دونوں خاموشی سے پگڈنڈی پر چل رہے تھے۔ سامنے چاردیواری تھی اور اُن کا رخ اسی سمت تھا۔ ناگاہ گہرے سکوت میں قدموں کی آہٹ ابھری۔ ساتھ ہی میدان میں بکھری ہوئی جھاڑیوں میں سرسراہٹ

پیدا ہوئی۔

صندلی نے مڑ کر اس طرف دیکھا۔ درختوں کی اوٹ سے اُسے کچھ لوگ نظر آئے۔ مدھم روشنی میں وہ سایوں کی مانند دھندلے دھندلے نظر آرہے تھے۔ صندلی نے غور سے دیکھا۔ وہ تعداد میں پانچ تھے اور جھاڑیوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے پگڈنڈی پر چل رہے تھے۔ صندلی کو ایسا محسوس ہوا کہ ان میں عابد بھی شامل تھا۔ اس کا قد اونچا تھا اور وہ آگے آگے چل رہا تھا۔ وہ جھک جھک کر پگڈنڈی کے دونوں طرف اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے کچھ تلاش کر رہا ہو۔

صندلی کو فوراً خطرے کا احساس ہوا۔ اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں قیصر مرزا سے کہا۔ "وہ آگئے۔"

"کون؟" قیصر مرزا نے مڑ کر صندلی کو حیرت سے دیکھا۔

"عابد اور اس کے گرگے۔" اس نے ہاتھ اُٹھا کر اشارہ کیا۔ "وہ دیکھیے۔"

"ہاں کچھ لوگ نظر تو آرہے ہیں۔" قیصر مرزا نے بے نیازی سے کہا۔ "مگر اب ان سے ڈرنے کی کیا ضرورت۔ رانی صاحبہ تو رہی نہیں جن کے حکم پر وہ مجھے موت کے گھاٹ اتار دینا چاہتے تھے۔"

"مگر ان کو تو ابھی یہ معلوم نہیں کہ رانی صاحبہ گزر گئیں۔" صندلی نے اس کی حوصلہ افزائی نہ کی۔ جھنجھلا کر بولی۔ "آپ میرا کہنا کیوں نہیں مانتے۔ جو کہہ رہی ہوں وہ کیجیے۔" اس نے پلٹ کر ایک بار پھر پیچھے دیکھا اور گھبرائے ہوئے لہجے میں گویا ہوئی۔ "جلد سے جلد چار دیواری تک پہنچنے کی کوشش کیجیے۔"

صندلی بڑھ کر قیصر مرزا سے آگے نکل گئی۔ قیصر مرزا اب اس کے پیچھے تھا۔ دونوں تیز رفتار سے پگڈنڈی پر چل رہے تھے۔

پگڈنڈی ختم ہوگئی۔ آگے مختصر میدان تھا۔ میدان کے اس پار چار دیواری تھی۔ مگر اب مشرق میں بادل چھٹ گئے تھے۔ ہلکی ہلکی روشنی ہر طرف پھیل گئی تھی۔ اس روشنی میں دونوں کو دور سے دیکھا جا سکتا تھا۔ وہ آگے بڑھے اور جیسے ہی کھلے میدان میں پہنچے

عقب سے آواز بلند ہوئی۔ "کون ہے؟" صندلی نے پلٹ کر دیکھا، عابد اور اُس کے ساتھی دوڑتے ہوئے اسی جانب آ رہے تھے۔

عابد نے ڈپٹ کر کہا۔ "رُک جاؤ۔"

لیکن صندلی رُکی نہیں۔ اس نے قیصر مرزا کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور قدموں کی رفتار اور تیز کر دی۔ دونوں نے میدان عبور کیا اور چار دیواری کے پاس پہنچ گئے۔ صندلی دیوار کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ قیصر مرزا اس کے ہمراہ تھا۔

دونوں اب ایسی جگہ پہنچ چکے تھے جہاں چار دیواری ٹوٹی ہوئی تھی۔ اس میں اتنا بڑا موکھا بن گیا تھا جس سے گزر کر باہر نکلا جا سکتا تھا۔ صندلی رک گئی۔ قیصر مرزا کی جانب متوجہ ہوئی۔ "اب، آپ اس موکھے سے فوراً باہر نکل جائیں۔" قیصر مرزا نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ آگے بڑھا اور جھک کر موکھے سے باہر جانے کا ارادہ کیا، لیکن وہ اس قدر خوف زدہ تھا کہ گھبراہٹ اور پریشانی میں اس کا سر ایک ٹوٹی ہوئی اینٹ سے اس بری طرح ٹکرایا کہ آنکھوں تلے اندھیرا آ گیا۔

قیصر مرزا لڑکھڑایا۔ مگر صندلی نے آگے بڑھ کر اس کا بازو تھام لیا۔ قیصر مرزا گرنے سے بال بال بچ گیا۔ اس نے خود کو سنبھالا۔ صندلی نے سہارا دیا اور وہ موکھے سے گزر کر چار دیواری سے باہر چلا گیا۔ صندلی موکھے کے قریب کھڑی تھی اور قیصر مرزا کو جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ جب وہ ایک موڑ پر مڑ کر نظروں سے اوجھل ہو گیا تو صندلی نے گہری سانس بھری۔ اس کی روشن آنکھوں میں جھلملاتے ہوئے چراغ بجھ گئے۔ چہرے پر افسردگی چھا گئی۔

وہ واپس جانے کے لئے پلٹی تو عابد اس کے قریب پہنچ چکا تھا۔ اس نے تیوری پر بل ڈال کر پوچھا۔ "صندلی! تمہارے ساتھ کون تھا؟"

"وہی جس کی لاش تم تلاش کر رہے تھے۔" صندلی نے نہایت سکون سے جواب دیا۔ "وہ زندہ ہے اور چار دیواری سے باہر جا چکا ہے۔"

"یہاں سے فرار ہونے میں تم نے ضرور اس کی مدد کی ہوگی۔" اس نے برہمی کا اظہار

کیا۔ "تم کو اتنی جرأت کیسے ہوئی؟ تم نے ایسا کیوں کیا؟"

"تم مجھ سے یہ پوچھنے والے کون ہوتے ہو؟" صندلی جل کر بولی۔ "تم میرے آقا ہو، حاکم ہو، کون ہو تم؟"

"اب تم سرکار کے سامنے چل کر بتانا۔" عابد نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "ان کا عتاب تم نے دیکھا ہے اور اُس سے بخوبی واقف بھی ہو۔"

"بہت اچھی طرح واقف ہوں۔ تمہارے بتانے کی ضرورت نہیں۔" صندلی نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔ "اور یہ بھی سُن لو میں نے جو کچھ کیا رانی صاحبہ کے حکم ہی سے کیا ہے۔"

"رانی صاحبہ کے حکم سے؟" عابد نے حیران و پریشان ہو کر پوچھا۔

"ہاں انھی کے حکم سے۔" صندلی نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "مگر چند گھنٹے پہلے وہ گزر گئیں۔ اب وہ اس دنیا میں نہیں رہیں۔ جاؤ، محل میں سب کو ان کے انتقال کی خبر کر دو۔"

صندلی کی آواز بھرا گئی۔ آنکھوں کے آبگینے چھلک اٹھے۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا کر بے اختیار رونے لگی۔ عابد اور اس کے ارد گرد کھڑے ہوئے دوسرے ملازم دم بخود رہ گئے۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے صندلی کو دیکھ رہے تھے جس کی سسکیاں رک رک کر گہری خاموشی میں ابھر رہی تھیں۔

(۱۳)

قیصر مرزا واپس عشرت منزل پہنچا تو پہر دن گزر چکا تھا۔ اس نے چوکنا نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا اور صدر دروازے کی جانب بڑھا۔ دروازے کو ہولے سے دھکا دیا تو ایک پٹ کھل گیا۔ قیصر مرزا کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ ڈیوڑھی میں داخل ہوا تو اسے معاً آغا جانی کی گھٹی گھٹی چیخیں یاد آ گئیں جو کل شام اس نے تہہ خانے کے اندر سنی تھیں اور ذرا ہی دیر بعد بند بھی ہو گئی تھیں۔ وہ اسی عالم میں اسے چھوڑ کر حیدر گڑھ روانہ ہو گیا تھا

اور اب دل گرفتہ ہو کر سوچ رہا تھا کہ اس کی غیر موجودگی میں خدا معلوم آغا پر کیا بیتی۔

عشرت منزل کے دروازے پر کنڈی نہیں لگی تھی۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ آغا جانی ابھی تک تہہ خانے میں تھا۔ قیصر مرزا دھڑکتے دل سے آگے بڑھا۔ وہ طرح طرح کے اندیشوں اور وسوسوں میں مبتلا تھا۔ مگر جب وہ ڈیوڑھی سے گزر کر صحن میں پہنچا تو ٹھٹک کر رہ گیا۔ اس کی نظر سب سے پہلے صحنچی پر پڑی۔ آغا جانی وہاں موجود تھا۔ وہ تخت پر بیٹھا اطمینان سے کلچے اور نہاری کھا رہا تھا۔

قیصر مرزا کی پریشانی رفع ہو گئی۔ وہ صحنچی کی جانب بڑھا۔ قدموں کی آہٹ سن کر آغا نے سر اٹھایا۔ قیصر مرزا کو دیکھا۔ شکوہ کرنے کے انداز میں گویا ہوا۔ "اماں! تم ساری رات کہاں رہے؟ تمہارے انتظار میں ٹھیک سے نیند بھی نہیں آئی۔"

قیصر مرزا نے کوئی جواب نہ دیا۔ خاموشی سے جا کر اس کے قریب بیٹھ گیا۔

مگر آغا جانی خاموش نہ رہا۔ اس نے زور دے کر پوچھا۔ "اماں! تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ کہاں رہے رات بھر؟"

"حیدر گڑھ گیا تھا اور تم کو بتایا بھی تھا۔ بھول گئے؟"

"رات بھر وہیں رہے؟"

"ہاں!" قیصر مرزا نے مختصر جواب دیا۔

"ناشتہ کر کے آئے ہو؟"

"نہیں۔" قیصر مرزا نے اس دفعہ بھی مختصر جواب دیا۔

"تو پھر تکلف کس بات کا۔" آغا نے پلیٹ قیصر مرزا کی طرف بڑھا دی۔ "لو، اب شروع ہو جاؤ۔ نہاری نہایت مزیدار ہے اور کلچے بھی تازہ تازہ ہیں۔ ذرا چکھ کر دیکھو۔"

"نہیں، مجھے بالکل بھوک نہیں۔" قیصر مرزا نے بیزاری سے کہا۔

"تم ارے اتنا دور دراز کا سفر کر کے آرہے ہو اور بھوک بھی نہیں۔ اماں، بات کیا ہے؟"

"رات کو سو نہیں سکا۔" قیصر مرزا نے منہ کھول کر جماہی لی۔

"رانی صاحبہ ملی تھیں؟"

"ہاں۔" قیصر مرزا نے بتایا۔ "انھی کے بلانے پر تو حیدر گڑھ گیا تھا۔"
آغا جانی نے چبھتی ہوئی نظروں سے قیصر مرزا کو دیکھا۔ چہرے کی اڑی اڑی رنگت، آنکھیں بجھی بجھی، ہونٹ خشک، جسم نڈھال۔ وہ بیمار بیمار سا لگ رہا تھا۔ آغا چند لمحے خاموش رہا۔ پھر تیکھے لہجے میں گویا ہوا۔ "ساری رات وہاں گزار دی اور سوئے بھی نہیں۔ یار برا نہ ماننا مجھے تورانی صاحبہ کچھ رنگین مزاج معلوم ہوتی ہیں۔ سنا ہے انہوں نے شادی بیاہ کا جھنجھٹ بھی نہیں پالا۔ ابھی تک کنواری ہیں۔ اماں، کہیں ان کا تم پر دل وِل تو نہیں آ گیا۔ تم ہو بھی بانکے جوان۔ بالکل پرستان کے شہزادے لگتے ہو۔" اس نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ "میاں صاحبزادے! ان کے چکر میں نہ پڑنا۔ کھونٹی پر لٹکنے کے قابل بنا دیں گی۔" اس کا لہجہ طنزیہ تھا اور وہ ابھی اور بھی بہت کچھ کہنا چاہتا مگر قیصر مرزا نے اسے ٹوکا۔
"تمہارے منہ میں جو آتا ہے اول فول بک جاتے ہو۔ تم کو کچھ خبر بھی ہے۔"
"مجھے سب خبر ہے۔"
"خاک خبر ہے۔" قیصر مرزا نے جھنجھلا کر کہا۔ "تمہیں معلوم ہے کہ کل رات ان کا انتقال ہو گیا!"
"ہائیں!" آغا نے حیرت سے منہ پھاڑ کر کہا۔ "اماں، تم کیا کہہ رہے ہو؟"
قیصر مرزا نے کوئی جواب نہ دیا۔
"واللہ! وہ انتقال کر گئیں؟" آغا جانی اظہار تاسف کرنے لگا۔ "مجھے کیا خبر تھی کہ وہ گزر گئیں۔ خواہ مخواہ بے چاری کے بارے میں نہ جانے کیا کیا کہہ گیا۔ مگر ان کا انتقال ہوا کیسے؟"
"غالباً ہارٹ فیل ہو گیا۔" قیصر مرزا نے مصلحت اندیشی سے کام لیا۔ آغا جانی کو اصل حقیقت سے آگاہ نہ کیا۔ اس نے فوراً بات کا رخ موڑ دیا۔ "یہ بتاؤ کہ کل تم پر نہنہ خانے میں کیا گزری؟"
"مرتے مرتے بچا ہوں۔"
"ہوا کیا تھا؟"
"بس کچھ پوچھو نا۔" آغا جانی نے بتایا۔ "پریشان تو وہ مجھے سہ پہر ہی سے کر رہی تھی۔ وظیفے کے ورد کے دوران ذرا آنکھیں بند کیں اور وہ چھم چھم کرتی نازل ہو جاتی۔ کبھی زور

زور سے قہقہے لگاتی۔ کبھی دھاڑیں مار کر روتی۔ سالی نے چلہ کشی دوبھر کردی۔"

"اماں، وہ ہے کیسی؟" قیصر مرزا نے بے چین ہو کر پوچھا۔

"صاف تھوڑی نظر آتی ہے۔ بس پرچھائیں کی طرح جھلک دکھا کر غائب ہو جاتی ہے۔ مگر کل بھی میں نے یہ احتیاط کر لی تھی کہ وظیفہ شروع کرنے سے پہلے اپنے چاروں طرف کھلا بڑا حصار کھینچ لیا تھا اور اسی کے اندر بیٹھا تھا۔ حصار کے اندر تو وہ آ نہیں سکتی۔ دور ہی دور منڈلاتی رہی۔" آغا جانی روانی سے بولتا رہا اور قیصر مرزا توجہ سے اس کی باتیں سنتا رہا۔ "کل تو حرام زادی نے بہت ستایا۔ چلہ کشی کے دوران کئی بار گڑبڑایا۔ بار بار بھول جاتا۔" اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ "جھٹ پٹے کے وقت جب تہہ خانے میں اندھیرا بڑھ گیا تو میں چراغ جلانے کے لئے اٹھا۔ جیسے ہی حصار سے قدم باہر نکالا ایسا محسوس ہوا کہ کسی نے پشت پر زور سے ٹھوکا مارا اور مضبوطی سے میرا گلا دبوچ لیا۔ خوف سے میری گھگھی بندھ گئی۔ پھر بھی ہمت سے کام لیا۔ جھٹکا دے کر اس کی گرفت سے چھڑایا اور بدحواس ہو کر چیختا ہوا دروازے کی طرف لپکا۔ اندھیرے میں سیڑھیوں سے ٹھوکر کھا کر دھڑام سے گرا۔ پھر مجھے نہیں معلوم کیا ہوا۔"

یہی وقت تھا جب قیصر مرزا نے تہہ خانے کے اندر آغا کی گھٹی گھٹی چیخیں سنی تھیں مگر اس نے آغا سے اس کا اظہار کرنے سے گریز کیا۔ صرف اس قدر پوچھا۔ "مگر تم تہہ خانے سے باہر کیسے آئے؟"

"اماں بہت دیر بے ہوش پڑا رہا۔" آغا نے قیصر مرزا کو مطلع کیا۔ "جب ذرا ہوش آیا تو میں نے سنا کہ وہ مجھے خبردار کر رہی تھی۔ دیکھ اب بھی باز آجا ورنہ کلیجہ نکال کر کھا جاؤں گی۔ مایا یوں ہاتھ نہیں آئے گی۔ پہلوٹی کے بیٹے کا خون بھینٹ دے۔"

"بھئی تم اب اس چکر کو چھوڑو۔" قیصر مرزا نے گھبرا کر کہا۔ "کسی روز جان سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔"

"کوئی بہت ہی خبیث شے معلوم ہوتی ہے۔" آغا کے لہجے سے بھی خوف آشکارہ تھا۔ "بغیر خون لئے قابو میں نہیں آئے گی۔"

"میں تو کہتا ہوں یہ جان جوکھوں کا معاملہ ہے۔" قیصر مرزا نے آغا کو سمجھانے کی کوشش کی۔ "اب تم اس کام سے باز آجاؤ۔"

آغا اس کا مشورہ نظر انداز کرتے ہوئے بولا "لیکن اس حرام زادی کے لیے پہلوٹی کا بیٹا لایا کہاں سے جائے۔"

"اماں تم یہ حرکت بھی کرو گے؟" قیصر مرزا نے خفگی کا اظہار کیا۔ "تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا؟"

آغا جانی اس کی خفگی سے مرعوب ہو گیا۔ کھسیانا ہو کر ہنسنے لگا۔ "یار، میں تو یونہی کہہ رہا تھا۔ کون اپنی اولاد اس طرح دے گا۔"

قیصر مرزا ہنوز ناراض تھا۔ تیوری پر بل ڈال کر بولا۔ "اب یہ سلسلہ فوراً بند ہو جانا چاہیئے۔ مجھے تو اس مکان سے خوف آنے لگا ہے۔ اسے تو خالی کر دینا چاہیئے۔"

"اسے خالی تو نہیں کروں گا۔ اپنا تو کوئی اور ٹھکانا بھی نہیں۔" آغا نے اپنی مجبوری بیان کی۔ "یہاں سے نکل کر جاؤں گا کہاں۔"

"تم نے اب تک کا کرایہ تو مکان دار کو ادا کر دیا؟"

"نہیں، تم نے جو روپے دیئے تھے اس میں سے اتنا بچا ہی نہیں کہ کرایہ ادا کرتا۔"

"یار حد کر دی تم نے۔" قیصر مرزا نے مُنہ بگاڑ کر ناگواری کا اظہار کیا۔ "مکان دار پہلے ہی دھمکی دے چکا ہے، ایک روز کھڑے کھڑے مکان خالی کروا لے گا۔"

"اماں، تم بھی کیسی باتیں کرتے ہو۔ مکان خالی کرانا ہنسی ٹھٹھا ہے۔" آغا نے بے نیازی سے کہا۔ "وہ اتنی ہمت کر ہی نہیں سکتا۔"

"کیوں نہیں کر سکتا؟" قیصر مرزا نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "وہ تمہارا دبیل ہے یا تم اس کے داماد لگتے ہو؟ کسی ہوا میں نہ رہنا۔ وہ کسی بھی دن سامان نکال کر باہر پھنکوا دے گا اور مکان اپنے قبضے میں کر لے گا۔" اس کا لہجہ نرم پڑ گیا۔ "مجھ سے روپے لو اور کرایہ آج ہی ادا کر دو۔"

"روپے تو ضرور دے دو۔ ضرورت بھی ہے۔ مگر میں اب کرایہ ادا نہ کروں گا۔" وہ

بے تکلفی سے مسکرانے لگا۔ "پوچھو کیوں؟ اماں، تم کو یہ تو معلوم ہی ہے کہ یہ جھگڑے کی جائیداد ہے۔ اس کی ملکیت کے لئے ایک عرصے سے مقدمہ بازی چل رہی ہے۔ یہ ہے دیوانی مقدمہ۔ برسوں مقدمہ چلے گا اور ابھی تو مقدمہ سول جج کی عدالت میں ہے۔ وہاں سے فیصلہ ہو بھی گیا تو جس فریق کے خلاف فیصلہ ہوا وہ چیف کورٹ میں اپیل دائر کرسکتا ہے۔ وہاں سے فیصلہ ہونے میں بھی برسوں لگ جائیں گے۔"

"مگر مقدمہ بازی سے مکان کے کرائے کا کیا تعلق"؟ قیصر مرزا نے مداخلت کی۔

"بہت بڑا تعلق ہے اور وہ ہے قبضہ۔ جس فریق کا قبضہ ہو گا مقدمہ اس کا دوسرے کے مقابلے میں مضبوط ہو گا۔" آغا جانی نے قیصر مرزا کو صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ "پچھلے دنوں تمہاری غیر موجودگی میں مالک مکان میر کلب علی آئے۔ کرائے کا تقاضہ کیا۔ حسب معمول مکان خالی کرا لینے کی دھمکی دی۔ بڑے لال پیلے ہوئے۔ مجھے بھی تاؤ آ گیا۔ صاف صاف کہہ دیا کہ میر صاحب! کسی اور ہوا میں نہ رہنا۔ میں اب نہ کرایہ دوں گا نہ مکان خالی کروں گا۔ کرایہ ادا بھی کروں گا تو عدالت میں جا کر جمع کرا دوں گا۔ میر کلب علی میرا ترکی بہ ترکی جواب سُن کر بہت سٹ پٹائے۔ ایک دم نرم پڑ گئے۔ کہنے لگے، ایسا ہرگز ہرگز نہ کرنا۔ جب کرائے کا بندوبست ہو جائے دے دینا۔ مکان خالی کرنے کی ضرورت نہیں جب تک جی چاہے رہو۔"

"یار آغا! تم نے تو کمال کر دیا۔" قیصر مرزا نے حیرت زدہ ہو کر اپنے ردّ عمل کا اظہار کیا۔ "واقعی میر صاحب نے یہی کہا تھا؟"

"میں تم سے غلط بیانی کر رہا ہوں؟ مگر میر صاحب بھی ایک نمبر کا ئیاں ہیں۔" آغا نے کہا۔ "آسانی سے رام نہیں ہوئے۔ میں نے ان کو مرعوب کرنے کے لیے یہ بھی دھمکی دی کہ مرلی دھر وکیل تو یہاں تک کہتا ہے کہ بغیر کرایہ دیئے جب تک چاہو رہو اور منجھو بیگم کی جانب سے کرائے کی باقاعدہ رسید بھی ملتی رہے گی۔"

"کیا واقعی مرلی دھر وکیل نے تم سے یہ کہا تھا؟"

"اس نے تو یہ بات نہیں کہی، البتہ اس کا منشی ایک روز مجھے مل گیا۔ باتوں باتوں

میں اس نے یہ عندیہ دیا۔" آغا نے بتایا۔ "میں نے اسے تو ٹال دیا مگر یہ قانونی نکتہ سمجھ میں آگیا کہ میر کلب علی مکان خالی نہیں کرا سکتے۔" اس نے بے تکلفی سے قہقہہ لگایا۔ "یار رہنے کو پھوکٹ میں اتنا عالیشان مکان مل گیا۔ اب ایسا ٹھکانا کہاں ملے گا۔"

"استاد! مان گئے تم ہو بڑی چلتی رقم۔" قیصر مرزا بھی ہنسنے لگا۔

آغا نے بات کا رخ موڑتے ہوئے پوچھا۔ "یار یہ تو بتاؤ حیدر گڑھ میں طلعت آراء سے بھی تمہاری ملاقات ہوئی؟ رانی صاحبہ نے وعدہ بھی کیا تھا۔"

"نہیں، وہ وہاں نہیں آئی۔" قیصر مرزا کا لہجہ اچانک افسردہ ہو گیا۔

"تم اس کے زیورات لے کر گئے تھے؟"

"ہاں!" قیصر مرزا نے سخن سازی سے کام لیا۔ یہ جھوٹ اس نے اس لئے بولا تھا کہ اگر آغا کو یہ معلوم ہو گیا کہ زیورات ابھی تک موجود ہیں تو وہ ان کو فروخت کرنے پر زور دے گا۔ قیصر مرزا یہ چاہتا نہ تھا۔ ایک موہوم سی امید تھی کہ شاید زیورات واپس کرنے کے بہانے طلعت آرا سے ملاقات کی کوئی سبیل پیدا ہو جائے۔ وہ ابھی تک اسے بھولا نہیں تھا۔ حیدر گڑھ سے واپس آنے کے بعد تو اس کی یاد شدت سے تازہ ہو گئی تھی۔ اس نے بات میں وزن پیدا کرنے کے لئے آغا سے یہ بھی کہا۔ "طلعت آرا نہ ملی تو میں نے زیورات رانی صاحبہ کے حوالے کر دیئے کہ وہ طلعت آرا کو پہنچا دیں۔"

"سخت غلطی کی تم نے۔" آغا نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "تمہیں زیورات لے کر حیدر گڑھ جانا ہی نہیں چاہیئے تھا۔ اور اگر لے بھی گئے تھے تو طلعت آراء کے نہ آنے پر واپس لے آتے۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "تم نے ہاتھ آئی ہوئی دولت اپنے لونڈے پن سے گنوادی۔ زیورات بیچ کر اتنی رقم مل جاتی کہ اطمینان سے دفینہ حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی اور دونوں کی مزے سے گزر بسر ہوتی۔"

"اب تو جو ہونا تھا ہو گیا۔" قیصر مرزا نے اسے تسلی دی۔ "پریشان نہ ہو۔ تمہیں روپے کی ضرورت ہے۔ اس کا میں ابھی بندوبست کئے دیتا ہوں۔"

آغا نے کسی ردِ عمل کا اظہار نہ کیا۔ سر جھکائے خاموش بیٹھا رہا۔ اس کے چہرے پر

افسردگی چھائی ہوئی تھی۔ قیصر مرزا نے مزید بات چیت نہ کی۔ فوراً اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ زینہ طے کرکے اوپر اپنے کمرے میں پہنچا۔ صندوق کھولا۔ چوکنّا نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔ زیورات کی پوٹلی کو کپڑوں کے نیچے دبا کر چھپا دیا۔ چار سو روپے نکالے۔ صندوق بند کرکے قفل لگایا۔ کنجی سنبھال کر جیب میں رکھی اور واپس آغا جانی کے پاس چلا گیا۔

اس نے تیس روپے آغا کو دیتے ہوئے ایک بار پھر دل جوئی کی۔ "فکر نہ کرو۔ لو یہ روپے رکھ لو۔ ابھی میرے پاس اتنی رقم موجود ہے کہ تم کو پریشانی اٹھانا نہ پڑے گی۔ کام چلتا رہے گا۔"

آغا جانی نے روپے تو لے لئے مگر خاموش رہا۔

قیصر مرزا بھی زیادہ دیر نہ ٹھہرا۔ وہ شب بیداری اور سفر کی تکان سے نڈھال ہو رہا تھا۔ وہ جلد سے جلد اپنے گھر پہنچ کر آرام کرنا چاہتا تھا۔

☆

عشرت منزل سے نکل کر قیصر مرزا اپنے گھر کی جانب روانہ ہوا۔ راستے میں ایک گلی پڑتی تھی جو نواب پیارے آغا کے گھر کی جانب جاتی تھی۔ قیصر مرزا جب اس گلی کے نکڑ پر پہنچا تو معاً اسے پیارے آغا یاد آگیا جس نے گذشتہ شب بندوق سے گولی چلا کر اُسے ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی۔ قیصر مرزا نے اس کے خلاف سخت نفرت اور جھنجلاہٹ محسوس کی۔ غصّے سے اس قدر مغلوب ہوا کہ فوراً گلی میں داخل ہو گیا۔

پیارے آغا سے اس کی زیادہ یاد اللہ بھی نہ تھی وہ اس کے بیمار والد کی عیادت کے لئے پہلی بار نصرت علی خاں کے ہمراہ آیا تھا۔ بعد میں بھی ایک آدھ بار آیا تھا۔ قیصر مرزا اس کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا تھا۔ وہ اس کے والد کا شناسا تھا۔ البتہ نصرت علی سے اس کے گہرے مراسم تھے۔ انھی کی زبانی نواب پیارے آغا کے متعلق یہ معلوم ہوا تھا کہ وہ ایک بگڑا ہوا رئیس تھا۔ ایک زمانے میں وہ خاصا کھاتا پیتا اور خوش حال تھا۔ رہنے کے لئے عالیشان محل سرا تھی۔ نوکر چاکر تھے۔ ذاتی سواری بھی تھی۔ دو ہزار روپے ماہانہ وثیقہ ملتا تھا۔ دوسرے رئیسوں کی طرح اس کا بھی یہ معمول تھا کہ شام کو بگھی میں سوار

ہو کر اپنی حویلی سے نکلتا۔ بگھی وہ خود چلاتا تھا اور اس شان سے چلاتا تھا کہ ہاتھ میں چمڑے کا نفیس چابک دبا ہوتا۔ قریب ایک مصاحب بیٹھا ہوتا۔ کوچوان بگھی کی پشت کے پائدان پر مستعدی سے استادہ ہوتا۔ گول دروازے پر پہنچ کر بگھی کوچوان کے حوالے کرتا اور مصاحب کے ہمراہ چوک میں داخل ہو جاتا۔ جس طوائف سے مراسم ہوتے اس کے بالاخانے پر جاتا۔ اکثر شب باشی کرتا ورنہ پہر رات گزرے واپس گھر آجاتا۔

شادی کے بعد بھی نواب پیارے آغا کے معمولات میں فرق نہ آیا۔ رنڈی بازی کا شوق برقرار رہا۔ اس شوق کے ساتھ ساتھ کوکین کھانے کی بھی لت لگ گئی۔ اب وہ شام کو چوک میں داخل ہونے کے بعد سید صاحب تنبولی کی دوکان پر پہنچتا۔ کوکین کا ایک پان لے کر منہ میں رکھتا۔ اس کے مصاحب بدلتے رہتے تھے۔ اگر مصاحب بھی کوکین کا رسیا ہوتا تو اسے بھی ایک پان کھلاتا۔ بالاخانے پر جانے کے بعد ضرورت محسوس ہوتی تو مصاحب کے ذریعہ کوکین کے اور پان بھی منگوا لیتا۔ اسی زمانے میں ریس کھیلنے کا بھی شوق پیدا ہوا اور ایسا چسکا لگا کہ بلا ناغہ ہر ریس میں شریک ہوتا۔ رنڈی بازی ہی تباہی کے لئے کیا کم تھی۔ ریس نے رہی سہی کسر پوری کر دی۔ اخراجات پورے نہ ہوتے تو مہاجنوں سے قرض ادھار لینا پڑتا۔ قرض کا بار بڑھا تو اس کی ادائیگی کے لئے پہلے محل سرا رہن ہوئی پھر فروخت ہوئی۔ وثیقہ بھی رفتہ رفتہ فروخت ہونے لگا۔ اور پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ وہ بالکل قلّاش ہو گیا۔

بندوق چلانے کا شوق پیارے آغا کو لڑکپن ہی سے تھا۔ اس کے پاس مختلف ساخت کی بندوقیں تھیں۔ وہ خود کو میرن پہنچ بینی کا شاگرد بتاتا تھا۔ ان کے بارے میں طرح طرح کی روایات اور کہانیاں مشہور تھیں۔ وہ اپنے زمانے کے نہایت باکمال نشانے باز تھے۔ سر پر سیب رکھوا کر گولی سے اڑا دینے والے ماہر نشانہ باز تو بہت تھے مگر میرن پہنچ بینی کا کمال یہ تھا کہ عورت کو نتھ پہنا کر کھڑا کیا۔ بندوق اٹھا کر نشست باندھی۔ گولی چلائی۔ گولی نتھ کے اندر سے صاف گزر گئی۔ نشانے میں سرمو فرق نہ آیا۔ عورت کو یہ خبر نہ ہوئی کہ گولی کب نتھ کے اندر سے گزری اور کیسے گزری۔ کہا جاتا ہے کہ میرن کی شہرت

سن کر انگریز اسسٹنٹ کمشنر میجر جان ہیڈلے کو اشتیاق پیدا ہوا۔ وہ خود بھی بہت عمدہ نشانہ باز تھا اور اپنی مہارت کا اسے زعم بھی تھا۔ اس نے میرن پیچ بینی کو بلایا اور نشانہ بازی کا مظاہرہ کرنے کی فرمائش کی۔ میرن نے تانبے کے موٹے پیسوں کی تین اپنچ اونچی گڈی بنائی۔ گڈی کے بیچوں بیچ چاندی کی ایک عدد اٹھنی رکھی۔ سامنے کھڑے ہو کر بندوق داغی۔ گولی اس طرح ٹھیک نشانے پر لگی کہ اٹھنی نکل کر دور جا گری مگر پیسوں کی گڈی ہنوز اپنی جگہ قائم رہی۔ نہ گری نہ ذرا بھی خم ہوئی۔ میجر ہیڈلے یہ مہارت دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ ساتھ ہی جذبۂ حسد بھی پیدا ہوا۔ اس لے میرن کو نیچا دکھانے کے لئے چال چلی۔ اس کے حکم پر شیشے کے نہایت نازک کنول میں شمع روشن کی گئی۔ شرط یہ رکھی گئی کہ گولی سے شمع تو گل ہو جائے مگر کنول پر بال تک نہ آئے۔ میجر ہیڈلے کے اشارے پر عیاری یہ کی گئی کہ شمع کی بتی کنول کی لگر کے برابر اس طرح رکھی گئی کہ ذرا بھی نشانہ چوکے تو کنول کے پرخچے اڑ جائیں۔ میرن پیچ بینی نے بندوق سنبھال کر نشانہ لیا اور اس صفائی سے گولی چلائی کہ شمع کی جھلملاتی لو بجھ گئی۔ کنول صحیح سالم رہا۔ اس پر ذرا آنچ نہ آئی۔ جان ہیڈلے حیرت سے اُچھل پڑا۔ اس قدر محظوظ ہوا کہ میرن کو انعام و اکرام کے ساتھ ساتھ اعلیٰ کارکردگی کی سند بھی دی۔ اسلحہ خانے سے نئی قرابین نکلوا کر پیش کی۔

مشہور ہے کہ جب میرن پیچ بینی کی مہارت اپنے شباب پر تھی تو مٹی کے گھڑے پر نیم کی پتی اس طرح چپکا دیتے کہ بالائی حصہ الگ رہتا۔ میرن ذرا ترچھے کھڑے ہو کر نشانہ باندھتے اور اس خوبی سے گولی چلاتے کہ پتی دو ٹکڑے ہو جاتی مگر گھڑا نہ ٹوٹتا اور نہ اپنی جگہ سے مطلق کھسکتا۔

میرن پیچ بینی کے بارے میں اور نہ جانے ایسے ہی کتنے عجیب و غریب قصے مشہور تھے۔ سنانے والے مزا لے لے کر انہیں سناتے اور زیب داستاں کے لئے حاشیہ آرائی بھی کرتے۔ ان میں پیارے آغا بھی شامل تھا۔ وہ خود بھی ایسا ماہر نشانے باز تھا کہ اندھیرے میں صرف آواز سن کر گولی چلاتا اور اس کا نشانہ خطا نہ ہوتا۔ قیصر مرزا اس کی نشانے بازی کا یہ کمال دیکھ چکا تھا۔ اگر صندلی عین وقت پر آڑے نہ آتی تو وہ اس کے نشانے کی زد میں

آکر اپنی جان سے ہاتھ دھو چکا ہوتا۔

☆

گلی زیادہ کشادہ نہ تھی اور کوئی فرلانگ ڈیڑھ فرلانگ طویل تھی۔ قیصر مرزا نے گلی عبور کی۔ سامنے وسیع میدان تھا۔ میدان کے ایک گوشے میں نیم کا گھنا درخت تھا اور اس کے عقب میں نواب پیارے آغا کا گھر تھا۔ یہ پرانی وضع کا بوسیدہ مکان تھا۔ اس کی دیواروں پر برسوں سے قلعی نہیں ہوئی تھی۔ صدر دروازے پر ٹاٹ کا پردہ تھا۔

قیصر مرزا میدان سے گزر کر نیم کے درخت کی جانب بڑھا۔ مگر وہ نواب پیارے آغا کے مکان کے نزدیک بھی نہ پہنچا تھا کہ اسی اثناء میں ٹاٹ کا پردہ سرکا کر وہ برآمد ہوا۔ قیصر مرزا کو دیکھتے ہی ٹھٹکا اور حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے لگا۔

"آداب بجا لاتا ہوں۔" قیصر مرزا نے قریب پہنچ کر شائستگی سے کہا۔ "مزاج اقدس۔"

مگر پیارے آغا اس قدر حیران و پریشان تھا کہ کوئی جواب نہ دے سکا۔ گم صم کھڑا قیصر مرزا کے چہرے کو تکتا رہا۔

"اس قدر حیرت سے کیا دیکھ رہے ہیں؟" قیصر مرزا مسکرا کر گویا ہوا۔ "میں آپ کا نیازمند قیصر مرزا ہوں۔ پہچانا نہیں آپ نے؟"

"کیوں، کیوں نہیں پہچانا۔" پیارے آغا نے چونک کر جلدی جلدی آنکھیں جھپکائیں۔ خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ نرم لہجے میں دریافت کیا۔ "اس وقت کیسے آنا ہوا؟ آپ کے والد، قبلہ نواب بوٹا، تو خیریت سے ہیں۔"

"وہ تو خیریت سے ہیں۔ میں تو اس وقت اپنی خیریت بتانے کے لئے حاضر ہوا تھا۔" قیصر مرزا نے مسکرا کر طنزیہ لہجے میں کہا۔ "آپ تو یہ سمجھ رہے ہوں گے کہ میرا کام تمام ہو گیا۔ آپ کا نشانہ کہیں چوک سکتا ہے۔"

"جی، جی، یہ کیا فرما رہے ہیں آپ؟" پیارے آغا بوکھلا کر بولا۔ "میں آپ کی بات کا مطلب سمجھا نہیں۔"

"آپ سمجھنا بھی چاہیں تو سمجھ نہیں سکتے۔" قیصر مرزا نے اس دفعہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "کل رات آپ حیدر گڑھ میں تھے نا۔"

"حیدر گڑھ تو میں اکثر جاتا رہتا ہوں۔" پیارے آغا نے بتایا۔ "یہ تو آپ کو بھی علم ہے کہ مجھے شکار کھیلنے کا ہمیشہ سے شوق ہے۔ مگر آپ کو شاید علم نہ ہوگا کہ رانی حیدر گڑھ کو بھی شکار کھیلنے سے بہت دلچسپی ہے۔ نہ صرف خود شکار کھیلتی ہیں بلکہ حکام اور دوسرے معزز مہمانوں کے لیے اپنے علاقے میں شکار کا اہتمام بھی کرتی رہتی ہیں۔ اس سلسلے میں مجھے بھی بلا لیتی ہیں۔"

پیارے آغا ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ دراصل جب سے وہ معاشی طور پر تباہ حالی میں مبتلا ہوا تھا، شکار ایک طور سے اس کا ذریعہ معاش بن گیا تھا۔ اس کی نشانے بازی کا شہرہ دُور دُور تک تھا۔ لہٰذا شکار کے موقع پر اسے خاص طور پر مدعو کیا جاتا بلکہ کئی رجواڑوں اور رئیسوں کی سرکار سے مستقل ملازم کی حیثیت سے وابستہ بھی رہ چکا تھا۔ مگر کہیں ٹک کے نہ رہا۔ کچھ مدت تک ملازمت کرتا اور پھر اسے چھوڑ چھاڑ کر واپس لکھنؤ آجاتا۔ بگڑا ہوا رئیس تھا لہٰذا نازک مزاج بھی تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر مشتعل ہو جاتا۔ سُبکی اور بے عزتی محسوس کرتا۔ عزّت نفس اور آن کا مسئلہ بنا دیتا۔

قیصر مرزا نے اس کی باتیں سن کر تیکھے لہجے میں کہا۔ "تو گویا کل رات آپ شکار کھیلنے حیدر گڑھ گئے تھے۔ کسی جانور کا شکار کرنے گئے تھے یا میرا شکار کرنے۔"

"کیا فرمایا آپ نے؟" پیارے آغا چونکا۔ اس نے فوراً پینترا بدلا۔ صاف مُکر گیا۔ "کل رات تو میں حیدر گڑھ نہیں گیا۔ بلکہ کہیں بھی نہیں گیا۔ تمام وقت گھر ہی پر رہا۔"

"لیکن میں نے تو آپ کو حیدر گڑھ میں دیکھا۔ سنی سنائی بات نہیں کہہ رہا ہوں۔ خود اپنی آنکھوں سے آپ کو اڈے پر ایک لاری سے اُترتے ہوئے دیکھا تھا۔"

"میرا خیال ہے کہ آپ کو مغالطہ ہوا۔" پیارے آغا نے بات بنانے کے لئے ازراہ تفنن کہا۔ "میرا مشورہ ہے کہ آپ اپنی آنکھوں کا علاج کرائیں۔ عینک لگایا کریں۔"

"بینائی کے ساتھ ساتھ کیا میرے کان بھی بہرے ہو گئے ہیں؟" قیصر مرزا نے تیکھے

لہجے میں کہا۔ "جب آپ نے صبح پانچ بجے کے قریب نام لے کر مجھے پکارا تو میں نے جواب بھی دیا تھا۔ کیا یہ بھی غلط ہے؟"

"میں پھر یہی عرض کروں گا آپ کو مغالطہ ہوا" پیارے آغا نے اس دفعہ بھی سخن سازی سے کام لیا۔ نہایت سنجیدہ لہجے میں گویا ہوا۔ "میاں صاحبزادے، آپ یقین مانیں میں تو شام ہی سے بستر پر پڑا تھا۔ طبیعت کچھ ناساز تھی۔ سر میں درد تھا۔ ہلکا ہلکا بخار بھی تھا۔ اس وقت بھی حکیم آغائی صاحب کے مطب جانے کے لئے گھر سے نکلا تھا۔"

وہ مسلسل جھوٹ بولتا رہا۔ قیصر مرزا کو غصہ تو آیا مگر وہ طرح دے گیا۔ "دیکھئے پیارے آغا صاحب، میں آپ سے اُلجھنا نہیں چاہتا۔ صرف یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ میں نے آپ کا کیا بگاڑا۔ کسی قسم کی رنجش یا لاگ ڈانٹ بھی نہیں۔ پھر آپ نے کیوں میری جان لینے کی کوشش کی۔ مجھے کیوں قتل کرنا چاہا؟" اس کا لہجہ اچانک تلخ ہو گیا۔ "یہ بھی نہ سوچا کہ میرے والد آپ کے ملنے والے ہیں۔ سخت علیل بھی ہیں۔ صرف چھ ہزار روپے کی خاطر آپ نے میری زندگی کا چراغ گل کرنا چاہا۔"

اس انکشاف پر پیارے آغا شعلے کی مانند بھڑک اٹھا۔ غضب ناک ہو کر بولا۔ "کیا اول فول بک رہے ہو۔ تمہارے ہوش تو بجا ہیں۔ کچھ بھنگ دنگ چڑھا کر تو نہیں آرہے ہو۔" اس نے نفرت سے منہ بگاڑ کر قیصر مرزا کو دھتکارا۔ "دُور ہو جاؤ میری نظروں کے سامنے سے۔ میں تم سے بات کرنا نہیں چاہتا۔"

پیارے آغا غصے سے بڑبڑاتا ہوا مڑا اور اپنے گھر کی جانب بڑھا۔ قیصر مرزا بھی اب آپے سے باہر ہو گیا تھا۔ اس نے جھپٹ کر اس کا کندھا پکڑا اور زور سے جھٹکا دیا۔ ہاتھ تو کندھے پر سے پھسل گیا البتہ پیارے آغا کے کرتے کا گریبان انگلیوں میں دبا رہا۔ قیصر مرزا نے جھنجھلا کر کہا۔ "یوں نہیں جانے دوں گا۔ میری بات کا جواب دینا ہوگا۔" وہ قہر آلود نظروں سے نواب پیارے آغا کو گھورنے لگا۔

"جواب چاہتا ہے تو لے جواب۔" پیارے آغا نے پلٹ کر تڑاق سے قیصر مرزا کے منہ پر تھپڑ مارا۔ پیارے آغا اب ادھیڑ ہو چکا تھا۔ سر اور مونچھوں کے بال کھچڑی ہو چکے

تھے۔ مگر ہاتھ پیروں میں ابھی خاصا کس بل تھا۔ ہاتھ ایسا کرارا پڑا کہ قیصر مرزا کا دماغ تک جھنجھنا گیا۔ اس نے تڑپ کر ہاتھ میں دبے ہوئے کرتے کے گریبان کو کھینچا۔ گریبان چرسے پھٹ گیا۔

گریبان پھٹا تو پیارے آغا اور برافروختہ ہوگیا۔ اس نے دوبارہ تھپیڑ مارنا چاہا تو قیصر مرزا نے جھٹ اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ دونوں زور آزمائی کرتے ہوئے گتھم گتھا ہوگئے۔ قیصر مرزا جوان تھا۔ بدن بھی اس کا مضبوط اور کسا ہوا تھا۔ برسوں چھوٹے سید کے اکھاڑے میں زور بھی کرتا رہا تھا۔ پیارے آغا اس کے سامنے زیادہ دیر نہ ٹھیر سکا۔ لڑکھڑا کر گر پڑا۔ قیصر مرزا نے اسے سنبھلنے کا موقع نہ دیا۔ جھپٹا اور اس کے سینے پر سوار ہوگیا۔ ایک ہاتھ سے ٹینٹوا دبا کر چیخا۔

”ابے بڈھے جھڑوس! کل رات تو میری جان لینا چاہتا تھا۔ اب میری باری ہے۔ تجھے بخشوں گا نہیں۔“

نواب پیارے آغا نے قیصر مرزا کے ہاتھوں کی گرفت سے نکلنے کے لئے بدحواس ہوکر ہاتھ پاؤں مارے۔ وہ قیصر مرزا کی گردن پکڑنا چاہتا تھا۔ گردن تو ہاتھ آئی نہیں صرف اچکن تک ہاتھ پہنچا۔ اسے پکڑ کر کھینچا۔ اچکن پھٹی نہیں البتہ اس کے بٹن ٹوٹ ٹوٹ کر اِدھر اُدھر بکھر گئے۔ قیصر مرزا نے جھنجھلا کر اس کا ٹینٹوا اور زور سے دبایا۔ دوسرے ہاتھ سے منہ پر زناٹے کا ایک جھاپڑ بھی رسید کیا۔

پیارے آغا نے بے بسی سے اِدھر اُدھر گردن ہلائی اور زور زور سے چیخنے چلّانے لگا۔ ”ابے بدذات میری گردن تو چھوڑ۔ کیا مار ڈالنے کا ارادہ ہے؟“ وہ اسے اونچی آواز سے برا بھلا کہنے لگا۔ گالم گلوچ کرنے لگا۔

قیصر مرزا نے غضبناک ہوکر اس کی گردن پر رکھے ہوئے ہاتھ کا شکنجہ کچھ اور کسا تو پیارے آغا سراسیمہ ہوکر نہایت بے ہنگم آواز میں چیخا۔ ”ہائے مرا۔“

میدان اس وقت بالکل سنسان تھا۔ دُور دُور تک کوئی نظر نہ آتا تھا۔ مگر نواب پیارے آغا کا گھر نزدیک تھا۔ اس کی چیخ پکار گھر میں پہنچی تو بیوی حواس باختہ ہوکر بیرونی دروازے

پر پہنچی۔ ٹاٹ کا پردہ کھسکا کر باہر دیکھا۔ قیصر مرزا ابھی تک پیارے آغا کے سینے پر سوار تھا اور ایک ہاتھ سے اُس کا ٹینٹوا دبائے ہوئے تھا۔ بیوی نے میاں کی یہ درگت دیکھی تو کوسنوں کے ساتھ ساتھ دہائی بھی دینے لگی۔

"ارے لوگو! دیکھو یہ مُوا مسٹنڈا نواب صاحب کو مارے ڈال رہا ہے۔ ہائے، کیسی بے دردی سے گردن دبوچے ہوئے ہے۔ اللہ کرے اس کے ہاتھ ٹوٹیں۔ ڈھائی گھڑی کی موت آئے۔ مولا علی کی تیغ ٹوٹے۔ جوانا مرگ کیسا سینے پر چڑھا بیٹھا ہے۔ اسے رات دیکھنا نصیب نہ ہو۔ سوتا کا سوتا رہ جائے۔"

اس کی چیخ پکار دُور دُور تک سنائی دینے لگی۔ پاس پڑوس کے کمروں کے دروازے کھلنے لگے۔ پڑوسی گھبرائے ہوئے گھروں سے نکلے۔ بھاگتے ہوئے دونوں کے قریب پہنچے۔ قیصر مرزا کو گھسیٹ کر علیحدہ کیا۔ نواب پیارے آغا کچھ دیر تو بے حال فرش پر پڑا رہا اور زور زور سے ہانپتا رہا۔ پھر کپڑے جھاڑتا ہوا اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ خونخوار نظروں سے قیصر مرزا کو گھورتے ہوئے بولا۔

"طبیعت میری ٹھیک نہیں تھی۔ تو نے بیماری سے فائدہ اٹھایا۔ آئندہ سمجھ لوں گا۔ تجھے چھوڑوں گا نہیں۔"

"کچھ اور لے گا۔" قیصر مرزا نے تڑپ کر جھٹکا دیا۔ خود کو لوگوں کی گرفت سے آزاد کرایا۔ جھپٹ کر آگے بڑھا اور پیارے آغا کو مارنا پیٹنا چاہا۔ دونوں ایک بار پھر گتھم گتھا ہو گئے۔ مگر لوگوں نے دونوں کو دبوچ کر علیحدہ کیا۔ قیصر مرزا کو ایک طرف کیا اور پیارے آغا کو دوسری طرف۔ قیصر مرزا غضب ناک ہو کر بار بار خود کو آزاد کرا لیتا۔ نواب پیارے آغا کی جانب غصے سے دھاڑتا ہوا جھپٹا۔ "ابے چنڈول! جو کچھ کرنا چاہتا ہے ابھی کر لے۔ کوئی حسرت دل میں نہ رہے۔"

لیکن اسے پیارے آغا کے قریب نہ پہنچنے دیا گیا۔ پوچھنے والے دونوں سے جھگڑے کا سبب پوچھتے تھے۔ مگر نہ پیارے آغا نے کچھ بتایا اور نہ ہی قیصر مرزا نے۔ دونوں ہی صاف بات بتانے سے کترا رہے تھے۔ آخر کسی نہ کسی طور بڑے بوڑھوں نے سمجھا بجھا کر بیچ بچاؤ

کرایا۔ دونوں کو ٹھنڈا کیا۔ نواب پیارے آغا کو گھر میں بھیجا۔ مگر اس نے گھر کے دروازے میں داخل ہوتے ہوئے پلٹ کر قیصر مرزا کو قہر آلود نظروں سے دیکھا اور چیخ کر دھمکی دی۔

"کسی ہوا میں نہ رہنا۔ اب جو ہتھے آ گیا تو کام تمام کر کے چھوڑوں گا۔ لاش کا بھی پتہ نہ چلے گا۔ یاد رکھنا۔ میرا نام نواب پیارے آغا ہے۔ میں تو بڑے بڑوں کو دیکھ چکا ہوں۔ تیری کیا حقیقت ہے۔ کل کا لونڈا۔"

قیصر مرزا اس کی دھمکی سے ذرا مرعوب نہ ہوا۔ بپھر کر خود کو لوگوں کی گرفت سے چھڑانا چاہا۔ مگر اسے آگے نہ بڑھنے دیا گیا۔ نواب پیارے آغا کو بھی کسی نہ کسی طرح گھر کے اندر پہنچا دیا گیا۔

٭

دھوپ کی تمازت بڑھ گئی تھی۔ ہوا بند تھی۔ قیصر مرزا اپنے گھر میں داخل ہوا تو پسینے سے شرابور تھا۔ حلیہ بھی اس کا بگڑا ہوا تھا۔ شب بیداری سے آنکھیں سُرخ ہو رہی تھیں، چہرے کا رنگ اڑا ہوا تھا۔ بال پریشان تھے۔ اچکن کے بٹن ٹوٹے ہوئے تھے۔ لباس خاک سے لتھڑا ہوا تھا۔ رُخساروں اور گردن پر کہیں کہیں خراشیں بھی تھیں۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ کسی سے دھینگا مشتی کر کے آیا ہے۔

اس نے چاہا کہ ماں کی نظریں بچا کر سیدھا اپنے کمرے میں چلا جائے۔ مگر ماں کی اس پر نظر پڑ گئی۔ چھوٹی بہن زہرہ اسے پہلے ہی دیکھ چکی تھی۔ ماں کے ٹوکنے سے پہلے ہی وہ گھبرا کر بولی۔ "اماں جان! ذرا بھائی جان کو تو دیکھئے، ان کی کیا حالت ہو رہی ہے۔"

ماں نے فوراً اسے مخاطب کیا۔ "قیصر! اُدھر کہاں چلا؟ میرے پاس تو آ۔"

قیصر مرزا آگے نہ بڑھ سکا۔ مڑا اور جھجکتا ہوا ماں کے قریب پہنچ گیا۔ ماں نے پریشان ہو کر ماتھے پر ہاتھ مارا۔ "یا اللہ خیر! ارے بیٹے، یہ تیرا کیا حال ہو رہا ہے؟"

اس نے ٹالنا چاہا۔ فوراً بات بنائی۔ "آپ تو خواہ مخواہ پریشان ہو جاتی ہیں۔ کچھ بھی تو نہیں ہوا۔ گھر واپس آ رہا تھا کہ ایک موڑ پر سامنے سے اچانک ایک بیل بھاگتا ہوا آ گیا۔ اس سے

بچنے کے لئے ایک طرف ہٹا تو گھبرا کر لڑکھڑا گیا۔ قریب ہی ایک گڑھا تھا اس میں گر گیا۔ خیریت ہوئی کہ کہیں چوٹ چپیٹ نہیں آئی۔"

"ارے لڑکے کیوں میری آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش کر رہا ہے۔ میں تیری ماں ہوں۔ پال پوس کر اتنا بڑا کیا ہے۔" ماں نے کھل کر اپنے شک و شبے کا اظہار کیا۔"گڑھے میں گرنے سے اچکن کے بٹن بھی ٹوٹ جاتے ہیں؟ تو ضرور کسی سے جھگڑا فساد کر کے آرہا ہے۔ سچ سچ بتا کیا ہوا؟"

قیصر مرزا سخت شرمندہ ہوا۔ اس نے جو عذر تراشا تھا کارگر ثابت نہ ہوا۔ نظریں جھکا کر جھجکتے ہوئے بولا۔"صبح ہی صبح ایک شخص سے جھائیں جھائیں ہوگئی۔ بات بڑھی تو ہاتھا پائی کی نوبت آگئی۔ مگر راہ گیروں نے فوراً بیچ بچاؤ کرادیا۔"

"کون تھا وہ؟"

"اس کا نام اشتیاق ہے۔ آغا جانی کا ملنے والا ہے۔ آپ اُسے نہیں جانتیں۔"

"میں نے ہزار بار کہا تو اس موئے آغا جانی کا ساتھ چھوڑ دے۔" ماں نے تیکھے لہجے میں کہا۔"سمجھ میں نہیں آتا اس لچے لفنگے میں تجھے کیا خوبی نظر آتی ہے کہ ہر دم سائے کی طرح اسے لگائے رہتا ہے۔ کچھ اپنی خاندانی حیثیت کا تو خیال کر۔ اس کی صحبت میں رہے گا تو آئے دن اسی طرح دنگا فساد ہوتا رہے گا۔"

قیصر مرزا نے خاموش رہنے میں عافیت سمجھی۔ ماں نے جو کچھ کہا اس نے کان دبا کر سن لیا۔ حمام میں گیا۔ نہا دھو کر لباس تبدیل کیا اور باپ کے پاس چلا گیا۔ پچھلے دنوں ان کی طبیعت پھر بگڑ گئی تھی۔ وہ بالکل لت پت پڑے تھے۔ آنکھیں بند تھیں اور رک رک کر سانس بھر رہے تھے۔ قیصر مرزا کچھ دیر ان کے پاس بیٹھا رہا پھر بستر پر جا کر لیٹ گیا۔

رات بھر کا جاگا ہوا تھا۔ ایسی گہری نیند سویا کہ شام کو آنکھ کھلی۔

منہ ہاتھ دھو کر وہ ماں کے پاس گیا تو اسے گھر کی فضا کچھ بدلی بدلی نظر آئی۔ اس کی خالہ بھی موجود تھیں اور ماں کے پاس ہی بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہ قیصر مرزا کی ماں سے بڑی تھیں۔ ایک عرصے سے ریاست رام پور میں مقیم تھیں۔ ان کے میاں خاندانی طبیب تھے اور معالج

کی حیثیت سے خاصے معروف تھے۔ ان دنوں دربار رام پور سے وابستہ تھے۔ نواب صاحب کے خاص معالجین میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ وہ تو لکھنؤ کم ہی آتے تھے مگر خالہ سال ڈیڑھ سال میں مہینہ بھر کے لئے چھوٹی بہن اور دوسرے عزیز و اقارب سے ملنے ضرور آتی تھیں۔ قیصر مرزا کی ماں کے سوا نہ ان کا کوئی بھائی تھا اور نہ بہن تھی۔ ماں باپ کا بھی انتقال ہو چکا تھا۔ لہٰذا دونوں بہنوں میں بہت ایکا سلوک تھا۔ ایک دوسرے پر جان چھڑکتی تھیں۔ وہ ہمیشہ ٹھہرتی بھی چھوٹی بہن کے ساتھ ہی تھیں۔ خالہ کو لکھنؤ آئے ہوئے تو لگ بھگ مہینہ بھر ہو چکا تھا لیکن گذشتہ ایک ہفتے سے سسرال میں تھیں۔ ان کے سسر ابھی حیات تھے۔

خالہ کچھ ہی دیر پہلے سسرال سے واپس آئی تھیں۔ قیصر مرزا نے آداب کیا۔ انہوں نے دعائیں دیں اور اسے اپنے قریب ہی بٹھا لیا۔ بات چیت شروع ہوئی تو قیصر مرزا کو والدہ کی زبانی معلوم ہوا کہ ان کو نواب پیارے آغا سے اس کے جھگڑے کی اطلاع پہنچ چکی تھی۔ لیکن انہیں یہ پتہ نہیں چل سکا تھا کہ جھگڑا کیوں ہوا اور کس بات پر ہوا البتہ ان کو یہ علم ضرور تھا کہ نواب پیارے آغا نے اسے قتل کرنے کی دھمکی دی ہے۔ اس دھمکی نے نہ صرف ان کو بلکہ گھر بھر کو سخت تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔ خالہ بھی خوف زدہ تھیں۔ کہنے لگیں۔

”قیصر بیٹے ! تم نے پیارے آغا سے دشمنی مول لے کر اچھا نہیں کیا۔ سنا ہے وہ تو بڑا شورہ پشت ہے۔ بات بات پر بندوق نکال لیتا ہے۔ عادات و اطوار بھی اس کے ٹھیک نہیں۔ اوباش اور بدقماش لوگوں کی صحبت میں رہتا ہے۔ تب ہی تو لاکھ کا گھر خاک میں ملا دیا۔ اچھا کھاتا پیتا رئیس تھا۔ سب کچھ تباہ کر کے اب ادھر اُدھر نوکریاں کرتا پھرتا ہے۔ اس کے بارے میں طرح طرح کی باتیں مشہور ہیں۔“

اے باجی ! وہ بہت خطرناک شخص ہے۔ ” قیصر مرزا کی ماں نے پیارے آغا کے خلاف اپنی نفرت کا اظہار کیا۔ ”میں تو یہ کہتی ہوں کہ یہ کیوں اس سے الجھا۔“ انھوں نے مُڑ کر قیصر مرزا کو دیکھا۔ ” خیریت یہ ہوئی کہ اس کے ابا کو کچھ نہیں معلوم ورنہ ان کی طبیعت

اور بگڑ جاتی۔"

"بس تم وہی کرو جو میں نے کہا ہے۔" خالہ نے مشورہ دیا۔ "تم ان کو لے کر میرے ساتھ رام پور چلو۔ تمہارے دولہا بھائی بھی یہی کہتے تھے۔ وہ تو علاج کریں گے۔ اللہ نے ان کے ہاتھ میں شفا دی ہے۔ ان کے علاج سے مرض میں ضرور افاقہ ہوگا۔ کیسے کیسے جاں بلب مریض ان کے علاج معالجے سے شفا پا چکے ہیں۔ ان کا علاج تو وہ اور بھی توجہ سے کریں گے۔" انھوں نے خاصدان سے گلوری نکال کر منہ میں رکھی۔ "قیصر کو بھی ساتھ لیتی چلو۔ اس کا یہاں رہنا ٹھیک نہیں۔ دشمن سے کبھی غافل نہیں رہنا چاہیئے۔"

قیصر مرزا دونوں کی گفتگو خاموشی سے سر جھکائے سنتا رہا مگر اب خاموش نہ رہ سکا۔ "یہاں کے حکیم صاحب کے علاج سے آبا جان کو فائدہ ہے۔ اس وقت ان کا علاج ختم کرنا مناسب نہ ہوگا۔"

مگر نہ ماں نے اس کی تائید کی اور نہ ہی خالہ نے۔ بلکہ خالہ کا اصرار اور بڑھ گیا۔ قیصر مرزا رام پور جانا نہ چاہتا تھا مگر خالہ اور ماں کے سامنے اس کی ایک نہ چلی۔ کوئی عذر، کوئی دلیل کارگر ثابت نہ ہوئی۔ ان کی گفتگو سے اسے اندازہ ہوا کہ وہ اس سلسلے میں پہلے ہی سوچ بچار کر چکی تھیں۔

اسی وقت سے رام پور جانے کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ قیصر مرزا پر سختی سے پابندی لگا دی گئی کہ گھر سے باہر نہ نکلے۔ وہ ذرا نظروں سے اوجھل ہوتا ماں فوراً پوچھ گچھ کرتیں۔

دو روز وہ گھر سے باہر نہ نکل سکا۔ تیسرے روز شام ہوتے ہی وہ سب کی نظریں بچا کر باہر چلا گیا۔ سیدھا عشرت منزل پہنچا۔ مگر دروازے میں قفل پڑا تھا۔ قیصر مرزا نے اس کنجی سے قفل کھولنے کا ارادہ کیا جو اس کے پاس رہتی تھی۔ اس نے کرتے کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ لیکن کنجی موجود نہ تھی۔ کنجی اچکن کی جیب میں تھی اور اچکن گھر میں کھونٹی پر لٹک رہی تھی۔ وہ اس گھبراہٹ کے عالم میں گھر سے نکلا تھا کہ کنجی لینے کا نہ موقع ملا اور نہ ہی اس طرف اس کا دھیان گیا۔

قیصر مرزا دروازے کے قریب کھڑا آغا جانی کا انتظار کرتا رہا۔ وہ رام پور جانے سے

پہلے آغا جانی کو صورت حال سے آگاہ کرنا چاہتا تھا۔ مگر آغا جانی کا کہیں پتہ نہ تھا۔ دروازے کے قریب یوں مشتبہ حالت میں کھڑا رہنا اسے معیوب معلوم ہوا۔ لہٰذا وہ وہاں سے ہٹ گیا۔ اِدھر اُدھر گلیوں میں گھومتا رہا اور وقفے وقفے سے عشرت منزل کے دروازے پر پہنچتا۔ لیکن ہر بار اسے دروازہ بند ملتا۔

شام اب ختم ہو چکی تھی۔ رات در و بام سے نیچے اُتر آئی تھی۔ ہر طرف اندھیرا پھیل چکا تھا اور اس اندھیرے میں جگہ جگہ چراغ جھلملا رہے تھے۔ پھر رات گزر گئی مگر آغا جانی نظر نہ آیا۔ خدا معلوم اس روز وہ کہاں چلا گیا تھا۔ آخر مایوس ہو کر قیصر مرزا واپس گھر چلا گیا۔

آدھی رات تک سفر کی تیاری ہوتی رہی۔ گھر میں ہر طرف ہنگامہ تھا، چہل پہل تھی۔ لمبا سفر تھا۔ کھانے پینے کی اشیاء کے علاوہ ضرورت کا دوسرا ساز و سامان تیار کیا جا رہا تھا۔ سب پر سفر سوار ہو چکا تھا۔ کوئی بھی نیند بھر کے نہ سو سکا۔

صبح ہوئی۔ ساڑھے نو بجے کی ٹرین سے قیصر مرزا سفر پر روانہ ہو گیا۔ اس کے ہمراہ خالہ کے بال بچوں کے علاوہ بیمار والد تھے۔ ماں تھی۔ بن بیاہی چھوٹی بہن تھی۔ ایک خادمہ اور ایک ملازم بھی تھا۔ ریل گاڑی کھٹ کھٹ کرتی لوہے کی پٹریوں پر تیزی سے دوڑ رہی تھی۔ قیصر مرزا اپنی نشست پر گم صم بیٹھا تھا۔ اسے رہ رہ کے عشرت منزل یاد آ رہی تھی جہاں کچھ دیر بیٹھ کر وہ آغا جانی سے بات چیت کرنا چاہتا تھا۔

پنجم

(۱)

جاڑا ختم ہو چکا تھا۔ گرمی کی آمد آمد تھی۔ دن میں دھوپ ناگوار گزرتی مگر رات کو ہلکی ہلکی خنکی ہو جاتی۔ اس روز شام ہوتے ہی شہر کی رونق بہت بڑھ گئی تھی۔

دریائے گومتی کے کنارے جہاں رات کو ہو کا عالم ہوتا تھا آج جھٹ پٹا ہوتے ہی چہل پہل شروع ہو گئی تھی۔ راج گھاٹ پر چراغاں کا اہتمام کیا گیا تھا۔ گھاٹ کے جھروکوں میں چراغ روشن تھے۔ برج کے نیچے دریا آہستہ آہستہ بہہ رہا تھا۔ چراغوں کی روشنی پانی کی لہروں پر جھلملا رہی تھی۔ دریا پر آنے والوں کی تعداد میں برابر اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ ریت پر چلنے والے سایوں کی مانند نظر آرہے تھے۔ رات جس قدر کالی ہوتی جا رہی تھی، پکّے پل پر ملی جلی آوازوں کا شور اسی قدر بڑھتا جا رہا تھا۔

پہر رات گزر چکی تھی۔ پل پر نوجوانوں کی ٹولیاں اِدھر اُدھر منڈلا رہی تھیں۔ جگہ جگہ آتش بازی چھوڑنے والوں کا ہجوم تھا۔ طرح طرح کی آتش بازی کا مظاہرہ کیا جا رہا تھا۔ شعبان کا چاند دیکھتے ہی آتش بازی کی تیاری کا کام تیز ہو جاتا تھا۔ نت نئے انداز سے پٹاخوں میں ندرت اور انفرادیت پیدا کی جاتی۔ آج کی رات ان کا مظاہرہ پکّے پل پر ہوتا۔ ایک دوسرے

کو للکار کر مقابلے ہوتے۔ شرطیں بدی جاتیں۔ ہار جیت میں گالی گلوچ کی نوبت آجاتی۔ کہیں کہیں سر پھٹول بھی ہو جاتی۔

آج شب برات تھی۔ مرنے والوں کی یاد تازہ کرنے کا تہوار۔ دن نکلتے ہی طرح طرح کے حلوے تیار کرنے کا اہتمام ہونے لگتا۔ چولہے دہکنے لگتے۔ میٹھی میٹھی خوشبو ہر طرف پھیلتی۔ دن ڈھلے پاس پڑوس اور عزیز و اقارب کو حصے پہنچائے جاتے۔ کہار سروں پر خوان اٹھائے گلی کوچوں میں تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے نظر آتے۔ ڈیوڑھی پر پہنچ کر ہانک لگاتے۔ خوان زنان خانے میں پہنچاتے۔ انعام و اکرام پاتے اور دعائیں دیتے ہوئے دوسری ڈیوڑھیوں کی جانب روانہ ہو جاتے۔

آفتاب غروب ہوتے ہی شب برات کی رونق اپنے عروج پر پہنچ جاتی۔ نذر نیاز ہوتی۔ آتش بازی چھوڑی جاتی۔ بچے ہنستے، قہقہے لگاتے، تالیاں بجاتے۔ ان کی چیخ پکار بڑھتی جاتی۔ شام کا دھندلکا رات کی تاریکی میں ڈھل جاتا تو مرد گھروں سے نکل کر عیش باغ کا رخ کرتے۔ قبرستان پہنچتے۔ قبروں پر فاتحہ پڑھتے۔ مرنے والوں کے لئے دعائے مغفرت کرتے۔ یہ شب قدر ہے۔ آج کی رات موت و حیات کا اعمال نامہ بارگاہ الٰہی میں پیش ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ آسمان سے زمین کی جانب نزول فرماتا ہے۔ رحمتِ الٰہی ندا دیتی ہے کہ ہے کوئی روزی کا طلب گار کہ اسے رزق عطا ہو۔ ہے کوئی طالب مغفرت کہ اسے بخشش ودیعت ہو اور ہے کوئی آفات و مصائب سے رستگاری کا آرزومند کہ اس کی مشکلیں آسان ہوں۔ یہ منادی طلوع سحر تک جاری رہتی ہے۔

عبادت گزار تمام رات مساجد میں یاد الٰہی کریں گے۔ ان میں بڑی تعداد میں ضعیف العمر اور نکوکار ہوتے ہیں۔ منچلے نوجوان دریائے گومتی کا رُخ کرتے ہیں جہاں آتش بازی کے نت نئے کمالات دکھائے جاتے ہیں۔ ہر سو روشنی کی ایسی بارش ہوتی ہے کہ رات پر دن کا گماں ہوتا ہے۔

★

چاند طلوع ہو کر درختوں کی بلندی پر پہنچ گیا تھا۔

پلوں کے نیچے گومتی کا پانی خاموشی سے بہہ رہا تھا۔ لوہے والے پل کے آس پاس کے ریتیلے میدان میں آنے والوں کا ہجوم بڑھتا جا رہا تھا۔ ان میں نوجوان اور بوڑھے تھے۔ عورتیں اور بچے بھی تھے۔ خوانچے والے طرح طرح کی صدائیں لگا رہے تھے۔ جگہ جگہ دکانیں بھی تھیں ملی جلی انسانی آوازوں کا شور بلند ہوتا تھا۔ ہر طرف میلے کا سماں تھا۔

شعبان کی چودھویں رات کا پورا چاند نکلا ہوا تھا۔ اجلی اجلی چاندنی میں راج گھاٹ کی کالی کلوٹی بوسیدہ دیواریں بھی نمایاں ہو گئی تھیں۔ پھر رات گزرتے ہی گھاٹ پر لوگوں کی آمد بڑھ گئی تھی۔ مشہور ہے کہ اس گھاٹ کی تعمیر راجہ مہرہ کی نگرانی میں سالہا سال قبل شاہی عہد میں ہوئی تھی۔ اس کے دو برج تھے اور دو منزلہ تھے۔ کسی زمانے میں نچلی منزل میں امراء اور خاندان اجتہلو کے مردوں کو غسل دیا جاتا تھا۔ اب یہ سلسلہ بند ہو چکا ہے۔ گھاٹ شکستہ ہو چکا ہے۔ ایک برج ۱۸۹۴ء کی قیامت خیز بھیا میں طوفانی لہروں کی زد میں اس طرح آیا کہ منہدم ہو کر غرق آب ہو گیا۔ گھاٹ کی سیڑھیاں بھی جگہ جگہ سے ٹوٹ پھوٹ گئی تھیں۔ صرف ایک برج گھاٹ کی یادگار رہ گیا تھا جس کی دونوں منزلیں موجود تھیں۔ اوپر کی منزل سے تیراک دریا میں چھلانگیں لگاتے۔ غوطے لگاتے، نہاتے دھوتے۔ برسات میں جب دریائے گومتی چڑھتا تو نچلی منزل پانی میں ڈوب کر اوجھل ہو جاتی۔ عام دنوں میں یہ برج ویران اور اجاڑ رہتا تھا۔ کبھی کبھار موسم گرما میں دھوپ کی تمازت سے بچنے کے لئے کوئی تھکا ہارا راہگیر وہاں ٹھہر کر سستاتا۔ کچھ دیر آرام کرتا اور پھر اپنی راہ لیتا۔

راج گھاٹ کی سیڑھیاں چاندنی میں سیاہ لکیروں کی مانند نظر آ رہی تھیں۔ دھندلی دھندلی روشنی میں ایک ادھیڑ شخص آہستہ آہستہ سیڑھیوں سے نیچے اترا۔ اس کے ہاتھ میں حلوے سے بھرا طباق دبا تھا جس پر رنگ برنگی موم بتیاں روشن تھیں۔ ہوا کا جھونکا آیا۔ موم بتیوں کی لو تھرتھرائی۔ زرد زرد روشنی کا حلقہ اس کے چہرے پر لہرانے لگا۔ وہ کچھ اور جھک گیا اور کبڑوں کی طرح خمیدہ ہو کر ڈگمگاتے قدموں سے آخری سیڑھی پر پہنچا۔ دریا کی لہریں اب اس کے برہنہ پیروں کو چھو رہی تھیں۔ اس نے دونوں ہاتھ بڑھا کر حلوے کا طباق ہولے سے لہروں پر تیرا دیا۔ موم بتیاں جھلملا رہی تھیں اور طباق آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا

تھا۔ اس شخص نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے۔ کہیں قریب سے صدا بلند ہوئی۔ "یارزاق! پرسوں ریس میں البیلی کو جیتوادو۔" دعا مانگنے والے نے چونک کر اس طرف دیکھا۔ یہ گویا تائید غیبی تھی۔ وہ اپنی جوان بیٹی کے ہاتھ پیلے کرنے کا آرزومند تھا۔ اس نے دعا مانگی اور اُمیدوں سے لدا پھندا واپس ہوا۔

☆

رات آہستہ آہستہ اپنا سفر طے کرتی رہی۔ دریائے گومتی سبک خرامی سے بہتا رہا۔ پکّے پل پر آتش بازی چھوٹ رہی تھی۔ دھماکوں کی گھن گرج رک رک کر ابھرتی تھی۔ ہوائیاں روشنی کی لکیریں کھینچتی ہوئی سائیں سائیں گزر رہی تھیں۔ کرنجوے سرسراتے ہوئے اُبھرتے اور بلندی پر دور دُور تک طرح طرح کی روشنیاں بکھیرتے۔ نوجوان غل غپاڑہ مچاتے تھے۔ دریا کی لہروں پر جگہ جگہ حلوے کے طباق تیر رہے تھے۔ موم بتیاں ہوا کے جھونکوں سے جھل ملا رہی تھیں۔ پل کے نشیبی میدان میں نیمہ شعبان کے جشن کی رونق دوبالا ہوگئی۔ ہر طرف گہما گہمی تھی۔ چہل پہل تھی۔ مسرت اور شادمانی کی فراوانی تھی۔

رات نے کچھ اور سفر طے کیا۔ رات آدھی ہوگئی۔ رات ڈھلنے لگی۔ شعبان کی مقدس رات کا گول گول چمکتا دمکتا سنہرا چاند آسمان کے مغربی گوشے میں پہنچ گیا تھا۔ چاندنی اور اجلی اور تابناک ہوگئی تھی۔ ریت کے ذرّے ننھے ننھے ستاروں کی مانند جگمگا رہے تھے۔

آغا جانی بار بار بے چینی سے پہلو بدلتا۔ گھاٹ کی سیلی ہوئی سیڑھیاں اور سرد ہوگئی تھیں۔ اُسے رات کے ختم ہونے کا انتظار تھا۔ وہ آدھی رات سے پہلے راج گھاٹ پہنچ گیا تھا اور اپنا عریضہ لگانے آیا تھا۔ اس کی طرح اور بھی کتنے ہی ایسے حاجت مند تھے جو عریضہ لگانے آئے تھے اور اپنے اس عقیدے میں راسخ تھے کہ امام مہدی آخرالزماں زندہ ہیں اور قربِ قیامت میں ظہور فرمائیں گے۔ آج ان کی شبِ ولادت ہے اور اس کا وقت طلوعِ آفتاب سے قبل ہے۔ اس وقت عریضے کی صورت میں جو حاجت مند دستِ طلب دراز کرے گا مراد اس کی بَر آئے گی۔ ہر سال بارھویں امام کا جشنِ ولادت

اسی دھوم دھام سے منایا جاتا ہے اور ان کی خدمت میں عریضے پیش کیے جاتے ہیں۔ یہ عریضے بازار میں ملتے ہیں۔

مشرقی افق پر ہلکا ہلکا اجالا پھیلنے لگا۔ رات ختم ہو رہی تھی۔ ہوا میں خنکی بڑھ گئی تھی۔ گھڑیال نے ٹن ٹن پانچ بجائے۔ یہ آمدِ سحر کا اعلان تھا۔ میدان میں ہر طرف ہلچل مچ گئی۔ ہر شخص لوہے والے پل کی سمت دیکھنے لگا۔ راج گھاٹ کی سیڑھیوں پر بیٹھے ہوئے لوگ بھی چونکے اور مڑ مڑ کر چوکنا نظروں سے پل کی جانب دیکھنے لگے۔ آغا نے جیب سے عریضہ نکالا اور سنبھل کر بیٹھ گیا۔ وہ بھی لوہے والے پل کی طرف دیکھنے لگا۔ پل کے عقب میں شاہ پیر محمد کا ٹیلا تھا جس کی بلندی پر بنی ہوئی پرشکوہ مسجد ڈوبتے چاند کی سنہری چاندنی میں جگمگا رہی تھی۔ یہ عالیشان مسجد شہنشاہ اورنگ زیب نے تعمیر کروائی تھی۔ ٹیلے کے پہلو میں رُومی دروازے کی اونچی اونچی محرابیں نظر آتی تھیں اور ان کے پیچھے سے جھانکتی ہوئی آصف الدولہ کے امام باڑے کی برجیاں قطار در قطار دُور تک سلسلے وار چلی گئی تھیں۔

ہر نگاہ اب بے چین تھی اور پل کی جانب اٹھی تھی۔ میدان کا ہجوم سمٹ کر دریا کے کنارے کی جانب آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا۔ سب کو کسی کی آمد کا انتظار تھا اور ابھی وہ لمحہ نہیں آیا تھا۔ آغا جانی کی بے قراری بڑھ گئی۔ وہ راج گھاٹ کی سیڑھیوں پر بیٹھے ہوئے دوسرے لوگوں کی طرح بار بار پہلو بدل رہا تھا۔ ان میں کتنے ہی ایسے بھی تھے جو اٹھ کر کھڑے ہو گئے تھے اور گردن اونچی کر کے پل کی سمت دھڑکتے دل سے دیکھ رہے تھے۔

رات کی تاریکی کچھ اور چھٹ گئی۔ چاند مغربی افق کے کنارے پہنچ کر سونے کے بہت بڑے تھال کی مانند معلوم ہو رہا تھا۔ چاندنی کا رنگ پھیکا پڑ چکا تھا۔ مساجد سے اذانیں بلند ہو رہی تھیں۔ فضا سہانی ہو گئی تھی۔ دیکھتے دیکھتے لوہے والے پل کی پشت پر تیز روشنی ابھری اور دھیرے دھیرے بڑھتی اور پھیلتی گئی۔ ایک بجرا پل کے نیچے سے نکلا اور سامنے آ گیا۔ بجرا رنگا رنگ روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔

بجرا آگے بڑھا اور میدان کے سامنے پہنچ کر ٹھہر گیا۔ ہجوم میں کھلبلی مچ گئی۔ کچھ لوگ کشتیوں سے اور کچھ تیرتے ہوئے بجرے کی طرف دیوانہ وار بڑھے۔ جو عریضے نہ لگا سکے وہ مٹی

یا آٹے میں پلٹے ہوئے اپنے عریضوں کو دریا کی لہروں کے سپرد کرنے لگے۔

بجرا کچھ دیر کنارے پر رک کر آگے بڑھا اور لہروں پر ہچکولے کھاتا راج گھاٹ کی جانب چلا۔ قریب پہنچا اور گھاٹ کی سیڑھیوں کے نزدیک لنگرانداز ہو گیا۔ اس کے قریب پہنچنے کے لئے دھکم پیل شروع ہو گئی۔ بجرا خاصا بڑا تھا۔ اسے بہت نفاست سے سجایا گیا تھا۔ جگہ جگہ خوش نما کنول اور رنگا رنگ موم بتیاں روشن تھیں اور ہوا کے نرم نرم جھونکوں سے لہرا رہی تھیں۔ بجرا خوبصورت اور دیدہ زیب نظر آ رہا تھا۔ اس میں بیٹھے ہوئے لوگ اجلے اجلے لباس پہنے ہوئے تھے۔ موم بتیوں کی جگمگاہٹ سے ان کے چہرے تابندہ ہو گئے تھے۔ ان کے آگے مٹی کے کورے کونڈے رکھے تھے جو عمدہ اور لذیذ حلوے سے بھرے ہوئے تھے۔ حلوے کے اوپر لگے ہوئے چاندی کے ورق تیز روشنی سے جھلملا رہے تھے۔ وہ دونوں ہاتھوں سے حلوہ تقسیم کر رہے تھے۔ یہ تبرک تھا جسے حاصل کرنے کے لئے ہر شخص ٹوٹا پڑ رہا تھا۔

بجرے کے ایک الگ تھلگ گوشے میں ایک بوڑھا بت بنا بیٹھا تھا۔ وہ گویا امام آخرالزماں کے ایلچی کا نمائندہ تھا۔ عریضہ لگانے والے امام کے بزرگ ایلچی کا نام دل ہی دل میں لے کر اپنے عریضے بوڑھے کے سپرد کر رہے تھے۔ بوڑھا خاموشی سے عریضے وصول کر رہا تھا اور قریب رکھے ہوئے لوہے کے ایک اونچے اور سیدھے تار میں پروتا جا رہا تھا۔ اس کا لباس سیاہ تھا۔ نہ وہ کسی سے بول رہا تھا نہ بات کر رہا تھا۔ اس کی سفید خشخشی ڈاڑھی تھی۔ چہرے کا رنگ کھلتا ہوا تھا اور تیز روشنی میں زیادہ اجلا نظر آ رہا تھا۔ سر پر بڑا سا سیاہ عمامہ تھا۔ عبا بھی سیاہ تھی اور ڈھیلی ڈھالی تھی۔ جسم بھاری بھرکم تھا۔ اپنی شکل و صورت اور وضع قطع سے وہ باوقار اور مقدس معلوم ہو رہا تھا۔ وہ اونچی مسند پر دوزانو بیٹھا تھا۔

آغا جانی اپنا عریضہ احتیاط سے ہاتھ میں دبائے ہوئے گھاٹ کی سیڑھیاں طے کرتا تیزی سے نیچے اترا۔ اس نے پائجامے کے دونوں پائنچے ایک ہاتھ سے سنبھال کر اونچے کئے اور پانی میں چلا گیا۔ پانی سرد تھا۔ مگر وہ اس کی ٹھنڈک سے بے نیاز بھیڑ میں راستہ بناتا ہوا آگے بڑھا اور بجرے کے قریب پہنچ گیا۔ حلوے کے تبرک کے لئے چھینا جھپٹی ہو رہی تھی مگر وہ کسی نہ کسی طرح اسے حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

تبرک لینے کے بعد وہ سیاہ پوش بوڑھے کی جانب مڑا۔ امام مہدی کے پیغام رساں کا نام لے کر اس نے ہاتھ بڑھایا اور اپنا عریضہ بوڑھے کے حوالے کر دیا۔ اس نے غور سے بوڑھے کے تابناک چہرے کو دیکھا۔ عقیدت و احترام سے اس کی نگاہیں جھک گئیں۔ عریضہ لگانے کے بعد وہ مطمئن نظر آرہا تھا۔ یہ عریضہ اس نے آج ہی دوپہر کو چوک سے دو آنے میں خریدا تھا۔ آغا نے عریضے میں امام آخرالزماں سے درخواست کی تھی کہ عشرت منزل میں جس دفینے کو نکالنے کے لئے وہ مدت سے کوشاں ہے اس کے ہاتھ آجائے اور اس کی پریشانیوں کا مداوا ہو جائے۔

بجرا راج گھاٹ پر کچھ دیر رکنے کے بعد آگے بڑھا۔ بجرے کے ملاح تیز تیز ہاتھوں سے چپو چلا رہے تھے۔ بجرا رفتہ رفتہ دور ہوتا گیا۔ ریل کے پل کے نیچے سے گزر کر پکے پل کی سمت بڑھا۔ اسے راہ میں کئی مقامات پر ٹھہرنا تھا۔ وہ آگے، اور آگے بڑھتا گیا۔ عریضے لگانے اور تبرک حاصل کرنے والے گومتی کے کنارے جگہ جگہ ٹولیوں میں جمع تھے۔ بجرا قریب آکر رکتا تو وہ پانی میں اترتے، عریضے لگاتے، تبرک حاصل کرتے اور مطمئن ہو کر پلٹتے۔ اس دن کا انہیں سال بھر انتظار رہتا تھا۔

بجرا اب بہت دور جا چکا تھا۔ اس پر روشن کنول اور موم بتیاں، روشنیوں کی کہکشاں معلوم ہو رہی تھی۔ یہ بجرا امام باڑہ حسین آباد سے روانہ ہوا تھا اور موتی محل کے پل کے نیچے سے گزرتا ہوا امام باڑہ شاہ نجف کی سمت جا رہا تھا۔ یہ امام باڑہ روضۂ حضرت علی کی شبیہ ہے۔ اسے اودھ کے مشہور فرماں روا غازی الدین حیدر نے سکندر باغ کے پہلو میں دریائے گومتی کے کنارے تعمیر کرایا تھا۔ یہی امام باڑہ بجرے کی آخری منزل تھا۔ طلوعِ آفتاب سے پہلے پہلے بجرے کو اپنی منزل پر پہنچنا تھا۔

☆

بجرا نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ جشن ولادت منانے والے شب بیداری کے بعد تھک کر نڈھال ہو چکے تھے۔ دریا کے کنارے کا ہجوم بکھرنے لگا تھا۔ دکاندار اپنی دکانیں بڑھا

رہے تھے۔ خوانچے والے آخری صدائیں لگاتے رخصت ہو رہے تھے۔

آغا جانی بھی تھکا ہوا تھا۔ گھاٹ کی سیڑھیوں سے اتر کر نیچے پہنچا تو دھندلی روشنی میں کسی سے اس طرح ٹکرایا کہ بلبلا اٹھا۔ رات بھر کا جاگا ہوا تھا۔ نیند سے بے حال ہو رہا تھا۔ اس نے پلٹ کر اسے قہر آلود نظروں سے دیکھا۔ ایسا محسوس ہوا کہ اسے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔ صبح کی روشنی ابھی پوری طرح پھیلی نہ تھی۔ مگر آغا نے اسے فوراً پہچان لیا۔ وہ داروغہ میر نصیر تھا۔

دونوں کی نظریں ملیں تو آغا نے جھک کر آداب کیا۔ مزاج پوچھا۔ لیکن میر نصیر اسے پہچان نہ سکا۔ اظہارِ معذرت کرتے ہوئے گویا ہوا۔ "معاف کیجیے، میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔ اتنا یاد آتا ہے کہ کہیں دیکھا ہے۔ کہاں دیکھا ہے اور کب دیکھا ہے یہ یاد نہیں۔"

"ناچیز کو آغا جانی کہتے ہیں۔" آغا نے نرم لہجے میں یاد دہانی کرائی۔ "ایک مقدمے کے کاغذات کے سلسلے میں آپ سے نیاز حاصل ہوا تھا۔"

"ارے تو یہ آپ ہیں۔" میر نصیر نے حیرت کا اظہار کیا۔ "واللہ! بالکل ذہن سے آپ کا خیال نکل گیا۔ معذرت چاہتا ہوں۔"

"کیوں شرمندہ فرما رہے ہیں۔ آپ کا نیازمند ہوں۔" آغا جانی نے مسکرا کر دریافت کیا۔ "جشنِ ولادتِ امام میں شرکت کے لیے تشریف لائے تھے؟"

"بھئی اب نہ وہ سن رہا نہ وہ ولولہ رہا کہ گومتی کے کنارے جشنِ ولادت مناؤں۔ یہ تو آپ کے ایسے نوجوانوں کا حوصلہ ہے۔" میر نصیر نے تھکے ہوئے لہجے میں وضاحت کی۔ "عریضہ لگانے آیا تھا۔ لیکن دیر سے پہنچا۔ بجرا آگے جا چکا تھا۔"

"تو آیئے ایسا کریں۔ چھتر منزل کی طرف چلیں۔" آغا جانی نے مشورہ دیا۔ "بجرا راستے میں ابھی کئی جگہ ٹھہرے گا۔ کہیں بھی عریضہ لگا دیجیے گا۔"

"نہیں میاں، مجھ میں اتنی دُور جانے کی ہمت نہیں۔" میر نصیر آمادہ نہ ہوا۔ "کربلائے معلیٰ کی خاک ایک پڑیا میں احتیاطاً رکھ لی تھی۔ پانی ملا کر عریضہ اس میں لپیٹ دوں گا اور اسے دریا بُرد کر دوں گا۔ امام کی خدمت میں پہنچ جائے گا۔ مقصد تو اسے پہنچانا ہی ہے۔ سیکڑوں ایسے ہوں گے جو بجرے میں عریضہ نہ لگا سکے۔ انھوں نے بھی یہی کیا ہوگا۔" اس

نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ "ملازم ہمراہ ہے۔ عریضہ اور خاکِ کربلا کی پڑیا اسے دیدونگا۔ وہ عریضہ دریا کے سپرد کر دے گا۔"

آغا خاموش رہا۔ دونوں ناہموار راستے پر سنبھل سنبھل کر چلتے رہے۔ —

دونوں کچھ ہی دور گئے ہوں گے کہ ملازم مل گیا۔ میر نصیر نے اچکن کی جیب سے ایک پڑیا نکالی اور اس کے ساتھ ہی عریضہ نکالا۔ اس کے حوالے کیا اور ضروری ہدایات دیں۔ وہ عریضہ لے کر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھا اور آن کی آن میں نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

بُرج کے جھروکوں میں ابھی تک چند چراغ ٹمٹما رہے تھے۔ چاندنی کا حسن ماند پڑ گیا تھا۔ ریت کے جگمگاتے ذرّوں پر لوگ سر جھکائے گھروں کو لوٹ رہے تھے۔ لگ بھگ سب ہی نے عریضے لگائے تھے۔ کسی نے بن بیاہی بیٹی کے فرض سے سبکدوش ہونے کے لئے اور کسی نے اپنے بیمار عزیز کی صحت یابی کے لئے عریضہ لگایا تھا۔ کسی نے قرض کے بار سے نجات حاصل کرنے اور کسی نے کاروبار کی ترقی کے لئے عریضہ لگایا تھا۔ کچھ ایسے بھی تھے جنہوں نے محبوبہ کا دل جیتنے اور رقیب رُوسیاہ کے ناکام و نامراد ہونے کی درخواست کی تھی۔ ان میں پیارے آغا بھی شامل تھا جو ایک عرصے سے گھڑدوڑ میں مسلسل ہار رہا تھا۔ مگر اب اُسے توقع تھی کہ آئندہ ریس میں ضرور جیتے گا۔ اس نے گھڑدوڑ میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے عریضہ لگایا تھا۔ آغا جانی اس سے واقف نہ تھا۔ اسے قیصر مرزا سے اس کے جھگڑے کا بھی علم نہ تھا جو اس سے ملے بغیر رام پور چلا گیا تھا اور ابھی تک وہیں تھا۔

آغا جانی اور میر نصیر چپ چاپ چلتے رہے۔ انھوں نے گھاٹ میں داخل ہونے والا تنگ راستہ عبور کیا۔ یہاں دریا کا پانی چڑھ کر آ گیا تھا۔ لہٰذا دونوں سنبھل سنبھل کر چل رہے تھے۔ جب وہ گھاٹ سے باہر آ گئے تو آغا نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"قبلہ میر صاحب! اس مقدمے کا کیا بنا جس کے کاغذات کی آپ کو ضرورت تھی؟"

"بھئی آپ نے وہ کاغذات ہی لاکر نہیں دیئے جن کے بارے میں آپ سے معاملہ طے ہوا تھا۔" اس نے شکوہ کیا۔ "آپ تو اُمید بندھا کے ایسے غائب ہوئے کہ پھر نظر ہی نہیں آئے۔ نہ پوچھئے آپ کو کہاں کہاں تلاش کیا۔"

"میں ان دنوں لکھنؤ میں موجود ہی نہ تھا۔" آغا نے نہایت ڈھٹائی سے جھوٹ بولا۔ آپ سے ملنے کے بعد فوراً ہردوئی جانا پڑا۔ والد سخت علیل تھے۔ بیماری نے ایسا دبوچا کر جان لے کر ٹلی۔" حالانکہ اس کے باپ کو مرے ہوئے دس بارہ سال ہو چکے تھے۔

"آپ نے تو بہت افسوس ناک خبر سنائی۔ بہت دکھ ہوا۔" میر نصیر نے اظہار ہمدردی کیا۔ اس نے قدرے تامل کے بعد بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "مگر ان کاغذات کے نہ ملنے سے بہت نقصان ہوا۔ مقدمے میں بالکل جان نہ رہی۔ نواب صفی کے سامنے ندامت بھی ہوئی۔ میں نے ان سے کاغذات کا ذکر بھی کر دیا تھا۔ وہ تو ان کی منہ مانگی قیمت دینے کو تیار تھے۔"

"مقدمے کا ابھی فیصلہ تو نہیں ہوا؟"

"فریق مخالف نے مطلوبہ دستاویزات کی تصدیق شدہ نقلیں عدالت میں پیش کر دیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مقدمہ خارج ہو گیا۔"

"میر صاحب! میں سخت نادم ہوں۔ کیا عرض کروں، بالکل مجبور ہو گیا تھا۔" آغا نے اظہار پشیمانی کیا۔

"مگر ایک بات سمجھ میں نہیں آئی کہ یہ کاغذات آپ کو مل کیوں کر جاتے۔ وہ تو نواب تقی مرحوم کی بیوہ حضور بیگم کی تحویل میں تھے اور نہایت حفاظت سے رکھے گئے تھے۔ میں تو اُس ڈیوڑھی سے برسوں وابستہ رہا ہوں۔" میر نصیر نے حیرت اور استعجاب کا اظہار کیا۔ "واللہ! میں یہ راز سمجھ نہ سکا۔"

"یہ بات آپ نے پہلے بھی دریافت کی تھی۔" آغا جانی نے پچھلی ملاقات میں میر نصیر کو مقدمے کے کاغذات کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا اور نہ اب بتانا چاہتا تھا۔ اس نے میر نصیر کو اس بار بھی صاف ٹرخا دیا۔ "میں ان کے متعلق صرف اس قدر عرض کر سکتا ہوں کہ مقدمے کے کاغذات ملنے کی ایک صورت پیدا ہو گئی تھی۔ کیسے ہوئی یہ میں نہ بتا سکوں گا۔ اور اب تو یہ سلسلہ ہی ختم ہو گیا۔"

"درست فرمایا آپ نے جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا۔" میر نصیر نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "مقدمہ ہارنے کے بعد اب چیف کورٹ میں اپیل دائر کی ہے۔ دیکھئے اس کا کیا نتیجہ نکلتا

ہے۔ اسی اپیل کی کامیابی کے لئے عریضہ لگانے آیا تھا۔"

"مقدمے کی اب نوعیت کیا ہے؟" آغا جانی نے ٹوہ لگانے کی کوشش کی۔

"بہت کمزور ہے۔ اس مقدمے سے بڑی اُمید وابستہ تھی۔ نواب صاحب بہت پریشان ہیں۔ بال بال قرض سے بندھا ہے۔ محل سرا تک رہن ہے۔ مقدمے کا فیصلہ ہوتے ہی مہاجنوں نے قرض کی واپسی کے لئے نالش کردی۔" میر نصیر بغیر پوچھے خود ہی ٹھہر ٹھہر کر بتاتا رہا۔ "ادھر مقدمہ جیتتے ہی حضور بیگم کی قسمت اور جاگ اٹھی۔ پہلے ہی ان کے پاس کیا کم جائیداد تھی۔ رانی حیدر گڑھ کا انتقال ہوا۔ ان کا کوئی وارث تو تھا نہیں۔ انھوں نے جو وصیت نامہ چھوڑا اس کی رُو سے پوری ریاست حضور بیگم کی اکلوتی بیٹی طلعت آرا کو ملی۔"

"یہ تو اللہ میاں نے انھیں چھپر پھاڑ کر دیا۔" آغا نے اپنے فوری ردِ عمل کا اظہار کیا۔

"ہاں کبھی ایسا ہی ہوا۔" میر نصیر نے اس کی تائید کی۔ "ان کے ساتھ تارا پور ہاؤس والوں کا مقدر بھی جاگا۔"

"وہ کیسے؟" آغا جانی نے بے چین ہو کر پوچھا۔

"تارا پور کے نواب مرزا فائق علی کے چھوٹے بیٹے مرزا ساجد علی سے طلعت آرا کی پچھلے مہینے شادی جو ہو گئی ہے۔" میر نصیر نے آغا جانی کو مطلع کیا۔ "نواب فائق علی تو صرف نام کے نواب رہ گئے تھے۔ ساری جائیداد لٹا بیٹھے تھے۔ صرف ساکھ رہ گئی تھی۔ بس اُسی سے رئیسانہ آن بان بھی قائم تھی۔ کسی نہ کسی طرح کام چل رہا تھا۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "اپیل بھی خارج ہو گئی تو نواب صفی بالکل تباہ ہو جائیں گے۔ مجھے تو ڈر ہے کہ دل برداشتہ ہو کر کہیں وہ خودکشی وودکشی نہ کرلیں۔ آج کل وہ ایسی ہی باتیں کرتے ہیں۔ صحت بھی بہت گر گئی ہے۔ پریشانی سے نیند بھی اڑ گئی ہے۔"

دونوں باتیں کرتے ہوئے سڑک پر آ گئے۔ سڑک پر ابھی تک آمد و رفت جاری تھی۔ مشرق میں شفق کی سرخی پھیلتی جا رہی تھی۔ درختوں میں پرندے چہچہا رہے تھے۔ ہوا میں خنکی تھی اور سڑک پر شبنم کی نمی تھی۔ آغا جانی نے میر نصیر کی باتیں سُن کر تبصرہ کرنے سے گریز کیا۔ میر نصیر بھی خاموش رہا۔ دونوں چپ چاپ سڑک پر چلتے رہے۔ ایک دوراہے پر

پہنچ کر وہ ایک دوسرے سے رخصت ہوئے اور اپنی اپنی راہ پر مڑ گئے۔

(۲)

نوروز کی سہانی صبح تھی۔ آفتاب بارہ برجوں کا دورہ مکمل کر کے برج حمل میں داخل ہو گیا تھا۔ موسم بڑا خوش گوار تھا۔ درختوں میں ممولے چہک رہے تھے۔ ہوا گنگناتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ فضا میں پھولوں کی مہک رچی ہوئی تھی۔ محلّے کے کتنے ہی گھروں میں چہل پہل اور گہما گہمی تھی۔ شادمانی اور مسرت تھی۔ مگر عشرت منزل پر ویرانی چھائی تھی۔

ایک کوا چھت کی منڈیر پر بیٹھا دیر سے کائیں کائیں کر رہا تھا۔ آغا جانی نے مڑ کر اس کی جانب گردن اٹھا کر دیکھا اور پھر گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ وہ ابھی تک عشرت منزل میں مقیم تھا۔ جاتا بھی کہاں۔ کوئی اور ٹھکانا بھی نہ تھا۔ عشرت منزل کا کرایہ بھاڑا دینا نہ پڑتا تھا۔ مفت کی رہائش تھی اور ہر طرح سے آرام دہ بھی تھی۔ لیکن وہ ان دنوں بہت پریشان تھا۔ قیصر مرزا اسے جو رقم دے گیا وہ ختم ہو چکی تھی۔ قرض ادھار سے کسی نہ کسی طور کام چلا رہا تھا۔ اب قرض ملنا بھی روز بروز مشکل ہوتا جا رہا تھا بلکہ قرض خواہوں نے قرض کی واپسی کا تقاضہ شروع کر دیا تھا۔

آغا جانی نے تہہ خانے میں بیٹھ کر چلہ کشی کا سلسلہ بھی منقطع کر دیا تھا۔ قلزم شاہ کی جانب سے مایوس اور دل برداشتہ ہو کر اس نے ایک بیراگی سے رجوع کیا جس کا ان دنوں گنگو گھاٹ پر گومتی کے کنارے ایک ویرانے میں استھان تھا۔ اس کے بارے میں طرح طرح کی روایات مشہور تھیں۔ سننے میں آیا تھا کہ وہ ایسے کارگر اور آزمودہ منتر جانتا تھا کہ حاجت مندوں کے بگڑے کام بن جاتے تھے۔ آغا جانی ایک رات اس کی کٹیا میں پہنچا۔ دیکھا ایک جٹا دھاری سادھو بھبوت ملے، آسن جمائے، آلتی پالتی مارے، آنکھیں بند کئے مراقبے میں بیٹھا ہے۔ اس کے ایک ہاتھ میں ترسول دبا تھا جسے اٹھا کر وہ وقفے وقفے سے "الکھ نندن" کی صدا بلند کرتا۔ آغا جانی اس کے روبرو دو زانو ہو کے ادب سے سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ اس وقت کٹیا میں آغا کے سوا اور کوئی حاجت مند یا چیلا موجود نہ تھا۔ بہت دیر بعد اس نے آنکھیں کھولیں۔ آغا نے اسے اپنی جانب متوجہ پایا تو عاجزی سے اپنا مدعا بیان کیا۔ بیراگی نے اس کی بات خاموشی

سے سنی۔ آنکھیں بند کیں اور چند لمحے چپ بیٹھا رہا۔ پھر اس نے آنکھیں کھولیں۔ آہ سرد بھری اور آغا کو خبردار کیا کہ یہ جان جوکھوں کا کام ہے۔ وہ اس خیال سے باز آجائے۔ مایا حاصل کرنے کے لئے اُسے پہلوٹی کا بالک بھینٹ چڑھانا ہوگا۔ اس کے بنا کام نہ بنے گا ورنہ جان سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔

بیراگی سے ملنے کے بعد آغا جانی اس قدر محتاط ہوگیا کہ اس نے نہ صرف چلّہ کشی کا سلسلہ یک لخت بند کردیا بلکہ تہہ خانے میں جانا بھی چھوڑ دیا۔ اس نے چوری چھپے کوشش بھی کی کہ پہلوٹی کا کوئی بچّہ مل جائے۔ مگر بچّہ اور وہ بھی پہلوٹی کا، ملنا بہت دشوار تھا۔ اس کے لئے رقم کی بھی ضرورت تھی اور آغا بالکل قلّاش تھا۔ قیصر مرزا کی فوری واپسی کی بھی کوئی توقع نظر نہ آتی تھی اور حالات روز بروز بد سے بدتر ہوتے جارہے تھے۔ اب ایک ہی راستہ رہ گیا تھا کہ کوئی کام دھندا شروع کیا جائے تاکہ یافت کی سبیل پیدا ہو۔

لڑکپن ہی سے اُسے تھیٹر دیکھنے کا شوق تھا اور اسی شوق کے باعث وہ کوشش کرکے کسی نہ کسی طرح نیومون لائٹ تھیٹریکل کمپنی میں ملازم ہوگیا اور پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ اسے ایکٹنگ کرنے کا بھی موقع ملا۔ شروع میں اس نے چھوٹے موٹے کردار ادا کئے۔ کام لگن اور محنت سے کرتا تھا۔ چنانچہ بڑے کردار بھی ملنے لگے۔ کبھی لیلیٰ مجنوں کے کھیل میں لیلیٰ کا باپ بنا تو کبھی اندر سبھا میں کالے دیو کا کردار نہایت موثر انداز میں ادا کیا۔ نیومون لائٹ کمپنی کے علاوہ اس نے دوسری تھیٹریکل کمپنیوں میں بھی کام کیا اور ان کے ہمراہ شہر شہر گھومتا رہا۔ ماسٹر امیر جان کو وہ استاد مانتا تھا۔ وہ جس کمپنی میں جاتے ان کے ساتھ وہ بھی چلا جاتا مگر جب ماسٹر امیر جان گٹھیا کے مرض میں مبتلا ہوکر معذور ہوگئے اور ایکٹنگ کرنے کے قابل نہ رہے تو آغا نے بھی تھیٹر کو خیر باد کہا اور جفت سازی کا کام کرنے لگا اور اس میں ایسی مہارت حاصل کی کہ اس کا شمار شہر کے اچھے کاریگروں میں ہونے لگا۔ کام جلدی کرتا تھا اور ہاتھ میں صفائی بھی تھی۔ ہفتے میں جوتوں کی دو جوڑیاں تیار کرلیتا تھا۔ ان سے اتنی مزدوری مل جاتی کہ مزے سے گزر بسر ہوجاتی۔

مگر آغا جانی نے جوتے بنانے کے کسی کارخانے میں ٹک کر کام نہیں کیا۔ آئے دن کارخانے

بدلتا رہتا۔ اچانک غائب ہو جاتا اور ہفتوں غائب رہتا۔ کاریگر بہت اچھا تھا لہذا کسی نہ کسی کارخانے میں اسے کام مل جاتا۔ یہ لاابالی پن اس کے مزاج میں اس لئے تھا کہ آگے پیچھے کوئی تھا نہیں۔ باپ مر چکا تھا۔ ماں بچپن ہی میں گھر بار چھوڑ کر ایک قلعی گر کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ کہاں تھی، کس حال میں تھی، آغا کو کچھ علم نہ تھا اور نہ اس نے کبھی معلوم کرنے کی کوشش کی۔ آغا جانی نے اب تک شادی بیاہ بھی نہ کیا تھا۔ بالکل چھڑا تھا۔ یار باش بھی تھا۔ جو کچھ کماتا دوست احباب پر خرچ کر دیتا۔

قیصر مرزا سے اس کی جان پہچان بھی ایک کارخانے میں ہوئی تھی۔ وہ ایک جوڑا جوتے کا بنوانا چاہتا تھا اور اپنے پیر کی ناپ دینے کارخانے میں آیا تھا۔ آغا جانی نے اسے دیکھا تو ایسا فریفتہ ہوا کہ دو جوڑے جوتے کے نہایت نفاست سے تیار کر کے اسے پیش کئے اور اصرار کرنے کے باوجود ان کی قیمت نہ لی۔ یہیں سے ان کی دوستی کا آغاز ہوا۔ وہ قیصر مرزا سے ملنے کے لئے نت نئے بہانے تلاش کرتا۔ ساری کمائی اس پر لٹا دیتا۔ مگر ان کی دوستی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ تھی کہ قیصر مرزا رئیس زادہ تھا اور آغا ٹھہرا موچی۔ یہی وجہ تھی کہ قیصر مرزا کے گھر والوں کو آغا جانی کے ساتھ اس کا میل جول ایک آنکھ نہ بھاتا۔ نواب بوٹا نے تو اس سے رسم و راہ رکھنے پر سخت پابندی عائد کر دی تھی۔ بار بار بیٹے کو تنبیہ کی کہ آغا جانی سے نہ ملا کرے۔

آغا جانی کو جب اس بات کا علم ہوا تو اس نے جوتے بنانے کا پیشہ بالکل ترک کر دیا۔ کرنے کو کوئی کام دھندا نہ رہا تو اس کا اور بھی زیادہ وقت قیصر مرزا کے ساتھ گزرنے لگا۔ وہ خفا ہو جاتا تو منت سماجت کر کے مناتا۔ اس کی ڈانٹ ڈپٹ ہنس ہنس کر برداشت کرتا۔ اس کی دل جوئی کرتا۔ ہر طرح ناز برداری کرتا۔ پھر ایک ایسا وقت آیا کہ وہ قیصر مرزا کا مصاحب بن گیا اور جب عشرت منزل کرائے پر لے کر تہہ خانے میں دبا ہوا نواب شغو مرحوم کا زر و مال نکالنے کا سودا سر میں سمایا تو دونوں کا میل جول اور بڑھ گیا۔ دفینہ نکالنے کے لئے چلہ کشی کرنے کا مصائب آزما کام بھی آغا نے اپنے ذمے لے لیا۔ اب دن کے علاوہ راتیں بھی ایک ساتھ بسر ہوتیں۔ قیصر مرزا کئی کئی روز گھر نہ جاتا۔ تمام وقت عشرت منزل میں پڑا رہتا۔

دونوں وقیقہ ہاتھ لگنے کے لئے بے چینی سے منتظر تھے۔ ہر دم اسی کے بارے میں باتیں کرتے رہتے اور جب طلعت آرا سہانا خواب بن کر قیصر مرزا کی زندگی میں داخل ہوئی تو آغا جانی اس کی ضرورت بن گیا۔ وہ ہر معاملے میں اس سے مشورہ کرتا۔ اس سے رہنمائی حاصل کرتا۔

اب وہ سہانا خواب تار تار ہو گیا تھا اور آغا جانی سخت پریشانی میں مبتلا تھا۔

☆

نوروز پر آغا جانی کہیں نہیں گیا۔ تمام وقت سوچتا رہا کہ اب اسے کیا کرنا چاہیئے۔ وہ رات گئے تک جاگتا رہا اور بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔

صبح ہوئی۔ آغا بیدار ہوا۔ مگر گھر سے باہر نہ گیا۔ اوّل شب باہر نکلا۔ کل رات سے اس نے کچھ بھی نہ کھایا تھا۔ بھوک سے نڈھال ہو رہا تھا۔ جب وہ وکٹوریہ روڈ پہنچا تو معاً اسے حاجی چھٹن یاد آ گیا۔ چوک میں اس کی جوتے کی دکان تھی اور جوتے بنانے کا اپنا کارخانہ بھی تھا۔ حاجی چھٹن مزاج کا تو کڑوا تھا لیکن اچھے کاریگروں کی قدر کرتا تھا۔ آغا جانی کے ساتھ اس کا رویّہ ہمیشہ بہت اچھا رہا۔ جب اسے کہیں کام ملنے میں دشواری ہوتی تو وہ چھٹن کے پاس چلا جاتا۔ وہ اسے دیکھ کر پہلے تو خفا ہوتا۔ بُرا بھلا کہتا۔ اس کی غیر ذمہ دارانہ حرکتوں پر لعنت ملامت کرتا۔ جب ذرا غصہ ٹھنڈا ہوتا تو وہ نرم پڑ جاتا۔ آغا جانی کو پھر کام پر لگا دیتا۔ لین دین کے معاملے میں بھی کھرا تھا۔ اجرت ادا کرنے میں ذرا بھی چخ چخ نہ کرتا بلکہ ضرورت پڑنے پر پیشگی بھی دے دیتا۔

حاجی چھٹن کا کارخانہ ایک گلی میں تھا۔ آغا نے سوچا اگر حاجی اس وقت مل جائے تو اس سے کچھ پیشگی اینٹھ لے۔ وہ گلی میں مڑ گیا۔ حاجی چھٹن کے کارخانہ پر پہنچا۔ لیکن یہ دیکھ کر اس کا دل بیٹھ گیا کہ کارخانہ بند تھا۔ دروازے پر تالا پڑا تھا۔ کارخانے کے آگے مختصر چبوترہ تھا۔ دو آوارہ کتے چبوترے پر لیٹے آرام سے بیٹھ کھجا رہے تھے۔ آغا کو قریب پا کر کتے غرّائے اور زور زور سے بھونکنا شروع کر دیا۔ آغا پہلے ہی جھنجھلایا ہوا تھا۔ کتوں کے بھونکنے پر اور برافروختہ ہو گیا۔ وہ کتوں کو دل ہی دل میں گالیاں دیتا ہوا تیز تیز قدموں سے آگے بڑھ گیا۔

گلی میں اندھیرا تھا۔ ایک بار ٹھوکر کھا کر وہ گرتے گرتے بچا۔ عین اس وقت قریب سے

آواز ابھری۔ "بھئی ذرا سنبھل کے چلنا۔ راستہ خراب ہے۔ یہ میونسپلٹی والے نہ تو بدبخت گلی کے فرش کی مرمت کراتے ہیں اور نہ روشنی کا بندوبست کرتے ہیں۔" آغا نے آواز سنتے ہی فوراً اسے پہچان لیا۔ وہ سجاد تھا۔ اس کا پرانا ملنے والا۔ وہ چلتے چلتے ٹھٹکا۔ مڑ کر اس طرف دیکھا۔

"اماں، مرزا سجاد بیگ، تم یہاں کیسے؟"

سجاد نے قریب کے ایک مکان کے دروازے سے گردن نکالی اور دھندلی روشنی میں آغا جانی کو پہچاننے کی کوشش کرنے لگا۔ جھجکتے ہوئے بولا۔ "آواز تو آغا جانی کی معلوم ہوتی ہے اماں، تم ہی ہو نا؟"

آغا مسکرا کر بے تکلفی سے مخاطب ہوا۔ "ہاں بھئی، میں ہی ہوں۔" وہ آگے بڑھا اور دروازے کے نزدیک پہنچ گیا۔

سجاد دروازے سے نکل کر گلی میں آ گیا۔ دونوں بڑی گرم جوشی سے ملے۔

گلی پر سناٹا چھایا تھا۔ دونوں طرف قدیم وضع کے مکانوں کی کالی کالی دیواریں تھیں اور رنگ و روغن سے بے نیاز بوسیدہ دروازے تھے۔ مکانوں کی منڈیروں پر ہلکی ہلکی چاندنی بکھری ہوئی تھی۔ مارچ کا مہینہ تھا۔ پہر رات گزر چکی تھی۔ ہوا میں خوشگوار خنکی تھی۔

"اماں، تم تو عید کا چاند ہو گئے۔ کہیں نظر نہیں آتے۔ نہ جانے آج کل کس چکر میں ہو۔ کسی سے تمہارا اتا پتا بھی نہ ملا۔" مرزا سجاد بیگ نے بدمعاشی سے ایک آنکھ دبا کر رازدارانہ لہجے میں کہا۔ "کسی کوٹھے سے اتر کر آ رہے ہو؟"

آغا ہنسنے لگا۔ "کیوں خواہ مخواہ بدنام کرتے ہو۔ نہیں یار، میں ایسے چکروں میں نہیں پڑتا۔"

"اب زیادہ نہ اڑو۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ تم کتنے پہنچے ہوئے ہو۔" سجاد بے تکلفی سے اسے چھیڑتا رہا۔ "ٹھیک ٹھیک بتاؤ۔ زیادہ دُون کی نہ لو۔ یہ اپنی پارسائی کی دھونس کہیں اور جمانا۔"

سجاد تیزی سے بولتا چلا گیا۔ آغا جانی خاموش کھڑا اس کا منہ تکتا رہا۔ جب وہ رکا تو اس نے نرمی سے کہا۔ "اچھا بھئی جو تمہارے جی میں آئے وہ سمجھو۔ میں نے اصل بات تم کو بتا دی۔" اس نے قدرے تامل کیا، پھر بات کا رخ موڑتے ہوئے دریافت کیا۔ "اچھا یہ تو بتاؤ

کہ تم اس وقت یہاں کیسے؟"

"یہ مکان کرائے پر لے لیا ہے۔"

"کیوں، آج کل گھر پر نہیں رہتے؟" آغا نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔ "کیا آبائی مکان فروخت کر دیا؟"

"ابھی تو نہیں فروخت ہوا مگر وہ وقت بھی جلد ہی آ جائے گا۔" سجاد نے کسی قدر تلخی سے بتایا۔ "یار! وہ ہماری بھاوج جب سے گھر میں بیاہ کر آئی ہے۔ اس نے وہ آگ لگائی ہے کہ روز جوتیوں میں دال بٹتی ہے۔ ایک روز تو بڑے بھیّا سے ایسا جھگڑا ہوا کہ ہاتھا پائی تک کی نوبت آ گئی۔ بس اسی روز میں نے گھر چھوڑ دیا۔ اتفاق سے یہ مکان خالی مل گیا۔ اب اطمینان سے رہتا ہوں، نہ ہر دم کی جھک جھک نہ آئے دن کا جھگڑا فساد۔"

"چلو یہ بھی اچھا ہی ہوا۔" آغا نے اس کی تائید کی۔ "اب نہ کسی کا دباؤ ہے نہ احسان۔" اس نے قدرے تامّل کے بعد دریافت کیا۔ "مگر تم آجکل کر کیا رہے ہو؟"

"تم جانتے ہو وثیقے میں تو اپنا گزارہ ہوتا نہیں۔" سجّاد نے مطلع کیا۔ "کل پندرہ روپے مہینہ تو ملتا ہی تھا۔ میں نے اس میں سے پانچ روپے کا وثیقہ پانچ ہزار میں بیچ دیا اور اس رقم سے جوہری محلّے میں سوزن کاری کا کارخانہ کھول لیا ہے۔ آٹھ کاریگر کام کرتے ہیں۔ گرمیاں آ رہی ہیں۔ کڑھے ہوئے کرتوں اور ٹوپیوں کے پلّوں کی مانگ بڑھ جائے گی تو کاریگروں کی تعداد اور بڑھا دوں گا۔"

"اس وقت کام کیسا چل رہا ہے؟"

"اچھا خاصا چل رہا ہے۔ دکاندار خود آ کر مال لے جاتے ہیں۔ زیادہ کام تو آڈر ہی کا تیار ہوتا ہے۔ کسی روز کارخانے پر آؤ۔" بات کہتے کہتے وہ چونکا۔ "یہاں کیوں کھڑے ہو۔ آؤ اندر بیٹھ کر اطمینان سے باتیں کریں۔"

آغا جانی نے انکار نہ کیا۔ سجّاد مڑا اور گھر کے اندر چلا گیا۔ آغا جانی اس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ دونوں نے صحن عبور کیا۔ سجاد نے بڑھ کر ایک کمرے کا دروازہ کھولا۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ سجاد نے دیا سلائی جلا کر تپائی پر رکھا ہوا لیمپ روشن کیا۔ کمرہ خاصا کشادہ تھا۔ البتہ

چھت ذرا نیچی تھی۔ ایک طرف پلنگ پر صاف ستھرا بستر لگا تھا۔ ایک گوشے میں سیاہ رنگ کا ٹرنک رکھا تھا۔ کھونٹیوں پر کپڑے ٹنگے تھے۔ مغربی دیوار پر ایک طغرا آویزاں تھا۔ کمرے کے آگے دالان تھا۔ اس میں ایک طرف گھڑونچی تھی جس پر دو صراحیاں اور ایک گھڑا رکھا تھا۔ صراحیاں اور گھڑے بالکل کورے معلوم ہوتے تھے۔ ایک گھڑے پر تانبے کا تازہ تازہ قلعی کیا ہوا منقش کٹورا رکھا تھا۔

گھڑے اور صراحیوں کو دیکھ کر آغا نے پیاس محسوس کی مگر خالی پیٹ پانی پینے سے اجتناب کیا۔ سجاد سے پوچھا۔ "صرف یہی ایک کمرہ ہے؟"

"اندر ایک کمرہ اور ہے۔ اس کے ساتھ بھی دالان ہے۔ صحن ہے۔ صحنچی ہے۔ اچھی خاصی مکانیت ہے۔ روشن اور ہوادار بھی ہے۔" سجاد دلچسپی سے ایک ایک تفصیل بتاتا رہا۔ "یار، بڑے موقع سے مل گیا۔ کرایہ بھی نہایت مناسب ہے۔"

آغا اس کا ہاتھ دبا کر بے تکلفی سے مسکرایا۔ "بس اللہ کا نام لے کر اب تم چاند سی ایک عدد دلہن بھی لے آؤ۔ اس کے بغیر گھر سونا سونا لگتا ہے۔"

"ارادہ تو یہی ہے۔" سجاد شرما کر بولا۔ "ایک جگہ سلسلہ بھی چل رہا ہے۔"

"کہاں؟" آغا نے دلچسپی کا اظہار کیا۔

"امیر محل میں۔" سجاد نے دبی زبان سے بتایا۔

"امیر محل میں!" آغا نے چونک کر پوچھا۔ "نواب تقی مرحوم کی بیٹی طلعت آرا کے ساتھ؟" اس نے قدرے تامل کے بعد کہا۔ "مگر میں نے تو سنا ہے کہ کچھ ہی عرصہ پہلے اس کی شادی ہو گئی۔"

"تم نے بالکل ٹھیک سنا ہے۔ وہ تو تارا پور ہاؤس والوں میں بیاہ کر گئی ہے۔" سجاد نے اس کی اطلاع کی تصدیق کرتے ہوئے کہا۔ "نواب تقی کی جائیداد کی خاطر تو تارا پور ہاؤس والوں نے خوشامد کر کے رشتہ کیا ہے۔ ورنہ میں نے تو سنا ہے اس پر جنوں کا سایہ ہے۔"

"پھر تمہاری شادی کس کے ساتھ ہو رہی ہے۔" آغا نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔ "نواب تقی مرحوم کی طلعت آرا کے علاوہ اور کوئی اولاد نہیں۔"

"امیر محل میں جو مغلانی ہیں ان کی بھانجی کے ساتھ رشتے کی بات چل رہی ہے۔" مرزا سجاد بیگ نے وضاحت کی۔ "وہ خالہ کے ساتھ ہی رہتی ہے۔ مغلانی کھری مغل ہیں۔ سنا ہے بڑے اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔"

"اچھا تو بات یوں ہے۔" آغا نے مسکرا کر پوچھا۔ "یہ بتاؤ رشتہ طے ہو گیا کہ نہیں؟"

"رشتہ تو سمجھو طے ہے۔ صرف ایک رخنہ ہے بیچ میں۔"

"وہ کیا؟" آغا نے بے چین ہو کر دریافت کیا۔

"بس ہے ایک رخنہ۔" سجاد نے ٹالنا چاہا۔ کھل کر بات نہ کی۔

"آخر کچھ معلوم تو ہو۔"

سجاد صاف بات کہتے ہوئے کترا رہا تھا۔ آغا جانی اس کے پیچھے پڑ گیا۔ اصرار کرنے لگا۔ "اماں اب ہم سے بھی غیریت برتو گے۔ واللہ ہم تو خوش ہونے والوں میں ہیں۔ ہمیشہ تم کو اپنا سمجھا۔ کبھی دل کی بات نہ چھپائی۔"

"بات دراصل یہ ہے کہ اس کی پہلے بھی ایک شادی ہو چکی ہے۔" سجاد نے جھجکتے ہوئے بتایا۔ "میاں نکھٹو تھا۔ ایک بیوی پہلے بھی تھی۔ اس سے تین بچے بھی ہیں۔ مار پیٹ بھی کرتا تھا۔ لہٰذا سال سوا سال بعد طلاق ہو گئی۔"

"مگر اس بے چاری کا تو کوئی قصور نہیں تھا۔"

"مجھے اس کے پچھلے عقد کا تو ایسا زیادہ خیال نہیں۔" سجاد نے بتایا۔ "مگر مصیبت یہ ہے کہ پچھلے شوہر سے ایک بیٹا بھی ہے۔ وہ بھی اس کے ساتھ ہی ہے۔ شادی کے بعد جو بھی اس بچے کو دیکھے گا تو مذاق اڑائے گا۔ لو بھئی، سجاد کی دلہن جہیز میں ایک عدد بیٹا بھی لائی ہے۔ سب سے زیادہ آفت کی پرکالہ ہماری بھابی صاحبہ ہیں۔ وہ تو زندگی دوبھر کر دیں گی۔ بس یہی بات رہ رہ کے پریشان کر رہی ہے۔ ورنہ بات تو بالکل پکی ہے۔ لڑکی خوبصورت ہے۔ بڑی سگھڑ اور سلیقہ شعار بھی ہے۔"

سجاد کی بات سن کر آغا جانی چونکا۔ اسے فوراً یاد آیا کہ عشرت منزل کے تہہ خانے میں جو مایا ہے وہ پہلوٹی کا لڑکا مانگتی ہے۔ آغا نے سوچا اگر یہ بچہ کسی طرح ہاتھ آجائے تو دفینہ مل

جائے گا۔ سارے دلدر دُور ہو جائیں گے۔ قسمت پلٹ جائے گی۔

"بس یہی رخنہ تمہارے راستے میں حائل ہے؟" آغا نے دریافت کیا۔

"ہاں بھئی۔ یہی رکاوٹ درپیش ہے ورنہ میں کب کا بیاہ کر چکا ہوتا۔"

"میں تمہارا یہ مسئلہ حل کئے دیتا ہوں۔" آغا نے مستعدی سے کہا۔ "ایسا کرو وہ بچہ تم مجھے دلوا دو۔"

"اماں واللہ! تم میری یہ مدد کر سکو گے؟" سجاد نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔

"یار سجاد! ہم تو یاروں کے یار ہیں۔ آڑے وقت میں دوستوں کے کام آنے والے۔"

"مگر تم اسے لے کر کرو گے کیا؟" سجاد نے مذبذب ہو کر دریافت کیا۔ "تمہارے تو بال بچے بھی نہیں۔"

آغا اس سوال کے جواب کے لئے خود کو پہلے ہی تیار کر چکا تھا۔ مسکرا کر بولا۔ "یار سجاد! تم بھی بس یونہی ہو۔ اماں میں کسی کا بچہ لے کر کیا کروں گا۔ میں اسے کیسے پال پوس سکوں گا۔" اس نے قدرے توقف کے بعد وضاحت کی۔ "بات دراصل یہ ہے کہ میری ایک ماموں زاد بہن ہے۔ اس کی شادی کو دس برس سے اوپر ہو چکے ہیں۔ مگر اولاد کوئی نہیں۔ بہت علاج معالجہ کرایا۔ نہ جانے کہاں کہاں منتیں مانیں مگر مراد پوری نہ ہوئی۔ دونوں میاں بیوی کو اولاد کا بڑا ارمان ہے۔ اسی غم میں ہر دم گھلتے رہتے ہیں۔ اکثر مجھ سے کہہ چکے ہیں کہ کوئی لاوارث بچہ مل جائے تو اسے گود لے لیں۔"

سجاد خوش ہو کر بولا۔ "یار بات تو دل لگتی ہے۔ ان کا ارمان بھی پورا ہو جائے گا اور اپنا کام بھی بن جائے گا۔"

"کہو استاد کیسی کہی۔" آغا نے گرم جوشی سے سجاد کا ہاتھ تھام لیا۔ "تم نے کبھی آغا جانی کو آزمایا نہیں۔ کسی نے سچ کہا ہے دوست تو اصل وہ ہے جو وقت پر کام آئے۔"

سجاد کو اب ایک نئی فکر دامن گیر ہوئی۔ "مگر یار سوال یہ ہے کہ مغلانی اور ان کی بیٹی اس بچے کو علٰحدہ کرنے پر اس طرح راضی بھی ہو جائیں گی۔ بھئی اولاد کا معاملہ ہے۔"

"تم زور دو گے تو کیوں نہیں راضی ہوں گی۔" آغا جانی نے مشورہ دیا۔ "اچھی طرح سمجھا دینا کہ بچہ اس گھر میں زیادہ آرام سے رہے گا۔ اولاد کے ترسے ہوئے ہیں۔ اس قدر ناز و نعم

سے پرورش کریں گے کہ کیا کوئی ماں باپ اتنا لاڈ پیار کرے گا۔"

"میرا خیال ہے کہ ان کو رضامند ہو جانا چاہیئے۔ میں کل ہی یہ تجویز مغلانی صاحبہ کو پہنچا دوں گا۔" سجّاد نے آغا جانی سے اتفاق رائے کیا۔ "چند روز میں اندازہ ہو جائے گا کہ وہ کیا چاہتی ہیں۔" اس نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ "آج منگل ہے تم آئندہ منگل کو مجھ سے مل لینا۔"

آغا نے اس ڈھب سے بات آگے بڑھائی کہ سجّاد نے بھی دلچسپی کا اظہار کیا۔ وہ بازار سے اپنے لئے کھانا لے کر آیا تھا۔ اس نے کھانا نکالا اور اصرار کر کے آغا کو کھلایا۔ دونوں کھانا کھاتے رہے اور بچے ہی کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد سجّاد کی خواہش تھی کہ آغا جانی رات وہیں بسر کرے مگر وہ آمادہ نہ ہوا۔

آغا رخصت ہونے لگا تو سجّاد نے مسکرا کر کہا۔ "تو پھر بات پکّی رہی۔ کہیں غچّہ نہ دے جانا۔ منگل کی شام کو کارخانے پر آ جانا۔ مغلانی صاحبہ سے جو جواب ملے گا تم کو بتا دوں گا۔ آنا ضرور۔ میں تمہارا انتظار کروں گا۔"

آغا جانی کی جیبیں خالی تھیں۔ دوسرے روز بھی کہیں سے کچھ ملنے کی اُمید نہ تھی۔ چلتے چلتے وہ ٹھٹکا سجّاد سے مخاطب ہوا۔ "اماں، کچھ روپے ہوں تو دے دو۔ رات زیادہ ہو گئی۔ کوئی ایکہ تانگہ مل گیا تو اسی سے چلا جاؤں گا۔ گھر سے جو کچھ لے کر چلا تھا، ختم ہو گیا۔"

سجّاد نے بلا تامّل جیب میں ہاتھ ڈالا اور دو روپے آغا کو دے دیئے۔ "گھر تک جانے کے لئے یہ روپے کافی ہوں گے۔ اس وقت جیب میں یہی تھے۔"

آغا نے روپے لے کر منگل کو آنے کا وعدہ کیا اور دروازے سے نکل کر گلی میں پہنچ گیا۔

☆

دن ڈھلے آغا جانی نے غسل کیا۔ اُجلا لباس پہنا اور شام کا اندھیرا پھیلتے ہی سجّاد کے پاس پہنچ گیا۔ سجّاد کارخانے میں موجود تھا اور اس کا انتظار کر رہا تھا۔ کارخانہ اب بند ہو چکا تھا۔ سوزن کار اور ململ پر کڑھائی کرنے والے کاریگر کام ختم کر کے جا چکے تھے۔ سجّاد اس وقت بالکل تنہا تھا۔ آغا کو دیکھتے ہی ہنس کر بولا۔

"آؤ بھئی آغا آؤ۔ تمہارا تو دو روز سے انتظار کر رہا تھا۔"

"طے تو منگل کو آنے کا ہوا تھا۔ آج منگل ہے اور میں حسبِ وعدہ آ گیا۔"

"مگر یار! یہ تو طے نہیں ہوا تھا کہ منگل سے پہلے ادھر کا رخ ہی نہ کرو۔ نہ پوچھو کس قدر بے چینی سے تمہارا انتظار رہا۔"

"اماں خیریت تو ہے۔ بڑے خوش نظر آ رہے ہو۔" آغا نے مسکرا کر ٹوہ لگانے کی کوشش کی۔ "یہ تو بتاؤ کیا جواب آیا وہاں سے؟"

"شروع شروع میں تو مشاطہ یہی کہتی رہی کہ وہ آمادہ نہیں ہیں۔ کہتے ہیں کہ بچہ ماں کے پاس ہی رہے گا۔" سجاد نے مطلع کیا۔ "مگر میں بھی اپنی بات پر اڑ گیا۔ صاف کہہ دیا کہ یہ شرط مجھے منظور نہیں۔ خاندان بھر میں نکو بن جاتا۔ ملنے جلنے والے الگ مذاق اڑاتے۔ یار! مارتے کا ہاتھ تو سب پکڑ لیتے ہیں کہنے کی زبان کوئی نہیں پکڑتا۔"

"اماں یہ تو بعد کی بات ہے۔ یہ بتاؤ طے کیا ہوا؟" آغا نے بے چین ہو کر دریافت کیا۔

"اتوار کی سہ پہر کو مشاطہ آئی تو ایک دم بدلی ہوئی تھی۔"

"یہ رشتہ کسی مشاطہ کے ذریعے طے ہو رہا ہے؟"

"اماں بھول گئے۔ بتا تو چکا ہوں کہ مشاطہ کے ذریعہ بات چیت چل رہی ہے۔" سجاد نے ہنس کر بتایا۔ "واللہ! بڑی تیز عورت ہے۔ میرا خیال ہے، کسی زمانے میں خانگی رہ چکی ہے۔ رہتی بھی ٹاپے والی گلی میں ہے۔ یہ خانگیاں اور رنڈیاں جب بن سے اتر جاتی ہیں تو مشاطہ کا پیشہ اختیار کر لیتی ہیں یا بھیک مانگتی پھرتی ہیں۔ اگر ایک آدھ نوچی مل گئی تو نائکہ بن کر اس کے سہارے زندگی گزارنے کی کوشش کرتی ہیں۔ بھئی میں نے تو ان کا یہی حشر دیکھا ہے۔"

"یار! یہ تم خانگیوں اور رنڈیوں کا ذکر کہاں لے بیٹھے۔" آغا نے سجاد کی باتوں پر بے زاری کا اظہار کیا۔ "کام کی بات کرو۔ یہ بتاؤ وہ کہتی کیا ہے؟"

"واللہ! بڑی چلتی رقم ہے۔ ایسی تڑاق پڑاق بات کرتی ہے کہ میں تو اس کا منہ دیکھتا رہ جاتا ہوں۔" سجاد نے بتایا۔ "آتے ہی بولی۔ دولہا میاں! منہ میٹھا کرائیے۔ ایسا شیشے میں اتارا کہ ان کو ہاں کرتے ہی بن پڑی۔ اب استخارہ کروا کے دن تاریخ مقرر کرا لیجیے۔ کم بخت

تین روپے اینٹھ کر لے گئی۔"

"لیکن اس معاملے کا کیا ہوا؟" آغا کو سجاد کی شادی سے زیادہ بچے کی فکر تھی جس کے ملنے پر عشرت منزل کا دفینہ اس کے ہاتھ آجاتا۔

"اماں کون سا معاملہ؟"

"یار! حد کردی تم نے۔" آغا نے جھنجلا کر کہا۔ "اب تم کو یہ بھی یاد نہیں۔ اماں وہی۔"

"یاد آگیا، بالکل یاد آگیا۔" سجاد کو فوراً اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ آغا کی بات کاٹ کر بولا۔ "تم ایسا کرو کہ پرسوں میرے پاس یہیں آجاؤ۔ مگر ذرا دیر سے آنا۔ یہی تو، ساڑھے نو بجے کے قریب۔ میں مشاطہ کو بلوا لوں گا۔ وہ تم کو اپنے ہمراہ امیر محل لے جائے گی۔ تم وہاں سے بچے کو لے آنا۔ ٹھیک ہے نا۔"

"میں ضرور آجاؤں گا۔" آغا نے فوراً ہامی بھرلی۔

"دیکھو، آ ضرور جانا۔"

"کہہ تو دیا کہ آجاؤں گا۔ کہو تو اسٹامپ پیپر پر لکھ دوں۔"

سجاد جھینپ کر مسکرانے لگا۔ "یار، سارے مرحلے تو طے ہوگئے ہیں۔ اب تو تمہارے ہی سر سہرا ہے۔ تم میرا یہ کام کردو تو یوں سمجھ لو کہ تم نے زندگی بھر کے لئے مجھے خرید لیا۔"

"اماں سجاد! ۔ تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔ آخر دوست کس وقت کے لئے ہوتے ہیں۔" اس نے سینے پر ہاتھ مار کر نہایت جوش و خروش سے کہا۔ "تمہارے لئے تو جان حاضر ہے۔"

"یار! اب تم سے کیا پردہ۔" سجاد نے قدرے شرماتے ہوئے دبی زبان سے کہا۔ "بات دراصل یہ ہے کہ اس لڑکی سے اپنی آنکھ لڑ گئی ہے۔ میں نے اشرف نواب کے گھر ایک مجلس میں اسے دیکھ لیا۔ کچھ ایسا اتفاق ہوا کہ بالکل اچانک آمنا سامنا ہوگیا۔ کیا بتاؤں کس غضب کا اس پر نکھار ہے۔ ایسی من موہنی صورت کہ اب تک آنکھوں میں بسی ہے۔ بس اسی روز سے اس کے لئے دیوانہ ہوں۔ کسی پہلو قرار نہیں۔" یہ کہتے کہتے سجاد نے تھیٹر کے ایکٹروں کی طرح آہ سرد کھینچی۔ "دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر ایک روز اشرف نواب کے پاس گیا۔ جھجکتے ہوئے ان سے عرض مدعا کیا۔ انھوں نے بڑی نفیس طبیعت پائی ہے۔ ذرا بھی حوصلہ شکنی نہ کی۔ دل جوئی کی باتیں

کیں۔ پھر انھی کے وسیلے سے یہ سلسلہ چلا۔ انھوں نے مشاطہ کو بلایا اور میرا رقعہ امیر محل بھجوا دیا۔ گھر میں تو ابھی تک کسی کو اس بات چیت کا پتہ بھی نہیں۔ رشتہ باقاعدہ طے ہو جائے تو سب کو خبر کروں گا۔ سردست تو اشرف نواب ہی میری طرف سے سب کچھ کر رہے ہیں۔"

سجاد تفصیل کے ساتھ ایک ایک بات بتاتا رہا اور آغا جانی خاموشی سے سنتا رہا۔ اس نے اور بھی بہت سی باتیں بتائیں اور آغا نے انھیں بھی توجہ سے سنا۔ اس دوران سجاد نے کئی بار تبنولی سے پان منگوا کر آغا کو کھلائے۔

آغا کو ضرورت تو تھی مگر اس روز رخصت ہوتے وقت سجاد سے قرض مانگنے کی ہمت نہ پڑی۔ سجاد کے کارخانے سے آغا باہر آیا تو اسے معاً قیصر مرزا یاد آگیا۔ اسے رام پور گئے ہوئے کئی مہینے ہو گئے تھے۔ آغا کو کچھ خبر نہ تھی کہ وہ کس حال میں ہے اور کب واپس آرہا ہے۔ وہ اُس کے گھر بھی جانا نہ چاہتا تھا۔ نواب بوٹا اور ان کے اہل خانہ اس قدر برگشتہ تھے کہ نوکروں تک کو سختی سے منع کر دیا گیا کہ اگر آغا آئے اور قیصر مرزا کے بارے میں کچھ پوچھے تو اس سے بات تک نہ کی جائے۔ آغا کو اس حقیقت کا علم اس وقت ہوا جب وہ ایک روز قیصر مرزا کے گھر پہنچا۔ نوکروں نے اس سے سیدھے منہ بات تک نہ کی۔ نہایت بے رخی کا مظاہرہ کیا۔ ایسا اشتعال انگیز رویہ اختیار کیا کہ اسے دوبارہ جانے کی ہمت نہ ہوئی۔ چنانچہ جب قیصر مرزا کو کوئی پیغام دینا ہوتا تو وہ کاظم سے ملتا۔ کاظم سے اس کی اچھی خاصی یاد اللہ تھی۔ وہ قیصر مرزا کے پڑوس میں رہتا تھا اور اس سے دُور کی قرابت داری بھی تھی۔ کاظم رئیس زادہ تو نہ تھا مگر رئیسوں کی مصاحبت میں رہتا تھا۔

کاظم کی شامیں عام طور پر چوک میں گزرتی تھیں۔ آغا نے سوچا کہ اس وقت کاظم چوک میں مل جائے گا اور اگر ملاقات ہو گئی تو اس سے قیصر مرزا کی خیر خبر مل جائے گی۔ وہ جوہری محلے سے نکل کر چوک میں داخل ہوا۔ شام اودھ کی رونق اس وقت اپنے شباب پر تھی۔ دکانیں تیز روشنیوں سے جگمگا رہی تھیں۔ چوک میں یکّے تانگوں، بگھیوں اور ایسی ہی دوسری سواریوں کی آمد و رفت بند ہو چکی تھی۔ سڑک تنگ تھی۔ ہر طرف پیدل چلنے والوں کی بھیڑ تھی۔ سڑک کے دونوں جانب قدیم وضع کے مکانات کا سلسلہ دُور تک چلا گیا تھا۔ مکانوں کے نچلے حصّے میں دکانیں تھیں اور ان

کے اوپر طوائفوں کے بالاخانے تھے۔ بالاخانوں سے طرح طرح کے سازوں کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ طبلے کی تھاپ، سارنگی کی سنگت اور گھونگروؤں کے چھناکے پر کہیں رقص ہوتا تھا کہیں موسیقی۔ پھول والوں اور تنبولیوں کی دکانوں پر تماش بینوں کے جمگھٹے تھے۔ وہ پھولوں کے ہار خرید رہے تھے، پان کھا رہے تھے اور چھجوں اور بالکونیوں پر بیٹھی ہوئی بنی سنوری طوائفوں سے اشارے بازی کر رہے تھے۔ ہنس رہے تھے، مسکرا رہے تھے۔ کوئی منچلا نوجوان شوخی سے کسی عشوہ طراز طوائف پر پھبتی کستا یا کوئی چبھتا ہوا فقرہ چست کرتا تو زور دار کا قہقہہ بلند ہوتا۔

☆

آغا جانی چوک کی رنگارنگ دلچسپیوں سے بے نیاز آگے بڑھتا رہا۔ اس کی نظریں کاظم کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ مگر کاظم کا کہیں پتہ نہ تھا۔ آغا اپنی دھن میں مگن گردن ادھر ادھر گھما پھرا کر متلاشی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اسی اثنا میں کسی نے قریب آکر سرگوشی کی۔ "سرکار! کہیں تفریح کرا لاؤں۔ واللہ ایک نمبر دانا ہے۔ دیکھیں گے تو دل تھام کر رہ جائیں گے۔" آغا اس کی بات سن کر سخت بھنّایا۔ عالم یہ تھا کہ اس کی جیب میں کل ساڑھے تین آنے تھے۔ اس کا ارادہ تھا کہ کسی نانبائی کی دکان پر جا کر دو پیسے کا سالن اور ایک پیسے کی دو گرم گرم خمیری روٹیاں خریدے گا اور تنور کے پاس بیٹھ کر اطمینان سے کھائے گا۔ کہیں سے فوری طور پر قرض ادھار ملنے کی توقع نہ تھی۔ لہٰذا وہ ہاتھ روک کر خرچ کر رہا تھا۔

آغا نے غصّے سے مڑ کر بھڑوے کی جانب دیکھا مگر اسے دیکھتے ہی اس کا غصہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ آغا نے اسے پہلی ہی نظر میں پہچان لیا۔ مسکرا کر بے تکلفی سے بولا۔ "ابے غفورے! رندہ بسولا چھوڑ کر تو نے یہ رنڈیوں کی دلّالی کب سے شروع کر دی۔ بڑھئی کا پیشہ کچھ برا تھا؟"

"میاں رنڈی کی یاری میں آخر کو یہی انجام ہوتا ہے۔ سالی نے ہاتھ کے اوزار تک بکوا دئے۔" غفورے نے تلخی سے کہا۔ "نہ جانے کتنوں کے تو گھر بار بک گئے۔ کوڑی کوڑی کو محتاج ہو گئے رنڈی کے چکر میں جو پڑا، گیا کام سے۔ اس کے کوٹھے پر یا تو چلمیں بھرتا ہے یا میری طرح بھڑواگیری کرتا ہے۔ سکندر نواب کا حشر آپ نے نہیں دیکھا۔ وہی سکندر نواب جن کی محل سرا پر کبھی ہاتھی

جھُومتے تھے۔"

"ابے تو نے تو پوری رام کہانی شروع کردی۔ یہ بتا کاظم کو کہیں دیکھا ہے؟"
"کون کاظم؟ وہی تو نہیں جو لاڈن سوداگر کے بڑے لڑکے کی معشوقی میں رہتا ہے۔ گورا گورا نازک نازک ذرا ریشمی سا، کمر کو تھوڑا لچکا کر چلتا ہے۔"

"نہیں یار۔ تو نہ جانے کس کاظم کی بات کر رہا ہے۔" آغا جانی نے بے زاری کا اظہار کیا۔
"میں اس کاظم کے بارے میں پوچھ رہا ہوں جو کسی زمانے میں مشرف آغا کا مصاحب تھا۔ پرانے حیدر گنج میں رہتا ہے۔"

"اچھا، اچھا، وہ کاظم جو آجکل کجّن نواب کے ساتھ نظر آتے ہیں۔" غفورے نے سنجیدگی سے کہا۔ "ابھی ذرا دیر پہلے تو میں نے ان کو نواب صاحب کے ساتھ کھُن کھُن جی کی کوٹھی کے پاس دیکھا تھا۔ میرا خیال ہے وہ اس وقت دلبری خانم کے کوٹھے پر ملیں گے۔ کجّن نواب کا آجکل وہاں بہت آنا جانا رہتا ہے۔"

"یار غفورے! ایسا کر مجھے وہاں لے چل۔ کاظم سے مجھے اک ضروری کام ہے۔"
"میاں! ایسا کرو، تم خود وہاں چلے جاؤ۔ یہ دھندے کا وقت ہے۔ ہر طرف گاہک منڈلاتے پھر رہے ہیں۔"

"اماں، ذرا دیر میں کونسی قیامت آجائے گی۔ مجھے کھڑے کھڑے کاظم سے دو باتیں کرنا ہیں۔"
غفورے نے ٹالنا چاہا۔ مگر آغا جانی نے اصرار کیا تو وہ آمادہ ہوگیا۔ وہ آغا جانی کو دلبری خانم کے بالاخانے پر لے گیا۔ لیکن سامنے کے زینے کے بجائے پچھواڑے سے لے گیا۔ دروازہ کھولتے ہی آغا جانی نے دیکھا۔ ایک ادھیڑ شخص اسٹول پر سر جھکائے ایک گوشہ میں بیٹھا ہے۔ حلیہ اس کا یہ تھا کہ چہرہ اجڑا ہوا، سر کے بالوں کے لمبے لمبے پٹے الجھ کر چیل کا گھونسلہ بن گئے تھے۔ لباس میلا کچیلا و بلا پتلا پچکی سا جسم۔ وہ وقفے وقفے سے سر اٹھا کر آہ سرد بھرتا اور بے قرار ہو کر یہ صدا بلند کرتا۔

دلبر دل آرا، تیرے ناز نے انداز نے مارا مجھے

قریب ہی ایک آراستہ پیراستہ وسیع کمرہ تھا۔ اجلی چاندنی کا فرش تھا۔ اس پر خوش رنگ قالین بچھا تھا۔ جگہ جگہ خاص ترتیب سے گاؤ تکیے لگے تھے۔ کئی تماش بین گاؤ تکیوں سے ٹیک لگائے

مسند پر بیٹھے تھے۔ پان چباتے تھے یا پیچواں حقے کی نے ہونٹوں میں دبا کر کش لگاتے تھے۔ طبلے اور سارنگی کی سنگت پر دلبری لہک لہک کر گا رہی تھی۔ بھاؤ بتا رہی تھی۔ بانکی چتونوں کے تیر چلا رہی تھی۔ عشوہ طرازی کر رہی تھی۔ جذبات میں ہلچل پیدا کر رہی تھی۔ گیت کے ایک ایک بول پر محفل میں قلغلہ بلند ہوتا۔ کوئی تڑپ کر آہ کرتا کوئی واہ۔

غفورے کمرے میں چلا گیا۔ آغا جانی نہ گیا۔ ذرا دیر بعد غفورے واپس آگیا۔ آغا جانی کے دریافت کرنے پر اس نے بتایا۔ "میاں! اندر نہ تو نواب کمّن ہیں اور نہ کاظم۔" پھر وہ اسٹول پر بیٹھے ہوئے مجنوں صفت خبطی سودائی کی جانب متوجہ ہوا۔ اسے جھک کر آداب کیا۔ مسکرا کر مزاج پوچھا۔ "نواب صاحب! کہیے کیا حال چال ہے؟"

اس مردِ ناتواں نے گردن اٹھا کر پژمردہ نظروں سے غفورے کو دیکھ' ٹھنڈی سانس بھری اور یوں گویا ہوا۔ "میاں، حال احوال ہمارا کیا پوچھتے ہو۔ اپنا حال تو یہ ہے۔

ترے در پہ اس بہانے ہمیں دن سے رات کرنا
کبھی اِس سے بات کرنا کبھی اُس سے بات کرنا!

اس نے سر جھکایا اور ایک بار پھر مراقبے میں چلا گیا۔ غفورے نے اس سے مزید بات چیت نہ کی۔ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھا۔ آغا جانی اس کے ساتھ ساتھ چلا۔ دونوں زینے کی سیڑھیاں طے کر کے نیچے پہنچے۔

آغا جانی نے دلبری کے بالا خانے سے باہر آکر غفورے سے پوچھا۔ "اماں غفورے! یہ خبطی سودائی کون تھا؟"

"آپ انہیں نہیں جانتے؟" غفورے نے حیرت کا اظہار کیا۔ "یہی تو سکندر نواب ہیں۔"

"مگر انہوں نے یہ کیا بھگل بنا رکھا ہے؟"

"دلبری کی چاہت میں لاکھ کا گھر خاک میں ملا دیا۔ سب کچھ اس پر لٹا دیا۔" غفورے نے بتایا۔ "آپ تو جانتے ہی ہیں کہ رنڈی بھلا کس کی ہوئی۔ یہ قلاّش ہوئے تو وہ دوسرے کے پہلو میں جا بیٹھی۔ آجکل نواب کمّن کے پاس ہے۔ وہ بھی آنکھیں بند کر کے دلبری پر پانی کی طرح روپیہ پیسہ لٹا رہے ہیں۔" اس نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ "اِدھر سکندر نواب کا حال یہ ہے کہ

رنڈی بازی کے ساتھ ساتھ مدک کا چھینٹا لگانے کا بھی چسکہ پڑ گیا۔ رنڈی بازی کرتے کا تواب ہوتا رہا نہیں۔ بے زر عشق ٹیں ٹیں والا معاملہ ہے۔ مگر مدک بازی نہیں چھوٹی۔"

"مگر یار غفورے! یہ رنڈی کا کوٹھا ہے۔ چنڈو خانہ تو ہے نہیں جہاں مدک کا چھینٹا لگانے کے لئے افیم ملتی ہو۔"

"میاں! بات دراصل یہ ہے کہ جس طرح بائیسکوپ کی فلموں کی پبلسٹی ہوتی ہے۔ اسی طرح سکندر نواب بھی دلبری کی پبلسٹی کرتے ہیں۔" غفورے نے مسکرا کر کہا۔ "شام ہوتے ہی یہ دلبری کے کوٹھے پر پہنچ جاتے ہیں۔ میں تو اس بازار کی دائی ہوں۔ مجھ سے کیا چھپا ہے۔ ان کی حقیقت بھی اچھی طرح جانتا ہوں۔ نہ یہ خبطی ہیں نہ سودائی۔ صرف ایکٹنگ کرتے ہیں۔ دلبری کے کوٹھے پر آنے جانے والے ان کو اس حال میں دیکھتے ہیں تو ان پر دلبری کے حسن کا بڑا رعب پڑتا ہے۔ چوک میں ہر طرف ان کی عاشقی کا شہرہ ہے۔"

"اس ایکٹنگ سے ان کو ملتا کیا ہے؟" آغا جانی ہنوز حیرت زدہ تھا۔

"اکیلے میں کبھی کبھار دلبری کو سینے سے لگا کر چوما چاٹی کر لیتے ہیں۔ پھوکٹ میں دل کے ارمان نکال لیتے ہیں۔" غفورے نے بے تکلفی سے قہقہہ لگایا۔ "رات گئے تک اس کے کوٹھے پر آہیں بھرتے رہتے ہیں۔ آنے والے گاہکوں کو دیکھ کر شعر پڑھتے ہیں۔ شعر تو انہیں ایک سے ایک پھڑک دار یاد ہے۔ اور یہ جو لباس اس وقت پہنے بیٹھے ہیں یہ تو ایک طرح سے ان کی وردی ہے۔ کچھ دیر بعد جب بازار میں سناٹا پڑ جائے گا اور گاہکوں کی آمد و رفت ختم ہو جائے گی تو یہ کوٹھری میں جا کر وہ اجلے کپڑے پہنیں گے جو گھر سے پہن کر آتے ہیں۔ صابن سے منہ ہاتھ دھوئیں گے۔ تیل ڈال کر بالوں کو سنواریں گے۔ نائکہ سے روزانہ کا بندھا ہوا کلدار ایک روپیہ وصول کریں گے۔ سیدھے کسی ٹھیکے پر پہنچیں گے۔ چار آنے کی افیم خریدیں گے۔ ایک آنے کی آدھ پاؤ بالائی خریدیں گے۔ چنڈو بازوں کے ساتھ بیٹھ کر افیم سے مدک تیار کریں گے۔ اس کا چھینٹا لگائیں گے اور بالائی کھائیں گے۔ روپے میں سے جو کچھ بچ جائے گا اس سے کل گھر کا خرچ چلائیں گے۔"

وہ بولتا رہا آغا جانی توجہ اور دلچسپی سے سنتا رہا۔ بات کہتے کہتے غفورے کو اپنے مطلب کا ایک گاہک نظر آیا۔ وہ اس کی جانب لپکا۔ آغا نے اسے نہ ٹوکا نہ روکا۔ خاموشی سے آگے بڑھ

گیا۔ سکندر نواب کا ذکر سُن کر اسے وہ مدکیا یاد آ گیا جو دن ڈھلے رکاب گنج کے پل بھیک مانگتا نظر آتا تھا۔ حلیہ اس کا یہ تھا کہ بال بکھرے ہوئے۔ جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ۔ گال پچکے ہوئے۔ کمر جھکی ہوئی۔ بدن پر میلا کچیلا لباس۔ پیروں میں پھٹی پرانی جوتی۔

بھیک مانگنے کا اس کا انداز سب سے نرالا تھا۔ وہ اپنی جھکی ہوئی کمر پر دونوں ہاتھ رکھے پل پر ادھر سے ادھر چکر لگاتا رہتا۔ راہگیروں کو نہایت عاجزی سے ٹوکتا۔

"قبلہ، صرف دو آنے کا سوال ہے۔"

"وہ جو ترکی ٹوپی پہنے ہوئے ہیں۔ اے حضرت، صرف ایک چونّی کا طلب گار ہوں۔"

"سُنئے جناب! ایک دوّنی مرحمت فرمائیں۔ حضور کے بال بچوں کو دعائیں دوں گا۔"

"اے صاحب! وہ جو سیاہ اچکن زیب تن کئے ہیں۔ سرکار! صرف ایک اٹھنّی کا سوال ہے۔"

"وہ صاحب، جو سیاہ پمپ شو پہنے ہیں۔ بندہ پرور ایک آنہ تو مرحمت فرمائیں۔"

وہ ہر راہگیر کو اس کی وضع قطع کے مطابق مخاطب کرتا اور اس کی حیثیت کا اندازہ لگا کر سوال کرتا۔ راہگیر اس انوکھی دریوزہ گری پر چونکتے۔ پلٹ کر اسے دیکھتے۔ کچھ نہ کچھ اسے دیتے یا مسکراتے ہوئے اپنی راہ لیتے۔ اس گداگر کی عمر تیس بتیس سال سے زیادہ نہ تھی مگر افیون کی لت نے جوانی ہی میں اسے بوڑھا بنا دیا تھا۔ سنا ہے وہ بھی کوئی تباہ حال نواب زادہ تھا۔ خاندانی امراء کے کسی گھرانے کا چشم و چراغ تھا۔ گداگری سے اسے جو کچھ ملتا اسے جیب میں ڈال کر شام کو کسی چنڈو خانے میں پہنچتا۔ مدک کا چھینٹا لگاتا۔ افیون کے نشے سے سرشار ہو کر غم غلط کرتا۔ رات گزرتی، دن نکلتا۔ اور جب دو گھڑی دن رہ جاتا تو وہ رکاب گنج کے پل پر پہنچ جاتا۔ ہر آنے جانے والے کے سامنے دست طلب دراز کرتا۔

☆

سجاد تنہا تھا اور اس روز بھی آغا جانی کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ آغا پہنچا تو اس نے شکوہ کرنے کے انداز میں کہا۔ "اماں، تم کل نہیں آئے۔"

"کل کا تو میں نے وعدہ نہیں کیا تھا۔" آغا اس کے برابر ہی تخت پر بیٹھ گیا۔ "آج رات

کے لئے تم نے کہا تھا۔ میں آگیا۔ مگر وہ مشاطہ کہاں ہے؟"

"آنے ہی والی ہوگی۔ شام کو وہ آئی تھی اور اس وقت آنے کا وعدہ کر گئی تھی۔"

"اگر وہ واقعی خانگی رہ چکی ہے تو بہت تیز ہوگی۔ حرفوں کی بنی ہوئی ہوگی۔"

"بہت تیز ہے۔ میں نے تو تم کو پہلے ہی بتایا تھا۔" سجاد نے مسکرا کر کہا۔ "اماں وہ کیسی بھی ہو۔ ہمیں اس سے کونسی عزیز داری جوڑنا ہے۔ اس کے وسیلے سے بس اپنا کام ہو جائے۔"

"بچے کے بارے میں بھی اس سے بات ہوئی تھی؟" آغا جانی زیادہ دیر اپنی بے چینی پر قابو نہ رکھ سکا۔ دل کی بات بے ساختہ زبان پر آگئی۔

"بچے ہی کے بارے میں بات ہوئی تھی۔ اس وقت اُسے بلایا ہی اس مقصد سے ہے۔"

"آج ہی رات اس کے ہمراہ امیر محل جانا ہوگا؟"

"اماں آج نہیں تو کیا کل جمعرات کو۔" سجاد بیگ نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "پچھلی ملاقات پر تم کو بتایا نہیں تھا۔ بھول گئے اس روز کی بات؟"

"یاد آیا اس روز یہی بات ہوئی تھی۔" آغا نے مسکرا کر اپنی غلطی کا اعتراف کیا۔

سجاد خاموش رہا۔ آغا کو معاً خیال آیا کہ اگر طلعت آرا اس وقت امیر محل میں موجود ہوئی اور اس نے کسی طور اسے دیکھ لیا تو فوراً پہچان لے گی۔ ایسی صورت میں تو بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔ لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ امیر محل جانا خطرے سے خالی نہ تھا۔ اسے طرح طرح کے خدشات ستانے لگے۔ اس نے ٹوہ لگانے کی غرض سے پوچھا۔

"حضور بیگم کی بیٹی طلعت آرا تو زیادہ تر امیر محل ہی میں رہتی ہوگی۔"

"یہ تم کو بیٹھے بٹھائے اس وقت طلعت آرا کا خیال کیسے آگیا؟"

"اکلوتی اولاد ہے۔ سنا ہے ماں اُسے اس قدر چاہتی ہیں کہ گھڑی بھر کی جدائی گوارہ نہیں۔"

"اماں بیٹی شادی کے بعد پرائے گھر کی ہو جاتی ہے۔" سجاد نے سنجیدگی سے کہا۔ "مجھے زیادہ تو نہیں معلوم۔ البتہ اتنا سننے میں آیا ہے کہ وہ بہت کم آتی ہے اور جب آتی ہے تو دن ہی دن ٹھہر کر چلی جاتی ہے۔ بات یہ ہے کہ شوہر اس کا اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے۔ بیوی کو بھی تعلیم یافتہ بنانا چاہتا ہے۔ دو دو ماسٹر پڑھانے کے لئے ملازم ہیں۔ صبح کا الگ، شام کا الگ۔ ان کے

ملاوہ ایک میم بھی اتالیق کے طور پر مقرر ہے۔"

"وہ کیا کرتی ہے؟" آغا جانی نے دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔

"وہ انگریزی بول چال سکھاتی ہے۔ انگریزوں کا رہن سہن اور ان کے طور طریق سکھاتی ہے۔"

"تو کیا اسے بھی میم بنانے کا ارادہ ہے؟" آغا نے مسکرا کر تبصرہ کیا۔

"میاں کی تو خواہش ہے کہ طلعت آرا پردہ ترک کر دے مگر وہ ابھی اس کے لئے آمادہ نہیں۔" مرزا سجاد بیگ نے بتایا۔ "مرحومہ رانی حیدر گڑھ تو بالکل میموں ہی کی طرح رہتی تھیں۔ پردہ تو انہوں نے کیا ہی نہیں۔ کھلے تخزانے سگریٹ پیتی تھیں اور میں نے تو یہ بھی سنا ہے کلب میں انگریز حکام کے ساتھ شراب وراب بھی پیتی تھیں۔" اس نے قدرے تامّل کے بعد کہا۔ "حیدر گڑھ ریاست تو چھوٹی سی ہے۔ یوں سمجھو تعلقداری ہے مگر یاور علی خاں کو سرکار کی طرف سے راجہ کا خطاب ملا ہوا تھا۔ اب وہ موروثی بن گیا۔ لیکن ریاست ہے جھگڑے کی۔"

"جھگڑے کی کیسے ہے؟"

"ریاست کا ایک اور دعویدار پیدا ہو گیا ہے۔"

"وہ کون ہے؟" آغا نے اس کی باتوں میں مزید دلچسپی کا اظہار کیا۔

"وہ رشتے میں راجہ یاور علی خاں کا ماموں زاد بھائی لگتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ریاست کا حق ملکیت اسے ملنا چاہیئے۔ وہ خود کو اصلی وارث قرار دیتا ہے۔"

"مگر مرحومہ رانی حیدر گڑھ نے تو اپنے وصیت نامہ میں طلعت آرا کو اپنا وارث قرار دیا ہے۔ میں نے تو یہی سنا ہے۔"

"ہاں کوئی باقاعدہ وصیت نامہ تو ہے نہیں۔" سجاد نے آغا کو مطلع کیا۔ "نہ کسی وکیل کی معرفت تیار ہوا ہے اور نہ ہی سرکار کی طرف سے منظور شدہ ہے۔ سنا ہے مرنے سے پہلے مرحومہ رانی حیدر گڑھ نے سادہ کاغذ پر ایک تحریر چھوڑی تھی جس کی رُو سے طلعت آرا کو انہوں نے اپنا وارث قرار دیا ہے اس تحریر کو دوسرے فریق نے غیر قانونی بتایا ہے۔ عدالت میں مقدمہ بھی دائر کر دیا ہے۔"

"اگر یہ بات ہے تب تو اس کا مقدمہ مضبوط ہے۔" آغا نے اپنے ردّ عمل کا اظہار کیا۔

"مگر وہ بالکل کھکّل ہے۔ مقدمہ لڑنے کے لئے روپیہ چاہیئے اور وہ اس کے پاس ہے نہیں۔

ادھر روپے کی ریل پیل ہے۔ وہ دو بیرسٹر طلعت آما کی طرف سے مقدمے کی پیروی کے لئے کھڑے کئے گئے ہیں۔" سجاد نے بات کا رخ بدلتے ہوئے کہا۔" اماں ان کی مقدمہ بازی تو چلتی رہے گی۔ مجھے تو اس بات میں دلچسپی ہے کہ آج بچہ تم کو مل جائے تاکہ شادی کے لئے میرا راستہ صاف ہو جائے۔"

دونوں باتیں کر رہے تھے کہ اسی اثناء میں ایک برقع پوش عورت سامنے سے آتی ہوئی نظر آئی۔ اسے دیکھتے ہی سجاد بیگ نے دبی زبان سے کہا۔" لو وہ آگئی۔"

آغا جانی نے نظریں اُٹھا کر دیکھا۔ وہ اب قریب آ چکی تھی۔ وہ ملگجا سفید برقع اوڑھے ہوئے تھی۔ دونوں کے سامنے پہنچتے ہی اس نے نقاب الٹ دی۔ وہ ادھیڑ تھی اور صورت شکل سے زمانہ ساز اور گھاگ نظر آتی تھی۔ سانولا رنگ تھا اور چہرے پر ہلکے ہلکے چیچک کے داغ تھے۔ آنکھیں چھوٹی چھوٹی تھیں اور ان میں ایک خاص قسم کی چمک تھی۔ اس نے آتے ہی دریافت کیا۔

" وہ آپ کے دوست آگئے؟"

" آئے ہوئے بھی دیر ہو گئی۔" سجاد نے آغا جانی کی طرف اشارہ کیا۔" یہ بیٹھے ہیں۔ بس تمہارا ہی انتظار ہو رہا تھا۔"

وہ قریب پڑی ہوئی ایک بنچ پر بیٹھتے ہوئے تھکی ہوئی آواز سے بولی۔" سیدھی امیر محل سے آ رہی ہوں۔ قسم لے لیجئے جو راستے میں کہیں رکی ہوں۔ صرف آج ہی نہیں کئی روز سے صرف آپ ہی کے کام کے لئے ماری ماری پھر رہی ہوں۔ حالانکہ میرے پاس اور بھی کئی پیغام ہیں۔ کہیں رقعہ پہنچانا ہے۔ کہیں بر دکھوے کا بندوبست کرانا ہے۔ کہیں دن تاریخ طے کرانا ہے۔ آپ کو کیا کیا بتاؤں۔ میری جان کو تو ہزار آزار ہیں۔ مگر مجھے تو آجکل آپ ہی کے کام کی دھن ہے۔" وہ مشین کی طرح فرفر بولتی رہی۔ دونوں خاموش بیٹھے اس کی باتیں سنتے رہے۔ وہ بولتے بولتے ذرا رکی تو سجاد نے ٹوکا۔

" تو پھر اب کیا ارادہ ہے؟"

" اے ارادہ کیا ہے۔" اس نے آغا کی جانب ہاتھ اٹھا کر کہا۔" انہیں اپنے ساتھ امیر محل لے جاؤں گی۔" وہ زیرِ لب مسکرا کر سجاد کی جانب متوجہ ہوئی۔" میاں! اب ایسی بھی کیا بے صبری۔ سب کچھ تو طے ہو چکا ہے۔ اب تو چار بھائی بندوں کو اکٹھا کر کے دو بول پڑھوانا رہ گئے ہیں۔"

سجّاد جھینپ کر رہ گیا۔ آغا بھی گم صم بیٹھا رہا۔ مگر مشاطہ خاموش نہ رہی۔ "ایک بیڑا پان کا تو کھلوائیے۔ منہ پھیکا پھیکا ہو رہا ہے۔"

تنبولی کی دوکان قریب ہی تھی۔ سجّاد نے آواز دے کر تین گلوریاں لانے کے لئے کہا۔ اور مشاطہ سے دریافت کیا۔ "اشرف نواب کی طرف بھی گئی تھیں؟"

"اے لو، کیوں نہیں گئی تھی۔" مشاطہ نے مستعدی سے جواب دیا۔ "سویرے سے تین پھیرے ان کے گھر کے کر چکی ہوں۔ پوچھ لیجئے گا۔ اے اللہ رکھے آپ تو ٹھہرے نوشامیاں، اس وقت تو صاحبِ معاملہ اشرف نواب ہی ہیں۔ سب کچھ ان ہی کے ذریعے طے ہو رہا ہے۔ وہ بیچ میں نہ پڑتے اور میں جان نہ لڑاتی تو خدا ہی اس رشتے کو طے کرواتا۔ اے ہے کیسے کیسے طوفان اٹھے ہیں۔ کیا کیا بکھیڑے پیدا ہوئے ہیں۔ اکیلے دم پر سب کا سامنا کیا ہے۔ سو روپے اور جوڑا لوں گی۔ دیکھئے اُس وقت حیل و حجّت نہ کیجئے گا۔"

"وہ وقت تو آجائے۔" سجّاد نے مسکرا کر کہا۔

"اے اب وقت آنے میں رہ کیا گیا ہے۔ ایسی چاند سی دلہن دلوا رہی ہوں کہ چراغ لے کر ڈھونڈیئے گا تو نہیں ملے گی۔ پھر ماشاء اللہ گھرانا بھی اچھا ہے۔ حضور بیگم بالکل اولاد کی طرح اس لڑکی کو سمجھتی ہیں۔ سارا انتظام ہی وہ کر رہی ہیں۔" وہ کھل کر مسکرائی۔ "اے آپ تو امیر محل داماد بن کر جا رہے ہیں۔"

وہ ابھی اور نہ جانے کیا کچھ کہتی، اسی اثنا میں تنبولی پان لے کر آ گیا۔ سجّاد نے پان اٹھا کر مشاطہ کو پیش کیا۔ اس نے گلوری کلّے میں دبائی اور آغا کی جانب متوجہ ہوئی۔ "چلئے پھر کچھ سوچ کر بولی۔ "اے اپنا نام تو بتا دیجئے۔" وہ اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

آغا کے جواب دینے سے پہلے ہی سجّاد بول اٹھا۔ "ان کو آغا جانی کہتے ہیں۔ میرے بہت پرانے ملنے والے ہیں۔"

☆

آغا خاموشی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ مشاطہ نے سجّاد سے دوسرے روز شام کو ملنے کا وعدہ کیا۔

آگے بڑھی اور گلی میں پہنچ گئی۔ آغا جانی اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

گلی سنسان تھی اور روشنی بھی کم تھی۔

مشاطہ اور آغا جانی امیر محل کی جانب جا رہے تھے۔ کچھ دُور تک وہ چپ چاپ چلتے رہے پھر مشاطہ نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ پوچھا۔ "میاں! آپ کے اللہ رکھے کتنے بچے ہیں؟"

"میں نے ابھی تک بیوی بچوں کا جھنجٹ نہیں پالا۔" آغا نے مسکرا کر جواب دیا۔

"اے آپ بیوی بچوں کو جھنجٹ کہہ رہے ہیں۔ وہ گھر ہی کیا جس میں گھر والی نہ ہو۔ اور بچے تو گھر کی رونق ہوتے ہیں۔" اس نے فوری ردّ عمل کا اظہار کیا۔ "تو گویا آپ ابھی تک چھڑے ہیں۔"

"جی ہاں، میں نے ابھی تک شادی نہیں کی۔" آغا نے شادی نہ کرنے کا یہ جواز پیش کیا۔ "والدین انتقال کر چکے ہیں۔ ایک سیانی بہن ہے۔ چاہتا ہوں پہلے اس کے فرض سے سبکدوش ہو جاؤں، پھر اپنا گھر بساؤں۔" آغا نے سخن سازی سے کام لیا۔ ورنہ حقیقت یہ تھی کہ اس کی چھوٹی بہن کا عرصہ ہوا بیاہ ہو چکا تھا۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ اٹاوہ میں رہتی تھی۔ کئی بچے بھی تھے۔ مگر دونوں عرصہ دراز سے ایک دوسرے سے قطعی بے تعلق تھے۔ اس کے علاوہ آغا جانی کی نہ کوئی بہن تھی اور نہ بھائی۔

"بہن کے لئے کوئی پیغام ویغام بھی آیا؟" مشاطہ نے اپنے ڈھب سے بات آگے بڑھائی۔ "میرے پاس لڑکوں کے کئی اچھے رشتے ہیں۔ کہئے تو کسی کا رقعہ لے کر آؤں۔ مجھے اپنے گھر کا پتہ بتا دیجئے۔"

آغا کا ٹھکانہ عشرت منزل میں تھا اور اس کے بارے میں وہ اسے بتانا نہ چاہتا تھا۔ لہٰذا اس نے بات آگے نہ بڑھنے دی۔ "بہن کی نسبت تو پہلے ہی طے ہو چکی ہے۔ ادھر ذرا ہاتھ تنگ ہے۔ حالات ٹھیک ہوتے ہی اس کا بیاہ کر دوں گا۔"

"اللہ نے چاہا تو وہ جلد ہی اپنے گھر بار کی ہو جائے گی۔ مگر آپ نے کچھ اپنے بارے میں بھی سوچا۔"

"اس کے فرض سے ادا ہونے کے بعد ہی سوچوں گا۔ فی الحال ایسا کوئی ارادہ نہیں۔"

"ماشاء اللہ آپ جوان جہان ہیں، کیسے گزارہ ہوتا ہے؟"

"بس کسی نہ کسی طرح گزارہ ہو جاتا ہے۔" آغا نے ٹالنے کی کوشش کی۔

"چوک کی کوٹھے والیوں کے بھاؤ تو بہت اونچے ہیں۔" اس دفعہ اس نے کھل کر بات کی۔ اس کے بارے میں سجاد کا اندازہ بالکل درست تھا۔ وہ جوانی میں خانگی رہ چکی تھی۔ عمر ڈھلی اور جوانی کا سورج غروب ہوا تو اس کا دھندا ختم ہونے لگا۔ پیٹ پالنے کے لئے اس نے مشاطہ کا پیشہ اختیار کر لیا لیکن اس کے ساتھ ساتھ چوری چھپے خانگیوں کی دلالی بھی کرتی تھی۔ "میں تو کہتی ہوں ادھر ادھر بھٹکنے کے بجائے کسی خانگی کے پاس چلے جایا کریں۔ ادھر آپ کا ہاتھ بھی تنگ ہے۔ روپے ڈیڑھ روپے میں کام چل جائے گا۔"

آغا جانی اس کی حوصلہ افزائی کرنا نہ چاہتا تھا۔ وہ کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ اسی اثنا میں دو راہگیر اندھیرے سے نکل کر سامنے آ گئے۔ آغا خاموش رہا۔ وہ بھی کچھ نہ بولی۔ مگر جب راہگیروں کے قدموں کی آہٹ مدھم پڑ کر خاموشی میں تحلیل ہو گئی تو اس نے پھر بات چھیڑی۔ "کہئے تو کہیں لے چلوں؟" دونوں اس وقت ایک سنسان گلی سے گزر رہے تھے۔ گلی تنگ تھی اور خاصی تاریک بھی تھی۔ گلی کے دونوں طرف بوسیدہ مکانات تھے۔

"سنا ہے کہ خانگیاں تو ٹاپے والی گلی میں رہتی ہیں اور وہ یہاں سے بہت دور ہے۔" آغا نے کترانے کی کوشش کی۔

"اے صرف ٹاپے والی گلی ہی میں خانگیاں نہیں رہتی ہیں۔" مشاطہ نے اسے مطلع کیا۔ "جگہ جگہ ان کے اڈے ہیں۔ ایک تو اسی گلی میں ہے۔" اس نے قریب کے ایک مکان کی سمت ہاتھ اٹھا کر اشارہ ۔ "یہ سامنے ہی تو ہے۔"

مشاطہ نے آغا کے جواب کا انتظار بھی نہ کیا۔ تیز تیز قدم اٹھاتی اس مکان کے سامنے جا کر ٹھہر گئی۔ یہ مکان بھی بوسیدہ تھا۔ آگے اونچی دیوار تھی مگر کہیں کہیں سے ٹوٹ پھوٹ گئی تھی۔ دروازے کا رنگ روغن بھی کب کا اڑ چکا تھا۔ آغا بڑھ کر اس کے قریب پہنچ گیا۔ مشاطہ نے دروازے کی کنڈی پکڑ کر ہولے ہولے کھٹکھٹائی۔ ذرا ہی دیر بعد چاپ سنائی دی۔ دروازے کا ایک پٹ ذرا سا کھلا۔ بارہ تیرہ برس کے ایک نوعمر لڑکے نے منہ باہر نکال کر پوچھا۔

"کون ہے؟"

"بوٹن!" مشاطہ نے اسے مخاطب کیا۔ "اماں سے جاکر کہو خالہ انوری آئی ہیں۔ ساتھ میں کوئی اور بھی ہے۔"

بوٹن نے کوئی جواب نہ دیا۔ مشتبہ نظروں سے آغا کو بغور دیکھا اور اپنا چہرہ اندر کرلیا۔ دروازہ بند ہوگیا۔ خاموشی چھاگئی۔ آغا جانی بہت سٹ پٹایا۔ اس کی جیب میں چند آنے تھے۔ وہ اُس وقت کسی خانگی داشتہ کے پاس جانا نہ چاہتا تھا۔ وہ جلد سے جلد امیر محل پہنچنا چاہتا تھا تاکہ وہاں سے پہلوتی کا بچہ حاصل کرے جس کی اسے ایک عرصے سے تلاش تھی۔ آغا نے مشاطہ کو روکنے کی کوشش کی۔

"دیکھئے ابھی تو امیر محل جانا ہے۔ دیر نہ ہو جائے!"

"اے امیر محل تو دیر ہی سے پہنچنا ہے۔" مشاطہ انوری نے نہایت اطمینان سے کہا۔ "وہاں سے تو خاص طور پر ہدایت کی گئی ہے کہ رات کو دیر ہی سے آنا۔"

"لیکن میرا کہیں اور جانے کا کوئی ارادہ نہیں۔" آغا نے صاف گوئی سے کام لیا۔ "ویسے آپ سے کیا چھپانا۔ میری جیب اس وقت بالکل خالی ہے۔"

"اے دو چار روپے تو جیب میں پڑے ہی ہوں گے۔" مشاطہ نے اسے گھیرنے کی ایک اور کوشش کی۔ "کوئی بات نہیں۔ میں نے تو آپ کو پہلے ہی بتادیا تھا کہ یہاں اس سے بھی کم میں کام چل جائے گا۔"

"میرے پاس تو مشکل سے چند آنے پڑے ہیں۔" آغا نے اس دفعہ اور بھی کھل کر بات کی۔

اسی اثنا میں دروازہ ایک بار پھر کھلا۔ بوٹن نے گردن باہر نکال کر چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔ آہستہ سے کہا۔ "اندر آجائیے" وہ دروازے کی اوٹ میں ہوگیا۔

مشاطہ نے اندر جانے کے لئے قدم بڑھایا اور آغا کو بھی اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ مگر آغا جہاں تھا وہیں کھڑا رہا۔ اس نے اندر جانے سے صاف انکار کردیا۔ "دیکھئے میں اندر جاؤں گا نہیں۔ آپ جانا چاہتی ہیں تو چلی جائیں۔ میں باہر کھڑا آپ کی واپسی کا انتظار کرتا رہوں گا۔"

"اے ہے۔ کہیں ایسا غضب بھی نہ کیجئے گا۔" مشاطہ کے لہجے سے گھبراہٹ آشکارہ تھی۔ "کوئی دیکھے گا تو خواہ مخواہ شک کرے گا۔ یہ چوک تو ہے نہیں جہاں کھلے عام کاروبار ہوتا ہے۔ یہاں

و سب کچھ چوری چھپے ہوتا ہے۔ ایسی رازداری برتی جاتی ہے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ ورنہ محلے والے رہنا دوبھر کر دیں۔"

"لیکن میں تو آپ سے اپنی مجبوری بتا چکا ہوں۔" آغا اس کے اصرار کرنے پر بھی آمادہ نہ ہوا۔

"آپ فکر نہ کریں۔ میں تو موجود ہوں۔"

اسی وقت بوٹن نے دروازے سے منہ نکالا اور گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "آپ دروازے پر کیوں کھڑی ہیں؟ اماں کہہ رہی ہیں جسے اپنے ساتھ لانا ہے فوراً اندر لے آئیں۔"

"لیجئے، اب تو بلاوا بھی آگیا۔ آیئے میرے ساتھ۔" وہ آگے بڑھی۔ آغا بھی بادل نخواستہ اس کے ساتھ ساتھ چلا۔

دونوں گھر کے اندر داخل ہو گئے۔ بوٹن دروازے کے ساتھ ہی لگا کھڑا تھا۔ اس نے جلدی سے دروازہ بھیڑ کر کنڈی لگا دی۔

آغا نے دیکھا، دروازے کے سامنے خاصا وسیع آنگن تھا۔ آنگن کے ایک گوشے میں نیم کا گھنا درخت تھا۔ درخت کے نیچے مرغیوں کی ڈھابلی تھی۔ مرغیاں اس وقت بھی ڈھابلی کے اندر وقفے وقفے سے کڑکڑا رہی تھیں۔ آنگن کا فرش کچا تھا۔ بائیں ہاتھ کو باورچی خانہ تھا جس پر چھپر کی چھت تھی۔ باورچی خانے کے ساتھ ہی کچی دیواروں کا بنا ہوا مختصر سا حمام اور بیت الخلا تھا۔ جس پر کوئی چھت نہ تھی۔ اور دروازوں کے بجائے صرف ٹاٹ کے پردے پڑے تھے۔ باورچی خانے کے عین سامنے آنگن کی دوسری طرف دالان تھا۔ آنگن میں رسّی کی الگنی تھی۔ اس پر ایک بوسیدہ چادر اس طرح پڑی تھی کہ اس طرف کا حصہ نظر نہ آتا تھا۔ اُدھر سے بچوں کے رونے اور عورتوں اور مردوں کے بولنے کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔

انوری دالان کی جانب بڑھی۔ آغا اس کے پیچھے پیچھے چلا۔

دالان میں ایک طرف لکڑی کی اتنی بڑی چوکی تھی جس پر تین چار افراد کے بیٹھنے کی گنجائش تھی۔ چوکی پر میلی سفید چادر بچھی تھی۔ چادر پر ایک گاؤ تکیہ رکھا تھا۔ گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے ایک دبلی پتلی ادھیڑ عورت کلی دار پاجامہ پہنے بیٹھی تھی۔ اس کا رنگ زردی مائل کھلتا ہوا تھا۔ سر کے بال کھچڑی تھے۔ چہرہ مرجھایا ہوا تھا۔ لیکن چہرے کے نقش و نگار بتاتے تھے کہ جوانی میں خوبصورت

اور طرح دار رہی ہو گی۔ وہ اپنے رکھ رکھاؤ سے نائکہ معلوم ہوتی تھی۔ اس کے قریب چھوٹا سا پاندان رکھا تھا جس پر مدت سے قلعی نہ ہوئی تھی۔ جگہ جگہ سے میلا میلا تانبا نظر آ رہا تھا۔

چوکی سے ذرا ہٹ کر کوٹھڑی تھی۔ کوٹھڑی کا دروازہ بند تھا۔ اس کی دیوار میں فٹ بھر اونچا موکھا تھا جس پر مٹی کا چراغ رکھا تھا۔ چراغ روشن تھا اور اس کی دھندلی دھندلی روشنی دالان میں پھیلی ہوئی تھی۔ کوٹھڑی کے برابر کمرہ تھا۔ اس کا دروازہ بھی بند تھا مگر اندر سے سرگوشیوں اور ہلکی ہلکی ہنسی کی نسوانی آوازیں ابھر رہی تھیں۔

نائکہ نے انوری اور آغا کو دیکھا تو اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ مسکرا کر مشاطہ سے مخاطب ہوئی۔ "اے انوری! تم کہاں غائب ہو گئی تھیں۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے سال بھر بعد تمہاری صورت نظر آئی ہے۔" اس نے بڑھ کر انوری کا ہاتھ تھاما اور اپنے برابر چوکی پر بٹھا لیا۔ انوری نے برقع اتار کر ایک طرف رکھا اور سنبھل کر بیٹھ گئی۔

چوکی کے عین مقابل کچھ فاصلے پر پلنگ تھا۔ پلنگ پر صرف دری بچھی ہوئی تھی۔ نائکہ نے پلنگ کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے آغا سے کہا۔ "تشریف رکھیے۔" آغا خاموشی سے پلنگ پر بیٹھ گیا۔

انوری صفائی پیش کرنے لگی۔ "کیا بتاؤں بہن، کتنی مصروفیت ہے۔ ایک ایک رشتہ طے کرانے کے لئے ادھر سے ادھر بھاگتے بھاگتے ٹانگیں ٹوٹ جاتی ہیں۔ کبھی کبھی تو مہینوں کی بھاگ دوڑ کے بعد ٹکا سا جواب مل جاتا ہے کہ رشتہ منظور نہیں۔ ساری محنت اکارت جاتی ہے۔" اپنی بات کہتے کہتے اس نے آغا جانی کی جانب دیکھا اور موضوع بدل دیا۔ "آج تمہارے گھر کے سامنے سے گزر رہی تھی۔ یہ آغا جانی صاحب میرے ساتھ تھے۔ ان کے ایک کام کے سلسلے میں امیر محل جا رہی تھی۔ تمہارے گھر کا دروازہ دیکھا تو ملنے کو جی چاہا۔ سوچا ان کو بھی تم سے ملوا دوں۔"

"تو پھر میں لڑکیوں کو بلا لوں۔" نائکہ نے جواب کا انتظار بھی نہ کیا۔ فوراً آواز دی۔ "ارے بھئی لڑکیو! سن رہی ہو۔ ذری باہر تو آؤ۔"

آن کی آن میں کمرے کا دروازہ کھل گیا۔ دو نوجوان لڑکیاں کمرے سے نکل کر باہر آگئیں اور چند قدم آگے بڑھ کر خاموشی سے کھڑی ہو گئیں۔ ایک کی عمر بیس بائیس سال تھی۔ اس کا رنگ

گورا تھا مگر چہرے پر زردی چھائی ہوئی تھی۔ آنکھوں میں خوب گہرا کاجل تھا۔ ہونٹوں پر پان کی سرخی تھی۔ نقش و نگار تیکھے تھے اور ان میں ماں کی شباہت صاف جھلکتی تھی۔ وہ خوش شکل لڑکی تھی مگر کچھ بیمار بیمار سی نظر آتی تھی۔ نائکہ نے اس کی جانب اشارہ کر کے کہا۔ "یہ مہرالنساء ہے۔" اس نے دوسری کی طرف ہاتھ اٹھا کر آغا کو متوجہ کیا۔ "یہ قمرالنساء ہے۔" قمرالنساء کی عمر مشکل سے پندرہ سال تھی۔ اس کا قد بھی چھوٹا تھا۔ رنگ ذرا دبا ہوا تھا۔ آنکھوں میں شوخی تھی اور بدن بھی گداز تھا۔

آغا نے نظریں اٹھا کر دونوں کو دیکھا۔ دونوں کا لباس بہت معمولی تھا اور ان پر سلوٹیں بھی پڑی ہوئی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کپڑوں کو آج ہی گھر میں دھویا گیا تھا۔ بڑی ڈوریئے کی کرتی پہنے ہوئی تھی جس کے مونڈھے پر بڑا سا پیوند لگا تھا۔ وہ پیوند چھپانے کے لئے بار بار دوپٹے کا پلو اٹھا کر کندھے پر ڈال لیتی۔ اس کی نظریں بھی جھکی جھکی تھیں۔ لیکن چھوٹی الھڑپن سے دیدے نکالے آغا کے چہرے کو ٹکر ٹکر دیکھ رہی تھی۔ آغا نے دونوں کا بغور جائزہ لیا مگر خاموش بیٹھا رہا۔

"آپ کوٹھری میں چلے جائیں۔ جسے پسند کریں اسے اندر بھیج دوں گی۔ مگر اندر جانے سے پہلے ایک روپیہ خرچی کا مجھے دیتے جائیں۔ ایک دونی اس کے علاوہ دودھ پینے کے لئے دینا ہوگی۔" نائکہ ٹھیٹ کاروباری انداز میں باتیں کر رہی تھی۔ "اندر جانے سے پہلے ایک بات کان کھول کر سن لیجئے۔ دیکھئے زیادہ دیر نہ ٹھہریئے گا۔ جلدی باہر آجایئے گا۔" وہ شکوہ کرنے کے انداز میں بڑبڑانے لگی۔ "گھنٹہ، سوا گھنٹہ پہلے ایک گاہک آیا تھا۔ موا کوکین ڈوکین کھا کر آیا تھا۔ بچی کو ہلکان کر ڈالا۔ یہ مہرن اس کے پاس تھی۔ کسی طرح چھوڑتا ہی نہ تھا۔ جب اس نے پھونک مار کر چراغ بجھا دیا اور مہرن اندر سے چیخی تو میں نے اٹھ کر زور زور سے دروازہ بھڑبھڑایا۔ تب کہیں جا کر باہر نکلا۔ میرا تو پہلے ہی ماتھا ٹھنکا تھا۔ جب اس نے روپیہ دینے میں ہچر مچر کی۔ کہنے لگا۔ اٹھنی دوں گا۔ میں نے جل کر کہا۔ چونی اٹھنی دینا ہے تو گڑھے والی سرائے یا چاول والی گلی چلے جاؤ۔ وہاں ٹکھیائیاں مل جائیں گی۔ یہ انہی کا بھاؤ ہے۔ بلکہ اس سے بھی کم میں کام چل جائے گا۔"

آغا خاموش بیٹھا رہا۔ نہ وہ اپنی جگہ سے اٹھا نہ کوٹھری کی جانب قدم بڑھایا۔ وہ سخت پریشان تھا۔ انوری نے اس کی پریشانی بھانپ لی۔ اس نے جھٹ مداخلت کی۔ "اے بہن اپنی ہی کہتی رہو گی۔ دوسرے کی بھی کچھ سنو گی۔"

"ہاں، ہاں ضرور کہو۔ کیا کہنا ہے؟"

"اے یہ ٹھہرنے کے ارادے سے اس وقت یہاں نہیں آئے ہیں۔" انوری نے وضاحت کی۔ "یہ تو اندر آنے کو بالکل تیار نہیں تھے۔ میرے اصرار کرنے پر آئے ہیں۔ میں نے سوچا، چلو ان کو تم سے ملوادوں۔ بعد میں آتے رہیں گے۔" اس نے سرگوشی کی۔ "یہ جتنی بار آئیں۔ میری دلالی کی چوتی نکال کر الگ رکھتی جانا۔"

"چوتی لوگی؟ توبہ کرو بہن۔ میں تو دوّنی سے زیادہ کسی کو دلالی نہیں دیتی۔" نائکہ نے منہ بگاڑ کر کہا۔ "اکبر سے پوچھ لو۔ دلالی کرتے اس کا سر سفید ہوگیا۔ تم تو اس سے اچھی طرح واقف ہو۔ اسے ہمیشہ دوّنی ہی دیتی ہوں۔ دلالوں کی طرح میرے تو گاہک بھی لگے بندھے ہیں۔"

"خفا کیوں ہوتی ہو۔ چلو دوّنی ہی دینا۔" انوری مسکرا کر نرم لہجے میں بولی۔ "آئندہ جب یہ آئیں تو ہو سکتا ہے میں بھی ان کے ساتھ آؤں۔ ویسے تم ان سے واقف تو ہو گئیں۔"

"یہ تم نے اچھا کیا۔ بغیر جان پہچان کے میں کسی کو اندر آنے نہیں دیتی۔" نائکہ نے دبی زبان سے کہا۔ "ہر دم پولیس کے مخبروں کا دھڑکا لگا رہتا ہے۔"

"اے پولیس والے بھی کیا کرتے ہیں۔ میں انہیں اچھی طرح جانتی ہوں۔" انوری نے بے نیازی کا اظہار کیا۔ "دو چار روپے کھا کر خاموش ہو جاتے ہیں۔"

"اے خدا ان پولیس والوں سے بچائے۔ ایک بار گھر دیکھ لیں تو آئے دن دروازے پر کھڑے ہیں۔ طرح طرح سے پریشان کرتے ہیں۔ پاس پڑوس میں بدنامی الگ ہوتی ہے۔ میں نے اسی لئے تو کاظمین والا مکان چھوڑ دیا۔ یہاں چلی آئی۔" نائکہ نے مڑ کر لڑکیوں کی سمت دیکھا اور اندر جانے کا اشارہ کیا۔

دونوں خاموشی سے کمرے میں چلی گئیں اور دروازے کے پٹ بھیڑ دیئے۔ بوٹن جو دیر سے دروازے کے قریب کھڑا تھا، آہستہ آہستہ چلتا ہوا دالان میں داخل ہوا اور ماں کے عقب میں جا کر چوکی پر بیٹھ گیا۔

"بہن! اب تم بڑی کی کمائی بہت کھا چکیں۔ کسی کے ساتھ اس کا پلّو باندھ دو۔ خیر سے اپنے گھر بار کی ہو جائے۔" انوری نے منجھی ہوئی مشاطہ کی حیثیت سے مشورہ دیا۔ "میرے پاس کئی

لڑکوں کے رشتے ہیں۔ کہو تو اس کے لئے بات کروں۔"

"اے بہن! دو کی کمائی میں تو پورا پڑتا نہیں۔ اکیلی قمرن سے کیسے کام چلے گا۔"

"کیوں نہیں پورا پڑتا۔ دن میں ترپائی کے کرتے سیتی ہو۔ مرغیاں بھی پال رکھی ہیں۔ انڈوں اور چوزوں سے بھی کچھ نہ کچھ تو مل ہی جاتا ہوگا۔ اللہ رکھے، کل چار دم ہیں۔ غریبا مئو گزر بسر ہو سکتی ہے۔"

"اے صرف چار دم کہاں۔ بھائی بھی تو میرے ساتھ ہی رہتا ہے۔ اس کی بیوی ہے۔ چار بچے ہیں۔"

"وہ کوئی کام دھندا نہیں کرتا مگر تمہاری بھاوج تو کڑھائی کا کام کرتی ہے۔"

"اس کے بعد بھی کہاں پورا پڑتا ہے۔ ایسا برا وقت لگا ہے کہ تم سے کیا بیان کروں۔ اب یہی دیکھو۔ مہرن ضد کر رہی ہے۔ اسے نیا جوڑا تک سلوا کر نہ دے سکی۔ بوٹن ننگے پیر گھومتا پھرتا ہے۔ اسے اب تک جوتی بھی نہیں دلوا سکی۔ سوچتی ہوں کچھ پیسے بچ جائیں تو اسے ایک کھڑاؤں منگوا دوں۔ ننگے پیر تو نہیں پھرے گا۔" نائکہ اپنی پریشاں حالی بیان کرنے لگی۔ "ادھر ہر چیز کو جیسے آگ لگ گئی۔ غضب خدا کا دودھ دو آنے سیر ہو گیا۔ پچھلی عید پر منگایا تھا تو آٹھ آنے کا پورا پانچ سیر دیا تھا۔ گھی روپے کا سوا سیر ملتا تھا، اب سیر بھر آتا ہے۔ آٹا روپے کا اٹھارہ سیر ملتا تھا، اب چودہ سیر آتا ہے۔ یہی دالوں اور ترکاریوں کا حال ہے۔ بکری کا گوشت تین آنے کے بجائے چار آنے سیر ہو گیا۔"

"اس کم بخت مہنگائی کا رونا تو سب ہی رو رہے ہیں۔" انوری نے اس کی تائید کی۔ "تو بھی کوئی اور کام دھندا تلاش کرو۔"

"اب تو یہی رہ گیا ہے کہ کسی کے گھر جا کر ماماگیری کروں۔ ہنڈیا پکاؤں۔ برتن مانجھوں۔" اس نے صاف انکار کر دیا۔ "جو سنے گا یہی کہے گا کہ معتمد الدولہ کی نواسی اور نواب دلارے کی بیگم اب ماماگیری کرتی پھر رہی ہیں۔ نہ بابا اتنے عالی خاندان کے نام کو بٹہ نہیں لگا سکتی۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "خدا بخشے نواب صاحب مرحوم کو میں نے کتنا کہا۔ کس کس طرح نہ سمجھایا مگر وہ تو اس وقت ہوا کے گھوڑوں پر سوار تھے۔ پانی کی طرح پیسہ بہایا۔ ساری جائیداد رہن رکھ دی۔ میرا زیور تک نہ چھوڑا۔ اور جب ڈگری ہوئی اور قرقی گھر پر آئی تو خود تو شرم سے زہر

کھا کر سدھار گئے، مجھے اور ان بچے بچیوں کو دکھ جھیلنے کے لئے چھوڑ گئے۔" نائکہ کا لہجہ رقت انگیز ہو گیا۔ "جس فخر النسا بیگم کی کسی نامحرم نے آواز تک سنی تھی، اب خانگی کہلاتی ہے۔ جوان بیٹیوں کی خرچی کھاتی ہے۔ لعنت ہے ایسی زندگی پر۔"

"صبر کرو بہن۔ جو ہونا تھا ہو گیا" انوری نے اسے تسلی دی۔ "ایک تم پر منحصر نہیں۔ میں تو کتنی ہی ایسی بیگمات کو جانتی ہوں جنہوں نے حالات سے مجبور ہو کر خانگی کا پیشہ اختیار کر لیا۔ تم سلطان جہاں کو تو جانتی ہو گی۔ اسے وہی جو خود کو واجد علی شاہ کی پوتی بتاتی ہیں۔ جب وہ ٹوریہ گنج میں سبزی منڈی کے پاس رہتی تھیں تو ان کی بیٹیوں کے لئے کئی بار میں گاہک لے کر گئی۔"

"میں سلطان جہاں کو بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔ ان کی تو ایک دو نہیں پانچ جوان بیٹیاں ہیں۔" فخر النساء اپنا سارا دکھ درد بھول گئیں۔ چہک کر بولیں۔ "سنا ہے انھوں نے تو تانگے والے لگا رکھے ہیں۔ پانچوں بیٹیاں ان میں بیٹھ جاتی ہے۔ تانگوں کے ارد گرد چادریں بندھی ہوئی۔ پردہ کا پردہ اور رازداری بھی کہ کسی کو خبر نہ ہو کہ تانگے میں کون جا رہا ہے۔ کسی دلال کی بھی ضرورت نہیں۔ دونوں بھائی دلالی کرتے ہیں۔ بہنوں کو لے کر حضرت گنج جاتے ہیں۔ ایک سے ایک موٹا آسامی پھانس کے لاتے ہیں۔"

"اے تم کو ابھی خبر نہیں۔" انوری نے فخر النساء کی معلومات میں اضافہ کیا۔ "جب سے چولکھی کے قریب مکان کرائے پر لیا ہے ان کے کاروبار نے نرالا ڈھنگ اختیار کیا ہے۔ مکان کاہے کو ہے کوٹھی ہے کوٹھی۔ بڑے بڑے دالان کشادہ کمرے، کہیں کئی کئی تخت ملا کر چوکے لگائے ہیں۔ سفید چاندنی کا فرش۔ ان پر قالین بچھے ہوئے۔ گاؤ تکیے قرینے سے رکھے ہوئے کہیں صوفے، کہیں کرسیاں۔ نہ پوچھو کیا ٹھاٹھ باٹ ہیں۔ اب سلطان جہاں کی بیٹیاں باہر نہیں جاتیں۔ مستقل گاہک ہیں۔ خود چل کر آتے ہیں۔ منجھلی تو میونسپلٹی کے کسی کائستھ افسر کی باقاعدہ داشتہ ہے۔ بڑی لالہ دامودر داس کی ملازم ہے۔ وقت وقت کی بات ہے اسی دامودر داس کے پاس جائیداد رہن تھی۔ ہر وقت ہاتھ باندھے سلطان جہاں کے شوہر، سید مہدی حسن کے سامنے کھڑا رہتا تھا۔ اب گھر میں آقا کی طرح دندناتا ہوا آتا ہے۔ نواب صاحب بے چارے ایک گوشے میں پڑے پڑے بڑبڑاتے رہتے ہیں۔

انوری ابھی نواب زادی سلطان جہاں کے بارے میں اور نہ جانے کتنے نت نئے انکشافات

کرتی اسی اثناء میں دروازے پر کسی نے دستک دی۔ ماں نے بوٹن کو اشارہ کیا۔ وہ لپک کر دروازے پر پہنچا۔ واپس آکر بتایا۔ "اکبر آیا ہے۔ اس کے ساتھ کوئی اور شخص بھی ہے۔"

انوری فوراً اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ مسکرا کر بولی۔ "لو میں تو باتوں میں بالکل بھول ہی گئی کہ تمہارے دھندے کا وقت ہے۔ لگتا ہے اکبر کسی گاہک کو لایا ہے۔" اس نے برقع اوڑھتے ہوئے شکوہ کیا۔ "اے تم نے تو پان کا ٹکڑا بھی نہیں کھلایا۔"

"اب تم سے کیا بتاؤں۔ شام سے پان ختم ہو چکے ہیں۔ ورنہ ضرور کھلاتی۔" فخرالنساء نے اظہار معذرت کیا۔

آغا جانی بھی اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور مشاطہ انوری کے ساتھ باہر چلا گیا۔

☆

دونوں خاموشی سے پر پیچ گلیوں سے گزرتے رہے۔ آغا جانی دو قدم ہٹ کر پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ مشاطہ آگے بڑھتے ہوئے مڑ مڑ کے پیچھے دیکھتی جاتی۔ راستہ ناہموار تھا۔ فرش کی اینٹیں جگہ جگہ سے اکھڑی ہوئی تھیں۔ تاریکی بھی تھی۔ کہیں کہیں گلی کے نکڑ پر میونسپلٹی کی لالٹینیں روشن تھیں۔ دونوں دھندلی دھندلی روشنی میں سنبھل سنبھل کر قدم اٹھا رہے تھے۔

ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ گلیاں سنسان تھیں۔ جب دونوں امیر محل پہنچے تو رات کے گیارہ کا عمل تھا۔ امیر محل آبادی سے الگ تھلگ ویران اور اجاڑ علاقے میں واقع تھا۔ یہ قدیم وضع کی عالیشان عمارت تھی۔ دیواریں اونچی اونچی تھیں اور ان پر مدت سے قلعی نہیں ہوئی تھی۔ دیواروں میں ایک بھی کھڑکی نہ تھی۔ البتہ کہیں کہیں جھروکے اور تاب دان تھے۔ عمارت کے اردگرد قد آدم چاردیواری تھی۔ جگہ جگہ گھنے درخت تھے۔ چاردیواری کا پھاٹک اونچا تھا اور لوہے کا بنا ہوا تھا۔ پھاٹک سے متصل پختہ کوٹھری تھی۔ کوٹھری کا دروازہ کھلا تھا۔ اندر چراغ روشن تھا۔ کوٹھری کے آگے چبوترہ تھا۔ دھندلی روشنی میں ایک دربان چبوترے پر بیٹھا چلم پر دم لگا رہا تھا۔

مشاطہ کو دیکھتے ہی دربان نے اٹھ کر پھاٹک کا ایک پٹ کھول دیا۔ مشاطہ نے آغا کو پھاٹک کے باہر رکنے کی ہدایت کی اور خود اندر چلی گئی۔ آغا خاموش کھڑا رہا۔ دربان نے اسے دیکھ کر

بات چیت نہ کی۔ پھاٹک بند کیا اور اپنی جگہ پر جا کر بیٹھ گیا۔

امیر محل کے سامنے لق ودق میدان تھا۔ ذرا ہی دیر بعد کتوں کا ایک غول نمودار ہوا اور انھوں نے غرا کر لڑنا شروع کر دیا۔ مگر وہ پھاٹک کے قریب نہ آئے۔ آغا مڑ کر کتوں کو دیکھتا رہا۔ نہ دربان نے اندر آنے کے لئے کہا اور نہ ہی آغا نے اندر داخل ہونے کی خواہش کا اظہار کیا۔ دھندلی دھندلی روشنی میں امیر محل کسی قلعہ کی مانند نظر آ رہا تھا۔

آغا کو زیادہ دیر انتظار نہ کرنا پڑا۔ مشاطہ اندھیرے سے نکل کر سامنے آئی۔ دربان کے قریب پہنچی۔ پھاٹک کھولنے کے لئے کہا۔ دربان نے اٹھ کر فوراً پھاٹک کھول دیا۔ مشاطہ انوری نے آغا سے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ وہ پھاٹک سے گزر کر چپ چاپ اندر داخل ہو گیا۔ پھاٹک کے آگے پائیں باغ تھا۔ جو دور تک پھیلا ہوا تھا۔ باغ کے درمیان سے ایک کشادہ راستہ گزرتا تھا۔ راستے کے دونوں جانب روشیں تھیں۔ کیاریاں تھیں۔ پھولوں کے تختے تھے۔ ہر طرف گہری خاموشی چھائی تھی۔ انوری کی رہنمائی میں آغا آہستہ آہستہ آگے بڑھتا گیا۔

دونوں عمارت کے قریب پہنچے۔ ردکار میں ایک بلند دروازہ تھا۔ جس پر عشق پیچاں کی بیل پھیلتی ہوئی اوپر تک چلی گئی تھی۔ فضا میں پھولوں کی مہک رچی ہوئی تھی۔ انوری نے آہستہ سے دروازے کا ایک پٹ کھولا اور اندر داخل ہو گئی۔ آغا بھی اس کے پیچھے پیچھے اندر چلا گیا۔ داہنے ہاتھ کی دیوار میں ایک اونچا طاق تھا۔ جس میں لالٹین روشن تھی۔ یہ زنان خانے کی ڈیوڑھی تھی جس کی چھت نیچی تھی۔ دروازے کے قریب زینہ تھا جو نیم دائرہ بناتا ہوا ڈیوڑھی کی بالائی منزل کے کمرے تک جاتا تھا۔ اس کمرے میں محل دارنی رہتی تھی۔

ڈیوڑھی کے دوسرے سرے پر جو دروازہ تھا، اس پر پردہ پڑا تھا۔ انوری نے آغا کو دروازے پر ٹھہرایا اور اندر داخل ہو گئی۔ ذرا ہی دیر بعد ایک موٹی تگڑی حبشن نے پردے سے منہ باہر نکالا۔ یہ محل دارنی تھی اور کچھ ہی عرصہ قبل اس نے ملازمت شروع کی تھی۔ اس کا نام خسو تھا۔ اس نے مردانہ قسم کی بھاری آواز میں آغا سے کہا۔

"اندر آ جائیے۔ سرکار آپ کو یاد فرما رہی ہیں۔"

آغا نے آگے بڑھ کر پردہ ایک طرف سرکایا اور جھجکتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ دروازے کے

سامنے وسیع صحن تھا۔ اس کا فرش کچا تھا۔ بیچ میں پختہ حوض تھا۔ اس کے اردگرد پھولوں کی کیاریاں تھیں۔ صحن کے تین طرف صحنچیاں تھیں جن کے آگے طویل چبوترہ تھا۔ صحنچیوں کے عقب میں اونچے اونچے ستونوں کے دالان تھے۔ دالانوں کی چھتوں سے جھاڑ اور فانوس لٹک رہے تھے۔ ان میں موم بتیاں روشن تھیں جن کی روشنی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔

دروازے کے قریب حضور بیگم کی پرانی پیشِ خدمت گلبدن کھڑی تھی۔ اس نے جھک کر آغا کو آداب کیا۔ مڑی اور آغا کو اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔ محل دارنی حسنو دروازے ہی پر ٹھہر گئی۔ آغا آگے بڑھا اور گلبدن کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ دونوں نے ایک کے بعد دوسرا دالان طے کیا۔ ایک کشادہ اور طویل غلام گردش میں داخل ہوئے جس کی دیواروں پر جگہ جگہ کنول اور دوشاخے روشن تھے۔ غلام گردش سے گزر کر دونوں ایک دروازے پر جا کر ٹھہر گئے۔ دروازے پر چلمن پڑی تھی اور باہر کرسی رکھی تھی۔

گلبدن نے کرسی کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے آغا سے کہا۔ ”تشریف رکھیے۔“

آغا خاموشی سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ گلبدن چلمن اٹھا کر اندر چلی گئی۔ امیر محل کی شان و شوکت اور کروفر سے آغا بہت مرعوب ہوا اور سہما ہوا سا گم صم بیٹھا رہا۔ چلمن کے پیچھے سے باتیں کرنے کی آوازیں ابھر رہی تھیں مگر اتنی دھیمی تھیں کہ آغا کچھ سمجھ نہ سکا۔ محل سرا میں داخل ہونے کے بعد اب تک اسے مشاطہ کہیں نظر نہ آئی تھی۔ وہ منتظر تھا کہ مشاطہ اس کے پاس آئے اور کام کی بات کا آغاز ہو۔ مگر مشاطہ تو نہ آئی البتہ گلبدن چلمن کے پیچھے سے نکل کر باہر آئی۔ اس نے دریافت کیا۔

”سرکار پوچھ رہی ہیں، آپ کام کیا کرتے ہیں؟“

آغا پہلے تو سٹ پٹایا لیکن جہاں دیدہ اور پرانا گھاگ تھا اس نے فوراً اندازہ لگا لیا کہ چلمن کے پیچھے مغلانی کے علاوہ حضور بیگم بھی موجود ہیں۔ اس نے پہلو بدلا اور ذرا سنبھل کر بیٹھ گیا۔ گلبدن کی جانب متوجہ ہوا اور نرم لہجے میں بولا۔ ”پہلے میری طرف سے سرکار کی خدمت میں آداب کہیے۔“

گل بدن نے گردن چلمن کے اندر کی۔ مڑی اور آغا سے مخاطب ہوئی۔ ”سرکار دعا کہہ رہی ہیں۔“

آغا نے مسکرا کر سخن سازی سے کام لیا۔ سرکار سے کہیے کہ فی الحال وثیقے پر گزارہ ہے۔“

اندر کسی کی مدھم آواز ابھری۔ "وثیقے دار ہیں۔" پھر کھسر پھسر ہونے لگی۔ گل بدن چلمن کے پیچھے جا چکی تھی۔ جب ذرا خاموشی ہوئی تو گلبدن باہر آئی۔ "سرکار دریافت کر رہی ہیں کہ آپ کے وہ بہنوئی کیا کرتے ہیں جو بچّے کو گود لینا چاہتے ہیں؟"

"ان کی سندیلے میں زمیں داری ہے مگر رہتے یہیں لکھنؤ میں ہیں۔" آغا نہایت ڈھٹائی سے جھوٹ بولتا رہا۔ "اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ بس ممتا کے مارے ہوئے ہیں۔ اولاد کو ترستے ہیں۔ بہن کی گود شادی کے دس برس سے اوپر گزرنے کے بعد بھی ہنوز خالی ہے۔"

چلمن کے عقب میں ایک بار پھر دبی دبی زبان سے باتیں ہونے لگیں۔ آغا گومگو کے عالم میں انتظار کرتا رہا کہ اندر سے کیا جواب ملتا ہے۔ چند لمحے بعد حضور بیگم کی پروقار آواز ابھری۔ "گل بدن! کہہ دو کہ بچہ بڑا ناز و نعم سے پلا ہے۔ کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ اسے اچھی طرح رکھیں گے تو خوش و خرّم رہیں گے۔ بڑا بھاگوان ہے۔ نہال کر دے گا۔" گل بدن نے ہر بات لفظ بہ لفظ دہرا دی۔

آغا جانی نے نہایت مستعدی سے حضور بیگم کو یقین دلایا۔ "سرکار کے حکم میں بال برابر فرق نہ آئے گا۔ خاطر جمع رکھیں۔ ماں باپ سے کسی طور کم دیکھ بھال نہ ہوگی۔ اور وہ دونوں تو اولاد کے ترسے ہوئے ہیں۔ آنکھوں کی ٹھنڈک اور دل کا سرور سمجھیں گے۔ ہر طرح اس کی ناز برداری کریں گے۔" وہ غضب کا لسّان تھا۔ تھیٹر کا منجھا ہوا اداکار رہ چکا تھا۔ آواز میں اُتار چڑھاؤ پیدا کر کے روانی سے بولتا رہا۔ "سرکار چاہیں تو وقتاً فوقتاً کسی کو وہاں بھیجتی رہیں تاکہ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لے کہ کس طرح اسے پالا پوسا جا رہا ہے۔ حیدر گنج میں راجہ ٹکیٹ رائے کی مسجد کے قریب ان کا عالیشان مکان ہے۔ شبّر علی حسینی ان کا نام ہے۔ محلّے کا ہر فرد ان سے واقف ہے۔" اس نے قدرے تامّل کے بعد کہا۔ "اب تو رات زیادہ ہو چکی ہے۔ اجازت ہو تو کل حاضر ہو جاؤں۔ کسی کو میرے ساتھ کر دیا جائے کہ مکان دیکھ لے۔"

"یہ مناسب رہے گا۔" حضور بیگم کی آواز چلمن کے پیچھے سے ایک بار پھر ابھری۔ وہ آغا جانی کی چرب زبانی اور لچھے دار باتوں سے اس قدر متاثر ہوئیں کہ اس نے جو کچھ کہا انھوں نے آنکھ بند کر کے اس پر یقین بھی کر لیا۔ "گل بدن! کہہ دو کہ کل نہیں، پھر کسی روز آ جائیں اور کسی خادمہ کو اپنے ہمراہ لے جائیں اور اسے اپنے بہنوئی کا مکان دکھا دیں۔ ویسے نام اور پتہ تو بتا ہی دیا ہے۔ اور

سو باتوں کی ایک بات یہ کہ سجّاد بیگ تو موجود ہی ہیں۔" ان کے لہجے میں رقّت پیدا ہوگئی۔ "بھئی ہمارا کیا ہے۔ اللہ کی امانت ہے۔ وہی اس کا والی وارث ہے۔ ہم تو اس کی امانت سپرد کر رہے ہیں۔"

آغا نے ایک بار پھر ان کو موٹے دیانا یقین دلایا کہ بچے کا ہر طرح خیال رکھا جائے گا۔ کسی طرح کی تکلیف نہ ہوگی۔ اندر سرگوشیاں ہونے لگیں۔ دیر تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ آغا خاموش بیٹھا بے چینی سے پہلو بدلتا رہا۔ دفعتہً سرگوشیاں بند ہوگئیں اور خاموشی میں رک رک کر سسکیاں ابھرنے لگیں۔ کوئی گھٹی گھٹی آواز سے رو رہا تھا۔ پھر کسی نے اسے ڈانٹا۔ "نجو! یہ کیا حرکت ہے؟ صبر سے کام لو۔" یہ مغلانی کی آواز تھی۔ انھوں نے نرم لہجے میں اسے دلاسا دیا۔ "اللہ جو کرتا ہے بہتری ہی کے لئے کرتا ہے۔ اس میں بھی اس کی کچھ مصلحت ہوگی۔ لو اب آنسو پونچھ ڈالو اور دو گھونٹ پانی پی لو۔" اس کے بعد آہستہ آہستہ باتیں ہونے لگیں۔ مگر سسکیاں برابر ابھرتی رہیں۔

آغا کی نظریں چلمن پر لگی تھیں۔ آخر گلبدن چلمن اٹھا کر باہر آئی۔ بچہ اس کی گود میں تھا۔ اسی وقت نجو نے زور سے چیخ مار کر دہائی دی۔ "سرکار! اسے نہ جانے دیجیے۔ میں مرجاؤں گی۔ ہائے اللہ مجھ سے صبر نہیں ہوتا۔ اس کی جدائی کیسے برداشت کروں گی۔"

"نجو! تو باز نہیں آئے گی؟" اس دفعہ حضور بیگم نے اسے ڈانٹا۔ "تجھے کسی آئے گئے کی بھی شرم نہیں۔ بند کر رونا دھونا۔" لیکن سسکیاں بند نہ ہوئیں۔

گلبدن نے بچے کو آغا کی طرف بڑھایا۔ اس نے فوراً اٹھ کر اسے اپنے ہاتھوں پر سنبھال لیا۔ وہ ریشمی رضائی میں لپٹا ہوا تھا اور اس وقت بے خبر سو رہا تھا۔ اس نے ہاتھ پاؤں تک نہ ہلائے نہ کلبلایا نہ رویا۔

گلبدن بچے کو آغا کی آغوش میں دے کر اندر چلی گئی۔ لیکن ذرا ہی دیر بعد واپس آگئی اور روپے سے بھری ہوئی ایک سرخ تھیلی آغا کے ہاتھ میں دے کر بولی۔ "یہ تین سو روپے ہیں۔ سرکار نے فرمایا ہے کہ اس سے بچے کے کپڑے لتے بنوا دیجئے گا۔"

آغا ششدر رہ گیا۔ مگر اس نے جلد ہی خود کو سنبھال لیا۔ دبی زبان سے جھجکتے ہوئے کہا۔ "سرکار سے کہیئے۔ کیوں خواہ مخواہ شرمندہ کر رہی ہیں۔ جیسا حکم دیں گی ویسے ہی کپڑے لتے بنوا دیئے جائیں گے۔ سرکار کا یہی کیا کم احسان ہے کہ اولاد کے ترسے ہوؤں کو ماں مل جائے گی۔ زندگی بھر

دعائیں دیتے رہیں گے۔"

اندر سے کوئی جواب نہ ملا۔ البتہ گلبدن چلمن کے پیچھے چلی گئی۔ واپس آئی تو اس نے کہا "سرکار فرما رہی ہیں۔ یہ روپے تو آپ کو رکھنا ہی پڑیں گے۔ امیر محل سے بچہ خالی ہاتھ نہیں جائے گا۔"

آغا نے کسی قدر تکلف سے تھیلی جیب میں ڈال لی۔ نرم لہجے میں بولا۔ "سرکار کی اگر یہی مرضی ہے تو میں کیا عرض کر سکتا ہوں۔"

"گلبدن! کہہ دو کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو کہ بچہ کہاں سے آیا ہے اور کیسے آیا ہے۔" چلمن کے پیچھے سے حضور بیگم کی پُروقار آواز ابھری۔ "اس ہدایت کو گرہ میں باندھ لیا جائے اور اس پر سختی سے عمل کیا جائے۔ پوری پوری رازداری برتی جائے۔ اس میں دونوں کا بھلا ہے۔"

گلبدن نے حضور بیگم کی تنبیہہ لفظ بہ لفظ دہرا دی۔ آغا جانی نے دوبارہ آنے کا وعدہ کیا۔ حضور بیگم سے اجازت لی اور واپس جانے کے لئے مڑا۔ مشاطہ اندر ہی بیٹھی رہی۔ تمام وقت نہ تو اس کی آواز سنائی دی نہ چلمن سے نکل کر باہر آئی۔ اس دفعہ گلبدن نے اس کی رہنمائی کی اور پھاٹک تک اس کے ہمراہ گئی۔

آغا پھاٹک سے باہر آیا تو خوشی سے اس کی باچھیں کھلی جا رہی تھیں۔ وہ بچے کو کندھے سے لگائے آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔ میدان عبور کیا اور سڑک پر پہنچ گیا۔ اس نے کچھ ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ ایک خالی تانگہ مل گیا۔ جیب گرم تھی۔ پورے تین سو کی رقم تھی۔ اس نے تانگہ ٹھہرایا۔ کرایہ بھی نہ طے کیا۔ بچے کو سنبھالے ہوئے۔ تانگے میں بیٹھ گیا۔ اس کی ہدایت پر تانگہ عشرت منزل کی جانب روانہ ہو گیا۔

رات خاصی بھیگ چکی تھی۔ سڑکیں سنسان تھیں۔ کوچوان نے دو چار چابکیں لگائیں تو گھوڑا ہوا سے باتیں کرنے لگا۔ فضا خوشگوار تھی۔ آغا کو اس وقت تانگے کی سواری میں بڑا لطف آیا۔

آغا جب عشرت منزل کے دروازے پر پہنچا تو رات آدھی ہو چکی تھی۔ اس نے تالا کھولا۔ اندر گیا اور دروازے کی کنڈی لگا دی۔ عشرت منزل کے اونچے اونچے دالان اندھیرے میں بھائیں بھائیں کر رہے تھے۔ بچہ ابھی تک گہری نیند سو رہا تھا۔ راستے میں وہ کلبلایا تو آغا نے ہولے ہولے تھپک کر اسے سلا دیا۔

اس نے بچے کو بستر پر آہستہ سے لٹا دیا۔ لالٹین روشن کی۔ بچے کے قریب گیا۔ ہلکی ہلکی روشنی میں وہ بہت خوبصورت نظر آرہا تھا۔ سنہری گھونگھر والے بال۔ آنکھوں پر جھکی ہوئی لانبی پلکیں۔ تندرست ہاتھ پاؤں۔ سرخ و سفید رنگ۔ آغا نے اسے دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔

صبح ہوتے ہی بچے نے پریشان کرنا شروع کر دیا۔ آغا نے کسی نہ کسی طرح دن گزارا۔ شام کا اندھیرا پھیلتے ہی اس نے بچے کو گود میں لیا اور ممانی کے گھر پہنچ گیا جن کے پاس وہ گاہے گاہے جاتا رہتا تھا۔ اس نے بچے کو ان کے سپرد کر دیا۔ پوچھنے پر یہ عذر پیش کیا کہ اس کے ایک پرانے ملنے والے بارہ بنکی سے اپنی بیوی کا علاج کرانے لکھنؤ آئے ہیں مرض کچھ ایسا خطرناک نکلا کہ اسپتال کے ڈاکٹروں کو فوری طور پر آپریشن کرنا پڑا۔ شوہر دن رات بیوی کی تیمارداری میں مصروف رہتے ہیں۔ بچہ ساتھ آیا تھا۔ اس کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں۔ لہٰذا وہ بچے کو یہاں لے آیا۔

آغا نے بات اس ڈھب سے کی کہ ممانی نے یقین کر لیا۔ اس نے اس توقع کا اظہار کیا کہ بچے کی ماں دس بارہ دن میں صحت یاب ہو جائے گی تب وہ آکر بچے کو لے جائے گا۔ ممانی کی طبیعت میں دردمندی تھی۔ نیک اور خدا ترس تھیں۔ گھر میں بھی کوئی کم سن بچہ نہ تھا۔ ان کی صرف دو لڑکیاں تھیں جو اب سیانی ہو چکی تھیں۔ بچہ تھا بھی بہت خوبصورت۔ خوب گورا چٹا اور گول مٹول۔ ممانی اور ان کی بیٹیوں نے بچے کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ بیٹیاں تو اس قدر خوش ہوئیں کہ فوراً اس کا منہ ہاتھ دھلایا۔ بال سنوارے اور طرح طرح سے ناز برداری کرنے لگیں۔

آغا نے بچے میں ان کی اس قدر دلچسپی دیکھی تو اطمینان کی سانس لی۔ اس کی بہت بڑی دردسری رفع ہو گئی۔ ہر طرح کی پریشانی سے چھٹکارہ مل گیا۔ اب وہ یکسوئی سے چلّہ کشی کر سکتا تھا۔ اس نے جمعرات سے چلّہ کشی شروع کرنے کا منصوبہ بنایا۔

جمعرات کی سہ پہر وہ بازار گیا۔ اگربتیاں، لوبان اور چراغ روشن کرنے کے لئے کڑوا تیل خریدا۔ عطر کی ایک شیشی بھی لی۔ کھانے پینے کی ضروری اشیاء کی خریداری کی۔ عشرت منزل پہنچا۔ غسل کیا۔ اجلا لباس پہنا۔ عطر لگایا اور جب پہر رات گزری تو تہہ خانے میں چلا گیا۔ طاقوں میں رکھے ہوئے چراغوں میں تیل ڈالا۔ ان کو روشن کیا۔ اگربتیاں سلگائیں اور اگرسوز میں لگا دیں۔ اگرسوز مٹی کا بنا ہوا تھا۔ خاصا بڑا تھا اور سوراخ بھی زیادہ تھے۔

تہہ خانے کا فرش کچّا تھا۔ اسے وہ دن ہی میں صاف کر چکا تھا۔ اس نے ایک صاف ستھرے گوشے میں مصلا بچھایا اور اس پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ عمل شروع کرنے سے پہلے اس نے انگشت شہادت سے اپنے اردگرد حصار کھینچا۔ یہ مایا جگانے کے لئے اکیس روز کی چلّہ کشی تھی۔

(۳)

گرمیوں کے دن تھے۔ مگر اس روز لُو نہیں چل رہی تھی۔ یہ ایک نیم گرم شام تھی۔ آغا جانی اکبری دروازے سے چوک میں داخل ہوا۔ وہ اس وقت ململ کا کڑھا ہوا کرتا اور ایک بَر کا سفید پائجامہ پہنے ہوئے تھا۔ پیروں میں پمپ شو تھا اور سر پر دو اُنگل اُونچی باڑہ کی دو پلی ٹوپی تھی۔ ایک ہاتھ کی کلائی میں موتیے کے پھولوں کا گجرا لپٹا ہوا تھا۔

وہ اس شام خوب بن سنور کر نکلا تھا۔ ممانی کے گھر بھی گیا تھا۔ بچّے کو دیکھا۔ وہ ممانی اور ان کی لڑکیوں سے خوب گھل مل گیا تھا۔ کبھی فرش پر گھٹنیوں چلتا۔ کبھی پلنگ کی پٹّی پکڑ کر کھڑا ہو جاتا اور اسے چھوڑ کر چلنے کی کوشش کرتا۔ چند قدم ڈگمگاتا ہوا چلتا اور پھر گر جاتا۔ مگر رونے کے بجائے قہقہے لگاتا۔ خود ہنستا اور دوسروں کو بھی ہنساتا۔ آغا کچھ دیر ممانی کے گھر رہا۔ بچّے کو گود میں لے کر کھلاتا رہا۔

اسے ممانی کے سپرد کرنے کے بعد وہ اکثر ان کے گھر جاتا رہا۔ بچّہ شروع شروع میں اسے دیکھ کر بدکتا تھا۔ اس کی گود میں جا کر رونا شروع کر دیتا تھا۔ مگر اب وہ اس سے بھی خاصا مانوس ہو گیا تھا۔ آغا چاہتا بھی یہی تھا۔ وہ جب کبھی ممانی کے گھر جاتا۔ بچّے کے لئے کچھ نہ کچھ لے کر ضرور جاتا اور بہانا یہ بناتا کہ اسے بچّے کی بیمار ماں نے بھیجا ہے جواب روبصحت ہے۔ اپنے بچّے کو ہر دم یاد کرتی ہے۔ اس کے بارے میں برابر پوچھتی رہتی ہے۔

وہ ممانی کی بڑی بیٹی میں بھی اب دلچسپی لینے لگا تھا۔ وہ بھی اس کی جانب مائل نظر آتی تھی۔ اس کے سامنے اترا اترا کر بولتی۔ بات بات پر ہنستی۔ عشوہ طرازی کرتی۔ ممانی کی نظریں بچا کر آغا آنکھوں ہی آنکھوں میں حال دل بیان کرتا۔ سینے پر ہاتھ رکھ کر ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں بھرتا۔ اشارے کرتا۔ بچّے کو اس کی گود میں دیتے ہوئے ہولے سے ہاتھ دبا دیتا۔ تنہائی میں اسے سینے سے لگانے

کی کوشش کرتا۔

وہ ہمیشہ خوب بن ٹھن کر ممانی کے گھر جاتا اور ہمیشہ نت نیا لباس پہن کر جاتا۔ وضع قطع بدلی۔ اچھا کھانے اور اچھا پہننے کو ملا تو اس کے چہرے پر رونق آگئی۔ رنگ بھی ذرا کھل گیا۔ جعفری بیگم کے دیئے ہوئے تین سو روپے وہ ہاتھ کھول کر ممانی کے گھر پر کسی نہ کسی بہانے خرچ کرتا رہتا۔ کبھی مٹھائی ساتھ لے جاتا کبھی پھل۔ کبھی کپڑے لتے۔ چلہ کشی کی مدت ختم ہو رہی تھی اور اُسے یقین تھا کہ جلد ہی دفینہ اس کے ہاتھ آجائے گا۔ پھر تو پَو بارہ ہوں گے۔ عیش ہی عیش ہوگا۔ ادھر ممانی کا حال یہ تھا کہ عرق النساء کے مرض میں مبتلا ہونے کے بعد وہ کسی محل سرا میں ملازمت کرنے کے قابل نہ رہی تھیں۔ ماموں حسین آباد ٹرسٹ میں معمولی محرر تھے۔ تنخواہ قلیل تھی۔ ایک کمانے والا اور چار کھانے والے۔ کسی نہ کسی طور غریبانہ گزر بسر ہو رہی تھی۔ آغا جس فیاضی سے ان پر خرچ کر رہا تھا، اس سے سب ہی مرعوب تھے۔ وہ گھر میں داخل ہوتا تو گرم جوشی سے اس کا خیر مقدم کیا جاتا۔

وہ کبھی کبھی تو دن بھر ممانی کے گھر میں رہتا۔ مگر دن ڈھلتے ہی جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوتا۔ روکنے پر بھی نہ رکتا۔ اور اگر دن ڈھلے آتا تو دو گھڑی رات گزرنے سے پہلے پہلے چلا جاتا۔ یہ اس کے تہ خانے میں جانے اور چلہ کشی کا وقت ہوتا اور چلہ کشی میں وہ کسی طور ناغہ کرنا نہ چاہتا تھا۔

☆

آغا جانی اکبری دروازے سے نکل کر چوک میں کچھ ہی دُور گیا تھا کہ اچانک قیصر مرزا پر اس کی نظر پڑی۔ وہ سر جھکائے، کسی سوچ میں غرق سامنے سے آرہا تھا۔ آغا اسے دیکھ کر ایسا بے قرار ہوا کہ لپک کر قریب پہنچا اور گرم جوشی سے اسے دونوں بازوؤں میں بھینچ لیا۔ مگر قیصر مرزا نے اس قدر گرم جوشی کا مظاہرہ نہ کیا۔ اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ وہ بجھا بجھا اور نڈھال نظر آرہا تھا۔

"اماں تم تو رام پور جا کر وہیں کے ہو گئے۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے کوئی چھ مہینے بعد تمہاری صورت دکھائی دی ہے۔" آغا نے شکوہ کیا۔ "ایسی بھی کیا بے مروّتی۔ جانے سے پہلے مل کر بھی نہ گئے۔"

"رام پور جانے سے ایک روز پہلے شام کو میں عشرت منزل گیا تھا۔" قیصر مرزا نے صفائی پیش کی۔ "لیکن دروازے پر تالا لگا تھا۔"

"لیکن ایک کنجی تو تمہارے پاس بھی رہتی ہے۔ تالا کھول کر اندر جاتے اور میرا انتظار کرتے۔"
"کنجی میں گھر ہی میں چھوڑ آیا تھا۔ واپس جاکر اسے لانے کی گنجائش نہ تھی۔ پھر بھی دروازے پر کھڑا دیر تک تمہارا انتظار کرتا رہا۔ مگر تم نہ جانے کہاں گئے تھے۔ واپس ہی نہ آئے۔" قیصر مرزا نے آغا جانی کو مطلع کیا۔ "آخر ناامید ہو کر واپس چلا گیا اور دوسرے روز صبح رام پور کے لئے روانہ ہو گیا۔ تم سے ملنے اور بات کرنے کی مہلت ہی نہ ملی۔"

"مگر رام پور تم گئے کس تقریب میں تھے؟" آغا نے دریافت کیا۔

"یہ تو میں تم کو پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ جب سے خالو دربار رام پور سے وابستہ ہوئے ہیں خالہ بال بچوں کے ساتھ وہیں رہتی ہیں۔ وہ ضد کر کے ابا جان کو خالو سے علاج کرانے کے لئے رام پور لے گئیں۔ مجھے بھی ان کے ہمراہ جانا پڑا۔ اماں جان بھی ساتھ گئیں اور چھوٹی بہن بھی۔ پورا گھر گیا تھا۔"

"لیکن اتنے طویل عرصے تک وہاں کیا کرتے رہے؟"

"یہ تو تم نے بھی سنا ہو گا کہ خالو بہت مانے ہوئے حکیم ہیں۔ ان کے علاج سے ابا جان کے مرض میں افاقہ بھی ہوا۔ دو چار قدم چلنے بھی لگے تھے۔ بولتے تو بات سمجھ میں آجاتی۔" قیصر مرزا سنبھل سنبھل کر بولتا رہا۔ "واپس لکھنؤ جانے کا ارادہ کیا تو خالہ نے چھوٹی بہن کی شادی کے لئے زور دیا۔ وہ بچپن ہی سے ان کے منجھلے بیٹے سے منسوب تھی۔ اماں جان چاہتی تھیں کہ لکھنؤ جا کر شادی کی جائے۔ وہ بھی ٹھیک کہہ رہی تھیں۔ وہاں تو ہمارے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ جہیز کا بندوبست اور شادی کے اخراجات کیسے پورے کئے جاتے۔ جاڑا شروع ہو چکا تھا اور جاڑا شروع ہوتے ہی ابا جان کی طبیعت اچانک بگڑ گئی۔ انہوں نے شادی کی ہامی بھر لی۔ وہ چاہتے تھے کہ بیٹی ان کی زندگی ہی میں اپنے گھر بار کی ہو جائے۔ آخر ایک روز چپ چپاتے شادی ہو گئی۔"

"مگر بہن کی شادی کے بعد وہاں اب تک کیوں ٹھہرے رہے؟" آغا نے مداخلت کی۔

"ابا جان کی حالت سفر کے قابل نہ تھی۔ سوچا تھا کہ ان کی طبیعت سنبھلتے ہی واپس چلے جائیں گے۔ مگر ان کی حالت سنبھلنے کے بجائے روز بروز بگڑتی ہی گئی۔" قیصر مرزا کی آواز بھرا گئی۔ آنکھوں کے آبگینے چھلک پڑے۔ "ایک رات وہ ہم سب کو روتا پیٹتا چھوڑ کر ہمیشہ ہمیشہ کے

لئے رخصت ہو گئے۔"

قیصر مرزا رومال سے آنسو پونچھنے لگا۔ آغا جانی بھی غم زدہ ہو گیا۔ قیصر مرزا کو تسلی تشفی دینے لگا۔ اسی اثنا میں ایک سقہ کٹورا بجا بجا کر صدا لگاتا ہوا قریب سے گزرا۔ آغا جانی نے اسے روکا۔ پینے کو پانی مانگا۔ اس نے مشک کا منہ کھول کر کٹورے میں پانی ڈالا۔ آغا نے کٹورہ لے کر قیصر مرزا کی جانب بڑھایا۔ اصرار کر کے پانی پلایا۔ آغا نے خود بھی کٹورہ بھر کر پانی پیا۔ پیسہ دے کر سقے کو رخصت کیا۔

جب ذرا قرار آیا تو قیصر مرزا نے بتایا۔ "ابا جان کے انتقال کے بعد فوری واپسی ممکن نہ تھی۔ اماں جان کو عدت کے چار مہینے دس دن پورے کرنے کے لئے رام پور میں قیام کرنا پڑا۔"

"تم واپس کب آئے؟" آغا نے پوچھا۔

"آج ہی دوپہر کو اماں جان کے ساتھ واپس پہنچا ہوں۔" قیصر مرزا نے جواب دیا۔ "ابا جان کے ایک پرانے ملنے والے ہیں۔ ان کے پاس جا رہا تھا۔ واپسی پر تم سے ملنے عشرت منزل جاتا۔ اچھا ہوا کہ تم سے یہیں ملاقات ہو گئی۔ اب کہیں نہیں جاؤں گا۔ تمہارے ساتھ عشرت منزل چلوں گا۔"

آغا جانی خاموش رہا۔ وہ اپنی نئی چلہ کشی کے بارے میں قیصر مرزا کو کچھ بتانا نہ چاہتا۔ اور ایسے مرحلے پر جب چلہ کشی میں صرف دو روز رہ گئے تھے، خدشہ تھا کہ وہ کوئی نہ کوئی رخنہ نہ پیدا کر دے۔ اس کی اکتیس روزہ طویل اور صبر آزما کوشش پر پانی پھر جاتا۔

آغا کو خاموش پا کر قیصر مرزا نے پوچھا۔ "اماں تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ کس سوچ میں پڑ گئے؟"

"میں اس وقت عشرت منزل نہیں جا رہا ہوں۔" آغا نے فوراً عذر پیش کیا۔

"کیا کسی رنڈی کے کوٹھے پر جا رہے ہو؟ نکلے بھی بہت بن ٹھن کے ہو۔" قیصر مرزا نے بے تکلفی سے کہا۔ "بڑے نقشے سے ہو۔ بات کیا ہے۔ کہیں دفینہ وفینہ تو نہیں نکل آیا؟"

"ارے یار اپنی ایسی قسمت کہاں۔ دفینہ نکل آتا تو سارے دلدر دور ہو جاتے۔" آغا نے دروغ گوئی سے کام لیا۔ "میں نے تو اس کا خیال ہی چھوڑ دیا۔"

"اچھا ہی کیا۔ یار بہت جان جوکھوں کا کام تھا۔ واللہ! جب تم تہہ خانے میں عمل پڑھنے

جاتے تھے تو مجھے ہر وقت تمہاری طرف سے دھڑکا لگا رہتا تھا۔" قیصر مرزا نے مسکرا کر دریافت کیا۔" مگر تمہارے ٹھاٹھ باٹ تو کچھ اور ہی بتا رہے ہیں۔ کہاں سے رقم ہاتھ لگ گئی؟"

"یار میں تمہاری طرح رئیس زادہ تو ہوں نہیں۔ باپ بھی میرے نہ صاحب جائیداد تھے نہ دشتہ دار۔ کچھ بھی چھوڑ کر نہ گئے۔" آغا جانی نے گہری سانس بھری۔" میں تو موچی تھا موچی ہی رہا۔ اپنی قسمت میں تو جوتے گانٹھنا لکھا ہے وہی کام کرتا ہوں۔ حاجی چھٹن کے کارخانے میں کام کر رہا ہوں۔ وہ ہے تو بہت بڑا خسیس مگر کام نفیس اور بڑھیا ہو تو اجرت بھی بہت اچھی دیتا ہے۔ پچھلے دنوں میں نے اس کے کارخانے میں لگ کر کام کیا۔ نہ کرتا تو بھوکوں مر جاتا۔ بلکہ تمہارے جانے کے بعد تو ایک بار مسلسل تین روز کے فاقے سے رہا۔"

"میں اسی لئے تو رام پور روانگی سے پہلے عشرت منزل گیا تھا کہ تم کو خرچ کے لئے کچھ دیتا جاؤں۔ لیکن تم سے ملاقات ہی نہیں ہوئی۔" قیصر مرزا نے فوراً صفائی پیش کی۔" اب یہ بتاؤ کہ تم عشرت منزل کب پہنچو گے؟"

" اس وقت تو میں چار باغ اسٹیشن جا رہا ہوں۔ مجھے نو بجے کی ٹرین سے کانپور جانا ہے۔" آغا نے جھٹ بات بنائی۔ وہ اسے عشرت منزل لے جانا نہیں چاہتا تھا۔

" اماں تم کانپور جا رہے ہو!" قیصر مرزا نے حیرت زدہ ہو کر دریافت کیا۔" کس سلسلے میں جا رہے ہو؟"

" کوپر ایلن مل میں نوکری کرنے۔ وہاں آجکل بھرتی ہو رہی ہے۔"

" مگر تم مل میں کرو گے کیا؟"

" وہی جوتے بنانے کا کام۔" آغا نہایت ڈھٹائی سے جھوٹ بولتا رہا۔" اماں، یہ جو تم نے فلیکس کے جوتے دیکھے ہیں۔ ایلن مل ہی میں بنتے ہیں۔ پچھلے دنوں کانپور سے صابر آیا ہوا تھا۔ وہ آجکل ایلن مل میں کام کر رہا ہے۔ اسی نے بلایا ہے۔"

" تو گویا تم عشرت منزل نہیں جاؤ گے۔" قیصر مرزا نے کہا۔" تو پھر ایسا کرو کہ تالے کی کنجی مجھے دیتے جاؤ۔ میرے پاس جو کنجی تھی وہ کہیں گم ہو گئی ہے۔ بہت تلاش کیا مگر ملی نہیں۔"

آغا کو یہ سن کر بہت اطمینان ہوا کہ قیصر مرزا کے پاس جو کنجی تھی وہ کھو گئی۔ اس نے حیلہ سازی

سے کام لیا۔" اس وقت تو کنجی میرے پاس ہے نہیں۔ ممانی کے گھر گیا تھا۔ کنجی وہیں چھوڑ آیا۔ سوچا کہ راستے میں کہیں ادھر ادھر نہ ہو جائے۔ خواہ مخواہ تالا توڑنا پڑے گا۔ دیکھنے والوں کا شبہ بھی ہوگا۔"

"یار یہ تم نے بہت برا کیا۔" قیصر مرزا نے اپنی پریشانی کا اظہار کیا۔ "مجھے ایک ضروری کام سے عشرت منزل جانا تھا۔"

"عشرت منزل میں ایسا کیا ضروری کام ہے؟" آغا نے مسکرا کر کہا۔ "اب تو طلعت آرا سے بھی ملنے کی کوئی امید نہیں۔ اس کی تو شادی ہوئے بھی ایک مدت ہوگئی۔ حیدر گڑھ کی تعلقہ داری پھوکٹ میں مل گئی۔ اللہ جسے دیتا ہے اسی طرح چھپّر پھاڑ کر دیتا ہے۔ یہاں دفینہ ملنے کے خواب ہی دیکھتے رہ گئے اور وہ رانی حیدر گڑھ بن گئی۔ اپنی اپنی قسمت ہے۔"

"تھوڑی دیر پہلے کاظم ملا تھا۔ اس نے مجھے طلعت آرا کے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے۔ طلعت آرا کے پھوپھی زاد بھائی علی رضا سے بھی اس کا ملنا جلنا ہے۔ اماں وہی علی رضا جو طلعت آرا کی محبت کا دم بھرتا تھا۔ اس سے شادی کرنے کی کوشش میں لگا رہتا تھا۔"

"تو کیا تم نے کاظم کو طلعت آرا کے بارے میں کچھ بتایا تھا؟"

"یار، تم بھی کمال کرتے ہو۔" قیصر مرزا نے خفگی سے کہا۔ "بھلا میں اس سے طلعت آرا کے بارے میں کیوں بات کرنے لگا۔ میں نے تو اسے ہوا بھی نہ لگنے دی۔ یونہی باتوں باتوں میں اس نے خود ہی سب کچھ بتا دیا اور وہ بھی علی رضا کی ہمدردی میں۔" وہ ایک بار پھر حرفِ مطلب زبان پر لایا۔ "کیا تم ایسا نہیں کر سکتے کہ آج کے بجائے کل کانپور چلے جاؤ۔"

"کل ہی تو مل میں بھرتی ہو رہی ہے۔" آغا نے بات بنائی۔ "مجھے تو اسی ٹرین سے جانا ہے۔ صابر کانپور میں گوالٹولی میں رہتا ہے۔ مجھے اس کا گھر بھی نہیں معلوم۔ وہ مجھے لینے اسٹیشن آئے گا۔ ورنہ میں کسی دوسری ٹرین سے چلا جاتا۔ کانپور تو کئی گاڑیاں جاتی ہیں۔ لیکن میں صابر کو کہاں ڈھونڈتا پھروں گا۔" اس نے قدرے تامّل کے بعد پوچھا۔ "تم عشرت منزل جانے کے لئے اتنے بے چین کیوں ہو؟"

"وہاں میرا جو صندوق رکھا ہے اسے کھول کر کچھ نکالنے کی ضرورت پڑ گئی ہے۔"

"اماں کہیں طلعت آرا کے زیورات تو ابھی تک اس میں نہیں رکھے ہیں؟" آغا نے اسے

مشتبہ نظروں سے دیکھا۔ "تمہاری بے چینی سے تو کچھ ایسا ہی ظاہر ہوتا ہے۔"

قیصر مرزا کا چہرہ فق ہو گیا۔ لیکن اس نے فوراً خود کو سنبھالا۔ صاف مکر گیا۔ "وہ تو میں نے مرحومہ رانی حیدر گڑھ کو دیدئے تھے۔ تم سے بتا بھی چکا ہوں۔ اب وہ میرے پاس کہاں سے آئے"

اس نے اپنی دروغ گوئی کی پردہ پوشی کے لئے یہ عذر پیش کیا۔ "بات دراصل یہ ہے کہ آغا جان کے انتقال کے بعد لالہ گوپی چند نے نالش کر دی ہے۔ وہ تو ڈگری نکلوا کر ساری جائیداد قرق کروانا چاہتا ہے مگر ابھی مقدمے کا فیصلہ ہوا نہیں۔ کچھ ایسے ضروری کاغذات ہیں جو میرے صندوق میں رکھے ہیں۔ مجھے ان کی ضرورت ہے۔"

"مگر تم نے ان کے بارے میں مجھ سے کبھی تذکرہ کیا نہیں۔" آغا کو ابھی تک شبہ تھا کہ قیصر مرزا صاف گوئی سے کام نہیں لے رہا ہے۔ وہ اس سے کچھ چھپانے کی کوشش کر رہا ہے۔ "تم تو اس میں پہننے کے چند کپڑے رکھ کر گھر سے لائے تھے۔ جائیداد کے کاغذات اس میں رکھنے کی کیا تک تھی۔"

"اماں تم نے تو وکیلوں کی طرح باقاعدہ جرح شروع کر دی۔" قیصر مرزا نے اس کی باتوں سے چڑھ کر کہا۔ "یہ بتاؤ کانپور سے واپسی کب تک ہو گی؟"

آغا اُسے دو روز کے لئے ٹالنا چاہتا تھا۔ "میں تو اتوار سے پہلے نہ آسکوں گا۔ کل جمعہ ہے اور پرسوں ہفتہ۔ اور انہی دو دنوں میں مل میں بھرتی ہو گی۔" اس نے مسکرا کر بے تکلفی سے کہا۔ "یار صرف دو روز کی تو بات ہے۔ دو روز میں قیامت تو نہیں آجائے گی۔"

"میں اپنا سامان عشرت منزل سے اٹھا کر گھر لے جاؤں گا۔ وہاں رہنے سے اب کیا حاصل۔" وہ خفا سا نظر آرہا تھا۔ "تم چاہو تو ٹھہرے رہو۔"

"اگر مجھے نوکری مل گئی تو فوری طور پر عشرت منزل چھوڑ دوں گا۔" آغا نے اس کی خفگی نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔ "ویسے ایسے حالات بھی پیدا ہو گئے ہیں کہ اُسے خالی کرنا ہی پڑے گا۔ سنا ہے کہ اس جائیداد کے بارے میں برسوں سے جو مقدمے بازی ہو رہی تھی اب ختم ہونے والی ہے۔ کچھ اس طرح کا راضی نامہ ہو گیا ہے کہ عشرت منزل کو فروخت کر دیا جائے اور جو روپیہ ملے وہ دونوں فریقوں میں آدھا آدھا تقسیم کر دیا جائے۔"

دونوں باتیں کرتے ہوئے آہستہ آہستہ چلتے رہے۔ راستے میں آغا جانی نے تنبولی کی دوکان سے ایک پیسے کے دو عمدہ و ساوری پان لئے۔ ایک خود کھایا دوسرا قیصر مرزا کو کھلایا۔ جب وہ چوک سے نکل کر نخاس میں پہنچ گئے تو آغا نے اتوار کو ملنے کا وعدہ کیا۔ چار باغ اسٹیشن جانے کا بہانہ کیا۔ قیصر مرزا سے رخصت ہوا اور نادان محل روڈ کے نکڑ پر کھڑے ہوئے ایک اِکّے پر سوار ہو گیا۔ وہ قیصر مرزا کو غچّا دینے کے لئے ایک طویل اور پیچ دار راستے سے عشرت منزل جانا چاہتا تھا۔

☆

ہفتے کی شام کو آغا جانی ممانی کے گھر پہنچا اور بچّے کو عشرت منزل لے آیا۔ اسے نہلایا دُھلایا۔ سرخ لباس پہنایا۔ گلے میں گیندے کے پھولوں کا ہار ڈالا۔ پیشانی پر سیندور کا ٹیکا لگایا۔ دودھ میں افیون گھول کر پلائی۔ خود بھی معمول کے مطابق غسل کیا۔ صاف ستھرے کپڑے پہنے۔ عطر لگایا اور بچّے کو گود میں اٹھا کر تہہ خانے میں لے گیا اور چمکار کر دیوار کے سہارے ایک گوشے میں بٹھا دیا۔ کھیلنے کے لئے اس کے سامنے مٹّی کے کھلونے رکھ دیئے۔

تہہ خانے کے طاقچوں میں چراغ روشن تھے۔ اگربتّیوں اور لوبان کے دھویں سے فضا میں خوشبو رچی ہوئی تھی۔ وہ خاموشی سے مصلّے پر جا کر بیٹھ گیا۔ انگلی سے دائرے کی شکل میں حصار کھینچا اور عمل پڑھنا شروع کر دیا۔ اس کے ہونٹ آہستہ آہستہ ہل رہے تھے اور نظریں جنوبی دیوار کے اس بڑے طاق کی جانب اٹھی ہوئی تھیں جس کے نیچے گہرا گڑھا تھا۔ اس جگہ وہ پچھلے بیس روز سے بلاناغہ کھدائی کر رہا تھا۔ اس کا یہ معمول تھا کہ حصار کے اندر بیٹھ کر لگ بھگ تین گھنٹے عمل پڑھتا۔ اس وقت وہ مراقبے کے عالم میں ہوتا تھا۔ آنکھیں بند ہوتیں۔ ہاتھ میں دبی ہوئی تسبیح پر انگلیاں تیزی سے چلتی رہتیں اور ان کے ساتھ ساتھ لبوں پر جنبش ہوتی۔ عمل سے فارغ ہونے کے بعد وہ حصار سے باہر نکلتا۔ گڑھے کے اندر جاتا اور پھاوڑا اٹھا کر کھدائی شروع کر دیتا۔ وہ سنبھل سنبھل کر ہاتھ چلاتا تھا تا کہ رات کے سنّاٹے میں آواز دور تک نہ جائے اور پاس پڑوس میں رہنے والوں کو شبہ پیدا نہ ہو۔ جس جگہ اس نے کھدائی کی تھی وہاں حوض کی مانند چوکور گڑھا بن گیا تھا جو اس کے کندھے تک گہرا تھا۔ گڑھے سے باہر نکلنے کے لئے اس نے مٹّی کی سیڑھیاں

بنا دی تھیں۔ انہی سیڑھیوں سے وہ نیچے اترتا تھا اور کھدائی ختم کرنے کے بعد انہیں طے کرکے اوپر پہنچتا تھا۔

آغا جانی عمل پڑھتا رہا اور نگاہیں گھما کر بار بار بچے کو بھی دیکھتا رہا۔ وہ گڑھے سے ذرا ہٹ کر بیٹھا تھا اور آغا کو ٹکر ٹکر تک رہا تھا۔ نہ وہ بول رہا تھا نہ ہنس رہا تھا اور نہ ہی رویا۔ وہ بالکل گم صم تھا۔ سرخ لباس میں وہ بہت خوبصورت نظر آ رہا تھا۔ گورا گورا گلابی چہرہ دمک رہا تھا۔ طاقچوں میں جلتے ہوئے چراغوں کی روشنی میں ماتھے پر سیندور کا قشقہ اور نمایاں ہو گیا تھا۔ اس کی بڑی بڑی غلافی آنکھوں میں خمار تھا، غنودگی تھی جو برابر بڑھتی جا رہی تھی۔ آنکھیں بار بار بند ہو جاتیں۔ وہ دیوار کے سہارے بیٹھا آہستہ آہستہ جھومتا رہا اور پھر جھومتے جھومتے لڑھک کر فرش پر سو گیا۔

آغا نے بھی آنکھیں بند کرلیں۔ اس کی انگلیاں تیزی سے تسبیح پر چلتی رہیں اور ہونٹ ہلتے رہے۔ ناگاہ زور کا چھناکا ہوا۔ یہ گھونگروؤں کے بجنے کی آواز تھی۔ جیسے کسی رقاصہ نے رقص کرنے کے لئے زور سے فرش پر پیر مارا ہو۔ ساتھ ہی فضا میں نسوانی قہقہہ بلند ہوا۔ آغا جانی نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ ایک پرچھائیں سامنے دیوار پر لہرائی اور آن کی آن میں اوجھل ہو گئی۔ آغا لمحہ بھر کے لئے گڑبڑایا اور پھر اونچی آواز سے عمل پڑھنے لگا۔

پچھلے کئی روز سے ایسا ہی ہو رہا تھا۔ جب وہ آنکھیں بند کئے عمل کا ورد کرتے کرتے محویت کے عالم میں ہوتا تو گھونگروؤں کے بجنے کی آواز ابھرتی۔ کوئی چھم چھم کرتا ہوا اس کے ارد گرد منڈلاتا۔ آغا کچھ دیر آنکھیں بند کئے بیٹھا رہتا۔ پھر پریشان ہو کر آنکھیں کھول دیتا۔ نظر تو کوئی نہ آتا مگر پرچھائیں لہرا کر غائب ہو جاتی اور کل رات تو ایسا ہوا کہ گھونگروؤں کی جھنکار کے ساتھ پشت پر قہقہہ بلند ہوا۔ یوں لگا جیسے کوئی عورت کہہ رہی ہو۔ "دیکھ ابھی کچھ نہیں گیا۔ باز آجا ورنہ کلیجہ نکال کر چبا ڈالوں گی۔ پہلے پہلوٹا بھینٹ چڑھا۔ یوں تیرے قبضے میں نہ آؤں گی۔" آغا نے بہت ضبط کیا۔ مگر کچھ ایسی دہشت طاری ہوئی کہ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ پیچھے مڑ کر دیکھنے کا حکم نہ تھا۔ اس میں جان ہاتھ سے دھونے کا خطرہ تھا۔ وہ دم بخود بیٹھا طاقوں میں جھلملاتے ہوئے چراغ دیکھتا رہا اور تیزی سے عمل پڑھتا رہا۔ خوف کے ساتھ ساتھ اس کے عزم میں

پختگی بھی پیدا ہوتی جارہی تھی۔ یہ ایسی علامتیں تھیں جن سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ مایا جگانے میں کامیاب ہوگیا ہے۔

یہ رات اس کے لئے بہت سخت تھی۔ بار بار گھونگرو بجتے۔ ہیبت ناک قہقہے بلند ہوتے طرح طرح کی آوازیں ابھرتیں۔ کبھی وہ ہنستی، کبھی روتی، کبھی گڑگڑاتی، کبھی غضب ناک ہوکر جان لینے کی دھمکی دیتی۔ آغا کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ مگر اس نے ہمت نہ ہاری۔ چلہ کشی کے لئے جو وقت مقرر تھا، اسے پورا کیا۔ تین بار رک رک کر دستک دی۔ حصار سے باہر نکلا۔ کدال سنبھالی۔ سیڑھیاں طے کرکے گڑھے میں اترا اور کھدائی شروع کردی۔

رات کے تین بجے تک وہ کھدائی کرتا رہا۔ اس نے کئی فٹ زمین کھود ڈالی۔ ایک بار اس نے کدال چلائی تو کسی برتن کے کھنکنے کی آواز سنائی دی۔ خوشی سے آغا کا چہرہ دمکنے لگا۔ اس نے فوراً ہاتھ روک لیا۔ اب اسے صرف اتنی کھدائی کرنا تھی کہ اس دیگ کا منہ صاف نظر آنے لگے جس میں نواب شفو مرحوم نے عشرت منزل چھوڑنے سے قبل اپنا تمام زر و مال بند کرکے تہہ خانے میں دفن کردیا تھا۔ لیکن یہ کھدائی چلہ کشی کے آخری روز کرنا تھی اور ابھی اس میں ایک رات باقی تھی۔ آغا گڑھے سے باہر نکلا۔ ایک ایک کرکے سارے چراغ پھونک مار کر بجھا دیئے۔ البتہ سب سے بڑے طاق کا چراغ اس نے نہ بجھایا۔ وہ جلتا رہا۔

پچھلے پہر کل رات کو جب وہ تہہ خانے سے نکلا تو تھکن سے نڈھال تھا۔ مگر وہ مطمئن اور مسرور تھا۔ اب دفینہ ہاتھ آنے میں صرف ایک رات رہتی تھی اور وہ چلہ کشی کی آخری رات۔

☆

آغا جانی آنکھیں بند کئے نہایت محویت کے عالم میں عمل پڑھ رہا تھا۔ آج رات اس کی چلہ کشی ختم ہونے والی تھی۔ اس کے سامنے چھری رکھی تھی جسے اس نے چند ہی روز قبل بازار سے خریدا تھا۔ اس کی دھار بہت تیز تھی اور چراغوں کی روشنی میں جگمگا رہی تھی۔ عمل پڑھتے پڑھتے آغا جب آنکھیں کھولتا اور چھری کو دیکھتا تو اس کے بدن میں ہر بار جھرجھری سی پیدا ہوتی۔

تہہ خانے میں گہری خاموشی چھائی تھی۔ آغا کی آنکھیں بند تھیں۔ ہونٹ ہل رہے تھے اور

انگلیاں تسبیح کے دانوں پر تیزی سے چل رہی تھیں۔ عمل پڑھنے کا یہ آخری مرحلہ تھا۔ پھر چلہ کشی ختم ہو جاتی۔ وہ چھری پر دم کرتا۔ اسے ہاتھ میں دبا کر حصار سے باہر نکلتا۔ بچے کے قریب جاتا۔ اسے گود میں اٹھا کر گڑھے میں اترتا اور ٹھیک اس جگہ جہاں اس نے پچھلی رات برتن کھنکنے کی آواز سنی تھی، لٹا دیتا۔ چھری سے اس کی نرم و نازک گردن ذبح کرتا۔ اس کا خون چلو میں بھر کر زمین پر چھڑکتا۔ اور پھر پھاوڑا اٹھا کر کھدائی کرتا۔ دیگ کا منہ سامنے آجاتا۔ وہ اس کا ڈھکنا اٹھاتا اور اس میں رکھا ہوا سارا زر و مال نکال کر اپنے قبضے میں کر لیتا۔

آغا جھوم جھوم کر عمل پڑھ رہا تھا۔ اسی اثناء میں گھونگروؤں کی جھنکار ابھری۔ ساتھ ہی ہلکا نسوانی قہقہہ بلند ہوا۔ اور پھر رونے اور گڑگڑانے کے ساتھ ساتھ جان سے مار دینے کی دھمکیاں بھی سنائی دینے لگیں۔ اب وہ ان آوازوں کا کسی قدر عادی ہو گیا تھا۔ وہ طرح طرح کی خوفناک آوازیں نکالتی رہی اور چھم چھم کرتی ہوئی اس کے ارد گرد منڈلاتی رہی۔ مگر آغا جانی نے سنی ان سنی کرتے ہوئے کسی ردعمل کا اظہار نہ کیا۔ اسے پختہ یقین تھا کہ وہ حصار کے اندر داخل نہیں ہو سکتی۔ حصار کے باہر ہی سے ڈرا دھمکا کر اس کے عمل میں خلل ڈالنے کی کوشش کر سکتی تھی۔ آغا جانی نے نہ آنکھیں کھولیں نہ پہلو بدلا۔ جس طرح بیٹھا تھا اسی طرح اپنی جگہ پر بیٹھا عمل پڑھتا رہا۔ اب اس کے آس پاس ابھرتی ہوئی آوازیں اور خوف ناک ہو گئی تھیں۔ یہ قہقہے نہ تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے کوئی عورت سسکیاں بھر رہی ہے۔ یہ سسکیاں تیز ہوتی گئیں۔ تیز اور تیز۔ پھر ان سسکیوں کے درمیان بچے کی دل دوز چیخ ابھری۔ وہ زور زور سے رونے لگا۔ وہ روتا رہا، چیختا چلاتا رہا۔

آغا جانی پہلے تو دہشت زدہ ہو کر گھبرا گیا۔ دھیان بٹا تو گڑبڑایا بھی۔ مگر اس نے جلد ہی خود کو سنبھال لیا۔ آنکھیں بند کئے زور زور سے عمل پڑھنے لگا۔ یہ اس کے لئے آزمائش کی گھڑی تھی۔ چلہ کشی ختم ہونے میں تھوڑا ہی وقت رہتا تھا۔ اس کے بعد ۲۱ روزہ چلہ کشی مکمل ہو جاتی۔ پھر وہ ہوتا اور دفینے کی تمام دولت ہوتی۔

گھونگرو بجتے رہے۔ خوف ناک آوازیں ابھرتی رہیں۔ بچہ چیخ چیخ کر روتا رہا۔ آغا جانی جی کڑا کئے اپنا عمل پڑھتا رہا۔ یکایک تہہ خانے کا دروازہ چرچرایا۔ ساتھ ہی قدموں کی

آہٹ ابھری۔ ایسا محسوس ہوا کہ کوئی زینے کی سیڑھیاں طے کر کے نیچے اتر رہا ہے۔ چاپ قریب اور قریب آتی گئی۔ آغا جانی کا دھیان ایک بار پھر بھٹکا۔ اس نے جلدی سے سر کو جھٹکا اور زیادہ بلند آواز سے عمل پڑھنے لگا۔ جب چاپ بالکل قریب آگئی تو اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ گھبرا کر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ دیکھا، قیصر مرزا اس کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ اسے قہر آلود نظروں سے گھور رہا تھا۔ آغا نے اُسے اپنے روبرو پایا تو بہت سٹ پٹایا چند لمحے وہ دم بخود بیٹھا رہا پھر اس نے خود کو سنبھالا۔ ہاتھ اٹھا کر قیصر مرزا سے باہر جانے کا اشارہ کیا۔ لیکن وہ اکڑا ہوا کھڑا رہا اور تیوری پر بل ڈالے غصے سے آغا جانی کو دیکھتا رہا۔

بچے نے اسی اثنا میں زور سے چیخ ماری۔ آغا نے پریشان ہو کر اس کی جانب دیکھا۔ وہ مٹی میں لتھڑا ہوا پڑا تھا اور سسکیاں بھر کر رو رہا تھا۔ قیصر مرزا نے بھی مڑ کر اس کی طرف دیکھا پلٹا اور آگے بڑھا۔ آغا نے زور سے کھنکار کر قیصر مرزا کو اپنی جانب متوجہ کیا۔ عمل پڑھنے کے دوران اُسے بولنے اور بات کرنے کی بالکل اجازت نہ تھی۔ قیصر مرزا نے پلٹ کر آغا جانی کی سمت دیکھا۔ آغا جانی نے انگشت شہادت ہلا کر اسے منع کیا۔

قیصر مرزا غضب ناک ہو کر چیخا۔ ”ابے دیوث! تو اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئے گا۔ بے رحم، جلاد، قاتل۔“

آغا جانی نے تیوری پر بل ڈال کر چبھتی ہوئی نگاہوں سے اسے دیکھا مگر زبان سے کچھ نہ کہا۔

”میں یہ خون نہیں ہونے دوں گا۔ ہرگز نہیں ہونے دوں گا۔“

آغا نے بے چین ہو کر پہلو بدلا۔ لیکن خاموش رہا۔ قیصر مرزا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے گھورتا رہا۔ اس کے ہونٹ ہلتے رہے اور انگلیاں تیزی سے تسبیح کے دانوں پر چلتی رہیں۔

قیصر مرزا زیادہ دیر خاموش نہ رہا۔ ”ایسی دولت پر لعنت جس کی خاطر اس معصوم کا خون اپنی گردن پر لینا پڑے۔ اَخ تھو۔“ اس نے وہیں فرش پر تھوک دیا۔

آغا جانی گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ اس دفعہ بھی اس نے زبان نہ کھولی۔ خاموش کھڑا قیصر مرزا کی جانب گھورتا رہا۔ لیکن قیصر مرزا اس کی خفگی سے ذرا مرعوب نہ ہوا۔ اس کا غصہ اور تیز ہو گیا۔

"ایسی دولت پر تو میں کھڑے کھڑے پیشاب کردوں۔" یہ کہتا ہوا وہ گڑھے کی طرف بڑھا۔ تیزی سے نیچے اترا اور باقاعدہ پیشاب کرنا شروع کردیا۔

آغا کسی نامعلوم خوف سے کانپ اٹھا۔ وہ بدحواس ہوکر حصار سے باہر نکل آیا۔ بے ساختہ اس کی زبان سے نکلا۔ "قیصر مرزا کیا غضب کررہے ہو۔ کیوں اپنی جان گنوانا چاہتے ہو۔" وہ قیصر مرزا کی جانب لپکا۔

قیصر مرزا نے پلٹ کر اس کی جانب دیکھا۔ مڑا اور سیڑھیاں طے کرکے گڑھے سے باہر آگیا۔ آغا جانی اژدہے کی طرح غصے سے پھنکاریں مار رہا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہورہی تھیں۔ چہرہ ڈراؤنا نظر آرہا تھا۔ قیصر مرزا اس کے غیظ و غضب سے قطعی متاثر نہ ہوا۔ تیکھے لہجے میں بولا۔ "میں نے تو جو کرنا تھا کردیا۔ کچھ بگاڑنا ہے تو بگاڑ لو۔ بلالو اپنی اس چھمک چھلّو کو جو چھم چھم کرتی آتی ہے کبھی کلیجہ نکال کر چباڈالنے کی دھمکی دیتی ہے۔ کبھی خون پی جانے کی۔ کہاں ہے وہ کل مُوہی؟"

آغا تیزی سے مڑا اور حصار میں رکھی ہوئی چھری چھپاک سے اٹھالی۔ دانت پیستے ہوئے بولا۔ "قسم ہے جناب امیر کی۔ کوئی اور ایسی حرکت کرتا تو ٹکڑے ٹکڑے کرڈالتا۔" اس نے چراغوں کی روشنی میں جھلملاتا ہوا چھری کا تیز پھل سامنے کردیا۔ "اسے دیکھ رہے ہو؟"

"دیکھ رہا ہوں۔ بالکل دیکھ رہا ہوں۔ اسی چھری سے تم اس بے چارے کو ذبح کرنا چاہتے تھے۔" قیصر مرزا نے مڑکر بچے کی جانب دیکھا جو رک رک کر سسکیاں بھر رہا تھا۔ "تمہیں ذرا بھی ترس نہ آیا۔ دولت کے لالچ نے تم کو اندھا بنادیا ہے۔" اس نے نفرت سے مُنہ بگاڑا۔ "سنگدل خونی۔ تھو ہے تمہاری اوقات پر۔"

"زبان سنبھال کے بات کرو۔ ورنہ بات بڑھ جائے گی۔" آغا نے خونخوار نظروں سے قیصر مرزا کو گھورا۔ نچلا ہونٹ دانتوں سے دباکر بولا۔ "اس وقت میں اپنے آپے میں نہیں ہوں۔ جو کچھ کرگزروں وہ کم ہے۔"

"ابے جیب سٹ ا بیدھا ہوا ہے۔" قیصر مرزا کو بھی طیش آگیا۔ اس نے جھٹ کرتے کی آستینیں اُوپر چڑھالیں۔ "ابھی ساری ہیکڑی نکال کے رکھ دوں گا۔ اس خیال میں نہ رہنا کہ میں نہتا ہوں۔ سالا چرکٹا، کل تک میرے آگے ہاتھ پھیلاتا تھا آج آنکھیں دکھا رہا ہے۔

خونی، یزید کی اولاد۔"

آغا کے تن بدن میں آگ ہی تو لگ گئی۔ اس نے چھری مضبوطی سے پکڑ لی اور ٹکٹکی باندھے قیصر مرزا کے چہرے کو تکتا رہا۔ قیصر مرزا نے اسے للکارا۔ "کھڑے میرا منہ کیا تک رہے ہو۔ ہمت ہے تو کرو وار۔ مجھے بھی دیکھنا ہے کہ تم کتنے پانی میں ہو۔" مگر آغا نے وار نہ کیا۔ گہری سانس بھری۔ بجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ "گالیاں تو تم نے ایسی دی ہیں کہ چھریاں مار مار کر یہیں ڈھیر کر دیتا۔ مگر کیا کروں تم پر ہاتھ ہی نہیں اٹھتا۔" اس نے ہاتھ بڑھایا اور چھری قیصر مرزا کے حوالے کر دی۔

قیصر مرزا بھی نرم پڑ گیا۔ چھری لے کر بے نیازی سے گڑھے میں پھینک دی۔ "واللہ! یہ غصہ حرام ہوتا ہے۔ نہ جانے کیا اول فول بک گیا۔ معاف کرنا، تمھارے ساتھ بہت زیادتی ہوگئی۔" اس نے قدرے تامل کے بعد کہا۔ "مگر مجھے یہ توقع نہ تھی کہ تم اس دفینے کی خاطر اس معصوم کی جان لینے سے بھی دریغ نہ کرو گے۔"

آغا نے کچھ نہ کہا۔ نظریں جھکائے خاموش کھڑا رہا۔ قیصر مرزا کہتا رہا۔ "وہ تو کہو میں عین وقت پر پہنچ گیا ورنہ تم نے تو اس کا کام ہی تمام کر دیا تھا۔"

آغا اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے گویا ہوا۔ "مگر تم تہہ خانے میں پہنچے کیسے؟"

"واللہ! میں تو یہ سمجھ رہا تھا کہ تم کانپور میں ہو گے اور کل واپس آؤ گے۔ اتفاق سے شام کو کاظم سے ملاقات ہوگئی۔ اس نے تمہیں ولائی محلے کی جانب جاتے ہوئے دیکھا تھا۔" قیصر مرزا نے آغا کو مطلع کیا۔ "مجھے تو اس کی زبانی جیسے ہی یہ معلوم ہوا کہ تم یہیں ہو میں تو اسی وقت عشرت منزل پہنچتا۔ مگر وکیل صاحب کے پاس مقدمے کے سلسلے میں جانا نہایت ضروری تھا۔ وہاں دیر ہوگئی۔ وکیل صاحب کے پاس سے اٹھا تو سیدھا ادھر کا رخ کیا۔"

"لیکن دروازہ تو بند تھا۔"

"ہاں! دروازہ بند ہی تھا۔ میں نے بار بار دستک دی۔ جب کوئی جواب نہ ملا تو مجھے تاؤ آگیا۔ زور زور سے دروازہ ہلایا تو کنڈہ کھسک گیا اور کنڈی کھل گئی۔" قیصر مرزا نے بتایا۔ "میں اندر داخل ہوا تو کسی کو نہ پایا۔ ادھر ادھر دیکھ ہی رہا تھا کہ تہہ خانے سے بچے کے رونے کی آواز سنائی دی۔ میں فوراً ادھر لپکا۔ یہاں پہنچا تو یہ خوفناک منظر دیکھا۔ میرا خون کھول اٹھا۔ ایک تو تم نے

مجھ سے صاف جھوٹ بولا۔ کانپور جانے کا بہانہ بنایا اور اوپر سے یہ ستم کہ اس ننھی سی جان کو مایا کی بھینٹ چڑھانے کے لئے یہ سارا جال پھیلایا۔ برا نہ ماننا۔ واللہ! تم بہت سنگدل ہو۔ یہ مجھے آج معلوم ہوا۔ اماں تم کو اس معصوم پر ذرا ترس نہ آیا۔"

آغا بت بنا چپ کھڑا رہا۔ اسی اثنا میں بچہ زور زور سے رونے لگا۔ قیصر مرزا نے مڑ کر اسے دیکھا۔ تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔ قریب پہنچا۔ فرش سے اسے اٹھایا۔ اس کے جسم سے مٹی جھاڑتے ہوئے چمکارنے لگا۔ وہ بہت خوف زدہ نظر آ رہا تھا۔ قیصر مرزا نے اسے کندھے سے لگایا۔ بچہ سسکیاں بھرنے لگا۔ قیصر مرزا پیار سے ہولے ہولے اس کی پیٹھ تھپکنے لگا۔

تہہ خانے کی خاموشی میں آغا کی آواز ابھری۔ "قیصر مرزا! تم نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ بہت برا کیا۔ بہت ہی برا کیا۔" اس کے لہجے میں مایوسی اور شکست خوردگی تھی۔

قیصر مرزا نے اس کے شکوے شکایت پر توجہ نہ دی۔ صرف اتنا پوچھا۔ "یہ بتاؤ کہ تم اسے لائے کہاں سے ہو؟ کیسا بھولا بھالا بچہ ہے۔ کوئی ماں باپ تو اپنے اس لال کو تمہیں دینے سے رہے۔ کہیں سے اغوا وغوا کر کے لائے ہو گے۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "یہ مایا انسان کو اندھا کر دیتی ہے۔ بڑی بری بلا ہے۔ دل پتھر کا بنا دیتی ہے۔"

"بس اب تم چپ ہو جاؤ۔" آغا ایک بار پھر بھڑک اٹھا۔ "خواہ مخواہ خون کھولانے کی باتیں نہ کرو۔" اس نے قدرے توقف کیا۔ پھر افسردہ لہجے میں گویا ہوا۔ "تم نے مجھے کہیں کا نہ رکھا۔ سارے کئے کرائے پر پانی پھیر دیا۔ میں نے اس کے لئے کیا کیا جتن کئے۔ کیسی کیسی پریشانیاں اٹھائیں۔ کوڑی کوڑی کو محتاج رہا۔ کئی کئی وقت کے فاقے کئے۔ نہ سردی دیکھی نہ گرمی۔ خود کو جان جوکھوں میں ڈالا۔ زندگی داؤں پر لگا دی۔ مگر تم نے سب ملیامیٹ کر دیا۔" اس کی آواز بھرا گئی۔ "قیصر مرزا تم نے مجھے برباد کر دیا۔"

"اماں تم تو فضول میں خفا ہو رہے ہو۔ جی چاہے تو مجھے اور برا بھلا کہہ لو۔" قیصر مرزا نے اسے رام کرنے کی کوشش کی۔ "مگر میں تو یہی کہوں گا۔ جو کچھ ہوا ٹھیک ہی ہوا۔ کہیں اس طرح دفینہ ہاتھ آتا ہے۔ سب کہنے کی باتیں ہیں۔" اس نے بچے کو آہستہ آہستہ تھپ تھپایا جو اس کے کندھے سے لگا اب بالکل چپ تھا۔ "ناحق اس بے چارے کا خون اپنی گردن پر لیتے۔ نہ جانے

کیا عذاب نازل ہوتا۔" اس نے آغا کا ہاتھ تھام لیا۔ "آؤ باہر چلیں۔ یہاں تو دم گھٹ رہا ہے۔ آفریں ہے تمھاری ہمت کو اس گرمی اور حبس میں چلّہ کشی کرتے رہے ہے۔" قیصر مرزا نے آگے قدم بڑھایا۔ "یہیں جمے کھڑے رہو گے۔ باہر نکلنے کا ارادہ نہیں ؟"

آغا روٹھے ہوئے بچّے کی طرح اس کا ہاتھ جھٹک کر ترش روئی سے بولا "تم جاؤ۔ میرا جب جی چاہے گا آجاؤں گا۔"

"اب یہاں جان ہلکان کرنے سے کیا حاصل ؟۔ جو کچھ کہنا سننا ہے، باہر کہہ لینا۔"

آغا خاموش کھڑا رہا۔ قیصر مرزا نے پھر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ آغا نے ہاتھ چھڑانا چاہا۔ وہ قیصر مرزا کے ہمراہ جانے پر آمادہ نہ تھا۔ مگر جب قیصر مرزا نے اصرار کیا اور دل جوئی کی باتیں کیں تو وہ تہہ خانے سے باہر آیا۔

☆

صحن میں چارپائی بچھی تھی۔ اس پر آغا کا بستر لگا تھا۔ قیصر مرزا نے بچّے کو آہستہ سے بستر پر لٹا دیا۔ وہ اب سو گیا تھا۔ آغا دالان سے ایک چارپائی نکال کر لایا اور صحن میں ڈال دی۔ وہ خاموشی سے کھرّی چارپائی پر لیٹ گیا۔ قیصر مرزا نے فوراً ٹوکا۔

"اماں کھرّی چارپائی پر لیٹو گے ؟ ایسا کرو اوپر جا کر کمرے سے میرا بستر لے آؤ۔ آج گرمی کچھ زیادہ ہی ہے۔ اُمس بھی ہے۔ میں یہیں لیٹوں گا۔ کمرے میں تو نیند بھی نہیں آئے گی۔"

"کمرے کے دروازے پر تو تالا لگا ہے۔"

قیصر مرزا نے کرتے کی جیب سے کنجیوں کا گچھا نکالا۔ اس کے چھلے میں تین کنجیاں تھیں۔ آغا کے قریب گیا۔ وہ چارپائی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ کنجیاں لیں اور چپ چاپ زینے کی جانب چلا گیا۔ قیصر مرزا نے گریبان کھول دیا اور کرتے کے دامن سے آہستہ آہستہ بدن کو ہوا دینے لگا۔ گرمی سے اس کا برا حال تھا۔ جب تک تہہ خانے میں رہا غصّے اور جھنجھلاہٹ میں اسے گرمی کا ذرا احساس نہ ہوا۔ باہر آیا تو جسم پسینے سے شرابور تھا۔ ہوا ٹھہری ہوئی تھی اور ہر سو گہرا سکوت طاری تھا۔

آغا جانی بستر اٹھائے زینے سے نکل کر صحن میں آیا اور بستر چارپائی پر بچھانے لگا۔ قیصر مرزا

نے اس کی مدد کرنا چاہی تو بے رخی سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ مگر قیصر مرزا نے ذرا برا نہ مانا۔ مسکرا کر بولا۔ "اماں، ابھی تک ناراض ہو۔" آغا نے کچھ نہ کہا۔ بستر لگایا اور کنجیاں قیصر مرزا کے حوالے کر دیں۔ قیصر مرزا نے کنجیاں جیب میں ڈالیں اور کرتا اتار کر دالان کے ستون میں لگی ہوئی کھونٹی پر ٹانگ دیا۔

آغا جانی اپنے بستر پر جا کر لیٹ گیا۔ قیصر مرزا بھی لیٹ گیا اور پنکھا اٹھا کر جھلنے لگا۔ آغا ہنوز خاموش تھا اور بے چینی سے کروٹیں بدل رہا تھا۔ بچہ اس کے پہلو میں لیٹا تھا۔ ایک بار وہ کلبلایا تو آغا نے تھپک تھپک کر اسے سلا دیا۔ رات دم بخود تھی۔ حبس بہت زیادہ تھا۔

دونوں جاگ رہے تھے اور خاموش تھے۔ پھر خاموشی میں قیصر مرزا کی آواز ابھری۔ "اماں آغا! کیا سو گئے ہو؟"

آغا نے کوئی جواب نہ دیا۔

قیصر مرزا نے قدرے توقف کے بعد اسے پھر مخاطب کیا۔ "آغا۔ اماں آغا جانی۔"

اس دفعہ آغا نے کروٹ بدل کر اس کی جانب دیکھا اور بیزاری سے بولا۔ "اب سونے بھی دو گے کہ نہیں۔"

قیصر مرزا نے مسکرا کر اسے چھیڑا۔ "اچھا! تو گویا تم سچ مچ سو رہے تھے، اماں۔ کیوں خواہ مخواہ مکر گانٹھ رہے ہو۔"

آغا سخت بھنّایا۔ اس نے کروٹ بدل کر منہ پھیر لیا۔

"اب یہ رنڈیوں کے سے عمزے چھوڑ دو۔" قیصر مرزا نے اسے پھر چھیڑا۔ "جو کچھ ہونا تھا وہ تو ہو گیا۔ میں تو کہتا ہوں اچھا ہی ہوا۔ نہ جانے کیا مصیبت نازل ہوتی۔" اس کا لہجہ سنجیدہ ہو گیا۔ "وہ تو کہو کہ میں بروقت پہنچ گیا۔ خون چھپتا نہیں۔ سر پر چڑھ کر بولتا ہے۔ پولیس تھانہ ہوتا۔ تمہارے ساتھ میں بھی کھنچا کھنچا پھرتا۔ بدنامی الگ ہوتی۔"

آغا نے تڑپ کر کروٹ بدلی۔ جھنجھلا کر بولا۔ "تم اپنا یہ لکچر بند نہیں کرو گے؟ مجھے نیند آ رہی ہے۔ سونا حرام کر دیا۔"

"اماں، خفا کیوں ہوتے ہو؟" قیصر مرزا اس کی جلی کٹی سن کر ذرا مشتعل نہ ہوا۔ "بس تم

سے کچھ کام کی بات کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے تمہاری پریشانی کا احساس ہے۔ فکر نہ کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ بات دراصل یہ ہے کہ مجھے کچھ خبر نہیں کہ ابا جان نے کس کس سے قرض لے رکھا ہے اور کتنا لے رکھا ہے۔ نہ انہوں نے کبھی مجھے بتایا نہ مجھے ان سے پوچھنے کی ہمت ہوئی۔ اب قرض خواہوں نے تقاضہ شروع کیا اور نالش کر دی تو مجھے کچھ معلومات حاصل ہو رہی ہیں۔ ساری جائیداد رہن ہے۔ صرف زمین داری پر قرض کا بار کچھ کم ہے۔ جس محل سرا میں رہائش ہے وہ اماں جان کے نام ہے۔ اس لئے بچ گئی۔"

قیصر مرزا سنبھل سنبھل کر بولتا رہا۔ آغا جانی خاموشی سے اس کی باتیں سنتا رہا۔

"سوچتا ہوں جس محل سرا میں رہتا ہوں اسے بیچ کر کوئی گزارے کے قابل چھوٹا مکان لے لیا جائے۔ ویسے بھی ہمیں بہت بڑے مکان کی ضرورت نہیں۔ دونوں بہنیں اپنے گھر بار کی ہو گئیں۔ اب تو صرف اماں جان ہیں اور میں ہوں۔ ہم دونوں کو تو چھوٹا ہی مکان چاہیئے۔" قیصر مرزا نے اپنی تجویز پیش کی۔ "موجودہ مکان بیچنے سے جو رقم ملے اس سے زمیں داری پر جو قرض ہے بے باق کر دیا جائے۔ میں چاہتا ہوں زمیں داری پوری طرح اپنے قبضے میں آجائے تو اس کی دیکھ بھال پر تم کو لگا دوں۔ پہلے منشی کندن لال زمیں داری کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ انہوں نے دونوں ہاتھوں سے لوٹا۔ ابا جان تو کبھی علاقے پر جاتے نہیں تھے۔ منشی جی نے جو حساب پیش کیا۔ انھوں نے آنکھ بند کر کے قبول کر لیا۔ اب وہ خود ہی نوکری چھوڑ رہے ہیں۔ پرسوں یہی کہنے آئے تھے۔" اس نے قدرے تامل کے بعد آغا جانی سے پوچھا۔ "بولو کیا کہتے ہو؟"

آغا نے کچھ نہ کہا۔ خاموش لیٹا رہا۔

"اماں تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔" قیصر مرزا نے اصرار کیا۔ "میں تو یہ چاہتا ہوں کہ ایک بار ہم دونوں کا جو ساتھ ہوا ہے ہمیشہ قائم رہے۔"

"نہیں بھئی یہ نہیں ہو سکتا۔" آغا نے صاف انکار کر دیا۔ "تم ٹھہرے رئیس زادے اور میں بے چارا جوتے گانٹھنے والا موچی۔ تمہارے آگے ہاتھ پھیلانے والا چرکٹا۔ میرا تمہارا کیا ساتھ۔ اپنی اصلیت بھول گیا تھا۔ آج معلوم ہو گئی۔"

"وہ تو میں غصے میں اول فول بک گیا تھا۔ معذرت بھی کر لی تھی۔ معلوم ہوتا ہے تمہارے

دل کا غبار ابھی صاف نہیں ہوا۔" قیصر مرزا نے بے تکلفی کا مظاہرہ کیا۔ "اب تم دل توڑنے کی باتیں نہ کرو۔ یہ بتاؤ کیا ارادہ ہے؟"

"میں اپنا ارادہ تو بعد میں بتاؤں گا۔ تم پہلے مقدمے بازی سے تو نمٹ لو۔" آغا جانی نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔ "ابھی تو تم کو یہ بھی علم نہیں کہ زمیں داری کے عوض کتنا قرض لیا جا چکا ہے۔ منشی کندن لال کو کتے نے تو نہیں کاٹا کہ لگی لگائی روزی پر لات مار کر جا رہے ہیں۔ انھوں نے حالات دیکھ کر ہی فیصلہ کیا ہوگا۔ پھر سو باتوں کی ایک بات یہ کہ میں زمیں داری کے داؤں پیچ بالکل نہیں جانتا۔ کبھی سابقہ ہی نہیں پڑا۔"

"تم کرنا چاہو تو کیا نہیں کر سکتے۔ رفتہ رفتہ سب کچھ سمجھ جاؤ گے۔"

"نہیں بھئی، اب تو تم مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔" آغا تڑپ کر اٹھا اور سنبھل کر بستر پر بیٹھ گیا۔ "برا نہ مانو تو ایک بات کہوں۔"

"کہو کیا کہنا چاہتے ہو۔"

"میں نے اب تک جو کچھ کیا وہ تمھارے ساتھ رہنے کا نتیجہ تھا۔ میں اپنی اوقات بھول گیا تھا اور یہ سوچنے لگا تھا کہ کسی طرح کچھ رقم ہاتھ لگ جائے تو میں بھی تمھاری طرح رئیس زادہ بن جاؤں۔" اس کے لہجے میں تلخی پیدا ہو گئی۔ "مگر اپنی قسمت میں تو جوتے گانٹھنا بدا ہے۔ موچی کا موچی رہا۔ تو بھئی کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اب میری تمھارے ساتھ نہیں نبھ سکتی۔"

"اس وقت تم غصے میں ہو۔ میں پھر بات کروں گا۔" قیصر مرزا نے بات کا رخ بدل دیا۔ "اچھا یہ بتاؤ۔ یہ بچہ تم کہاں سے لائے؟"

"یتیم خانے سے۔"

"بھئی حد کر دی تم نے۔ اماں یتیم خانے میں اتنے چھوٹے بچے کہاں ہوتے ہیں۔" قیصر مرزا نے حیرت کا اظہار کیا۔ "بہرصورت تم اسے کہیں سے بھی لائے ہو کل صبح وہیں پہنچا دینا۔"

آغا نے کچھ نہ کہا۔ خاموش بیٹھا رہا۔

"میرا کہنا مانو تو یہ دفینے وفینے کا چکر چھوڑ دو۔" قیصر مرزا نے آغا جانی کو خبردار کیا۔ "کسی نے پولیس سے مخبری کر دی تو کھنچے کھنچے پھرو گے۔ جان چھڑانا مشکل ہو جائے گا۔"

آغا جانی اس دفعہ بھی خاموش رہا۔ اس نے ٹانگیں پھیلائیں اور منہ پھیر کر کروٹ کے بل بستر پر لیٹ گیا۔

قیصر مرزا جل بھن کر رہ گیا۔ اس نے مزید بات چیت نہ کی۔ آنکھیں بند کیں اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔

☆

بچہ بلک بلک کر رو رہا تھا۔ قیصر مرزا کی آنکھ کھل گئی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ دھوپ اونچی اونچی دیواروں پر جھلملا رہی تھی۔ قیصر مرزا نے دیکھا آغا جانی کا بستر خالی تھا۔ بستر کے سرہانے چھری رکھی تھی۔ بچہ اس کے قریب بیٹھا تھا اور منہ بسور کر رو رہا تھا۔ چھری دیکھ کر قیصر مرزا کو حیرت ہوئی۔ دل میں طرح طرح کے وسوسے پیدا ہوئے۔ اسے یاد آیا کہ پچھلی رات اس نے چھری تہہ خانے کے گڑھے میں پھینک دی تھی۔ مگر اسے اٹھا کر لایا کون؟ آغا کا کہیں پتہ نہ تھا۔ نہ جانے وہ کہاں چلا گیا۔ وہ اس سے چھری کے بارے میں دریافت کرنا چاہتا تھا۔

قیصر مرزا بستر پر حیران و پریشاں بیٹھا تھا۔ بچہ سسکیاں بھر کر رو رہا تھا۔ اسی اثنا میں دروازے پر گھوسی کی آواز ابھری۔ قیصر مرزا بستر سے نیچے اترا۔ باورچی خانے میں گیا۔ ایک صاف ستھری پتیلی اٹھائی اور ڈیوڑھی میں پہنچا۔ لیکن یہ دیکھ کر چونکا کہ دروازے کی کنڈی کھلی تھی۔ اسے فوراً اندازہ ہو گیا کہ آغا جانی گھر میں نہیں ہے۔ وہ نہ جانے کب اٹھ کر باہر چلا گیا تھا۔ قیصر مرزا نے دروازہ کھولا۔ سامنے گھوسی دودھ سے بھری ہوئی بالٹی اٹھائے کھڑا تھا۔ قیصر مرزا نے پتیلی اس کے سامنے بڑھا دی۔ آہستہ سے اسے مخاطب کیا۔

”رمضانی! آج سیر بھر دودھ زیادہ دینا۔“

”سرکار! روز کی بندھی سے سیر بھر زیادہ دودھ تو نہیں دے سکوں گا۔ مجھے دوسرے ٹھکانوں پر بھی دودھ پہنچانا ہے۔“ رمضانی نے نرم لہجے میں، اپنی مجبوری کا اظہار کیا۔ ”روزانہ اتنا ہی دودھ لے کر نکلتا ہوں جتنا جمانوں کو پہنچانا ہوتا ہے۔ آپ ایسا کریں آدھا سیر بڑھتی لے لیں۔ بس اتنی ہی گنجائش ہے۔“

قیصر مرزا نے اصرار نہ کیا۔ "جتنا زیادہ دے سکتے ہو، دے دو۔"

گھوسی نے ڈونگے سے پتیلی میں دودھ ڈالتے ہوئے پوچھا۔ "آج آغا صاحب نظر نہیں آرہے ہیں۔ خیریت تو ہے؟"

"وہ ایک ضروری کام سے باہر گئے ہیں۔ آتے ہی ہوں گے۔"

دودھ والے نے دودھ دیا اور آگے بڑھ گیا۔ قیصر مرزا پتیلی سنبھالے ہوئے اندر چلا گیا۔ بچہ اب چیخ چیخ کر رو رہا تھا۔ قیصر مرزا پریشان ہو گیا۔ جلدی سے باورچی خانے میں گیا۔ پتیلی رکھی، واپس جا کر بچے کو اٹھا کر کندھے سے لگایا۔ پچکار کر تھپ تھپایا۔ اس کا منہ ہاتھ دھلایا۔ دوبارہ باورچی خانے میں گیا۔ چولھا سلگا کر کسی نہ کسی طرح دودھ گرم کیا۔ گھبراہٹ میں چولھے کی آنچ سے انگلیاں بھی جھلس گئیں۔ قیصر مرزا کو رہ رہ کر آغا جانی پر غصہ آرہا تھا۔ یہ سارے کام وہی کرتا تھا۔ قیصر مرزا کبھی اس کا ہاتھ بٹانے کی کوشش بھی کرتا تو مسکرا کر منع کر دیتا۔ "میاں نواب زادے! کام کاج کرنا تمہارے بس کا روگ نہیں۔ یہ تمہارا غلام کس وقت کے لئے ہے۔ تم تو صرف حکم صادر کیا کرو۔" قیصر مرزا نے بچے کو دودھ پلایا۔ خود بھی پیا۔

دوپہر ہو گئی۔ مگر آغا واپس نہ آیا۔ قیصر مرزا نے رات کی باسی خمیری روٹیاں دودھ میں بھگو کر بھوک مٹائی۔ دن ڈھلنے لگا۔ قیصر مرزا کی بے چینی بڑھتی گئی۔ آغا تو چلا گیا لیکن بچہ قیصر مرزا کے لئے وبال جان بن گیا۔ اسے لمحہ بھر چین نہ لینے دیا۔ کبھی وہ روتا، کبھی زور زور سے چیختا، کبھی مچلتا۔ شام تک وہ اس سے عاجز آگیا۔ وہ گھر میں قیدی بن کر رہ گیا تھا۔ اسے تنہا چھوڑ کر کہیں جا بھی نہ سکتا تھا۔ گود میں اٹھا کر بازار میں جانا قیصر مرزا کو سخت معیوب معلوم ہوا۔ کوئی دیکھتا تو کیا کہتا۔ ایک بار ہمت کر کے جھٹ پٹے میں باہر نکلا۔ گلی کے نکڑ تک بھی نہ پہنچا تھا کہ ایک واقف کار بزرگ سامنے سے آتے ہوئے نظر آئے۔ اس کے والد کے پرانے ملنے والے تھے۔ انہیں دیکھتے ہی وہ گھبرا گیا۔ آگے جانے کی ہمت نہ پڑی۔ الٹے قدموں واپس آگیا۔

شام گہری ہو گئی۔ اندھیرا بڑھنے لگا۔ رات ہو گئی مگر آغا نہ آیا۔ قیصر مرزا کی جھنجھلاہٹ میں اور اضافہ ہو گیا۔ اسی جھنجھلاہٹ میں اس نے بچے کو کئی بار جھڑکا بھی۔ رات سنسان ہو گئی۔ قیصر مرزا کو تشویش ہونے لگی۔ سارا غصہ رفو چکر ہو گیا۔ اب تو اس کی ایک ہی خواہش تھی کہ آغا کسی طرح واپس

آجائے۔ بچہ روتے روتے سوگیا تھا۔ قیصر مرزا کی آنکھوں میں دُور دُور تک نیند نہ تھی۔ بھوک بھی نہ لگی۔ وہ بے قرار ہو کر صحن میں ٹہلنے لگا۔

رات تاریک ہو گئی۔ کوچہ و بازار سُنسان ہو گئے۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ گھر بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ اونچی اونچی دیواریں اور دالانوں کے بڑے بڑے ستون ہیبت ناک معلوم ہو رہے تھے۔ گلی میں راہگیروں کی آمدورفت کم ہو چکی تھی۔ قیصر مرزا ہلکان ہو کر بستر پر لیٹ گیا اور بے چینی سے کروٹیں بدلنے لگا۔ آدھی رات سے کچھ پہلے گلی میں اچانک کُتوں نے زور زور سے بھونکنا شروع کر دیا۔ قیصر مرزا آنکھیں بند کئے لیٹا تھا۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ ڈیوڑھی کے دروازے پر کوئی آہستہ آہستہ دستک دے رہا ہے۔ قیصر مرزا نے کروٹ بدل کر ڈیوڑھی کی سمت دیکھا۔ دستک صاف سنائی دے رہی تھی۔

قیصر مرزا نے اطمینان کی سانس لی۔ آغا واپس آگیا تھا۔ اس کے علاوہ اتنی رات گئے اور کون آسکتا تھا۔ وہ بستر سے نیچے اترا۔ اور یہ طے کر کے ڈیوڑھی کی جانب بڑھا کہ دیکھتے ہی آغا پر بری طرح برسے گا۔ وہ ڈیوڑھی میں داخل ہوا۔ دروازہ کھولا تو بھونچکا رہ گیا۔ آغا کے بجائے دروازے پر ایک عورت کھڑی تھی۔ گہرے اندھیرے میں وہ بڑی پراسرار معلوم ہوئی۔ وہ آنکھیں پھاڑے حیران و پریشان کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ قیصر مرزا کو خاموش پا کر اس نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔

"آغا جانی یہیں رہتے ہیں؟"

قیصر مرزا نے محسوس کیا کہ یہ آواز کچھ جانی پہچانی سی ہے۔ وہ پہلے بھی اسے سُن چکا ہے معاً اسے صندلی یاد آگئی۔ ہاں یہ اسی کی آواز تھی۔ اس نے بے ساختہ کہا۔ "صندلی!" وہ صندلی ہی تھی۔ اس نے بھی قیصر مرزا کو فوراً پہچان لیا۔ حیرت زدہ ہو کر بولی۔

"ارے یہ آپ ہیں قیصر مرزا صاحب۔ کیا آپ یہیں رہتے ہیں؟"

"نہیں" قیصر مرزا نے انکار میں گردن ہلائی۔ "مگر یہ تو بتاؤ اتنی رات گئے تم یہاں کیسے آئیں؟"

"میں آغا جانی صاحب کو تلاش کرتے آئی تھی۔ سنا ہے وہ اسی مکان میں رہتے ہیں۔"

"وہ رہتے تو یہیں ہیں۔" قیصر مرزا ابھی تک حیرت زدہ تھا۔ "مگر تم کو ان کی تلاش کیوں ہے، اور وہ بھی اتنی رات گئے۔"

"یہ سب کچھ میں آپ سے بعد میں بتاؤں گی۔" صندلی کے لہجے سے بے قراری آشکارہ تھی۔

"پہلے آپ مجھے ان سے ملا دیجیے۔ ایک ضروری کام ہے۔"

قیصر مرزا اور حیرت زدہ ہو گیا۔ "ضروری کام اور آغا سے!"

عین اسی وقت گلی کے پختہ فرش پر قدموں کی آہٹ ابھری۔ نکڑ پر، جہاں میونسپلٹی کی لالٹین روشن تھی، ایک سایہ ابھرا۔ کوئی ادھر ہی آ رہا تھا۔ قیصر مرزا نے گھبرا کر صندلی سے کہا "اندر آجاؤ۔ کوئی آ رہا ہے۔ ہمیں اس طرح باتیں کرتے دیکھ کر نہ جانے کیا سوچے۔"

صندلی نے انکار نہ کیا اور اس کے ہمراہ اندر چلی گئی۔

وہ صندلی کو اس کمرے میں لے گیا جہاں اس نے کبھی ارجمند سلطانہ کے ساتھ رات کی تنہائی میں دیر تک باتیں کی تھیں۔ اس نے لیمپ روشن کیا اور صحن کے رخ پر جو کھڑکی تھی، اس کے دونوں پٹ کھول دیئے۔ لیمپ کی ہلکی زرد روشنی میں اس نے دیکھا۔ صندلی کے نکھرے نکھرے چہرے پر پہلی سی شادابی اور دل نوازی نہ تھی۔ کنول کی سی شفاف آنکھوں کے روشن چراغ مدھم پڑ گئے تھے۔ نہ بالوں میں وہ سج دھج تھی نہ رخساروں پر کھلتے ہوئے گلابوں کی شگفتگی تھی وہ تھکی تھکی اور مرجھائی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

قیصر مرزا کے دل کو ٹھیس لگی۔ "صندلی! تم نے اپنی یہ کیا حالت بنا لی؟"

وہ مسکرا دی۔ مگر اس مسکراہٹ میں وہ رعنائی نہ تھی کہ جسے کلی کھلنے سے تشبیہ دی جائے۔ یہ صرف مسکراہٹ تھی۔ سپاٹ اور مضمحل۔

"صندلی، تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔" قیصر مرزا نے اصرار کیا۔

وہ اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔ "پہلے آپ آغا جانی صاحب کو تو بلوائیے۔ مجھے ان سے بہت ضروری بات کرنا ہے۔"

قیصر مرزا جھنجھلا کر بولا۔ "یہ آغا جانی سے تمہاری کہاں کی جان پہچان نکل آئی۔"

"اُف! ابھی آپ ان کو بلائیے تو۔"

"پہلے تم مجھے یہ بتاؤ کہ بات دراصل ہے کیا؟"

"دیکھیے، میں اس وقت رانی صاحبہ کے ساتھ آئی ہوں۔ وہ موٹر میں بیٹھی میرا انتظار کر رہی ہیں۔" صندلی نے ٹالنے کی کوشش کی۔

"یہ کونسی رانی صاحبہ ہیں؟" قیصر مرزا نے تعجب سے پوچھا۔ "رانی صاحبہ کا تو انتقال ہو گیا۔"

"بھئی اللہ! میں آپ کو کیا کیا بتاؤں۔" صندلی نے قدرے بے زاری سے کہا۔ "یہ ہماری نئی سرکار ہیں۔ حیدر گڑھ کی نئی رانی۔"

قیصر مرزا لمحہ بھر کے لئے الجھا۔ پھر صورت احوال اس پر واضح ہو گئی۔ گردن ہلا کر بولا۔ "اچھا تو وہ ہوں گی طلعت آرا۔"

"ہائیں۔" صندلی چکرا کے رہ گئی۔ "آپ انہیں کیسے جانتے ہیں؟"

قیصر مرزا صاف بات تو بتا نہ سکتا تھا۔ اس نے مسکرا کر سخن سازی سے کام لیا۔ "ارے بھئی ہم بھی تو یہیں لکھنؤ میں رہتے ہیں اور ان سے تو ہماری دور کی رشتہ داری بھی ہوتی ہے۔" بات کہتے کہتے معاً اسے خیال آیا کہ طلعت آرا اتنی رات گئے صندلی کے ہمراہ یہاں کیوں آئی ہے۔ اس نے بے ساختہ پوچھ ہی لیا۔ "کیا وہ بھی آغا کی تلاش میں آئی ہیں؟"

صندلی پہلے تو جھجکی۔ پھر دبی زبان سے بولی۔ "جی ہاں۔"

"کیوں؟" قیصر مرزا نے حیران و پریشان ہو کر دریافت کیا۔ "انہیں آغا سے کیا کام ہو سکتا ہے؟"

قیصر مرزا کے اس سوال پر صندلی تذبذب میں پڑ گئی۔ کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ چپ بیٹھی رہی۔

اسے خاموش پا کر قیصر مرزا نے ٹوہ لگانے کی کوشش کی۔ "آخر بات کیا ہے؟ کچھ مجھے بھی تو بتاؤ۔" صندلی نے اس بار بھی کچھ نہ کہا۔ قیصر مرزا نے اصرار کیا۔ "صندلی! جب تم نے رانی صاحبہ مرحومہ کا کوئی راز مجھ سے نہ چھپایا تو یہ کونسا ایسا راز ہے جسے بتانے میں تم اس قدر پس و پیش کر رہی ہو۔"

"آپ کو تو خواہ مخواہ وہم ہو گیا۔" صندلی نے مسکرانے کی کوشش کی۔ "بات صرف اتنی ہے کہ ان کی متلاتی کی کوئی بھانجی ہے۔"

"بنجو!" قیصر مرزا نے مداخلت کی۔ پوری بات بھی نہ کہنے دی۔

"آپ تو سب ہی کو جانتے ہیں۔" وہ کھل کھلا کر ہنسنے لگی۔ "ہاں تو وہ بنجو ہے نا۔ اس کا ایک بچہ ہے۔"

قیصر مرزا نے فوراً لقمہ دیا۔ "مگر اس کی تو ابھی شادی بھی نہیں ہوئی۔"

"بس معلوم ہو گیا کہ آپ کتنا جلنتے ہیں۔" مندلی نے شوخی سے کہا۔ "جناب عالی! اس کی ایک نہیں اب تک دو شادیاں ہو چکی ہیں۔"

"کب ہوئیں اس کی دونوں شادیاں؟"

"یہ تو مجھے معلوم نہیں۔ البتہ یہ سُننے میں آیا ہے کہ پہلے میاں سے ایک بچہ ہے۔" مندلی نے اس دفعہ کھل کر بات کی اور ذرا تفصیل سے بتایا۔ "جب اس کا دوسرا بیاہ ہونے لگا تو دولھا والوں کی طرف سے یہ شرط رکھی گئی کہ بچہ ماں کے ساتھ نہیں آئے گا۔ کسی سے اس کے بارے میں بتایا بھی نہ جائے۔ میرا خیال ہے وہ اسے اپنے کنبے والوں میں کنواری لڑکی کے طور پر پیش کرنا چاہتے ہوں گے۔ اب سوال یہ پیدا ہوا کہ بچے کا کیا کیا جائے۔ پہلا میاں سنا ہے ایسا نکما ہے کہ اپنی اولاد تک کا روادار نہیں۔ ماں کی غیر موجودگی میں بچہ رہتا تو کس کے پاس۔ مبتلا تی بے چاری بوڑھی ہو گئی ہیں۔"

مندلی سنبھل سنبھل کر بولتی رہی۔ قیصر مرزا توجہ سے اس کی باتیں سنتا رہا۔ "آخر آغا جانی صاحب نے یہ مشکل حل کر دی۔ بنجو کے دوسرے شوہر مرزا سجاد بیگ سے اُن کی بہت اچھی یاد اللہ ہے۔ بچے کے سلسلے میں سجاد بیگ ہی کے ذریعہ بات چیت شروع ہوئی۔ آغا جانی صاحب کو اپنے بہنوئی کے لئے بچے کی ضرورت تھی۔ بے چارے لاولد ہیں۔ شادی کو دس سال سے اوپر ہو گئے۔ مگر کوئی اولاد نہیں۔ سنا ہے آغا جانی کی بہن بانجھ ہیں۔ انھوں نے کوشش کر کے بچہ بہنوئی کے لئے حاصل کر لیا۔"

اس کی باتیں سن کر قیصر مرزا چونکا۔ فوراً بات کی تہ تک پہنچ گیا۔ اس پر یہ حقیقت آشکارہ ہو گئی کہ آغا دفینہ حاصل کرنے کے لئے جو بچہ بھینٹ چڑھانا چاہتا تھا وہ کہاں سے حاصل کیا گیا تھا اور کس بہلانے سے حاصل کیا گیا تھا۔ مگر قیصر مرزا نے نہ مندلی کو ٹوکا نہ مداخلت کی۔ خاموش بیٹھا رہا۔ مندلی بتاتی رہی۔ "آغا صاحب نے راجہ ٹکیٹ رائے کی مسجد کا پتہ بتایا تھا۔ ایک عرصے سے ان کی تلاش ہو رہی ہے۔ چپا چپا چھان مارا۔ نہ کہیں وہ ملے نہ ان کے بہنوئی۔ سجاد بیگ کو بھی ان کا پتہ معلوم نہیں۔ پرسوں حاجی چھٹن سے معلوم ہوا کہ آغا جانی یہاں رہتے ہیں۔ وہ بھی اس طرح کہ رانی صاحبہ کی جوتیاں اور گرگابیاں ان کے کارخانے سے بن کر آتی ہیں۔ بازار جوتیاں رانی صاحبہ کو بالکل پسند نہیں۔"

"کیا تم بچے کو واپس لینے آئی ہو؟"

"نہیں تو" صندلی نے جواب دیا۔ "دراصل رانی صاحبہ یہ دیکھنا چاہتی ہیں کہ بچہ کیسا ہے۔ کس حال میں ہے۔ بات یہ ہے کہ سنجو ان کے ساتھ کھیلی ہوئی ہے۔ وہ بچے کے لئے بڑی بے قرار ہے۔ سسرال والوں کے ڈر سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتی۔ اندر ہی اندر گھٹ رہی ہے۔"

"سنجو بھی طلعت آرا کے ساتھ آئی ہوگی۔" قیصر مرزا نے قیاس آرائی کی۔

"نہیں، وہ تو اپنی سسرال میں ہے۔"

"تو پھر طلعت آرا بچے کے لئے کیوں اس قدر سرگرداں ہیں؟"

صندلی کے چہرے کا رنگ اچانک بدل گیا۔ لمحہ بھر توقف کرنے کے بعد اس نے پوچھا۔ "آپ ہر بات کو اتنا کریدتے کیوں ہیں؟" اس نے مسکرا کر قیصر مرزا کو دیکھا۔ قیصر مرزا نے معاً محسوس کیا کہ صندلی کی بانکی چتونوں کا جادو جاگ اٹھا ہے۔ ان میں وہی لگاوٹ تھی، وہی عشوہ طرازی تھی جو حیدر گڑھ کی محل سرا میں اس رات اس نے دیکھی تھی جب وہ رانی ارجمند سلطانہ سے ملنے گیا تھا۔

رات ساکت تھی۔ کمرے میں تنہائی تھی۔ لیمپ کی لو آہستہ آہستہ لرز رہی تھی۔ روشنی کا اتار چڑھاؤ صندلی کے چہرے پر لہرا رہا تھا، جس پر تابندگی تھی۔ شگفتگی تھی۔ جوانی کی ہلچل اور حرارت تھی۔ قیصر مرزا نے گہری سانس بھری۔ "صندلی!"

"جی۔" صندلی گردن کو خم دے کر اس کے چہرے کو تکتی رہی۔

"تم کو محل کی وہ رات یاد ہے؟"

لیکن صندلی کو محل کی رات کے بجائے دفعتہً طلعت آرا یاد آگئی۔ گھبرا کر بولی۔ "ہائے اللہ! میں باتوں کی دھن میں بھول ہی گئی کہ رانی صاحبہ میرا انتظار کر رہی ہیں۔ آپ جلدی سے آغا جانی کو بلوایئے۔"

"مگر وہ تو اس وقت ہے نہیں۔"

صندلی نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "یہ آپ نے مجھے پہلے کیوں نہ بتایا؟"

"اگر پہلے بتا دیتا تو تم سے اتنی دیر باتیں کرنے کا موقع کیسے ملتا۔" قیصر مرزا نے مسکرا کر

اسے چھیڑا۔

"سرکار کو یہ بات معلوم ہوگی تو مجھ پر بری طرح برس پڑیں گی۔ آپ کو کیا خبر کہ آج کل مجھ پر کیا بیت رہی ہے" اس کا چہرہ ایک بار پھر افسردہ ہوگیا۔ "میں تو اپنی زندگی سے عاجز آگئی ہوں۔ بڑی رانی صاحبہ کیا مدھاریں میرے لئے تو محل جہنم بن گیا۔"

"رانی صاحبہ مرحومہ نے تمہارے ساتھ بڑی بے انصافی کی۔" قیصر مرزا نے اظہار ہمدردی کیا۔ "دُور کے رشتہ داروں کو تو سب کچھ دے گئیں اور تمہارے لئے کچھ بھی نہ کیا۔"

وہ جل کر بولی۔ "ان کا بھانڈا نہ پھوٹ جاتا" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "ان باتوں کو نہ چھیڑیئے۔ ان کے ذکر سے میرا کلیجہ پھٹتا ہے۔" اس نے بات کا رُخ موڑ دیا۔ "یہ بتایئے آغا جانی کب آئیں گے؟"

"کہہ نہیں سکتا۔" قیصر مرزا نے جواب دیا۔ "ویسے آغا کو اب تک واپس آجانا چاہیئے تھا۔"

"بڑی مشکل میں جان ہے۔" وہ جھنجھلا کر بولی۔ "وہ ملتے نہیں اور رانی صاحبہ ہیں کہ انہوں نے جان زِلیق میں کر دی ہے۔ خود بھی پریشان ہیں دوسروں کو بھی پریشان کرتی ہیں۔ عجیب مصیبت ہے۔"

"صندلی! میری سمجھ میں یہ بات نہ آئی کہ طلعت آرا اس قدر پریشان کیوں ہیں۔" قیصر مرزا نے اپنی تشویش کا اظہار کیا۔ "پریشان تو بجو کو ہونا چاہیئے۔ وہ تو بچے کو دیکھنے بھی نہیں آئی۔"

"مجھے کیا معلوم۔"

قیصر مرزا نے صندلی کی برہمی نظر انداز کرتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ "تم بچے کو دیکھنے آئی ہو۔ وہ میرے پاس ہے۔"

"سچ!" صندلی نے حیرت کا اظہار کیا۔ ساری کدورت جاتی رہی۔ اس کا چہرہ کھل اٹھا۔

"میں غلط نہیں کہہ رہا ہوں۔" قیصر مرزا نے اسے یقین دلایا۔ "مگر یہ تو بتا دو کہ طلعت آرا اس کے لئے اتنی پریشانی میں کیوں مبتلا ہیں۔"

"اللہ قسم آپ بڑے ضدی ہیں۔" صندلی نے مسکرا کر قیصر مرزا کے چہرے کو دیکھا۔ "دیکھئے بات یہ ہے۔" بات کہتے کہتے وہ ٹھٹکی۔ اس نے ایک بار پھر ٹالنے کی کوشش کی۔ "نہیں بھئی مجھے کچھ نہیں معلوم۔"

"بتادو صندلی۔" قیصر مرزا کے لہجے میں التجا تھی۔

"اُف! بھئی اللہ آپ تو بہت پریشان کرتے ہیں۔" اس کے انداز میں بے زاری کے بجائے شیفتگی تھی، خود سپردگی تھی۔ قیصر مرزا نے بھی اسے محسوس کیا۔ صندلی کا ہاتھ تھام کر محبت سے اسے اپنے پہلو میں بٹھا لیا۔ صندلی کی نظریں جھکی ہوئی تھیں اور چہرہ تابناک ہوگیا تھا۔ قیصر مرزا نے اس کی ٹھوڑی پکڑ کر چہرہ اوپر اٹھایا۔ نرم لہجے میں گویا ہوا۔ "سچ سچ بتاؤ بات کیا ہے؟"

صندلی موم کی طرح پگھل گئی۔ انکار نہ کر سکی۔ اس نے سب کچھ اگل دیا۔ "سنا ہے کہ یہ بچہ رانی صاحبہ کا ہے۔" قیصر مرزا سکتے میں آگیا۔ اس انکشاف پر وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑے صندلی کو دیکھتا رہ گیا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "امیر محل کی ماماؤں نے بتایا ہے کہ شادی سے پہلے وہ جس محل سرا میں رہتی تھی اسی کی اوپر کی منزل پر جنوں کے شہزادے کا بسیرا تھا۔ وہ ان پر عاشق ہوگیا۔ یہ اس سے ملنے ہر جمعرات کو مغرب کے بعد نہا دھو کر خوب سنگھار کرتیں اور اوپر جا کر تمام رات وہیں رہتیں۔ بڑی رانی صاحبہ کی کوششوں سے اس سے چھٹکارا ملا۔ یہ اس وقت پیٹ سے تھیں۔ رانی صاحبہ انہیں حیدرگڑھ لے آئیں۔ وہیں چپ چپاتے یہ بچہ پیدا ہوا جو بعد میں بنّو کے سر تھوپا گیا۔ اس میں کیا سچ ہے، کیا جھوٹ۔ بس سنا ہی سنا ہے۔ رانی صاحبہ مرحومہ نے بھی اتنی رازداری سے کام لیا کہ مجھے بھی کچھ نہ بتایا۔" اس نے قدرے تامل کے بعد کہا۔ "یہ اس وقت کی بات ہے جب آپ بڑی رانی صاحبہ سے ملنے حیدرگڑھ نہیں آئے تھے۔ مجھے بھی تب تک یہ راز معلوم نہیں تھا۔ اگر معلوم بھی ہوتا تو آپ سے کیا بتاتی۔ آپ کا تو اس سے کوئی واسطہ ہی نہ تھا۔"

صندلی بولتی رہی اور قیصر مرزا خاموش بیٹھا سوچتا رہا کہ وہ بچہ جو دالان میں بستر پر تنہا پڑا ہے اور بے خبر سو رہا ہے، اس کا اپنا لختِ جگر ہے۔ اسے طلعت آرا نے جنم دیا ہے جو ممتا کے ہاتھوں مجبور ہو کر اسے دیکھنے رات کے سناٹے میں یہاں تک آئی ہے۔ بدنامی کے خوف سے نہ وہ اسے اپنا بیٹا کہہ سکتا ہے اور نہ طلعت آرا۔ کتنا بدنصیب ہے یہ بچہ کہ ماں باپ کے ہوتے ہوئے بھی لاوارث ہے۔ حالات نے کیا کیا گل کھلائے ہیں۔ کیا کیا ستم ڈھائے ہیں۔ وہ دل گرفتہ ہوگیا۔ چہرے پر افسردگی کا غبار چھا گیا۔

صندلی نے اسے گم صم پایا تو حیرت کا اظہار کیا۔ "ارے! آپ کیا سوچنے لگے؟"

"کچھ نہیں۔" قیصر مرزا نے چونک کر جواب دیا۔

صندلی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ "مجھے اب چلنا چاہیئے۔ رانی صاحبہ پریشان ہو رہی ہوں گی۔ وہ سب سے چھپ کر یہاں آئی ہیں۔ ان کے میاں مقدمے کے سلسلے میں وکیل سے مشورہ کرنے الہ آباد گئے ہیں۔ ان کی غیر موجودگی سے فائدہ اٹھا کر وہ یہاں آگئیں۔"

"یہ مقدمے بازی کس سلسلے میں ہو رہی ہے؟"

"ریاست کے حقِ وراثت کے بارے میں۔ یہی سننے میں آیا ہے۔" صندلی فوراً حرفِ مطلب پر آگئی۔ "چلیئے، مجھے بچّے کے پاس لے چلیئے۔"

قیصر مرزا بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ دونوں آگے بڑھے۔ کمرے سے باہر نکلے اور زینے کی سیڑھیاں طے کر کے نیچے پہنچ گئے۔ قیصر مرزا آگے آگے تھا۔ وہ صحن سے گزرتا ہوا دالان کی جانب بڑھا جہاں ایک چارپائی پر بچہ بے خبر سو رہا تھا۔

☆

قیصر مرزا اور صندلی نے صحن عبور بھی نہ کیا تھا کہ اسی اثنا میں ڈیوڑھی میں آواز ابھری۔ "صندلی! اے صندلی!" یہ طلعت آرا تھی جو صندلی کا انتظار کرتے کرتے پریشان ہو کر عشرت منزل کے اندر آگئی تھی۔

"لیجئے، رانی صاحبہ خود یہاں آگئیں۔" صندلی نے گھبرا کر قیصر مرزا سے کہا۔ مڑی اور ڈیوڑھی کی جانب بڑھتے ہوئے گویا ہوئی۔ "آپ بچّے کو لے آئیں۔ میں رانی صاحبہ کو اپنے ساتھ لاتی ہوں۔"

قیصر مرزا نے کچھ نہ کہا۔ آگے بھی نہ بڑھا۔ جہاں تھا وہیں ٹھہر گیا۔ لالٹین کی ہلکی ہلکی روشنی میں اس کا چہرہ پریشان نظر آ رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا، اگر طلعت آرا سے اس کا آمنا سامنا ہو گیا تو کیا ہو گا؟ مناسب تو یہی ہو گا کہ وہ اس کے سامنے ہی نہ جائے اور تہہ خانے میں جا کر چھپ جائے۔ دونوں بچّے کو خود ہی تلاش کر لیں گی۔ اور طلعت آرا تو صرف اپنے بچّے ہی کو دیکھنے آئی تھی۔ اس کی موجودگی کا تو اُسے سان گمان بھی نہ تھا۔ صندلی اس کا ذکر بھی کرتی تب بھی وہ پہچان نہ پاتی۔ وہ اسے جنوں کے شہزادے گل رخ کی حیثیت سے جانتی تھی۔ اسے تو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ اس کا نام قیصر مرزا ہے۔

وقت کم تھا اور اسے جلد سے جلد تہہ خانے میں پہنچ جانا چاہیئے تھا۔ تہہ خانے میں جانے کے لئے ایک صحنچی سے گزرنا پڑتا تھا۔ اور وہ صحنچی عین ڈیوڑھی کے سامنے تھی۔ قیصر مرزا گھبرایا ہوا صحنچی کی جانب لپکا۔ لیکن وہ صحنچی میں داخل بھی نہ ہوا تھا کہ صندلی ڈیوڑھی سے نکل کر سامنے آگئی۔ اس کے عقب میں طلعت آرا تھی۔ وہ سیاہ برقع اوڑھے ہوئے تھی اور چہرے پر جالی کی باریک نقاب پڑی تھی۔ قیصر مرزا کو معاً اس پر رانی ارجمند سلطانہ کا گمان ہوا۔ مگر وہ ارجمند سلطانہ نہ تھی۔ طلعت آرا ہی تھی۔ اس نے نقاب الٹی تو اس کا چہرہ قیصر مرزا کے سامنے تھا جو اب کچھ زیادہ ہی دلکش اور دل آرا ہو گیا تھا۔ رخسار تازہ پھولوں کی مانند شگفتہ تھے۔ سرخ سرخ شبنمی ہونٹوں پر ہلکی سی لرزش تھی۔ بڑی بڑی روشن آنکھیں ایک جگہ جم کر رہ گئی تھیں۔ وہ حیران و پریشان ہو کر ٹھٹکی اور ٹکٹکی باندھے قیصر مرزا کو دیکھتی رہی۔

قیصر مرزا بھی مبہوت کھڑا تھا۔ دونوں کی نظریں ملیں اور دفعتہً طلعت آرا کا خوبصورت چہرہ وحشت زدہ ہو گیا۔ آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔ اس نے منہ کھول کر لرزتی ہوئی آواز میں کہا "ہائے اللہ!" وہ لڑکھڑائی اور سراسیمہ ہو کر صندلی سے چمٹ گئی۔

قیصر مرزا حیرت سے آنکھیں پھاڑے ہکا بکا کھڑا تھا۔

صندلی نے طلعت آرا کو اس قدر خوف زدہ پایا تو وہ بھی گھبرا گئی۔ اس کی سمجھ ہی میں نہ آیا کہ آن کی آن میں طلعت آرا کو کیا ہو گیا۔ لمحہ بھر تو وہ بھی کسی ان جانے خوف سے دم بخود کھڑی رہی۔ پھر اس نے خود کو سنبھالا۔ طلعت آرا کو سہارا دیا اور گھبرائی ہوئی آواز میں پوچھنے لگی۔

"رانی صاحبہ!"

"سرکار! یہ آپ کو کیا ہو گیا؟"

"رانی صاحبہ! کچھ تو بتلایئے۔"

وہ گھبرا گھبرا کر پوچھتی رہی۔ مگر طلعت آرا کے لبوں کو ذرا جنبش نہ ہوئی۔ وہ ٹوٹی ہوئی شاخ کی طرح صندلی کے شانے کا سہارا لئے نڈھال کھڑی تھی۔ اس کے پیر لرز رہے تھے اور چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔

قیصر مرزا ذرا دیر تک حواس باختہ کھڑا رہا۔ پھر وہ چونکا۔ اسے صورت حال کی نزاکت کا

احساس ہوا۔ وہ فوراً مڑا اور مسہری کی جانب منہ پھیر کر اس طرح مڑ گیا کہ اس کی پیٹھ ان دونوں کی طرف تھی۔ وہ خالی خالی نظروں سے تاریک در و دیوار کو تک رہا تھا۔ ہر طرف گہرا سکوت طاری تھا۔ لالٹین کی مٹیالی روشنی میں دالان کے اونچے اونچے ستون دم بخود کھڑے تھے جس کے ایک گوشے میں چارپائی پر بچہ بے خبر سو رہا تھا جسے دیکھنے اور اپنی ممتا ٹھنڈی کرنے طلعت آرا چوری چھپے عشرت منزل آئی تھی۔ مگر اب وہ اس سے بھی بے نیاز تھی۔ اسے اپنے تن بدن کا ہوش نہ تھا۔

قیصر مرزا چپ چاپ کھڑا تھا۔ اس کی پشت پر صندلی کی آواز ابھر رہی تھی۔ وہ گھبراہٹ کے عالم میں طلعت آرا سے اس کی پریشانی اور سراسیمگی کے بارے میں بار بار پوچھ رہی تھی اور طلعت ہنوز خاموش تھی۔ آخر کچھ دیر بعد اس کی آواز ابھری۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "صندلی! مجھے واپس لے چلو" اس کے لہجے سے نقاہت صاف آشکارہ تھی۔ وہ بے حد نڈھال اور مضمحل لگ رہی تھی۔

قیصر مرزا نے پلٹ کر دونوں کی جانب نہ دیکھا۔ اس نے گہری خاموشی میں کپڑوں کی سرسراہٹ سنی اور اس کے ساتھ ساتھ قدموں کی آہٹ۔ قدم جو بوجھل تھے اور رک رک کر اٹھ رہے تھے۔ ان قدموں کی آہٹ اس نے صحن میں سنی۔ پھر ڈیوڑھی میں۔ چاپ رفتہ رفتہ دور ہوتی گئی۔

قیصر مرزا نے پلٹ کر دیکھا۔ دونوں ڈیوڑھی سے گزر کر باہر جا چکی تھیں۔ وہ آگے بڑھا اور ڈیوڑھی میں داخل ہو گیا۔ ڈیوڑھی میں اندھیرا تھا اور دروازہ کھلا تھا۔ گلی کے پختہ فرش پر قدموں کی آہٹ ابھر رہی تھی۔ قیصر مرزا دہلیز پر پہنچا۔ دروازے کے ایک پٹ کا سہارا لے کر اس نے گردن آگے بڑھائی۔ باہر دیکھا۔ دھندلی دھندلی روشنی میں اسے دو سائے حرکت کرتے ہوئے نظر آئے اور دیکھتے دیکھتے نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ قیصر مرزا دروازے سے ٹیک لگائے گم صم کھڑا رہا اور رک رک کر گہری سانسیں بھرتا رہا۔ رات تاریک تھی اور دور کہیں گلیوں میں کتے بھونک رہے تھے۔

کوتوالی کے گھڑیال نے بارہ بجے کا گجر بجایا۔ رات گہری ہو چکی تھی۔ قیصر مرزا چونکا۔ اسے اچانک خیال آیا کہ سنسان دالان میں بچہ اکیلا سو رہا ہے۔ اس کا خیال آتے ہی قیصر مرزا نے ڈیوڑھی کا صدر دروازہ بند کیا۔ کنڈی لگائی اور تھکے تھکے قدموں سے چلتا ہوا ڈیوڑھی سے باہر نکلا۔ دالان کی جانب بڑھا۔ مگر چند ہی قدم چلا تھا کہ اس کا پیر کسی چیز سے ٹکرایا۔ اسی جگہ پر ذرا دیر پہلے طلعت آرا سراسیمگی کے عالم میں صندلی کا سہارا لئے کھڑی تھی۔ وہ ٹھٹک کر رہ گیا۔

اس نے جھک کر دیکھا لیکن اندھیرے میں کوئی اندازہ نہ لگا سکا۔

وہ لپک کر دالان میں پہنچا۔ لالٹین اٹھائی۔ اس کی لو اونچی کی۔ روشنی تیز ہو گئی۔ واپس اس جگہ گیا تو بھونچکا رہ گیا۔ یہ چمڑے کا سیاہ تھیلا تھا جسے نہایت نفاست اور سلیقے سے تیار کیا گیا تھا اور کچھ اس وضع کا تھا جیسا ڈاکیے خط پتر تقسیم کرنے کے لئے کندھے پر لٹکا کر چلتے ہیں تھیلا بالکل نیا تھا۔ لالٹین کی روشنی میں خوب چمک رہا تھا۔ خاصا پھولا ہوا بھی تھا۔

قیصر مرزا فرش پر اکڑوں بیٹھ گیا۔ تھیلا اٹھایا۔ اسے کھولا تو چھوٹے چھوٹے ریشمی اور رنگین لباس، چاندی کے دو نقشین جھنجھنے، ہاتھی دانت کی سفید کنگھی، سیاہ ریشمی ڈوری میں پرویا ہوا چاندی کا تعویز، رنگ برنگی ولایتی مٹھائیوں کے پیکٹ، بسکٹوں کے چھوٹے بڑے ڈبے، ایک خوبصورت ربڑ کی گڑیا اور ایسے ہی کئی اور کھلونے اندر سے نکلنے لگے۔ قیصر مرزا انہیں دیکھتا رہا اور دل گرفتہ ہو کر سوچتا رہا کہ یہ سب کچھ طلعت آرا اپنے بچّے کے لئے لائی تھی جسے وہ ایک نظر دیکھ بھی نہ سکی اور حواس باختہ ہو کر واپس چلی گئی۔

اس نے ہر چیز احتیاط سے تھیلے میں رکھی۔ اسے بند کیا اور دالان میں جا کر کھونٹی پر لٹکا دیا۔ وہ بچّے کے پاس گیا۔ کچھ دیر اس کے بھولے بھالے خوبصورت چہرے کو دیکھتا رہا۔ پھر جھک کر بے اختیار اس کے رخسار کو چوم لیا۔ بچّہ نیند میں کلبلایا۔ قیصر مرزا قریب بیٹھ کر اس کی پیٹھ ہولے ہولے تھپکنے لگا۔ بچّہ سو رہا تھا اور قیصر مرزا خاموش بیٹھا طلعت آرا کے بارے میں سوچ رہا تھا جو اس کی محبوبہ تھی۔ اس کے بچّے کی ماں تھی۔ اسے قوی امید تھی کہ طلعت آرا مامتا کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنے بچّے کو دیکھنے ایک بار پھر آئے گی۔

قیصر مرزا نے بستر پر بیٹھے بیٹھے طے کیا کہ آئندہ جب طلعت آرا آئے گی تو وہ اس کے زیورات واپس کر دے گا۔ اس طرح وہ اس کی خوشنودی حاصل کر سکتا تھا۔ اپنا پامال بھرم بحال کر سکے گا۔ حالانکہ وہ اس ارادے سے عشرت منزل آیا تھا کہ طلعت آرا کے زیورات نکال کر مراد آباد لے جائے گا۔ کسی ساہوکار کے ہاتھ فروخت کر دے گا اور جو رقم ملے گی اس سے اپنے والد کے قرض کا بوجھ کم کرنے کی کوشش کرے گا۔ مگر اب اس نے یہ ارادہ ترک کر دیا تھا۔ وہ بھول کر بھی اب تک طلعت آرا کو بھول نہ سکا تھا۔ اس کی محبّت کی یادگار صرف وہ زیورات رہ گئے تھے جنہیں پہن کر وہ نہایت

سج دھج کے ساتھ اس سے ملنے رات کی تنہائی میں آتی تھی۔ اور مانگنے پر ایک خاص ادا سے مسکرا کر ہر زیور اتارتی اور اس کے حوالے کر دیتی۔ ان زیورات میں طلعت آرا کے حسین جسم کی خوشبو رچی ہوئی تھی۔ جن سے نہ جانے کتنی سہانی یادیں وابستہ تھیں۔ اس کا جی چاہا کہ ان زیورات کو سامنے رکھ کر دیکھے۔ انہیں سونگھے، وارفتہ ہو کر چومے، سینے سے لگائے اور ان ہیجان انگیز راتوں کی یاد تازہ کرے جب طلعت آرا اس کے پہلو میں ہوتی تھی۔

وہ بے قرار ہو کر اٹھا اور زینے کی جانب بڑھا۔ سیڑھیاں طے کر کے اپنے کمرے میں پہنچا۔ کمرے میں لیمپ روشن تھا۔ وہ صندوق کے قریب گیا۔ کرتے کی جیب سے کنجی نکالی۔ صندوق کا قفل کھولا۔ مگر ڈھکنا اٹھایا تو ششدر رہ گیا۔ صندوق میں رکھے ہوئے کپڑے لتے اور تمام دوسرا ساز و سامان الٹا پلٹا اور نہایت بے ترتیبی سے بکھرا ہوا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے کسی نے بہت عجلت میں صندوق کی تلاشی لی ہے۔

قیصر مرزا کا فوراً ماتھا ٹھنکا۔ اس نے گھبرا کر جلدی جلدی زیورات تلاش کئے جو ایک رومال میں باندھ کر رکھے گئے تھے۔ یہ ایک پوٹلی تھی جسے کپڑوں کی تہہ کے نیچے ایک کونے میں احتیاط سے رکھا گیا تھا مگر پوٹلی کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔ اس نے حواس باختہ ہو کر صندوق کا سارا سامان نکال کر باہر ڈال دیا۔ ایک ایک کپڑا اجھاڑا۔ ایک ایک چیز دیکھی۔ ایک بار نہیں بار بار دیکھی۔ لیکن زیورات کی پوٹلی کا کوئی سراغ نہ ملا۔ صندوق میں جو دو ہزار روپے رکھے تھے ان میں سے بھی ایک ہزار کم تھے۔

اسے یاد آیا کہ گذشتہ رات جب وہ عشرت منزل میں داخل ہوا تھا تو اس نے پہلا کام یہ کیا تھا کہ زینہ طے کر کے سیدھا اپنے کمرے میں گیا تھا۔ صندوق کھولا اور یہ دیکھ کر مطمئن ہو گیا تھا کہ زیورات کی پوٹلی اپنی جگہ پر موجود تھی اور دو ہزار روپے بھی وہیں تھے جہاں وہ رام پور جانے سے قبل رکھ کر گیا تھا۔ ہر چیز سلیقے سے اپنی جگہ رکھی تھی۔ نہ کوئی الٹ پلٹ تھی نہ بے ترتیبی۔ مگر یہ راتوں رات کیا ہو گیا؟ یہ کس کی حرکت ہو سکتی ہے؟ معاً اسے ڈھا جانی کا خیال آیا۔ وہ منہ اندھیرے چپکے سے گھر سے نکل گیا تھا اور اب تک واپس نہ آیا تھا۔ اس کی یہ پراسرار غیر حاضری علت سے خالی نہ تھی۔ وہ بھنّایا ہوا بھی تھا۔ قیصر مرزا سے سخت ناراض تھا۔ اس نے جان پر کھیل کر حبس اور شدید گرمی میں اکیس روز

تک چلہ کشی کی تھی۔ مایا کو جگانے کے لئے عمل پڑھا تھا۔ ریاضت کی تھی۔ قیصر مرزا نے اس کی تمام جانفشانی اور ریاضت پر پانی پھیر دیا تھا۔ دفینہ حاصل کرنے کی ساری کوشش خاک میں ملا دی تھی۔ وہ ہارا ہوا جواری تھا اور ہارا ہوا جواری بہت خطرناک ہوتا ہے۔

تو گویا آغا جانی نے اپنی ناکامی کا اس سے یہ انتقام لیا۔ اس کے علاوہ کوئی اور یہ حرکت کر ہی نہیں سکتا۔ کسی کی اتنی جرأت ہی نہیں ہو سکتی کہ رات کی تاریکی میں اس کے کرتے کی جیب سے کنجی نکالے۔ صندوق کا تالا کھولے۔ زیورات اور روپے نکالے اور خاموشی سے کھسک جائے۔ آغا نے اس کے ساتھ بڑی تگڑی چوٹ کی تھی۔ یہ توقع نہ تھی کہ وہ ایسا بھی کر سکتا ہے۔ اس نے بُرا کیا۔ بہت برا کیا۔ قیصر مرزا نے تڑپ کر ٹھنڈی سانس بھری اور نڈھال ہو کر پلنگ پر لیٹ گیا۔

(۴)

عشرت منزل میں قیصر مرزا کے قیام کو ہفتہ بھر سے اوپر ہو گیا۔

اسے توقع تھی کہ آغا ایک نہ ایک روز واپس آئے گا۔ ہمیشہ کی طرح اظہار پشیمانی کرے گا۔ اس کی ڈانٹ پھٹکار پر ڈھیٹ بن کر مسکرائے گا اور منت سماجت کر کے اسے منانے اور رام کرنے کی کوشش کرے گا۔ اور اگر وہ واپس نہ آیا تو طلعت آرا عشرت منزل ضرور آئے گی۔ خود نہ آسکی تو صندلی کو بھیجے گی۔

ہر صبح اٹھ کر پہلے وہ آغا کا انتظار کرتا۔ دروازے کی ہر آہٹ پر اس کے کان کھڑے ہو جاتے اور بے اختیار ڈیوڑھی کی جانب اس کی نظریں اٹھ جاتیں۔ دن اسی انتظار میں ڈھل جاتا۔ دھوپ مٹیالی پڑ جاتی۔ سائے طویل ہو جاتے۔ شام دبے پاؤں اونچی اونچی دیواروں سے نیچے اترتی اور ہر طرف سرمئی چادر بن کر پھیل جاتی۔ دم بدم تاریک ہوتی جاتی اور رات میں ڈھل جاتی اور جب دو گھڑی رات گزر جاتی۔ شہر کے ہنگامے سرد پڑ جاتے اور باہر گلی میں راہگیروں کی آمدورفت کم ہو جاتی تو اسے صندلی کا انتظار ہوتا۔ اس کے ساتھ طلعت آرا کا۔ طلعت آرا آتی تو تنہا نہ آتی۔ اس کے ہمراہ صندلی ضرور ہوتی۔ وہ اس کی رازدار بن چکی تھی۔ قیصر مرزا کو یقین تھا کہ ماما طلعت آرا کو چین سے نہ بیٹھنے دے گی۔ اپنے بچے کو ایک نظر دیکھ کر ہی اسے قرار آئے گا۔ وہ اپنی ساری

شرم وحیا، عزت و وقار، خوف اور خطرات کو فراموش کر کے رات کے سناٹے میں کسی نہ کسی روز آئے گی ورنہ صندلی کے ذریعے بچے کی خیریت معلوم کرنے کی کوشش کرے گی۔ ہر شام اس کی یہ امید بیدار ہو جاتی اور جب کوچہ و بازار سنسان ہو جاتے۔ رات کالی کا جل ہو جاتی تو اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی۔ انتظار کی شدت سوا ہو جاتی۔ مگر نہ کبھی رات گئے کسی نے دروازے پر دستک دی۔ نہ صندلی آئی اور نہ اس کے ہمراہ طلعت آرا۔

آٹھ روز اسی امید و بیم کے عالم میں گزر گئے۔ انتظار، انتظار ہی رہا۔ وہ تمام وقت عشرت منزل ہی میں رہا۔ کھانے کے لئے بھی اسے باہر نہ جانا پڑا۔ قیصر مرزا کی مشکل رمضانی دودھ والے نے آسان کر دی۔ اس نے بازار کے ایک نان بائی سے اس سلسلہ میں بات کی۔ نان بائی کا لڑکا دونوں وقت کھانا پہنچا جاتا۔ قیصر مرزا کبھی گرم گرم خمیری روٹیاں اور سالن کھاتا۔ کبھی کلچے اور نہاری، کبھی پائے، کبھی دال گوشت۔

وہ بچے کے ساتھ اپنا دل بہلاتا رہا اور جب سے یہ انکشاف ہوا تھا کہ وہ اسی کی اولاد ہے، اس کا اپنا خون ہے تو اور بھی زیادہ پیار کرنے لگا تھا۔ ہنس ہنس کر اس کی ناز برداری کرتا۔ نہلاتا دھلاتا۔ لباس تبدیل کرتا۔ دودھ گرم کر کے پلاتا۔ طلعت آرا کی لائی ہوئی ولایتی مٹھائیاں اور بسکٹ کھلاتا۔ بچہ بھی اس سے مانوس ہو گیا تھا۔ اسے دیکھ کر خوش ہوتا۔ ہنستا مسکراتا۔ کلکاریاں بھرتا۔ قیصر مرزا اب اسے گلفام کہہ کر پکارتا تھا۔ یہ نام اس نے کچھ اس خیال رکھا تھا کہ طلعت آرا اپنے بچے کو پرستان کے شہزادے کی اولاد سمجھتی تھی۔ پہلی بار اس نے بچے کو گلفام کہہ کر مخاطب کیا تو وہ منہ پھاڑ کر ہنسنے لگا تھا۔ اس کا یہ انداز قیصر مرزا کو اس قدر پیارا لگا کہ اسے گود میں اٹھا کر بے اختیار چومنا شروع کر دیا۔

طلعت آرا بچے کے لئے طرح طرح کے جو خوبصورت کھلونے چھوڑ گئی تھی، انہیں پا کر وہ بہت خوش ہوا تھا۔ اب وہ روتا بھی کم تھا۔ دالانوں، صحنچیوں، کمروں اور آنگن میں ادھر ادھر دوڑنے اور خاک دھول اڑانے کے بجائے عام طور پر اپنے کھلونوں کے ساتھ بیٹھا کھیلتا رہتا۔ لیکن قیصر مرزا کی پریشانیاں روز بروز بڑھتی جا رہی تھیں۔ اس کے کپڑے میلے ہوتے جا رہے تھے۔ حجامت بڑھ گئی تھی۔ خالی بیٹھے بیٹھے دل گھبراتا تھا۔ احساس تنہائی سے دم گھٹتا تھا۔ نہ کوئی ہمدم

تھا نہ غم گسار۔ نہ کوئی بولنے والا تھا نہ بات کرنے والا صرف گلفام تھا جسے چھوڑ کر وہ کہیں جا بھی نہ سکتا تھا۔

ایک روز وہ حجامت بنوانے گھر سے باہر گیا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ گلفام دودھ پی کر سو گیا تھا۔ مگر جب وہ حجامت بنوا کر واپس آیا تو یہ دیکھ کر پریشان ہو گیا کہ گلفام کا چہرہ لہولہان ہو رہا تھا۔ روتے روتے اس کی ہچکی بندھ گئی تھی۔ وہ نیند میں کروٹ بدلتے ہوئے پلنگ سے نیچے گر پڑا تھا۔ فرش پختہ تھا۔ پیشانی پر گہری چوٹ آئی تھی۔ قیصر مرزا نے فوراً اس کا زخم گیلے کپڑے سے صاف کیا۔ گلفام کے ریشمی لباس سے ایک ٹکڑا پھاڑا۔ اسے جلایا۔ ریشم کی راکھ زخم پر رکھی اور پٹی باندھ دی۔ بچپن میں ایک بار دروازے کی چوکھٹ سے ٹکرا کر اس کا سر پھٹ گیا تھا تو بوڑھی انّا کے مشورے پر ماں نے فوری طور پر زخم کا علاج اسی طرح کیا تھا۔ اور یہ نسخہ کارگر بھی ثابت ہوا تھا۔

قیصر مرزا نے گلفام کو اٹھایا اور کندھے سے لگا کر چمکارنے لگا۔ اس حادثے کے بعد وہ ایسا خائف ہوا کہ گھر سے باہر جانے کا ارادہ ہی ترک کر دیا۔

☆

منگل کا دن تھا۔ اور اسی روز مقدمے کی پیشی تھی۔ قیصر مرزا کو اپنے وکیل کے ہمراہ عدالت میں پیش ہونا تھا۔ قیصر مرزا گھر سے نکل کر کہیں جا نہیں سکتا تھا۔ گلفام کو گھر میں تنہا چھوڑنا ممکن نہ تھا اور نہ ہی اسے کہیں لے جا سکتا تھا۔ ایک بار اس کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ اسے اپنے گھر لے جائے۔ مگر وہ اپنی والدہ سے ڈرتا تھا۔ وہ پہلے ہی اس سے بدظن تھیں۔ طرح طرح کے شبہات میں مبتلا تھیں۔ گلفام کو دیکھتے ہی ہنگامہ برپا کر دیتیں۔ وہ قیصر مرزا سے جس قدر لاڈ پیار کرتی تھیں اسی قدر نالاں بھی تھیں۔ سخت گیر اور مغلوب الغضب بھی تھیں۔ کوئی بات ناگوار گزرتی تو شعلے کی طرح بھڑک اٹھتیں۔ آپے سے باہر ہو جاتیں۔ ذرا نہ پسیجتیں۔ یہی وجہ تھی کہ نواب بو تامرحوم سے ہمیشہ ان کی اَن بن رہتی تھی۔ وہ بھی مزاج کے کڑوے تھے۔ ہمیشہ ناک پر غصہ رہتا تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر میاں بیوی میں کھٹ پٹ ہو جاتی۔ کئی کئی روز بات چیت بند رہتی۔ زنان خانے میں نہ آتے۔ بیشتر وقت دیوان خانے میں مصاحبین اور حاضر باشوں کے ساتھ گزارتے۔

قیصر مرزا کا حلقۂ احباب بھی بہت محدود تھا۔ دو چار جو دوست احباب تھے وہ قیصر مرزا کی طرح نکھٹو اور آشفتہ طبع تھے۔ بجز آغا جانی کے سب ہی بگڑے ہوئے رئیس زادے تھے۔ کوئی بھی ایسا نہ تھا جو گلفام کو اپنے پاس رکھ سکتا یا اس سلسلے میں اس کی کوئی مدد کر سکتا۔ گلفام نے قیصر مرزا کو سخت مشکل میں ڈال دیا تھا۔ زندگی جنجال ہو گئی تھی۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کرے۔ اس الجھن سے کیسے چھٹکارا حاصل کرے۔

وہ عدالت میں حاضری کے لئے صبح سے پریشان تھا۔ اس نے بہت سوچ بچار کیا مگر کوئی سبیل پیدا نہ ہو سکی۔ گلفام اس کی پریشانی سے بے نیاز گھر میں ادھر ادھر گھوم پھر رہا تھا۔ کبھی اپنے کھلونوں سے کھیلنے بیٹھ جاتا۔ کبھی اسے اپنی جانب متوجہ کرنے کے لئے کلکاریاں بھرتا۔ قہقہے لگاتا۔ کبھی منہ بسور کر رونے لگتا اور بلا سبب دیر تک روتا رہتا۔ قیصر مرزا کو اس کے رونے سے سخت جھنجھلاہٹ ہوتی۔ وہ اسے چمکارتا بھی اور دھمکاتا بھی۔ ایک بار جب طرح طرح سے خوش کرنے کی کوشش کے باوجود وہ مسلسل روتا رہا تو قیصر مرزا نے جھنّا کر ایک تھپڑ بھی مارا۔ گلفام بلبلا کر اور زور سے رونے لگا۔ قیصر مرزا نے جل کر ایک اور تھپڑ مارا۔ ہاتھ ایسا بھرپور پڑا کہ گلفام فرش پر گر پڑا اور سہم کر اسے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھنے لگا۔ لیکن رک رک کر سسکیاں بھی بھرتا رہا۔ قیصر مرزا تڑپ اٹھا۔ اپنے کئے پر پچھتایا اور گود میں اٹھا کر ہولے ہولے اس کی پیٹھ تھپکنے لگا۔

قیصر مرزا کو رہ رہ کے آغا جانی پر غصہ آرہا تھا جس نے اس کا سکون غارت کر دیا تھا۔ اس کی آزادی سلب کر لی تھی۔ اسے مجبور و بے بس بنا دیا تھا۔ عشرت منزل اس کے لئے جیل بن گئی تھی اور وہ قیدی ہو کر رہ گیا تھا۔ عشرت منزل کی فصیل نما اونچی اونچی دیواریں کاٹ کھانے کو دوڑتی تھیں بام و در سے وحشت ہوتی تھی۔ اسی وحشت و پریشانی میں دوپہر ہو گئی۔ نانبائی کا لڑکا کھانا لے کر آگیا۔ مگر قیصر مرزا اس قدر اکتایا ہوا تھا کہ دو چار لقمے کھانے کے بعد ہاتھ کھینچ لیا۔ البتہ پانی گلاس بھر کر پیا اور نڈھال ہو کر بستر پر لیٹ گیا۔ لیکن نیند نہ آئی۔ بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔

دن ڈھلے خلاف توقع دروازے پر آہٹ ہوئی۔ کوئی آہستہ آہستہ بیرونی دروازے کی کنڈی کھٹکھٹا رہا تھا۔ قیصر مرزا چونکا۔ مڑ کر ڈیوڑھی کی جانب دیکھا۔ دستک صاف سنائی دے رہی تھی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھا۔ پلنگ سے نیچے اترا اور ڈیوڑھی کی جانب بڑھا۔ گلفام بھی سویا نہیں تھا۔

دالان کے ایک گوشے میں فرش پر بیٹھا گڑیا سے کھیل رہا تھا۔
قیصر مرزا ڈیوڑھی میں گیا۔ دروازہ کھولا تو ہکا بکا رہ گیا۔ سامنے صندلی کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک گٹھڑی دبی تھی۔ قیصر مرزا نے حیرت سے پوچھا۔ "صندلی! تم! اس وقت، کیسے آگئیں؟"
"کیوں؟ میرا اس وقت آنا آپ کو بُرا معلوم ہوا؟" وہ مسکرا کر شوخی سے بولی۔
"میں تو بے چینی سے تمہارا انتظار کر رہا تھا۔" قیصر مرزا بھی مسکرانے لگا۔ "اندر آجاؤ۔"
صندلی ڈیوڑھی میں داخل ہوئی۔ قیصر مرزا نے دروازہ بند کر دیا۔ دونوں آگے بڑھے۔ قیصر مرزا نے جھجکتے ہوئے دریافت کیا۔ "طلعت آرا بھی آئی ہیں؟"
"جی نہیں۔ میں اکیلی آئی ہوں۔" وہ تھکی ہوئی اور نڈھال نظر آرہی تھی۔ "ویسے مجھے سرکار ہی نے بھیجا ہے۔"
"وہ کیوں نہیں آئیں؟ اپنے بچے کو دیکھنے تو انہیں آنا چاہیئے تھا۔"
دونوں ڈیوڑھی سے نکل کر آنگن میں آگئے تھے۔ صندلی نے بتایا۔ "آج تو لاری سے آئی ہوں۔ ہچکولے کھاتے کھاتے برا حال ہوگیا۔ سارا بدن دکھ رہا ہے۔"
"جبھی اس قدر تھکی تھکی نظر آرہی ہو۔"
"آغا جانی صاحب تو آج موجود ہوں گے۔" صندلی اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔
"نہیں، وہ اس روز سے اب تک واپس نہیں آئے۔ البتہ گلفام موجود ہے۔"
"یہ گلفام کون ہے؟" صندلی نے حیرت کا اظہار کیا۔
"وہی بچہ جسے دیکھنے تم آئی ہو۔" قیصر مرزا نے ہاتھ اٹھا کر گلفام کی جانب اشارہ کیا۔ "دیکھو وہ سامنے بیٹھا کھلونوں سے کھیل رہا ہے۔"
صندلی نے اسے غور سے دیکھا۔ "آپ نے اس کا نام گلفام رکھا ہے۔ ہائے، کتنا خوبصورت اور پیارا ہے۔ بالکل گلفام لگتا ہے۔"
"پرستان کے شہزادے کا شہزادہ ہے۔" قیصر مرزا نے ہنس کر بے تکلفی سے کہا۔ "اس کا نام تو گلفام ہی ہونا چاہیئے۔"
صندلی نے کچھ نہ کہا۔ مسکراتی ہوئی گلفام کی جانب بڑھی۔ مگر گلفام نے اسے دیکھ کر مُنہ

بسورا اور رونے لگا۔ صندلی قریب پہنچ گئی۔ پچکار کر بولی۔ "ارے، شہزادے صاحب تو رونے لگے۔ دیکھئے میں آپ کے لئے کیسے اچھے اچھے کھلونے اور مٹھائیاں لائی ہوں۔" وہ اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ گٹھری کھولی۔ لکڑی اور ربڑ کے کھلونے نکالے۔ مٹھائیاں اور بسکٹ کے ڈبے نکالے اور ایک ایک چیز گلفام کے سامنے رکھ دی۔ کھلونے دیکھ کر گلفام نے رونا بند کر دیا۔ ذرا دیر سہما ہوا چپ بیٹھا رہا۔ مگر جب صندلی نے ایک جھنجھنا بجا کر اس کے ہاتھ میں تھما دیا تو وہ بھی اسے خوش ہو کر بجانے لگا۔ صندلی نے ڈبا کھول کر بسکٹ نکالا۔ گلفام کو کھلایا۔ وہ بھوکا بھی تھا۔ اطمینان سے کھانے لگا۔ وہ رفتہ رفتہ صندلی سے مانوس ہونے لگا۔

"بھئی تم نے بہت جلدی اسے پٹا لیا۔" قیصر مرزا نے مسکرا کر کہا۔ "یہ تو ہر ایک کو دیکھ کر بدکتا ہے۔ میرے علاوہ کسی کے پاس جاتا ہی نہیں۔"

"آغا جانی صاحب کے پاس بھی نہیں جاتا؟"

"آغا جانی نے تو پلٹ کر خبر بھی نہ لی اور اس بچے کو میرے لئے مصیبت بنا کر چھوڑ دیا۔"

"میں نے تو سنا ہے کہ وہ اسے اپنی بہن کے لئے لے گئے تھے۔" صندلی نے کہا۔ "ان کی کوئی اولاد نہیں۔ اگر یہ سچ ہے تو آغا جانی کے بہنوئی کو آنا چاہیئے تھا۔"

"مجھے اس سلسلے میں کچھ نہیں معلوم۔ نہ آغا جانی نے کچھ بتایا اور نہ ہی ان کے بہنوئی کبھی یہاں آئے۔" قیصر مرزا نے صاف بات بتانے سے گریز کیا۔ اس نے فوراً بات کا رُخ موڑ دیا۔ "صندلی! یہ تو بتاؤ کہ طلعت آرا اس رات اپنے بچے کو دیکھے بغیر اچانک واپس کیوں چلی گئیں؟ وہ بہت گھبرائی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔"

"مجھے خود نہیں معلوم وہ اتنی گھبرا کیوں گئی تھیں۔"

"میرے بارے میں انہوں نے تم سے کچھ پوچھا تھا؟" قیصر مرزا نے ٹوہ لگانے کی کوشش کی۔

"جی نہیں۔" صندلی نے جواب دیا۔ "بلکہ میں نے انہیں جب یہ بتایا کہ آپ کی تو ان سے رشتہ داری بھی ہوتی ہے تو انہوں نے صرف اتنا کہا۔ مجھے نہیں معلوم۔ میں نے تو پہلی بار دیکھا ہے۔"

قیصر مرزا کی حاضر دماغی نے کام کیا۔ اس نے فوراً بات بنائی۔ "اب سمجھ میں آیا کہ وہ مجھے دیکھ کر اس روز اس قدر پریشان کیوں ہو گئی تھیں۔ انہیں یہ خوف لاحق ہوا ہو گا کہ کہیں مجھے یہ

راز نہ معلوم ہوجائے کہ گلفام ان کا بیٹا ہے۔ وہ تو آغا جانی کے پاس آئی تھیں۔ انھیں یہ توقع تو تھی نہیں کہ آغا جانی کے بجائے مجھ سے مڈبھیڑ ہوجائے گی۔ تب ہی تو انہوں نے مجھے پہچاننے سے بھی انکار کردیا۔"

"ایسا ہی ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ بدنامی کے ڈر سے وہ اتنی پریشان ہوگئیں۔" مندلی نے اس کی تائید کی۔

"مگر میں تو اس بچّے کی وجہ سے قیدی بن کے رہ گیا ہوں۔" قیصر مرزا نے اپنی پریشانی بیان کی۔ "اسے تنہا چھوڑ کر کہیں جا بھی نہیں سکتا۔ کیا بتاؤں کس مشکل میں مبتلا ہوں۔ ایک بار ایسا ہوا کہ حجامت بنوانے کے لئے حجام کی دکان تک گیا تھا۔ اس وقت یہ سو رہا تھا۔ واپس آیا تو یہ پلنگ سے گر کر لہولہان ہوچکا تھا۔"

"حجامت تو آپ کی پھر بڑھ گئی ہے۔" مندلی نے مسکرا کر کہا۔ "واقعی آپ تو سخت پریشانی میں مبتلا ہوگئے۔ اتنے کم سن بچّے کی دیکھ بھال کرنا بڑا مشکل کام ہے۔ ہر دم خیال رکھنا پڑتا ہوگا۔ یہ کام تو کوئی عورت ہی کرسکتی ہے۔"

"مندلی! ایسا کرو۔ تم اسے اپنے ساتھ لے جاؤ۔" قیصر مرزا نے تجویز پیش کی۔ "تم اس کی اچھی طرح دیکھ بھال کرسکتی ہو۔ طلعت آرا کو بھی اطمینان رہے گا۔ بچّہ ان کی نظروں کے سامنے ہی رہے گا۔"

"مگر وہ اس کے لئے آمادہ نہیں ہوں گی۔"

"کیوں؟ اس میں کیا قباحت ہے۔"

"اپنے میاں سے ڈرتی ہیں۔" مندلی نے جھجکتے ہوئے بتایا۔ "میرا خیال ہے کہ ان کے کانوں میں بھی کچھ بھنک پڑ چکی ہے۔ تب ہی تو اس رات یہاں چھپ کر آئی تھیں جب وہ حیدرگڑھ میں موجود نہ تھے۔ مجھے بھی سختی سے منع کردیا ہے کہ کسی سے ذرا بھی تذکرہ نہ کروں۔"

"لیکن میں اسے کہاں لے جاؤں؟" قیصر مرزا زچ ہو کر بولا۔ "گھر لے جاتا ہوں تو خواہ مخواہ بدگمانی پیدا ہوگی۔ کوئی پوچھے گا تو کیا بتاؤں گا۔ آغا جانی کے بارے میں کچھ علم نہیں کہ کہاں ہیں کس حال میں ہیں۔ میری تو کسی جان پہچان والے سے ادھر ملاقات ہی نہیں ہوئی۔ ہوتی بھی کیسے؟ یہاں سے نکلنا ہی نہ ہوا۔"

"رانی صاحبہ بھی اسے یہاں رکھنا نہیں چاہتیں۔"

"پھر یہ رہے گا کہاں؟"

"میں آپ سے سچ سچ بتاؤں کہ وہ اس بچے کے لئے کیا سوچ رہی ہیں۔" وہ کھل کھلا کر ہنسی۔ اس کی بتیسی کھل کر چنبیلی کی کلیوں کی طرح بھلی نظر آنے لگی۔ "مصیبت یہ ہے کہ آپ سے تو میں کوئی بات چھپا بھی نہیں سکتی۔ حالانکہ انہوں نے سختی سے منع کیا تھا۔" اس نے قدرے تامل کے بعد بتایا۔ "وہ چاہتی ہیں کہ یہ بچہ میرے پاس رہے۔ اسے ماں کی طرح پال پوس کر بڑا کروں۔ اس کی پرورش کے لئے مجھے زندگی بھر پانچ سو روپے ماہانہ ملتا رہے گا۔ مگر یہ سب کچھ اس وقت ہوگا جب میری شادی ہو جائے گی۔ ان کی خواہش ہے کہ جلد سے جلد میری شادی ہو جائے۔"

"تب تو تمہارے لئے اچھے سے اچھا رشتہ مل جائے گا۔ اور ڈھونڈا جائے تو بہت اچھے خاندان میں مل سکتا ہے۔" قیصر مرزا نے مسکرا کر اپنے فوری ردِ عمل کا اظہار کیا۔ "پانچ سو روپے ماہانہ کم نہیں ہوتا۔ زندگی بھر نہایت آرام سے گزر بسر ہوگی۔"

"محل کی ایک معمولی خادمہ اور ڈرائیور کی بیٹی کو کون اچھے خاندان والا بیاہ کرلے جائے گا۔" صندلی اچانک افسردہ ہوگئی۔ اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "کہیں مخمل میں ٹاٹ کا پیوند لگتا ہے۔"

"تم ڈرائیور کی بیٹی کب ہو۔ تم تو رانی ارجمند سلطانہ کی بیٹی ہو۔"

"یہ تو آپ جانتے ہیں۔ دوسروں کو تو یہ حقیقت نہیں معلوم۔" اس نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "جن کو یہ حقیقت نہیں معلوم وہ تو مجھے محل کی خادمہ اور ڈرائیور نذیر خاں کی بیٹی ہی کی حیثیت سے جانتے ہیں۔"

"مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اسی اودھ کا کون سا بادشاہ ہے جس نے محل کی معمولی کنیزوں اور خواصوں سے شادی نہیں کی اور ان کی اولادیں تخت و تاج کے وارث بھی بنیں۔ تو لب وزیر علی خاں، نصیر الدین حیدر، فریدوں بخت مُنّا جان۔ کس کس کا نام بتاؤں۔" قیصر مرزا نے اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لئے دلیل پیش کی۔ "تم خوبصورت ہو، جوان ہو، ذہین اور سمجھدار ہو۔ تم میں کس بات کی کمی ہے۔"

"آپ مجھ سے شادی کرلیں گے؟" قیصر مرزا کی باتوں سے متاثر ہو کر صندلی نے بے ساختہ

پوچھا۔ قیصر مرزا کسی ایسے سوال کے لئے ذہنی طور پر تیار نہ تھا۔ اس سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ نظریں جھکا کر سوچنے لگا کہ صندلی سے کیا کہے۔ صندلی نے اسے متفکر پایا تو تیکھے لہجے میں بولی۔ "چھوڑیئے، کیا رکھا ہے ان باتوں میں۔ کہنا آسان ہے کرنا بہت مشکل ہے۔ پریشان نہ ہوں۔ میں نے تو یونہی ایک بات پوچھ لی۔ میں اپنی اوقات اچھی طرح جانتی ہوں۔ ٹاٹ کا پیوند ٹاٹ ہی میں لگتا ہے۔"

"نہیں ایسی بات نہیں۔ میں کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔" قیصر مرزا نے گھبرا کر کہا۔

"ہاں کچھ اور ہی سوچئے۔ ایسی بات نہ سوچئے۔" صندلی کے ہونٹوں پر زہر خند تھا۔

"تم میری بات کا غلط مطلب سمجھیں۔" قیصر مرزا بدستور گھبرایا ہوا تھا۔ "ارے تم وہاں فرش پر کیوں بیٹھی ہو؟ اطمینان سے تخت یا پلنگ پر بیٹھ جاؤ۔ گلفام کو بھی اپنے ساتھ بٹھا لو۔ تم سے تو اس قدر جلد ہل گیا جیسے پرانی جان پہچان ہو۔" وہ جلدی جلدی بولتا رہا۔ صندلی کچھ نہ بولی۔ چند لمحے خاموش رہی۔ پھر اس نے گلفام کو گود میں اٹھایا اور تخت کی جانب بڑھی۔ قیصر مرزا اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ رخسار کے بڑھے ہوئے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے گویا ہوا۔ "تم گلفام کے ساتھ ذرا دل بہلاؤ۔ میں حجام کے پاس جا کر حجامت بنوالوں۔ بہت بڑھ گئی ہے۔"

صندلی نے اس دفعہ بھی کچھ نہ کہا۔ چپ چاپ تخت پر بیٹھ گئی۔ قیصر مرزا اس وقت صندلی کے پاس ٹھہرنا نہ چاہتا تھا۔ حجامت بنوانے کے لئے بھی بے چین تھا۔ وہ ڈیوڑھی کی جانب بڑھا۔ دروازہ بھیڑا اور گھر سے باہر چلا گیا۔

☆

حجام کی دوکان پر پہنچ کر قیصر مرزا نے بال ترشوائے۔ ڈاڑھی منڈوائی اور چکنے چکنے رخساروں پر ہاتھ پھیرتا ہوا عشرت منزل کی جانب واپس ہوا۔ وہ جب سے عشرت منزل سے نکلا تھا مسلسل صندلی کے بارے میں سوچتا رہا۔ اسے بخوبی اندازہ تھا کہ صندلی اس سے محبت کرتی ہے۔ کبھی اشاروں کنایوں میں۔ کبھی دبی زبان سے اور آج تو کھل کر اس کا اظہار بھی کر دیا تھا۔ صندلی اسے پسند بھی تھی۔ انگ انگ سے پھوٹتی ہوئی اس کی بھرپور جوانی، ترشا ہوا سڈول جسم، بڑی بڑی سیاہ آنکھیں۔ اس کی پیشانی۔ اس کے لب۔ مگر اس میں محبت کی وہ دیوانگی اور شوریدہ سری نہ تھی جو ارمن

سلطانہ کے لئے اس نے محسوس کی تھی۔ ان کی زلف گرہ گیر میں اسیر ہو کر تو وہ اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھا تھا اور نہ ہی اس میں وہ بے قراری اور تڑپ تھی جو طلعت آرا کے لئے محسوس ہوتی تھی۔ طلعت آرا کو تو اس نے ٹوٹ کر چاہا تھا اور اب تک یہ محبت ختم نہ ہوئی تھی۔ حالانکہ طلعت آرا اب پرائی ہو چکی تھی۔ لیکن اب تک وہ اسے بھول نہ سکا تھا۔

وہ مندلی کا دل بھی توڑنا نہ چاہتا تھا۔ اس کی محبت ٹھکرانا بھی نہ چاہتا تھا۔ وہ مالی طور پر پریشان تھا۔ باپ کا کوئی وثیقہ نہ تھا۔ ماں کا وثیقہ بھی صرف سوا دو سو روپے ماہانہ تھا۔ تمام جائیداد مہاجنوں کے پاس رہن تھی۔ یہ بھی خبر نہ تھی کہ مقدمے بازی کا کیا نتیجہ نکلے گا۔ اگر مندلی سے شادی ہو جائے تو پانچ سو روپے ماہانہ میں آرام سے زندگی بسر ہو سکتی تھی۔ اس کا بیٹا گلفام بھی اس کے پاس رہتا اور مندلی ایک چاہنے والی بیوی کی حیثیت سے ہر طرح اس کی ناز برداری بھی کرتی۔ مگر مندلی سے شادی کر کے وہ خاندان بھر میں نکو بن جاتا۔ ماں کے غیظ و غضب کا بھی دھڑکا تھا۔ نہ جانے وہ کیا ہنگامہ برپا کریں۔ لیکن وہ جتنی تند مزاج تھیں اتنی ہی جلد نرم بھی پڑ جاتی تھیں۔ ان کا غصہ دیرپا نہ تھا۔ جس تیزی سے چڑھتا تھا اسی تیزی سے اتر بھی جاتا تھا۔ ان کی ممتا بھڑکتی اور وہ اس پر مہربان ہو جاتیں۔ وہ ان کا اکلوتا بیٹا تھا۔ ان کے بڑھاپے کا سہارا۔ اگر وہ ماں کو رضامند کرنے میں کامیاب ہو جائے تو مندلی سے شادی کسی طور نامناسب نہ تھی۔ وہ مندلی کو ان سارے نشیب و فراز سے آگاہ کر دینا چاہتا تھا تاکہ بات یک لخت ختم نہ ہو جائے۔

قیصر مرزا اپنی سوچ میں کھویا ہوا عشرت منزل واپس پہنچا۔ لیکن ڈیوڑھی میں داخل ہوتے ہی اس کی نظر جو پہلے پر پڑی تو ششدر رہ گیا۔ باہر دروازے کے قریب چار کہاروں کو بھی اس نے ایک درخت کے نیچے بیٹھے دیکھا تھا۔ وہ اطمینان سے بیٹھے چلم پر دم لگا رہے تھے۔ قیصر مرزا شش و پنج میں پڑ گیا کہ اس وقت چوپہلے میں یہاں کون آ سکتا ہے۔ معاً اسے خیال آیا کہ طلعت آرا ممتا کے ہاتھوں مجبور ہو کر نہ آئی ہو۔ حیدر گڑھ کے بجائے اپنی ماں کے گھر امیر محل سے چوپہلے میں بیٹھ کر آئی ہو تاکہ کسی کو شبہ نہ ہو۔ بدنامی کے ڈر سے وہ اسی طرح چھپ کر آ سکتی تھی۔ اس کی موجودگی کی بھی اسے بہت کم توقع ہو سکتی تھی۔ وہ تو یہی سمجھی تھی کہ عشرت منزل میں آغا جاتی رہتا ہے اور بچہ اسی کے پاس ہے۔

قیصر مرزا نے دھڑکتے دل سے ڈیوڑھی عبور کی۔ صحن میں داخل ہوا۔ دالان میں نظر پہنچی تو دل دھک سے رہ گیا۔ وہاں طلعت آرا نہ تھی۔ اس کی والدہ پلنگ پر بیٹھی تھیں۔ عالم یہ تھا کہ ابرو کھنچے ہوئے۔ تیوری پر بل۔ آنکھوں میں شرارے، چہرہ غصے سے تمتمایا ہوا۔ قیصر مرزا کو دیکھتے ہی طنزیہ لہجے میں بولیں۔ "آیئے نواب زادے۔ میں بہت دیر سے انتظار کر رہی تھی۔" یکایک وہ شعلے کی مانند بھڑک اٹھیں۔ "یہی وہ نامراد عشرت منزل ہے جہاں تم چھپ چھپ کر آتے ہو۔ رنگ رلیاں مناتے ہو۔ جو جی چاہتا ہے کرتے ہو۔ اب تو کوئی تم سے باز پرس کرنے والا بھی نہیں۔ ایک باپ کا دم تھا وہ بھی نہ رہا۔"

قیصر مرزا آہستہ آہستہ چلتا ہوا ان کے قریب پہنچ گیا اور سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ جلی کٹی سناتی رہیں۔ "غضب خدا کا دس روز ہو گئے تم کو گھر سے آئے ہوئے۔ پلٹ کر یہ بھی نہ پوچھا کہ ہم پر کیا گزر رہی ہے۔ تم کو تو یہ بھی ہوش نہیں کہ آج مقدمے کی پیشی ہے۔ منشی کندن لال بھی چلا گیا۔ اب تو کوئی پیروی کرنے والا بھی نہیں رہا۔ وکیل صاحب نے صاف کہہ دیا کہ اگر اسی طرح غفلت برتی گئی اور قیصر مرزا عدالت میں حاضر نہ ہوئے تو یکطرفہ فیصلہ ہو جائے گا۔ لالہ ہرنام داس کے حق میں ڈگری ہو جائے گی اور ایک روز وہ قرق امین اور عدالت کے کارندوں کے ساتھ قرقی کا پروانہ لئے دروازے پر کھڑا ہو گا۔" انھوں نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "وہ روزِ بد دکھانے سے پہلے اللہ مجھے اس دنیا سے اٹھا لے۔"

"اماں جان! یقین مانئے۔ بالکل یاد نہ رہا کہ آج مقدمے کی تاریخ ہے۔ ورنہ میں ضرور پہنچتا۔" قیصر مرزا اصل سبب تو بتا نہ سکتا تھا۔ اس نے سخن سازی سے کام لیا۔

ماں نے جل کر کہا۔ "تاریخ یاد رہتی بھی کیسے۔ تم تو کسی اور دھن میں مگن تھے۔"

قیصر مرزا نے مڑ کر دیکھا۔ تخت خالی تھا۔ نہ صندلی تھی اور نہ گلفام۔ صرف اس کے کھلونے تخت پر بکھرے ہوئے تھے۔ قریب ہی دالان کے ایک ستون سے ٹیک لگائے رسولن کھڑی تھی۔ وہ دوہرے بدن کی خوب ہٹی کٹی خادمہ تھی جو قیصر مرزا کی والدہ کے ساتھ گھر سے آئی تھی۔ قیصر مرزا نے رسولن سے پوچھا۔ "صندلی کہاں ہے؟ یہیں تخت پر بیٹھی تھی۔" رسولن تو خاموش رہی۔ مگر ماں نے تیوری پر بل ڈال کر کہا۔

"اے اس سے کیا پوچھ رہے ہو۔ میں بتاتی ہوں وہ کل موہی کہاں گئی۔ میں نے اس حرّافہ کو دھتکار کر نکال دیا۔ غضب خدا کا، میں یہاں آئی تو نہ آداب نہ تسلیمات۔ تمنت پر اس طرح براجمان جیسے کسی بڑی محل سرا کی بیگم ہو۔ یہ غرّہ دیکھ کر آگ ہی تو لگ گئی۔ میں نے ڈانٹا تو لگی آنکھیں دکھانے۔ میں نے جل کر جوتی اٹھائی اور دُھڑ سے منہ پر ماری۔ بہت تلملائی۔ زبان درازی پر اتر آئی۔ رسولن سے اس کی گستاخی برداشت نہ ہوئی۔ جھونٹے پکڑ کر دھکا دیا تو وہ جا کر گری۔ بہت روئی پیٹی۔ بڑا فیل مچایا۔"

"اماں جان! یہ آپ نے اچھا نہیں کیا۔" قیصر مرزا نے دبی زبان سے احتجاج کیا۔

"اے تمہیں برا نہ لگے گا تو کسے لگے گا۔ تمہاری تو چہیتی تھی۔ گھر میں ڈال رکھا تھا۔ نت نئے حیلے بہانے بنا کر چھپ چھپ کے اس کے پاس آتے تھے۔" وہ چیخ چیخ کر بولتی رہیں۔ "ہفتوں منہ نہ دکھلاتے تھے۔ اُس چہیتی نے اس طرح پھانس کے رکھا تھا کہ نہ گھر کی فکر نہ باپ کی بیماری کا خیال۔" انھوں نے نفرت سے منہ بگاڑا۔ "میں کہتی ہوں تم کو کوئی اور نہ جُڑی۔ یہی لنگا پھر کاتی پتنگ تو م رہ گئی تھی۔ مجھے تو کوئی دہری وہری لگتی ہے۔ ذرا تو اپنے خاندان کی عزت و وقار کا خیال کیا ہوتا۔"

"آپ تو خواہ مخواہ بدگمانی میں مبتلا ہو گئیں۔ میرا اس سے کیا تعلق۔ وہ تو آغا جانی سے ملنے آئی تھی۔" قیصر مرزا نے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔

"اس موئے لچّے لفنگے کا میرے سامنے نام نہ لو۔ پرلے درجے کا چھا کٹا ہے۔ اس کا تو کام ہی یہ ہے کہ رئیس زادوں اور شریف گھرانوں کے نوجوانوں کو گھیر گھار کر لاتا ہے۔ انہیں عیاشی کے ڈھرّے پر لگاتا ہے۔ خود بھی عیش کرتا ہے۔ کماتا دھماتا خاک نہیں۔ رانڈ کے سانڈ کی طرح اینڈتا پھرتا ہے۔ تمہارے ابا جان مرحوم اس کے کرتوتوں سے خوب واقف تھے۔ تب ہی تو اسے اپنے در پر پھٹکنے نہ دیتے تھے۔ سختی سے منع کر دیا تھا۔ اور تم ہو کہ اس کے بغیر پل بھر کو چین نہیں۔"

قیصر مرزا نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ مگر گلفام کو نہ دیکھا تو پریشان ہو کر دریافت کیا۔ "مندلی کو تو آپ نے نکال دیا مگر گلفام کہاں گیا؟"

"تم اس بچے کے بارے میں پوچھ رہے ہو جسے وہ قتالّمہ گود میں لئے بیٹھی تھی۔" ماں نے

قیصر مرزا کو بتایا۔ "اس موری کے کیڑے کو بھی اس کے ساتھ دفان کر دیا۔ وہ تو بہت انکار کرتی رہی بڑی بچر مچر کی۔ کسی طرح اسے لے جانے پر تیار ہی نہ تھی۔ مگر جب میں نے رسولن کو تاکید کی کہ اس کلنک کے ٹیکے کو اُٹھا کر باہر پھینک دے تب وہ آمادہ ہوئی۔ اسے گود میں اٹھا کر روتی پیٹتی دفان ہو گئی۔"

"اماں جان! آپ کو تو وہم ہو گیا ہے۔ غصے میں کچھ بھی نہ سوچا۔ آپ نے بہت برا کیا۔" قیصر مرزا نے تیکھے لہجے میں اپنے غم و غصے کا اظہار کیا "میرا اس بچے سے کیا تعلق۔ اسے تو آغا جانی لایا تھا۔"

"ارے لڑکے تو مجھے چرانے چلا ہے۔ یہ چونڈا دھوپ میں سفید نہیں کیا۔ زندگی کے بہت نشیب و فراز دیکھے ہیں۔ تمہارے رنگیلے باوا کو بھگتا ہے۔ وہ بھی اپنے وقت کے پیا جانِ عالم تھے۔" ماں اس کی خفگی سے ذرا مرعوب نہ ہوئیں۔ "تمہارا اس بچے سے کوئی تعلق نہ تھا تو کیا آغا جانی کا تھا؟ ایسا گورا چٹا سرخ و سپید بچہ اس کل موہے شیدی کا ہو سکتا ہے۔" انہوں نے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے۔ "ان ہاتھوں میں تم پلے بڑھے ہو۔ تمہارا بچپن میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ اس بچے میں تمہاری شباہت صاف جھلکتی تھی۔ تم میری آنکھوں کو دھوکا نہیں دے سکتے۔" قدرے تامل کے بعد وہ بولیں۔ "آخر ہو کس باپ کے بیٹے۔ اللہ بخشے تمہارے ابا جان کو ان کے بھی یہی لچھن تھے۔ معلوم نہیں کہاں کہاں اپنی جیتی جاگتی نشانیاں چھوڑ گئے۔ تم کو تو یہ کرتوت ورثے میں ملے ہیں۔"

قیصر مرزا نے بہت صفائی پیش کی۔ شک و شبہ دور کرنے کی بہت کوشش کی مگر انہوں نے اس کی ایک نہ مانی۔ اپنی بات پہ اڑی رہیں۔ صاف صاف کہہ دیا۔ "تم کتنا ہی انکار کرو۔ لاکھ صفائی پیش کرو۔ مجھے تمہاری کسی بات کا ذرا اعتبار نہیں۔ اب میں تمہیں یہاں ٹھہرنے نہیں دوں گی۔ ابھی میرے ساتھ چلو اور کبھی پلٹ کر ادھر کا رخ بھی نہ کرنا۔ تم کو بہت ڈھیل دے رکھی تھی لیکن اب تمہاری ایک نہ چلنے دوں گی۔"

"اماں جان! آپ گھر چلیئے۔ میں نہا دھو کر آتا ہوں۔ حجامت بنوا کر آ رہا ہوں۔ جگہ جگہ بال چبھ رہے ہیں۔" قیصر مرزا نے عذر پیش کیا۔ وہ چاہتا تھا کہ ماں کے جاتے کے بعد فوراً مندلی کی تلاش میں لاریوں کے اڈے پر پہنچے۔ مندلی ابھی وہیں ہو گی۔ اس سے ملے۔ ماں کے ہتک آمیز رویے پر اظہار پریشانی کرے۔ سمجھائے بجھائے۔ دل جوئی کرے۔ اس کی ہمدردی حاصل کرنے کی کوشش

کرے۔ دونوں مل جل کر آئندہ کے بارے میں ٹھنڈے دل سے غور کریں۔ کوئی منصوبہ بنائیں مگر ماں نے اس کا کوئی عذر قبول نہ کیا۔ ڈپٹ کر بولیں۔ "نہیں، تم میرے ساتھ ہی چلو گے اور ابھی چلو گے"

"آپ تو چوپہلے میں جا رہی ہیں۔ میں آپ کے ساتھ کیسے جا سکتا ہوں۔" قیصر مرزا نے کٹی کاٹنے کی کوشش کی۔

"تمہارے دادا جان اور ابا جان کو کہیں جانا ہوتا تھا تو چوپہلے اور فینس ہی میں بیٹھ کر آتے جاتے تھے۔ ایک انھی پر کیا منحصر سارے ہی رئیس اور شرفاء سواری کے لئے چوپہلا اور فینس ہی استعمال کرتے ہیں۔ تم کو چوپہلے میں بیٹھنے میں کیوں عار ہے؟" وہ اپنی ہٹ کی پکی تھیں۔ ذرا نہ پسیجیں۔ "تم چلو گے اور میرے ساتھ چوپہلے میں بیٹھ کر چلو گے۔ میں یہ طے کر کے آئی تھی کہ تم کو اپنے ساتھ ہی لے کر جاؤں گی۔ زیادہ بوجھ اٹھانے کیلئے پہلے ہی مزید کہاروں کا بندوبست کر لیا تھا۔ ان کو بتا دیا تھا کہ واپسی میں دُوہری سواری ہوگی۔ رہ گیا تمہارا سامان تو ملازم کو بھیج کر بعد میں منگوا لیا جائے گا۔ تم اس کی مطلق فکر نہ کرو۔ اس وقت تک رسولن یہاں موجود رہے گی۔ آج ہی عشرت منزل خالی کر دی جائے اور مالک مکان کو اس کی اطلاع دے دی جائے گی۔" ان کی باتوں سے صاف اندازہ ہوتا تھا کہ وہ گھر سے پورا منصوبہ بنا کر نکلی تھیں۔

قیصر مرزا نے بہت ہاتھ پاؤں مارے۔ طرح طرح کے حیلے بہانے کئے۔ منت سماجت بھی کی۔ لیکن ماں نے اس کی ایک نہ چلنے دی۔ قیصر مرزا ماں کی ضد کے سامنے مجبور ہو گیا۔ منہ لٹکائے ہوئے اپنے کمرے میں گیا۔ صندوق کھول کر کپڑے اور روپے نکالے جو اس میں رکھے تھے۔ نیچے آیا۔ ماں کے ہمراہ ڈیوڑھی میں پہنچا اور بادل نخواستہ ان کے ساتھ ہی چوپہلے میں بیٹھ گیا۔ کہاروں نے چوپہلا اٹھایا اور ڈیوڑھی سے باہر چلے گئے۔

رسولن وہیں ٹھہر گئی۔ قیصر مرزا پلٹ کر عشرت منزل کو دیکھ بھی نہ سکا جس سے اس کی بہت سی سہانی یادیں وابستہ تھیں۔

(۵)

دیوالی کی چکا چوند گزرتے ہی موسم بدلنے لگا۔ گلابی جاڑا شروع ہو گیا۔ گرم اور اونی کپڑے

لٹتی کو دھوپ دی جاتی لگی۔ دو پہر کا وقت تھا۔ قیصر مرزا امین آباد سے قیصر باغ جا رہا تھا۔ وہ نظیر آباد کی جانب مڑا تو سڑک کے نکڑ پر جوتوں کی ایک دکان نظر آئی۔ دکان نئی تھی اور خاصی نمایاں بھی تھی۔ دکان کے اندر نگاہ پہنچی تو وہ ٹھٹکا۔ اس نے حیرت سے دیکھا آغا جانی گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے سامنے ہی بیٹھا تھا۔ اب اس میں بہت تبدیلی آ گئی تھی۔ صحت مند اور موٹا تازہ ہو گیا تھا۔ توند بھی نکل آئی تھی۔ گال بھر گئے تھے۔ چہرے پر فارغ البالی کی رونق تھی۔

اس وقت وہ دکان میں تنہا تھا۔ اس نے مڑ کر قیصر مرزا کی جانب دیکھا تو چہرے کا رنگ بدل گیا۔ گھبراہٹ طاری ہو گئی۔ فوراً نظریں چرانے کی کوشش کی۔ قیصر مرزا نے اس کی بے اعتنائی محسوس کی۔ مگر جھجکا نہیں۔ بے دھڑک دکان کے اندر داخل ہو گیا۔ آغا نے اسے سامنے پایا تو اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے جھٹ پینترا بدلا۔ گرم جوشی کا مظاہرہ کیا۔ دونوں ہاتھ پھیلا کر اونچی آواز سے گویا ہوا۔ "ارے! قیصر مرزا تم!" اس نے قیصر مرزا کو بازوؤں میں بھینچ کر پیٹھ تھپ تھپائی اور شکوہ کرنے لگا۔

"اماں تم تو عید کا چاند بن گئے۔ تمہاری صورت دیکھنے کو ترس گئے۔" اس نے حیرت کا اظہار کیا۔ "مگر تم آج ادھر کیسے بھول پڑے؟"

"عید کا چاند میں بن گیا کہ تم؟" قیصر مرزا کے رویے میں گرم جوشی نہ تھی، گلہ تھا۔ "ایسے چپ چپاتے گئے کہ پلٹ کر ادھر کا رخ بھی نہ کیا۔ یہ بھی معلوم کرنے کی کوشش نہ کی کہ تمہارے جانے کے بعد مجھ پر کیا بیتی۔"

"خیریت تو ہے۔ تم پر کیا افتاد پڑی؟"

"نہ پوچھو کیا کیا نہ بیتی۔" قیصر مرزا نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

عین اس وقت ایک نوجوان ملازم ہاتھ میں ٹفن کیریئر لٹکائے دکان میں داخل ہوا۔ آغا جانی نے مڑ کر اس کی جانب دیکھا۔ مسکرا کر بولا۔ "بھئی جمن۔ تو اس وقت بہت موقع سے کھانا لے کر آیا۔ فوراً جا کر کھانا لگا۔" اُس نے قیصر مرزا کی جانب اشارہ کیا۔ "قیصر مرزا بھی میرے ساتھ ہی کھانا کھائیں گے۔ کھانا کم ہو تو بازار سے جا کر کچھ لے آ۔" اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔

"کھانا کم نہیں پڑے گا۔ دونوں کے لئے کافی ہو گا۔" جمن نے اسے اطمینان دلایا اور

ٹفن کیریئر سنبھالے ہوئے دکان کے عقبی حصّے کی جانب چلا گیا۔

"تم خواہ مخواہ تکلف نہ کرو۔" قیصر مرزا نے کہا۔ "بھوک بھی نہیں ہے اور مجھے ایک ضروری کام سے قیصر باغ جانا ہے۔"

"اماں چلے جانا۔ ایسا بھی کیا ضروری کام ہے۔" آغا جانی نے اصرار کیا۔ "ایک مدت کے بعد ملے ہو۔ ساتھ بیٹھ کر کھانا کھائیں گے اور اطمینان سے بات بھی کریں گے۔"

آغا جانی نے قیصر مرزا کا ہاتھ پکڑا اور اس کے ساتھ ساتھ اس جانب چلا جدھر جمن گیا تھا۔ قریب جا کر قیصر مرزا نے دیکھا کہ دکان کے پچھلے حصّے میں ایک الگ تھلگ گوشہ تھا۔ وہاں لکڑی کی ایک خاصی چوڑی چکلی چوکی پڑی تھی۔ اس پر چھپا ہوا دسترخوان بچھا تھا۔ جمن نے کھانا چن دیا تھا۔ کھانے میں چپاتیوں کے علاوہ قورمہ تھا۔ بھنڈی کی بھجیا تھی۔ ارہر کی دال تھی۔ ایک پیالی میں ہرے دھنیے کی چٹنی تھی۔

جمن سلفچی لے آیا۔ قیصر مرزا اور آغا جانی کے سامنے سلفچی رکھ کر لوٹے سے ہاتھ دھلائے۔ دونوں نے ہاتھ پونچھے اور دسترخوان پر جا کر بیٹھ گئے۔

قیصر مرزا نے نوالہ بنا کر منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔ "ذائقے سے تو کھانا گھر کا پکا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ کہاں سے آیا؟"

"اماں آئے گا کہاں سے۔ گھر ہی سے آیا ہے۔" آغا جانی نے مسکرا کر بتایا۔ "تمہاری بھابی نے پکا کر بھیجا ہے۔"

"اچھا تو تم نے شادی بھی کر لی۔" قیصر مرزا نے حیرت زدہ ہو کر دریافت کیا۔ "کہاں کی؟"

"ممانی کی بڑی بیٹی کے ساتھ۔ اب تو شادی ہوئے تین مہینے سے اوپر ہو گئے۔" آغا جانی کے چہرے پر مسرت کی سرخی دوڑ گئی۔ باچھیں کھلی جا رہی تھیں۔ "سچ پوچھو تو زندگی کا لطف اب آیا ہے۔ بازار کا کھانا کھاتے کھاتے پیٹ خراب ہو گیا تھا۔ آئے دن کوئی نہ کوئی تکلیف رہتی تھی۔ اب دونوں وقت گھر کا پکا ہوا کھانا ملتا ہے۔ دوپہر کو تو دکان ہی پر کھاتا ہوں۔ مگر رات کو جب تک گھر نہ پہنچوں وہ کھانے کو ہاتھ نہیں لگاتیں۔ میرے انتظار میں بیٹھی رہتی ہیں۔ گھر دیکھو تو دل خوش ہو جائے۔ صاف ستھرا۔ آئینے کی طرح جھلکتا ہوا۔ صبح سو کر اٹھو تو منہ ہاتھ دھونے

کے لئے آفتابے میں گرم پانی موجود۔ صابن اور منجن قریب رکھا ہوا۔ کھونٹی پر اجلا تولیا لٹکا ہوا ناشتے میں کسی روز روغنی روٹی اور بالائی، کبھی پراٹھے اور تلا ہوا انڈہ۔ کبھی شیرمال، کبھی باقرخانی۔ تم سے کیا کیا بتاؤں۔ زندگی بھر تو جھک مارتے گزری۔ کیا کیا پاپڑ نہ بیلے۔ اب جا کر ذرا آرام نصیب ہوا ہے۔"

"معلوم ہوتا ہے تمہارے گھر میں سے بڑی سگھڑ اور سلیقہ مند ہیں۔"

"انہیں تو ہر وقت کام کی دُھن رہتی ہے۔ مزاج میں نفاست اتنی ہے کہ تم سے کیا بتاؤں۔ اللہ نے صورت شکل بھی اچھی دی ہے۔ سنگھار کر کے بیٹھتی ہیں تو کسی محل سرا کی بیگم معلوم ہوتی ہیں۔" آغا جانی کو بیوی کی تعریف اور توصیف کرنے میں لذّت محسوس ہو رہی تھی۔ "کسی روز تم کو گھر لے چلوں گا۔ پلاؤ کھلواؤں گا۔ بہت عمدہ پکاتی ہیں۔"

"دیکھو اب ملاقات کب ہوتی ہے؟"

"اماں دکان تو تم نے دیکھ ہی لی ہے۔ آتے رہنا۔"

"تم نے میرے ساتھ داؤں اچھا کیا۔" قیصر مرزا جو بہت دیر سے ضبط کئے بیٹھا تھا اچانک پھٹ پڑا۔ "ایسی چوٹ دی کہ اُف بھی نہ کر سکا۔ میرے تو وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ تم میرے ساتھ ایسا ہاتھ کر سکتے ہو۔ خوب چونا لگایا۔"

"اماں، تم کو بیٹھے بٹھائے یہ ہو کیا گیا؟" آغا نے آنکھیں پھاڑ کر حیرت کا اظہار کیا۔ "کیسی الٹی سیدھی باتیں کر رہے ہو؟"

"میرے صندوق سے طلعت آرا کے زیورات اٹھا کر لے گئے اور اب کہتے ہو کیسی الٹی سیدھی باتیں کر رہا ہوں۔" قیصر مرزا نے اس دفعہ کھل کر بات کی۔ "برسوں کی دوستی کا ذرا لحاظ نہ کیا۔ ایسی صفائی سے کام کیا کہ میں تو سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ تم ایسا بھی کر سکتے ہو۔"

"طلعت آرا کے زیورات! اماں میرا ان سے کیا تعلق۔" آغا نے انجان بننے کی کوشش کی۔ وہ اس الزام کا جواب دینے کے لئے خود کو پہلے ہی ذہنی طور پر تیار کر چکا تھا۔ "وہ تمہارے پاس تھے ہی کب۔ زیورات تو تم نے رانی صاحبہ مرحومہ کو دیدئے تھے۔ تم نے خود مجھے یہی بتایا تھا۔ یاد کرو یہی بتایا تھا نا۔"

"بتایا تو یہی تھا۔ مگر میں حیدر گڑھ جاتے وقت ان کو لے جانا بھول گیا تھا۔" قیصر مرزا نے وضاحت کی۔ "وہ ایک رومال میں بندھے ہوئے میرے صندوق میں رکھے تھے۔"

"میں تمہاری کس بات پر یقین کروں۔ کبھی کچھ کہتے ہو کبھی کچھ۔" آغا نے قیصر مرزا کو جھٹلانا چاہا۔ "اور یہ کیا ضروری ہے کہ میں ہی زیورات لے گیا۔ کوئی بھی ایسی واردات کر سکتا ہے۔ گھر تو کئی کئی روز خالی پڑا رہتا تھا۔"

"تمہارے سوا کوئی اور یہ واردات کر ہی نہیں سکتا۔" قیصر مرزا نے لہجے میں اعتماد پیدا کرتے ہوئے کہا۔ "یہ اسی رات کا ذکر ہے جب تہہ خانے میں تم سے گرما گرمی اور جھک جھک ہوئی تھی۔ تمہارے پاس آنے سے پہلے میں نے صندوق کھول کر دیکھا تھا۔ اس وقت زیورات موجود تھے۔ دوسرے روز دیکھا تو غائب تھے۔ کسی اور کے لے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"ہاں کوئی بھی لے گیا۔ کالا چور اٹھا کر لے گیا۔ تم ان کے لئے اب پریشان کیوں ہو؟ تم نے ان کو اپنا سمجھا ہی کب۔ میں نے منع بھی کیا مگر تم نے میری ایک نہ سنی۔ تم تو انہیں رانی صاحبہ یا طلعت آرا کو دینے پر تلے ہوئے تھے۔" آغا نے ڈھیٹ بن کر کہا۔ "مان لو میں زیورات لے گیا تو کون سا جرم کیا۔"

"تم نے یہ اچھا نہیں کیا۔" قیصر مرزا نے تلخی کا اظہار کیا۔ "بہت خود غرضی کی۔"

"خود غرضی میں نے کی یا تم نے؟" آغا نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ "تم کو یہ گوارہ تھا کہ رانی صاحبہ یا طلعت آرا ان کو لے جائیں اور میں جسے تم اپنا دوست کہتے ہو اگر ان کو لے گیا تو تم کو بڑا غم ہے۔ رانی صاحبہ یا طلعت آرا کو مل جاتے تو ان کے کیا کام آتے۔ اللہ نے ان کو اتنا بہت سا دیا ہے کہ وہ چند زیورات کی کیا پروا کرتیں۔ کسی توشہ خانے میں یا تجوری میں پڑے رہتے۔"

"مگر تم نے ان کا کیا کیا؟" قیصر مرزا لاجواب ہو کر بولا۔

"یہ دکان دیکھ رہے ہو۔ یہ انہی زیورات کی رقم سے کھلی ہے۔" آغا جانی نے صاف گوئی سے کام لیا۔ "تم نے تو دفینہ حاصل کرنے کا آخری موقع بھی ضائع کرا دیا۔ میرے لئے تو سچ پوچھو یہ زیورات ہی دفینہ ثابت ہوئے۔ میں انہیں لے کر سیدھا لکھن لکھن جی کے مرکنے پہنچا۔ صراف نے نو ہزار آنکے۔ میں نے اس سے کچھ مول تول کیا تو ساڑھے نو ہزار دینے پر راضی ہو گیا۔ میں نے رقم سنبھالی اور چمانی

کے پاس پہنچا۔ روپیہ تو سب ان کے پاس رکھوا دیا مگر اب یہ فکر سوار ہوئی کہ ان کا کیا کیا جائے۔ تم جانتے ہو کہ مجھے تو صرف جوتے بنانے کا ہنر آتا ہے۔ سوچا اس روپے سے جوتے بنانے کا کارخانہ کھول لوں۔ اسی سلسلہ میں حاجی چھتن سے ملاقات ہو گئی۔ وہ ان دنوں اس دکان کا سوداگر رہا تھا۔ اس میں وہ جوتوں کی دکان کھولنا چاہتا تھا۔ مگر اس کے لئے جتنی رقم کی ضرورت تھی وہ اس کے پاس نہ تھی۔ اس نے اپنی پریشانی کا مجھ سے ذکر کیا تو میں نے اس سے کہا۔ میرے ساتھ شراکت کر لو۔ وہ فوراً راضی ہو گیا۔ کارخانے میں بھی اس کے ساتھ ساجھے دار بن گیا۔"

آغا جانی اطمینان سے بولتا رہا۔ قیصر مرزا کھانا کھاتا رہا اور خاموشی سے اس کی باتیں سنتا رہا۔

"میں نے پورے ساڑھے نو ہزار روپے دے کر برابر کی شراکت کر لی۔ اب کارخانے کی دیکھ بھال حاجی چھتن کرتا ہے۔ دکان پر میں بیٹھتا ہوں۔"

"اور وہ جو تم دو ہزار میں سے ایک ہزار صندوق سے نکال کر لے گئے ان کا کیا کیا؟"

"ان سے شادی کر لی۔" آغا نے ہنس کر بتایا۔

"یہ ہزار روپے تم کو نہیں لینا چاہیئے تھے۔" قیصر مرزا نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "تم نے بہت برا کیا۔"

"کیا برا کیا۔ اماں اس میں تو آدھا ساجھا تھا۔ یہی طے ہوا تھا۔ بلکہ تم نے زیادہ ہی روپیہ لیا۔ میں نے تو دوستی کا حق ادا کیا۔ تمہارے لئے آدھی رقم چھوڑ دی۔ سب لے جاتا تو میرا کیا بگاڑ لیتے۔"

قیصر مرزا اس کا منہ دیکھتا رہ گیا۔

☆

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد آغا جانی نے چھمن کو بلایا۔ اسے ایک آنہ دے کر پان لانے کے لئے تنبولی کی دوکان پر بھیجا۔ چھمن چلا گیا تو آغا نے قیصر مرزا سے پوچھا۔ "جانتے ہو یہ چھمن کون ہے؟"

"مجھے کیا معلوم کون ہے۔" قیصر مرزا نے بے نیازی سے کہا۔ "میں نے تو اسے پہلی بار دیکھا ہے۔"

"یہ تمہاری معشوقہ طلعت آرا کا سوتیلا بھائی ہے۔"

"اماں نہیں۔" قیصر مرزا نے آغا جانی کی بات پر اعتبار نہیں کیا۔ "کیا بے پر کی اڑا رہے ہو۔"

"میں تم سے بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔"

"کیا سچ کہہ رہے ہو؟" قیصر مرزا نے بے زاری سے کہا۔ "تم کو طلعت آرا اور اس کے خاندان کے بارے میں کچھ خبر بھی ہے۔ طلعت آرا کے والد، نواب تقی نے صرف ایک ہی شادی کی تھی اور وہ طلعت آرا کی والدہ، حضور بیگم ہیں۔ جب ان کی کوئی دوسری بیوی ہی نہ تھی تو یہ طلعت آرا کا سوتیلا بھائی کہاں سے آگیا؟" قیصر مرزا نے ناگواری سے منہ بگاڑا۔ "خواہ مخواہ بے چاری طلعت آرا اور اس کے خاندان کو ملعون کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔ میں طلعت آرا اور اس کے خاندان سے بہت اچھی طرح واقف ہوں۔" اس نے تیکھی نظروں سے آغا جانی کو دیکھا۔ "ایسی باتیں کر کے تم مجھ پر یہ رعب جمانا چاہتے ہو کہ طلعت آرا کا بھائی تمہارا ایک معمولی ملازم ہے۔ آغا جانی! تم اس طرح رئیس زادے نہیں بن جاؤ گے۔ کہلاؤ گے موچی۔"

"اماں تم تو بلاوجہ ہتھوں سے اکھڑ گئے۔" آغا جانی نے برہمی کا اظہار نہ کیا۔ نرم لہجے میں کہا۔ "واللہ! میں تم سے بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔ مجھے تو یہ بات میر نصیر نے بتائی ہے۔"

"تم نے بھی کس لپاڑیئے کی بات کا یقین کر لیا۔"

"یہ تو تم کو بھی علم ہے کہ میر نصیر برسوں نواب تقی کی سرکار سے وابستہ رہا ہے۔ بلکہ ان کا ایسا معتمد تھا کہ نواب صاحب بغیر اس کے مشورے کے کوئی کام نہ کرتے تھے۔" آغا نے سنبھلے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میر نصیر بتاتا تھا کہ جمن کی ماں دلاری ایک زمانہ میں نواب صاحب کی پیش خدمت تھی۔ جوان تھی اور صورت شکل بھی اچھی تھی۔ نواب صاحب کا اس پر دل آگیا۔ تعلقات پیدا ہو گئے۔ دلاری حاملہ ہو گئی تو نواب صاحب کے حکم پر میر نصیر اسے گاؤں لے گئے۔ وہیں چپ چپاتے جمن پیدا ہوا۔"

"بھئی مجھے تو یقین آتا نہیں۔" قیصر مرزا نے بے رخی سے کہا۔ "مگر تم مجھے یہ باتیں کیوں بتا رہے ہو؟"

"تم کو یہ بھی خبر ہے کہ جائیداد کے بٹوارے کے سلسلے میں نواب صفی کی طلعت آرا کے خاندان سے مقدمہ بازی ہو رہی ہے اور اس وقت سے ہو رہی ہے جب نواب تقی حیات تھے۔ عدالت دیوانی سے مقدمہ خارج ہو گیا تو انہوں نے اس فیصلے کے خلاف چیف کورٹ میں اپیل دائر کر دی مگر ان کے مقدمے میں جان نہیں۔" قیصر مرزا خاموش بیٹھا اس کی باتیں سنتا رہا۔ آغا جانی نے مسکرا کر

کہا۔" اب میں تم کو اصل بات بتاتا ہوں جس کے لئے میں نے جمن کا ذکر چھیڑا تھا۔ نواب صفی کو جب یہ معلوم ہوا کہ جمن دراصل نواب تقی کا بیٹا ہے تو انہوں نے حق وراثت کے لئے جمن کی طرف سے مقدمہ لڑنے کا منصوبہ بنایا۔ دلاری کو بلایا۔ جمن کا سرپرست بننے کے لئے وہ تو دلاری سے متعہ کرنے کا بھی ارادہ رکھتے ہیں۔"

"مگر مجھے تو طلعت آرا نے ایک بار بتایا تھا کہ دلاری نے مشاطہ کا پیشہ اختیار کر لیا ہے۔ وہ طلعت آرا کے لئے ایک پیغام بھی لائی تھی۔"

"یہ تو مجھے معلوم نہیں اور میرا خیال ہے میر نصیر کو بھی نہیں معلوم۔ ورنہ وہ مجھ سے اس کا تذکرہ ضرور کرتا۔" آغا جانی نے قیصر مرزا کو مطلع کیا۔" البتہ میر نصیر نے میونسپلٹی کے دفتر سے جمن کی پیدائش کا سرٹیفکیٹ نکلوا لیا ہے۔ جس میں جمن کا اصلی نام اختر حسین لکھا ہے اور ولدیت کے خانے میں نواب تقی کا نام درج ہے۔"

"یہ سرٹیفکیٹ جعلی ہے یا اصلی؟"

"معلوم نہیں کیسا ہے۔ میر نصیر تو اصلی بتاتا ہے۔ ویسے اس نے مقدمے کی تیاری کے لئے اور بھی دستاویز حاصل کر لی ہیں۔ گواہ بھی مہیا کر لئے ہیں۔" آغا جانی نے مسکرا کر کہا۔" یار میر نصیر بڑی چلتی رقم ہے۔ اس نے مقدمہ بہت مضبوط تیار کیا ہے۔ نواب صفی کسی طرح حضور بیگم کو چین سے نہیں بیٹھنے دیں گے۔"

"وہ کچھ بھی کر لیں۔ اس مقدمے میں بھی کچھ نہیں ہوگا۔" قیصر مرزا برابر طلعت آرا اور اس کے خاندان کی طرف داری کرتا رہا۔" پہلے بھی انہوں نے اتنے مقدمے دائر کئے۔ مگر کیا اکھاڑ لیا۔ ایک میں بھی کامیابی نہ ہوئی۔ مجھے تو ایسا نظر آتا ہے کہ جمن بے چارہ جمن ہی رہے گا۔ نواب اختر حسین نہیں بن سکے گا۔"

"اماں یہ نہ کہو۔ یہ مقدمے بازی ہے۔ اس میں پانسہ پلٹتے دیر نہیں لگتی۔" آغا جانی نے قیصر مرزا سے اتفاق نہ کیا۔" تم نے نواب پھلکی قدر کا نام تو سنا ہوگا۔"

"ان کا نام کس نے نہیں سنا۔ مگر نواب ثریا قدر اور سلیمان قدر تو خاندانی رئیس کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ یہ نواب پھلکی قدر کیا شے ہیں؟"

"اماں ان کا تعلق بھی شاہی خاندان سے تھا۔ جب وہ جمن کی عمر کے تھے تو ایسا کڑا وقت پڑا کہ پیٹ پالنے کے لئے پھلکیاں بنا کر نخاس میں خوانچہ لگاتے تھے۔" آغا جانی نے قیصر مرزا کو بتایا۔" ایک رئیس مہربان ہو گئے۔ ان کی طرف سے مقدمہ لڑا اور مقدمہ جیت بھی گئے۔ جائیداد واگزار ہوئی اور وثیقہ بحال ہوا تو انھوں نے پھلکیوں کا خوانچہ بڑھایا، محل سرا آباد کی اور رئیسوں کی طرح رہنے لگے۔ مگر پھلکی قدر ان کے نام کے ساتھ ایسا چسپاں ہوا کہ ابھی تک نواب پھلکی قدر کہلاتے ہیں۔"

"مگر سوال یہ ہے کہ نواب صفی بے چارے جمن پر کیوں مہربان ہو گئے؟"

"اماں بات دراصل یہ ہے کہ نواب صفی اتنا قرض ادھار لے چکے ہیں کہ جائیداد کب کی نیلام ہو چکی ہوتی۔ مگر جب تک مقدمہ چل رہا ہے ایسی کارروائی نہیں ہو سکتی۔ وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ کسی نہ کسی طور مقدمے بازی کا سلسلہ چلتا رہے اور یہ سارے حربے میر نصیر انہیں سجھا رہا ہے۔ یار وہ بہت اونچی شے ہے۔ تم اُسے نہیں جانتے۔"

"لیکن نواب صفی نے جمن کی طرف سے ابھی تک مقدمہ دائر کیوں نہیں کیا؟"

"کچھ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ مقدمے کی پوری طرح تیاری نہیں ہوئی۔ دوسری طرف نواب صفی کی مالی حالت آج کل بہت پتلی ہے۔ کوئی مہاجن تو انہیں اب قرض دینے سے رہا۔ پہلے ہی انھوں نے بہت قرض لے رکھا ہے۔ میر نصیر بتاتا تھا کہ نواب صفی اپنے کسی عزیز سے مالی امداد لینے کلکتے گئے ہیں۔ اگر رقم کا بندوبست ہو گیا تو جمن کی طرف سے فوراً مقدمہ دائر کر دیں گے۔"

"میرا تو خیال ہے کہ وہ قرض خواہوں سے منہ چھپانے کے لئے کہیں روپوش ہو گئے ہیں۔"

"بھئی میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ مجھے تو میر نصیر نے جو کچھ بتایا وہ بیان کر دیا۔"

"اچھا یہ بتاؤ کہ یہ جمن تمہارے پاس کیسے پہنچ گیا؟"

"میر نصیر ہی نے اسے میرے پاس ملازم رکھوایا ہے۔" آغا نے قیصر مرزا کو بتایا۔

"تب تو میرا قیاس درست ہے۔ اگر نواب صفی مقدمہ دائر کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں تو وہ جمن کو اپنے پاس رکھتے۔ تمہارے پاس وہ ملازمت کیوں کرتا؟ میر نصیر کسی طرح نواب صفی کی مرضی

کے بغیر ایسا قدم نہیں اٹھا سکتے۔ غلط کہہ رہا ہوں میں؟"

"بات تو تمہاری دل لگتی معلوم ہوتی ہے۔" آغا جانی نے قیصر مرزا کی رائے سے اختلاف نہ کیا۔ "حقیقت کیا ہے یہ تو میر نصیر بتا سکتا ہے یا نواب صفی۔ مگر جمن کے بارے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ لڑکا سیدھا سادا ہے اور بہت محنتی ہے۔ کسی کام میں اسے عذر نہیں۔" آغا جانی بے تکلفی سے مسکرانے لگا۔ "اماں نواب چھلکی قدر کی طرح کبھی اس کی قسمت نے بھی یاوری کی اور وہ جائیداد کا مالک بن گیا تو کام ہی آئے گا۔ لحاظ کرے گا۔"

☆

جمن پان لے کر واپس آگیا۔ آغا جانی نے ایک پان قیصر مرزا کو پیش کیا۔ ایک اپنے منہ میں رکھا۔ جمن دوکان کے عقبی حصے میں جا کر کھانے کے برتن اٹھانے لگا۔

آغا نے پوچھا۔ "اماں قیصر مرزا اس بچے کا کیا حال ہے جسے میں تمہارے پاس چھوڑ گیا تھا؟"

"نہ پوچھو اس کی وجہ سے کتنی پریشانی اٹھانا پڑی۔" قیصر مرزا نے شکوہ کیا۔ "تم تو اسے چھوڑ کر غائب ہو گئے اور میں قیدی بن کر رہ گیا۔ اسے اکیلا چھوڑ کر کہیں جا بھی نہ سکتا تھا۔" اس نے قدرے توقف کے بعد آغا جانی کو مطلع کیا۔ "جس روز تم گئے اسی روز رات کو طلعت آرا آگئی۔ اس کے ساتھ مندلی بھی تھی۔"

"یہ مندلی کون ہے؟"

"پہلے وہ رانی صاحبہ مرحومہ کی ہمراز خواص تھی۔ اب طلعت آرا سے بھی اتنی ہی قریب ہے۔"

"مگر طلعت آرا عشرت منزل کیسے آئی تھی؟" آغا نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔ "تم سے ملنے آئی تھی؟"

"نہیں، اپنے بچے کو دیکھنے۔" قیصر مرزا نے بتایا۔ "وہ بچہ جسے تم میرے پاس چھوڑ گئے تھے اسی کا ہے۔"

"اماں نہیں! یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ تو نجو کا بچہ ہے۔" آغا نے حیرت زدہ ہو کر اپنے

ردِ عمل کا اظہار کیا۔" اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ شادی کے بعد طلعت آرا کے کوئی اولاد ہی نہیں ہوئی۔ اور ہوتی بھی تو وہ اسے کسی کو کیسے دے سکتی ہے۔"

"وہ شادی سے پہلے پیدا ہوا تھا۔"

" اچھا تو یہ بات ہے۔" آغا جانی فوراً بات کی تہہ تک پہنچ گیا۔" تو یوں کہو کہ وہ تمہارا بیٹا ہے۔ مگر طلعت آرا تو تم کو دیکھ کر کشش و پیچ میں پڑ گئی ہوگی۔ وہ تو تمہیں شہزادہ گل رخ کی حیثیت سے جانتی تھی۔"

قیصر مرزا نے اسے تفصیل سے پوری بات بتائی اور یہ بھی بتایا کہ طلعت آرا دوبارہ نہیں آئی۔ البتہ اس نے صندلی کو بھیجا تھا۔ وہ اپنے بچے کے لئے بہت پریشان تھی۔ اس کی خواہش ہے کہ صندلی کی شادی کر دے اور بچہ اس کے پاس رہے۔ اس کی پرورش کے لئے وہ تاحیات پانچ سو روپے مہینہ مقرر کرنا چاہتی ہے۔

آغا جانی نے اس کی پوری بات بھی نہ سنی۔ فوراً دخل دیا۔" اماں صندلی ہے کیسی؟"

" رنگ تو اس کا دبا ہوا ہے۔ مگر ناک نقشہ ایسا سجل کہ ہزاروں میں ایک ہے۔" قیصر مرزا نے ذرا دھیمے لہجے میں کہا۔" رانی صاحبہ مرحومہ کی اس میں شباہت صاف جھلکتی ہے۔ میرے پاس رانی صاحبہ کی جوانی کی ایک تصویر ہے۔ وہ تصویر رکھ دو اور سامنے صندلی کو بٹھا دو۔ جو دیکھے گا فوراً پہچان لے گا۔ دراصل وہ انہی کی بیٹی ہے۔ رانی صاحبہ نے شادی بیاہ تو کیا نہیں تھا بدنامی کے ڈر سے اسے نذیر خاں ڈرائیور کو دے دیا تھا۔ اس کی کوئی اولاد بھی نہ تھی۔"

" اماں، یہ تم آج کیا کیا عقدہ کشائیاں کر رہے ہو۔" آغا جانی نے حیرت کا اظہار کیا ساتھ ہی یہ مشورہ دیا۔" میں تو کہتا ہوں۔ تم فوراً صندلی سے شادی کر لو۔ پانچ سو روپے مہینہ گھر بیٹھے ملے گا۔ بہت آرام سے زندگی بسر ہوگی۔ پانچ سو روپے بہت ہوتے ہیں اور سو باتوں کی ایک بات یہ کہ ایسی خوبصورت بیوی کے ساتھ ساتھ بیٹا بھی تمہارے پاس ہی رہے گا۔ کسی وکیل سے مشورہ کر کے دیکھو۔ صندلی تو ریاست حیدر گڑھ کی دعویدار بھی ہو سکتی ہے۔ اصلی وارث تو وہ ہے۔ نذیر خاں اور اس کی بیوی تو گواہی کے لئے موجود ہی ہیں۔ تلاش کرو گے تو اور بھی گواہ مل جائیں گے۔"

"تم نہ جانے کیا اناپ شناپ ہانکنے لگے۔" قیصر مرزا نے بے زاری سے کہا۔ "اماں جان نے معاملہ ہی تلپٹ کر دیا۔ وہ میری غیر موجودگی میں اچانک عشرت منزل پہنچ گئیں۔ صندلی موجود تھی۔ اسے دیکھتے ہی ایسی غضبناک ہوئیں کہ خادمہ سے دھکے دلوا کر نہایت ذلت کے ساتھ گھر سے نکال دیا۔ تب سے وہ نظر نہیں آئی۔"

"یہ تو بہت برا ہوا۔ گھر آئی لچھمی کو نکال دیا۔" آغا نے اظہار تاسف کیا۔ "مگر وہ بچہ تو تمہارے ہی پاس ہے؟ وہ بھی کم قیمتی نہیں۔ جب تک وہ تمہارے پاس ہے۔ طلعت آرا تمہارے قابو میں ہے۔ جتنی رقم چاہے اس سے اینٹھ سکتے ہو۔ بچے کی خاطر نہ سہی بدنامی کے ڈر سے دے گی۔"

"مگر اماں جان نے صندلی کے ساتھ اسے بھی نکال دیا۔" قیصر مرزا نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "صندلی تو اُسے لے جانا نہ چاہتی تھی۔ لیکن اماں جان نے اسے بھی صندلی کے ساتھ بھیج دیا۔"

"ہائے ہائے! کیا غضب کر دیا۔" آغا جانی بے قرار ہو کر دونوں ہاتھوں سے اپنے زانو پیٹنے لگا۔ "یارو، انھوں نے تم پر بڑا ستم ڈھایا۔" اس نے قدرے تامل کے بعد پوچھا۔ "بہر حال جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا۔ یہ بتاؤ اب بچہ کہاں ہے؟"

"میرا خیال ہے وہ صندلی کے پاس ہو گا۔" قیصر مرزا نے قیاس آرائی کی۔ "طلعت آرا بدنامی کے ڈر سے اسے ساتھ تو رکھے گی نہیں۔"

"تم کسی طرح بچہ حاصل کرنے کی کوشش کرو۔" آغا جانی نے تجویز پیش کی۔ "ایسا کرو تم جلد سے جلد صندلی سے ملنے کی کوشش کرو۔ ابھی وہ حیدر گڑھ ہی میں ہو گی۔ تمہاری والدہ کی زیادتی سے اسے جو صدمہ پہنچا ہے اسے کسی نہ کسی طرح رفع کرو۔ اس سے شادی کرنے کا وعدہ کرو۔ اگر وہ مان گئی تو سمجھو پو بارہ ہیں۔"

"میں تو صندلی سے ملنا چاہتا ہوں۔ برابر اس کے بارے میں سوچتا رہتا ہوں۔ مگر سوال یہ ہے کہ اس سے ملا کیسے جائے۔" قیصر مرزا نے اپنی مجبوری بیان کی۔ "وہ حیدر گڑھ میں ہے اور بغیر کسی وسیلے کے حیدر گڑھ جانے سے کچھ حاصل نہ ہو گا۔"

"اس کا بندوبست میں کر دوں گا۔ تم اس کی فکر نہ کرو۔" آغا نے مسکرا کر بتایا۔ "اماں تم کو

یہ نہیں معلوم۔ طلعت آرا اپنی جوتیاں اور گرگابیاں حاجی چھٹن کے کارخانے سے بنواتی ہے۔ کام تو بڑا فینسی بنواتی ہے مگر منہ مانگے دام دیتی ہے۔ حاجی چھٹن اس کے پیر کی ناپ لینے خود جاتے ہیں۔" وہ اپنی بات کہتے کہتے چونکا۔" خوب یاد آیا۔ وہ آئندہ اتوار کو آڈر پر تیار کی ہوئی جوڑیاں پہنچانے حیدرگڑھ جا رہے ہیں۔ طلعت آرا کے پیر کی ناپ بھی انہیں لینا ہے۔ میں تم کو ان کے ساتھ بھیج دوں گا۔ وہ نذیر خاں ڈرائیور کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ وہ تم کو صندلی سے ملوا دیں گے۔"

"اور جو کہیں طلعت آرا سے آمنا سامنا ہو گیا۔" قیصر مرزا نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

"تو کیا ہوگا؟" آغا نے بے نیازی سے کہا۔" زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ وہ تمہیں دیکھ کر ڈر جائے گی۔ وہ تو یہی سمجھتی ہے کہ تم شاہ جن کے ولی عہد، شہزادہ گل رخ ہو اور پرستان سے آتے ہو۔"

"معلوم نہیں کہ وہ ابھی تک اسی مغالطے میں ہے کہ نہیں۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ آخری بار جب عشرت منزل میں اچانک مڈبھیڑ ہو گئی تو وہ مجھے دیکھ کر خوف سے لرزہ براندام ہو گئی تھی۔"

"بالکل ہو گئی ہوگی۔ اگر صندلی نے تمہارے بارے میں کچھ بتایا بھی ہوگا تب بھی وہ یقین نہیں کرے گی۔" آغا جانی نے قیصر مرزا کے خدشات دور کرنے کی کوشش کی۔" اماں میں نے اس پر ایسا رنگ جمایا ہے کہ اس کا اُترنا آسان نہیں۔ یاد کرو اس کے لئے کیا کیا جتن کرنا پڑے۔ کس کس طرح سے ایکٹنگ کی۔ تمہاری ایسی ہیبت بٹھائی ہے کہ اس کے طلسم سے اب تک نہ نکل سکی ہوگی۔" اس نے گہری سانس بھری۔" وہ بھی کیا دن تھے۔ طلعت آرا ڈری سہمی بستر پر بیٹھی ہوتی اور میں اس کے سامنے میک اَپ کئے، خوفناک چہرہ بنائے کھڑا ہوتا۔ اِدھر گھڑیال ٹن ٹن بارہ بجے کا گجر بجاتا اُدھر تم دیوار پھاند کر بارہ دری کی چھت پر پہنچتے۔ ہر طرف عود و عنبر کی خوشبو پھیلنے لگتی۔ میں آواز میں گھرج پیدا کر کے اعلان کرتا۔ صاحب عالم شہزادہ گل رُخ تشریف لا رہے ہیں۔ غلام ان کی پیشوائی کے لئے باہر جا رہا ہے۔ طلعت آرا اس وقت بالکل سہمی ہوئی کبوتری معلوم ہوتی۔ آنکھوں میں خوف۔ چہرے پر گھبراہٹ۔"

"اماں، تم کب تک بیتے دنوں کا رونا روتے رہو گے۔" قیصر مرزا نے اکتا کر آغا جانی کو ٹوکا۔ "کچھ کام کی بات کرو۔ یہ بتاؤ حاجی چھٹن سے کب ملاقات ہوگی تاکہ اتوار کو ان کے ہمراہ حیدرگڑھ

جانے کی تیاری کی جائے۔"

"تم اس کی بالکل فکر نہ کرو۔ حاجی میرا پارٹنر ہے۔ جو کہوں گا وہی کرے گا۔ وہ روزانہ شام کو کارخانے سے اٹھ کر دکان پر آتا ہے۔ تم ہفتے کی شام کو یہاں آجاؤ۔ اس سے ملاقات ہو جائے گی۔ وہ تمہیں نذیر خاں ڈرائیور سے بھی ملوا دے گا۔" آغا جانی نے بات کا رخ موڑتے ہوئے دریافت کیا۔ "تم نے اب تک کچھ اپنے بارے میں نہیں بتایا۔ کچھ اپنا حال احوال بتاؤ۔ کیسے ہو؟ کیا کر رہے ہو؟ قرض خواہوں سے جو مقدمہ بازی ہو رہی تھی وہ کس مرحلے میں ہے؟"

"نہ پوچھو کس پریشانی میں مبتلا ہوں۔" قیصر مرزا نے بجھے ہوئے لہجے میں بتایا۔ "خیال تھا کہ جس محل سرا میں رہائش ہے وہ قرض خواہوں سے بچی ہوئی ہے۔ سوچا تھا کہ اسے بیچ کر زمیں داری پر جو قرض ہے اس سے چھٹکارہ حاصل کر لوں گا۔ تم سے اس کا ذکر بھی کیا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ بھی رہن ہے۔ اللہ بخشے آبا جان مرحوم کو۔ انھوں نے کچھ بھی نہ چھوڑا۔ اب حال یہ ہے کہ مقدمہ بازی میں اماں جان کے زیور تک بک گئے۔ ادھر وکیل صاحب کا کہنا ہے کہ مقدمے میں کوئی جان نہیں۔ کسی بھی روز ہمارے خلاف ڈگری ہو جائے گی۔ سوچتا ہوں کہ قرقی آنے سے پہلے ہی محل سرا چھوڑ دوں۔ اماں جان کو تو قرقی کے خوف ہی سے ہول ہونے لگا ہے۔ اختلاج قلب میں مبتلا ہو گئی ہیں۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔ اماں جان کے سوا دو سو روپے ماہانہ وثیقے میں کیسے گزارہ ہو گا۔"

"یہ تو تم نے بہت افسوس ناک خبر سنائی۔" آغا جانی نے اظہار ہمدردی کیا۔ "یار بڑا بُرا وقت لگا ہے۔ خاندانی رئیسوں کی محل سرائیں ایک ایک کر کے اجڑتی جا رہی ہیں۔ مہاجنوں کے قبضے میں جا رہی ہیں یا ویران ہوتی جا رہی ہیں۔ مرمت کرانا تو ایک طرف رہا برسوں قلعی تک نہیں ہوتی۔ ٹوٹ پھوٹ کر کھنڈر بنتی جا رہی ہیں۔ یہی حال وثیقوں کا ہے۔ خاندان بڑھتے جا رہے ہیں۔ وثیقے تقسیم ہو کر ہزاروں سے سیکڑوں میں بلکہ اب تو روپے آنے تک کی نوبت آ گئی ہے۔ میں ایک ایسے ایکے والے کو جانتا ہوں جس کا وثیقہ صرف آٹھ آنے ہے۔ مہینے کے مہینے وثیقہ آفس جا کر اپنا وثیقہ لے آتا ہے۔ وہ اسی میں خوش ہے کہ ایکہ چلاتا ہے مگر وثیقہ دار ہے اور بڑے فخر سے اس کا اظہار بھی کرتا ہے۔"

"اماں وثیقہ دار ہو کر ایکہ چلاتا ہے۔" قیصر مرزا نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔

"ایکہ نہ چلائے تو کیا کرے۔ بھوکا مر جائے گا۔ پیٹ پالنے کے لئے کچھ نہ کچھ تو بستا ہونا چاہیئے۔" آغا جانی نے قیصر مرزا کو بتایا۔ "اب تو مہاجن بھی اس قدر سیانے ہو گئے ہیں کہ آسانی سے قرض نہیں دیتے۔ خوب ٹھونک بجا کر دیکھ لیتے ہیں۔ اب تو وہ سوچتے ہیں کہ اگاہی پر قرض دینے کے بجائے کیوں نہ کسی کاروبار میں روپیہ لگایا جائے۔ سارے ہی کاروبار پر ان کا قبضہ ہے۔"

"ہاں یار، تم کہہ تو ٹھیک رہے ہو۔ صرافہ اور بزازہ تو سمجھو پوری طرح ان کے ہاتھ میں ہے۔ کون سا کاروبار ہے جس پر ان کا قبضہ نہیں۔"

"ادھر حال یہ ہے کہ مسلمان عورتیں اور نوجوان لڑکیاں گھروں میں بیٹھ کر ململ کے کرتوں اور ٹوپیوں کے پلّوں کی کڑھائی کرتی ہیں۔ کشیدہ کاری یا تار کشی کرتی ہیں اور بنیوں کی دکانوں پر پہنچا دیتی ہیں۔ وہ انہیں بیچتے ہیں اور سیٹھ اور ساہو کار کہلاتے ہیں۔" آغا نے اپنے کام کی اہمیت جتائی۔ "لے دے کے چمڑے یا جوتے کا کاروبار رہ گیا ہے جس میں گئو ہتیا کے خوف سے وہ ہاتھ نہیں ڈالتے۔ بلکہ کتنے ہی تو ایسے ہیں کہ چمڑے کے جوتے تک کو ہاتھ نہیں لگاتے۔ بنا چام کے جوتے پہنتے ہیں۔"

قیصر مرزا نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "یار میں تو کہیں نوکری چاکری بھی نہیں کر سکتا۔ ابّا جان نے کسی اسکول ہی میں داخل نہیں کرایا۔ وہ انگریزی تعلیم کے سخت خلاف تھے اور امّاں جان ان سے بھی زیادہ مخالف تھیں۔ کہتی تھیں مجھے اپنے بیٹے کو انگریزی پڑھا کر کرسٹان نہیں بنانا۔ کیا تو یہ کیا کہ مولوی بنانے کے لئے سلطان المدارس میں داخل کرا دیا۔ وہاں ایک سے ایک بڑا قل اعوذیہ پڑا تھا۔ دل ایسا اچاٹ ہوا کہ دوسرے ہی سال میں نے مدرسے جانا چھوڑ دیا۔" اس کا لہجہ افسردہ ہو گیا۔ "اب سوال یہ ہے کہ کروں تو کیا کروں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ مجھے تو ڈر ہے کہ مقدمے بازی کے چکر میں کچھ ہی وقت جاتا ہے کہ اماں جان کے وثیقے کو بیچنے کی نوبت آجائے گی۔ یہ آخری سہارا بھی جاتا رہے گا۔" قیصر مرزا کے چہرے پر دکھ کے سائے پھیل گئے۔ وہ بجھا بجھا اور دل گرفتہ نظر آرہا تھا۔

"اماں تم اتنے دل برداشتہ نہ ہو۔" آغا جانی نے اسے تسلّی دی۔ "میں تو کہتا ہوں جب تک

کوئی بہتری کی صورت پیدا نہ ہو۔ یہاں دکان پر آکر میرے پاس بیٹھ جایا کرو۔ دکانداری میں میرا ہاتھ بٹاتا۔ میں حاجی پھمّن سے بات کر کے تمہارے لئے پچاس روپے مہینہ مقرر کرا دوں گا۔ ابھی نئی نئی دکان کھولی ہے۔ اس وقت اس سے زیادہ کی گنجائش نہیں۔ دکان چل نکلی تو اس میں اضافہ کر دوں گا۔ مال لانے لے جانے کے سلسلے میں میرا تو باہر جانا لگا ہی رہے گا۔ میری غیر موجودگی میں تم ہی دکان سنبھالنا۔" اس نے قدرے توقف کے بعد پوچھا۔ "بولو کیا کہتے ہو؟"

"تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ میں پچاس روپلی مہینے پر تمہاری نوکری کر لوں۔ بھئی خوب دوستی کا حق ادا کیا۔" قیصر مرزا ایک دم بھڑک اٹھا۔ "اماں جان سُنیں گی تو سر پیٹ لیں گی۔ کہیں گی ہائے قیصر مرزا، تم نے خاندان کا نام خوب روشن کیا۔ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رکھا۔ نواب بوٹا کا بیٹا اور نواب افضل علی کا پوتا دکان پر بیٹھ کر جوتے بیچے۔ آغا جانی! یہ تم کس دشمنی کا مجھ سے انتقام لینا چاہتے ہو۔"

"اماں تم میری بات کا بالکل غلط مطلب سمجھے۔" آغا جانی گھبرا کر صفائی پیش کرنے لگا۔ "واللہ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ خالی پھرنے سے بہتر ہے کہ میرے پاس آکر بیٹھ جایا کرو۔ ذرا دل بہلتا رہے گا۔ کچھ ہاتھ خرچ کا بھی سُبیتا ہو جائے گا۔"

"تم یہ چاہتے ہو کہ میں بھی تمہاری طرح موچی بن جاؤں۔" قیصر مرزا بدستور برہم تھا۔ "واہ بھئی واہ! یہ بھی خوب رہی۔ ایسی ذلت کی زندگی سے تو موت بھلی۔ کان کھول کر سن لو۔ فاقوں مر جاؤں گا مگر خاندان کے لئے کلنک کا ٹیکہ نہیں بنوں گا۔"

"بھئی تم برا مانتے ہو تو میں اپنے الفاظ واپس لئے لیتا ہوں۔ وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ کبھی ایسی بات زبان پر نہیں لاؤں گا۔ تم اپنا دل میلا نہ کرو۔ یہ بات بھول جاؤ۔" آغا نے اس کی کدورت رفع کرنے کے لئے پوچھا۔ "اماں، یہ تو بتاؤ کبھی عشرت منزل کی طرف بھی جانا ہوا؟"

"نہیں۔ اسے خالی کرنے کے بعد کبھی نہیں گیا۔" قیصر مرزا نے دریافت کیا۔ "تم وہاں گئے تھے؟"

"میں بھی نہیں گیا۔"

"وہاں جانے کی ضرورت بھی نہ رہی تھی۔ تم جو کچھ چاہتے تھے تمہیں مل گیا۔" قیصر مرزا نے تلخی سے کہا۔

"یار، اب ان باتوں پر خاک ڈالو۔ خواہ مخواہ بدمزگی پیدا کرنے سے کیا فائدہ۔" آغا نے ٹالنے کی کوشش کی۔ وہ بات بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔

"میری پریشانی کا تو کچھ خیال کیا ہوتا۔"

"سچ کہتا ہوں۔ تم کو ہر وقت یاد کرتا رہتا تھا۔" آغا نے صفائی پیش کی۔ "تمہاری خفگی کے ڈر سے جانے کی ہمت نہ ہوئی۔"

"میں تم کو کھا تو نہیں جاتا۔" قیصر مرزا نے جل کر کہا۔

"تم پہلے ہی بہت کچھ کہہ چکے ہو۔ معلوم ہوتا ہے ابھی تمہارے دل کی بھڑاس نکلی نہیں۔" آغا جانی ڈھٹائی سے ہنسنے لگا۔

"واللہ! تم نے مجھے بہت دکھ پہنچایا۔"

آغا جانی نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "تو یہ طے رہا کہ تم ہفتے کی شام کو میرے پاس آرہے ہو۔ ویسے تم چاہو تو پہلے بھی آسکتے ہو۔ میں تو دکان ہی پر رہتا ہوں۔ البتہ آئندہ مہینے مال کی خریداری کے لئے آگرہ جاؤں گا۔ وہاں جوتوں کی بہت بڑی منڈی، دیال باغ ہے جس کے جوتے بہت پسند کئے جاتے ہیں۔"

"اچھا اب میں چلوں گا۔" قیصر مرزا اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ آگے بڑھا۔ پھر ٹھٹکا۔ جھجکتے ہوئے آغا سے کہا۔ "اماں، تمہارے پاس کچھ روپے ہوں گے۔ اس وقت جیب بالکل خالی ہے۔ ہفتے کو شام کو آؤں گا تو لوٹا دوں گا۔"

آغا نے جیب سے پندرہ روپے نکالے اور قیصر مرزا کی طرف بڑھا دیئے۔ قیصر مرزا نے روپے لیتے ہوئے کہا۔ "ضرورت تو زیادہ کی تھی۔"

"فی الحال تو میرے پاس یہی ہیں اور ان کو لوٹانے کی ضرورت نہیں۔"

قیصر مرزا نے روپے واپس کرنے پر اصرار کیا تو آغا مسکرا کر بولا۔ "اماں! مدتوں تمہارے آگے ہاتھ پھیلاتا رہا ہوں۔ سیکڑوں لئے اور کبھی واپس نہ کئے۔ میں نے یہ پندرہ روپے تم کو دیدئے تو کون سا احسان کر دیا۔ یہ تو حساب دوستاں دردل والی بات ہے۔"

قیصر مرزا مسکرا کر خاموش ہو گیا۔ آغا سے رخصت ہوا۔ دوکان سے باہر نکلا اور قیصر باغ کی جانب

روانہ ہوگیا۔

★

اتوار کو حاجی چھٹن کا پروگرام ملتوی ہوگیا۔ دو روز بعد قیصر مرزا اس کے ہمراہ حیدر گڑھ پہنچا۔ دن ڈھل رہا تھا۔ سائے طویل ہوتے جارہے تھے۔ موسم خوش گوار تھا۔ قیصر مرزا ایک بار پہلے بھی حیدر گڑھ آیا تھا مگر رات کا وقت تھا۔ ہر طرف سناٹا چھایا تھا۔ مگر آج بازار میں چہل پہل اور گھما گھمی تھی۔ بازار سے ایک پختہ سڑک محل کی جانب جاتی تھی۔ اسی سڑک سے گزر کر وہ محل کی چار دیواری میں اس رات داخل ہوا تھا جب وہ رانی ارجمند سلطانہ سے ملنے گیا تھا۔

دونوں پھاٹک پر پہنچے۔ اندر گئے۔ کچھ ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ نذیر خاں مل گیا۔ حاجی چھٹن کو قیصر مرزا کے بارے میں کچھ بتانے کی ضرورت پیش نہ آئی۔ نذیر خاں نے قیصر مرزا کو دیکھتے ہی پہچان لیا۔ مسکرا کر خیریت دریافت کی۔ آنے کا مقصد پوچھا۔ قیصر مرزا نے صندلی سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ نذیر خاں نے اپنے ہمراہ آنے کا اشارہ کیا۔ دونوں آگے بڑھ گئے۔

حاجی چھٹن محل کی جانب چلا گیا جہاں طلعت آرا اس کا انتظار کر رہی تھی۔ دربان نے پھاٹک ہی پر اُسے مطلع کر دیا تھا۔

نذیر خاں اور قیصر مرزا ایک پر پیچ راستے سے گزرتے ہوئے ایسے مقام پر پہنچے جو محل سے دُور ایک الگ تھلگ گوشے میں تھا۔ ان کے سامنے مٹی کے بنے ہوئے کچے مکانات تھے۔ ان میں محل کا عملہ اور دوسرے شاگرد پیشہ رہتے تھے۔ ایک کچے مکان کے دروازے پر پہنچ کر نذیر خاں ٹھہر گیا۔ دروازہ اندر سے بند نہ تھا۔ نذیر خاں نے اس کا ایک پٹ کھولا اور قیصر مرزا کے ہمراہ انگنائی میں پہنچ گیا۔ دونوں انگنائی سے گزر کر برآمدے میں داخل ہوئے جس پر پھوس کا چھپر پڑا تھا۔ برآمدے میں سامنے کے رخ پر دو دروازے تھے۔ ایک کھلا تھا۔ قیصر مرزا کی صندلی پر نظر پڑی۔ وہ چارپائی پر تنہا بیٹھی تھی۔ اسے دیکھتے ہی ہڑبڑا کر کھڑی ہوگئی اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھنے لگی۔

نذیر خاں نے صندلی سے کہا۔ "یہ قیصر مرزا صاحب تم سے ملنے کسی ضروری کام سے آئے

ہیں۔" مگر وہ ٹھہرا نہیں۔ خاموشی سے مڑا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا گھر سے باہر چلا گیا۔

صندلی نے آداب کیا اور جھجکتے ہوئے دریافت کیا" آج آپ ادھر کیسے آگئے؟" وہ ابھی تک حیرت زدہ تھی۔

"آنا تو بہت دن سے چاہتا تھا مگر اس کی کوئی سبیل پیدا نہ ہوئی۔" قیصر مرزا نے بتایا۔ آج حاجی چھٹن اپنے کام سے ادھر آرہے تھے۔ میں ان کے ہمراہ چلا آیا۔"

صندلی نے ادھر ادھر نظریں گھما پھرا کر دیکھا اور باہر چلی گئی۔ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں سرکنڈوں کا بنا ہوا مونڈھا تھا۔ اس نے مونڈھا قیصر مرزا کے سامنے رکھا۔ ہاتھ سے اشارہ کیا۔ "تشریف رکھیے۔" اور خود اس کے روبرو چارپائی پر پیر لٹکا کر بیٹھ گئی۔

قیصر مرزا نے صندلی کو غور سے دیکھا۔ وہ اُجڑی اُجڑی نظر آرہی تھی۔ چہرے پر نہ پہلی سی آب و تاب تھی نہ پھبن۔ آنکھوں میں جگمگاتے ہوئے چراغ مدھم پڑ گئے تھے۔ دبلی بھی ہوگئی تھی۔ وہ مرجھا کر رہ گئی تھی۔ قیصر مرزا نے اس کا یہ حال دیکھا تو دل کو ٹھیس پہنچی۔ مگر اس کا اظہار نہ کیا۔ صندلی کو دکھ ہی ہوتا۔

"اس روز اماں جان نے تمہارے ساتھ جو زیادتی کی تھی اس کے لیے تم سے معذرت کرنے آیا تھا۔" قیصر مرزا نے نرم لہجے میں کہا۔ "یقین مانو مجھے جب یہ معلوم ہوا تو بڑا دکھ ہوا۔ میں تو اسی وقت تمہاری تلاش میں لاریوں کے اڈے پر پہنچتا مگر اماں جان نے گھر سے باہر ہی نہ جانے دیا۔ مجھے مجبور کرکے اپنے ساتھ چوپہلے میں بٹھا کر لے گئیں۔ بعد میں بھی تمہارے پاس آنے کا برابر ارادہ کرتا رہا مگر یہاں کوئی جان پہچان کا نہ تھا۔ دربان پھاٹک پر روک لیتے۔ تمہارا حوالہ دینا مناسب نہ معلوم ہوا۔ خدشہ تھا کہ رانی صاحبہ کو اطلاع پہنچی تو وہ نہ معلوم کیا سوچیں۔ کس طرح کا رویہ اختیار کریں۔ تم سے باز پرس کریں۔ اسی ادھیڑ بن میں وقت گزرتا گیا۔"

صندلی نے مطلق مداخلت نہ کی۔ خاموش بیٹھی اس کی باتیں سنتی رہی۔ قیصر مرزا اپنی بات کہہ چکا تو صندلی بولی۔ "جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا۔ اب گڑے مردے اکھاڑنے سے کیا فائدہ۔"

"مگر میرے دل پر مدت سے جو بوجھ تھا آج ہلکا ہو گیا۔" قیصر مرزا نے دبی زبان سے پوچھا۔ "مگر تم نے اپنی یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟ خیریت تو ہے؟"

"بس زندہ ہوں۔" اس کی آواز میں درد کی چبھن تھی۔ اس نے قیصر مرزا کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ "یہ آپ کو اچانک کیسے میری یاد آگئی۔ یہ تو میں مانتی نہیں کہ آپ اس روز کے واقعے پر مجھ سے ہمدردی کرنے آئے ہیں۔ اس کی تو اب ضرورت بھی نہ رہی تھی۔"

"واللہ، میں صرف اسی لئے آیا تھا۔" قیصر مرزا نے اسے یقین دلانے کی کوشش کی۔ "سچ کہتا ہوں میں تمہیں اب تک نہیں بھولا۔" اس کا لہجہ جذباتی ہوگیا۔ "میں نے تو یہی چاہا کہ تم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے میری بن جاؤ۔ بلکہ اس روز حجامت بنوا کے لوٹا تو یہ تہیہ کرچکا تھا کہ تم سے کھل کر بات کروں گا۔ یہ بتادوں گا کہ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

"اچھا ہی ہوا کہ ایسا نہ ہوا ورنہ آپ کی اماں جان تو مجھے کچا چبا ڈالتیں۔ کھڑے کھڑے گھر سے نکال دیتیں اور اگر آپ کی زورہ زوری پر رکھ بھی لیتیں تو کسی روز سوتے میں مجھے چھری سے ذبح کر دیتیں۔" اس کے لہجے میں اور تلخی پیدا ہوگئی۔ "اس روز انہوں نے مجھے کیسی کیسی صلواتیں سنائیں۔ کس کس طرح دھتکارا۔ کیسے کیسے کوسنے دیئے۔ میں آپ سے کیا بتاؤں۔ غصے سے دیوانی ہورہی تھیں۔ اور ان کی وہ مسٹنڈی ماما جسے وہ اپنے ساتھ لائی تھیں، اس چنڈال نے تو مجھے روئی کی طرح دُھنک کے رکھ دیا۔ جان بچا کر فوراً چلی نہ جاتی تو ہڈی پسلی توڑ کر برابر کر دیتی۔ خون کر ڈالتی۔ میری حالت پر ترس کھانے کے بجائے آپ کی اماں جان اس مُلّادنی کو برابر بڑھاوا چڑھاوا دیتی رہیں۔ میری ایک نہ سنی۔ آتے ہی برسنے لگیں۔ جو منہ میں آیا کہتی رہیں۔"

"مجھے معلوم ہے ان کا غصہ کتنا خراب ہے۔" قیصر مرزا نے نرمی سے کہا۔ "انہوں نے واقعی تم پر بہت ظلم ڈھایا۔ مجھے اب تک اس کا ملال ہے۔"

"چھوڑیئے ان باتوں میں کیا رکھا ہے۔" صندلی نے بے زاری کا اظہار کیا۔ "البتہ اس روز جو ذلت اور خواری ہوئی اس سے یہ سبق حاصل ہوا کہ کبھی اپنی اوقات نہیں بھولنا چاہیئے۔ میں بھول گئی تھی کہ آپ ایک اعلیٰ خاندان کے رئیس زادے ہیں اور میں ٹھہری ادنا ذات کی معمولی خادمہ۔"

"اس طرح نہ سوچو صندلی۔ تم میری اماں جان کو نہیں جانتیں۔ میں ان کا بیٹا ہوں۔ انہیں بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ مزاج کی جتنی کڑوی ہیں اندر سے اتنی ہی نرم دل بھی ہیں۔ ان کا

غصہ جتنی تیزی سے چڑھتا ہے اسی تیزی سے جھاگ کی طرح بیٹھ بھی جاتا ہے۔" قیصر مرزا نے مسکرا کر روٹھی ہوئی صندلی کو منانے کی کوشش کی۔ قدرے تامّل کیا۔ پھر حرفِ مطلب زبان پر لایا۔ "ابھی کچھ نہیں بگڑا۔ ابھی وقت ہے۔ میں شادی کر کے تم کو اپنی شریکِ حیات کے روپ میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ رہ گیا میری والدہ کا سوال انہیں راضی کرنا میرا کام ہے۔ میں ان کا اکلوتا بیٹا ہوں۔ اتنا لاڈلا ہوں کہ اڑ جاؤں تو نا نہیں کریں گی۔ وہ مجھے اداس اور غم زدہ دیکھ ہی نہیں سکتیں۔ موم کی طرح پگھل جاتی ہیں۔ تم چاہو تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ واللہ! میں آج اسی ارادے سے تمہارے پاس آیا ہوں۔"

"مگر آپ نے آنے میں بہت دیر کر دی۔ اب تو سارا کھیل ختم ہو گیا۔" صندلی نے قیصر مرزا کو مطلع کیا۔ "شاید آپ کو معلوم نہیں۔ میری شادی ہو چکی ہے۔ میں تو اب اناؤ میں رہتی ہوں۔"

قیصر مرزا ششدر رہ گیا۔ گھبرا کر بولا۔ "کب ہوئی تمہاری شادی؟"

"لگ بھگ دو مہینے ہو گئے۔" صندلی نے بتایا۔ "میرا میاں ڈسٹرکٹ بورڈ کے دفتر میں چپراسی ہے۔ اس کا نام نذر محمد ہے۔" اس کے ہونٹوں پر زہر خند ہویدا ہوا۔ "نذیر خاں ڈرائیور کا داماد نذر محمد چپراسی۔ میرے ابا نے خوب سوچ سمجھ کر رشتہ طے کیا تھا۔ ٹاٹ کا پیوند آخر ٹاٹ میں لگ گیا۔"

"یہ تم نے بڑی دل خراش خبر سنائی۔" قیصر مرزا نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "میں تو نہ جانے کیسے کیسے ارمان دل میں لے کر آیا تھا۔ سوچا ہم دونوں ہنسی خوشی اپنا گھر بسائیں گے۔ اپنے گلفام کو پالے پوسیں گے۔ پروان چڑھائیں گے۔" جذبات کی رَو میں بے ساختہ اس کی زبان سے نکل گیا۔ "تم کو یہ نہیں معلوم کہ گلفام میرا بیٹا ہے۔"

"ہائے اللہ! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" صندلی حیران و پریشان ہو گئی۔ "واقعی آپ سچ کہہ رہے ہیں؟ یقین نہیں آتا۔ سننے میں تو یہ آیا ہے کہ اس کا باپ جنوں کا شہزادہ تھا۔ آپ تو جن نہیں معلوم ہوتے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ میری تو عقل کام نہیں کر رہی۔" اس کے چہرے پر خوف کے سائے پھیل گئے۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے قیصر مرزا کو دیکھتے ہوئے گویا ہوئی۔ "آپ نواب بوٹا کے بیٹے قیصر مرزا نہیں ہیں؟"

"میں قیصر مرزا ہی ہوں۔ اور نواب بوٹا مرحوم کا بیٹا ہوں۔ نہ جن ہوں نہ پری زاد۔" قیصر مرزا نے مسکرا کر کہا۔" میری طرف دیکھو۔ میں تمہیں کیا نظر آتا ہوں؟"

"آپ تو معمّہ میں باتیں کر رہے ہیں۔ صاف صاف بتلایئے۔ اصل حقیقت کیا ہے؟"

قیصر مرزا نے صندلی کو سب کچھ صاف صاف بتا دیا۔ کچھ بھی نہ چھپایا۔

"اب معلوم ہوا کہ رانی صاحبہ مرحومہ پیارے آغا کے ذریعے آپ کو کیوں قتل کروانا چاہتی تھیں۔" صندلی اس کی باتیں سُن کر بولی۔" وہ اپنی پھپی زاد بہن کا آپ سے انتقام لینا چاہتی تھیں۔ جب آپ رات کو رانی صاحبہ کے پاس محل میں آئے تھے تو گلفام پیدا ہو چکا تھا۔ اپنی ماں کے ساتھ یہیں حیدر گڑھ میں تھا۔"

"اس رات طلعت آرا محل ہی میں تھیں؟" قیصر مرزا نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

"جی نہیں۔" صندلی نے فوراً وضاحت کی۔ "وہ محل میں نہیں تھیں۔ رسٹ ہاؤس میں تھیں۔ رسٹ ہاؤس محل سے دو کوس اُدھر جنگل میں ہے۔ جب سے وہ حیدر گڑھ آئی تھیں رسٹ ہاؤس ہی میں مقیم تھیں۔ گلفام بھی وہیں پیدا ہوا تھا۔ لکھنؤ سے ڈاکٹرنی بلوائی گئی تھی۔ زچّہ کی دیکھ بھال کے لئے دو نرسیں رہتی تھیں۔ ایک دن کے لئے دوسری رات کے لئے۔ کسی کو وہاں جانے کی اجازت نہ تھی۔ صرف گلفام کی نانی اور ان کی مغلانی پیدائش کے وقت موجود تھیں۔ ایسی رازداری سے کام لیا گیا کہ رانی صاحبہ نے مجھے بھی ذرا ہوا نہ لگنے دی۔ کچھ بھی نہ بتایا۔ حالانکہ وہ مجھے ایسی باتیں بھی بتا دیتی تھیں جو کسی کو نہ بتاتی تھیں۔"

"طلعت آرا نے بھی گلفام کے بارے میں تمہیں کچھ نہیں بتایا؟"

"جی نہیں۔" صندلی نے جواب دیا۔ "نہ مجھے کبھی پوچھنے کی جرأت ہوئی اور نہ انہوں نے کچھ کھل کر بتایا۔ یہ بھی نہ بتایا کہ گلفام ان کا بیٹا ہے۔ ہمیشہ یہی کہتی رہیں کہ ننھو کا بیٹا ہے۔" اس نے لمحہ بھر تامّل کیا، پھر بولی۔" انہوں نے تو آپ کے بارے میں بھی کچھ نہیں بتایا۔ پوچھا بھی تو خاموش رہیں۔ لیکن گلفام کے لئے بہت بے چین رہتی تھیں۔"

"گلفام تو تمہارے ہی پاس ہوگا۔" قیصر مرزا نے دریافت کیا۔" نظر نہیں آیا کہاں ہے؟"

"بہت دیر بعد آپ کو اس کی یاد آئی۔" صندلی نے تیکھے لہجے میں کہا۔ اس کا چہرہ سوگوار

ہو گیا۔" وہ اب اس دنیا میں نہیں رہا۔ اللہ میاں نے اسے اپنے پاس بلا لیا۔"

"ہائیں، یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔" قیصر مرزا چکرا گیا۔ آواز لڑکھڑا گئی۔ "گلفام مر گیا۔ اس کا انتقال کب ہوا؟ کیسے ہوا؟"

"یہاں آنے کے آٹھویں دن اچانک اس کا انتقال ہو گیا۔"

"بیمار ہو گیا تھا؟" قیصر مرزا ہنوز پریشان تھا۔

"بیمار!" صندلی نے قدرے تامل کے بعد کہا۔ "ہاں بیمار پڑ گیا تھا۔"

"بات کچھ اور ہی ہے۔ تم مجھ سے چھپا رہی ہو۔" قیصر مرزا نے اسے مشتبہ نظروں سے دیکھا۔ "سچ سچ بتاؤ ہوا کیا؟ تم نے آج تک مجھ سے کچھ نہیں چھپایا۔" اس کے لہجے میں التجا تھی۔

"بتا دو صندلی۔ وہ میرا بیٹا تھا۔ مجھے یہ تو معلوم ہو جائے کہ وہ کیسے مرا؟"

"میں چاہوں بھی تو آپ سے کچھ چھپا نہیں سکتی۔ آپ کو تو میں اپنے دل کی بھی بات بتا دیتی ہوں۔" صندلی نے گہری سانس بھری۔ بے بسی سے قیصر مرزا کو دیکھا۔ "ہوا یہ کہ جب میں اسے عشرت منزل سے لے کر یہاں آئی تو سرکار بہت خفا ہوئیں۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ گلفام یہاں آئے۔ منع بھی کر چکی تھیں۔ میں نے آپ کا اور آپ کی والدہ کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ کچھ بھی نہ بتایا۔ بہانا یہ بنایا کہ آغا جانی صاحب نے بچے کو اپنے پاس رکھنے سے صاف انکار کر دیا۔ زبردستی میرے ساتھ بھیج دیا۔ یہ سن کر ان کا غصہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ گلفام کو میں نے اپنے پاس رکھ لیا۔ اس وقت اماں زندہ تھیں۔ وہی اس کی دیکھ بھال کرتی تھیں۔ وہ ان سے بہت ہل بھی گیا تھا۔"

"کیا تمہاری اماں کا بھی انتقال ہو گیا؟"

"وہ میری شادی کے دس بارہ ہی دن بعد گزر گئیں۔" صندلی نے بتایا۔ "ہیضہ ہو گیا تھا۔ میں اس وقت اناؤ میں تھی۔"

"یہ سن کر بہت دکھ ہوا۔ اللہ ان کی مغفرت کرے۔" قیصر مرزا نے افسردہ لہجے میں کہا۔ لمحہ بھر خاموش رہا۔ پھر بے چین ہو کر گویا ہوا۔ "تم گلفام کی اچانک موت کے بارے میں بتا رہی تھیں۔"

"رانی صاحبہ اسے چھپ کر دیکھنے آتی تھیں۔ بہت محبت کرتی تھیں۔ وہ بھی اسے گلفام کہتی تھیں۔" صندلی بجھے ہوئے لہجے میں بولتی رہی۔ "ایک روز ایسا ہوا کہ رانی صاحبہ کے

شوہر نواب ساجد علی اپنے والد کے پاس تارا پور گئے اور دو تین روز وہاں ٹھہرنے کے ارادے سے گئے۔ سرکار کو یہی بتایا تھا۔ ان کی غیر موجودگی میں سرکار نے گلفام کو اپنے پاس بلا لیا۔ وہ ان سے خاصا مانوس بھی ہو گیا تھا۔ شام کو گیا تھا۔ رات گئے تک ان کے پاس رہا۔ انھی کے کمرے میں کھیلتا رہا۔ کھیلتے کھیلتے وہیں فرش پر سو گیا۔ رانی صاحبہ نے خود اُسے اٹھا کر اپنے بستر پر لٹا دیا۔ میں نے واپس لانا چاہا تو انہوں نے منع کر دیا۔ اس کی نیند خراب کرنا نہ چاہتی تھیں۔ وہ اس رات اسے اپنے ہی پاس سلانا چاہتی تھیں۔" ممندلی تفصیل سے ایک ایک بات بتاتی رہی۔ قیصر مرزا خاموش بیٹھا توجہ سے سنتا رہا۔" خلاف توقع نواب صاحب اچانک رات کو واپس آ گئے۔" دس ساڑھے دس بجے کا وقت ہوگا۔ وہ خواب گاہ میں پہنچے۔ گلفام کو بستر پر سوتے ہوئے دیکھا تو ان کا خون کھول گیا۔ شبہ تو پہلے ہی سے تھا۔ ایسا جنون سوار ہوا کہ گلا گھونٹ کر گلفام کو مار ڈالا۔ بعد میں مشہور یہ کر دیا گیا کہ اسے ڈبل نمونیہ ہو گیا تھا۔"

"طلعت آرا نے اسے بچانے کی کوشش نہیں کی؟"

"وہ اس وقت خواب گاہ میں موجود نہیں تھیں۔ دوسرے کمرے میں مینجر صاحب کے ساتھ بیٹھی ریاست کے بارے میں کچھ ضروری باتیں کر رہی تھیں۔ واپس جا کر اپنے بستر پر گلفام کو مردہ پایا تو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ فوراً مجھے بلایا گیا۔ میں نے جا کر دیکھا۔ بستر پر گلفام کی لاش پڑی تھی اور سرکار اس کے سرہانے بیٹھی رو رہی تھیں۔ میں بھی رونے لگی۔ لاش اٹھوا کر اپنے ساتھ لے آئی۔"

"طلعت آرا نے اپنے شوہر سے کوئی باز پرس نہیں کی؟" قیصر مرزا نے برہم ہو کر پوچھا۔" اس جلاد سے کچھ نہیں پوچھا؟"

"پوچھا تھا۔ مگر وہ صاف مُکر گئے۔ کہنے لگے، میں تو خواب گاہ میں گیا ہی نہیں۔ ڈریسنگ رُوم میں لباس تبدیل کر رہا تھا۔ رونے پیٹنے کی آواز سن کر اس وقت پہنچا جب وہ مر چکا تھا۔ وہ ایسے ہی حیلے بہانے کرتے رہے۔ حالانکہ ایک خادمہ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ وہ گلفام کا گلا گھونٹ رہے تھے۔ گلفام کی نازک گردن پر انگلیوں کے نشان صاف نظر آ رہے تھے۔ رانی صاحبہ نے بھی دیکھے تھے بلکہ مجھے بھی دکھائے تھے۔" ممندلی نے تیکھے لہجے میں بتایا۔" تب ہی تو سرکار

نے ان کی ایک نہ سنی۔ کسی منہ کو نہ مانا۔ ان سے بات کرنا چھوڑ دیا۔ اپنے کمرے میں آنے سے منع کر دیا۔ دیکھتیں تو نفرت سے منہ پھیر لیتیں۔ سننے میں تو یہاں تک آیا ہے کہ ایک دن انھوں نے منانے کی کوشش کی تو سرکار پر ایسا جنون سوار ہوا کہ ان کے کپڑے پھاڑ ڈالے۔ منہ نوچ لیا۔ قاتل اور خونی کہا۔ بات اتنی بڑھی کہ وہ روٹھ کر تارا پور ہاؤس چلے گئے۔ ہفتے بھر تک نہ آئے۔ علیحدگی کی نوبت آ گئی۔ طلاق ہوتے ہوتے رہ گئی۔"

"مگر طلاق ہوئی کیوں نہیں؟" قیصر مرزا نے بے چین ہو کر پوچھا۔

"رانی صاحبہ کی والدہ نے بیچ میں پڑ کر صلح صفائی کرا دی۔" صندلی نے قیصر مرزا کو بتایا "انہوں نے تو بڑی عجیب و غریب باتیں کہیں۔ اتفاق سے میں اس وقت موجود تھی۔ وہ داماد کو اپنے ساتھ لے کر آئی تھیں۔ بیٹی سے کہنے لگیں۔ تم ناحق ساجد دولہا سے اتنی خفا ہو۔ وہ تو کوئی اور ہی تھا جو ان کے بھیس میں آیا تھا۔ انھوں نے جن یا پری زاد کا تو نام نہ لیا۔ اشاروں میں صرف اتنا کہا۔ میں رات کے وقت ان کا نام نہیں لوں گی۔ وہ تو جس قالب میں چاہتے ہیں خود کو ڈھال لیتے ہیں۔ جب چاہیں جہاں چاہیں پہنچ جاتے ہیں۔ جی چاہا تو سامنے آ گئے۔ جب چاہا چھلاوے کی طرح اوجھل ہو گئے۔ اے بیٹی! وہ کیا نہیں کر سکتے۔ کوئی بے ادبی ہو گئی۔ جلال میں آ کر انہوں نے بچے کا گلا مروڑ ڈالا۔ یاد کرو تمہارے آبا جان مرحوم کے ساتھ کیا کیا۔ اچھے بھلے جا کر سوئے۔ نہ کوئی دکھ نہ بیماری۔ ذرا دیر میں چٹ پٹ ہو گئے۔ تم ساجد دولہا کی طرف سے دل صاف کر لو۔ یہ ایسا کر ہی نہیں سکتے۔ ایسا پتھر کا دل ان کا ہو ہی نہیں سکتا۔ میں جانتی ہوں یہ کس کا کام ہے۔ تم فوراً اس کمرے کو خالی کر دو۔ یہاں کسی کا سایہ ہے۔ داماد بھی ساس کی ہاں میں ہاں ملانے لگے۔ طرح طرح کی صفائیاں پیش کرنے لگے۔ وہی جو پہلے رانی صاحبہ کے سامنے پیش کر چکے تھے۔ میں حیرت سے دونوں کا منہ دیکھ رہی تھی۔"

"طلعت آرا نے کچھ نہیں کہا؟"

"وہ خاموش بیٹھی رہیں۔ کچھ بھی نہ بولیں۔ ان کی اماں جان نے نہ جانے کیسے کیسے جن آسیب کے واقعات سنانے شروع کر دیئے۔ میں تو اکتا کر چلی آئی۔" صندلی نے منہ بگاڑ کر کہا۔ "دوسرے ہی روز کمرہ خالی کر دیا گیا۔ میاں بیوی پہلے کی طرح ہنسنے بولنے لگے۔ نہ کوئی رنجش رہی نہ کدورت۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ طلعت آرا پر ابھی تک جنوں کا خوف طاری ہے۔ ابھی تک ان کا ہوا سوار ہے۔"

"ایسا نہ ہوتا تو اتنی آسانی سے کیسے مُلح صفائی ہو جاتی۔"

قیصر مرزا سر جھکا کر گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

صندلی نے پوچھا۔ "آپ کس سوچ میں پڑ گئے؟"

"یہ بتاؤ طلعت آرا کے شوہر مرزا ساجد علی یہیں ہیں؟"

"جی نہیں۔" صندلی نے جواب دیا۔ "وہ آج صبح کسی ضروری کام سے بنارس چلے گئے۔"

"کب تک واپسی کا امکان ہے؟"

"تین چار روز سے پہلے تو نہ آ سکیں گے۔" صندلی نے حیرت کا اظہار کیا۔ "مگر آپ ان کے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

قیصر مرزا نے اس کی تشویش نظر انداز کرتے ہوئے دریافت کیا۔ "تم کب تک یہاں قیام کرو گی؟"

"میں کل اُناؤ چلی جاؤں گی۔"

"اچھا ہوا کہ میں آج آ گیا اور تم سے ملاقات ہو گئی۔ ورنہ مجھے یہ تمام باتیں کون بتاتا۔" قیصر مرزا نے کہا۔ "یہ بتاؤ طلعت آرا کی خواب گاہ اب کس کمرے میں ہے؟"

"اوپر کی منزل پر ہے۔" صندلی نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔ "ان کے پاس جانے کا تو ارادہ نہیں ہے؟"

"بالکل ایسا ارادہ ہے۔" قیصر مرزا نے صاف گوئی سے کام لیا۔ "میں ان کے پاس جاؤنگا اور آج ہی رات جاؤنگا۔"

"ان کے کمرے تک پہنچنا آسان نہیں۔ کئی پیچیدہ راستوں سے گزرنے کے بعد ان کا کمرہ آتا ہے اور ہر راستے پر رات کو پہرہ رہتا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ رات کو وہ عام طور پر کمرے کا دروازہ بند کر کے سوتی ہیں۔ صرف ایک کھڑکی کھلی رہتی ہے جو پچھواڑے کھلتی ہے۔"

"میں اسی کھڑکی سے کمرے میں جاؤں گا۔"

"معلوم ہوتا ہے آپ کو پھر ان کی محبت کا دورہ پڑا ہے۔" مندلی نے مسکرا کر شوخی سے کہا۔ "آپ وہی کھیل پھر کھیلنا چاہتے ہیں جو بارہ دری میں مدت تک کھیلتے رہے۔"

"ہاں آج رات میں وہی کھیل کھیلنا چاہتا ہوں۔" قیصر مرزا نے مندلی کو رام کرنے کے لئے انچھر پھینکا۔ "طلعت آرا سے نہ مجھے پہلے کبھی محبت تھی اور نہ اب ہے۔ میں تم سے سچ کہہ رہا ہوں۔ میں نے کسی اور سے بھی محبت نہیں کی۔" اس نے مندلی کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی۔ "میں نے تم سے اور صرف تم سے محبت کی اور ہمیشہ کرتا رہوں گا۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "تم کو اپنانے کے لئے میں نے کیسے کیسے منصوبے بنائے۔ کس کس طرح بے قرار ہو کر تم کو یاد کیا۔ تمہاری یہ غزالی آنکھیں۔ یہ گلابی ہونٹ۔ یہ چاند سا خوبصورت چہرہ، کیا کیا یاد نہ آیا۔ ہر دم تمہاری من موہنی صورت آنکھوں کے سامنے گھومتی تھی۔"

"یقین نہیں آتا۔" قیصر مرزا کا حربہ کارگر ثابت ہوا۔ مندلی کا چہرہ دمکنے لگا۔ اس نے عشوہ طرازی کا مظاہرہ کیا۔ چہک کر بولی۔ "بھلا آپ اور مجھ سے اس طرح ٹوٹ کر محبت کریں۔ یہ کیسے ممکن ہے۔" اس نے بے قرار ہو کر گہری سانس بھری۔ "ہاں میں نے اس طرح آپ کو چاہا۔ رانی صاحبہ مرحومہ سے بھی اس کا اظہار کر دیا تھا۔ تب ہی تو وہ مجھے گلے لگا کر رونے لگیں۔ سرخ لباس اتار کر سیاہ لباس پہنا اور زہر کھا کر خودکشی کر لی۔"

"مجھے اس کا اندازہ ہے۔ میں جانتا ہوں تم نے میرے لئے کیا کیا نہیں کیا۔" قیصر مرزا نے جذباتی لہجے میں کہا۔ "مندلی تم جس قدر خوبصورت ہو تمہارا دل بھی اتنا ہی خوبصورت ہے۔" اس نے قدرے توقف کیا۔ پھر گویا ہوا۔ "مندلی! میری خاطر تم کو یہ کام کرنا ہوگا۔ بتاؤ میں طلعت آرا کی خواب گاہ میں کیسے پہنچوں؟"

"میری سمجھ میں نہیں آتا آپ یہ خطرناک کھیل کیوں کھیلنا چاہتے ہیں۔ یہ بارہ دری ہے نہ عشرت منزل۔ یہاں رات کو ہر طرف پہرہ رہتا ہے۔ اب تو ایک چھوٹا سا بجلی گھر بھی لگ گیا ہے جس سے آن کی آن میں پورا محل جگمگانے لگتا ہے۔ اور سب سے بڑی دشواری، اس کھڑکی تک پہنچنا ہے۔"

"یہ تو تم ہی بتا سکتی ہو کہ اس کھڑکی تک کیسے پہنچا جائے۔"

"پچھواڑے کے چور دروازے سے میں آپ کو محل کے اندر تو پہنچا دوں گی۔ اسی دروازے سے جس سے اس رات آپ رانی صاحبہ مرحومہ سے ملنے آئے تھے۔ قریب ہی ایک زینہ ہے جو اوپر جاتا ہے۔ وہ صرف مہترانی اور صفائی کرنے والے دوسرے نوکروں کی آمد و رفت کے لئے ہے۔ زینہ جہاں ختم ہوتا ہے وہاں ایک کھڑکی ہے۔ وہ بھی پچھواڑے کھلتی ہے۔ کھڑکی کے نیچے باہر کی طرف چھجے نما کارنس ہے۔ مگر ہاتھ بھر سے زیادہ چوڑی نہیں۔ ایک بار کوئی چور اس پر سے گزر کر کھڑکی کے راستے محل میں داخل ہوا تھا۔ یہ کئی سال پرانی بات ہے۔ تب سے پچھواڑے کھلنے والا دروازہ رات کو بند کر کے تالا ڈال دیا جاتا ہے۔" صندلی نے گردن کو خم دے کر ایک خاص ادا سے دیکھا۔ "تالے کی کنجی تو میں کسی نہ کسی طرح حاصل کر لوں گی۔ دروازہ بھی کھول دوں گی۔ مگر کارنس کے ذریعے آپ کھڑکی تک پہنچ سکتے ہیں؟ یہ جان جوکھوں کا کام ہے۔ میرا کہا مانیئے اس خطرے میں نہ پڑیئے۔"

"جب عشرت منزل کی دیوار پھاند کر بارہ دری جاتا تھا تو جان پر کھیل کر ہی جاتا تھا۔ کسی بھی روز طلعت آرا کے بجائے کوئی ایسا بھی مل سکتا تھا جو مجھے قتل کر دیتا یا پکڑ کے پولیس کے حوالے کر دیتا۔" قیصر مرزا نے بڑے اعتماد سے کہا۔ "خطرہ تو ہمیشہ ہی رہتا تھا مگر جب میں ایک بار کسی کام کا تہیہ کر لیتا ہوں تو پھر خطرے سے نہیں ڈرتا۔"

"مگر آپ یہ خطرہ کیوں مول لینا چاہتے ہیں؟ اگر مجھے اپنا سمجھتے ہیں تو کم از کم یہ تو بتا دیجئے کہ آپ کو اس سے کیا حاصل ہوگا؟"

"میں طلعت آرا کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ گلفام کو کسی جن یا آسیب نے نہیں بلکہ اس کے شوہر نے گلا گھونٹ کر ہلاک کیا ہے۔ میں اس خونی سے گلفام کا انتقام اسی طرح لے سکتا ہوں۔" قیصر مرزا غصے سے سرخ ہو گیا۔ "اگر تم نے اس کام میں میری مدد نہ کی تو میں اس خبیث کو قتل کر دوں گا۔ پھر پھانسی ہو یا کچھ اور۔ مجھے اس کی ذرا پرواہ نہیں۔"

صندلی اس دھمکی سے ڈر گئی۔ گھبرا کر بولی۔ "نہیں، نہیں، آپ ایسا نہ سوچیں۔ آپ جو کہیں گے میں وہ کروں گی۔"

"یہ بتاؤ وہ موکھا ابھی تک موجود ہے جس سے اس رات تم نے محل کی چار دیواری سے

مجھے باہر پہنچایا تھا؟

"وہ موکھا ابھی تک موجود ہے۔" صندلی نے بتایا۔ "اسے بند کرنے کے لئے کسی نے ابھی تک توجہ ہی نہ دی۔ ویسے بھی وہ جھاڑیوں کی اوٹ میں اس طرح چھپا ہوا ہے کہ دور سے نظر ہی نہیں آتا۔"

گھر کا بیرونی دروازہ کھلا۔ نذیر خاں اندر داخل ہوا۔

قیصر مرزا نے سرگوشی کی۔ "میں اب واپس جا رہا ہوں۔ مگر رات کو ٹھیک ساڑھے دس بجے پہنچ جاؤں گا۔ تم موکھے کے پاس میرا انتظار کرنا۔"

صندلی نے آہستہ سے گردن ہلا کر رضامندی کا اظہار کیا۔

نذیر خاں نے قریب پہنچ کر قیصر مرزا سے کہا۔ "حاجی صاحب آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔"

قیصر مرزا اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور نذیر خاں کے ساتھ باہر چلا گیا۔

(۶)

رات نکھری نکھری تھی۔ ہر طرف گہرا سناٹا چھایا تھا۔ آسمان پر ستاروں کے کنول روشن تھے۔ صندلی موکھے کے پاس جنگلی جھاڑیوں کی اوٹ میں دبکی ہوئی بیٹھی تھی۔ موکھے کے دوسری طرف بھی گھنی جھاڑیاں تھیں۔ یہ موکھا محل کی چار دیواری کی اینٹیں ٹوٹ کر گر جانے سے بن گیا تھا۔ اتنا بڑا تھا کہ اس میں سے گزر کر آسانی سے باہر جایا جا سکتا تھا اور اسی آسانی آنے والا اندر آ سکتا تھا۔ کسی زمانے میں محل کے نوکر چاکر اسے چوری چھپے آنے جانے کے لئے استعمال کرتے تھے۔ مگر اب دونوں طرف جنگلی جھاڑیاں اس طرح پھیل گئی تھیں کہ کوئی ادھر کا رُخ نہ کرتا۔ اس موکھے کا علم بھی چند ہی ملازمین کو تھا۔ ان میں صندلی بھی شامل تھی۔

پہر رات گزرتے ہی صندلی موکھے کے پاس پہنچ گئی۔ اس وقت دس بھی نہیں بجے تھے۔ وہ خوب بن سنور کر آئی تھی۔ نہا دھو کر اس نے گلبدن کا نیا لہنگا پہنا۔ اس پر رنگین آڑی دھاریاں پڑی تھی۔ حاشیے پہ زربفت کی اونچی گوٹ لگی تھی۔ شلوکا بھی ریشمی تھا۔ شوخ رنگ کا تھا اور خوب کسا ہوا تھا۔ آنکھوں میں گہرا دنبالہ سُرمہ تھا اور ہونٹوں پر پان کا لاکھا تھا۔ وہ اس وقت بہت مسرور نظر آ رہی تھی۔ انگ انگ پھڑک رہا تھا۔ آئینے میں اپنی سج دھج دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

ہولے ہولے گنگنا رہی تھی۔

نذیر خاں نے اُسے اس قدر مگن پایا تو مسکرا کر ٹوکا۔ "آج تو ہماری بیٹا بہت خوش نظر آ رہی ہے۔ پر سانجھ ہوتے ہی تو کدھر چلی؟"

صندلی نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ ہنس کر بولی۔ "محل جا رہی ہوں۔ دیر سے لوٹوں گی کل تو واپس اناؤ چلی جاؤں گی۔" یہ کہتی ہوئی وہ گھر سے باہر چلی گئی۔

صندلی محل میں پہنچی۔ ادھر ادھر گھومتی رہی۔ ہنستی بولتی رہی اور جب سناٹا چھا گیا تو سب کی نظروں سے بچتی بچاتی پچھواڑے کے دروازے پر پہنچی۔ اسے کھولا۔ چوکنا نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ باہر نکلی۔ چھپتی چھپاتی موکھے کے پاس پہنچی اور بے چینی سے قیصر مرزا کا انتظار کرنے لگی۔

☆

موسم بہت خوشگوار تھا۔ مگر خنکی بڑھ گئی تھی۔ صندلی چھپی ہوئی چادر اوڑھے ہوئے تھی۔ احتیاطاً موٹی دوہر بھی اپنے ساتھ لائی تھی۔ خنکی محسوس ہوئی تو اس نے دوہر کندھوں پر ڈال لی۔ کھڑے کھڑے تھک گئی تو فرش پر پھسکڑا مار کر بیٹھ گئی۔ یہ جھاڑیوں کی اوٹ میں نرم نرم گھاس کا چھوٹا سا قطعہ تھا اور ہموار بھی تھا۔ صندلی ٹکٹکی باندھے موکھے کو تک رہی تھی۔ دس بجے، ساڑھے دس بجے، صندلی کی بے قراری بڑھ گئی۔ پونے گیارہ بج گئے، گیارہ کا عمل ہو گیا۔ لیکن موکھے پر کوئی پرچھائیں نہ ابھری۔ کوئی آہٹ نہ ہوئی۔ قیصر مرزا نہ آیا۔ قریب کی ایک جھاڑی میں جھینگر زور زور سے بول رہے تھے۔

کچھ اور وقت گزر گیا۔ صندلی نے مایوسی کے عالم میں گہری سانس بھری۔ اٹھ کر کھڑی ہوئی اور واپس جانا چاہا۔ وہ مڑی۔ چند ہی قدم چلی تھی کہ جھاڑیوں میں آہٹ ہوئی۔ وہ چونکی۔ ٹھٹک کر جہاں تھی وہیں رہ گئی۔ پلٹ کر چوکنا نظروں سے موکھے کی جانب دیکھا۔ مگر وہاں کوئی نہ تھا۔ اس نے مڑ کر محل کی جانب دیکھا۔ محل اندھیرے میں ڈھنڈار نظر آ رہا تھا۔ صرف برساتی میں ایک بلب روشن تھا اور اس سے بھی آگے۔ دُور محل کے پھاٹک پر دھندلی دھندلی روشنی نظر آ رہی تھی۔ صندلی نے واپس جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ خاموش کھڑی رہی۔ ایک بار پھر

جھاڑیوں میں ہلکی سی آہٹ ہوئی۔ ایک پرچھائیں قریب ہی لہرائی۔

صندلی کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ "کون؟" اس کی آواز خوف سے تھرتھرا رہی تھی۔

"ڈرو نہیں۔ میں ہوں۔" قیصر مرزا اندھیرے سے نکل کر اس کے سامنے آگیا۔ صندلی بڑھ کر اس کے سینے سے چمٹ گئی۔ "آپ نے تو سچ مچ ڈرا دیا۔ کس طرف سے آئے؟"

صندلی ابھی تک سہمی ہوئی تھی۔ اس کا جسم کپکپا رہا تھا۔ قیصر مرزا نے اس کی پیٹھ ہولے ہولے تھپکتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ "موکھے ہی سے اندر داخل ہوا تھا۔ پہنچنے میں دیر ہوگئی۔" اسی وقت قدموں کی آہٹ ابھری۔ ایک پہریدار محل کے سامنے سے گزرا۔ صندلی نے ہاتھ بڑھا کر جلدی سے قیصر مرزا کے منہ پر رکھ دیا۔

دونوں نے مڑ کر دیکھا۔ پہریدار کندھے پر بندوق رکھے، رک رک کر کھنکارتا ہوا دھندلی دھندلی روشنی میں آگے بڑھ رہا تھا۔ محل کے نکڑ پر پہنچ کر وہ مڑا اور اندھیرے میں غائب ہوگیا۔ مگر اس کی کھنکار اور قدموں کی آہٹ دیر تک خاموشی میں اُبھرتی رہی۔ صندلی ابھی تک خوف زدہ تھی اور قیصر مرزا کے سینے سے لگی ہوئی کھڑی تھی۔ قیصر مرزا کا جسم عطرِ حنا کی تیز خوشبو سے مہک رہا تھا۔

"تم یہاں کب پہنچ گئی تھیں؟" قیصر مرزا نے دریافت کیا۔

"میں تو دس بجے سے پہلے ہی پہنچ گئی تھی۔" صندلی نے شکوہ کیا۔ "آپ نے بہت انتظار کرایا۔"

"مجھے آغا جانی کے پاس دیر ہوگئی۔ میں اُسے بھی اپنے ساتھ لانا چاہتا تھا۔ مگر عین وقت پر ایک ضروری کام نکل آیا۔ لہٰذا وہ یہاں آ نہیں سکا۔"

"اچھا ہوا آپ انہیں نہیں لائے۔" صندلی نے مسکرا کر کہا۔ "انہیں دیکھ کر میرا تو ڈر کے مارے نہ جانے کیا حال ہو جاتا۔ آپ ہی نے تو بتایا تھا کہ وہ بہروپ بھر کر بہت ڈراؤنے نظر آتے ہیں۔"

قیصر مرزا نے پوچھا۔ "تم نے محل کے پچھواڑے کا دروازہ تو کھول دیا گیا ہوگا؟"

"دروازہ کھلا ہے۔ میں اسی سے گزر کر یہاں آئی ہوں۔" صندلی نے دبی زبان سے دریافت

کیا۔ "کب تک محل میں جانے کا ارادہ ہے؟"

"ٹھیک اس وقت جب رات آدھی ہو جائے گی۔"

"آدھی رات ہونے میں تو ابھی دیر ہے۔ اتنی دیر تک یوں کیسے کھڑے رہیں گے۔"
اس نے جھک کر نیچے دیکھا۔ اپنی دوہر اتاری اور گھاس پر بچھا کر بولی۔ "آیئے، کچھ دیر یہاں بیٹھ کر کمر سیدھی کر لیجئے۔ سفر کی تکان بھی دور ہو جائے گی۔"

قیصر مرزا خاموشی سے دوہر پر بیٹھ گیا۔ صندلی بھی لنگا سمیٹ کر اس کے پاس بیٹھ گئی۔ قیصر مرزا ہلکے کاہی ملگجے کا اونی کرتا اور اس کے اوپر مخمل کی سرخ صدری پہنے ہوئے تھا۔ صدری کے گریبان اور آستینوں پر کلابتو کا کام تھا۔ اس نے جیب سے چھوٹا سا کنگھا نکالا اور سر کے بکھرے ہوئے بالوں کو دوسرے ہاتھ کی مدد سے سنوارا۔ رومال سے چہرے کا گرد و غبار صاف کیا اور نظریں اٹھا کر محل کی جانب دیکھنے لگا۔ گہرے نیلے آسمان پر ستارے جگمگا رہے تھے۔ ان کی اجلی اجلی روشنی میں قیصر مرزا کی سج دھج اور نکھر گئی تھی۔ وہ کسی کج کلاہ شہزادے کی طرح خوبصورت اور وجیہہ نظر آ رہا تھا۔

صندلی نے اسے نظر بھر کر دیکھا۔ مسکرا کر بولی۔ "اس لباس میں تو آپ واقعی پرستان کے شہزادے نظر آتے ہیں۔"

"میں طلعت آرا کے پاس ایسے ہی لباس میں جایا کرتا تھا۔"

"وہ آپ کے بارے میں مغالطے میں رہیں تو ان کا مغالطہ بے جا نہ تھا۔" صندلی بدستور شوخی سے مسکراتی رہی۔ "یقین مانئے اس وضع قطع میں آپ بہت اچھے لگتے ہیں۔ جی چاہتا ہے بس دیکھتے ہی رہو۔"

"تم بھی تو اس وقت نکھری نکھری اور حسین لگ رہی ہو۔" قیصر مرزا نے مسکرا کر اسے چھیڑا۔ "واللہ غضب ڈھا رہی ہو۔ چہرے پر نظر نہیں ٹھہرتی۔"

"ہٹیئے، کیوں خواہ مخواہ بنا رہے ہیں۔" صندلی نے شرما کر ایک خاص ادا سے اُسے دیکھا۔ "کہاں اچھی لگ رہی ہوں۔"

"دن میں تو ایسی مرجھائی مرجھائی لگ رہی تھیں کہ مجھے تو تمہاری طرف سے تشویش

پیدا ہو گئی تھی۔ مگر اس وقت تو ایسا نکھار ہے کہ میں تم سے کیا بتاؤں۔"

"ایک بات کہوں۔ مان لیجیے گا؟"

"کہو، کیا کہنا چاہتی ہو؟"

"دیکھئے ابھی کچھ نہیں گیا۔ ابھی وقت ہے۔ باز آجائیے۔ رانی صاحبہ کے پاس جانے کا ارادہ دل سے نکال دیجئے۔ اس میں خطرہ ہی خطرہ ہے۔"

"اب تو آ ہی گیا ہوں۔ طلعت آرا سے ملے بغیر نہیں جاؤں گا۔" قیصر مرزا اپنی ضد پر اڑا رہا۔ "اسے یہ بتلا کے رہوں گا کہ گلفام کا قتل کسی اور نے نہیں اس کے شوہر نے کیا ہے۔"

"مان لیجئے انہیں یہ راز معلوم ہو گیا اور انہوں نے اس پر یقین بھی کر لیا تو حاصل کیا ہوگا؟"

قیصر مرزا در اصل یہی چاہتا تھا کہ طلعت آرا کو یہ معلوم ہو جائے کہ گلفام کا قاتل اس کا شوہر ہے۔ اور جب یہ راز افشا ہو جائے گا تو وہ ایک بار پھر اپنے شوہر سے برگشتہ ہو جائے گی۔ دونوں میں کشیدگی بڑھے گی اور طلاق کی نوبت آ جائے گی۔ طلاق ہو جانے کی صورت میں اس کا راستہ صاف ہو جائے گا۔ یہ امکان روشن ہو جائے گا کہ طلعت آرا کے ساتھ اس کا عقد ہو جائے۔ طلعت آرا اس کی ہو جائے گی تو ساری پریشانیاں، ساری مصیبتیں دُور ہو جائیں گی۔ اسے اپنی محبوبہ بھی مل جائے گی جس کی زلف گرہ گیر میں وہ ابھی تک اسیر تھا اور اس کے ساتھ ساتھ حیدر گڑھ کا تعلقہ بھی اس کے قبضے میں ہوگا۔ مگر یہ بات وہ صندلی کو بتا نہ سکتا تھا۔

صندلی نے اسے خاموش پایا تو عاجزی سے بولی۔ "میری بات مان لیجئے۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ خدا نخواستہ آپ کسی مصیبت میں پھنس گئے تو میں بے موت مر جاؤں گی۔ یہ صدمہ برداشت نہیں کر سکوں گی۔ آپ یہ کیوں نہیں سوچتے کہ یہ بارہ دری نہیں۔ ریاست حیدر گڑھ کا محل ہے۔ یہاں قدم قدم پر خطرہ ہے۔" اس نے بے قرار ہو کر قیصر مرزا کے پیر پکڑ لیے۔

"ارے، ارے، یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ ایسی بدشگونی کی باتیں نہ کرو۔" قیصر مرزا نے گھبرا کر کہا۔ "ایسی باتیں کرو کہ دل بہلے، کچھ وقت کٹے۔" اس نے صندلی کا ہاتھ پکڑا اور اپنی طرف کھینچا۔ "دیکھو رات کتنی خوبصورت ہے۔ اور مری جان، تم اس سے بھی زیادہ خوبصورت ہو۔"

صندلی وارفتہ ہو کر اس کے پہلو میں ڈھیر ہو گئی۔

رات جاگ رہی تھی۔ ستاروں کے کنول جھل ملا رہے تھے۔ جھاڑیوں میں جھینگروں کی تیز آوازیں ابھر رہی تھیں۔

☆

محل کے گھڑیالی نے بارہ بجے کا گجر بجایا۔ گجر کی آواز رات کے سناٹے دیر تک گونجتی رہی۔ قیصر مرزا گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ "آدھی رات ہو گئی۔ اب چلنا چاہیئے۔"

صندلی بھی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے اپنے بکھرے ہوئے بال سمیٹ کر جوڑا باندھ لیا۔ لہنگا درست کیا اور انگڑائی لے کر بولی۔ "چلیئے۔"

دونوں اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ صندلی نے دوہرا اٹھائی جو اوس سے نم ہو گئی تھی۔ دوہرا اس نے اوڑھی نہیں۔ تہہ کر کے بغل میں دبالی۔ وہ آگے بڑھی۔ قیصر مرزا اس کے پیچھے چلا۔ دونوں خودرو پودوں، جنگلی جھاڑیوں اور گھنے درختوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے محل کے پچھواڑے پہنچے اور اندھیرے میں رک کر کھڑے ہو گئے۔ سامنے چٹیل میدان تھا۔ میدان زیادہ وسیع نہ تھا۔ میدان کے اس پار محل تھا جو رات کے اندھیرے میں سر اٹھائے کھڑا تھا۔ محل کی بالائی منزل کے ایک دریچے سے ہلکی ہلکی روشنی پھوٹ رہی تھی۔ دریچے کے دونوں پٹ کھلے تھے۔

قیصر مرزا نے کھلے دریچے کی جانب اشارہ کر کے صندلی سے پوچھا۔ "یہ طلعت آرا کا کمرہ تو نہیں ہے؟"

"جی ہاں، یہ اُنھی کا کمرہ ہے۔"

"طلعت آرا تو اب سو رہی ہو گی۔"

"ہاں، اب تو انہیں سو جانا چاہیئے۔ رات آدھی ہو گئی۔" صندلی نے قیصر مرزا کو مطلع کیا۔ "ویسے وہ آجکل رات کو دیر تک پڑھتی رہتی ہیں۔ اس لئے سوتی بھی دیر سے ہیں۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر ایک کھڑکی کی جانب اشارہ کیا جو بند تھی۔ "یہ کھڑکی دیکھ رہے ہیں۔ اس کھڑکی سے آپ کو رانی صاحبہ کے کمرے تک جانا ہو گا۔"

"فاصلہ تو کچھ زیادہ نہیں ہے۔" قیصر مرزا نے بے نیازی سے کہا۔ "بہت ہو گا تو بیس گز

یا اس سے کچھ زیادہ ہو گا۔"

"مجھے فاصلے کا کچھ اندازہ نہیں۔ مگر جس کارنس سے گزر کر آپ کو خواب گاہ کی کھڑکی تک جانا ہو گا وہ بہت خطرناک ہے۔"

"خطرناک ہے۔ کیا مطلب؟" قیصر مرزا نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

"مطلب یہ کہ اتنی پتلی ہے کہ اس پر چلنا آسان نہیں۔" مندلی نے جواب دیا۔ "ابھی چل کر خود اسے دیکھ لیجئے گا۔"

"کھڑی کیوں ہو؟ آگے بڑھو۔" قیصر مرزا نے بے چینی کا اظہار کیا۔ "بارہ بج چکے ہیں۔ اب تاخیر نہیں ہونا چاہیئے۔"

"پہریدار کو گزر جانے دیجئے۔ ورنہ میدان سے گزرنا خطرے سے خالی نہیں۔" مندلی نے وضاحت کی۔

انہیں زیادہ دیر انتظار نہ کرنا پڑا۔ سناٹے میں کھنکار ابھری اور اس کے ساتھ ہی موڑ سے پہریدار نمودار ہوا۔ دونوں قریب کی جھاڑی میں دبک گئے۔ پہریدار کے قدموں کی آہٹ قریب آتی گئی۔ وہ ان کے سامنے سے آہستہ آہستہ چلتا ہوا آگے نکل گیا۔ جب اس کی چاپ سناٹے میں تحلیل ہو کر ختم ہو گئی تو مندلی نے جھاڑی کی اوٹ سے نکل کر چوکنا نظروں سے ادھر اُدھر دیکھا۔ قیصر مرزا کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ "آیئے۔ پہریدار اب پورے محل کا گشت لگا کر اس طرف آئے گا۔" وہ آگے بڑھی اور تیز تیز قدموں سے چلنے لگی۔ قیصر مرزا سائے کی طرح اس کے ہمراہ تھا۔

دونوں نے میدان عبور کیا۔ دروازے پر پہنچ کر مندلی نے کان لگا کر سن گن لی۔ ہر طرف گہری خاموشی چھائی تھی۔ اس نے ہولے سے دروازے کو دھکا دیا۔ ایک پٹ کھل گیا۔ مندلی اندر چلی گئی۔ قیصر مرزا باہر کھڑا رہا۔ ذرا دیر بعد دروازے پر مندلی نمودار ہوئی۔ ہاتھ ہلا کر قیصر مرزا کو بلایا۔ اشارہ ملتے ہی وہ بھی اندر چلا گیا۔ مندلی نے دروازہ بند کر دیا۔

دونوں ایک نیم تاریک گلیارے سے گزر کر زینے کے پاس پہنچے۔ قیصر مرزا پہلے اس طرف نہیں آیا تھا۔ زینے میں بھی روشنی کم تھی۔ زینہ تنگ بھی تھا اور خم کھاتا ہوا دوسری منزل کی

بلندی پر جاتا تھا۔ قیصر مرزا اور صندلی نے سنبھل سنبھل کر سیڑھیاں طے کیں اور اوپر پہنچ گئے۔ ان کے سامنے ایک کشادہ اور طویل غلام گردش تھی۔ جس کے نکڑ پر ایک بلب روشن تھا۔ غلام گردش بالکل سنسان تھی۔ نہ کوئی آہٹ تھی نہ آواز۔

زینہ جہاں ختم ہوتا تھا وہاں سے چند قدم کے فاصلے پر دائیں جانب دیوار میں ایک کھڑکی تھی جو محل کے پچھواڑے کھلتی تھی۔ کھڑکی چھوٹی تھی اور فرش سے اتنی بلندی پر تھی کہ صندلی نے پنجوں کے بل کھڑے ہو کر اسے کھولا۔ قیصر مرزا اس کے قریب پہنچ گیا۔ صندلی نے کھڑکی کا ایک پٹ ذرا سا کھول دیا۔ دونوں نے چوکھٹ کا سہارا لیا اور جھک کر باہر دیکھا۔ میدان میں ہُو کا عالم تھا۔ درخت سائیں سائیں کر رہے تھے۔ کھڑکی کے عین نیچے کارنس تھی جو دیوار کے ساتھ ایک سرے سے دوسرے سرے تک جاتی تھی۔ قیصر مرزا نے کارنس دیکھی تو گھبرا گیا۔ صندلی کا قیاس غلط نہ تھا۔ کارنس ہاتھ بھر سے زیادہ چوڑی نہ تھی۔ طلعت آرا کے کمرے کی کھڑکی کا فاصلہ بھی اس کے اندازے سے کچھ زیادہ ہی تھا۔ کارنس پر چل کر وہاں تک پہنچنا واقعی خطرناک تھا۔

صندلی نے اسے خاموش پایا تو سرگوشی کی۔ "میں نے غلط تو نہیں کہا تھا۔ اتنی پتلی کارنس پر چل کر آپ اس کھڑکی تک پہنچ سکتے ہیں؟ بہت مشکل ہے۔"
"مشکل تو ہے مگر اسی سے گزر کر میں طلعت آرا کے کمرے کی کھڑکی تک پہنچنے کی کوشش کروں گا۔"

"مجھے نہ جانے کیوں ہول ہو رہا ہے۔" صندلی نے قیصر مرزا کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سینے پر رکھ لیا۔ "دیکھئے، میرا دل کس بری طرح دھڑک رہا ہے۔"
قیصر مرزا کچھ نہ بولا۔ کھڑکی کی چوکھٹ پر چڑھا اور دوسری طرف اتر گیا۔ صندلی نے ٹوکا۔ "میری بات تو سنیئے۔" مگر قیصر مرزا نے توجہ نہ دی۔ آگے بڑھ گیا۔ صندلی کھڑکی سے گردن باہر نکالے سہمی ہوئی نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔

☆

کارنس بالکل سپاٹ تھی اور اس کی لگر آگے سے جھکی ہوئی بھی تھی۔ کہیں کہیں پھپلی

برسات کی کائی جمی ہوئی تھی۔ قدم قدم پر پیر پھسلنے کا اندیشہ تھا۔ البتہ محل کی دیوار لکھوری اینٹ کے بجائے گگّے کی بنی ہوئی تھی۔ اس پر کانپ اور گارے کی استرکاری بھی نہ تھی۔ صرف چنائی کی گئی تھی۔

قیصر مرزا نے جھک کر نیچے دیکھا تو دہل گیا۔ کارنس لگ بھگ پندرہ فیٹ اونچی تھی۔ اسے کارنس پر چلنے کی کوئی مشق نہ تھی۔ کبھی اتفاق ہی نہ ہوا۔ مگر اسے دیوار کی چنائی سے مدد ملی۔ اس میں انگلیوں کی پکڑ کے لئے گنجائش تھی۔ قیصر مرزا نے دونوں ہاتھ پھیلا کر دیوار کا سہارا لیا اور پھونک پھونک کے قدم اٹھانے لگا۔ اس کا منہ اس دریچے کے رُخ پر تھا جس سے ہلکی ہلکی روشنی ابھر رہی تھی۔ وہ جلد سے جلد اس دریچے پر پہنچ جانا چاہتا تھا۔

اس نے نصف سے کچھ زیادہ ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ رات کے سنّاٹے میں پہریدار کی کھنکار ابھری۔ قیصر مرزا گھبرا گیا۔ اسے پہریدار کے گزر جانے کا انتظار کرنا چاہیئے تھا۔ واپس جانا ممکن نہ تھا اور طلعت آرا کا کمرہ بھی دُور تھا۔ پہریدار کے قدموں کی آہٹ قریب آتی جا رہی تھی۔ قیصر مرزا نے چاہا کہ پہریدار کے پہنچنے سے پہلے وہ کھڑکی تک پہنچ جائے۔ مگر گھبراہٹ اور عجلت میں توازن بگڑ گیا۔ اس کا ایک پیر رُپٹا اور وہ ڈگمگا گیا۔ پیر پھسل کر کارنس سے نیچے چلا گیا۔ لیکن اس نے دیوار کو مضبوطی سے پکڑ لیا اور جہاں تھا وہیں رُک گیا۔

قدموں کی آہٹ قریب، اور قریب آتی گئی۔ قیصر مرزا نے گردن گھما کر اس طرف دیکھا۔ تاروں کی روشنی میں پہریدار سائے کی مانند دھندلا دھندلا نظر آرہا تھا۔ وہ ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتا رہا۔ پہریدار خوب لمبا تڑنگا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بندوق تھی جسے وہ کندھے سے لگائے ہوئے تھا۔ وہ مستعدی سے آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔ جب وہ بالکل سامنے پہنچ گیا تو قیصر مرزا اس کی طرف رُخ کرکے نہ دیکھ سکا۔ ڈرا اور سراسیمہ ہو کر دیوار سے چپک گیا۔ پہریدار زور سے کھنکارا اور قدموں کی آہٹ بند ہو گئی۔ قیصر مرزا لرز کر رہ گیا۔ اسے اپنے اناڑی پن کا شدّت سے احساس ہوا۔ نہ وہ آگے جا سکتا تھا نہ پیچھے اور نہ ہی اتنی بلندی سے کود کر راہ فرار اختیار کر سکتا تھا۔ اگر پہریدار نے دیکھ لیا تو کیا ہو گا؟ پکڑا گیا تو اپنی صفائی میں کیا عذر پیش کرے گا؟ نہ وہ کسی طور طلعت آرا کا نام لے سکتا تھا نہ یہ کہہ سکتا تھا کہ وہ چوری کی نیت

سے آیا تھا۔ آغا جانی کو بھی یہ نہ سوجھی کہ ایسی صورت میں کیا کیا جائے۔ مرواد یا سالے نے۔ بڑا حکیم لقمان بنا پھرتا ہے۔ غلطی اپنی بھی تھی۔ جلد بازی میں صندلی کی بات بھی نہ سنی۔ شاید وہ اسی خطرے سے خبردار کرنا چاہتی تھی۔ چلنے سے پہلے انجام پر مطلق دھیان نہ دیا۔ کچھ بھی تو نہ سوچا۔ نہ جانے اب کیا ہوگا؟

قیصر مرزا کے پیر لرز رہے تھے۔ انگلیوں کی گرفت ڈھیلی پڑتی جا رہی تھی۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا رہا تھا۔ دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ چہرہ پسینے سے شرابور تھا۔

گہرے سناٹے میں پہریدار کی کھنکار کہیں دُور سنائی دی۔ وہ اب آگے جا چکا تھا۔ وہ کب آگے بڑھا۔ کب دُور پہنچا۔ قیصر مرزا کو کچھ خبر نہ ہوئی۔ کھنکار سن کر وہ چونکا۔ اس نے اطمینان کی سانس لی۔ حواس ذرا بجا ہوئے تو اس نے مڑ کر چٹیل میدان کی جانب دیکھا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ ہر سو ویرانی چھائی تھی۔

قیصر مرزا دیوار کے سہارے ہولے ہولے آگے بڑھا اور اس کھڑکی پر پہنچ گیا جس سے ہلکی ہلکی روشنی پھوٹ رہی تھی۔ کھڑکی پر پردہ پڑا تھا۔ کمرے میں گہری خاموشی چھائی تھی۔ اس نے جھک کر چوکنا نظروں سے اندر دیکھا۔ مگر کھڑکی کا ایک پٹ اس طرح حائل تھا کہ وہ صرف اتنا اندازہ لگا سکا کہ مسہری پر کوئی لیٹا ہے۔ اس نے چوکھٹ مضبوطی سے پکڑی۔ اچھل کر اوپر پہنچا اور نیچے اتر گیا۔ لیکن احتیاط کے باوجود ایک پیر پردے سے الجھا اور وہ لڑکھڑا گیا۔

"کون ہے؟" کمرے کی خاموشی میں آواز ابھری۔ قیصر مرزا فوراً پہچان گیا۔ یہ طلعت آرا کی آواز تھی۔

قیصر مرزا پردے کی اوٹ سے نکل کر روشنی میں آ گیا۔ سامنے مسہری پر طلعت آرا لیٹی تھی۔ قیصر مرزا کو دیکھتے ہی وہ ہڑبڑا کر اٹھی اور تکیوں کے سہارے بیٹھ گئی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور آنکھوں میں نیند کا خمار تھا۔ وہ شب خوابی کا ڈھیلا ڈھالا ریشمی لباس پہنے ہوئے تھی۔ اس نے حیران و پریشان ہو کر کہا۔ "آپ، آپ!!" وہ آگے کچھ نہ کہہ سکی۔ وہ خوف زدہ اور سہمی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

"تم اس قدر ڈری ہوئی کیوں ہو؟" قیصر مرزا نے مسکرا کر اسے مخاطب کیا۔ "طلعت آرا!

تم نے مجھے پہچانا نہیں۔ میں ہوں شہزادہ گل رخ۔"

"میں نے آپ کو پہچان لیا۔ مگر آپ کا ادھر کیسے پھیرا ہوا؟"

"بہت دنوں سے تمہاری یاد ستا رہی تھی۔" قیصر مرزا نے گہری سانس بھری۔ "آج کچھ ایسا دل بے قرار ہوا کہ محفل میں دل نہ لگا۔ سبز پری ناچ رہی تھی۔ اس کا ناچ مجھے پسند بھی ہے۔ آج تو اُس پر اس غضب کا نکھار تھا کہ میں تم سے کیا بیان کروں۔ ظالم ہے بھی ایسی خوبصورت کہ نظر نہیں ٹھہرتی۔" وہ ان پرانے مکالموں کو دہرانے لگا جو کبھی آغا جانی نے اسے رٹلائے تھے اور اُن کو برمحل ادا کرنے کی باقاعدہ تربیت بھی دی تھی۔ "مگر تمہاری یاد کچھ اس طرح رہ رہ کے آئی کہ طبیعت اچاٹ ہو گئی۔ نہ ناچ اچھا لگا نہ گانا۔"

طلعت آرا نے کچھ نہ کہا۔ خاموش بیٹھی رہی۔ اس کے قریب ہی میز پر لیمپ روشن تھا۔ اس روشنی میں وہ کچھ اور دل آویز اور حسین نظر آ رہی تھی۔ اب وہ پہلی سی دھان پان طلعت آرا نہ رہی تھی۔ گداز اور زیادہ ہی طرح دار ہو گئی تھی۔

قیصر مرزا نے اسے دیکھا تو مبہوت ہو گیا۔ بے تاب ہو کر گویا ہوا۔ "تم تو اب اور زیادہ خوبصورت ہو گئی ہو۔ سچ کہہ رہا ہوں طلعت آرا تم اس وقت بہت خوبصورت لگ رہی ہو۔"

وہ آہستہ آہستہ اس کی جانب بڑھنے لگا۔

طلعت آرا اب خاموش نہ رہ سکی۔ اُس نے مسہری کے پہلو میں رکھے ہوئے ایک صوفے کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا۔ "تشریف رکھیئے۔" اس نے شانوں پر بکھرے ہوئے بالوں کو سمیٹ کر بے نیازی سے پشت پر ڈال لیا۔

قیصر مرزا معمول کے مطابق بیٹھنا تو اس کے ساتھ مسہری پر چاہتا تھا لیکن اس نے ایسا نہ کیا خاموشی سے صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ پھر صفائی پیش کی۔ "تم سوچ رہی ہو گی کہ میں اتنے طویل عرصے تک تمہارے پاس کیوں نہیں آیا۔ ہوا یہ کہ ابا حضور اچانک سخت علیل ہو گئے۔ لہٰذا ولی عہد کی حیثیت سے ان کے شاہی فرمان کے مطابق مجھے حکومت کی ذمّہ داری سنبھالنا پڑی۔ کاروبار سلطنت میں ایسا الجھا کہ سر اٹھانے کی مہلت نہ ملی۔" قیصر مرزا نے طلعت آرا کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی۔ "لیکن یقین مانو تمہاری یاد سے غافل نہیں رہا۔"

"تو گویا آج کل آپ شاہ جن ہیں"۔ طلعت آرا اب خوف اور گھبراہٹ پر قابو پا چکی تھی۔ اس کا لہجہ سنبھلا ہوا تھا۔ "تب تو آپ کی آمد سے پہلے زیادہ تیز خوشبو پھیلنا چاہیئے تھی۔ ایک کے بجائے کئی غلام آتے۔ آج تو آپ کا وہ غلام بھی نہیں آیا۔ وہی جو کالا چوغا پہنے، لومڑی کی کھال کی سینگ دار ٹوپی اوڑھے، اپنا کالا کلوٹا خوف ناک چہرہ لئے اس طرح داخل ہوتا تھا کہ دل دہل جاتا تھا۔ کہاں ہے وہ؟"

قیصر مرزا اس کی باتیں سن کر چونکا۔ طلعت آرا کا لہجہ بالکل بدلا ہوا تھا۔ وہ اس کے سامنے بولتی ہی نہ تھی اور بولتی بھی تھی تو بہت کم بولتی تھی۔ اتنی ڈری سہمی ہوئی رہتی تھی کہ شروع شروع میں تو ٹھیک سے الفاظ بھی ادا نہ ہوتے تھے۔ آواز میں کپکپاہٹ ہوتی۔ شادی کے بعد وہ اس قدر بدل جائے گی، قیصر مرزا نے یہ سوچا بھی نہ تھا۔ اس نے طلعت آرا کو بتایا۔ "غلام تو میرے ہمراہ کئی آئے ہیں اور عنبر بھی آیا ہے جس کا تم ذکر کر رہی ہو۔ مگر کسی کو اس خیال سے یہاں نہ لایا کہ اس کا ڈراؤنا چہرہ دیکھ کر تم خوف سے چیخنا چلانا شروع کر دو۔"

"آپ پرستان سے آ رہے ہیں نا۔"

"سیدھا وہیں سے آ رہا ہوں۔ کیا تم کو اس کے بارے میں شبہ ہے؟" قیصر مرزا نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"جی نہیں، میں تو صرف یہ معلوم کرنا چاہتی تھی کہ پرستان ہے کہاں۔"

"کوہ قاف میں۔ تم کو پہلے بھی بتا چکا ہوں۔" قیصر مرزا نے اسے مشتبہ نظروں سے دیکھا۔ "آج یہ بات دوبارہ دریافت کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟"

"یہ میں اس لئے کہہ رہی ہوں کہ کوہ قاف میں نہ کوئی پرستان ہے نہ پریوں اور جنوں کا مسکن ہے۔" طلعت آرا نے نہایت اطمینان سے بتایا۔ "وہاں نہ جن رہتے ہیں، نہ دیو نہ پریاں ہیں نہ پری زاد۔ وہاں بھی ویسے ہی لوگ رہتے ہیں جو دوسرے عام انسانوں کی طرح ہوتے ہیں۔"

"یہ بات تم کو کس احمق نے بتائی؟" قیصر مرزا نے گھور کر اُسے دیکھا۔

مگر وہ اس کی خفگی سے ذرا مرعوب نہ ہوئی۔ "میں نے یہ کتابوں میں پڑھا ہے۔ میری سیکرٹری نے بھی یہی بتایا ہے۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے اور آئرلینڈ کی رہنے والی ہے۔ صبح اور

شام کو مجھے جو ٹیچرز پڑھانے آتے ہیں، وہ بھی یہی کہتے ہیں۔"

قیصر مرزا بہت سٹ پٹایا۔ اسے طلعت آرا کی باتوں سے پہلے ہی شبہ ہو گیا تھا کہ اس نے جو جال بچھایا تھا وہ ٹوٹ پھوٹ چکا ہے۔ طلعت آرا اب بارہ دری کی چار دیواری میں بند رہنے والی وہ لڑکی نہیں رہی تھی جو آنکھ بند کر کے اس کی ہر بات تسلیم کر لیتی تھی۔ اب وہ تبدیل ہو چکی تھی۔ چار دیواری کے حصار سے نکل کر باہر آ گئی تھی۔ بہرحال ابھی کچھ نہیں گیا تھا۔ جس مقصد سے وہ آیا تھا اس کے اظہار کا موقع اس نے خود مہیا کر دیا تھا۔ قیصر مرزا فوراً حرفِ مطلب زبان پر لایا۔

"اگر تم کو اس بات کا یقین ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ گلفام کا خون کس نے کیا؟"

طلعت آرا نے چونک کر اسے حیرت سے دیکھا۔ "آپ جانتے ہیں کہ گلفام کی موت کا ذمہ دار کون ہے؟"

"ہاں میں جانتا ہوں کہ وہ کون ہے اور تم کو یہی بتانے آیا تھا۔"

"کون ہے وہ؟" طلعت آرا مجسم سوال بن گئی۔

"تمہارے شوہر مرزا ساجد علی نے گلا گھونٹ کر گلفام کو مار ڈالا۔ شاید تم کو اس حقیقت کا علم نہیں۔"

"نہیں، مجھے اس حقیقت کا پورا پورا علم ہے۔" طلعت آرا نے نہایت سکون سے اسے بتایا۔ اس کا لہجہ بہت صاف تھا۔ اس کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔ اُس پر کسی قسم کے تاثرات نہیں تھے۔

اس کی صاف گوئی پر قیصر مرزا چکرا کے رہ گیا۔ اس نے قدرے توقف کیا۔ پھر تیکھے لہجے میں پوچھا۔ "یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ تمہارے بیٹے کا قاتل ہے، ایک مجرم ہے، تم اسے اپنا شوہر سمجھتی ہو۔ بیوی کی حیثیت سے اس کے ساتھ رہتی ہو۔" اس نے طلعت آرا کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی۔ "سنا ہے شروع شروع میں تم کو شبہ ہوا تھا کہ گلفام کا قاتل وہی ہے۔ تم اس قدر برہم ہوئیں کہ اس سے بات کرنا چھوڑ دی۔ اپنے کمرے میں اس کے داخلے پر پابندی لگا دی۔ وہ ناراض ہو کر اپنے والدین کے پاس تارا پور ہاؤس چلا گیا۔ مہینہ بھر تک وہاں رہا۔ کشیدگی

اتنی بڑھی کہ نوبت طلاق تک پہنچ گئی۔ مگر تمہاری اماں جان نے یہ کہہ کر صلح صفائی کرا دی کہ گلفام کا خون تمہارے شوہر نے نہیں جنوں نے کیا ہے۔ اور تم نے آنکھ بند کرکے ان کی بات پر یقین کر لیا۔ اب کہتی ہو کہ میں جنوں اور پری زادوں کو نہیں مانتی۔ ان کا کوئی وجود نہیں۔"

طلعت آرا اس کی باتیں سن کر ششدر رہ گئی۔ اس نے حیران و پریشان ہو کر کہا۔ "مگر یہ تمام باتیں آپ کو کیسے معلوم ہوئیں؟"

"پہلے میری بات کا صاف صاف جواب دو۔ یہ بعد میں پوچھنا۔" قیصر مرزا نے تلخی سے جواب دیا۔

"صاف بات سننا چاہتے ہیں تو سنیئے۔ اماں جان کا کہا تو صرف بہانا بن گیا۔ میں خود صلح صفائی کرنا چاہتی تھی۔ بیوی بن کر ان کے ساتھ رہنا چاہتی تھی۔"

"کیوں؟" قیصر مرزا نے جرح کرنے کے انداز میں سوال کیا۔

"انہی دنوں میرے ذاتی معالج ڈاکٹر پنٹو نے بتایا کہ میں پیٹ سے ہوں۔" طلعت آرا نہ جھجکی نہ شرمائی۔ نہایت صاف گوئی سے بولی۔ "اس انکشاف کے بعد میں نے اپنے شوہر سے علیحدگی کا خیال بالکل دل سے نکال دیا۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ گلفام کی طرح وہ بھی باپ کی شفقت سے محروم رہے۔ بڑا ہو تو اس کے بارے میں طرح طرح کی باتیں ہوں۔ پوچھنے پر یہ بھی نہ بتا سکے کہ اس کے ماں باپ کے درمیان کیوں علیحدگی ہوئی۔ کیسے ہوئی؟ اس کا اصل سبب کیا تھا؟ یہ علیحدگی میرے بچے کے لئے اور خود میرے لئے ایک ایسا اسکینڈل بن جاتی جو زندگی بھر ہم دونوں کے لئے شرمساری اور خفت کا باعث بنا رہتا۔ یہ بات میری سیکریٹری مس ایملی نے مجھے سمجھائی تھی۔ وہ بہت ذہین اور دور اندیش ہے۔"

"ہو گی۔ میں اسے نہیں جانتا۔" قیصر مرزا نے بے رخی سے کہا۔ "میں صرف یہ جانتا ہوں کہ تمہارا شوہر گلفام کا قاتل ہے اور تم گلفام سے دیوانہ وار محبت کرتی تھیں ورنہ رات کے اندھیرے میں اسے دیکھنے چوری چھپے عشرت منزل نہ آتیں۔"

"آپ نے بالکل ٹھیک کہا۔ میں اسے پاگلوں کی طرح چاہتی تھی۔ مگر شوہر سے علیحدگی کے بعد وہ مجھے واپس تو نہ ملتا۔" اس نے دل گرفتہ ہو کر ٹھنڈی سانس بھری۔ چہرے پر غم کے

سائے پھیل گئے۔" وہ بڑا بدنصیب بچہ تھا۔ ماں باپ کے ہوتے ہوئے بھی وہ بن ماں باپ کا تھا۔ نہ اسے باپ کی شفقت ملی نہ ماں کی ممتا۔ میں بدنامی کے ڈر سے نہ اسے اپنے پاس رکھ سکتی نہ دُور رکھ کر اس کی جدائی برداشت کر سکتی تھی۔ ہر دم اس کی فکر مجھے ستاتی رہتی تھی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس کے لئے کیا کروں۔ اسے کہاں رکھوں؟ آگے چل کر اس کا کیا ہوگا؟ یہ سوچ کر صبر کر لیا کہ موت نے اس کی مشکل آسان کر دی۔ اسے رُواں رواں ہونے سے بچا لیا۔"

"تم نے تو اپنے شوہر کو معاف کر دیا مگر میں اسے نہیں بخشوں گا۔" قیصر مرزا نے اسے دہشت زدہ کرنے کی کوشش کی۔" اس کے ساتھ جرم میں شریک ہونے کی تم کو بھی سزا ملے گی۔"

"دیکھئے زیادہ جلال میں نہ آیئے۔ مجھے یا میرے شوہر کو مکھی یا مچھر بنا کر ڈبیا میں بند کر کے پرستان لے جانے کی دھمکی نہ دیجئے۔ اب وہ ناٹک ختم ہو چکا ہے۔ جب ڈرا دھمکا کر آپ اپنی ہر بات مجھ سے منوا لیتے تھے۔"

"تم کہنا کیا چاہتی ہو؟۔" قیصر مرزا نے تیوری پر بل ڈال کر کہا۔

"میں یہ بتانا چاہتی ہوں کہ یہ بارہ دری نہیں ہے۔ یہ ریاست حیدر گڑھ کا محل ہے۔ یہاں دن رات پہرہ رہتا ہے۔ آن کی آن میں مسلح گارڈ یہاں پہنچ جائیں گے۔ فرار ہونے کا بھی موقع نہیں ملے گا۔ یہ بڑی خطرناک جگہ ہے۔ یہاں تو لاش کا بھی پتہ نہیں چلتا۔" طلعت آرا اب رانی حیدر گڑھ کا روپ اختیار کر چکی تھی۔ اس کے لہجے میں رعب اور دبدبہ پیدا ہو چکا تھا۔

"سچ سچ بتایئے آپ کون ہیں؟"

"صندلی نے بھی میرے بارے میں کچھ نہیں بتایا؟" قیصر مرزا صورت حال کی نزاکت محسوس کرتے ہوئے نرم پڑ گیا۔

"جی نہیں۔" طلعت آرا نے اسی طنطنے سے کہا۔" نہ میں نے اس سے پوچھا اور نہ ہی اس نے بتایا۔ ویسے بھی آپ کی اس سے ایک ہی ملاقات ہوئی تھی اور وہ بھی چند منٹ کی۔ میرا خیال ہے وہ آپ کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ البتہ اس روز عشرت منزل میں آپ کو دیکھ کر میں سمجھ گئی تھی کہ آپ ہی وہ ہیں جو شہزاد گل رخ کے روپ میں میرے پاس

آتے تھے۔ پرستان سے نہیں بلکہ عشرت منزل سے جو بارہ دری سے بالکل متصل ہے۔ صرف دیوار بیچ میں حائل ہے۔ مگر یہ بات میں صندلی پر ظاہر کرنا نہیں چاہتی تھی۔ آپ کو اچانک دیکھ کر اس قدر بدحواس بھی ہو گئی تھی کہ فوراً واپس چلی گئی۔ دوبارہ اس خوف سے وہاں نہیں گئی کہ کہیں آپ سے پھر مڈبھیڑ نہ ہو جائے۔"

قیصر مرزا نے اس کی کسی بات کی تردید نہ کی۔ صندلی کے بارے میں بھی کچھ بتانے سے گریز کیا۔ اس نے صاف گوئی سے کام لیا۔ اَب چھپانے سے کچھ حاصل نہ ہوتا۔ طلعت آرا کے سامنے وہ بے نقاب ہو چکا تھا۔ اس نے سنبھلے ہوئے لہجے میں بتایا۔ "میرا نام قیصر مرزا ہے اور میں نواب بوٹا مرحوم کا بیٹا ہوں۔ شاید تم نے ان کا نام سنا ہو۔"

"ان کا نام سنا ہے اور آپ کا بھی۔" طلعت آرا کے چہرے پر بدستور سنجیدگی طاری تھی۔ "تو آپ ہیں وہ قیصر مرزا جن کا رانی بجیا نے ذکر کیا تھا۔" اس نے آہستہ آہستہ گردن ہلائی۔ "انھوں نے تو اشاروں میں یہ بھی بتانا چاہا تھا کہ آپ ہی شہزادہ گل رخ ہیں اور نہ جن ہیں نہ پری زاد۔ مگر اُن دنوں میری عقل پر ایسے پردے پڑے تھے۔ جن اور آسیب کا وہم اس قدر حاوی تھا کہ میں کچھ نہ سمجھ سکی۔ ان کی کسی بات پر دھیان بھی نہ دیا۔ یقین ہی نہ آیا۔ آپ نے اور آپ کے اس ساتھی نے جو غلام کا ہیبت ناک روپ بھر کر آتا تھا، خوف اور دہشت کا جال ہی ایسا پھیلایا تھا کہ میری ایسی گھر کی چار دیواری میں بند رہنے والی لڑکی بھلا اس چلتر بازی کو کیا سمجھ پاتی۔ خدا بخشے رانی بجیا کو وہ میری مدد کو نہ آتیں تو نہ جانے آپ کے ہاتھوں میرا کیا حشر ہوتا۔"

"مجھے اتنا خودغرض اور مطلبی نہ سمجھو۔" قیصر مرزا نے کسی خفگی کا اظہار نہ کیا بلکہ صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔ "میں نے اس کا ایک آبرومندانہ اور معقول حل تلاش کر لیا تھا۔ میں تم سے باقاعدہ شادی کرنا چاہتا تھا۔ رانی صاحبہ مرحومہ سے نہ صرف اس کا ذکر کیا بلکہ ان سے مدد کرنے کی درخواست بھی کی تھی۔"

"جو ہونا تھا ہو گیا۔ اب اُن زخموں کو کریدنے سے کیا حاصل۔" طلعت آرا نے بات بڑھانے کی کوشش نہ کی۔ مگر قیصر مرزا بات ختم کرنا نہ چاہتا تھا۔ وہ ہر بات تفصیل سے بتا کر خود کو بے گناہ

اور معصوم ثابت کرنا چاہتا تھا۔ "میں ایک بار پھر تمہارے پاس آنا چاہتا ہوں۔"

طلعت آرا نے اس کی پوری بات بھی نہ سنی۔ تیکھے لہجے میں بولی۔ "کیوں؟ خیریت تو ہے؟ آپ کیوں آنا چاہتے ہیں۔ کوئی نیا گل کھلانے کا ارادہ ہے؟"

قیصر مرزا اس کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر گھبرا گیا۔ نرمی سے بولا۔ "میں اتنا برا نہیں جتنا تم سمجھ رہی ہو۔" اس نے فوراً بات بنائی۔ "میں تمہارے زیورات لوٹانے آؤنگا۔ وہ میرے پاس تمہاری امانت ہیں، حالانکہ اس کے پاس کوئی زیورات نہ تھے۔ آغا جانی انہیں بیچ کھوچ کر پہلے ہی ٹھکانے لگا چکا تھا۔ وہ صرف طلعت آرا کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ آئندہ آنے کی سبیل پیدا کرنا چاہتا تھا۔ مگر طلعت آرا نے اس کی مطلق حوصلہ افزائی نہ کی۔ سختی سے منع کر دیا۔ "آئندہ آپ یہاں آنے کی جسارت نہ کریں ورنہ سخت پشیمان ہوں گے۔"

قیصر مرزا کو اس کی بے اعتنائی نہایت شاق گزری۔ جھنجھلا کر بولا۔ "اپنے شوہر سے ڈرتی ہو؟"

"جی نہیں۔" طلعت آرا نے دبنگ ہو کر جواب دیا۔ "ایسی کوئی بات نہیں۔ انہیں پہلے ہی گلفام کے بارے میں سب کچھ بتا چکی ہوں اور انھوں نے میرے سامنے اس کے قتل کا کھلے دل سے اعتراف بھی کر لیا ہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے راز دار ہیں۔ اور ایک دوسرے پر اعتماد کرتے ہیں۔ ہمیں ایک دوسرے کی ضرورت بھی ہے۔ ریاست کا کاروبار چلانے کے لئے مجھے ان کی ضرورت ہے اور اس ریاست کا مالک اور مختار کہلانے کے لئے انہیں میری ضرورت ہے۔ اس طرح ہم نے آپس میں سمجھوتہ کر لیا ہے۔" اس نے قدرے توقف کے بعد کہا "شادی بھی سچ پوچھئے تو عورت اور مرد کے درمیان ایک سمجھوتہ ہی ہوتی ہے۔ اور اب تو میں ان کے بچے کی ماں بننے والی ہوں۔ اب ہمارا رشتہ اور مضبوط ہو گیا ہے۔ ہم ایک دوسرے سے اب زیادہ ہی محبت کرنے لگے ہیں۔"

قیصر مرزا حیرت سے اس کا منہ دیکھتا رہا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اب وہ اتنی معاملہ فہم اور حقیقت پسند ہو گئی ہے۔ ایسی دور اندیشی اور سمجھداری کی باتیں کرنے لگی ہے کہ وہ خود کو اس کے سامنے کمتر اور کم مایہ سمجھنے لگا۔ اس نے گھبرا کر نہایت سادگی سے اپنی محبت کا اظہار کیا۔ "مگر میں تو اب تک تم سے دیوانہ وار محبت کرتا ہوں اور اسی محبت

کے ہاتھوں مجبور ہو کر بے اختیار یہاں چلا آیا۔" اس نے دل گرفتہ ہو کر ٹھنڈی سانس بھری۔ اس کے چہرے پر اداسی چھا گئی۔

"آپ تو ایک بار پہلے بھی محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر یہاں آ چکے ہیں۔" طلعت آرا زیرِ لب مسکرائی۔ مگر یہ مسکراہٹ نہ تھی زہر خند تھا۔ "لیکن اس وقت یہ کلوپٹرا کا محل تھا۔"

"کلوپٹرا!" قیصر مرزا نے حیرت کا اظہار کیا۔

"جی ہاں کلوپٹرا۔" طلعت آرا نے جما کر کہا۔ "وہ قدیم مصر کی بہت مشہور ملکہ تھی اور بہت خوبصورت بھی تھی۔ اس کا یہ دستور تھا کہ اپنے غلاموں میں سے کسی بھی کڑیل جوان پر مہربان ہو جاتی۔ اُسے اپنی خواب گاہ میں رات کو بلا لیتی۔ وہ رات بھر خلوت میں اس کے ساتھ رہتا۔ صبح اسے زہر کا پیالہ پیش کیا جاتا۔ وہ اسے خوشی خوشی پی جاتا اور ٹھنڈے ٹھنڈے ملک عدم کو سدھار جاتا۔ اسے شہید محبت کہا جاتا تھا۔" طلعت آرا کے ہونٹوں پر ایک بار پھر زہر خند ہویدا ہوا۔ اس کا لہجہ کچھ اور کٹیلا ہو گیا۔ "آپ کی قسمت میں شہید محبت ہونا نہ لکھا تھا۔ آپ بال بال بچ گئے۔"

"یہ بات تم کو صندلی نے بتائی ہے؟" قیصر مرزا نے حیران و پریشان ہو کر دریافت کیا۔

"جی نہیں۔" طلعت آرا نے سختی سے تردید کی۔

"اس کے علاوہ اس بات کو کوئی اور نہیں جانتا۔" قیصر مرزا نے زور دے کر کہا۔

"یہ آپ کی خام خیالی ہے۔" طلعت آرا نے وضاحت کی۔ "یہاں کتنے ہی اور بھی ایسے ملازم ہیں جو اس محل سرا کے بہت سے سربستہ رازوں سے واقف ہیں۔"

"میں اس سلسلے میں صفائی پیش کرنا نہیں چاہتا۔ صرف اتنا کہوں گا کہ وہ مجھے قتل کرنے کی سازش تھی۔" قیصر مرزا نے پسپائی اختیار کر لی۔ اس نے طلعت آرا کو رام کرنے کے لئے ایک بار پھر اپنی محبت کا سہارا لیا۔ "یقین مانو طلعت آرا، میں تم کو اب تک بھولا نہیں۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "چاہوں بھی تو تم کو نہیں بھول سکتا۔"

"ایک وقت آئے گا جب آپ بھول جائیے گا۔ اسی طرح جیسے میں ایک ڈراؤنا خواب سمجھ کر سب کچھ بھول گئی۔" طلعت آرا نے دو ٹوک جواب دیا۔ "میں ایک بار پھر آپ کو خبردار

کردینا چاہتی ہوں کہ آئندہ یہاں آنے کی کوشش نہ کریں۔ یہ خیال اپنے ذہن سے نکال دیں کہ میں کسی بدنامی یا اپنے شوہر کے ڈر سے یہ بات کہہ رہی ہوں۔" اس نے قیصر مرزا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "کیا آپ کے یہاں آنے کی ان کو اطلاع نہیں ملے گی؟ اگر کسی نے نہ بھی مخبری کی تو میں خود ان کو بتادوں گی۔"

"لیکن میں ان زیورات کا کیا کروں؟ وہ تو بہرحال مجھے واپس کرنا ہیں۔" قیصر مرزا نے اپنی بات نباہنے کی کوشش کی۔

مگر بات بنی نہیں۔ طلعت آرا نے بے نیازی سے کہا۔ "انہیں اپنے ہی پاس رکھیے۔ مجھے ان کی ضرورت نہیں۔ آپ کے کام ہی آئیں گے۔ پرستان لے جا کر مرصّع کرانے کا تو محض بہانہ تھا۔ اُن کی ضرورت پڑ گئی ہوگی۔" اس نے قدرے تامّل کے بعد پیش کش کی۔ "ضرورت ہو تو میں آپ کی اور بھی مدد کرسکتی ہوں۔ اللہ نے مجھے بہت دے رکھا ہے۔"

قیصر مرزا کو معاً آغا جانی یاد آگیا۔ یہی وہ موقع تھا جب طلعت آرا سے کچھ اینٹھا جاسکتا تھا۔ لیکن بات کچھ اس ڈھب سے نکلی کہ وہ حرفِ مطلب زبان پر نہ لاسکا۔ آخر وہ بھی رئیس زادہ تھا۔ اس کی حمیت نے گوارہ نہ کیا کہ دستِ طلب دراز کرکے اور خود کو طلعت آرا کی نظروں میں گرالے۔ اس نے طلعت آرا کے چہرے کو بغور دیکھا اور صرف اتنا کہا۔ "تم میری یہ مدد کرسکتی ہو کہ ڈرائیور کو بلالو۔ اس سے کہو کہ مجھے لکھنؤ پہنچادے۔" اس کے لہجے میں وقار اور دبدبہ تھا۔

طلعت آرا نے خاموشی سے ہاتھ بڑھا کر دیوار میں لگا ہوا سوئچ دبایا۔ گھنٹی کی آواز سناٹے میں اُبھری۔ فوراً دروازے پر ہولے سے دستک ہوئی۔

طلعت آرا نے اُونچی آواز سے کہا۔ "اندر آجاؤ۔ دروازہ کھلا ہے۔"

دروازہ کھلا اور ایک مسلح پہریدار اندر داخل ہوا اور مودب ہوکر دہلیز کے نزدیک کھڑا ہوگیا۔ اس کی فوری آمد سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ باہر دروازے پر پہرہ دے رہا تھا۔

طلعت آرا نے اسے مخاطب کیا۔ "خدا بخش! نذیر خاں ڈرائیور کو بلا لاؤ۔"

"کوئی اور حکم سرکار؟" پہریدار نے پوچھا۔

"نہیں، تم اب جا سکتے ہو۔" طلعت آرا نے نخوت سے کہا۔

پہریدار خاموشی سے مڑا۔ دروازہ بند کیا اور باہر چلا گیا۔

قیصر مرزا اس کا طنطنہ دیکھ کر مرعوب ہو گیا۔ اس نے اظہار معذرت کیا۔ "معاف کرنا بے وقت آ کر میں تمہاری نیند میں مخل ہوا۔"

"نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔" طلعت آرا نے بے نیازی سے کہا۔ "میرے معمولات میں کچھ فرق آ جائے گا۔ میں علی الصباح اٹھتی ہوں۔ باغ میں جا کر کچھ دیر چہل قدمی کرتی ہوں۔ واپس آ کر ناشتہ کرتی ہوں۔ ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد اسٹیڈی میں چلی جاتی ہوں۔ سیکرٹری وہاں میری منتظر ہوتی ہے۔ وہ اخبارات پڑھ کر مجھے سناتی ہے۔ روزانہ کی ڈاک بھی وہیں میرے سامنے پیش کرتی ہے۔" وہ اپنی روزانہ کی مصروفیات سے قیصر مرزا کو آگاہ کرتی رہی۔ "کل صبح دیر سے آنکھ کھلے گی لہٰذا چہل قدمی کو نہ جا سکوں گی۔"

قیصر مرزا نے دریافت کیا۔ "سنا ہے ریاست کے حق وراثت کے بارے میں مقدمہ بازی ہو رہی ہے؟"

"ہو رہی تھی مگر اب ختم ہو گئی۔" طلعت آرا نے بتایا۔ "رانی بجیا کے ایک دور کے عزیز ریاست کے مدعی بن گئے تھے۔ انھوں نے مقدمہ دائر کر دیا۔ مگر پچھلے دنوں ان سے مصالحت ہو گئی۔ ڈیڑھ لاکھ روپے لے کر وہ میرے حق میں اپنے دعوے سے دست بردار ہو گئے۔ لہٰذا مقدمہ خارج ہو گیا۔ ویسے جائیداد اور املاک کے معاملے میں مقدمے بازی کوئی نئی بات نہیں۔"

قیصر مرزا خاموش رہا۔ طلعت آرا بھی چپ رہی۔ کمرے میں کچھ دیر سکوت رہا۔ پھر قیصر مرزا کی آواز ابھری۔ "بلاشبہ تم رانی حیدر گڑھ ہو۔ خدا تمہارا اقبال اور بلند کرے۔ مگر میرے لئے تم صرف طلعت آرا ہو اور ہمیشہ طلعت آرا ہی ہو گی۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری اور دل کی بات کھل کر بتا دی۔

"یہ آپ کی مرضی ہے۔ جو چاہیں مجھے سمجھیں۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" طلعت آرا نے اس دفعہ بھی اس کی مطلق حوصلہ افزائی نہ کی۔

"شاید اب زندگی میں تم سے دوبارہ ملاقات نہ ہو سکے۔" قیصر مرزا کے لہجے میں درد کی

چھین تھی۔

طلعت آرا نے کسی جذباتی ردِ عمل کا اظہار نہ کیا۔ "بظاہر تو کوئی ایسا امکان نظر نہیں آتا۔"

قیصر مرزا نے مزید بات چیت نہ کی۔ طلعت آرا بھی خاموش بیٹھی رہی۔ اسی اثنا میں دروازے پر دستک ہوئی۔ طلعت آرا نے بلند آواز سے کہا۔ "اندر آجاؤ۔"

نذیر خاں کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے جھک کر طلعت آرا کو اور پھر قیصر مرزا کو آداب کیا اور سر جھکا کر پوچھا۔ "سرکار نے مجھے یاد فرمایا تھا؟"

"ہاں!" طلعت آرا نے جواب دیا۔ "تم کو ابھی لکھنؤ جانا ہے۔" اس نے قیصر مرزا کی جانب ہاتھ سے اشارہ کیا۔ "آپ کو اپنے ہمراہ لے جاؤ اور لکھنؤ پہنچا دو۔"

قیصر مرزا خاموشی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ جاتے جاتے اس نے پلٹ کر طلعت آرا کی جانب دیکھا۔ اس کی آنکھوں کے روشن چراغ ماند پڑ گئے تھے اور چہرہ شدّت کرب سے دھواں دھواں ہو گیا تھا۔ طلعت آرا اس سے نظریں نہ ملا سکی۔ سر جھکائے بت بنی بیٹھی رہی۔

قیصر مرزا آگے بڑھا اور نذیر خاں کے ہمراہ باہر چلا گیا۔ کمرے کا دروازہ بند ہو گیا۔

شوکت صدیقی

١٢، اکتوبر ١٩٨٨ء

TAKHLEEQKAR PUBLISHERS

104/B, Yawar Manzil, I-Block, Laxmi Nagar, Delhi-110092
Ph : 011-22442572, 9811612373 E-mail : qissey@rediffmail.com